اثرِ نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

استاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

جلد ۲

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

زیرِ سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

مصباح القرآن ٹرسٹ

نام کتاب ________ تفسیر نمونہ

جلد نمبر ________ ۲

زیر نظر ________ آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

مترجم ________ حضرت مولانا سید صدر حسین نجفی

نظر ثانی ________ ثاقب اکبر نقوی

ناشر ________ مصباح القرآن ٹرسٹ

مطبع ________ بلوبٹ پریس

تاریخ اشاعت ________ اگست 2011ء

ہدیہ ________

اس جلد کے اخراجات سید تسلیم حیدر زیدی صاحب نے ادا کیئے۔

ہماری دعا ہے کہ خدا تعالیٰ صدقہ محمدؐ و آل محمدؐ ان کی توفیقات میں

اضافہ فرمائے اور ان کے مرحومین کی مغفرت فرمائے

ادارہ

قرآن سنٹر

۲۴/ الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ فون نمبر: ۳۷۳۱۴۳۱۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

قارئین محترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ ــــ کلامِ حکیم اور عہدِ حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغازِ کار میں موجودہ دور کی شہرہ آفاق تفسیر ــــ تفسیر نمونہ ــــ کو فارسی سے اُردو زبان میں ترجمہ کروا کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور محسنِ ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلی اللہ مقامہ کی غیر معمولی ساعی، مالی معاونین کی فراخدلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ستائیس جلدوں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکراً للہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کتب کے علاوہ سید العلماء السید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہ کی سات جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی "پیامِ قرآن" از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور "قرآن کا دائمی منشور" از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل یک جلدی قرآن پاک عہدِ حاضر کے مقبول اُردو تراجم کے ساتھ زیرِ طباعت ہیں۔ اس سلسلے میں روشن فکر اور جید عالمِ دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہ کا ترجمہ "انوار القرآن" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری امتِ مسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے لہٰذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی

طلب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہل علم کی تجویز پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ ستائیس جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں پیدا کی جا سکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیب نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ جلدیں مکمل ہو جائیں لیکن اس میں یہ سقم رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سورتوں کا کچھ حصہ ایک جلد میں اور بقایا حصہ اس سے اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت سے بچانے کی خاطر اس تفسیر کو سورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سورت دو حصوں میں تقسیم نہیں ہونے پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سورت کی کامل تفسیر پر ختم ہوگئی۔ اس طرح پوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں آگئی ہے۔

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد دوم آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں سابقہ جلد دوم میں سے صفحہ ۲۲۴ تا ۴۰۴، پوری جلد سوم اور جلد چہارم میں سے صفحہ ۱ تا ۱۸۸ شامل کیے گئے ہیں، چنانچہ یہ جلد سورۂ آل عمران اور سورۂ نساء کی تفسیر پر مشتمل ہے۔

ہم نے زیر نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی آراء ہمارے لیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و مخیر مرد مومن الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہار تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن کے تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ بحق معصومینؑ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اِھداء

"مرکز مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے

اس نفیس تالیف کو

ان اہلِ مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم

یہ تفسیر

حسب ذیل علماء و مجتہدین کی باہمی کاوش قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے داؤد الہامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے اسد اللہ ایمانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے عبد الرسول حسنی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبد اللہی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

۱ تفسیر مجمع البیان — تالیف — مشہور مفسر طبرسی
۲ تفسیر تبیان — تالیف — عظیم و فقیہ عالم شیخ طوسی
۳ تفسیر المیزان — تالیف — علامہ طباطبائی
۴ تفسیر صافی — تالیف — ملا محسن فیض کاشانی
۵ تفسیر نور الثقلین — تالیف — عبد علی بن جمعہ حویزی
۶ تفسیر برہان — تالیف — سید ہاشم بحرانی
۷ تفسیر روح المعانی — تالیف — علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
۸ تفسیر المنار — تالیف — محمد رشید رضا (تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبدہ)
۹ تفسیر فی ظلال القرآن — تالیف — سید قطب
۱۰ تفسیر قرطبی — تالیف — محمد بن احمد انصاری قرطبی
۱۱ اسباب النزول — تالیف — ابو الحسن علی بن احمد واحدی نیشاپوری
۱۲ تفسیر مراغی — تالیف — احمد مصطفیٰ مراغی

گذارش

تفسیر نمونہ (فارسی)، ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اُردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن بھی ستائیس جلدوں ہی شائع ہوتے رہے ہیں۔ محسنِ ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوندِ کریم مولانا مرحوم کو جوارِ معصومینؑ میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس تفسیر کے لکھنے کا بنیادی مقصد :

اس تفسیر کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ فارسی زبان میں قرآن مجید کی ایک ایسی تفسیر مہیا کی جائے جو خواص و عوام کے لیے مفید ہو۔ ایسی تفسیر جس کی زبان رواں ہو۔ ایسی تفسیر جس میں پیچیدہ علمی اصطلاحات، مفسرین کے اختلافات، ادھر ادھر کے بکھرے ہوئے اقوال، کی بھرمار نہ ہو۔ ایسی تفسیر جو مختلف علوم کی ترقی کی روشنی میں قرآن سے نئی معلومات فراہم کر سکے۔

ایسی تفسیر جس میں تاریخی قرائن، شانِ نزول اور ہادیانِ اسلام سے مروی محکم احادیث سے استفادہ کیا جائے جو اسلامی مصادر و منابع سے ہم تک پہنچی ہیں۔

ایسی تفسیر جو تفسیر ہونے کے علاوہ اسلام کے اصول و فروع کے بارے میں نئے سوالات، دورِ حاضر کے مسائل اور مختلف اعتراضات بھی پیش نظر رکھے اور ایسے مسائل کا حل بھی پیش کرے۔

الحمد للہ اس تفسیر کی ابتدائی جلدیں اس قدر مقبول ہوئیں کہ جلد ہی ان کی پہلی، دوسری اور تیسری اشاعت ختم ہو گئی۔ یہ گرم جوشی نشاندہی کرتی ہے کہ ایسی آسان اور جدید طرز پر لکھی گئی تفسیر کی برسوں سے آگاہ طبقوں میں کس قدر پیاس موجود تھی۔ یہی بات سبب بنی کہ بعد والی جلدوں میں زیادہ دقتِ نظر اور دیکھ بھال سے کام لیا جائے لہٰذا ہم نے ایسا ہی کیا۔ مطالب کی جمع و ترتیب میں بھی تجدید نظر کی گئی ہے۔ اگر آپ پہلی اور دوسری تیسری جلد کا موازنہ کریں تو آپ کو واضح پیش رفت دکھائی دے گی[1]۔ مباحث کو اب زیادہ ہم آہنگ اور کامل تر کر دیا گیا ہے۔ صاحبانِ نظر اور مختلف طبقات کے احباب نے اس کی جتنی قدردانی اور حوصلہ افزائی کی تشویق کی ہے اس نے ہمیں اور دلولہ عطا کیا ہے اگرچہ پہلے بھی اور آج بھی اس راہ میں بہت سی مشکلات حائل ہیں۔ البتہ تشویق و تعریف کے ساتھ ساتھ تنقید بھی ہو رہی ہے اور شاید ہم نے تنقید سے تعریف کی نسبت زیادہ فائدہ اٹھایا ہو یہی وجہ ہے کہ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ بعد والی جلدوں کی تیاری میں اسے پیش نظر رکھیں۔ ہماری بڑی سعادت ہو گی اگر دیگر صاحبانِ نظر اس کے مطالعہ کے بعد اس کے کسی نقص کی نشاندہی کریں ہم انہیں اطمینان دلاتے ہیں کہ نقائص و عیوب کے بیان پر کسی تعصب سے کام نہیں لیں گے اور ہم اعتراضات اور یاد دہانیوں کا خندہ پیشانی سے استقبال کریں گے اور یقیناً ان سے استفادہ کریں گے۔

ہمیں توقع ہے کہ تفسیر قرآن جیسے ناپیدا کنار سمندر سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے ایک کمک ثابت ہو گی اور ہو سکتا ہے قرآن کی زندہ اور عمیق تعلیمات موجودہ افسوسناک صورتِ حال سے مسلمانوں کی نجات کا باعث بن جائیں اور مسلمان کوئی قدم اٹھا سکیں۔

توقع ہے کہ اس سے مراکزِ اسلامی میں تحریک و آگاہی پیدا ہو گی اور وہ دورِ حاضر میں اپنے کندھوں پر پڑی ہوئی اسلامی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے مؤثر قدم اٹھائیں گے اور بالخصوص نوجوان نسل کا قرآن سے رشتہ زیادہ محکم ہو سکے گا۔

ناصر مکارم شیرازی

قم ــــ یکم رجب ۱۳۹۶ ہجری

---

[1] جیسا کہ بتایا جا چکا ہے تفسیر نمونہ جلد اوّل پر نظرثانی کی گئی تھی اور ہم نے اسی نظرثانی شدہ جلد کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ (مترجم)

تفسیر نمونہ جلد ۲

فہرست

سورہ آل عمران

تفسیر نمونہ جلد ۲

اس میں مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں

۱۔ سورہ آلِ عمران ۲۔ سورہ نساء

سورۂ آلِ عمران : مدنی سورت ہے اور اس کی ۲۰۰ آیات ہیں

پارہ ۳ ــــ ۱ تا ۹۱ پارہ ۴ ــــ ۹۲ تا ۲۰۰

سورہ نساء : مدنی سورت ہے اور اس کی ۱۷۶ آیات ہیں

پارہ ۴ ــــ ۱ تا ۲۳ پارہ ۵ ــــ ۲۴ تا ۱۴۷

پارہ ۶ ــــ ۱۴۸ تا ۱۷۶

سُوْرَۃُ

اٰلِ عِمْرٰنَ

○ مدینہ میں نازل ہوئی

○ ۲۰۰ آیات ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ الٓمّٓ ۝

۲۔ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝

۳۔ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝

۴۔ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ[1]

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔

۱۔ الم۔

۲۔ خدائے یکتا کے علاوہ کوئی معبود نہیں ، وہ زندہ و پائیدار اور نگہبانی کرنے والا ہے۔

۳۔ (وہی ذات ہے) جس نے تم پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی ۔ یہ کتاب گذشتہ کتب کی نشانیوں پر منطبق ہوتی ہے اور اس سے قبل تورات اور انجیل کو لوگوں کی ہدایت کے لیے اتارا گیا ۔ نیز حق و باطل میں تمیز کرنے والی کتاب (قرآن مجید) کو نازل کیا۔

شانِ نزول

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اسّی سے کچھ زیادہ آیات نجران کے عیسائی نمائندوں کے بارے میں ہیں جنہیں اسلام کے بارے میں تحقیق کے لیے مدینہ بھیجا گیا تھا۔

---

[1] یہاں کچھ حصہ آیت ۴ کا بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ (مترجم)

قرآن کے حروف مقطعات کے بارے میں سورہ بقرہ کی ابتداء میں ضروری توضیحات پیش کی جاچکی ہیں، اب ان کے تکرار کی ضرورت نہیں۔ یہاں پر ہم ان کے بارے میں ایک قابلِ توجہ نظریہ پیش کریں گے۔ یہ نظریہ حال ہی میں ایک مصری عالم نے پیش کیا ہے۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ہم اُسے یہاں مکمل طور پر بیان کرتے ہیں۔ البتہ اس کی صحت یا کسی سقم کے بارے میں فیصلہ کرنا بہت زیادہ تحقیق کا محتاج ہے جو شاید آئندہ آنے والے لوگوں کے ذمے ہے۔ ہم اسے یہاں فقط ایک نظریے کے طور پر ذکر کرتے ہیں۔

مشہور مصری مجلہ "آخر ساعۃ" جو ایشیا کا ایک بڑا مجلہ شمار ہوتا ہے نے مصر ہی کے ایک مسلمان عالم کی کچھ آیات قرآن مجید کے بارے میں کمپیوٹر کی مدد سے تیار کی گئی عجیب و غریب تحقیق پیش کی ہے۔ اس نے دُنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والوں کو حیران کر دیا ہے۔ یہ تحقیقات کیمسٹری کے مصری اُستاد ڈاکٹر رشاد خلیفہ کی تین سالہ مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ ان تحقیقات نے ایک دفعہ پھر اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ یہ عظیم آسمانی کتاب ذہن انسانی کی پیداوار نہیں ہے اور انسان کے بس کی بات نہیں کہ اس کی مثل پیش کر سکے۔

ڈاکٹر رشاد خلیفہ نے یہ تحقیقات امریکی ریاست میسوری کے شہر سانٹ لوئیس میں کی ہیں۔ وہ اب بھی غذا سازی کی ایک امریکی کمپنی میں بطور مشیر کام کرتے ہیں۔

اُنہوں نے اپنی حیرت انگیز تحقیقات کی تکمیل کے لیے مدتوں کمپیوٹر سے استفادہ کیا ہے۔ ان کمپیوٹرز پر کام کرنے کا ایک سیکنڈ کا کرایہ ۱۴ ڈالر تھا جو وہاں کے بعض مسلمانوں کی مدد سے ادا کیا گیا۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ فارسی جرائد میں مذکورہ سائنسدان سے مصری خبر نگار کی گفتگو ناقص اور غیر مکمل صورت میں شائع ہوئی ہے فارسی دان طبقہ اس سے پوری طرح بات نہیں سمجھ پایا۔ لہٰذا ہم نے ضروری سمجھا کہ خبر کے اصلی منبع سے رجوع کیا جائے تاکہ اس بحث کا مکمل تجزیہ و تحلیل کیا جا سکے۔ البتہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس وقت ہمارا مقصد اس نظریے کی تائید نہیں بلکہ اسے ہم آئندہ تحقیق کرنے والوں کے لیے ریکارڈ پر لانا چاہتے ہیں۔ مذکورہ پروفیسر نے اپنی تمام تر مساعی قرآن کے حروف مقطعات جو ق، الم، یٰس وغیرہ کی شکل میں ہیں کے سمجھنے پر صرف کی ہیں۔ اُس نے پیچیدہ حسابات (CALCULATIONS) کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ جس سورہ کے شروع میں یہ حروف آتے ہیں اُس سورۃ کے دیگر حروف سے ان کا نزدیکی تعلق ہے (غور کیجئے گا)۔

کمپیوٹر سے صرف سورتوں کے حروف کی تعداد اور ان کی نسبت معلوم کرنے کے لیے (اصطلاحاً) ایک فیصد حروف سے مدد لی گئی ہے نہ یہ کہ اس سے قرآنی آیات کی تفسیر چاہی گئی ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ کمپیوٹر کے بغیر یہ بات کسی انسان کے بس کی نہ تھی کہ وہ سالہا سال تک ان حسابات کو کرتا رہتا۔

اب ہم مذکورہ سائنسدان کے انکشافات پیش کرتے ہیں:-

ڈاکٹر رشاد کہتا ہے: ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید کی ۱۱۴ سورتیں ہیں۔ ان میں سے ۸۶ مکہ میں اور ۲۸ مدینہ میں نازل ہوئیں۔ ان میں ۲۹ سورتوں کے آغاز میں حروف مقطعات ہیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ مجموعی طور پر یہ تمام حروف ۱۴ ہیں جب کہ

عربی حروف ابجد کی تعداد ۲۸ ہے ۔ گویا یہ ان کا نصف ہوئے ۔ حروف مقطعات میں آنے والے حروف یہ ہیں
ا ، ح ، ر ، س ، ص ، ط ، ع ، ق ، ک ، ل ، م ، ن ، ھ ، ی ، انہیں بعض اوقات حروف نورانی بھی کہتے ہیں

ڈاکٹر رشاد مزید کہتا ہے : میں سالہا سال سے جاننا چاہ رہا تھا کہ یہ حروف جو ظاہراً ایک دوسرے سے الگ ہیں اور سورتوں کی ابتداء میں آتے ہیں ۔ ان کے معانی کیا ہیں ۔ عظیم مفسرین کی تفاسیر و آراء دیکھیں لیکن تسلی نہ ہوئی لہٰذا خدا سے مدد مانگی اور مطالعہ میں محو ہوگیا ۔

اچانک یہ سوچ پیدا ہوئی کہ شاید ان حروف اور جس سورہ کے شروع میں یہ موجود ہیں اس کے حروف کے درمیان کوئی رابطہ پایا جاتا ہو لیکن ۱۴ نورانی حروف اور ۱۱۴ سورتوں کے بارے میں تحقیق ہر ایک نسبت کا تعین اور دیگر بہت سے حسابات کمپیوٹر کے بغیر ممکن نہ تھے لہٰذا پہلے مذکورہ حروف کو قرآن کی ۱۱۴ سورتوں میں علیحدہ علیحدہ کیا گیا اور پھر سورت کے تمام حروف کو ترتیب دے کے کمپیوٹر کے سپرد کیا گیا تاکہ ان کی مدد سے آئندہ حسابات کئے جا سکیں ۔ یہ کام اور دیگر ابتدائی ضروری امور دو سال کے عرصے میں انجام پائے ۔

اس کے بعد کمپیوٹر پر مذکورہ حسابات کے ایک سال کام کرتا رہا تو بہت ہی درخشاں نتیجہ برآمد ہوا ۔ تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ تعجب انگیز حقائق سے پردہ اٹھا جنہوں نے دیگر پہلوؤں کے علاوہ علم ریاضی کے اعتبار سے حروف قرآن کی نسبت کے بارے میں قرآنی اعجاز کو مکمل طور پر واضح کر دیا ۔ کمپیوٹر نے ہمیں بتایا کہ ان چودہ حروف کی ۱۱۴ قرآنی سورتوں میں ہر ایک سے کیا نسبت ہے مثلاً حساب کے بعد ہم نے دیکھا کہ " ق " جو قرآن کے نورانی حروف میں سے ہے ۔ سورہ فلق میں اس کا سب سے زیادہ حصہ ہے ، یہ حصہ ۰ ۰ ۷، ۹ فیصد ہے اور یہ نسبت قرآن کی سورتوں میں اول نمبر پر ہے (البتہ سورہ ق اس میں شامل نہیں ہے) اس کے بعد سورہ قیامتہ ہے جس میں ق کی نسبت ۷ ، ۹۰ ۲ فیصد ہے پھر سورہ والشمس ہے جس میں یہ تناسب ۶ ۔ ۹ ۲ فیصد ہے جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ سورہ قیامتہ اور والشمس میں یہ فرق سو میں سے ایک ہزار کا ہے ۔ اسی ترتیب سے قرآن کی تمام ۱۱۴ سورتوں میں سے ہم نسبت معلوم کر سکیں گے ۔ اور یہ نسبت اسی ایک حرف کے بارے میں نہیں بلکہ تمام نورانی حروف کے بارے میں ہر ایک سورت کے تمام حروف کی نسبت ایک ایک کر کے معلوم کی جا سکتی ہے ۔

اب ہم ان جاذب نظر نتائج کا ذکر کرتے ہیں جو ان حسابات (CALCULATIONS) سے سامنے آتے ہیں ۔

۱ ـــ حرف ق کی نسبت سورہ ق میں قرآن کی دوسری سورتوں کے مقابلے میں بلا استثناء سب سے زیادہ ہے یعنی ۲۳ سالوں کے دوران میں جو دیگر ۱۱۳ سورتیں نازل ہوئی ہیں ، ان میں حرف ق سورہ ق کی نسبت کم استعمال ہوا ۔ واقعاً یہ امر بہت حیران کن ہے کہ ایک انسان ۲۳ سال کے طویل عرصے میں اپنی گفتگو کے حروف کی تعداد کا اس قدر خیال رکھے اور اس کے باوجود آزادانہ اور بلا تکلف گفتگو کرتا رہے ۔ مسلّم ہے کہ یہ کام ایک انسان کے بس سے باہر ہے یہاں تک کہ ایک عظیم ترین ریاضی دان بھی کمپیوٹر کی مدد کے بغیر اس کا حساب نہیں رکھ سکتا ۔

یہ تمام چیزیں نشاندہی کرتی ہیں کہ نہ صرف قرآن کی سورتیں اور آیات بلکہ حروف قرآن بھی ایک خاص نظام اور حساب کے

تحت ہیں اور اس پر صرف خدا ہی قادر ہے۔

اسی طرح حسابات سے معلوم ہوتا ہے کہ حرف ص کی سورہ ص میں یہی پوزیشن ہے یعنی اس میں اس کی مقدار سورہ کے باقی حروف کی نسبت قرآن کی دیگر سورتوں میں اس کی نسبت سے زیادہ ہے۔

اس طرح سورہ حجر کے علاوہ حرف ن کی سورہ "ن والقلم" میں نسبت دیگر سورتوں میں اس کی نسبت سے زیادہ ہے لیکن سورہ حجر میں اس کی نسبت سورہ ن والقلم میں اس کی نسبت سے زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر جاذب نظر ہے کہ سورہ حجر ان سورتوں میں سے ہے جن کی ابتداء "ال ر" سے ہوتی ہے۔ بعد میں ہم دیکھیں گے کہ وہ سورتیں جن کی ابتدا "ال ر" سے ہوتی ہے وہ سب کی سب ایک سورت شمار ہوں گی اور اگر ہم نے ایسا کیا تو ہمیں مطلوبہ نتیجہ دستیاب ہوگا یعنی ان تمام سورتوں میں حرف ن کی نسبت۔ اس کی سورہ ن والقلم میں نسبت سے کم ہو جائے گی۔

۲ - ال م ص - یہ چار حروف سورہ اعراف کی ابتداء میں آتے ہیں اب اگر اس سورہ میں آنے والے تمام ال م ص جمع کیے جائیں تو ہم دیکھیں گے کہ ان کی نسبت اس سورہ کے دیگر حروف کے ساتھ ان کی نسبت دوسری سورتوں میں دیگر حروف سے زیادہ ہے

اسی طرح ال ر - یہ چار حروف سورہ رعد کی ابتداء میں ہیں ان کی بھی یہی حالت ہے۔ یونہی ک ھ ی ع ص - یہ پانچ حروف سورہ مریم کے آغاز میں ہیں ان کا بھی یہی حساب ہے۔

یہاں مسئلے کے ایک نئے رخ سے ہمارا سامنا ہوتا ہے کہ ایک جدا حرف ہی اس آسمانی کتاب میں ایک خاص نظم کے تحت نہیں بلکہ ایک سے زیادہ حروف بھی حیرت انگیز وضع میں اس میں موجود ہیں۔

۳ - اب تک تو صرف ایک سورہ کے شروع میں آنے والے حروف کا ذکر تھا لیکن وہ حروف مقطعات جو ایک سے زیادہ قرآنی سورتوں کے آغاز میں آتے ہیں مثلاً ال م ر یا ال م تو وہ اپنے اندر ایک اور مشکل حساب سموئے ہوئے ہیں۔ اور وہ یہ کہ جن سورتوں میں یہ حروف آتے ہیں، مثلاً ال م چھ سورتوں کے آغاز میں ہے تو ان چھ سورتوں میں ان حروف کے مجموعے کا تناسب دیگر حروف سے دیکھنا ہوگا۔ ہم دیکھیں گے کہ یہ نسبت ان حروف کی دیگر ہر سورۃ میں ان کی نسبت سے زیادہ ہے

یہاں مسئلے نے پھر ایک توجہ طلب صورت اختیار کرلی ہے اور وہ یہ کہ نہ صرف قرآن کی ہر سورت کے حروف ایک معین ضابطے اور حساب کے تحت ہیں بلکہ مشابہ سورتوں کے مجموعی حروف بھی ایک ہی ضابطے اور نظام کے مطابق ہیں۔

ضمنی طور پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید کی متعدد سورتیں کیوں ال م یا ال م ر سے شروع ہوتی ہیں گویا ایسا اتفاقاً اور بلاوجہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر رشاد نے پیچیدہ ترین حسابات "ح م" پر مشتمل سورتوں کے بارے میں پیش کئے ہیں ہم اختصار کے پیش نظر ان سے صرف نظر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر رشاد نے اس ضمن میں کچھ اور قابل توجہ نکات بھی پیش کیے ہیں جنہیں بعض نئے نتیجہ بخش نکات کے اضافے کے ساتھ ہم قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۔ الٓمّٓ ۝

۲۔ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۝

۳۔ نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ ۝

۴۔ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ[1]

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔

۱۔ الم۔

۲۔ خدائے یکتا کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ زندہ و پائیدار اور نگہبانی کرنے والا ہے۔

۳۔ (وہی ذات ہے) جس نے تم پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی۔ یہ کتاب گذشتہ کتب کی نشانیوں پر منطبق ہوتی ہے اور اس سے قبل تورات اور انجیل کو لوگوں کی ہدایت کے لیے اتارا گیا۔ نیز حق و باطل میں تمیز کرنے والی کتاب (قرآن مجید) کو نازل کیا۔

شان نزول

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اسّی سے کچھ زیادہ آیات نجران کے عیسائی نمائندوں کے بارے میں ہیں جنہیں اسلام کے بارے میں تحقیق کے لیے مدینہ بھیجا گیا تھا۔

[1] یہاں کچھ حصہ آیت ۴ کا بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ (مترجم)

وہ ساٹھ افراد تھے ۔ ان میں سے چودہ نجران کے اشراف اور معززین شمار ہوتے تھے ۔ ان چودہ میں سے تین سردار تھے وہاں کے عیسائی اپنے کاموں اور مشکلات میں انہی تین سے رجوع کرتے تھے ۔ ان میں سے ایک عاقب تھا جسے عبدالمسیح بھی کہتے تھے ۔ وہ اپنی قوم کا امیر اور رئیس بھی شمار ہوتا تھا ۔ اس کی قوم کبھی اس کے نظریے اور رائے کی مخالفت نہیں کرتی تھی ۔ دوسرے کا نام سید تھا اُسے ایہم بھی کہتے تھے ۔ خاطر تواضع اور سفر کے انتظامی امور کی سرپرستی بھی کرتا تھا اور عیسائیوں کے لیے بہت قابل اعتماد تھا ۔ تیسرا شخص ابوحارثہ تھا جو عالم تھا اور نہایت باا‌ثر تھا ۔ عیسائیوں نے کئی ایک گرجے اس کے نام کے بنا رکھے تھے ۔ اُسے تمام مذہبی مسیحی کُتب یاد تھیں ۔ ساٹھ افراد کا یہ گروہ قبیلہ بنی کعب کے لباس میں مدینہ آیا اور مسجد نبوی میں پہنچا ۔ اس وقت نبی اکرمؐ مسلمانوں کے ہمراہ نماز عصر ادا فرما چکے تھے ۔ ان ساٹھ افراد نے خوبصورت زرق برق اور پرکشش لباس پہن رکھے تھے ۔ ایک صحابی کے بقول : ہم نے کبھی کوئی نمائندے ایسے بنے ٹھنے نہیں دیکھے تھے ۔ [۱]

وہ مسجد میں پہنچے تو یہ اُن کی نماز کا وقت تھا ۔ انہوں نے اپنے مراسم کے مطابق ناقوس بجایا اور مشرق کی طرف رُخ کر کے نماز میں مشغول ہو گئے ۔ کچھ اصحاب نے انہیں روکنا چاہا لیکن آپؐ نے فرمایا : تم ان سے سروکار نہ رکھو ۔

نماز کے بعد عاقب اور سید نبی کریمؐ کی خدمت میں آئے اور آپؐ سے گفتگو کرنے لگے ۔ آپؐ نے اُنہیں دینِ اسلام قبول کرنے اور بارگاہِ خداوندی میں سرِ تسلیم خم کرنے کی دعوت دی ۔

عاقب اور سید کہنے لگے : ہم آپ سے پہلے اسلام لا چکے ہیں اور بارگاہِ الٰہی میں سرِ تسلیم خم کر چکے ہیں ۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا : تم کس طرح دینِ حق پر ہو جب کہ تمہارے اعمال بتاتے ہیں کہ تم خدا کے سامنے سرِ تسلیم جھکائے ہوئے نہیں ہو کیونکہ تم خدا کے لیے بیٹے کے قائل ہو اور حضرت عیسٰی کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہو ، صلیب کی پوجا اور پرستش کرتے ہو اور خنزیر کا گوشت کھاتے ہو جب کہ یہ سب امور دینِ حق کے خلاف ہیں ۔

عاقب اور سید نے کہا : اگر حضرت عیسٰی خدا کے بیٹے نہیں تو پھر ان کا باپ کون تھا ؟

نبی کریمؐ نے فرمایا : کیا تم یہ بات مانتے ہو کہ ہر بیٹا باپ سے شباہت رکھتا ہے ؟

اُنہوں نے کہا : ہاں ۔

آپؐ نے فرمایا : کیا ایسا نہیں کہ ہمارا خدا ہر چیز پر محیط ہے ، قیوم ہے اور موجودات کو روزی دینا اُس کے ذمہ ہے ؟

وہ کہنے لگے : ہاں ایسا ہی ہے ۔

آپؐ نے فرمایا : کیا حضرت عیسٰی میں یہ اوصاف تھے ؟

اُنہوں نے کہا : نہیں ۔

آپؐ نے فرمایا : کیا تم جانتے ہو کہ زمین و آسمان کی کوئی چیز خدا سے مخفی نہیں اور وُہ ہر چیز کو جانتا ہے ؟

---

[۱] یمن کے شمالی کوہستان میں ایک مقام صنعاء ہے ۔ صنعاء سے دس منزل دور قبیلہ ہمدان کی زمینیں تھیں ۔ جاہلیت کے زمانے میں اس قبیلے کا ایک بت تھا ۔ اس کا نام اہل قبیلہ نے "یعوق" رکھا تھا ۔ اس قبیلے کی بستی کو نجران کہتے تھے ۔ معجم البلدان یاقوت حموی کے بقول نجران چند مقامات کا نام ہے ۔

کہنے لگے : ہاں ، ہم جانتے ہیں ۔
آپ نے فرمایا : جو کچھ حضرت عیسٰی کو خدا نے بتلایا کیا وہ اس کے علاوہ اپنی طرف سے کسی چیز کو جانتے تھے ؟
وہ بولے : نہیں ۔
آپ نے فرمایا : کیا تم جانتے ہو کہ ہمارا خدا وہی ہے جس نے شکم مادر میں حضرت عیسٰی کو جیسے چاہا بنایا ؟
کہنے لگے : ہاں ، ایسا ہی ہے ۔
آپ نے فرمایا : کیا ایسا نہیں کہ حضرت عیسٰی کو ان کی والدہ باقی بچوں کی طرح جسم میں اٹھائے رہیں اور پھر انہیں باقی ماؤں کی طرح جنم دیا اور حضرت عیسٰی ولادت کے بعد دیگر بچوں کی طرح غذا کھاتے تھے ؟
وہ کہنے لگے : ہاں ایسے ہی تھا ۔
اس پر آپ نے فرمایا : تو پھر حضرت عیسٰی خدا کے بیٹے کیسے ہو گئے جب کہ اس سے کوئی شباہت نہیں رکھتے ؟
گفتگو یہاں تک پہنچی تو سب کے سب خاموش ہو گئے ۔ اس وقت اس سورۃ کی اسّی سے کچھ اوپر آیات نازل ہوئیں ان آیات میں بعض معارف اور کچھ اسلامی پروگراموں کی وضاحت کی گئی ہے ۔[1]

تفسیر

یہ سورہ باتفاق مفسرین دو سو آیات پر مشتمل ہے ۔ اس کی تمام آیات مدینہ میں نازل ہوئیں ۔ آل عمران کے واقعے کی مناسبت سے اس کا نام سورہ آل عمران رکھا گیا ہے ۔ یہ واقعہ آیت ۳۲ کے بعد اس سورہ میں موجود ہے ۔
اس سورہ کے اہم موضوعات ہیں ۔

- ایمان ،
- اسلام ،
- اسلام کی حمایت اور وسعت میں استقامت و پامردی ،
- یہود و نصاریٰ سے منطقی مقابلہ ،
- مسلمانوں کے لیے متعدد تربیتی درس ،
- اسلام کی پیش رفت اور
- باطل عقائد کی نفی ۔

اس سورہ کے مطالب ایک دوسرے سے اس طرح مربوط اور متناسب ہیں گویا سب آیات ایک وقت میں نازل ہوئی ہیں
اب اس سورہ کی ایک ایک آیت کی تفسیر بیان کی جاتی ہے ۔

الم ـ کمپیوٹر کے ذریعے حروف مقطعات کی تفسیر

---

[1] المیزان ، ج ۳ ، ص ۱۳ ۔

قرآن کے حروف مقطعات کے بارے میں سورہ بقرہ کی ابتداء میں ضروری توضیحات پیش کی جا چکی ہیں ، اب ان کے تکرار کی ضرورت نہیں ۔ یہاں پر ہم ان کے بارے میں ایک قابلِ توجہ نظریہ پیش کریں گے ۔ یہ نظریہ حال ہی میں ایک مصری عالم نے پیش کیا ہے ۔ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم اُسے یہاں مکمل طور پر بیان کرتے ہیں ۔ البتہ اس کی صحت یا کسی سقم کے بارے میں فیصلہ کرنا بہت زیادہ تحقیق کا محتاج ہے جو شاید آئندہ آنے والے لوگوں کے ذمے ہے ۔ ہم اسے یہاں فقط ایک نظریے کے طور پر ذکر کرتے ہیں ۔

مشہور مصری مجلہ "آخر ساعتہ" جو ایشیا کا ایک بڑا مجلہ شمار ہوتا ہے نے مصر ہی کے ایک مسلمان عالم کی کچھ آیات قرآن مجید کے بارے میں کمپیوٹر کی مدد سے تیار کی گئی عجیب و غریب تحقیق پیش کی ہے ۔ اس نے دُنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والوں کو حیران کر دیا ہے ۔ یہ تحقیقات کیمسٹری کے مصری اُستاد ڈاکٹر رشاد خلیفہ کی تین سالہ مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہیں ۔ ان تحقیقات نے ایک دفعہ پھر اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ یہ عظیم آسمانی کتاب ذہنِ انسانی کی پیداوار نہیں ہے اور انسان کے بس کی بات نہیں کہ اس کی مثل پیش کر سکے ۔

ڈاکٹر رشاد خلیفہ نے یہ تحقیقات امریکی ریاست میسوری کے شہر سانٹ لوئیس میں کی ہیں ۔ وہ اب بھی غذا سازی کی ایک امریکی کمپنی میں بطور مشیر کام کرتے ہیں ۔

انہوں نے اپنی حیرت انگیز تحقیقات کی تکمیل کے لیے مدتوں کمپیوٹر سے استفادہ کیا ہے ۔ ان کمپیوٹرز پر کام کرنے کا ایک سیکنڈ کا کرایہ ۱۰ ڈالر تھا جو وہاں کے بعض مسلمانوں کی مدد سے ادا کیا گیا ۔

افسوس ہے کہنا پڑتا ہے کہ فارسی جرائد میں مذکورہ سائنسدان سے مصری خبر نگار کی گفتگو ناقص اور غیر مکمل صورت میں شائع ہوئی ہے فارسی دان طبقہ اس سے پوری طرح بات نہیں سمجھ پایا ۔ لہٰذا ہم نے ضروری سمجھا کہ خبر کے اصلی منبع سے رجوع کیا جائے تاکہ اس بحث کا مکمل تجزیہ و تحلیل کیا جا سکے ۔ البتہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس وقت ہمارا مقصد اس نظریے کی تائید نہیں بلکہ اسے ہم آئندہ تحقیق کرنے والوں کے لیے ریکارڈ پر لانا چاہتے ہیں ۔ مذکورہ پروفیسر نے اپنی تمام تر مساعی قرآن کے حروف مقطعات جو ق ، الم ، یٰسٓ وغیرہ کی شکل میں ہیں کے سمجھنے پر صرف کی ہیں ۔ اُس نے پیچیدہ حسابات (CALCULATIONS) کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ جس سورہ کے شروع میں یہ حروف آتے ہیں اُس سورۃ کے دیگر حروف سے ان کا نزدیکی تعلق ہے (غور کیجئے گا) ۔

کمپیوٹر سے صرف سورتوں کے حروف کی تعداد اور ان کی نسبت معلوم کرنے کے لیے (اصطلاحاً) ایک فیصد حروف سے مدد لی گئی ہے نہ یہ کہ اس سے قرآنی آیات کی تفسیر چاہی گئی ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ کمپیوٹر کے بغیر یہ بات کسی انسان کے بس کی نہ تھی کہ وہ سالہا سال تک ان حسابات کو کرتا رہتا ۔

اب ہم مذکورہ سائنسدان کے انکشافات پیش کرتے ہیں :-

ڈاکٹر رشاد کہتا ہے : ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید کی ۱۱۴ سورتیں ہیں ۔ ان میں سے ۸۶ مکہ میں اور ۲۸ مدینہ میں نازل ہوئیں ۔ ان میں ۲۹ سورتوں کے آغاز میں حروف مقطعات ہیں ۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ مجموعی طور پر یہ تمام حروف ۱۴ ہیں جب کہ

عربی حروف ابجد کی تعداد ۲۸ ہے۔ گویا یہ ان کا نصف ہوئے۔ حروف مقطعات میں آنے والے حروف یہ ہیں
ا . ح . ر . س . ص . ط . ع . ق . ک . ل . م . ن . ھ . ی ، انہیں بعض اوقات حروفِ نورانی بھی کہتے ہیں

ڈاکٹر رشاد مزید کہتا ہے: میں سالہا سال سے جاننا چاہ رہا تھا کہ یہ حروف جو ظاہراً ایک دوسرے سے الگ ہیں اور سورتوں کی ابتداء میں آتے ہیں۔ ان کے معانی کیا ہیں۔ عظیم مفسرین کی تفاسیر و آراء دیکھیں لیکن تسلی نہ ہوئی لہٰذا خدا سے مدد مانگی اور مطالعے میں محو ہوگیا۔

اچانک یہ سوچ پیدا ہوئی کہ شاید ان حروف اور جس سورہ کے شروع میں یہ موجود ہیں اس کے حروف کے درمیان کوئی ربط پایا جاتا ہو لیکن ۱۴ نورانی حروف اور ۱۱۴ سورتوں کے بارے میں تحقیق ہر ایک نسبت کا تعین اور دیگر بہت سے حسابات کمپیوٹر کے بغیر ممکن نہ تھے لہٰذا پہلے مذکورہ حروف کو قرآن کی ۱۱۴ سورتوں میں علیٰحدہ علیٰحدہ کیا گیا اور پھر سورت کے تمام حروف کو ترتیب دے کے کمپیوٹر کے سپرد کیا گیا تاکہ ان کی مدد سے آئندہ حسابات کئے جاسکیں۔ یہ کام اور دیگر ابتدائی ضروری امور دو سال کے عرصے میں انجام پائے۔

اس کے بعد کمپیوٹر پر مذکورہ حسابات کے [illegible] ایک سال کام کرتا رہا تو بہت ہی درخشاں نتیجہ برآمد ہوا۔ تاریخِ اسلام میں پہلی مرتبہ تعجب انگیز حقائق سے پردہ اٹھا جنہوں نے دیگر پہلوؤں کے علاوہ علم ریاضی کے اعتبار سے حروفِ قرآن کی نسبت کے بارے میں قرآنی اعجاز کو مکمل طور پر واضح کردیا۔ کمپیوٹر نے ہمیں بتایا کہ ان چودہ حروف کی ۱۱۴ قرآنی سورتوں میں ہر ایک سے کیا نسبت ہے مثلاً حساب کے بعد ہم نے دیکھا کہ "ق" جو قرآن کے نورانی حروف میں سے ہے۔ سورہ فلق میں اس کا سب سے زیادہ حصہ ہے، یہ حصہ ۰.۰۷ فیصد ہے اور یہ نسبت قرآن کی سورتوں میں اول نمبر پر ہے (البتہ سورہ ق اس میں شامل نہیں ہے) اس کے بعد سورہ قیامتہ ہے۔ جس میں ق کی نسبت ۷.۰۹ فیصد ہے پھر سورہ والشمس ہے جس میں یہ تناسب ۹.۰۶ فیصد ہے جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ سورہ قیامتہ اور والشمس میں یہ فرق سو میں سے ایک ہزار کا ہے۔ اسی ترتیب سے قرآن کی تمام ۱۱۴ سورتوں میں سے ہم نسبت معلوم کرسکیں گے۔ اور یہ نسبت اسی ایک حرف کے بارے میں نہیں بلکہ تمام نورانی حروف کے بارے میں ہر ایک سورت کے تمام حروف کی نسبت ایک ایک کر کے معلوم کی جاسکتی ہے۔

اب ہم ان جاذب نظر نتائج کا ذکر کرتے ہیں جو ان حسابات (CALCULATIONS) سے سامنے آتے ہیں۔

۱ — حرف ق کی نسبت سورہ ق میں قرآن کی دوسری سورتوں کے مقابلے میں بلا استثناء سب سے زیادہ ہے یعنی ۲۳ سالوں کے دوران میں جو دیگر ۱۱۳ سورتیں نازل ہوئی ہیں ان میں حرف ق سورہ ق کی نسبت کم استعمال ہوا۔ واقعاً یہ امر بہت حیران کن ہے کہ ایک انسان ۲۳ سال کے طویل عرصے میں اپنی گفتگو کے حروف کی تعداد کا اس قدر خیال رکھے اور اس کے باوجود آزادانہ اور بلا تکلف گفتگو کرتا رہے۔ مسلّم ہے کہ یہ کام ایک انسان کے بس سے باہر ہے یہاں تک کہ ایک عظیم ترین ریاضی دان بھی کمپیوٹر کی مدد کے بغیر اس کا حساب نہیں رکھ سکتا۔

یہ تمام چیزیں نشاندہی کرتی ہیں کہ نہ صرف قرآن کی سورتیں اور آیات بلکہ حروفِ قرآن بھی ایک خاص نظام اور حساب کے

تحت ہیں اور اس پر صرف خدا ہی قادر ہے۔

اسی طرح حسابات سے معلوم ہوتا ہے کہ حرف ص کی سورہ ص میں یہی پوزیشن ہے یعنی اس میں اس کی مقدار سورہ کے باقی حروف کی نسبت قرآن کی دیگر سورتوں میں اس کی نسبت سے زیادہ ہے۔

اس طرح سورہ حجر کے علاوہ حرف ن کی سورہ "ن والقلم" میں نسبت دیگر سورتوں میں اس کی نسبت سے زیادہ ہے لیکن سورہ حجر میں اس کی نسبت سورہ ن والقلم میں اس کی نسبت سے زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر جاذب نظر ہے کہ سورہ حجر ان سورتوں میں سے ہے جن کی ابتداء "ال ر" سے ہوتی ہے۔ بعد میں ہم دیکھیں گے کہ وہ سورتیں جن کی ابتدا "ال ر" سے ہوتی ہے وہ سب کی سب ایک سورت شمار ہوں گی اور اگر ہم نے ایسا کیا تو ہمیں مطلوبہ نتیجہ دستیاب ہوگا یعنی ان تمام سورتوں میں حرف ن کی نسبت۔ اس کی سورہ ن والقلم میں نسبت سے کم ہو جائے گی۔

۲ ـــ ال م ص ـــ یہ چار حروف سورہ اعراف کی ابتدا میں آتے ہیں اب اگر اس سورہ میں آنے والے تمام ال م ص جمع کیے جائیں تو ہم دیکھیں گے کہ ان کی نسبت اس سورہ کے دیگر حروف کے ساتھ ان کی نسبت دوسری سورتوں میں دیگر حروف سے زیادہ ہے

اسی طرح ال ر ۔ یہ چار حروف سورہ رعد کی ابتداء میں ہیں ان کی بھی یہی حالت ہے۔ یونہی ک ھ ی ع ص ـــ یہ پانچ حروف سورہ مریم کے آغاز میں ہیں ان کا بھی یہی حساب ہے۔

یہاں مسئلے کے ایک سے نئے رُخ سے ہمارا سامنا ہوتا ہے کہ ایک جدا حرف ہی اس آسمانی کتاب میں ایک خاص نظم کے تحت نہیں بلکہ ایک سے زیادہ حروف حیرت انگیز وضع میں اس میں موجود ہیں۔

۳ ـــ اب تک تو صرف ایک سورہ کے شروع میں آنے والے حروف کا ذکر تھا لیکن وہ حروف مقطعات جو ایک سے زیادہ قرآنی سورتوں کے آغاز میں آتے ہیں مثلاً ال م ر یا ال م تو وہ اپنے اندر ایک اور مشکل حساب سموئے ہوئے ہیں۔ اور وہ یہ کہ جن سورتوں میں یہ حروف آتے ہیں، مثلاً ال م چھ سورتوں کے آغاز میں ہے تو ان چھ سورتوں میں ان حروف کے مجموعے کا تناسب دیگر حروف سے دیکھنا ہوگا۔ ہم دیکھیں گے کہ یہ نسبت ان حروف کی دیگر ہر سورۃ میں ان کی نسبت سے زیادہ ہے

یہاں مسئلے نے پھر ایک توجہ طلب صورت اختیار کرلی ہے اور وہ یہ کہ نہ صرف قرآن کی ہر سورت کے حروف ایک معین ضابطے اور حساب کے تحت ہیں بلکہ مشابہ سورتوں کے مجموعی حروف بھی ایک ہی ضابطے اور نظام کے مطابق ہیں۔

ضمنی طور پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید کی متعدد سورتیں کیوں ال م یا ال م ر سے شروع ہوتی ہیں گویا ایسا اتفاقاً اور بلاوجہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر رشاد نے پیچیدہ ترین حسابات "ح م" پر مشتمل سورتوں کے بارے میں پیش کئے ہیں ہم اختصار کے پیش نظر ان سے صرف نظر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر رشاد نے اس ضمن میں کچھ اور قابل توجہ نکات بھی پیش کیے ہیں جنہیں بعض نئے نتیجہ بخش نکات کے اضافے کے ساتھ ہم قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:۔

(۱) قرآن مجید کے اصلی رسم الخط کی حفاظت کریں

وہ کہتے ہیں کہ یہ تمام حسابات اسی صورت میں صحیح ہیں جب ہم قرآن کے اصلی اور قدیمی رسم الخط پر ہاتھ نہ ڈالیں ورنہ حساب خراب ہو جائے گا۔ مثلاً اسحٰق، زکوٰۃ اور صلوٰۃ کی صورت میں لکھیں نہ کہ اسحاق، زکات اور صلات کی شکل میں۔

(۲) قرآن مجید میں عدمِ تحریف کی ایک اور دلیل

یہ تحقیقات نشاندہی کرتی ہیں کہ قرآن مجید میں ایک لفظ بلکہ ایک حرف کی بھی کمی یا زیادتی نہیں ہوئی ورنہ یقینی طور پر پہلے حسابات موجودہ قرآن میں یہ نتائج پیش نہ کر سکتے۔

(۳) پر معنی اشارات

قرآن حکیم کی بہت سی سورتیں جن کی ابتدا حروف مقطعات سے ہوئی ہے ان میں ان حروف کے بعد قرآن کی حقانیت اور عظمت کا ذکر آیا ہے مثلاً "الٓمٓ ذٰلک الکتٰب لا ریب فیہ"
یہ بذاتِ خود مذکورہ حروف کے اعجازِ قرآن ہونے کی طرف ایک اشارہ ہے۔

حاصل کلام

اس ساری بحث سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ۲۳ سال میں پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہونے والے حروفِ قرآن بہت دقیق اور منظم حسابات کے حامل ہیں اور الف، با اور دیگر تمام حروف کا ہر سورۃ کے مجموعی حروف سے علم ریاضی کے حوالے سے گہرا تعلق ہے ایسے حسابات انسان کمپیوٹر کی مدد کے بغیر نہیں کر سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ دانشمندِ مذکور کی تحقیقات ابھی ابتدائی مرحلے میں ہیں لہٰذا نقائص سے خالی نہیں ہیں۔ ابھی انہیں انہی کے ذریعے یا دیگر دانشمندوں کے ذریعہ پایۂ تکمیل تک پہنچنا چاہیے۔

"اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ"

اللہ یگانہ و یکتا ہے، جاوداں اور قائم رہنے والا معبود ہے اور تمام چیزیں اسی کے وجود سے وابستہ ہیں۔ اس آیہ کی شرح تفسیر سورہ بقرہ کی آیہ ۲۵۵ میں گزر چکی ہے۔

"نزّل علیک الکتٰب بالحق مصدقًا لما بین یدیہ وانزل التوراۃ والانجیل من قبل ھدًی للناس"

اس آیت میں پیغمبر اسلامؐ مخاطب ہیں۔ فرمایا گیا ہے: وہ خدا جو پائندہ اور قیوم ہے اس نے تم پر ایسا قرآن نازل کیا ہے جس میں حق و حقیقت کی نشانیاں ہیں اور یہ نشانیاں ان کے علاوہ بھی ہیں جن کی بشارت گذشتہ انبیاء اور آسمانی کتب (تورات، انجیل) نے دی ہے اور گذشتہ انبیاء اور آسمانی کتب نے قرآن اور قرآن لانے کے بارے میں جو گفتگو کی ہے اس نے اس کی بھی تصدیق کی

ہے۔ وُہ وُہی خدا ہے جس نے تورات اور انجیل کو نوعِ بشر کی راہنمائی اور ہدایت کے لیئے نازل کیا ہے۔

چند اہم نکات

(۱) **حق کا مفہوم**:۔ "حق" کا معنی اصل میں "مطابقت" اور "ہم آہنگی" ہے۔ اسی لیے جو چیز واقعیت سے مطابقت رکھتی ہے اسے حق کہتے ہیں۔ یہ جو خدا تعالیٰ کو حق کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ذاتِ مقدس عظیم ترین واقعیت ہے کہ جو قابلِ انکار نہیں۔ واضح تر الفاظ میں ـــ حق یعنی وہ ثابت اور مضبوط امر جس میں باطل کے لیے کوئی راستہ نہ ہو۔ محل بحث آیت میں "باء" اصطلاح میں مصاحبت کے لیے ہے۔ یعنی اے پیغمبر! خدا نے تم پر ایسا قرآن نازل کیا ہے جو واقعیت کی نشانیوں سے توام اور ہم آہنگ ہے۔

(۲) **تورات کیا ہے**: "توریٰة" عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا معنی ہے "شریعت" اور "قانون"۔ یہ لفظ خدا کی طرف سے حضرت موسیٰؑ بن عمران پر نازل ہونے والی کتاب کے لیے بولا جاتا ہے۔ نیز بعض اوقات عہد عتیق کی کتب کے مجموعے کے لیے اور کبھی کبھی تورات کے پانچوں اسفار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہودیوں کی کتب کے مجموعے کو عہد عتیق کہتے ہیں۔ اس میں تورات اور چند دیگر کتب شامل ہیں۔ تورات کے پانچ حصے ہیں جنہیں سفرِ پیدائش، سفرِ خروج، سفرِ لاویان، سفرِ اعداد اور سفرِ تثنیہ کہتے ہیں۔ اس کے موضوعات یہ ہیں:

(i) کائنات، انسان اور دیگر مخلوقات کی خلقت،

(ii) حضرت موسیٰؑ بن عمران، گذشتہ انبیاء اور بنی اسرائیل کے حالات اور

(iii) اس دین کے احکام کی تشریح۔

عہد عتیق کی دیگر کتابیں دراصل حضرت موسیٰؑ کے بعد کے مؤرخین کی تحریر کردہ ہیں۔ ان میں حضرت موسیٰ بن عمران کے بعد کے نبیوں، حکمرانوں اور قوموں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

یہ بغیر کہے واضح ہے کہ تورات کے پانچوں اسفار سے اگر صرفِ نظر کر لیا جائے تو دیگر کتب میں سے کوئی کتاب بھی آسمانی کتاب نہیں ہے۔ خود یہودی بھی اس کا دعویٰ نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ حضرت داؤدؑ سے منسوب زبور جسے وہ مزامیر کہتے ہیں، حضرت داؤدؑ کے مناجات اور پند و نصائح کی تشریح ہے۔ رہی بات تورات کے پانچوں سفروں کی تو ان میں ایسے واضح قرائن موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ بھی آسمانی کتابیں نہیں ہیں بلکہ وہ تاریخی کتب ہیں جو حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کے بعد لکھی گئی ہیں کیونکہ ان میں حضرت موسیٰؑ کی وفات، ان کے دفن کی کیفیت اور ان کی وفات کے بعد کے کچھ حالات مذکور ہیں۔ خصوصاً سفرِ تثنیہ کے آخری حصے میں یہ بات وضاحت سے ثابت ہوتی ہے کہ یہ کتاب حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کی وفات سے کافی مدت بعد لکھی گئی ہے۔

علاوہ ازیں ان کتب میں بہت سی خرافات اور ناروا باتیں انبیاء و مرسلین سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ بعض بچگانہ باتیں بھی ہیں جو ان کے خود ساختہ اور جعلی ہونے پر گواہ ہیں نیز بعض تاریخی شواہد بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ اصلی تورات غائب ہو گئی اور پھر حضرت

موسیٰ بن عمران علیہ السلام کے پیروکاروں نے یہ کتابیں تحریر کیں[1]

(۳) انجیل کیا ہے؟ "انجیل" اصل میں یونانی لفظ ہے۔ اس کا معنی ہے "بشارت" یا "جدید تعلیم"۔ یہ اس کتاب کا نام ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ قرآن نے محل بحث آیت اور دیگر آیات جن میں حضرت عیسیٰؑ کی کتاب کا نام لیا ہے، یہ لفظ مفرد ہی استعمال ہوا ہے اور اسے خدا کی طرف سے نازل شدہ قرار دیا ہے۔ اب وہ بہت سی اناجیل جو عیسائیوں میں مروّج ہیں، وحیِ الٰہی نہیں ہیں۔ ان اناجیل میں یہ چار زیادہ مشہور ہیں:

(۱) لوقا، (۲) مرقس، (۳) متی اور (۴) یوحنا[2]

ان کے وحیِ الٰہی نہ ہونے کا خود عیسائی بھی انکار نہیں کرتے۔ موجودہ انجیلیں سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگردوں یا اُن کے شاگردوں کی ہیں اور آپ سے کافی مدت بعد لکھی گئی ہیں۔ عیسائیوں کا دعویٰ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ حضرت مسیح کے شاگردوں نے یہ اناجیل الہام الٰہی سے لکھی ہیں۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عہد جدید اور اناجیل کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے ان کے مصنّفین سے واقفیت حاصل کریں۔

عیسائیوں کی اہم ترین مذہبی کتاب عہد جدید کا مجموعہ ہے جس پر تمام عیسائی فرقے ایک آسمانی کتاب کی حیثیت سے ایمان رکھتے ہیں۔

عہد جدید کا مجموعہ عہد قدیم کے تیسرے حصّے سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ ۲۷ متفرق کتب و رسائل پر مشتمل ہے۔ یہ بالکل مختلف موضوعات کی حامل ہیں۔ ان کی ترتیب یہ ہے:

(۱) **انجیل متیٰ:** متیٰ حضرت مسیحؑ کے بارہ شاگردوں میں سے ایک تھا۔ یہ انجیل اس نے ۳۸ء میلادی میں یا بعض کے نظریے کے مطابق ۵۰ء میلادی سے لے کر ۶۰ء میلادی کے درمیان لکھی

(۲) **انجیل مرقس:** کتاب قاموس مقدس کے صفحہ ۹۲ پر ہے کہ مرقس مسیحؑ کے حواریوں میں سے نہ تھا۔ اس نے اپنی انجیل پطرس کی زیرِ نگرانی تصنیف کی۔ مرقس ۶۸ء میلادی میں قتل ہو گیا۔

(۳) **انجیل لوقا:** لوقا پولس رسول کا رفیق اور ہمسفر تھا۔ پولس نے حضرت عیسیٰ کی وفات کے ایک عرصہ بعد عیسائیت قبول کی۔ یہ آپ کے زمانے میں متعصب یہودی تھا۔ لوقا کی وفات ۷۰ء میلادی کے قریب ہوئی۔ قاموس مقدس کے مولف نے اپنی تالیف کے صفحہ ۷۷۲ پر لکھا ہے کہ انجیل لوقا کی تالیف عام خیال کے مطابق تقریباً ۶۳ء میلادی میں ہوئی۔

(۴) **انجیل یُوحنا:** یُوحنا مسیحؑ کے شاگردوں میں سے تھا اور پولس کا دوست اور ہمسفر تھا۔ مؤلف مذکور کے بقول اس کی تالیف زیادہ تر ناقدین کے نزدیک پہلی صدی کے آخری حصّے میں لکھی گئی[3]

یہ اناجیل عموماً حضرت مسیحؑ کو سولی دیے جانے اور اس کے بعد کے حوادث کے ذکر سے معمور ہیں۔ اس سے اچھی

---

[1] مزید وضاحت کے لیے: "الہدیٰ الیٰ دین المصطفیٰ" (عربی)، قاموس حیاۃ المسیح مسیحیۃ (عربی)، رہبر سعادت (فارسی) اور قرآن و [illegible]

[2] [illegible]

طرح ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب اناجیل حضرت مسیحؑ کے سالہا سال بعد لکھی گئی ہیں اور ان میں کوئی بھی کتاب آسمانی نہیں جو حضرت مسیحؑ پر نازل ہوئی ہو۔

(۵) **اعمال رسولانہ** : صدر اوّل میں حضرت عیسیٰ کے حواری اور مبلغین کے اعمال۔

(۶) **۱۴ رسالے** : مختلف افراد اور اقوام کے نام پولس کے خطوط۔

(۷) **رسالۂ یعقوب** : عہد جدید کے ستائیس کتب و رسائل میں سے یہ بیسواں رسالہ ہے۔

(۸) **پطرس کے خطوط** : یہ عہد جدید کے اکیسویں اور بائیسویں رسالے پر مشتمل ہیں۔

(۹) **یوحنا کے خطوط** : یہ تین رسالوں پر مشتمل ہیں ۲۳، ۲۴ اور ۲۵ رسالوں میں یہی خطوط ہیں۔

(۱۰) **نامہ یہودا** : یہ عہد جدید کا چھبیسواں رسالہ۔

(۱۱) **مکاشفہ یوحنا** : یہ عہد جدید کا آخری حصہ ہے۔

لہٰذا عیسائی مؤرخین کی تصریح، نیز اناجیل اور عہد جدید کی دیگر کتب و رسائل کے مطابق ان میں سے کوئی بھی آسمانی کتاب نہیں ہے۔ مزید یہ کہ یہ تمام کتب حضرت عیسیٰؑ کے بعد لکھی گئی ہیں۔ اس گفتگو سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حضرت مسیحؑ پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب درمیان میں سے اٹھ گئی ہے اور آج دستیاب نہیں ہے۔ اس کے کچھ حصے جو حضرت مسیحؑ کے شاگردوں نے اپنی اناجیل میں بیان کئے ہیں باعث تاسف ہے کہ ان میں بھی خرافات شامل ہو چکی ہیں۔

رہی بعض کی یہ بات کہ مسلمانوں کو موجودہ اناجیل اور تورات کی صحت میں شک نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ قرآن نے ان کی تصدیق کی ہے اور ان کی صحت کی گواہی دی ہے تو اس کا جواب جلد اوّل میں اس آیت کے ذیل میں آچکا ہے۔

"وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ. (بقرۃ: ۴۱)

"وانزل الفرقان"

تورات و انجیل کے ذکر کے بعد آیت کے اس حصے میں نزول قرآن کا تذکرہ ہے۔ قرآن کو فرقان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ "فرقان" لغت میں "حق کی باطل سے تمیز کا ذریعہ" کے معنی میں ہے اور ہر وہ چیز جو حق کو باطل سے ممتاز کر دے اسے فرقان کہتے ہیں اسی لیے جنگ بدر کے روز کو قرآن نے "یوم الفرقان"[۱] قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس دن ایک بے سروسامان چھوٹا سا لشکر اپنے سے کئی گنا بڑے کیل کانٹے سے لیس اور طاقتور دشمن پر کامیاب و کامران ہوا۔ اس طرح حضرت موسیٰؑ کے دس معجزات کو بھی فرقان[۲] کہا گیا ہے۔ یونہی عقل و خرد اور روشن فکری کو بھی فرقان کہا جاتا ہے[۳]۔ محل بحث آیت میں بھی قرآن کو اسی جہت سے فرقان کہا گیا ہے کہ قرآن حق کو باطل سے ممتاز کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

بعض اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے قرآن پوری آسمانی کتاب کا نام ہے جب کہ فرقان اس کی ان آیات کے مجموعے کو کہتے ہیں جن میں عملی احکام، حلال و حرام اور انفرادی و اجتماعی منصوبوں کا ذکر ہے۔[۴]

---

[۱] انفال۔ ۴۱ [۲] بقرہ۔ ۵۳ [۳] اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (انفال ۲۹) [۴] تفسیر نور الثقلین، ج ۱، ص ۲۶۰ بحوالہ اصول کافی۔

۴۔ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ○ [1]

ترجمہ

۴۔ جو لوگ آیاتِ الٰہی کے منکر ہو گئے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور خدا بدکاروں اور سرکش کافروں کو عذاب دینے کی قدرت رکھتا ہے اور وہ انتقام لینے والا ہے۔

تفسیر

اتمامِ حجت، خدا کی طرف سے آیات کے نزول اور انبیاء کے دعویٰ کی صداقت پر عقل و فطرت کی گواہی کے بعد بلاشبہ انہیں قبول کر لینا چاہیے۔ لہٰذا جو لوگ ان تمام امور کے باوجود مخالفت کرتے ہیں تو اس کا سبب ہٹ دھرمی اور سرکشی کے علاوہ کچھ نہیں اور عقل و وجدان انہیں مستحقِ عذاب قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس آیت میں منکرین آیات کو شدید اور دردناک عذاب کی تہدید کرتا ہے۔

"واللہ عزیزٌ ذوانتقام"

لغت میں "عزیز" ہر مشکل چیز کے معنی میں ہے۔ وہ زمین جسے عبور کرنا سخت مشکل ہو اسے "عزاز" کہتے ہیں۔ جو چیز کمیابی کی وجہ سے مشکل سے ملتی ہو اسے بھی "عزیز" کہتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ کوئی شخص اس پر غلبہ کی قدرت نہیں رکھتا اور ہر کوئی اس کا ارادہ کر کے رہ جاتا ہے۔

کافروں کو آگاہ کرنے کے لیے کہ یہ تہدید اور دھمکی بالکل حقیقی اور حتمی ہے اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ خدا قادر ہے اس لیے کوئی شخص اس کی دھمکیوں پر عمل درآمد کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا کیونکہ جیسے وہ رحیم اور مہربان ہے جو لوگ رحمت کے قابل نہیں ان کے لیے اس کے پاس عذابِ شدید ہے اور ان کے لیے وہ صاحبِ انتقام ہے۔

آج کی اصطلاح میں "انتقام" زیادہ تر ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے جہاں لوگ خلاف ورزیوں کے مقابلے میں معاف نہیں کرتے یا دوسرے اشتباہات کی بناء پر ویسا ہی بدلہ لیتے ہیں اور درگزر کرنے کو درست نہیں سمجھتے۔ یہ صفت مسلماً پسندیدہ نہیں ہے کیونکہ بہت سے مقامات پر ویسا ہی بدلہ لینے کی بجائے انسان کو عفو و درگزر کا راستہ اختیار کرنا چاہیے لیکن حقیقت میں انتقام لغوی طور پر اس معنی میں نہیں ہے بلکہ گناہگار کو سزا دینے کے معنی میں ہے اور مسلّم ہے کہ خود سرستمگروں اور گناہگاروں کو سزا دینا نہ صرف پسندیدہ کام ہے بلکہ ان سے صرفِ نظر کرنا عدالت و حکمت کے

---

[1] آیت نمبر ۴ کا ابتدائی حصہ پہلی آیات کے ضمن میں ذکر ہو چکا ہے۔

خلاف ہے۔

۵ - اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝

ترجمہ

۵ - زمین و آسمان میں کوئی چیز بھی خدا پر مخفی نہیں رہتی (اس لیے اُن کی تدبیر کرنا بھی اُس کے لیے مشکل نہیں ہے)۔

تفسیر

یہ آیت درحقیقت گذشتہ آیات کے مفاہیم کی تکمیل کرتی ہے کیونکہ ہم گذشتہ آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ خدا حی و دال اور قیوم ہے۔ جہانِ ہستی کی تدبیر اور انتظام اُس کے ہاتھ میں ہے۔ مسلم ہے کہ یہ کام وسعت علم کا محتاج ہے لہذا گذشتہ آیت کے آخر میں اُس کی قدرتِ مطلقہ کی طرف اشارہ ہوا ہے اور یہ آیت اُس کے بے پایاں علم کی طرف اشارہ کرتی ہے اور کہتی ہے: زمین و آسمان کی کوئی چیز اللہ کے لیے مخفی اور مستور نہیں۔ یہی مضمون قرآن کی دیگر بہت سی آیات میں بھی آیا ہے۔

پروردگار کے وسعتِ علم کی دلیل واضح ہے کیونکہ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اس لیے کہ اس کا وجود بے پایاں و غیر محدود ہے کوئی جگہ اس سے خالی نہیں ہے لہذا اگرچہ وہ محل و مقام نہیں رکھتا ہے، تمام چیزوں پر محیط ہے۔ خدا کا یہ احاطۂ وجودی اور ہر جگہ پر اس کے حاضر ہونے کا حتمی نتیجہ یہ ہے کہ تمام چیزوں اور جگہوں کے متعلق اس کا علم کامل ہے اور وہ بھی علمِ حضوری نہ کہ علمِ حصولی[1]

۶ - هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

ترجمہ

۶ - وہ وہ ذات ہے جو ماؤں کے رحم میں جیسی چاہتا ہے تمہاری صورت بناتا ہے (اسلیے

---

[1] علم حضوری کا مطلب یہ ہے کہ جس کا علم ہے یا جو معلوم ہے اس کی ذات عالم کے سامنے حاضر ہو لیکن علم حصولی میں معلوم کی شکل و صورت اور نقش و نگار عالم کے پاس حاضر ہوتے ہیں۔ مثلاً اپنی ذات کے متعلق ہمارا علم علم حضوری ہے کیونکہ ہماری ذات خود ہمارے سامنے حاضر ہے لیکن باقی موجودات کے بارے میں ہمارا علم علم حصولی ہے کیونکہ ہمارے سامنے ذہن میں فقط نقش و نگار اور شکل و صورت ہی حاضر ہے۔

اُس توانا اور حکیم خدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔

تفسیر

اس آیت میں خدا کی قدرت، دانائی اور حکمت کا شاہکار بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شکم مادر میں انسان کی صورت بناتا ہے۔ واقعاً یہ امر تعجب خیز اور حیرت انگیز ہے کہ رحم کے اندر خدا انسان کے مختلف خدوخال بناتا ہے، طرح طرح کی استعداد پیدا کرتا ہے، کئی قسم کی صفات عطا کرتا ہے اور جبلت و سرشت کی تشکیل کرتا ہے۔

جنین کے مراحل — تخلیق کا شاہکار

علم جنین شناسی کی ارتقاء نے آج کی دُنیا میں اس آیت کے مفہوم کی عظمت کو بہت اجاگر کر دیا ہے۔ ابتداء میں جنین ایک خلیے (CELL) پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی کوئی شکل و صورت ہوتی ہے نہ اعضا و جوارح۔ اُس میں کوئی طاقت و توانائی بھی نہیں ہوتی۔ پھر وہ عجیب سُرعت سے رحم کے مخفی خانے میں ہر روز نئی شکل اور نیا نقش و نگار اپناتا ہے۔ جیسے نقش و نگار کے ماہرین اس کے پاس بیٹھے ہیں اور شب و روز اس پر کام کر رہے ہیں اور اس ناچیز ذرے سے تھوڑے ہی عرصے میں ایک انسان بنا ڈالتے ہیں۔ وہ انسان جس کا ظاہر بہت ہی آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے اور اس کے وجود کے اندر صاف ستھرے، پیچیدہ دقیق اور حیرت انگیز کارخانے نظر آنے لگتے ہیں۔ اب اگر مراحل جنین کی فلم لی جائے (جیسا کہ لی بھی گئی ہے) اور انسان کی آنکھوں کے سامنے یہ مناظر یکے بعد دیگرے گزرتے رہیں تو انسان کو عظمتِ خلقت اور قدرتِ خالق سے ایک نئی آشنائی ہوگی اور وہ بے اختیار کہہ اُٹھے گا۔

؎ زیبندهٔ ستائش، آن آفریدگاری است

کارد چنین دل آویز، نقشی زماء و طینی

وہ خالق لائق تعریف ہے کہ جو ایسا دلآویز نقش پانی اور مٹی سے بنا لایا ہے۔

اور تعجب کی بات ہے کہ یہ تمام نقش و نگار پانی پر ہیں جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس پر نقش و نگار نہیں ہو سکتے!

؏ کہ کردہ است در آب صورت گری؟

یہ کون ہے کہ جس نے پانی پر صورتیں بنائی ہیں؟

یہ امر قابل توجہ ہے کہ انعقادِ نطفہ کے بعد جب جنین اپنی پہلی شکل اختیار کر لیتا ہے تو تیزی سے تقسیم و افزائش کے عمل سے گزرتا ہے اور پھر شہتوت کے ایک پھل کی طرح ہو جاتا ہے جس کے چھوٹے چھوٹے دانے ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں۔ اُسے مورولا کہتے ہیں۔ عین اس پیش رفت کے موقع پر خون کا ایک لوتھڑا جسے جفت کہتے ہیں اس کے قریب ارتقائی حالت میں ہوتا ہے۔ ایک طرف سے جفت دو شریانوں اور ایک ورید کے ذریعے ماں کے دل سے ملا ہوتا ہے اور دوسری طرف بند ناف کے ذریعے جنین سے مربوط ہوتا ہے اور جنین خونِ جفت سے غذا حاصل کرتا ہے کیونکہ غذائی مواد خونِ جفت

میں موجود ہوتا ہے، غذا ملنے، ارتقائی سفر طے کرنے اور خلیوں کا باہر کی طرف رُخ کرنے سے مرولا کا اندرونی حصّہ آہستہ آہستہ خالی ہو جاتا ہے جسے بلاسٹولا کہتے ہیں۔ زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ بلاسٹولا کے خلیوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے اب بلاسٹولا دو تہوں والے تھیلے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر وہ اپنے اندر کی طرف سکڑنا شروع کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں بچہ دو حصّوں یعنی سینہ اور شکم میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اس مرحلے تک تمام خلیے ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں اور ظاہراً ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس مرحلے کے بعد جنین کی صورت بننے لگتی ہے اور اس کے اجزاء میں آئندہ انجام پانے والے کاموں کی مناسبت سے تغیر آنے لگتا ہے۔ نئے تانے بانے بننے لگتے ہیں اور نئی مشینیں حرکت میں آجاتی ہیں اور خلیوں کا ایک ایک گروپ بن کر کسی ایک مشین کو اپنے ذمے لے لیتا ہے مثلاً اعصاب کی مشین، گردشِ خون اور معدے کا عمل وغیرہ اس کے نتیجے میں جنین رحم کے مخفی خانے میں ایک موزوں انسان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

تکاملِ جنین اور اس کے مختلف مراحل کی تفصیل انشاء اللہ سورہ مومنون کی آیت ۱۲ کے ذیل میں پیش کی جائے گی۔

ابتدائے سورہ میں جو شانِ نزول بیان کی گئی ہے اُسے نگاہ میں رکھیں تو اس آیت کا مقصد واضح ہو جاتا ہے اس میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش اور عیسائیوں کے عقائد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب خود عیسائی قبول کرتے ہیں کہ حضرت مسیح شکمِ مادر میں پروان چڑھے اور انہوں نے خود اپنے تئیں پیدا نہیں کیا لہٰذا وہ کسی پیدا کرنے والے کی مخلوق ہیں کہ جس نے عالمِ رحم میں اس طرح سے ان کی ہیئت و صورت بنائی ہے۔ اس لیے کیسے ممکن ہے کہ حضرت مسیح خدا ہوں۔

"لا الٰہ الا ھو العزیز الحکیم"

اس جملے میں تاکید کی گئی ہے کہ حقیقی معبود صرف خدائے قادر و حکیم ہے جو نہ صرف رحمِ مادر میں پانی کے قطرے پر خوبصورت اور نئی نئی شکلیں بناتا ہے بلکہ اس کی قدرت و حکمت پوری کائنات پر محیط ہے اس لیے حضرت مسیح جیسی مخلوق کو کس طرح معبود قرار دیا جا سکتا ہے وہ مخلوق کہ جو اپنے سارے وجود اور ہستی میں اور تمام مراحل میں اس کی قدرت و حکمت کی محتاج ہے۔

۷۔ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ؔ

وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

ترجمہ

۷۔ وہ ذات وہ ہے کہ جس نے تم پر کتاب نازل کی جس کی بعض آیات محکم (صریح اور واضح) ہیں جو اس کتاب کی بنیاد ہیں (اور جو پیچیدگی دیگر آیات میں نظر آئے وہ ان کی طرف رجوع کرنے سے برطرف ہو جاتی ہے) اور کچھ آیات متشابہ ہیں (یہ وہ آیات ہیں جن میں بلند سطح کے مطالب بیان کئے گئے ہیں اور کچھ دیگر پہلو بھی ہیں جن کے باعث پہلی نظر میں ان میں مختلف احتمالی معانی دکھائی دیتے ہیں لیکن محکم آیات کی تفسیر کی طرف توجہ کرنے سے یہ آیات بھی اہل نظر پر واضح ہو جاتی ہیں) لیکن جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تاکہ فتنہ انگیزی کرتے رہیں (اور لوگوں کو گمراہ کریں) اور اس کی (غلط) تفسیر کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ان کی تفسیر اللہ اور علم میں راسخ لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور یہ (راسخون فی العلم) وہی ہیں جو (فہم و ادراک رکھتے ہیں، تمام آیات قرآنی کے اسرار و رموز سے آگاہ ہیں اور الٰہی علم و دانش کے سبب) کہتے ہیں کہ ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں، سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور دانشمند لوگوں کے سوا کوئی تذکر نہیں کرتا (اور ان کے علاوہ کوئی ادراک حقیقت نہیں کر سکتا)

شان نزول

تفسیر نور الثقلین[1] میں معانی الاخبار کے حوالے سے امام باقر علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے کہ یہودیوں کے چند افراد حی بن اخطب اور اس کے بھائی کے ہمراہ پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حروف مقطعہ ال م کی بنیاد پر کہنے لگے کہ ابجد کے حساب سے الف مساوی ہے ایک کے، لام برابر ہے ۳۰ کے

[1] نور الثقلین، ج ۱، ص ۳۱۳

اور میم مساوی ہے ۴۰ کے ۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کی اُمت
کی بقاء کا زمانہ اکہتر برس سے زیادہ نہیں ہے
پیغمبر اسلامؐ نے ان کی غلط فہمی کے ازالے کے لیے فرمایا:
تم حرف "الٓمٓ" الف لام میم کا حساب
کیوں کرتے ہو ۔ کیا قرآن میں "الٓمٓصٓ" "الٓرٰ" اور
دیگر حروف مقطعہ نہیں ہیں ۔ اگر یہ حرف میری اُمت کی بقاء کی مدت
کی طرف اشارہ ہیں تو پھر سب کا حساب کیوں نہیں کرتے ہو (جبکہ
ان حروف سے تو کچھ اور مراد ہے)
بہرحال اس واقعے پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی ۔

تفسیر "فی ظلال القرآن" میں اس آیت کی ایک اور شانِ نزول بھی منقول ہے جو نتیجے کے اعتبار سے پہلی شانِ نزول ہی سے ہم آہنگ ہے اور وہ یہ ہے کہ نجران کے کچھ عیسائی پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے حضرت مسیحؑ کے بارے میں قرآنی تعبیر "کلمۃ اللہ و روحہ" کو اپنے حق میں دلیل قرار دیا ۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے عقیدۂ تثلیث اور حضرت عیسیٰؑ کے خدا ہونے کے اپنے نظریے کے لیے اس سے غلط فائدہ اٹھائیں اور ان آیات کو نظر انداز کر دیں جو پوری صراحت سے خدا کے لیے ہر قسم کے شریک اور شبیہ کی نفی کرتی ہیں ۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی ۔

تفسیر

اس آیت میں مُحکَم وَ مُتَشَابِہ آیات کا ذکر ہے اور اس میں اہل ایمان اور بے ایمان لوگوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ ان آیات سے کس طرح وابستگی اختیار کرتے ہیں ۔ آیت کے عمیق اور گہرے مطالب سے آگاہی کے لیے مندرجہ ذیل نکات کا واضح ہونا ضروری ہے :

(۱) محکم اور متشابہ آیات سے کیا مراد ہے

لفظ "مُحکَم" دراصل "احکام" سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے ممنوع قرار دینا ۔ اسی لیے پائیدار اور استوار چیزوں کو "محکم" کہتے ہیں ۔ چونکہ نابودی اور تباہی کے عوامل ان سے دور ہوتے ہیں ۔ واضح اور قطعی باتیں جو ہر مخالف احتمال کو اپنے سے دُور کر دیں بھی "مُحکَم" کہلاتی ہیں ۔ اس لیے آیات محکمات سے مراد وہ آیات ہیں جن کا مفہوم اس قدر واضح ہے کہ اُن کے معنی میں گفتگو اور بحث و تمحیص کی گنجائش نہ ہو ۔ مثلاً
"قل ھو اللہ احد"

- " لیس کمثلہ شیء "
- " اللہ خالق کل شیء "
- " للذکر مثل حظ الانثیین "

اور ایسی ہی دیگر ہزاروں آیات ہیں جو عقائد، احکام، مواعظ اور تاریخ کے بارے میں ہیں اور سب کی سب " محکمات " ہیں۔

یہ " محکمات " قرآن میں " ام الکتاب " کے نام سے موسوم ہیں یعنی یہی وہ آیات ہیں جنہیں اصل مرجع، مفسر اور دیگر آیات کی وضاحت کرنے والی کہا جاسکتا ہے۔

لفظ " متشابہ " سے دراصل ایسی چیز مراد ہے جس کے مختلف حصے ایک دوسرے سے شباہت رکھتے ہوں۔ اسی لیے وہ جملے اور کلمات جس کے معانی پیچیدہ ہوں اور بعض اوقات ان کے بارے میں مختلف احتمالات پیدا ہو جائیں " متشابہ " کہلاتے ہیں متشابہات قرآن سے ایسی ہی آیات مراد ہیں۔ یعنی وہ آیات جن کے معانی پہلی نظر میں پیچیدہ ہیں اور ابتداء میں ان میں کئی احتمالات دکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ آیات محکمات کی طرف توجہ کرنے سے ان کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

مفسرین نے " محکم " اور متشابہ کے بارے میں اگرچہ بہت سے احتمالات پیش کیے ہیں لیکن ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ان دونوں الفاظ کے اصل معانی سے بھی مطابقت رکھتا ہے اور شان نزول اور اس آیت کے ذیل میں وارد ہونے والی روایات جن میں ان کی تفسیر بیان کی گئی ہے کے بھی مطابق ہے۔ نیز خود محل بحث آیت سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔ کیونکہ مذکورہ آیت میں ہے کہ خود غرض لوگ متشابہ آیات کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں واضح ہے کہ ایسے لوگ ایسی آیات سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں جن کی پہلی نظر میں متعدد تفاسیر ہو سکتی ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ متشابہ کا وہی مفہوم ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

متشابہ آیات کے لیے ہم اُن آیات کے نمونے پیش کرتے ہیں جو صفات خدا اور معاد و قیامت کی کیفیت سے مربوط ہیں مثلاً:

- " ید اللہ فوق ایدیھم "

(خدا کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں کے اوپر ہے)

یہ قدرت خدا کے بارے میں ہے۔

- " واللہ سمیع علیم "

(خدا سننے والا اور جاننے والا ہے)

یہ علم الٰہی کی طرف اشارہ ہے۔

- " ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ " (الانبیاء : ۴۷)

(قیامت کے دن ہم عدالت کے ترازو مقرر کریں گے)

یہ اعمال کے ناپ تول کے ذریعے کے متعلق ہے۔

واضح ہے کہ خدا کا ہاتھ کسی خاص عضو کے مفہوم میں نہیں ہے یہ نہ ہی اس کا سُننا بھی کسی کان کے وسیلے سے نہیں ہے اور نہ ہی اعمال کو تولنے کے لیے اُس کے پاس کوئی ایسا ترازو ہے جس کے ہم عادی ہیں بلکہ یہ سب قدرت، علم اور اعمال کی قدر و قیمت کے مفاہیم کی طرف اشارہ ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ محکم اور متشابہ قرآن میں ایک اور مفہوم کے لیے بھی استعمال ہوئے ہیں۔ سورہ ہود کے شروع میں ہے:

"کتٰب احکمت اٰیٰتہ"

اس آیت میں تمام آیات قرآن کو محکم کہا گیا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ آیات قرآن ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور باہم پیوستہ ہیں۔

سورہ الزمر آیہ ۲۳ میں ہے:

"کتٰبا متشابھا"

یعنی —— وہ کتاب کہ جس کی تمام آیات متشابہ ہیں

یہاں متشابہ سے مراد یہ ہے کہ اس کتاب کی آیات درستی اور حقیقت کے لحاظ سے ایک دوسرے کی مانند ہیں۔

محکم اور متشابہ کے بارے میں جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی جویائے حقیقت کے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ وہ اپنے پروردگار کے ارشادات کو سمجھنے کے لیے تمام آیات کو ایک جگہ پر رکھے اور اگر کچھ آیات کے ظاہر میں پہلی نظر میں کوئی ابہام یا پیچیدگی دکھائی دے تو دوسری آیات کو سامنے رکھتے ہوئے اسے دور کرے اور اس طرح ان آیات کی حقیقت تک پہنچے۔ آیات محکمات درحقیقت بڑی شاہراہوں کی مثل ہیں اور متشابہات ذیلی اور چھوٹے راستوں کی مانند ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر انسان کبھی چھوٹے اور ذیلی راستوں کے بارے میں حیران و سرگرداں ہو تو وہ کوشش کرتا ہے کہ وہ پہلے شاہراہ تک پہنچ جائے اور وہاں سے اپنے راستے کا پھر سے صحیح طریقے سے تعین کرے۔

محکمات کو ام الکتاب قرار دینا بھی اس حقیقت کی تائید کرتا ہے کیونکہ لفظ "ام" لغت میں ہر چیز کی اصل اور اساس کے معنی میں ہے ماں کو ام کہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ خاندان کی جڑ ہوتی ہے اور حوادث و مشکلات میں وہی اولاد کی پناہ گاہ بھی ہوتی ہے۔ اس لیے محکمات دیگر آیات کے لیے اساس، جڑ اور ماں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۲۔ قرآن کی کچھ آیات متشابہ کیوں ہیں

اس کے باوجود کہ قرآن نور، روشنی اور حق ہے، ایک واضح کلام ہے اور تمام لوگوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے

اس میں متشابہ آیات کیوں ہیں اور بعض آیات کے مفاہیم ایسے پیچیدہ کیوں ہیں کہ فتنہ انگیز لوگوں کے لیے غلط مقاصد کے حصول کا سبب بنتے ہیں۔

یہ موضوع بہت اہمیت کا حامل ہے اور گہرے غور و فکر کا مقتضی ہے۔ ہو سکتا ہے مجموعی طور پر مندرجہ ذیل وجوہات قرآن میں آیات متشابہات کا سبب اور راز ہوں۔

(۱) انسانوں کی گفتگو میں استعمال ہونے والے الفاظ اور جملے روزمرہ کی ضروریات کے ماتحت ہوتے ہیں اس لیے جب ہم انسان کی محدود مادی زندگی کے دائرے سے باہر نکلیں اور مثلاً خالق کائنات کے بارے میں گفتگو کریں جو ہر جہت سے لامحدود ہے تو ہمیں نظر آئے گا کہ ہمارے الفاظ ان معانی کے لیے سانچے اور قالب کا کام نہیں دیتے تاہم ہم وہی الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہیں اگرچہ یہ الفاظ مختلف پہلوؤں سے ناقابل اور نارسا ہیں۔ الفاظ کی یہی نارسائی متشابہاتِ قرآن کے اہم حصے کا سرچشمہ ہے۔ یہ آیات اسی مفہوم کے ادراک کے لیے نمونہ ہیں

"ید اللّٰہ فوق ایدیھم"

"الرحمٰن علی العرش استوٰی"

"الٰی ربھا ناظرۃ"

ان آیات کی تفسیر اپنے مقام پر آئے گی۔ سمیع و بصیر جیسی تعبیرات بھی اسی قبیل سے ہیں۔ ان کی تفسیر آیات محکمات کی طرف رجوع کرنے سے اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

(۲) بہت سے حقائق دوسرے جہاں یا عالم ماورائے طبیعت سے مربوط ہیں۔ یہ حقائق ہماری فکر و نظر کے افق سے دور ہیں۔ زمان و مکان کی قید میں محدود ہونے کی وجہ سے ہم ان کی گہرائی کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہمارے افکار کی نارسائی اور ان معانی کے افق کی بلندی بعض آیات کے متشابہ ہونے کا دوسرا سبب ہے۔ اس کی مثال بعض وہ آیات ہیں جن کا تعلق قیامت وغیرہ سے ہے۔

یہ بالکل اس طرح ہے جیسے کوئی شخص کسی بچے کو عالم جنین میں اس دنیا کے حالات بتانا چاہے، اگر بات نہ کرے تو بڑی کوتاہی ہے اور اگر کچھ کہے تو مجبوراً مطالب کو سربستہ اور اجمالی صورت میں ادا کرے گا۔ کیونکہ سننے والا اس حالت میں زیادہ استعداد نہیں رکھتا۔

(۳) قرآن میں متشابہات کا ایک مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی فکر و نظر کو زیادہ سے زیادہ کام میں لایا جائے اور فکری تحریک پیدا ہو۔ ہمیشہ پیچیدہ فکری مسائل مفکرین کے افکار کی تقویت کے لیے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ وہ مسائل کے حل کے لیے زیادہ سے زیادہ تفکر و تدبر اور تحقیق و جستجو سے کام لے سکیں۔

(۴) ایک اور نکتہ جو قرآن میں متشابہات کی موجودگی کے لیے ہے اور اہل بیت علیہم السلام کی روایات بھی جس کی تائید کرتی ہیں یہ ہے کہ قرآن میں ایسی آیات خدائی پیشواؤں، پیغمبر اکرمؐ اور ان کے اوصیاء کی شدید احتیاج کو واضح کرتی ہیں اور یہ اس طرح کہ احتیاج علمی لوگوں کو مجبور کرے گی کہ وہ ان کی جستجو اور تلاش کریں اور عملی طور پر ان کی رہبری تسلیم کریں۔ اس

طرح دیگر علوم اور دیگر مشکلات میں بھی انہی سے راہنمائی حاصل کریں ۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے درسی کتب میں کچھ مسائل کی تشریح معلم اور اُستاد کے ذمے کی جاتی ہے تاکہ طالب علم اُستاد سے اپنا رابطہ منقطع نہ کرے اور یوں اس ضرورت کے ماتحت تمام چیزوں میں اس کے افکار سے راہنمائی حاصل کرے ۔ درحقیقت ایسی روایات قرآن کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ کی مشہور وصیت کا مصداق ہیں ؛

"انی تارك فیكم الثقلین كتاب الله واهل بیتی وانهما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض"

• یعنی ۔ میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ؛ خدا کی کتاب اور اپنے اہل بیت اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ قیامت کے دن کوثر کے کنارے مجھ تک پہنچیں گے ۔ [۱]

۲ ۔ تاویل کسے کہتے ہیں

"تاویل" کے معنی کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن حقیقت کے نزدیک یہ ہے کہ "تاویل" کا اصلی لغوی معنی ہے "کسی چیز کو پلٹانا" اس لیے ہر کام یا بات کو اس کے آخری مقصد اور ہدف تک پہنچا دینے کو "تاویل" کہتے ہیں ۔ مثلاً اگر کوئی شخص کچھ اقدام کرتا ہے جس کا اصلی ہدف واضح نہیں ہے لیکن آخر میں اسے معین کر دے تو اس چیز کو "تاویل" کہیں گے جیسے حضرت موسیٰؑ اور ایک عالم کے واقعے میں ہے کہ عالم نے سفر کے دوران میں ایسے کام انجام دیے جن کا مقصد واضح نہیں تھا (مثلاً کشتی میں سوراخ کرنا) اس پر حضرت موسیٰؑ پریشان ہوئے لیکن جب اس عالم نے اختتامِ سفر پر اپنا مقصد بیان کیا اور کہا میرا مقصد تو کشتی کو غاصب و ظالم بادشاہ سے نجات دلانا تھا اور مزید کہا ۔

"ذلك تاويل ما لم تسطع عليه صبرًا."

یہی وہ مقصد تھا جس پر تم صبر نہ کرسکے (الکہف ۔ ۸۲)

یونہی اگر کوئی شخص کوئی خواب دیکھے جس کا نتیجہ واضح نہ ہو ۔ پھر کسی سے پوچھنے پر یا کوئی منظر دیکھنے سے اسے اس خواب کی تعبیر معلوم ہو جائے تو اسے تاویل کہا جائے گا ۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے جو مشہور خواب دیکھا جب وہ خارجی دُنیا میں عمل میں آیا اور اصطلاح کے مطابق انتہاء کی طرف پلٹ آیا تو آپؑ نے فرمایا ۔

"هذا تاويل رؤياى من قبل"

یہ اُس خواب کی انتہا اور نتیجہ ہے جو میں نے دیکھا تھا (یوسف ۱۰۰)

اس طرح جب کوئی انسان ایسی بات کہے کہ جس میں مخصوص مفاہیم و اسرار مخفی ہوں تو اس کے حقیقی مقاصد کو "تاویل" کہیں گے ۔

محل بحث آیت میں بھی "تاویل" سے یہی مراد ہے یعنی قرآن میں کچھ ایسی آیات ہیں جن کے معانی و اسرار

---

[۱] "مستدرک حاکم" جلد سوم ، صفحہ ۴۸

کبرے ہیں البتہ منحرف افکار اور فاسد اغراض رکھنے والے لوگ اس کی غلط تفسیر اور معنی گھڑ لیتے ہیں اور اپنے آپ کو یا دوسروں کو غافل رکھنے کے لیے اس سے کام لیتے ہیں۔

اس بنا پر " ابتغاء تأویلہ " سے مراد یہ ہے کہ وہ آیت کی " تأویل " اس کی اصل صورت کے علاوہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں ابتغاء تأویلہ علی خلاف الحق "

جیسا کہ ہم آیت کی شان نزول میں پڑھ چکے ہیں کہ کچھ یہودیوں نے قرآن کے حروف مقطعات سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کا معنی یہ کر دیا کہ دین اسلام کی مدت کم ہے۔

اس طرح عیسائیوں نے " رُوحٌ مِنْهُ " سے حضرت عیسیٰ کی الوہیت پر استدلال شروع کر دیا۔

یہ تمام چیزیں "تأویل بغیر حق" اور آیت کو غیر واقعی اور غلط ہدف و مقصد کی طرف پھیرنے کے مفہوم میں داخل ہیں۔

۴۔ "راسخون فی العلم" کون ہیں

یہ تعبیر قرآن مجید میں دو مقامات پر استعمال ہوئی ہے۔ ایک تو اسی مقام پر اور دوسرا سورہ نساء آیہ ۱۶۲ میں جہاں فرمایا گیا ہے۔

" لکن الراسخون فی العلم منھم والمؤمنون
یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک "

" ہم میں سے راسخ اہل کتاب میں سے اور اہل ایمان (بھی) اس پر ایمان رکھتے ہیں جو کچھ تم پر نازل ہوا اور جو کچھ تم سے پہلے نازل ہوا ہے۔"

اس لفظ کے لغوی معنی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو علم و دانش میں ثابت قدم اور صاحب نظر ہیں۔

البتہ اس لفظ کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں تمام علماء اور مفکرین شامل ہیں تاہم ان میں کچھ ایسے ممتاز افراد ہیں جن میں ایک مخصوص درخشندگی اور روشنی ہوتی ہے جو طبعاً اس لفظ کے درجہ اول کے مصادیق قرار پاتے ہیں اور جب کبھی یہ لفظ ادا ہو، سب سے پہلے نگاہیں انہی کی طرف اٹھتی ہیں۔

یہ جو کئی ایک روایات میں " راسخون فی العلم " سے پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ ہدیٰ علیہم السلام مراد لیے گئے ہیں تو اس کی یہی وجہ ہے۔

ہم کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ قرآن کی آیات اور الفاظ وسیع مفاہیم رکھتے ہیں۔ بہر حال اس کے مصادیق میں سب سے پہلے اس مفہوم کے غیر معمولی اور فوق العادہ قابلیت رکھنے والے افراد ہی آتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات اس کی تفسیر میں فقط انہی کا نام آتا ہے۔ اصول کافی میں امام باقرؑ یا امام صادقؑ سے روایت ہے۔ فرمایا :

رسول خدا راسخون فی العلم میں سب سے بلند تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی آپؐ پر نازل فرمایا آپ اس کی تاویل و تنزیل سے واقف تھے۔ خدا نے آپ پر کوئی ایسی چیز نازل نہیں کی جس کی تاویل آپ کو نہ سکھائی ہو اور آپ کے اوصیاء بھی قرآن کی سب تاویل و تنزیل کو جانتے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سی اور روایات بھی اصول کافی اور دیگر کتب احادیث میں موجود ہیں جنہیں

نورالثقلین اور البرھان کے مولفین نے اس آیہ کے ذیل میں جمع کیا ہے اور جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ راسخون فی العلم سے جہاں جہاں پیغمبر اسلامؐ اور ائمہ ھدیٰؑ مراد لیے گئے ہیں وہاں اس کے وسیع مفہوم کی نفی نہیں ہوجاتی ۔ اسی لیے ابن عباس سے منقول ہے وہ کہتے ہیں:

میں بھی راسخون فی العلم میں سے ہوں۔

البتہ ہر شخص قرآنی اسرار و تاویل سے اپنے علم کے مطابق ہی آگاہ ہوگا اور جن کے علم کا سرچشمہ پروردگار کا علم بے کنار ہے یقیناً وہ تمام اسرار قرآن اور تمام تر تاویلات قرآن سے آشنا ہیں جب کہ ان کے علاوہ دوسرے لوگ تو کچھ اسرار سے واقف ہیں۔

یہاں مفسرین اور علماء ایک اہم بحث کرتے ہیں وہ یہ کہ کیا "راسخون فی العلم" ایک مستقل جملے کی ابتداء ہے یا عطف سے "اِلَّا اللّٰہ" سے منسلک ہے۔

دوسرے لفظوں میں: کیا آیت کا معنی یہ ہے کہ:

> قرآن کی تاویل خدا اور راسخون فی العلم کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ....

یا اس کا مفہوم یہ ہے کہ

> قرآن کی تاویل صرف اللہ ہی جانتا ہے، باقی رہے راسخون فی العلم تو وہ کہتے ہیں اگرچہ آیاتِ متشابہ کی تاویل ہمیں معلوم نہیں تاہم ہم ان کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں اور وہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں۔

ان دونوں نظریات کے طرفداروں نے اپنے اپنے موقف کی تائید کے لیے شواہد پیش کئے ہیں لیکن جو چیز آیت میں موجود قرائن اور مشہور روایات سے ہم آہنگ ہے یہ ہے کہ "الراسخون فی العلم" کا عطف "اللّٰہ" پر ہے اور یہ آپس میں منسلک ایک ہی جملہ ہے کیونکہ:

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ بہت بعید ہے کہ قرآن میں کچھ ایسی آیات بھی ہوں کہ جن کے اسرار خدا تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہ جانتا ہو۔ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ کیا یہ آیات لوگوں کی تربیت اور ہدایت کے لیے نازل نہیں ہوئیں۔ اگر اسی لیے نازل ہوئی ہیں تو پھر کیسے ممکن ہے کہ خود پیغمبر اکرمؐ کہ جن پر قرآن نازل ہوا ہے وہ ان کے معانی اور تاویل سے بے خبر ہوں کیونکہ یہ تو بالکل اسی طرح ہوگا کہ ایک شخص کوئی ایسی کتاب لکھے کہ جس کے بعض جملوں کا مفہوم خود اس کے علاوہ کوئی نہ سمجھ سکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مرحوم طبرسی مجمع البیان میں کہتے ہیں:

> کبھی نہیں دیکھا کہ مفسرین اور علماء اسلام کسی آیت کی تفسیر پر بحث کرنے میں احتراز کریں اور یہ کہیں کہ یہ آیت ان آیات میں سے ہے کہ جس کے حقیقی معنی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا بلکہ سبھی ہمیشہ قرآن کے اسرار و معانی معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر مقصد یہ ہے کہ راسخون فی العلم جس چیز کو نہیں جانتے اس کے سامنے سر تسلیم خم

کرتے ہیں تو پھر زیادہ مناسب یہ تھا کہ کہا جاتا کہ ایمان میں راسخ وہ لوگ ہیں کیونکہ علم میں راسخ ہونا تو تاویل قرآن سے آگاہی سے مناسبت رکھتا ہے نہ کہ عدم آگاہی اور سرِ تسلیم خم نہ کرنے سے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ بہت سی روایات جو اس آیت کی تفسیر میں منقول ہیں سب کی سب تائید کرتی ہیں کہ "راسخون فی العلم" وہ لوگ ہیں جو آیات قرآنی کی تاویل کو جانتے ہیں۔

ان دلائل کے پیشِ نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ عطف لفظ "اللہ" پر ہے اور "والراسخون فی العلم" نئے جملے کا آغاز نہیں ہے۔

جو چیز باقی رہ جاتی ہے وہ نہج البلاغہ کے خطبہ "اشباح"[1] کا ایک جملہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ راسخون فی العلم آیات کی تاویل سے ناواقف ہیں اور وہ اپنے عجز و ناتوانی کا اعتراف کرتے ہیں:

"واعلم ان الراسخین فی العلم هم الذین اغناهم عن اقتحام السدد المضروبة دون الغیوب الاقرار بجملة ما جهلوا تفسیره من الغیب المحجوب"

اور جان لو کہ راسخین فی العلم وہ ہیں جو اسرار غیبی کے مقابلے میں اعتراف عجز کرتے ہیں اور وہ ان اسرار کی تفسیر سے عاجز ہیں اسی عجز نے انہیں اس سلسلے میں کاوش و کوشش سے بے نیاز کر دیا ہے۔[2]

یہ جملہ بعض ان روایات سے متفق معلوم نہیں ہوتا جو خود حضرت امیرالمومنینؑ سے ہی منقول ہیں اور جن میں آپؑ نے "راسخون فی العلم" کا عطف "اللہ" پر قرار دیا ہے اور انہیں قرآنی تاویل سے آگاہ بتایا ہے اور پھر مندرجہ بالا دلائل پر بھی یہ منطبق نہیں ہے[3] لہٰذا ضروری ہے کہ خطبہ اشباح کے اس جملے کی ایسی توجیہ کی جائے جو ہمارے پاس موجود دیگر مدارک سے اختلاف نہ رکھتی ہو سکے۔

آیت کی تفسیر کے سلسلے میں نتیجہ کلام

زیرِ بحث آیت کی تفسیر کے ضمن میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی آیات دو قسم کی ہیں:

۱۔ ایک وہ کہ جن کا مفہوم اس طرح واضح اور روشن ہے کہ ان سے کسی قسم کے انکار، ان کی توجیہ اور ان سے غلط فائدہ اٹھانے کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔ انہیں **محکمات** کہتے ہیں۔

دوسری قسم کی آیات وہ ہیں جن کے مطالب کی سطح بلند ہے یا ان میں ایسے عوالم کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۔

[2] تفسیر نور الثقلین ج ۱ ۔ [illegible] [3] نہج البلاغہ کا یہ جملہ در اصل خود راسخون فی العلم کے علم کی عظمت پر دلالت کرتا ہے کہ وہ [illegible] [illegible] (مترجم)

کہ جو ہماری دسترس سے باہر ہیں مثلاً عالمِ غیب، جہانِ حشر و نشر اور صفاتِ خدا وغیرہ ۔ ان آیات کا حقیقی معنی، اسرار اور ان کی کنہ حقیقت کا ادراک مخصوص علمی سرمائے کا محتاج ہے، انہیں **متشابہات** کہتے ہیں۔

منحرف اور کج رو افراد ہمیشہ کوشش کرتے ہیں کہ آیات متشابہات سے سوء مقصد حاصل کریں ان کی خلافِ حق تفسیر کریں تاکہ لوگوں میں فتنہ انگیزی کریں اور انہیں حق سے گمراہ کریں۔ لیکن اللہ تعالیٰ اور راسخین فی العلم ان آیات کے اسرار جانتے ہیں اور لوگوں کے سامنے ان کی تشریح کرتے ہیں۔ وہ اپنے وسیع علم کی روشنی میں آیات متشابہات کا آیات محکمات کی طرح ادراک کرتے ہیں اور اس بناء پر سب کے سب سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تمام آیات ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں کیونکہ سب آیات چاہے محکم ہوں یا متشابہ ان کے علم و دانش کے سامنے واضح اور روشن ہیں۔

"یقولون اٰمنا بہ کل من عند ربنا"

علم میں راسخ ہونا سبب بنتا ہے کہ انسان اسرارِ قرآن سے زیادہ سے زیادہ آگاہ ہوتا ہے البتہ جو علم و دانش کے لحاظ سے پہلے درجے پر فائز ہیں، یعنی پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ ہدیٰ علیہم السلام تو وہ تمام اسرار سے آگاہ ہیں جبکہ باقی لوگ اپنے علم و فضل کی مقدار کے برابر ان میں سے کچھ چیزیں جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء ہمیشہ خدا کے بھیجے ہوئے معلمین سے اسرارِ قرآن حاصل کرنے کے درپے رہتے ہیں۔

"وما یذکر الا اولوا الالباب"

یہ جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان حقائق کو صرف صاحبانِ عقل و خرد اور اہلِ فکر و نظر ہی جانتے ہیں۔ یہی لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں محکم و متشابہ آیات کیوں موجود ہیں اور یہی لوگ سمجھتے ہیں کہ آیات متشابہ کو محکم آیات کے سامنے رکھ کر معانی معلوم کئے جاتے ہیں۔ اسی لیے امام علی بن موسیٰ علیہما السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

"من رد متشابہ القراٰن الی محکمہ ھدی الی صراط مستقیم"

جو شخص آیاتِ متشابہ کو آیاتِ محکم کی طرف پلٹاتا ہے اس نے سیدھے راستے کی طرف ہدایت حاصل کی ہے [1]

۸۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ○

۹۔ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ○

---

[1] تفسیر صافی ۔ آیہ محلِ بحث کے ذیل میں

ترجمہ

۸۔ (راسخین فی العلم کہتے ہیں) پالنے والے ہمارے دلوں کو سیدھے رہنے کی ہدایت کے بعد منحرف نہ کر دے اور اپنی طرف سے ہم پر رحمت فرما کیونکہ تو ہی بخشنے والا ہے۔

۹۔ اسے ہمارے پروردگار! تو لوگوں کو اس دن جمع کرے گا جس میں کوئی شک و تردد نہیں ہے کیونکہ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا (ہم تجھ پر، تیری رحمت بے پایاں پر اور حشر و نشر اور قیامت کے وعدے پر ایمان رکھتے ہیں)۔

تفسیر

ممکن ہے کہ آیات متشابہ اور اُن کے حقیقی اسرار و رموز لوگوں کے لیے مقام لغزش ہو جائیں لہذا اہل ایمان، راسخین فی العلم اور صاحبانِ فکر و نظر آیات کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اپنے علمی سرمائے سے کام لینے کے علاوہ اپنے خدا کی پناہ اور سہارا بھی حاصل کرتے ہیں اور یہ دونوں آیات جو راسخون فی العلم کی زبان سے نقل ہوئی ہیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ علم میں راسخ، آگاہ اور فکر و نظر کے حامل لوگ ہمیشہ اپنے قلب و روح کی حفاظت کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ ٹیڑھے رستوں کی طرف مائل نہ ہوں اور وہ اس راہ میں خدا سے مدد طلب کرتے ہیں کیونکہ بہت سے لوگ علمی غرور و تکبر کے باعث شکست سے ہمکنار ہو گئے ہیں اور کج راستوں میں سرگرداں ہیں کیونکہ وہ خالق کی عظمت، اپنی خلقت اور اپنی کم علمی کو فراموش کر بیٹھے ہیں اور اپنے پروردگار کی ہدایت سے محروم ہو گئے ہیں۔ لیکن اہل ایمان اور صاحبانِ فکر و نظر کہتے ہیں "ربنا لا تزغ قلوبنا......"

علاوہ ازیں افکار و نظریات کو کنٹرول کرنے کے لیے معاد اور قیامت کے اعتقاد سے بڑھ کر کوئی چیز مؤثر نہیں، راسخین فی العلم مبداء و معاد کے عقیدے کے ذریعے اپنے افکار کو اعتدال پر رکھتے ہیں۔ وہ حد سے گزرے ہوئے رجحانات اور جذبات سے اجتناب کرتے ہیں کیونکہ یہ لغزش کا سبب بنتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک بلا مزاحم فکر و نظر کے ذریعے صحیح راستے کو دیکھتے ہیں اور اس پر چلتے ہیں۔

ہاں ایسے ہی افرادِ آیاتِ الٰہی سے مکمل طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔

• درحقیقت پہلی آیت مبداء کے بارے میں ان کے کامل ایمان کی طرف اشارہ ہے اور دوسری آیت معاد کے بارے میں اُن کے راسخ عقیدے کا اظہار ہے۔

ترجمہ

۱۲ — جو کافر ہو گئے ہیں ان سے کہہ دیجئے: جنگ احد کی وقتی فتح پر خوش نہ ہو جاؤ عنقریب تم مغلوب ہو جاؤ گے (اور پھر آخرت میں) جہنم کی طرف محشور ہو گے اور وہ کس قدر بُری جگہ ہے۔

شانِ نزول

جنگ بدر اور اس میں مسلمانوں کی کامیابی کے بعد بعض یہودی کہنے لگے: جس رسول امّی کی تعریف و توصیف ہم نے اپنی مذہبی کتاب تورات میں پڑھی ہے کہ وہ کسی جنگ میں مغلوب نہیں ہوگا وہ یہی پیغمبر ہے۔

اس پر بعض دوسرے کہنے لگے جلدی نہ کرو، دوسری جنگ اور کوئی اور واقعہ پیش آ لینے دو، پھر فیصلہ کرنا۔

جب جنگ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو وہ کہنے لگے، بخدا یہ وہ پیغمبر نہیں جس کی بشارت ہماری کتب میں دی گئی ہے۔

اس واقعے کے بعد صرف یہی نہیں کہ مسلمان نہ ہوئے بلکہ ان کے رویے میں مزید سختی آگئی اور وہ مسلمانوں سے اور دور ہو گئے یہاں تک کہ انہوں نے رسول خدا سے جو لڑائی جھگڑا نہ کرنے کا معاہدہ کر رکھا تھا اُسے بھی معینہ مدت سے پہلے توڑ دیا۔ کعب بن اشرف کی ہمراہی میں ان کے ساٹھ سوار مکہ پہنچے اور اسلام کے خلاف جنگ کیلئے مشرکین سے معاہدہ کر کے مدینہ واپس آگئے۔

اس دوران میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں انہیں دندان شکن جواب دیا گیا اور کہا گیا کہ نتیجہ تم کام کے انجام پر اخذ کرنا اور یہ جان لو کہ تم سب مغلوب ہو جاؤ گے۔

تفسیر

ایک صریح پیش گوئی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو صراحت سے بشارت دی ہے کہ وہ تمام دشمنوں پر فتح یاب ہوں گے نیز کفار سے کہا گیا ہے کہ تم اس دُنیا میں بھی شکست کھاؤ گے اور مغلوب ہو گے اور دوسرے جہاں میں بھی تمہارا انجام بہت بُرا ہوگا۔

آیت کی شان نزول کو دیکھیں تو یہ آیت جنگ احد کے بعد نازل ہوئی ہے۔ جب مسلمان ظاہری طور پر

ترجمہ

۸۔ (راسخین فی العلم کہتے ہیں) پالنے والے ہمارے دلوں کو سیدھے رستے کی ہدایت کے بعد منحرف نہ کر دے اور اپنی طرف سے ہم پر رحمت فرما کیونکہ تو ہی بخشنے والا ہے۔

۹۔ اے ہمارے پروردگار! تو لوگوں کو اس دن جمع کرے گا جس میں کوئی شک و تردد نہیں ہے کیونکہ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا (ہم تجھ پر، تیری رحمت بے پایاں پر اور حشر و نشر اور قیامت کے وعدے پر ایمان رکھتے ہیں)۔

تفسیر

ممکن ہے کہ آیات متشابہ اور ان کے حقیقی اسرار و رموز لوگوں کے لیے مقامِ لغزش ہو جائیں لہٰذا اہل ایمان، راسخین فی العلم اور صاحبانِ فکر و نظر آیات کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اپنے علمی سرمائے سے کام لینے کے علاوہ اپنے خدا کی پناہ اور سہارا بھی حاصل کرتے ہیں اور یہ دونوں آیات جو راسخون فی العلم کی زبان سے نقل ہوئی ہیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ علم میں راسخ، آگاہ اور فکر و نظر کے حامل لوگ ہمیشہ اپنے قلب و روح کی حفاظت کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ ٹیڑھے رستوں کی طرف مائل نہ ہوں اور وہ اس راہ میں خدا سے مدد طلب کرتے ہیں کیونکہ بہت سے لوگ علمی غرور و تکبر کے باعث شکست سے ہمکنار ہو گئے ہیں اور کج راستوں میں سرگرداں ہیں کیونکہ وہ خالق کی عظمت، اپنی خلقت اور اپنی کم علمی کو فراموش کر بیٹھے ہیں اور اپنے پروردگار کی ہدایت سے محروم ہو گئے ہیں۔ لیکن اہل ایمان اور صاحبانِ فکر و نظر کہتے ہیں "ربنا لا تزغ قلوبنا......"

علاوہ ازیں افکار و نظریات کو کنٹرول کرنے کے لیے معاد اور قیامت کے اعتقاد سے بڑھ کر کوئی چیز مؤثر نہیں، راسخین فی العلم مبدأ و معاد کے عقیدے کے ذریعے اپنے افکار کو اعتدال پر رکھتے ہیں۔ وہ حد سے گزرے ہوئے رجحانات اور جذبات سے اجتناب کرتے ہیں کیونکہ یہ لغزش کا سبب بنتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک دستاویز... بے مزاحم فکر و نظر کے ذریعے صحیح راستے کو دیکھتے ہیں اور اس پر چلتے ہیں۔

ہاں ایسے ہی افراد آیاتِ الٰہی سے مکمل طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔

درحقیقت پہلی آیت مبدأ کے بارے میں ان کے کامل ایمان کی طرف اشارہ ہے اور دوسری آیت معاد کے بارے میں ان کے راسخ عقیدے کا اظہار ہے۔

۱۰۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْھُمْ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰہِ شَیْئًا ؕ وَاُولٰٓئِکَ ھُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ○

۱۱۔ کَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ ؕ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَاَخَذَھُمُ اللّٰہُ بِذُنُوْبِھِمْ ؕ وَاللّٰہُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ○

ترجمہ

۱۰۔ جو لوگ کافر ہو گئے ہیں انہیں مال و دولت اور اولاد خدا سے بے نیاز نہیں کر سکتے (اور وہ انہیں اس کے عذاب سے نہیں چھڑا سکتے) اور وہ (جہنم کی) آگ کا ایندھن ہیں۔

۱۱۔ (انکار حقائق اور تحریف میں) ان کی عادت آل فرعون اور ان سے پہلے لوگوں کی طرح ہے، انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور خدا نے ان کے گناہوں کے باعث ان کی گرفت کی اور خدا شدید العقاب ہے۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں محکم اور متشابہ آیات کے متعلق کفار، منافقین اور مومنین کے ردعمل کی تشریح کی گئی ہے۔ اس کے بعد اب فرمایا گیا ہے: اگر ہٹ دھرم کافر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مال و دولت اور آل اولاد دوسرے جہان میں انہیں بچا سکتے ہیں تو وہ سخت اشتباہ میں ہیں۔ ممکن ہے یہ اس جہان میں وقتی طور پر کچھ حوادث کے مقابلے میں انسان کے کام آجائیں لیکن پروردگار کے مقابلے میں اس دنیا میں اور دوسرے جہان میں ان کی کوئی حیثیت نہیں لہٰذا یہ چیزیں کسی غرور اور جرأت گناہ کا باعث نہیں بننا چاہئیں۔ آیت کے آخر میں کہا گیا ہے وہ جلا ڈالنے والی آگ

میں گرفتار ہوں گے جن کا وہ خود ایندھن بنیں گے۔ "و اولٰئک ھم وقود النار"۔[1]

مندرجہ بالا تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی آگ کے شعلے خود گنہگاروں کے وجود کے اندر سے اٹھیں گے اور انہی کا وجود اُن میں آگ بھڑکانے کا موجب ہو گا۔ البتہ کچھ آیات ایسی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ دوزخ کا ایندھن گنہگاروں کے علاوہ پتھر بھی ہوں گے لیکن جیسے جلد اوّل سورہ بقرہ آیہ ۲۴ کے ذیل میں کہا جا چکا ہے کہ ممکن ہے ان سے وہ بت مراد ہوں جو پتھر سے بنائے گئے۔ اسی طرح جہنم میں بتوں کو ان کے ساتھ ڈالا جائے گا۔ باطل اعمال سے دوزخ کے شعلے بن کر نکلیں گے۔

کدأب اٰل فرعون

"دأب" اصل میں سیر و حرکت کے دائم و قائم رکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور ہر مسلسل کام اور عادت کے مفہوم میں بھی مستعمل ہے۔

مندرجہ بالا دوسری آیت میں پیغمبر اکرمؐ کے دور کے کفار کی حالت کو آل فرعون اور ان سے پہلی قوموں کی غلط اور مستقل عادت و سیرت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ وہ لوگ آیات خدا کی تکذیب کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی ان کے گناہوں کی وجہ سے گرفت کی اور وہ اسی جہاں میں سخت سزا اور عذاب میں مبتلا ہوئے۔

درحقیقت یہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کے ہٹ دھرم کافروں کو تنبیہ ہے کہ وہ آل فرعون اور ان سے پہلی قوموں کی حالت کو نظر میں رکھیں اور اپنے اعمال کا محاسبہ کریں۔

یہ صحیح ہے کہ خدا ارحم الراحمین ہے لیکن اپنے مقام پر اور بندوں کی تربیت کے لیے وہ شدید العقاب بھی ہے لہٰذا پروردگار کی وسیع رحمت کہیں کسی کے لیے غرور و تکبر کا باعث نہ بن جائے۔

لفظ "دأب" سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت کے مقابلے میں ان کی ہٹ دھرمی کا یہ غلط انداز اور تکذیب آیاتِ الٰہی اُن کی عادت بن چکی تھی۔ اسی لیے انہیں سخت سزا اور عذاب سے ڈرایا گیا ہے کیونکہ جب تک گناہ اور تجاوز کسی کی عادت اور راہ و رسم نہ بن جائے اس کا لوٹ آنا آسان ہے اور اس کی سزا نسبتاً کم ہے لیکن جب وہ وجودِ انسانی میں نفوذ کر لے تو پھر لوٹ آنا مشکل ہے اور اس کی سزا بھی سخت ہے لہٰذا کیا ہی اچھا ہے کہ کافر اور گنہگار جب کہ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا غلط راستے سے لوٹ آئیں۔

۱۲۔ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ۝

---

[1] چونکہ بعض کہتے ہیں کہ وقود کا معنی ایندھن ہے یعنی وہ چیز جس سے آگ جلائی جاتی ہے (مثلاً لکڑی کوئلہ) ... جس سے آگ جلائی جاتی ہے (اچھے ماخذ)

ترجمہ

۱۲ ۔ جو کافر ہو گئے ہیں ان سے کہہ دیجئے "جنگ اُحد کی وقتی فتح پر خوش نہ ہو جاؤ" عنقریب تم مغلوب ہو جاؤ گے (اور پھر آخرت میں) جہنم کی طرف محشور ہو گے اور وہ کس قدر بُری جگہ ہے۔

شانِ نزول

جنگ بدر اور اس میں مسلمانوں کی کامیابی کے بعد بعض یہودی کہنے لگے، جس رسول اُمّی کی تعریف و توصیف ہم نے اپنی مذہبی کتاب تورات میں پڑھی ہے کہ وہ کسی جنگ میں مغلوب نہیں ہوگا وہ یہی پیغمبر ہے۔

اس پر بعض دوسرے کہنے لگے جلدی نہ کرو، دوسری جنگ اور کوئی اور واقعہ پیش آلینے دو، پھر فیصلہ کرنا۔

جب جنگ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو وہ کہنے لگے، بخدا یہ وہ پیغمبر نہیں جس کی بشارت ہماری کتب میں دی گئی ہے۔

اس واقعے کے بعد صرف یہی نہیں کہ مسلمان نہ ہوئے بلکہ ان کے رویے میں مزید سختی آگئی اور وہ مسلمانوں سے اور دور ہو گئے یہاں تک کہ انہوں نے رسول خدا سے جو لڑائی جھگڑا نہ کرنے کا معاہدہ کر رکھا تھا اُسے بھی مدت سے پہلے توڑ دیا۔ کعب بن اشرف کی ہمراہی میں ان کے ساٹھ سوار مکہ پہنچے اور اسلام کے خلاف جنگ کیلئے مشرکین سے معاہدہ کر کے مدینہ واپس آگئے۔

اس دوران میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں انہیں دندان شکن جواب دیا گیا اور کہا گیا کہ نتیجہ تم کام کے انجام پر اخذ کرنا اور یہ جان لو کہ تم سب مغلوب ہو جاؤ گے۔

تفسیر

ایک صریح پیشن گوئی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو صراحت سے بشارت دی ہے کہ وہ تمام دشمنوں پر فتح یاب ہوں گے نیز کفار سے کہا گیا ہے کہ تم اس دُنیا میں بھی شکست کھاؤ گے اور مغلوب ہو گے اور دوسرے جہاں میں بھی تمہارا انجام بہت بُرا ہو گا۔

آیت کی شان نزول کو دیکھیں تو یہ آیت جنگ احد کے بعد نازل ہوئی ہے۔ جب مسلمان ظاہری طور پر

اپنی طاقت اور اثر کھو چکے تھے جب کہ دشمنانِ اسلام اپنے باہمی اتحاد اور معاہدوں کی وجہ سے دیدبہ، ہیبت و طاقت حاصل کر چکے تھے، ایسے میں مستقبل قریب کے بارے میں "ستغلبون" (تم عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے) کہہ کر ایک صریح پیشین گوئی کی گئی ہے اس لیے اس آیت کو اعجازِ قرآن والی آیات میں شمار کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں آئندہ ہونے بارے میں ایک واضح خبر دی گئی ہے اور وہ ان حالات میں جب کہ کافروں اور یہودیوں پر مسلمانوں کی کامیابی بالکل واضح نہ تھی۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ آیت کی صداقت ثابت ہو گئی۔ مدینہ کے یہودی بنی قریظہ اور بنی نضیر تباہ و برباد ہو گئے اور جنگ خیبر میں ان کی طاقت کا اہم ترین مرکز ختم ہو گیا۔ اور مشرکین مکہ بھی فتح مکہ کے بعد ہمیشہ کے لیے مغلوب ہو گئے۔

۱۳۔ قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۖ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُم مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ ۚ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَن يَشَاءُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ○

ترجمہ

۱۳۔ جب دو گروہ (جنگ بدر میں) آمنے سامنے آئے تو اس میں تمہارے لیے نشانی اور درسِ عبرت تھا۔ ایک گروہ راہِ خدا میں جنگ کر رہا تھا اور دوسرا کافروں کا گروہ تھا (جو شیطان اور بتوں کی راہ میں مشغولِ جنگ تھے) ان (کافروں) کو (مومنین) اپنی تعداد سے دوگنا نظر آ رہے تھے (اور یہ بھی ان کی وحشت و شکست کا ایک عامل بن گیا) اور خدا جسے چاہتا ہے (اور اہل سمجھتا ہے) اپنی مدد سے اس کی تائید کرتا ہے اور اس میں صاحبانِ نظر کے لیے عبرت ہے۔

شانِ نزول

یہ آیت جنگِ بدر کی صورتِ حال کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جیسا کہ مفسرین نے بیان کیا ہے کہ جنگِ بدر

میں مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی ۔ ان میں ستتر مہاجر تھے اور دو سو چھتیس انصار ۔ مہاجرین کا پرچم حضرت علی کے ہاتھ میں تھا اور انصار کے پرچم بردار سعد بن عبادہ تھے۔ اس عظیم معرکے کے لیے ان کے پاس صرف ستر اونٹ، دو گھوڑے، چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں تھیں ۔ دوسری طرف دشمن کی فوج ہزار افراد سے متجاوز تھی ۔ اس کے پاس کافی و وافی اسلحہ تھا اور ایک سو گھوڑے تھے ۔ اس جنگ میں بائیس مسلمان شہید ہوئے ۔ ان میں چودہ مہاجر اور آٹھ انصار تھے دشمن کے ستر افراد مارے گئے اور ستر ہی قیدی ہوئے ۔ اس طرح مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور یوں مکمل کامرانی کے ساتھ وہ مدینہ کی طرف پلٹ آئے ۔ زیر نظر آیت واقعہ بدر ہی کا ایک پہلو بیان کرتی ہے ۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں کفار کو تنبیہ کی گئی تھی کہ وہ مال و ثروت اور کثرتِ تعداد پر مغرور نہ ہوں ۔ اس آیت میں اس مسئلے کا ایک زندہ شاہد بیان کیا گیا ہے اور انہیں دعوت دی گئی ہے کہ وہ جنگِ بدر کے تاریخ ساز واقعے سے درسِ عبرت حاصل کریں ۔

"قد کان لکم آیة فی فئتین التقتا ...."

وہ اس بات سے کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے کہ جنگی ساز و سامان سے عاری ایک چھوٹا سا لشکر لیکن پختہ ایمان والوں پر مشتمل اپنے سے کئی گنا بڑے جنگی وسائل سے آراستہ لشکر پر فتحیاب ہو گیا ۔ اگر مال و دولت اور کثرتِ تعداد بغیر ایمان کے اثر انداز ہو سکتی تو جنگِ بدر میں اپنا اثر دکھاتی جبکہ وہاں تو نتیجہ برعکس رہا ۔

" یرونہم مثلیہم رأی العین "

آیت کے اس حصے میں فرمایا گیا ہے : میدانِ جنگ میں کافروں کو مومنین اپنی تعداد سے دوگنا دکھائی دیتے تھے یعنی اگر ان کی تعداد ۳۱۳ تھی تو وہ چھ سو سے زیادہ دکھائی دیتے تھے ۔ [1]

یہ مسلمانوں کی کامیابی کے لیے خدائی امداد تھی کیونکہ خدا اپنے مجاہد اور مومن بندوں کی کئی طرح سے مدد کرتا ہے ایسا ظاہری پہلو سے بھی فطرۃً امداد دکھائی نظر آتا ہے کیونکہ جب جنگ شروع ہوئی تو مسلمانوں نے دشمنوں پر کڑی ضربیں لگائیں اس لیے کہ وہ قوتِ ایمان اور تربیتِ اسلامی سے آراستہ تھے ۔ دشمنوں نے یہ دیکھا تو وہ اتنے مرعوب اور وحشت زدہ ہوئے کہ سمجھنے لگے کہ مسلمانوں کے ساتھ اتنی ہی طاقت اور آملی ہے اور پہلی قوت سے دوگنا طاقت سے وہ میدانِ جنگ پر قابض ہو گئے ہیں جبکہ دشمنانِ اسلام جنگ شروع ہونے سے پہلے اس نتیجے کا خیال تک بھی نہ کر سکتے تھے اور مسلمان ان کو اصل تعداد سے بھی کم گنتے تھے ۔

سورہ انفال کی آیت ۴۴ میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے اور وہ آیت مندرجہ بالا تفسیر کی تائید کرتی ہے

---

[1] یہ تفسیر اس نظریہ کی بنیاد پر ہے کہ "یرونہم" میں مخاطب کفار ہیں ہے اور "ہم" کی ضمیر کا اشارہ مسلمانوں کی طرف ہے اور یہی آیت کا واضح مفہوم معلوم ہوتا ہے مگر بعض مفسرین نے ضمیروں کے مرجع کے بارے میں اور احتمالات بھی بیان کئے ہیں ۔

" وإذ يريكموهم إذ التقيتم في أعينكم قليلا و يقللكم في أعينهم ليقضي الله أمرا كان مفعولا "

وہ وقت یاد کرو جب میدانِ جنگ میں اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کو تمہاری نظروں میں کم کرکے دکھایا تاکہ وہ اس جنگ سے منہ نہ پھیریں جس کا انجام ان کی شکست ہے، اور انہیں بھی تمہاری نظروں میں کم کرکے دکھایا تاکہ اس تاریخی اور فیصلہ کن جنگ میں تمہارے دل بھی کمزور نہ ہوں، لیکن جنگ شروع ہوتے ہی معاملہ دگرگوں ہو گیا اور مسلمان جنہیں دشمن کم اس سے زیادہ نظر آنے لگے اور یہ بات دشمنوں کی شکست کا ایک عامل تھا۔

بدر کی تاریخی جنگ کے بارے میں سورہ انفال کی آیہ ۴۱ سے لے کر ۴۴ تک کی تفسیر میں انشاء اللہ تفصیل سے بحث کریں گے۔

واللہ یؤید بنصرہ من یشاء۔

اس جملے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے غلبہ اور کامیابی عطا کرتا ہے البتہ جیسا کہ ہم متعدد مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ مشیتِ الٰہی بغیر کسی وجہ اور بنیاد کے عمل میں نہیں آتی بلکہ ہمیشہ اس کی کوئی حکمت و مصلحت ہوتی ہے اور یہ لوگوں کی اہلیت کی حدود میں محدود ہوتی ہے یعنی جو تائید کی لیاقت رکھتے ہیں انہی کی تائید کی جاتی ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ بدر کے تاریخی واقعے میں تائیدِ الٰہی اور مسلمانوں کی کامیابی کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ فوجی لحاظ سے کامیابی تھی اور دوسری منطقی پہلو سے۔ فوجی کامیابی اس لحاظ سے تھی کہ ایک چھوٹا سا لشکر جس کے پاس جنگی ساز و سامان نہیں تھا ایسے لشکر پر غالب آگیا جو تعداد میں کئی گنا زیادہ تھا اور بے پناہ ساز و سامان سے لیس تھا اور منطقی کامیابی اس حوالے سے تھی کہ خدا تعالیٰ نے جنگ ہونے سے پہلے ہی صراحت سے مسلمانوں کو اس میں کامیابی کی خبر دے دی تھی۔

" إن في ذلك لعبرة لأولي الأبصار "

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ چشمِ بصیرت رکھتے ہیں اور حقائق کو صحیح طور پر دیکھتے ہیں وہ اہلِ ایمان کی اس کامیابی کو اس حوالے سے دیکھتے اور پہچانتے ہیں کہ کامیابیوں اور کامرانیوں کا اصل سرمایہ ایمان اور صرف ایمان ہے اور پھر وہ اس سے درس و عبرت حاصل کرتے ہیں۔

۱۴۔ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ○

ترجمہ

۱۴۔ [illegible] چیزوں میں سے [illegible]، اولاد اور مال جو سونے چاندی کے ڈھیروں پر مشتمل ہو منتخب گھوڑے، جانور اور زراعت لوگوں کی نظر میں پسندیدہ بنا دیے گئے ہیں (تاکہ ان کے ذریعے ان کی آزمائش اور تربیت ہو لیکن) یہ چیزیں (اگر انسان کے اصلی مقاصد کے لیے ذریعہ بنیں پھر بھی) پست، مادی زندگی کا سرمایہ ہیں اور انجام نیک (اور عالی زندگی) خدا کے پاس ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں بتایا گیا ہے کہ انسان کا حقیقی سرمایہ ایمان ہے نہ کہ مال و دولت اور کثرت اولاد و افراد۔ اب یہ آیت اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ بیوی بچے اور مال و ثروت اس جہان کی مادی زندگی کے لیے سرمایہ ہیں۔ یہ انسان کا اصلی مقصد اور ہدف نہیں ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ان وسائل کے بغیر روحانی و معنوی سعادت کی راہ بھی طے نہیں کی جاسکتی لیکن اس راہ میں ان سے کام لینا اور چیز ہے اور (وسیلہ نہ سمجھتے ہوئے) ان سے وابستگی اور ان کی پرستش دوسری چیز ہے۔ اس آیت میں چند قابل توجہ نکات ہیں جن کا ہم ذیل میں ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ امور مادی کو کس نے زینت دی ہے

"زین للناس حب الشھوت ...."[1] یہ جملہ فعل مجہول کی شکل میں ہے اس میں کہا گیا ہے: بیوی بچوں اور مال و دولت سے لگاؤ اور ان سے محبت کو لوگوں کی نگاہ میں پسندیدہ بنا دیا گیا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ پسندیدہ بنانے والا اور انہیں لوگوں کی نظروں میں زینت دینے والا کون ہے؟
بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ شیطانی ہوا و ہوس ہے جو انہیں لوگوں کی نگاہوں میں پسندیدہ بناتی ہے [illegible] استدلال کرتے ہیں جس میں فرمایا گیا ہے:

---

[1] "شہوات" "شہوت" کی جمع ہے جس کا معنی ہے کسی چیز سے شدید لگاؤ اور تعلق رکھنا" لیکن مندرجہ بالا آیت میں "شہوات" "مشتہیات" کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور "مشتہیات" ان چیزوں کو کہتے ہیں جن سے تعلق اور لگاؤ ہو۔

"وزین لھم الشیطان اعمالھم"

اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نگاہ میں زینت دی ہے۔

ایسی اور بھی آیات موجود ہیں۔

لیکن یہ استدلال صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ محل بحث آیت میں اعمال کے بارے میں گفتگو نہیں ہے۔ بلکہ اس میں مال، عورتوں اور اولاد کے بارے میں گفتگو ہے۔

آیت کی صحیح تفسیر یہی معلوم ہوتی ہے کہ زینت دینے والا خدا ہی ہے اور یہ قوت اس نے انسان کی فطرت وطینت میں ودیعت کی ہے۔ کیونکہ خدا ہی انسان میں اولاد اور مال و دولت کی محبت پیدا کرتا ہے تاکہ اُسے تکامل کا اُسے کمال و ارتقاء عطا کرے اور تربیت کے راستے میں آگے لے جائے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے۔

"انا جعلنا ما علی الارض زینۃ لھا لنبلوھم ایھم احسن عملاً" :

ہم نے زمین کی تمام چیزوں کو ان کے لیے زینت بنایا ہے تاکہ ان کی اخلاقی تربیت ہو کے یعنی اس محبت و وابستگی سے صرف سعادت، اصلاح اور تعمیر کے لیے فائدہ اٹھائیں نہ یہ کہ فتنہ و فساد اور تباہی و بربادی کے لیے انہیں کام میں لائیں۔ (کہف - ۷)

یہ امر قابل ذکر ہے کہ زیر نظر آیت میں پہلے ازواج اور اولاد کا ذکر ہے۔ آج کے ماہرین نفسیات بھی کہتے ہیں کہ جنسی پہلو انسان کے قوی ترین غرائز اور اندرونی تقاضوں میں سے ہے۔ انسان کی تاریخ اور دورِ حاضر بھی اس بات کی تائید کرتا ہے کہ بہت سے معاشرتی حوادث کا سرچشمہ اسی انسانی خواہش سے اٹھنے والے طوفان تھے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ زیر بحث آیت اور ایسی دوسری آیات بیوی بچوں اور مال و دولت سے معتدل محبت اور لگاؤ کی مذمت نہیں کرتیں کیونکہ معنوی اور روحانی مقاصد و اہداف کی پیش رفت مادی وسائل کے بغیر ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں قانونِ شریعت کبھی قانونِ فطرت سے متضاد نہیں ہو سکتا اور قانونِ فطرت قابلِ مذمت نہیں ہوتا ہاں البتہ ایسا عشق و محبت جو افراط کی حد کو پہنچ جائے۔ بہ الفاظ دیگر پرستش و عبادت بن جائے وہ قابلِ مذمت ہے۔

۲۔ "القناطیر المقنطرۃ" اور "الخیل المسومۃ" سے کیا مراد ہے

"قناطیر" "قنطار" کی جمع ہے۔ "قنطار" کا معنی ہے "محکم چیز"۔ بعد ازاں یہ لفظ "زیادہ مال" کے لیے استعمال ہونے لگا۔ پل کو "قنطرۃ" اس کی مضبوطی کے پیش نظر اور باہوش افراد کو "قنطر" اُن کی فکر و نظر کے استحکام کی وجہ سے کہتے ہیں۔ "مقنطرۃ" اسم مفعول ہے اس کا معنی ہے "کئی گنا" اور "مکرر"۔ یہ دونوں الفاظ کا اکٹھا ذکر تاکید کے لیے ہے۔ جیسے آج کل فارسی میں کہتے

ہیں: ذوکس صاحب آلاف و الوف می باشد (فلاں شخص ہزاروں اور ہزاروں کا مالک ہے) یعنی اس کے پاس بہت مال و دولت ہے
بعض نے "قنطار" کے لیے ایک معین حد بیان کی ہے اور کہا ہے کہ "قنطار" ستر ہزار سونے کے دینار کو کہتے ہیں، بعض نے ایک لاکھ دینار بتایا ہے اور بعض بارہ ہزار درہم کہتے ہیں اور کچھ کے نزدیک "قنطار" سونے چاندی کے سکوں سے بھری ہوئی تھیلی کو کہتے ہیں۔

ایک روایت جو امام باقرؑ اور امام صادق علیہما السلام سے منقول ہے کے مطابق قنطار سونے کی وہ مقدار ہے جو ایک گائے کی کھال کو بھر دے۔

حقیقت میں اس کا ایک وسیع مفہوم ہے اور وہ ہے زیادہ اور کثیر مال۔

"خیل" اسم جمع ہے اور اس کا معنی "گھوڑے" اور "گھڑسوار" دونوں بیان کیے گئے ہیں البتہ زیرِ نظر آیت میں اس سے مراد "گھوڑے" ہی ہے۔

"مسومۃ" دراصل "ممتاز" کے معنی میں ہے: ممتاز ہونا جمال جسم اور چہرے کے متناسب ہونے کے لحاظ سے ہے یا تربیت یافتہ ہونے اور میدانِ جنگ میں سواری کے لیے آمادہ ہونے کے حوالے سے ہے۔

اس مطالعے سے یہ نتیجہ نکلا کہ محل بحث آیت میں چھ چیزوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو زندگی کا اہم سرمایہ ہیں اور وہ یہ ہیں:

۱) بیوی
۲) اولاد
۳) مال و دولت
۴) بہترین سواریاں اور گھریلو ضرورت کے جانور ("انعام")
۵) زراعت اور فصلیں

یہ سب مادی زندگی کے بنیادی ارکان ہیں۔

۲۔ دنیا کی متاعِ حیات سے کیا مراد ہے

متاع ایسی چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان لطف اندوز ہوتا ہو اور حیاتِ دُنیا سے مراد پست زندگی ہے اس بنا پر "متاع الحیٰوۃ الدُّنیا" کا معنی یہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص ان چھ امور سے بنیادی ہدف کے طور پر عشق کرے اور انہیں مادہ حیات میں وسیلہ نہ بنائے تو اُس نے اپنے آپ کو پست زندگی کے سپرد کر دیا۔

حیاتِ دُنیا (پست زندگی) دراصل اس زندگی کے ارتقاء اور تکامل کی طرف اشارہ ہے اس طرح اس جہان کی زندگی ایک مرحلہ بن جاتی ہے اسی لیے آیت کے آخر میں اعلیٰ ترین زندگی جو انسان کے انتظار میں ہے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

"واللہ عندہ حسن الماٰب"

یعنی ۔ نیک انجام تو خدا کے پاس ہے ۔

۱۵۔ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

۱۶۔ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

۱۷۔ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝

ترجمہ

۱۵۔ کہہ دیجئے: کیا تمہیں ایسی چیز سے آگاہ کروں جو اس (مادی سرمائے) سے بہتر ہے جنہوں نے پرہیزگاری اختیار کی ہے (اور مادی سرمائے سے شرعی طریقے سے اور حق و عدالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے استفادہ کیا ہے) ان کے پروردگار کے پاس (دوسرے جہان میں) ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور پاکیزہ بیویاں (جو ہر نا پاکی سے منزہ ہیں) اور خوشنودیٔ خدا انہیں نصیب ہوگی اور خدا بندوں کے اعمال دیکھنے والا ہے۔

۱۶۔ وہی لوگ جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے ہیں، پس ہمیں بخش دے اور آگ کے عذاب سے بچا لے۔

۱۷ـ وہی جو (مشکلات کے مقابلے میں، اطاعت کی راہ میں اور ترکِ گناہ کے راستے میں) پامردی اور استقامت دکھاتے ہیں، سچ بولتے ہیں۔ (خدا کے حضور) خضوع کرتے ہیں (اس کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور اوقاتِ سحر میں (اور عبادت آخرِ شب میں) استغفار کرتے ہیں۔

تفسیر

ان میں پہلی آیت انسانی تکامل وارتقا کے لیے بلندی کی راہوں کو واضح کرتی ہے۔ اسی طرف گذشتہ آیت کے آخر میں اشارہ ہوا تھا اس آیت میں فرمایا گیا ہے: کیا تمہیں اس چیز کی خبر دوں جو محدود، مادی اور پست زندگی سے بالاتر اور بہتر ہے وہ جہان ابدی کی زندگی ہے جو پرہیزگار اور خود دار افراد کے انتظار میں ہے جس میں تمام اس جہان کی نعمتیں موجود ہیں لیکن وہ زیادہ کامل صورت میں ہیں اور عیب ونقص سے پاک ہیں۔

وہاں ایسے باغات ہیں جن کے درختوں کے نیچے اس جہان کے برعکس پانی بہتا رہتا ہے اور منقطع نہیں ہوتا۔
"جنّات تجری من تحتها الانهٰر"

اس جہان کی نعمتیں تو بہت جلد گزر جاتی ہیں اور ناپائیدار ہیں لیکن وہاں کی نعمتیں ابدی ہیں خٰلدین فیها
اس جہان کی بیویاں یہاں کی حسین عورتوں کے برعکس جسمانی وروحانی اعتبار سے بہت پاکیزہ ہوں گی اور ان میں کوئی ناپاکی وتیرگی نہیں ہوگی "وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ"۔

یہ سب چیزیں پرہیزگاروں کے انتظار میں ہیں اور ان تمام سے بالاتر معنوی نعمتیں ہیں جو تصور سے ماوراء ہیں جنہیں آیت میں "رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ" (یعنی — خوشنودیٔ خدا) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ آیت "اَؤُنَبِّئُكُمْ" سے شروع ہوتی ہے جس کا معنی ہے "کیا تمہیں آگاہ کروں" ایک طرف یہ جملہ استفہامیہ ہے جو انسان کی بیدار فطرت سے جواب طلب کرتا ہے تاکہ سننے والے پر اس کا اثر زیادہ گہرا ہو اور دوسری طرف سے یہ لفظ "انباء" کے مادہ سے ہے اور خبر دینے کے معنی میں لیا گیا ہے جو عموماً اہم ترین اور قابلِ توجہ خبروں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

درحقیقت قرآن اس آیت میں صاحبِ ایمان افراد کو خبر دیتا ہے کہ اگر وہ غیر شرعی لذتوں۔ سرکشی اور گناہ آلود ہوس سے صرف نظر کریں تو اس کا معنی لذت سے محرومی نہیں ہوگا کیونکہ وہ راہِ سعادت میں جائز لذات حاصل کر سکنے کے علاوہ دوسرے جہاں کی لذتوں سے بھی بہرہ مند ہوں گے جو اس جہاں کی لذتوں کی طرح ہیں لیکن ... ہیں اور ہر نقص وعیب سے مبرا بھی۔

کیا جنت میں مادی لذتیں بھی ہیں

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مادی لذتیں اسی دنیا میں منحصر ہیں اور اخروی دنیا میں ان کا نام و نشان نہیں ہوگا اور یہ جو آیاتِ قرآنی میں باغات بہشت طرح طرح کے پھل اور میووں، جاری پانی اور بہترین بیویوں کا تذکرہ ہے۔ یہ معنوی مقامات والعامات کے ایک سلسلے سے کنایہ ہیں اور یہ تعبیریں "کلّم النّاس علٰی قدر عقولهم" یعنی — لوگوں سے ان کے فکری معیار کے مطابق بات کرو۔ کے مصداق بیان فرمائی گئی ہیں۔

اس خیال کا جواب یہ ہے کہ جب بہت سی صریح آیات قرآنی کے پیشِ نظر معادِ جسمانی ثابت ہو چکا ہے تو ضروری ہے کہ جسمانی اور روحانی تقاضوں کے مطابق نعمتیں بھی ہوں البتہ ان کی سطح ضرور بلند ہونی چاہیئے اور اتفاق کی بات ہے کہ اس آیت میں دونوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ معادِ جسمانی کی طرف بھی اشارہ ہے اور روح اور معادِ ارواح کی ... سے بھی اشارہ موجود ہے۔

جو لوگ اس جہان کی تمام نعمتوں کو معنوی نعمتوں کے لیے کنایہ سمجھتے ہیں وہ دراصل آیاتِ قرآنی کے ظاہر ... تاویل بھی کرتے ہیں اور وہ معادِ جسمانی اور اس کے لوازمات کو بھی بالکل فراموش کیے ہوئے ہیں۔

"واللّٰه بصيرٌ بالعباد" یعنی — خدا اپنے بندوں کی کیفیت کو دیکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ جملہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ خدا تعالیٰ دوسرے جہان میں انسانی جسم و روح کے تقاضوں سے آگاہ ہے اور وہ ان تقاضوں کو بطریقِ احسن پورا کرے گا۔

"الّذين يقولون ربّنا انّنا ...."

گذشتہ آیت میں بتایا گیا تھا کہ پرہیزگار آخرت کی نعمتوں سے مالا مال ہیں۔ اس آیت میں اور بعد والی آیت میں پرہیزگاروں کا تعارف کرواتے ہوئے ان کی چھ نمایاں صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔ وہ دل و جان سے اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہیں اور ایمان نے ان کا دل روشن کر دیا ہے۔ اسی لیے وہ سختی سے اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہیں اور وہ اپنے گناہوں کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ وہ خدا سے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں اور دوزخ سے نجات کی خواہش کرتے ہیں "فاغفر لنا ذنوبنا وقنا عذاب النّار")۔

۲۔ اپنے معاملات میں صبر و استقامت سے کام لیتے ہیں اور انہیں انجام تک پہنچاتے ہیں۔ گناہ، ترکِ ... میں اور انفرادی، اجتماعی مشکلات کا سینہ تان کے مقابلہ کرتے ہیں ("الصّٰبرين")۔

۳۔ سچ بولتے ہیں۔ صحیح کردار کے مالک ہیں۔ جن چیزوں کا دل سے اعتقاد رکھتے ہیں انہی پر عمل کرتے ہیں اور ... جھوٹ، مکر و فریب اور خیانت سے دور رہتے ہیں ("وَالصّٰدِقِين")۔

۴۔ خدا کی بندگی اور عبودیت کی راہ میں ہمیشہ خضوع اور فروتنی سے کام لیتے ہیں ("وَالقٰنِتِين")۔[1]

---

[1] قنت کا معنی خدا کے سامنے خضوع بھی ہے اور اطاعت و بندگی میں دوام و استمرار بھی۔

۵۔ مال ہی نہیں بلکہ جو بھی مادی و روحانی نعمتیں انہیں میسر ہیں وہ انہیں راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور اس طرح سے اجتماعی و معاشرتی مشکلات اور بیماریوں کا مداوا کرتے ہیں۔

۶۔ وقتِ سحر اور آخرِ شب یعنی جب سکون اور مخصوص صفا و خلوص کا ماحول تمام جگہوں پر محیط ہو، جب بے خبر لوگ خوابِ غفلت میں ہوں اور میٹھی نیند سو رہے ہوں، جب ساری دنیا کا شور و شین خاموش ہو چکا ہو اور مردانِ خدا کے افکار اور زندہ دلوں میں عالمِ ہستی کی اصلی قدریں نمایاں ہو رہی ہوں وہ یادِ خدا کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اس کی باعظمت بارگاہ میں استغفار اور طلب بخشش کرتے ہیں، پروردگار کے نور و جلال کے پرتو میں محو ہوتے ہیں اور ان کے وجود کے سب ذرے باہم زمزمۂ توحید گنگنا رہے ہوتے ہیں۔ ("وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ")

امام صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

> جو شخص نمازِ وتر میں ۷۰ مرتبہ "اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ اَتُوْبُ اِلَيْهِ" پڑھے اور ایک سال تک اس عمل کی پابندی کرے خدا تعالیٰ اسے وقتِ سحر استغفار کرنے والوں (یعنی "اَلْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ") میں سے قرار دے گا اور یقیناً اسے اپنی عفو و بخشش سے نوازے گا۔

سحر کیا ہے

سَحَر (بر وزن "بشر") دراصل "پوشیدہ اور پنہاں ہونے" کے معنی میں ہے۔ رات کے آخری حصے میں چونکہ تمام چیزوں پر ایک خاص قسم کی پوشیدگی غالب آجاتی ہے لہذا اس کا نام سحر رکھ دیا گیا ہے۔

لفظ "سِحْر" (بر وزن "شِعْر") بھی اسی مادہ سے ہے۔ "سَاحِر" اور جادوگر چونکہ ایسے کام کرتا ہے جن کے اسرار دوسروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں اس لیے اس کے اس عمل کو "سِحْر" کہتے ہیں۔

اہلِ عرب انسان اور حیوان کی سانس کی نالی کو بھی بعض اوقات "سَحَر" کہتے ہیں اور یہ بھی اندر والے حصے کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شب و روز کے اوقات میں سے صرف وقتِ "سحر" کا تذکرہ کیوں ہے جب کہ بارگاہِ الٰہی میں ہر حالت میں توبہ و استغفار مطلوب ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سحر وہ وقت ہے کہ جب سکون، آرام اور خاموشی ہوتی ہے، مادی کام معطل ہوتے ہیں اور استراحت کے بعد نشاط اور خوشی کا ایک عالم ہوتا ہے، یہ صورتِ حال اور یہ ماحول انسان کو زیادہ سے زیادہ بارگاہِ الٰہی میں توبہ و انابت کے لیے آمادگی بخشتا ہے۔

تجربے سے اس کیفیت کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے یہاں تک کہ بہت سے علماء اور دانشور علمی مسائل کے حل کے لیے اسی وقت سے استفادہ کرتے ہیں کیونکہ وقتِ "سَحَر" انسانی فکر و روح کا چراغ دیگر اوقات کی

نسبت زیادہ روشن اور درخشندہ ہوتا ہے۔ عبادت و استغفار کی روح توجہ اور حضورِ قلب ہے لہٰذا لمحاتِ سحر میں عبادت و استغفار زیادہ گرانبہا اور عزیز تر ہے۔

۱۸۔ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

ترجمہ

۱۸۔ خدا (جہانِ ہستی کے اکیلے نظام کو ایجاد کر کے) گواہی دیتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور فرشتے اور اہل علم و دانش (سب ایک طرح) گواہی دیتے ہیں، اس عالم میں کہ (خدا تعالیٰ عالم ہستی میں) عدالت قائم کیے ہوئے ہے (اور یہ عدالت بھی اُس کی ذات کی یکتائی کے لیے نشانی ہے، اس لیے تم بھی ان سب کے ساتھ ہم آواز ہو کر کہو کہ اُس کے علاوہ کوئی معبود نہیں جو کہ غالب و توانا بھی ہے اور حکیم و دانا بھی۔

تفسیر

اس آیت میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی ذات کی یکتائی خود پروردگار کی شہادت ہے، پھر ملائکہ کی گواہی اور پھر علماء، دانشوروں اور ان لوگوں کی شہادت ہے۔ جو نورِ علم و فکر سے عالمِ دنیا کے حقائق پر نظر رکھتے ہیں۔

("شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ")

یہاں چند امور کی طرف توجہ ضروری ہے۔

۱۔ خدا کی اپنی یکتائی پر شہادت سے کیا مراد ہے

خدا تعالیٰ کی شہادت سے مراد عملی اور فعلی شہادت ہے نہ کہ قولی یعنی خدا تعالیٰ نے جہانِ آفرینش کو پیدا کیا۔ اس میں ایک ہی نظام قائم ہے، ہر جگہ اس کے قوانین ایک سے ہیں اور اس کا ایک ہی پروگرام ہے۔ حقیقت میں ایک اکیلا اپنے سے وابستہ یگانہ نظام بذات خود نشاندہی کرتا ہے کہ پیدا کرنے والا اور معبود اس جہاں میں ایک سے زیادہ نہیں اور سب مخلوقات کا ایک ہی منبع اور سرچشمہ ہے۔ اس بناء پر ایک ہی نظام کی ایجاد، ذاتِ الٰہی کی یگانگت اور یکتائی پر ایک شہادت ہے۔

دوسری طرف فرشتوں اور علماء کی شہادت قولی پہلو رکھتی ہے کیونکہ ان میں سے ہر کوئی حسب حال کلام کے ذریعے اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے ۔ ایک لفظ کے مختلف مفاہیم کی اور بھی بہت سی مثالیں آیات قرآنی میں موجود ہیں، مثلاً

" اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ . "

یعنی — اللہ اور اس کے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں ۔ (احزاب - ۵٦)

اس میں خدا کی طرف سے درود بھیجنے اور ملائکہ کی طرف سے درود بھیجنے کے اور معنی ہیں ۔ خدا کی طرف سے رحمت بھیجنا ہے اور فرشتوں کی طرف سے رحمت بھیجنے کا تقاضا ہے ۔ البتہ فرشتوں اور علماء کی گواہی عملی پہلو میں بھی فرق رکھتی ہے کیونکہ وہ صرف اسی کی پرستش کرتے ہیں اور کسی اور معبود کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے ۔

۲ ۔ قیام بالقسط کیا چیز ہے ۔

ادبی اصطلاح کے مطابق "شَہِدَ" فعل ہے ، اس کا فاعل "اللہ" ہے اور قَآئِمًا بِالْقِسْطِ اس سے حال ہے ۔ یعنی خدا تعالیٰ اپنی یکتائی کی گواہی اس عالم میں دیتا ہے کہ عالم ہستی میں عدالت قائم کیے ہوئے ہے اور واقعاً یہ جملہ اس کی شہادت کی دلیل ہے کیونکہ عدالت کی حقیقت یہ ہے کہ درمیانہ اور مستقیم راستہ انتخاب کیا جائے جو ہر قسم کے افراط ، تفریط اور انحراف سے دور ہو اور ہم جانتے ہیں کہ درمیانہ اور مستقیم راستہ ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے اور ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتا ، جیسا کہ سورہ انعام کی آیت ۱۵۳ میں ہے :

" وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ ."

اور یہ میرا سیدھا راستہ ہے ، پس اسی کی اتباع کرو اور دوسرے راستوں کے پیچھے نہ لگو کہ وہ تمہیں اس کے راستے سے بھٹکا دیں گے ۔

اس آیت میں خدا کے ایک راستے کا ذکر ہے اور منحرف اور بھٹکے ہوئے متعدد راستے بتائے گئے ہیں کیونکہ "صراط مستقیم" مفرد ہے اور کج راستوں کا ذکر جمع کے صیغے سے کیا گیا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عدالت ہمیشہ ایک ہی نظام سے ہوتی ہے اور ایک ہی نظام کا ہونا مبداء واحد کا پتہ دیتا ہے ۔ اس لیے عالم آفرینش میں حقیقی عدالت اپنے اصلی مفہوم میں پیدا کرنے والے کی یکتائی پر دلیل ہے (غور کیجئے گا) ۔

۳ ۔ علماء کی حیثیت و وقعت

اس آیت میں حقیقی علماء کو فرشتوں کا ہم پلہ قرار دیا گیا ہے اور یہ بات دوسروں کی نسبت علماء کے امتیاز کو ظاہر کرتی ہے آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علماء کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنے علم کے ذریعے حقائق پر مطلع ہوتے ہیں اور اس طرح سے خدا کی یگانگت کا اعتراف کرتے ہیں جو سب سے بڑی حقیقت ہے ۔

واضح ہے کہ آیت تمام علماء کے بارے میں ہے اور وہ روایات جو اس آیت کے ذیل میں وارد ہوئی ہیں ان میں جو "اولوا العلم" سے آئمہ اطہار مراد لیا گیا ہے تو وہ اس لحاظ سے ہے کہ وہ حضرات اولوالعلم کے واضح ترین مصداق ہیں۔

مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں جابر بن عبداللہ انصاری کی وساطت سے پیغمبر اسلامؐ کا ایک فرمان نقل کیا ہے، آپؐ نے فرمایا:

"ساعة من عالم يتكیء على فراشه ينظر في علمه خير من عبادة العابد سبعين عاما"

عالم کی وہ ایک ساعت جس میں وہ اپنے علم میں فکر و نظر کرنے کے لیے بستر پر تکیہ لگائے ایک عابد کی ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

آیت میں "لا الٰہ الا ھو" کے جملے کا تکرار ہے۔ یہ تکرار گویا اس طرف اشارہ ہے کہ جیسے ابتداء میں خدا فرشتوں اور علماء کی شہادت آئی ہے اس طرح جو شخص بھی سنے اُسے چاہیئے کہ وہ بھی انکی شہادت کے۔ ساتھ ہم آواز ہو جائے اور معبود کی وحدت کی گواہی دے۔

لا الہ الا اللہ خدا کے حق کی ادائیگی ہے اور اس کی توحید کا اظہار ہے لہذا "عزیز" و "حکیم" دو اسماء الٰہی پر ختم ہوا ہے کیونکہ عدالت کا قیام قدرت و حکمت کا محتاج ہے اور وہ خدا ہی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور تمام چیزوں سے آگاہ ہے اس لیے وہی جہانِ ہستی میں عدالت قائم رکھ سکتا ہے۔

یہ آیت ان آیات میں سے ہے جن پر رسول اکرمؐ نے ہمیشہ خصوصی نظر رکھی اور آپؐ بار بار مختلف مواقع پر اس کی تلاوت فرماتے رہے۔ زبیر بن عوام کا کہنا ہے:

"عرفہ کی رات میں آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر تھا۔ میں نے سنا کہ آپؐ بار بار اس آیت کی تلاوت کرتے تھے۔"[1]

۱۹۔ إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ○

ترجمہ

۱۹۔ اللہ کے نزدیک دین اسلام (اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا) ہے۔ جن کے پاس

[1] تفسیر مجمع البیان، ج ۲، ص ۴۲۰

آسمانی کتاب تھی انہوں نے علم و آگاہی کے بعد بھی اختلاف پیدا کیا اور وہ بھی اپنے درمیان ظلم و ستم کی بناء پر اور جو آیات خدا سے کفر اختیار کرے تو خدا اس کا محاسبہ کرے گا کیونکہ خدا سریع الحساب ہے۔

تفسیر

حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہی روح دین ہے

"دِین" کا معنی ہے "جزاء"، "پاداش"، "حکم کی اطاعت" اور "پیروی"۔ مذہبی اصطلاح میں دین عبارت ہے ان عقائد، قوانین اور آداب سے جن کے ذریعے انسان دُنیا و آخرت کی سعادت و خوش بختی تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ نیز انفرادی و اجتماعی اور اخلاقی و تربیتی لحاظ سے صحیح راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔

"اِسلام" "تسلیم" کے معنی میں ہے اور یہاں مراد خدا کے سامنے تسلیم ہونا ہے،

اِس لیے "انّ الدین عند اللہ الاسلام" کا معنی یہ ہوگا کہ بارگاہ الٰہی میں حقیقی دین اُس کے فرمان اور حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے اور دراصل روح دین تمام ادوار میں حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ کسی دوسری چیز کا نام نہیں البتہ چونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین و آئین اس کا اعلیٰ ترین نمونہ تھا اس لیے اس کے لیے 'اسلام' کے نام کا انتخاب ہوا۔

نہج البلاغہ کے کلمات قصار میں حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کا اس حقیقت کے بارے میں عمیق اور گہرے مفہوم پر مبنی یہ جملہ مقصد کو واضح کرتا ہے:

"لا نسبن الاسلام نسبۃ لم ینسبھا احد قبلی:
الاسلام ھو التسلیم، والتسلیم ھو الیقین،
والیقین ھو التصدیق، والتصدیق ھو الاقرار،
والاقرار ھو الاداء، والاداء ھو العمل۔"

اِس عبارت میں امام علیہ السلام نے پہلے فرمایا ہے:

"میں چاہتا ہوں اسلام کی ایسی تفسیر بیان کروں جو کسی نے نہ کی ہو۔

اِس کے بعد آپؑ نے اسلام کے چھ مرحلے بیان فرمائے ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ اسلام حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔

۲۔ تسلیم یقین کے بغیر ممکن نہیں (کیونکہ یقین کے بغیر تسلیم اندھا دھند تسلیم ہے عالمانہ نہیں)
۳۔ یقین تصدیق کا دوسرا نام ہے (یعنی علم و دانائی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ اعتقاد اور تصدیق قلب ضروری ہے)۔
۴۔ تصدیق ہی اقرار ہے (یعنی قلب و روح سے تصدیق کافی نہیں بلکہ جرأت و ہمت سے اس کا اظہار بھی کرنا چاہیئے)۔
۵۔ اقرار ذمہ داری کو پورا کرنا ہے (اقرار تو زبان تک محدود ہوتا ہے، اصل تو مسئولیت اور ذمہ داری کو قبول کرنا ہے)۔
۶۔ مسئولیت کو قبول کرنا ادائیگی اور عمل ہی کو کہتے ہیں۔

اور وہ لوگ جو اپنی قوت و توانائی کو فقط گفتگو، بیانات، جلسوں اور کانفرنسوں ہی میں صرف کرکے رہ جاتے ہیں اور باتوں سے آگے نہیں بڑھتے وہ نہ اپنی ذمہ داری کو قبول کیے ہوئے ہیں اور نہ رُوحِ اسلام سے واقف ہیں۔

اسلام کے تمام پہلوؤں کو مدِ نظر رکھنے والی یہ واضح ترین تفسیر ہے۔

"وما اختلف الذین اوتوا الکتٰب الا من بعد ما جاءھم العلم بغیًا بینھم"

اس جملے میں قرآن نے مذہبی اختلافات کے سرچشمے کا تذکرہ کیا ہے اور فرمایا ہے، وہ لوگ جو حقیقت سے آگاہ تھے اس کے باوجود انہوں نے دینِ خدا میں اختلاف پیدا کیا اُن کے اس عمل کا سبب طغیان، سرکشی، ظلم و ستم اور حسد کے علاوہ کچھ نہیں تھا کیونکہ ہر آسمانی دین ہمیشہ واضح مدارک سے منسلک ہوتا ہے جن کی وجہ سے متلاشیانِ حقیقت کے لیے کوئی ابہام باقی نہیں رہتا۔ مثلاً پیغمبرِ اسلامؐ کے لیے واضح معجزات، کھلی نشانیوں اور روشن دلائل کے علاوہ جو آپ کے دین میں موجود تھے اور آپ کی حقانیت کے گواہ تھے۔ گذشتہ کتبِ آسمانی میں مذکور آپؐ کے اوصاف اور نشانیاں بھی موجود تھیں اور ان کتب کے کچھ حصے ان کے پاس تھے بھی اور اُنہی کے پیشِ نظر ان کے علماء آپؐ کے ظہور سے قبل آپؐ کے ظہور کی بشارت دیا کرتے تھے لیکن آپ کی بعثت کے بعد انہیں اپنے فوائد معرضِ خطر میں نظر آنے لگے اس لیے ظلم و ستم اور طغیان و سرکشی کی راہ اختیار کرتے ہوئے انہوں نے وہ سب کچھ پسِ پشت ڈال دیا۔

"فمن یکفر بایٰت اللہ فان اللہ سریع الحساب"

آیات کے آخر میں ایسے لوگوں کا مآلِ کار بیان کیا گیا: وہ لوگ جو آیاتِ الٰہی کو ٹھکرا دیتے ہیں، اپنے اعمال کا مکمل نتیجہ حاصل کریں گے۔ خدا تعالیٰ ان کے اعمال کا بہت جلد حساب کرے گا۔

سریع الحساب کے مفہوم کے بارے میں اسی جلد میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۰۲ کے ذیل میں بحث کی جا چکی ہے، اُس سے رجوع فرمائیں۔

مذہبی اختلافات کا سرچشمہ

ضمنی طور پر اس آیت سے ایک جالبِ نظر بات معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ زیادہ تر مذہبی اختلافات کا سرچشمہ

جہالت، نادانی اور بے خبری نہیں ہے بلکہ ، سرکشی، ظلم، انحراف حق اور ذاتی مفادات ہی اس کی بیشتر وجوہات ہوتی ہیں۔ اگر سب لوگ عموماً اور علماء خصوصاً تعصب، کینہ پروری، تنگ نظری، ذاتی مفادات اور اپنے حقوق سے تجاوز سے باز رہیں اور حقیقت شناسی اور عدالت سے کام لیتے ہوئے احکام الٰہی کا مطالعہ کریں تو انہیں شاہراہ حق بہت ہی واضح دکھائی دے گی اور اختلاف بہت تیزی سے حل ہو جائیں گے۔

یہ آیت درحقیقت ان لوگوں کا دنداں شکن جواب ہے جو کہتے ہیں کہ مذہب لوگوں میں اختلاف پیدا کرتا ہے اور اسی کی وجہ سے تاریخ میں بہت سی خون ریزیاں ہوئی ہیں۔ یہ لوگ دراصل "مذہب" اور "مذہبی تعصبات اور انحرافی افکار" میں فرق نہیں کر پائے کیونکہ اگر مذاہب کے احکام و قوانین کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ سب ایک ہی ہدف اور مقصد کے درپے ہیں اور سب سعادت بشر کے لیے آئے ہیں اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ سلسلہ تکمیل تک پہنچا ہے۔

آسمانی ادیان اصل میں آسمان سے برسنے والے بارش کے قطروں کی طرح ہیں۔ بارش کے سب قطرے حیات بخش ہیں لیکن وہ شورہ دار اور تلخ زمینوں پر پڑتے ہیں تو مختلف رنگوں اور ذائقوں میں بدل جاتے ہیں اور ان اختلاف کا بارش سے تعلق نہیں بلکہ ان کا تعلق تو زمینی کثافتوں اور آلودگیوں سے ہے۔

ادیان کے سلسلۂ تکامل پر آخری بات یہ ہے کہ ان میں سے آخری دین کامل تر ہے۔

۲۰۔ فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۗ وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ ۚ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ۝

ترجمہ

۲۰۔ اگر وہ تم سے گفتگو اور جھگڑے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں (تو ان سے مجادلہ نہ کرو) اور کہہ دو! میں اور میرے پیروکار خدا کے (اور اس کے فرمان کے) سامنے تسلیم ہیں اور جو اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) ہیں اور جو اَن پڑھ (مشرکین) ہیں ان سے کہہ دو کیا تم بھی تسلیم ہوئے ہو؟ اگر وہ (فرمانِ خدا اور منطق حق کے سامنے) سرِ تسلیم خم کر دیں تو ہدایت پالیں اور اگر

روگردانی کریں (تو تم پریشان نہ ہو کیونکہ تم پر تو ابلاغ رسالت کی ذمہ داری) ہے اور خدا بندوں کے (عقائد و اعمال) دیکھتا ہے۔

تفسیر

لغت میں "محاجّہ" بحث، مباحثہ، گفتگو، استدلال اور کسی عقیدے کے دفاع کو کہتے ہیں۔ یہ فطری امر ہے کہ ہر دین کے طرفدار اپنے مقصد اور عقیدے کا دفاع کرتے ہیں اور اس سلسلے میں اپنے آپ کو حقدار قرار دیتے ہیں اس لحاظ سے قرآن رسول اللہؐ سے کہتا ہے: ہو سکتا ہے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ وغیرہ) تم سے بحث کریں اور کہیں کہ ہم حق کے سامنے تسلیم ہیں اور حق کی طرفداری کے معنی میں اسلام کے پیروکار ہیں، یہاں تک کہ وہ اس بارے میں اپنی استقامت و پائداری کا مظاہرہ کریں جیسا کہ نجران کے عیسائیوں نے بھی پیغمبر اسلامؐ سے ایسی ہی گفتگو کی تھی۔

مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبرؐ اسلام کو یہ حکم نہیں دیا کہ اہل کتاب سے بحث مباحثہ اور گفتگو ہی نہ کی جائے بلکہ یہاں ایک اور حکم دیا گیا ہے جس کے مطابق جب بحث آخری مرحلے تک پہنچ جائے تو اس وقت نہ اُن کی راہنمائی کی ضرورت ہے نہ مخاصمت و مجادلہ کی۔ بہترین راستہ یہ ہے کہ انہیں کہیں کہ میں اور میرے پیروکار خدا کے سامنے تسلیم کئے ہوئے ہیں اور حق کے پیروکار ہیں اور پھر مشرکین سے کہیں کہ اگر وہ بھی خدا کے سامنے تسلیم ہیں اور پیرو حق ہیں تو انہیں چاہیے کہ منطقی گفتگو کے سامنے سر جھکا دیں اور اس صورت میں اُن سے بحث و مباحثہ اور گفتگو کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس مقام پر گفتگو بے محل اور بے اثر ہے اور تبلیغ رسالت کے علاوہ کوئی چیز تم پر لازم نہیں ہے "فان اسلموا فقد اهتدوا ۚ وان تولوا فانما عليك البلغ."

خدا تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال و افکار کو دیکھتا ہے "واللہ بصیرٌ بالعباد."

اس مقام پر چند نکات قابل توجہ ہیں:

۱۔ آیت سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ہٹ دھرم افراد سے بحث مباحثے سے پرہیز کرنا چاہیے جو صحیح منطق کو تسلیم نہیں کرتے۔

۲۔ "اُمّیّین[1]" سے اس آیت میں مراد "مشرکین" ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ذکر بھی کتاب (یہود و نصاریٰ) کے مقابلے میں آیا ہے اور ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں تھی کہ جس کی وجہ سے وہ پڑھنے لکھنے پر مجبور ہوتے۔

۳۔ اس آیت سے مکمل طور پر واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کا طریق کار فکر و نظر اور عقیدہ ٹھونسنا نہیں تھا، بلکہ آپؐ کی کوشش ہوتی تھی کہ لوگوں پر حقائق آشکار ہو جائیں اور پھر اُنہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ خود حق کی پیروی کے لیے عزم صمیم کریں۔

---

[1] اُمّی اُسے کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔

۲۱۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

۲۲۔ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝

ترجمہ

۲۱۔ جو لوگ آیاتِ خدا سے کفر کرتے ہیں انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں اور عدل کا حکم دینے والوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں انہیں دردناک عذاب کی بشارت دیجیئے۔

۲۲۔ وہ ایسے لوگ ہیں جن کے نیک اعمال (ان عظیم گناہوں کی وجہ سے) دنیا اور آخرت میں تباہ ہوگئے ہیں اور ان کا کوئی یاور و مددگار (اور شفاعت کرنے والا) نہیں ہے۔

تفسیر

اِن دو آیتوں میں پہلے ان تین عظیم گناہوں کا ذکر ہے:

۱۔ آیاتِ الٰہی سے کفر اختیار کرنا،

۲۔ انبیاء کو ناحق قتل کرنا اور

۳۔ انبیاء و مرسلین کے پروگرام کی حفاظت کرنے والوں اور لوگوں کو عدل و انصاف کا حکم دینے والوں کو بھی قتل کر دینا۔

اِس کے بعد ان کے لیے تین سزاؤں اور بدبختیوں کا تذکرہ ہے جو یہ ہیں:

۱۔ "فبشرھم بعذاب الیم" (انہیں دردناک عذاب کی بشارت دیجیئے) اِس جملے میں ان کے لیے سخت سزا کا ذکر ہے۔

۲۔ بعد والی آیت میں ہے: "اولئک الذین حبطت اعمالھم فی الدنیا

والاخـرة ." (یعنی اِن لوگوں کے اعمال اس دُنیا میں اور آخرت میں نابود اور اکارت ہو جائیں گے) اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو نیک اعمال وہ انجام دے چکے ہیں وہ بھی ان کے عظیم گناہوں سے متاثر ہوں گے اور اپنی تاثیر کھو بیٹھیں گے اور ضائع ہو جائیں گے۔

۳۔ آخر میں مزید کہا گیا ہے کہ انہیں ملنے والی سخت سزا اور شدید عذاب کے مقابلے میں کوئی بھی شخص ان کی حمایت کرنے والا نہیں ہوگا یعنی وہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت سے بھی محروم رہیں گے" وما لهـم من نـصـرين "۔

جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیہ ۶۱ کے ذیل میں ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ آیت یہودیوں کی عجیب تاریخ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ وہ آیاتِ الٰہی کے انکار کے علاوہ انبیاء کو قتل کرنے میں بھی بڑی جسارت کا مظاہرہ کرتے تھے اور ان مجاہدوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے جو انبیاء کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے لیکن مسلّم ہے کہ یہ حکم اور سزا ان کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ ان تمام اقوام کے بارے میں ہے جو ان جیسے افعال و اعمال بجالاتی ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ اہلِ عدل انبیاء کے ساتھ ساتھ: آیت میں عدالت کا حکم دینے والوں اور نیک کاموں اور حق کی دعوت دینے والوں کا تذکرہ انبیاء کے ساتھ ساتھ آیا ہے۔ خدا سے کفر کرنے والوں نیز انبیاء اور اہلِ عدل کو قتل کرنے والوں کو ایک سطح پر قرار دیا گیا ہے اور یہ چیز واضح کرتی ہے کہ اسلام نے معاشرے میں عدالت کے قیام کے لیے کس قدر اہتمام کیا ہے۔

دوسری آیت سے ایسے صالح افراد کو قتل کرنے والوں کے لیے شدید عذاب اور سزا کا پتہ چلتا ہے ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ " حبط " سب گناہوں کے لیے نہیں بلکہ ایسے شدید اور سخت گناہوں کے بارے میں ہے جو نیک اعمال کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔

علاوہ ازیں ایسے اشخاص کی شفاعت سے محرومی ان کے گناہوں کی شدت کے بارے میں ایک اور دلیل ہے۔

۲۔ ناحق قتل " بغـيـر حـق " سے یہ مراد نہیں کہ حق کے ساتھ پیغمبروں کو قتل کیا جا سکتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ انبیاء کا قتل ہمیشہ ناحق اور ظالمانہ فعل ہے۔ اصطلاح میں "بغیر حق" کے الفاظ "قید توضیحی" کے طور پر ہیں اس لیے تاکید کے لیے ہیں۔

۳۔ "بشارت" کا مفہوم: "بشارت" کا لفظ دراصل نشاط انگیز خبروں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ان کا اثر انسانی "بشرہ" اور صورت پر ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن کی اس آیت میں اور دیگر آیات میں عذاب کے موقع پر اس لفظ کا استعمال درحقیقت ایک قسم کی تنبیہ ہے اور گنہ گاروں کے افکار و نظریات پر استہزا ہے۔ ایسی گفتگو ہمارے روزمرہ میں بھی مروج ہے۔ جب کوئی برا کام انجام دیتا ہے تو سرزنش اور استہزاء کے طور پر کہتے ہیں: "ہم تجھے اس کا اجر اور بدلہ دیں گے"۔

۱۔ "حبط" کے مسئلے کے بارے میں تحقیق کے لیے سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۷ کی تفسیر سے رجوع کریں۔

۲۳۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

۲۴۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ وَّغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝

۲۵۔ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۳۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کے پاس (آسمانی) کتاب کا کچھ حصّہ ہے اور ان میں فیصلہ کے لیے انہیں کتاب خدا کی طرف دعوت دی گئی ہے لیکن (علم وآگہی کے باوجود) ان میں سے ایک فریق نے روگردانی کی جب کہ وہ (قبولِ حق سے) اعراض کیے ہوئے تھے۔

۲۴۔ (ان کا) یہ (عمل)، اس بنا پر تھا کہ وہ کہتے تھے کہ چند دن کے سوا (جہنم کی) آگ ہم تک نہیں پہنچے گی (اور دوسری قوموں سے ہمارے امتیاز کی وجہ سے ہمیں بہت ہی محدود سزا ملے گی)، اور (خدا پر باندھے گئے) اس افتراء نے انہیں بہت مغرور کر دیا تھا۔

۲۵ س وقت ان کی کیا حالت ہوگی جب ہم ان کو ایک ایسے دن (قیامت) جس کے آنے میں کوئی

شک نہیں ہے اکٹھا کریں گے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں ہوگا (بلکہ وہ اپنے اعمال کی فصل ہی کاٹیں گے)

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان میں ابن عباس سے منقول :

رسول اللہؐ کے زمانے میں خیبر کے یہودیوں میں سے ایک عورت اور ایک مرد زنائے محصنہ[1] کے مرتکب ہوئے ۔ باوجودیکہ تورات میں ایسے اشخاص کو سنگسار کرنے کا حکم تھا، چونکہ یہ مرد عورت اشراف میں سے تھے اس لیے ان پر یہ حکم جاری کرنے میں توقف برتا گیا اور تجویز ہوا کہ پیغمبر اسلامؐ سے رجوع کیا جائے اور ان سے فیصلہ حاصل کیا جائے ۔ انہیں توقع تھی کہ آپؐ کی طرف سے کم سزا معین ہوگی لیکن رسول اللہ نے بھی ان کے لیے وہی سزا معین فرمائی ۔ اس فیصلے پر بعض یہودیوں اور ان کے وڈیروں میں سے بعض نے اعتراض کیا اور اس بات کا انکار کر دیا کہ یہودی مذہب کے مطابق یہ فیصلہ درست ہے ۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا : یہ موجودہ تورات ہی تمہارے اور میرے درمیان فیصلہ کرے گی ۔

انہوں نے قبول کر لیا ۔ ابن صوریا ان کا ایک عالم تھا ۔ اسے فدک سے مدینہ بلایا گیا تھا ۔ پیغمبر اکرمؐ نے اسے پہچان لیا اور فرمایا : تو ابن صوریا ہے ؟

اس نے عرض کیا : جی ہاں ۔

آپؐ نے فرمایا : کیا تم یہودیوں میں اعلم علماء ہو ؟

اس نے کہا : وہ یہی سمجھتے ہیں ۔

پیغمبر اکرمؐ نے حکم دیا کہ اس کے سامنے تورات کا وہ حصہ رکھا جائے جس میں سنگسار کرنے کا حکم ہے ۔

وہ چونکہ پہلے سے باخبر تھا اس لیے جب تورات کی اس آیت تک پہنچا تو اس پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کے بعد کے جملے پڑھ دیے ۔

عبداللہ بن سلام جو پہلے یہودی علماء میں سے تھا اور مسلمان ہوگیا تھا ، وہاں

---

[1] شادی شدہ افراد کے زنا کو "زنائے محصنہ" کہتے ہیں (مترجم)

موجود تھا۔ وہ ابن صوریا کی اس پردہ پوشی پر متوجہ ہو کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور اس کا ہاتھ اس جملے سے ہٹا دیا اور متن تورات میں سے اسے پڑھا اور کہا کہ تورات کہتی ہے : یہودیوں کے لیے ضروری ہے جب کوئی عورت اور مرد زنائے محصنہ کے مرتکب ہوں اور ان کے جرم کا کافی ثبوت موجود ہو تو انہیں سنگسار کر دیا جائے۔

اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے حکم دیا کہ ان کے دین کے مطابق مذکورہ سزا ان دو مجرموں پر جاری کی جائے۔

اس پر یہودیوں کی ایک جماعت سیخ پا ہو گئی، زیر نظر آیت اسی کیفیت کے بارے میں نازل ہوئی ہے [1]

تفسیر

ان آیات میں صراحت سے اہل کتاب کی چند خیانتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ کیسے حیلہ جوئی اور بہانہ جو مطالب کے ذریعے حدود الٰہی کے نفاذ سے بغاوت کرتے تھے۔ حالانکہ ان کے پاس موجود آسمانی کتاب صراحت سے حکم بیان کر چکی ہوتی تھی کہ اپنی مذہبی کتاب میں موجود حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں "الم تر الی الذین اوتوا نصیبا من الکتٰب یدعون الی کتٰب اللہ لیحکم بینھم"۔

لیکن انہوں نے صریحاً اس کی مخالفت کی اور مخالفت بھی ایسی جسے اعراض، سرکشی اور احکام خدا پر نکتہ چینی کہا جانا چاہیئے "ثم یتولی فریق منھم وھم معرضون"۔

"اوتوا نصیبا من الکتٰب" سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جو تورات اور انجیل یہود و نصاریٰ کے پاس موجود تھی وہ ساری حقیقی تورات اور انجیل نہ تھی بلکہ یہ تو اس کا صرف ایک حصہ تھا اور ان دونوں آسمانی کتابوں کا بیشتر حصہ یا غائب تھا یا پھر تحریف شدہ تھا۔

اس آیت کی قرآن کی دیگر آیات بھی تائید کرتی ہیں۔ نیز تاریخی شواہد بھی اس کے مؤید ہیں۔

دوسری آیت میں ان کی مخالفت اور روگردانی کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ ان کی ایک باطل اور غلط فکر تھی اور وہ یہ کہ وہ ایک بلند اور ممتاز خاندان سے ہیں۔ آج بھی وہ ایسا ہی سمجھتے ہیں اور بہت سی تحریریں ان کی نسل پرستی کی شاہد ہیں۔ ان کا اعتقاد تھا کہ پروردگار عالم سے ان کا ایک ... تعلق ہے یہاں تک کہ وہ اپنے تئیں خدا کے بیٹے کہتے تھے

---

[1] اس وقت موجودہ تورات میں سفر لاویان کی بیسویں فصل کے دسویں جملے میں ہے : اور جو شخص کسی غیر کی عورت سے زنا کرے (مثلاً) اپنے ہمسائے کی بیوی سے زنا کرے تو چاہیے کہ زانی اور زانیہ کو قتل کر دیا جائے۔

اس عبارت میں اگرچہ سنگسار کا حکم صراحت سے نہیں ہے لیکن انہیں قتل کر دینے کی اصل سزا کا حکم ہے۔ ممکن ہے پیغمبر اسلامؐ کے زمانے کے نسخوں میں وہ عبارت موجود ہو۔

جیسا کہ سورہ مائدہ آیہ اٹھارہ میں ان کی زبان سے قرآن نے نقل کیا ہے۔

"نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ "

ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے خاص دوست ہیں۔

اسی لیے وہ خدائی سزا کے مقابلے میں ایک قسم کی معنویت کے قائل تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے محفوظ رہیں گے اور اس امر کو خدا کی طرف بھی منسوب کرتے تھے لہٰذا ان کا اعتقاد تھا کہ ان میں سے گنہ گار افراد بھی قیامت میں چند دنوں کے سوا عذاب میں مبتلا نہیں ہوں گے۔ جیسا کہ محل بحث آیات میں بھی ہے:

"قالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودات "

ان ایام معدود سے مراد یا تو وہ چالیس دن تھے جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں انہوں نے گوسالہ پرستی شروع کردی تھی، یہ ایسا گناہ تھا کہ وہ خود بھی اس کا انکار نہیں کر سکتے تھے یا پھر اس سے مراد ان کی زندگی کے معدود اور گنے چنے دن تھے کہ جن میں انہوں نے بہت زیادہ واضح اور ناقابلِ انکار گناہوں کا ارتکاب کیا تھا اور وہ خود بھی ان گناہوں کی توجیہ اور پردہ پوشی نہ کر سکتے تھے۔

خدا کی طرف منسوب یہ جھوٹے اور جعلی امتیازات رفتہ رفتہ ان کے عقائد کا جز بن گئے جس سے وہ مغرور ہو گئے تھے یہاں تک کے احکام خدا کی مخالفت اور قانون شکنی میں بھی بے باک ہو گئے تھے ("وغرهم في دينهم ما كانوا يفترون ")۔

تیسری آیت میں قرآن ان تمام باطل خیالات پر خط بطلان کھینچتا ہے اور کہتا ہے: ایک روز یقیناً پروردگار کی بارگاہِ عدل میں دیگر انسانوں کی طرح پیش ہوں گے اور ہر شخص اپنے اعمال کا سامنا کرے گا چونکہ وہ اپنے ہی اعمال کا سامنا کریں گے اور اپنے ہی اعمال کا نتیجہ پائیں گے اس لیے انہیں جو بھی سزا ملے گی اس میں ان پر کسی قسم کا ظلم و ستم نہیں ہوگا کیونکہ یہ تو سب ان کے کیے کا ماحصل ہوگا " ووفيت كل نفس ما كسبت وهم لا يظلمون "

"ما كسبت " سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ قیامت کے دن کی جزا و سزا اور دوسرے جہان کی خوش بختی و بدبختی صرف انسانی اعمال سے وابستہ ہے اور اس میں کوئی اور چیز مؤثر نہیں ہے۔ اس حقیقت کی طرف بہت سی آیاتِ مجیدہ میں اشارہ ہوا ہے۔

دو سوال اور ان کا جواب

کیا یہ ممکن ہے کہ انسان کوئی جھوٹ بولے یا خدا پر افترا باندھے اور پھر خود ہی اس کے زیر اثر آجائے اور اس کے نتیجے میں مغرور ہو جائے جیسا کہ زیر نظر آیات میں فرمایا گیا ہے؟ کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے کیونکہ وجدان کو دھوکا اور فریب دینے کا مسئلہ آجکل نفسیات کے

مسلمہ مسائل میں سے ہے بعض اوقات قوت فکر و نظر وجدان کو غافل کر دیتی ہے اور حقیقت کے چہرے کو بگاڑ دیتی ہے۔ ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ بڑے بڑے گناہوں مثلاً قتل، چوری یا طرح طرح کی بُری عادات میں ملوث افراد اپنے اعمال کی قباحت کو اچھی طرح جاننے کے باوجود وجدان کی جھوٹی تسکین کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ وہ لوگوں پر کیئے گئے ظلم کا انہیں مستحق قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں یا اپنی ضرر رساں عادتوں کی توجیہ کرتے ہیں۔ زندگی کی ناہمواریوں اور معاشرے کی طاقت فرسا مشکلات کا نام لے کر اپنے لیے منشیات کے استعمال کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ جھوٹے امتیازات اہل کتاب کی گذشتہ نسلوں نے گھڑے تھے اور بعد کی نسلیں جو اس سے آگاہ نہیں تھیں انہوں نے نے اسے بلا تحقیق صحیح عقیدے کے طور پر اپنا لیا۔

۲۔ یہ بھی سوال کیا جا سکتا ہے کہ محدود عذاب اور سزا کا عقیدہ تو مسلمانوں میں بھی موجود ہے کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ حقیقی مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذاب الٰہی میں مبتلا نہیں رہیں گے اور آخرکار ان کا ایمان ان کی نجات کا سبب بنے گا۔

توجہ رہے کہ ہمارا یہ عقیدہ ہرگز نہیں کہ ایک گنہ گار اور طرح طرح کے جرائم میں آلودہ مسلمان صرف چند دن عذاب الٰہی میں مبتلا رہے گا بلکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ سالہا سال تک گرفتارِ سزا رہے گا اور اس کی سزا کی اصل مدت خدا تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے ممکن ہے اسکے ایمان کی وجہ سے اس کی سزا دائمی اور ابدی نہ ہو اور اگر واقعاً مسلمانوں میں کچھ ایسے افراد ہوں جو یہ سمجھتے ہوں کہ وہ اسلام، پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اطہارؑ پر ایمان کے نام پر ہر طرح کا گناہ کرنے کے مجاز ہیں اور اس پر انہیں چند روز کے علاوہ سزا نہیں ہوگی تو وہ بہت بڑے اشتباہ کا شکار ہیں اور روحِ اسلام اور تعلیماتِ اسلامی سے دُور ہیں۔

ہم اِس معاملے میں مسلمانوں کے لیے امتیاز کے قائل نہیں بلکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہر امت کے افراد جو اپنے اپنے زمانے کے پیغمبر پر ایمان رکھتے تھے مگر کسی گناہ کے مرتکب ہوگئے ہوں تو وہ بھی اِس قانون کے تحت آتے ہیں چاہے وہ کسی قوم یا قبیلے سے ہوں جبکہ یہودی صرف بنی اسرائیل کے لیے اِس امتیاز کے قائل ہیں اور دیگر اقوام عالم کے تئیں وہ ایسے کسی قانون کو نہیں مانتے۔

قرآن اُن کے اس جھوٹے امتیاز کا جواب دیتے ہوئے سورہ مائدہ کی آیت ۱۸ میں کہتا ہے۔

"بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ۔"

تم بھی دیگر انسانوں کی طرح ہو

۲۶۔ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝

۲۷۔ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○

ترجمہ

۲۶۔ کہیے بارالٰہا! حکومتوں کا مالک تو ہے، تو ہی جسے چاہتا ہے کہ حکومت بخشتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت لے لیتا ہے جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے، تمام خوبیاں تیرے ہاتھ میں ہیں کیونکہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

۲۷۔ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، مُردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مُردہ کو نکالتا ہے اور جسے چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔

شانِ نزول

مشہور مفسر طبرسی نے مجمع البیان میں اس سلسلے میں دو شان نزول بیان کی ہیں اور ہر دو ایک ہی حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے۔ ذیل میں دونوں شان نزول پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ پیغمبر اکرمؐ نے مکہ فتح کر لیا تو مسلمانوں کو خوشخبری دی کہ بہت جلد ایران اور روم بھی پرچم اسلام کے نیچے ہوں گے۔ یہ بات سُنی تو منافقین کہ جن کے دل ابھی نورِ ایمان سے روشن نہیں ہوئے تھے اُسے مبالغہ آمیز سمجھنے لگے اور تعجب سے کہنے لگے۔

محمدؐ نے مدینہ اور مکہ کو کافی نہیں سمجھا اور ایران و روم کی لالچ بھی رکھتا ہے۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں۔

۲۔ جب پیغمبر اکرمؐ مدینے کے باہر مسلمانوں کے ساتھ خندق کھود رہے تھے، مسلمان نہایت نظم و نسق اور انہماک سے دستوں میں منقسم ہو کر خندق کھودنے میں مصروف تھے تاکہ دشمن کے آنے سے پہلے یہ دفاعی کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ اچانک خندق میں سے ایک سفید اور سخت پتھر نکلا جسے مسلمان ہلانے اور توڑنے میں ناکام ہو گئے۔ سلمانؓ پیغمبر اکرمؐ کے پاس آئے اور ماجرا بیان کیا۔ آنحضرتؐ خندق میں اُترے، سلمان سے کدال لی اور زور سے پتھر پر ماری۔

کدال پتھر پر لگی تو ایک شعلہ نکلا ۔ اس پر پیغمبر اکرمؐ نے کامیابی کی تکبیر بلند کی ۔ مسلمان بھی آپؐ کے ہم آواز ہوئے اور ہر طرف سے تکبیر بلند ہوئی ۔ نبی اکرمؐ نے دوسری دفعہ کدال پتھر پر ماری تو پھر شعلہ نکلا اور کچھ پتھر ٹوٹ گیا ۔ پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں نے پھر تکبیر بلند کی ، تکبیر کی آواز سے فضا گونج اٹھی ۔ آپؐ نے تیسری مرتبہ کدال بلند کی اور باقی پتھر پر زور سے ماری پھر شعلہ نکلا جس سے چاروں طرف چمک پھیلی اور باقی پتھر بھی ٹوٹ گیا اور پھر تیسری مرتبہ تکبیر کی آواز خندق میں گونجی ۔

سلمان نے عرض کیا : آج میں نے آپؐ سے یہ عجیب و غریب چیز دیکھی ہے

پیغمبر اکرمؐ نے ارشاد فرمایا : پہلی مرتبہ شعلہ نکلا تو اس میں میں نے حیرہ اور مدائن کے محلات دیکھے اور میرے بھائی جبرئیلؑ نے مجھے بشارت دی کہ وہ پرچم اسلام کے نیچے آئیں گے ۔ دوسرے شعلے میں میں نے روم کے محلات دیکھے اور جبرئیلؑ نے بشارت دی کہ وہ میرے پیروکاروں کے قبضے میں آئیں گے اور تیسرے شعلے میں میں نے صنعاء اور یمن کے محلات دیکھے اس پر جبرئیلؑ نے بشارت دی کہ مسلمان انہیں بھی فتح کرلیں گے ۔ اسی لیے میں نے تکبیر کہی ۔ اے مسلمانو! تمہیں مبارک ہو ۔ مسلمان تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے اور خدا کا شکر ادا کرتے تھے لیکن منافقین کے چہرے بگڑ گئے اور وہ مغموم ہوگئے ۔ وہ اعتراض کرنے لگے : کیسی غلط آرزو ہے اور کیسا محال وعدہ ہے حالانکہ اس وقت تو انہوں نے اپنی جان کے خطرے سے دفاعی حالت اختیار کر رکھی ہے ، خندق کھود رہے ہیں ، اس چھوٹے دشمن سے بھی جنگ کے قابل نہیں ہیں اور سر میں دنیا کے عظیم ملکوں کی فتح کا سودا سمایا ہوا ہے ۔

اس موقع پر محل بحث آیات نازل ہوئیں جن میں ان منافقین کو جواب دیا گیا ہے ۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں مشرکین اور اہل کتاب کے بارے میں گفتگو تھی کہ وہ کیسے ملک اور عزت کو اپنے لیے مخصوص جانتے ہیں اور خود کو اسلام سے بے نیاز سمجھتے ہیں ۔ اب ان آیات میں خداوند عالم ان کے اس زعم باطل کو غلط ثابت کرتا ہے اور فرماتا ہے : خدا ہی ہر ملک و سلطنت کا مالک ہے ، خیر و نیکی اس کے قبضے میں ہے ، وہ قدرت مطلقہ ہے اور ہر حالت میں اسی کی پناہ حاصل کرنا چاہیئے ۔

موجودات کا حقیقی مالک وہی ہے جو ان کا خالق و پروردگار ہے ، جیسا کہ سورہ مومن کی آیہ ۶۲ میں ہے :

"ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ":

یہ خدا جو تمہارا پروردگار ہے ، تمام چیزوں کا خالق ہے

وہ وہی ہے جو جسے چاہتا ہے ملک و سلطنت بخش دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے ۔ وہی عزت دیتا ہے اور وہی جسے چاہتا ہے خاک ذلت میں بٹھا دیتا ہے ۔ یہ سب کچھ اس نے قبضۂ قدرت میں ہے اور اس کے زیر فرمان ہے ۔ وہ اپنے افعال میں مجبور نہیں ہے ۔ وہ فاعل مختار ہے نہ کہ فاعل مجبور ۔

بدیہی ہے کہ مشیت و ارادہ سے ان آیات میں یہ مراد نہیں کہ وہ بغیر کسی حساب کتاب کے یا بغیر کسی وجہ کے کسی کو کوئی چیز عطا کرتا ہے اور کسی سے کوئی چیز لے لیتا ہے بلکہ اس کی مشیت حکمت سے وابستہ ہے جہاں

خلقت کا پورا نظام اور عالمِ انسانیت کا سارا پروگرام اس کی مصلحت وحکمت کے تحت چل رہا۔ اس لیے وہ جو کام بھی کرتا ہے اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہترین اور صحیح ترین ہوتا ہے۔

"بیدک الخیر انک علی کل شیء قدیر" :

لفظ "خیر" کا فارسی میں متبادل ہے "بہتر"۔ یہ افضل التفضیل اور ایک چیز کی دوسری پر برتری بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تاہم ہر اچھے امر کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ آیہ ۲۲۱ میں ہے:

"و لعبد مؤمن خیر من مشرک"

بت پرست کی نسبت بندۂ مومن سے شادی کرنا بہتر ہے

ظاہر ہے کہ مشرک میں تو کوئی اچھائی اور خوبی نہیں کہ کہا جا سکے کہ وہ اچھا ہے اور مومن اس سے بہتر ہے۔
افضل التفضیل کے مفہوم میں بھی بعض اوقات یہ بات آجاتی ہے مثلاً سورہ یوسف کی آیہ ۳۳ میں حضرت یوسف کی زبانی فرمایا گیا ہے:

"رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ" :

یعنی — پروردگار! یہ شرمناک عمل زنا جس کی مجھے مصر کی عورتیں دعوت دے رہی ہیں اس سے قید مجھے زیادہ محبوب ہے۔

واضح ہے زنا کوئی ایسا عمل نہیں کہ جو حضرت یوسفؑ کی نظر میں محبوب ہو کہ اسے قید سے زیادہ محبوب قرار دیا جائے اس بناء پر افضل التفضیل صرف موازنے کے لیے استعمال ہوتا ہے اگرچہ ایک طرف وہ صفت بالکل موجود نہ ہو اور فقط دوسری طرف پائی جاتی ہو۔

"بیدک الخیر" یہ الفاظ دو حوالوں سے یہ بتاتے ہیں کہ تمام خیرات اور اچھائیاں خدا تعالیٰ میں منحصر ہیں۔

۱۔ لفظ خیر کے ساتھ الف اور لام ہے اور یہاں اسے الف لام استغراق کہتے ہیں۔
۲۔ یہاں مبتداء یعنی "خیر" بعد میں ہے اور "بیدک" جو اس کی خبر ہے وہ پہلے ہے۔
اور یہ دونوں چیزیں حصر کی دلیل ہیں۔

اس لیے ان الفاظ کا معنی کچھ یوں ہوگا: تمام نیکیاں تیرے ہی قبضۂ قدرت میں ہیں۔

"بیدک الخیر" سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ ہر قسم کی خیر اور سعادت کا سرچشمہ ہے۔ وہ عزت بخشتا یا ذلت دیتا ہے تو یہ سب کچھ قانونِ عدالت کے مطابق ہوتا ہے اور اس میں کچھ بھی "شر" نہیں ہوتا۔

"اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ"

یہ جملہ گذشتہ حصے کی دلیل کے طور پر آیا ہے۔ یعنی جب خدا قدرتِ مطلقہ کا مالک ہے تو پھر کوئی اشکال اور شبہ نہیں ہے کہ تمام نیکیاں اور اچھائیاں اس کے ارادے کے ماتحت ہوں گی۔

صالح اور غیر صالح حکومتیں

یہاں ایک اہم مسئلہ درپیش ہوگا اور وہ یہ کہ ممکن ہے مندرجہ بالا آیت سے کچھ لوگ یہ نتیجہ اخذ کریں کہ جس شخص کو بھی حکومت ملتی ہے اور جس سے بھی حکومت چھن جاتی ہے سب ارادۂ الٰہی کے تحت ہوتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ تاریخ میں گزرنے والے چنگیز اور ہٹلر جیسے جابر اور ستمگر حکمرانوں کی حکومت پر بھی مہر تصدیق ثبت کردی جائے۔ اتفاق سے تاریخ کہتی ہے کہ یزید بن معاویہ نے اپنی شرمناک اور ظالمانہ حکومت کے جواز اور توجیہ کے لیے اسی آیت سے استدلال کیا تھا۔[1]

یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے اس اعتراض کے جواب میں آیت کی مختلف وضاحتیں پیش کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ آیت خدائی حکومتوں سے مخصوص ہے یا پیغمبر اکرمؐ کی حکومت کے قیام اور قریش کی ظالم حکومتوں کے اختتام سے مخصوص ہے۔

لیکن حق یہ ہے کہ آیت ایک کلی اور عمومی مفہوم کی حامل ہے جس کے مطابق تمام اچھی اور بری حکومتیں خدا تعالیٰ کی مشیت اور ارادے کے مطابق ہیں مگر اس کا مفہوم یہ ہے کہ خداوند عالم نے اس دنیا میں کامیابی اور پیش رفت کے لیے عوامل و اسباب کا ایک سلسلہ پیدا کیا ہے اور ان آثار سے فائدہ اٹھانا ہی مشیت خدا ہے۔ اس لیے خدا کی مشیت سے مراد وہ آثار ہیں جو ان عوامل و اسباب میں پیدا کیے گئے ہیں۔ اب اگر چنگیز، یزید اور فرعون جیسے ظالم اور غیر صالح افراد کامیابی کے ان وسائل سے استفادہ کریں اور کمزور، پسماندہ اور بزدل قومیں اپنے آپ کو ان کے سپرد کردیں اور ان کی شرمناک حکومت کو گوارا کریں تو یہ ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ کہاوت ہے: ہر قوم اسی حکومت کی لائق ہے جو اس پر قائم ہے۔

مگر قومیں بیدار ہوں اور جابر و قاہر بادشاہوں سے یہ اسباب چھین کر صالح اور اہل ہاتھوں میں دے دیں اور عادلانہ حکومتیں قائم کریں تو یہ بھی ان کے اعمال کا نتیجہ ہے جو الٰہی اسباب و عوامل سے استفادہ کے طریقے سے وابستہ ہے۔

درحقیقت یہ آیت تمام افراد اور تمام انسانی معاشروں کی بیداری کے لیے ایک پیغام ہے تاکہ وہ ہوشیار ہیں اور اس سے پہلے کہ غیر صالح افراد ان عوامل کے ذریعے معاشرے کے حساس منصب سنبھال لیں اور تمام اہم مورچوں پر قبضہ کر لیں، یہ خود کامیابی کے وسائل سے فائدہ اٹھائیں۔

"تولج الیل فی النہار و تولج النہار فی الیل":

"ولوج" لغت میں اور دن کو رات میں داخل کرنا ہے۔ آیت کہتی ہے۔ اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ قرآن مجید میں آٹھ دیگر مقامات پر بھی اس بات کا تذکرہ موجود ہے۔

اس آیت سے مراد وہی تدریجی اور حسی تبدیلی ہے جو سال بھر میں رات دن میں ہم دیکھتے ہیں۔ یہ تبدیلی اس کرۂ ارض کے محور کے اپنے مدار سے جھکاؤ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو ۲۳ درجے سے کچھ زیادہ ہے اور اس سے سورج کی کرنوں کے زاویے بھی بدل جاتے ہیں۔ اسی لیے بلاد شمالی (خط استوا سے اوپر والے علاقے) میں سردیوں کی ابتداء میں دن بڑھنے لگتے ہیں اور راتیں چھوٹی ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس گرمیوں کے آغاز میں راتیں بڑھنے لگتی ہیں اور دن

---

[1] المیزان بحوالہ ارشاد از شیخ مفید

چھوٹے ہوتے جاتے ہیں اور سردیوں کی ابتداء تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جب کہ بلادِ جنوبی (خطِ استوا کے نیچے والے حصّہ) میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔

اِس لیے خدا تعالیٰ ہمیشہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا رہتا ہے یعنی ایک میں کمی کرتا ہے اور دوسرے میں اضافہ کر دیتا ہے ممکن ہے کہا جائے کہ خطِ استوار کے اُوپر اور اس طرح قطب شمالی اور قطب جنوبی کے اصلی نقطے میں رات دن تمام سال برابر رہتے ہیں اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی اور تغیر رونما نہیں ہوتا۔ خطِ استوا پر سال بھر رات دن بارہ بارہ گھنٹے کے اور قطب شمالی اور جنوبی میں سال میں ایک رات چھ ماہ کی اور ایک دن بھی چھ ماہ کا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ آیت عمومی پہلو نہیں رکھتی۔

اِس کے جواب میں کہنا چاہیے کہ حقیقت میں خطِ استوا ایک فرضی خط کے سوا کچھ نہیں اور لوگ ہمیشہ سے خطِ استوا کے اِس طرف یا اُس طرف زندگی بسر کرتے چلے آ رہے ہیں اِس طرح نقطۂ قطب بھی فرضی نقطے سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا اور شمالی و جنوبی قطب میں رہنے والے لوگوں کی زندگی (اگر وہاں کوئی رہتا ہو تو) یقیناً قطب کے حقیقی نقطے سے وسیع تر جگہ میں ہوگی اِس بناء پر دونوں صورتوں میں رات اور دن کا اختلاف موجود ہے۔

ممکن ہے اِس آیت کا مندرجہ بالا مفہوم کے علاوہ ایک اور معنی بھی ہو اور وہ یہ کہ کرۂ ارض میں فضا کے طبقات کی وجہ سے اس میں اچانک رات اور دن پیدا نہیں ہوتے بلکہ فجر اور شفق سے شروع ہو کر دن آہستہ آہستہ چھپتا جاتا ہے اور رات کا آغاز مشرق کی سُرخی سے ہوتا ہے اور تدریجاً تمام جگہوں پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ رات اور دن میں تدریجی تبدیلی جس حوالے سے بھی ہو انسان اور کرۂ ارض کے دیگر موجودات کے لیے فائدہ مند ہے۔ سبزوں، فصلوں اور بہت سے جانداروں کی پرورش سُورج کی تدریجی روشنی اور حرارت کی مرہونِ منت ہے آغازِ بہار سے جوں جوں دھوپ کی شدّت اور حدت میں اضافہ ہوتا ہے نباتات اور حیوانات اپنے تکامل کے تھے مختصر مرحلے طے کرتے ہیں اور انہیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ روشنی اور حرارت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ضرورت شب و روز کے تدریجی سفر سے پوری ہوتی ہے اور یہاں وہ اپنے ارتقاء کے آخری نقطے تک پہنچ جاتے ہیں۔

اگر رات اور دن ایک سے ہوتے تو بہت سے نباتات اور حیوانات نشوونما اور رشد و تکامل سے محروم رہ جاتے اور چار فصلوں کا تصور بھی نہ ہوتا کیونکہ وہ بھی اختلافِ لیل و نہار اور سُورج کی کرنوں کے بدلتے ہوئے زاویوں کے مرہونِ منت ہیں۔ یوں انسان فطری طور پر موسموں کے اختلاف کے فوائد سے بے بہرہ رہ جاتا۔

اِسی طرح اگر آیت کے دوسرے مفہوم کو پیشِ نظر رکھیں کہ رات اور دن تدریجی طور پر تبدیل ہوتے ہیں ناگہانی طور پر نہیں اور شفق، طلوعِ صبحِ صادق اور طلوعِ آفتاب رات اور دن کے درمیان ظہور پذیر ہوتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ رات اور دن کا یہ تدریجی عمل زمین میں رہنے والوں کے لیے ایک عظیم نعمت ہے کیونکہ اِس طرح وہ آہستہ آہستہ تاریکی یا روشنی سے ہمکنار ہوتے ہیں اور یہی صورت ان کی جسمانی اور اجتماعی کیفیت میں سازگار ہے جب کہ دوسری صورت بہت سی پریشانیوں کا سبب بن سکتی تھی۔

"وتخرج الحی من المیت و تخرج المیت من الحی"

یہ تعبیر بھی قرآن کی کئی ایک آیات میں موجود ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے: خدا زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔

زندہ کو مردہ سے نکالنے سے مراد بے جان موجودات سے حیات کو پیدا کرنا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جب زمین زندگی

کو قبول کرنے کے قابل ہوئی تو زندہ موجودات بے جان مادہ سے معرضِ وجود میں آئے۔ علاوہ ازیں ہمارے بدن میں اور تمام عالم کے زندہ موجودات میں بے جان مواد خلیوں (CELLS) کا جزبن کر زندہ موجود میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

زندہ موجودات سے مردہ وجود کی پیدائش کا عمل بھی ہماری آنکھوں کے سامنے جاری وساری رہتا ہے۔

یہ آیت درحقیقت موت وحیات کے دائمی قانون تبادل کی طرف اشارہ ہے جو بہت عام اور بہت پیچیدہ ہے اس کے باوجود نہایت جاذبِ نظر اور عجیب ترین قانون ہے جو ہم پر حکمران ہے۔

اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی ہے جو گذشتہ تفسیر کی نفی نہیں کرتی اور وہ ہے معنوی و روحانی زندگی اور موت کا مسئلہ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات صاحبانِ ایمان جو حقیقی زندہ ہیں بے ایمان افراد جو دراصل مردہ ہیں سے معرضِ وجود میں آتے ہیں اور بعض اوقات اس کے برعکس بے ایمان افراد اہلِ ایمان سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے معنوی زندگی اور موت کو متعدد آیات میں ایمان اور کفر سے تعبیر کیا ہے۔

اس تفسیر کے مطابق قرآن قانونِ توارث کی بنیادوں کو منہدم کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جب کہ دانشور اسے طبیعت کے قطعی قوانین میں سے سمجھتے ہیں۔ انسان طبیعت کے بے جان موجودات کی طرح نہیں ہے کیونکہ یہ موجودات مختلف عوامل کے زیرِ اثر مجبور ہیں جب کہ انسان ارادے کی آزادی کا حامل ہے اور یہ بذاتِ خود اللہ کی ایک قدرت نمائی ہے کہ وہ کافر کی اس اولاد سے آثارِ کفر محو کر دیتا ہے جو واقعاً مومن بننا چاہے اور مومن کی اس اولاد سے آثارِ ایمان دھو ڈالتا ہے جو کافر بننا پسند کرے۔ ارادے کا یہ استقلال جو ہر طرح کے مساعد و نامساعد حالات میں توارث پر غالب آجاتا ہے، اسی کی طرف سے ہے۔

یہی مفہوم پیغمبرِ اسلامؐ کی ایک روایت میں ہم تک پہنچا ہے۔ تفسیر درِ منثور میں سلمان فارسی سے منقول ہے:

رسول اللہ نے " تخرج الحی من المیت"..... کی

تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا: اللہ تعالیٰ مومن کو کافر کی صلب سے اور کافر کو مومن کی صلب سے نکالتا ہے۔

" وترزق من تشاء بغیر حساب "

اصطلاح کے مطابق یہ جملہ "خاص" کے بعد "عام" کے قبیل میں سے ہے۔ گذشتہ جملوں پر خدا کی طرف سے بندوں کو رزق دینے کے چند نمونے بیان ہوئے تھے اور اس جملے میں مسئلہ عمومی صورت میں بیان کیا گیا ہے جس میں ہر طرح کے رزق اور تمام عطیات کا ذکر کیا گیا ہے یعنی نہ صرف یہ کہ عزت، حکومت، موت اور زندگی خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے بلکہ ہر روزی، نعمت اور عنایت اُسی کی طرف سے ہے۔

" بغیر حساب " اس طرف اشارہ ہے کہ عنایاتِ خداوند کے دریا اس قدر وسیع اور گہرے ہیں کہ وہ جتنی بھی مقدار جسے بھی بخش دے ان میں کچھ فرق نہیں آتا اور وہ حساب رکھنے کا محتاج نہیں کیونکہ حساب تو وہ رکھتے ہیں جن کا سرمایہ محدود ہو اور اس کے کم یا ختم ہو جانے کا خوف ہو لیکن وہ خدا جو عالمِ وجود و کمالات کا بے کنار سمندر ہے اسے کم ہونے کا خوف ہے نہ اس سے کوئی حساب لینے والا ہے اور نہ ہی اسے حساب کی ضرورت ہے۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جملہ ان آیات کی نفی نہیں کرتا جن میں تقدیر الٰہی، حساب کتاب، لوگوں کی لیاقت و اہلیت اور خلقت کی حکمت و تدبیر کا تذکرہ ہے۔

جبر و اکراہ کی نفی

یہاں مختصر طور پر اس نکتے کی یاد دہانی ضروری ہے کہ قانونِ آفرینش، حکم عقل اور دعوتِ انبیاء کی نظر سے ہر شخص سعادت و خوش بختی، عزت و ذلت اور رزق کے حصول کے لیے کوشش کرنے میں آزاد اور مختار ہے، تو پھر مندرجہ بالا آیت میں ان چیزوں کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف کیونکر دی گئی ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ عالمِ آفرینش اور افرادِ بشر کے پاس جو عنایات، عطیات، توانائیاں اور صلاحیتیں ہیں سب کا اصلی سرچشمہ خدا ہے۔ اسی نے عزت اور خوش بختی کے تمام ذرائع لوگوں کے اختیار میں دیے ہیں۔ اسی نے اس دنیا کے لیے ایسے قوانین وضع کیے ہیں کہ جنہیں ٹھکرا دینے کا نتیجہ ذلت ہے اس لیے ان تمام کی نسبت اس کی طرف دی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ نسبت انسان کے ارادے کی آزادی کی نفی نہیں کرتی کیونکہ یہ انسان ہی ہے جو اللہ کی ان عنایات اور عطیات سے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کے ذریعے صحیح یا غلط فائدہ اٹھاتا ہے۔

۲۸۔ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ ۗ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ○

ترجمہ

۲۸۔ اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست اور سرپرست نہ بناؤ اور جو شخص ایسا کرے گا اس کا کسی چیز میں اللہ سے کوئی ربط نہیں ہے (یعنی اس کا رابطہ پروردگار سے بالکل ٹوٹ چکا ہے) مگر یہ کہ ان سے (اور اہم تر مقاصد کے لیے) تقیہ کرو اور خدا تمہیں (اپنی نافرمانی سے) ڈراتا ہے اور (تمہاری) بازگشت خدا کی طرف ہے۔

تفسیر

غیروں سے رشتہ

"اولیاء" "ولی" کی جمع ہے۔ یہاں اس کا معنی ہے حامی، مددگار، ہم پیمان، یار اور یاور۔

یہ آیت فی الواقع مسلمانوں کو ایک اہم سیاسی، اجتماعی اور معاشرتی درس دیتی ہے کہ وہ غیروں سے دوست، حامی، مددگار یا کسی اور حوالے سے کوئی ربط نہ رکھیں اور ان کی چکنی چپڑی باتوں، دلکش تقریروں، بظاہر گہری اور مخلصانہ محبت سے دھوکا نہ کھائیں کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ اہل ایمان اور بامقصد زندگی گزارنے والوں نے اس طرح سے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔

استعمار اور سامراج کی تاریخ کو غور سے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ اس نے ہمیشہ مظلوموں کی نظر میں دوستی، غم گساری اور انسان دوستی کے لباس میں اثر و نفوذ پیدا کیا ہے۔ یہاں تک کہ لفظ "استعمار" جس کا معنی ہے "آبادی کی کوشش کرنا" اسی مفہوم کی نشاندہی کرتا ہے کہ استعمار گر ہمیشہ استعمار شدہ معاشرے کی جڑوں میں اپنے پنجے مضبوط کرنے کے بعد وہاں کے عوام کو بے دردی سے لوٹ کھسوٹ رہے ہیں اور ان کا سب کچھ لوٹ لے جاتے ہیں۔

اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر آیت میں شدید تہدید اور دھمکی آئی ہے اور وہ یہ کہ جو شخص اپنے تئیں غیروں کے سپرد کر دے گا وہ خدا سے ہر قسم کا ربط منقطع کرے گا۔

"من دون المؤمنین" اس طرف اشارہ ہے کہ معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں ہر شخص مجبور ہے کہ اس کے کچھ دوست احباب ہوں لیکن اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ دوستی اور سرپرستی کے لیے ایمان والوں کا ہی انتخاب کریں اور ان کی جگہ کافروں سے رشتے استوار نہ کریں۔

"فلیس من اللہ فی شیء۔"

اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ جو افراد دشمنانِ خدا سے دوستی اور ہم کاری کرتے ہیں وہ کسی چیز میں خدا سے مربوط نہیں رہیں یعنی وہ فرمانِ الٰہی، خدا پرستوں اور فرمانِ خدا کے پیروکاروں سے بیگانے ہیں اور ان سے ہر لحاظ سے ان کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔

"الّا ان تتقوا منھم تقٰۃ۔"

اس جملے کے ذریعے مندرجہ بالا حکم میں استثناء کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ تقیہ کے موقع پر حرج نہیں کہ مسلمان اپنی جان کی حفاظت کے لیے یا ایسے اور امور میں بے ایمان افراد سے دوستی کا اظہار کریں اور آخر میں دو مزید جملوں سے مندرجہ بالا حکم کی تاکید کی گئی ہے:

"و یحذرکم اللہ نفسہ۔"

یعنی — خدا تمہیں اپنی سزا اور غضب سے ڈراتا ہے

" والی اللہ المصیر"

یعنی — تم سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور اگر تم نے دشمنوں سے دوستی کرلی تو اپنے اعمال کا نتیجہ بہت جلد دیکھ لوگے۔

"تقیہ" ایک حفاظتی ڈھال ہے

یہ صحیح ہے کہ کبھی انسان اعلیٰ ترین مقاصد مثلاً حفظِ شرافت، تقویت حق اور باطل کی کمر توڑنے کے لیے اپنی جانِ عزیز یک خدا کرنے کو تیار ہوتا ہے لیکن کیا کوئی عقلمند بغیر کسی اہم مقصد کے اپنی جان خطرے میں ڈالنے کو جائز کہہ سکتا ہے؟ اسلام نے صراحت سے اجازت دی ہے کہ جب انسان کی جان، مال اور عزت و آبرو خطرے میں ہو اور اظہار حق سے کوئی اہم نتیجہ اور فائدہ بھی حاصل نہ ہوتا ہو تو وقتی طور پر اظہار حق نہ کیا جائے اور اپنے فرائض مخفی طور پر ادا کیے جائیں جیسا کہ مندرجہ بالا آیت میں قرآن نے یاد دلایا ہے ایک اور تعبیر کے ذریعے سورہ نحل آیہ ۱۰۶ میں ہے:

" اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ "

مگر جو شخص مجبور ہو جائے (اور اپنے ایمان کے خلاف کسی چیز کا اظہار کردے) جب کہ اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔

تاریخ اور حدیث کی اسلامی کتابوں نے عمار، ان کے والد اور والدہ کی سرگذشت کو فراموش نہیں کیا کہ وہ بت پرستوں کے چنگل میں پھنس گئے تھے انہوں نے انہیں سخت اذیت میں مبتلا کر دیا اور کہتے تھے کہ اسلام سے بیزاری کا اظہار کریں۔ عمار کے ماں باپ نہ مانے اور مشرکین کے ہاتھوں قتل ہو گئے لیکن عمار نے ان کے کہنے کے مطابق اظہار کر دیا بعد میں خدا کے بزرگوار کے خوف سے روتے ہوئے پیغمبر اکرم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان سے فرمایا:

" ان عادوا لك فعد لهم "

اگر پھر پکڑے جاؤ تو وہ جو کہیں کہہ دینا

یوں آپ نے عمار کے اضطراب اور گریہ کو سکون بخشا۔

جس نکتے کی طرف پوری توجہ کی ضرورت ہے یہ ہے کہ تمام مقامات پر " تقیہ " کا حکم ایک جیسا نہیں بلکہ وہ کبھی واجب ہے، کبھی حرام ہے اور کبھی مباح ہے۔

" تقیہ " اس حالت میں واجب ہوتا ہے جب بغیر کسی اہم فائدے کے انسان کی جان خطرے سے دوچار ہو لیکن اظہار " تقیہ " باطل کی ترویج، لوگوں کی گمراہی اور ظلم و ستم کی تقویت کا باعث ہو وہاں حرام اور ممنوع ہے۔ اسی بنیاد پر اس سلسلے میں کیے گئے تمام اعتراضات کا جواب دیا جائے گا۔

حقیقت میں اعتراض کرنے والے تحقیق کرتے تو انہیں پتہ چلتا کہ یہ شیعوں کا ہی عقیدہ نہیں بلکہ مسئلہ " تقیہ " اپنی

بجز ایک قلبی حکم عقل ہے اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے[1]

دنیا کے تمام عقلمند جب کبھی اپنے آپ کو کسی دوراہے پر پاتے ہیں جہاں یا تو انہیں اپنے عقیدے کو چھپانا پڑتا ہے یا عقیدے کا اظہار کر کے اپنی جان، مال اور عزت کو خطرے سے دوچار کرنا پڑتا ہے تو اگر عقیدے کا اظہار کرنا جان و مال اور عزت وغیرہ کی قربانی کی قیمت رکھتا ہو تو وہ ظاہری کی راہ کو درست سمجھتے ہیں لیکن اگر اس کا واضح فائدہ نظر نہ آئے تو پھر عقیدے کو چھپانا بہتر سمجھتے ہیں۔

"تقیہ" مقابلے کی دوسری صورت

مذہبی، اجتماعی اور سیاسی مقابلوں کی تاریخ میں ایسے واقعات در پیش آتے ہیں کہ جب ایک حقیقت کا دفاع کرنے والے کھلم کھلا مقابلہ کریں تو وہ خود، ان کا نظریہ، مکتب اور مذہب نابودی کا شکار ہو جائے یا کم از کم خطرے میں پڑ جائے۔

اس کی مثال بنی امیہ کی غاصب حکومت کے زمانے میں شیعیان علیؑ کی حالت ہے۔ ایسے موقع پر صحیح اور عاقلانہ راہ یہ ہے کہ اپنی توانائیاں ضائع نہ کی جائیں اور اپنے مقدس مقاصد و اہداف کے لیے غیر واضح اور مخفی طور پر مقابلہ جاری رکھا جائے "تقیہ" درحقیقت ایسے مکاتب فکر اور ان کے پیروکاروں کے لیے ایسے لمحات میں مقابلے کی ایک تبدیل شدہ شکل کا نام ہے۔ یہ طریقہ انہیں تباہی سے بچا سکتا ہے اور اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کا موقع دیتا ہے۔

جو لوگ بے سوچے سمجھے "تقیہ" پر قلم بطلان پھیر دیتے ہیں بجائے ایسے مواقع کے لیے ان کے پاس کیا طریق کار ہے۔ کیا نابود اور ختم ہو جانا اچھا ہے یا مقابلے کو صحیح اور منطقی صورت میں باقی رکھنا۔ دوسری راہ کو "تقیہ" کہتے ہیں اور پہلی صورت کو کوئی شخص بھی تجویز نہیں کر سکتا۔

۲۹۔ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

ترجمہ

۲۹۔ کہیے کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اسے چھپائے رکھو یا آشکار کر دو، خدا (بہرحال) اسے جانتا ہے اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے۔ وہ اس سے آگاہ ہے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

---

[1] اقتباس از کتاب آئین ما ص ۳۳۳

تفسیر

گذشتہ آیت میں کفار سے تعاون و دوستی کرنے اور ان پر اعتماد و بھروسہ کرنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ البتہ "تقیہ" کے مقام کے لیے اس حکم میں استثناء روا رکھا گیا ہے۔

ممکن ہے کچھ لوگ بعض مواقع پر تقیہ کا نام لے کر غلط طور پر کفار سے دوستی کرلیں یا انہیں اپنا سرپرست بنالیں دوسرے لفظوں میں تقیہ کے مفہوم سے غلط فائدہ اٹھائیں اور اس کا نام لے کر دشمنانِ اسلام سے تعلقات استوار کرلیں اس لیے محل بحث آیت میں ایسے افراد کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے لامتناہی علم کو فراموش نہ کریں کیونکہ خدا تعالیٰ تو سینوں میں چھپے ہوئے اسرار سے ظاہری امور کی طرح واقف ہے۔

درحقیقت یہ آیت لوگوں کو اس طرف متوجہ کرتے ہوئے کہ خدا تعالیٰ دلوں کے رازوں کو جانتا ہے، یہ اشارہ کرتی ہے کہ وہ نہ صرف اسرار سے آگاہ ہے بلکہ یہ تو اس کے علم بے پایاں کا ایک مختصر سا گوشہ ہے اس کا علم تو زمین اور آسمانوں کی وسعتوں پر محیط ہے اور اس کے علاوہ وہ توانا بھی ہے اور گنہگاروں کو سزا دینے کی قدرت رکھتا ہے "واللہ علیٰ کل شیء قدیر"۔

۳۰۔ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَرًا ۛ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ ۛ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ ۗ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ۝

ترجمہ

۳۰۔ وہ دن کہ جب ہر شخص اپنے انجام دیے ہوئے نیک کام کو موجود پائے گا اور خواہش کرے گا کہ (کاش) اس کے اور اس کے برے کاموں کے درمیان زیادہ زمانی فاصلہ ہوتا اور خدا تمہیں (اپنی نافرمانی سے) ڈراتا ہے اور (اس کے باوجود) اللہ تمام بندوں پر مہربان ہے۔

تفسیر

یہ آیت روزِ قیامت نیک و بد اعمال کے حاضر ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ آیت کہتی ہے: تمام لوگ بلا استثناء جو بھی نیک و بد انجام دے چکے اُس دن موجود پائیں گے بس فرق یہ ہوگا کہ نیک اعمال کو دیکھ کر خوش ہوں گے اور بُرے اعمال دیکھ کر وحشت و پریشانی میں مبتلا ہو جائیں گے اور چاہیں گے کہ یہ ان سے دُور رہیں۔

لغت میں "امد" کا معنی ہے "محدود زمانہ" "ابد" اور "امد" میں فرق یہ ہے کہ "ابد" غیر محدود زمانے کو کہتے ہیں اور "امد" محدود زمانے کو اور اکثر اوقات "امد" انتہائے زمانہ کے مفہوم میں آتا ہے اگرچہ بعض اوقات مطلقاً "محدود زمانہ" کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس بناء پر مندرجہ بالا آیت میں یہ معنی پیدا ہوتا ہے کہ گنہگار آرزو کریں گے کہ ان کے اور ان کے بُرے اعمال کے درمیان زیادہ زمانے کا فاصلہ ہو اور یہ اپنے کردار سے ان کی انتہائی بیزاری کا اظہار ہے کیونکہ تنفر اور بیزاری کے لیے ہے۔ جیسے مکانی فاصلے کی نسبت زمانی فاصلہ زیادہ مؤثر ہوتا ہے، بلکہ مکانی فاصلے میں حاضر ہو جانے کا احتمال زیادہ ہو سکتا ہے جبکہ زمانی فاصلے میں اس کا احتمال بالکل نہیں ہے مثلاً عالمی جنگوں کے دوران میں جو شخص میدان جنگ سے دور زندگی بسر کرتا تھا وہ بھی تھوڑا بہت پریشانی اور اضطراب کا شکار ہوتا تھا۔ لیکن جو لوگ زمانی اعتبار سے ان جنگوں سے دُور ہیں انہیں ان سے پریشانی کا کوئی احساس نہیں۔

بعض مفسرین نے اگرچہ "امد" کو یہاں مکانی فاصلے کے مفہوم میں لیا ہے لیکن لغت میں ظاہراً یہ لفظ اس معنی کے لیے نہیں آیا۔

جیسے گنہگار آرزو کریں گے کہ کاش ان کے اور ان کے اعمال کے درمیان زیادہ زمانی فاصلہ ہوتا اس کے برعکس نیکوکار اپنے اعمال دیکھنے کے بعد سوچیں گے کہ کاش بہت جلد ان تک پہنچے ہوتے اور تھوڑے سے زمانے کا فاصلہ بھی نہ ہوتا۔

"ویحذرکم اللہ نفسہ واللہ رءوف بالعباد"

پہلے تو خدا تعالیٰ لوگوں کو اپنے حکم کی نافرمانی سے ڈراتا ہے اور پھر بندوں پر اپنی مہربانی کا ذکر کرتا ہے یوں لگتا ہے کہ آیت کے یہ دونوں حصے سنت قرآنی کے مطابق خوف اور امید کا ایک امتزاج ہیں لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ دوسرا حصہ "واللہ رءوف بالعباد" پہلے حصے "ویحذرکم اللہ نفسہ" کے لیے تاکید ہو۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی شخص دوسرے سے کہے کہ میں تجھے اس کام کے خطرناک انجام سے ڈراتا ہوں اور چونکہ میں تجھ پر مہربان ہوں لہٰذا تجھے خطرے سے باخبر کر رہا ہوں۔ اگر مجھے تجھ سے محبت نہ ہوتی تو تجھے اس خطرے سے آگاہ نہ کرتا۔

تجسم اور حضور اعمال قرآن کی نظر میں

محل بحث آیت میں قرآن وضاحت سے قیامت کے دن اعمال کے مجسم ہونے اور حاضر ہونے کے امر کو پیش کرتا ہے: "تجد" وجدان (پانا)، ضد ہے "فقدان" (نابود ہونا) کی۔ "خیر" اور "سوء" دونوں الفاظ یہاں نکرہ

کی صورت میں ہیں جو عمومی مفہوم دیتے ہیں یعنی روز قیامت انسان اپنے اچھے برے اعمال چاہے کم مقدار میں ہی کیوں نہ ہوں اپنے سامنے حاضر پائے گا۔

بعض چاہتے ہیں کہ اس آیت کی اور اس جیسی دیگر آیات کی یہ توجیہ کریں کہ اعمال کے حضور سے مراد یہ ہے کہ ان کی جزا یا سزا حاضر ہوگی یا اس سے مراد اعمال نامہ ہے کہ جس میں تمام اعمال ثبت ہوں گے لیکن واضح ہے کہ یہ توجیہات آیت کے ظاہری مفہوم سے میل نہیں کھاتیں کیونکہ آیت وضاحت سے بتاتی ہے کہ قیامت کے دن انسان خود عمل کو موجود پائے گا اور آیت میں ہے کہ گنہگار آرزو کرے گا کہ کاش اس کے اور اس کے انجام دیے ہوئے برے عمل کے درمیان جدائی پیدا ہو جائے، یہاں بھی خود عمل زیر بحث ہے نہ کہ نامہ اعمال اور نہ ہی عمل کی جزا و سزا۔

اس ضمن میں دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ گنہگار پسند کرے گا کہ اس کے اور اس کے عمل کے درمیان زیادہ فاصلہ ہو جائے اور اپنے عمل کی نابودی کی آرزو ہرگز نہیں کرے گا۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ اعمال کی نابودی اور خاتمے کا امکان نہیں ہے۔ اسی بناء پر وہ اس کی تمنا نہیں کرے گا۔ بہت سی دوسری آیات بھی اس مفہوم کی تائید کرتی ہیں۔ مثلاً سورہ کہف کی آیت ۴۹ میں ہے۔

"وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا"

"قیامت کے دن گنہگار اپنے تمام اعمال کو اپنے سامنے موجود پائیں گے اور خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔"

سورہ زلزال کی آیہ ۷ اور ۸ یوں ہے:

"فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ
وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ"

"جو شخص نیک یا برا عمل انجام دے گا، کتنا ہی کم ہو اسے اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔"

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ بعض مفسرین کبھی کبھار ان آیات میں لفظ "جزا" کو "مقدر" مانتے ہیں حالانکہ یہ آیات کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہے۔

بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا دوسری دنیا کی کھیتی ہے اور انسان کا عمل اس بیج کی طرح ہے جسے کسان زمین میں ڈالتا ہے پھر اسی دانے میں رشد اور نشوونما پیدا ہوتی ہے اور اسی دانے کو بہت سے اضافے کے ساتھ اٹھاتا ہے۔ انسان کے اعمال میں بھی بہت سی تبدیلیاں اور تغیرات رونما ہوں گے اور پھر وہ خود اس کی طرف پلٹ آئیں گے اور یہ عمل قیامت کا لازمہ ہے۔ جیسا کہ خداوند عالم سورہ شوریٰ آیہ ۲۰ میں فرماتا ہے:

"من کان یرید حرث الأخرة نزد له فی حرثه"

جو آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اس کی کھیتی میں ہم اضافہ کریں گے۔"

ب: دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کے نیک عمل دوسرے جہان میں نور اور روشنی کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔ منافقین اس نور کے لیے مومنین سے تقاضا کریں گے اور کہیں گے:

"انظرونا نقتبس من نورکم"

ٹھہرو! تاکہ ہم تمہارے نور سے کچھ فائدہ اٹھالیں

جواب میں ان سے کہا جائے گا:

"ارجعوا وراءکم فالتمسوا نوراً"

لوٹ جاؤ اور دنیا میں جاکر یہ نور حاصل کرو (حدید - ۱۳)

یہ اور اس جیسی بہت سی آیات بتاتی ہیں کہ قیامت کے دن ہم اپنے اسی عمل کو کامل تر صورت میں پائیں گے۔ اسی کا نام تجسم اعمال ہے جس کے علماء اسلام قائل ہیں۔ اسلام کے عظیم پیشواؤں سے اس ضمن میں بہت سی روایات منقول ہیں جو اسی مفہوم پر دلالت کرتی ہیں۔ یہاں ہم صرف ایک کو نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

ایک شخص نے پیغمبر اسلام ؐ سے نصیحت کی فرمائش کی تو آپؐ نے فرمایا:

"لا بد لک یا قیس! من قرین یدفن معک وھو حی وانت میت فان کان کریماً اکرمک وان کان لئیما اسلمک ثم لا یحشر الا معک ولا تحشر الا معہ ولا تسئل الا عنہ فلا تجعلہ الا صالحا فانہ ان صلح انست بہ وان فسد لا تستوحش الا منہ وھو فعلک۔"

"اس سے مفر نہیں کہ تیرا ایک ہم نشین ہے جو موت کے بعد تیرے ساتھ ہی دفن ہوگا لیکن وہ زندہ ہوگا اور تو مردہ۔ اگر وہ نیک اور محترم ہوا تو تیرا احترام اور عزت کرے گا اور اگر وہ پست اور کمینہ ہوا تو تجھے حوادث کے سپرد کر دے گا۔ وہ تیرے علاوہ کسی اور کے ساتھ محشور نہیں ہوگا اور تو بھی میدان قیامت میں اس کے علاوہ کسی اور کے ساتھ نہیں آئے گا۔ تجھ سے اس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔ لہٰذا کوشش کرو کہ اسے بہتر شکل میں انجام دو کیونکہ وہ درست ہوا تو تُو اس سے مانوس رہے گا ورنہ اس کے علاوہ کسی اور سے تجھے وحشت نہ ہوگی اور وہ تیرا عمل ہے[1]

اس بحث کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ اعمال کی جزا و سزا کی کیفیت کے بارے میں تحقیق کی جائے۔

[1] بحار، چھاپ کمپانی، جلد ۳ ص۱۶۱

جزا و سزا کے بارے میں علماء کے نظریات

اعمال کی جزا اور سزا کے بارے میں علماء کے مختلف عقائد و نظریات ہیں جو یہاں بیان کئے جاتے ہیں:

(۱) بعض کا عقیدہ ہے کہ اعمال کی جزا اس دنیا کی جزا و سزا کی طرح طے شدہ امور کی مانند ہے۔ یعنی جیسے اس دنیا میں ہر بُرے کام کے لیے قانون بنانے والوں کی طرف سے ایک سزا معین ہے اسی طرح خدائے بزرگ و برتر نے ہر عمل کے لیے ایک خاص سزا یا جزا معین کر رکھی ہے۔ یہ نظریہ اجر، مزدوری اور مقررشدہ سزاؤں کا سا ہے۔

(۲) بعض کا اعتقاد ہے کہ تمام سزائیں اور جزائیں نفس اور روحِ انسانی کی پیداوار ہیں جنہیں انسانی روح بغیر اختیار کے اس دنیا میں پیدا کرتی ہے کیونکہ نیک اور بد اعمال روحِ انسانی میں اچھے اور بُرے ملکات پیدا کردیتے ہیں اور یہ ملکات انسانی ضمیر اور ذات کا جزو بن جاتے ہیں اور ان ملکات میں سے ہر ایک اپنے حسبِ حال نعمت یا عذاب کی ایک شکل بنا لیتا ہے۔ جن لوگوں کا باطن اس دنیا میں اچھا ہے ان کا تعلق اچھے افکار و تصورات سے رہتا ہے اور ناپاک افراد سوتے جاگتے باطل افکار اور بُرے تصورات میں مشغول رہتے ہیں یہی ملکات قیامت کے دن نعمت و عذاب اور راحت و تکلیف کی تخلیق کریں گے دوسرے لفظوں میں جنّت کی نعمتوں اور دوزخ کی سزاؤں کے بارے میں جو کچھ بھی ہم پڑھتے ہیں وہ انسان کی اچھی بُری صفات کی مخلوق ہیں کوئی دوسری چیز نہیں۔

(۳) بزرگ علماء اسلام نے ایک اور راہ انتخاب کی ہے اور اس کے لیے آیات و روایات میں سے بہت سے شواہد پیش کئے ہیں، ان کے موقف کا خلاصہ یہ ہے:

ہمارا ہر کردار، اچھا ہو یا بُرا ایک دنیاوی شکل و صورت رکھتا ہے جس کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور ایک اس کی اُخروی شکل و صورت ہے جو اس وقت عمل میں چھپی ہوئی ہے اور قیامت کے دن تغیر و تبدل کے بعد وہ اپنی دنیاوی شکل و صورت کھو بیٹھے گا اور ایک نئی شکل میں سامنے آئے گا جو عمل کرنے والے کے لیے راحت و سکون یا آزار و تکلیف کا باعث ہوگی۔

ان تینوں مذکورہ نظریات میں سے آخری نظریہ بہت سی قرآنی آیات سے مطابقت اور موافقت رکھتا ہے۔ ان کے اعمال صلاحیتوں اور توانائیوں کی مختلف شکلیں ہیں۔ قانون بقائے مادہ کی ترمیم شدہ شکل کے مطابق توانائی (ENERGY) کبھی ختم نہیں ہوتی اور ہمیشہ اس دنیا میں رہتی ہے اگرچہ ظاہراً ہم یہی سمجھتے ہیں کہ وہ ختم ہو چکی ہے۔

ان اعمال کی بقاء اور ابدیت کی وجہ سے قیامت میں ہر شخص حساب کتاب کے وقت اپنے تمام اعمال دیکھ سکے گا چاہے اسے تکلیف و رنج ہو یا آرام و سکون۔ انسانی ذرائع اور وسائل ابھی تک اس قابل نہیں ہو سکے کہ وہ چند ایک کے سوا گذشتہ لمحات کے بارے میں حقائق معلوم کرسکیں [1]

---

[1] ماضی قریب میں ہمارے سائنسدانوں نے " اینفراریڈ " نامی ایک دوربین ایجاد کی ہے جو گذرے ہوئے چند لمحوں کی تصویر لے سکتی ہے۔ یہ نئی مشین (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لیکن مسلم ہے کہ اگر کوئی کامل تر آلہ وجود میں آجائے یا نگاہ اور ادراک زیادہ کامل ہوں تو ہو سکتا ہے کہ جو کچھ گذشتہ زمانے میں ہو چکا ہے ۔ (۱) اسے محسوس کر سکیں اور جان سکیں ۔

البتہ اس میں بھی کوئی مضائقہ اور مانع نہیں کہ بعض جزائیں اور سزائیں طے شدہ قوانین کے حوالے سے ہوں ۔

تجسم اعمال آج کے علم کی روشنی میں

گذشتہ اعمال کے مجسم ہونے کے امکان کے ثبوت کے لیے ہم آج کے طبیعات کے مسلمہ اصول سے استفادہ کر سکتے ہیں جس کے مطابق مادہ توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے مادہ اور توانائی کے بارے میں طبیعات (Physics) کا جدید نظریہ یہ ہے کہ مادہ اور توانائی ایک حقیقت کے دو مظہر ہیں ۔ مادہ متراکم اور منضبط توانائی ہے جو مخصوص حالات میں توانائی میں بدل جاتا ہے اور بعض اوقات ایک گرام مادہ میں چھپی ہوئی توانائی میں (Explosion) کی طاقت تیس ہزار ٹن ڈائنامیٹ سے زیادہ ہوتی ہے ۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مادہ اور توانائی ایک ہی حقیقت کے دو مختلف روپ ہیں اور ان کی بقاء کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ بعید نہیں کہ پھیلی ہوئی توانائیاں دوبارہ مل جائیں اور جسم کی صورت اختیار کر لیں ۔ اصلاح اور راستی کی راہ پر صرف شدہ توانائیاں اور ظلم و جور کے راستے پر صرف شدہ توانائیاں آپس میں مل کر قیامت کے دن ایک خاص جسمانی صورت میں ڈھل سکتی ہیں ۔ اس میں کوئی مانع نہیں کہ نیک اعمال جاذبِ نظر اور خوبصورت مادی نعمتوں کی شکل اختیار کر لیں اور برے اعمال سزا اور عذاب کے سانچوں میں ڈھل جائیں ۔

٣١ - قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

٣٢ - قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ○

---

(۱) دو سالہ تشقے سے ماخوذ ۔
ہیٹ سسٹم (Heat system) کے ذریعے کام کرتی ہے ۔ یہ اجسام سے نکلنے والی لہروں کو جذب کرتی ہے اور مخصوص طور پر گرم کے ذریعے انہیں سرد اور گرم دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے پھر انہیں واضح یا تاریک تصویروں کی صورت میں پیش کرتی ہے ۔ (روزنامہ کیہان ، شمارہ ۸۸۸۸ ، سال ۱۳۴۹ ش) اس ذریعے سے جرم کے وقوع اور کیفیت کو معلوم کیا جا سکتا ہے اور مجرموں کے گذشتہ کردار کی تصویر ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے اور ان کے جھوٹ کا پردہ چاک ہو جاتا ہے ۔

ترجمہ

۳۱ ۔ کہہ دیجیے ! اگر خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تاکہ خدا بھی تمہیں اپنا دوست بنا لے اور تمہارے گناہوں کو بخش دے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

۳۲ ۔ کہہ دیجیے ! خدا اور (اس کے) رسول کی اطاعت کرو اور اگر روگردانی کریں تو خدا کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

شانِ نزول

اِن آیات کے بارے میں مجمع البیان اور المنار میں دو شانِ نزول مذکور ہیں :

پہلی : یہ کہ کچھ افراد نے پیغبر اکرمؐ کے سامنے پروردگار کی محبت کا دعویٰ کیا جب کہ وہ احکام الٰہی پر کم عمل کرتے تھے اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں۔

دوسری : یہ کہ نجران کے کچھ عیسائی مدینے میں پیغبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی گفتگو کے دوران میں کہنے لگے ہم اگر حضرت مسیحؑ کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں تو اس کی وجہ ہماری خدا سے محبت ہے اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انہیں جواب دیا گیا۔

تفسیر

حقیقی محبت

پہلی آیت کہتی ہے کہ محبت ایک قلبی تعلق ہی کا نام نہیں بلکہ انسان کے عمل میں اس کے آثار دکھائی دینے چاہئیں ۔ جو شخص پروردگار سے محبت کا مدعی ہے اس کے لیے پہلی نشانی یہ ہے کہ وہ پیغبر اور اللہ کے بھیجے ہوئے کی پیروی کرے "ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی ......"

حقیقت میں محبت کا یہ فطری ثمر ہے کہ وہ انسان کو محبوب اور اس کی خواہشات کی طرف کھینچ لے جاتی ہے البتہ کمزور محبتیں بھی ہو سکتی ہیں کہ جن کی شعاع دل سے باہر نہ پڑ سکے لیکن ایسی محبتیں اس قدر حقیر ہیں کہ انہیں محبت کا نام نہیں دیا جا سکتا ۔ ایک حقیقی محبت یقیناً عملی آثار کی حامل ہوتی ہے اور ایسی محبت محب کا محبوب سے فسوں تعلق قائم کر دیتی ہے ، محبوب کی آرزوؤں کی راہ میں ثمر بخش ہوتی ہے اور اس کی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے محب کو سعی و کوشش کے لیے ایستادہ کر دیتی ہے۔

اس بات کی دلیل اور وجہ واضح ہے کیونکہ انسان کا کسی سے عشق اور لگاؤ یقیناً اس لیے ہے کہ اسے اس میں کوئی کمال نظر آیا ہے۔ انسان کبھی کسی ایسی شے سے عشق و محبت نہیں کرتا جس میں کوئی نقطۂ کمال نہ ہو۔ اس لیے خدا سے انسان کی محبت کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے کمال کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ اس لیے مسلّم ہے کہ ایسی ہستی کے تمام پروگرام اور احکام بھی کامل ہوں گے۔ ان حالات میں کیسے ممکن ہے کہ جو انسان تکامل و ارتقاء کا حقیقی عاشق ہو وہ ان پروگراموں سے منہ پھیرے اور اگر وہ روگرداں ہو جاتا ہے تو یہ اس کے عشق و محبت کی عدم صداقت کی نشانی اور علامت ہے۔

یہ آیت نجران کے عیسائیوں اور زمانۂ رسولؐ کے مدعیان محبت کے بارے میں ہی نہیں بلکہ یہ تمام ادوار کے لیے اسلام کی ایک منطق ہے۔ وہ لوگ جو رات دن عشق الٰہی یا پیشوایان اسلام، مجاہدین راہ خدا اور صالحین سے محبت کا دم بھرتے ہیں لیکن عمل کی دنیا میں ان سے کچھ بھی شباہت نہیں رکھتے ان کی حیثیت جھوٹے دعویداروں سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو سرتاپا گناہوں سے آلودہ ہیں اور اس کے باوجود اپنے دل کو خدا، رسولؐ، امیرالمومنینؑ اور عظیم پیشواؤں کے عشق سے لبریز سمجھتے ہیں یا یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ایمان، عشق اور محبت کا تعلق صرف دل سے ہے اور عمل سے ان چیزوں کا کوئی ربط نہیں، وہ اسلام کی منطق سے بالکل لاتعلق ہیں۔ معانی الاخبار میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"ما احب اللّٰہ من عصاہ"

جو گناہ کرتا ہے وہ خدا کو دوست نہیں رکھتا

اس کے بعد آپؑ نے یہ مشہور اشعار پڑھے:

تعصی الالٰہ وانت تظہر حبہ
ھذا لعمرک فی الفعال بدیع
لو کان حبک صادقاً لاطعتہ
ان المحب لمن یحب مطیع

یعنی

تو خدا کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کے باوجود اس کی محبت کا اظہار کرتا ہے۔
مجھے اپنی جان کی قسم یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے۔
اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو اس کی اطاعت کرتا۔
کیونکہ جو کسی سے محبت کرتا ہے وہ اس کے حکم کی پیروی کرتا ہے۔

"یحببکم اللّٰہ ویغفر لکم ذنوبکم واللّٰہ غفور رحیم."

قرآن پاک اس جملے میں کہتا ہے: اگر تم نے خدا سے محبت رکھی اور اس کے آثار تمہارے عمل اور زندگی پر مرتب ہوئے تو خدا تمہیں دوست رکھے گا اور اس دوستی کے اثرات حسب حال تم پر آشکار ہوں گے، وہ تمہارے گناہوں کو بخش

دے گا اور اپنی رحمت تمہارے شاملِ حال کر دے گا۔

خدا کی طرف سے متبادل دوستی کی دلیل بھی واضح ہے کیونکہ وہ ایسی ہستی ہے جو ہر لحاظ سے کامل و اکمل ہے علاوہ بریں کیونکہ ہے، جو موجود بھی تکامل و ارتقا کی راہ میں قدم اٹھائے گا اس کے اس پسندیدہ عمل کی وجہ سے خدا تعالیٰ بھی اس سے محبت کا رشتہ قائم کرے گا۔

اس آیت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ محبت یک طرفہ نہیں ہو سکتی کیونکہ ہر محبت محب کو دعوت دیتی ہے کہ وہ عملاً محبوب کی حقیقی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے قدم بڑھائے اس طرح محبوب کو بھی اس سے ضرور محبت ہو گی

ممکن ہے یہاں سوال کیا جائے کہ اگر محب ہمیشہ محبوب کے فرمان کو بجا لائے تو پھر اس کے ذمے تو گناہ ہی کوئی نہ ہو گا کہ جسے بخشے جانے کی بات کی جائے لہٰذا یغفر لکم ذنوبکم کی یہاں کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ممکن ہے یہ جملہ گذشتہ گناہوں کی بخشش کی طرف اشارہ ہو۔ دوم یہ کہ محب محبوب کی ہمیشہ نافرمانی نہیں کرتا لیکن شہوات و خواہشات کی سرکشی کی وجہ سے ممکن ہے کبھی کبھی اس سے لغزش بھی سرزد ہو جائے جو ہمیشہ فرماں بردار رہنے کی وجہ سے بخش دی جائے گی۔

دین اور محبت

پیشوایانِ اسلام سے متعدد روایات میں منقول ہے کہ دین محبت کے علاوہ کچھ نہیں۔ ان میں سے ایک روایت خصال اور کافی میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔

آپ نے فرمایا:

"ھل الدین الا الحب، ثم تلا ھذہ الآیۃ: "ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی"

کیا دین محبت کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "قل اطیعوا اللہ والرسول"

اِن روایات سے مراد یہ ہے کہ روحِ دین اور حقیقتِ دین اصل میں ایمان باللہ، عشق الٰہی ہی ہے۔ وہ ایمان اور عشق کہ جس کی شعاع تمام وجودِ انسانی کو روشن کر دیتی ہے اور اس کے تمام اعضاء و جوارح اور قوت بدن اس کے زیرِ اثر آجاتے ہیں اور اس کا ظاہری اور روشن اثر یہ ہے کہ انسان فرمانِ خدا کی اطاعت کرنے لگتا ہے۔

"اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول"

اِس آیت میں گذشتہ آیت کی بحث کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: چونکہ تم پروردگار کی محبت کے دعویدار ہو اس لیے فرمانِ خدا کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی پیروی کرو اور اگر تم نے اس سے روگردانی کی تو یہ پروردگار سے محبت نہ کرنے کی نشانی ہو گی اور خدا ایسے لوگوں کو دوست نہیں رکھتا۔ "فان تولوا فان اللہ

لا یحب الکٰفرین "

ضمناً "واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول" سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا اور رسول کی اطاعت ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے ۔ رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے اور خدا کی اطاعت رسول کی اطاعت ہے ۔ اسی لیے گذشتہ آیت میں صرف اطاعتِ رسول کی بات کی گئی ہے یہاں خدا اور رسولؐ دونوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے ۔

"فان تولوا فان اللہ لا یحب الکٰفرین "

اس کے بعد فرمایا گیا ہے : اگر یہ لوگ روگردانی کریں اور دوستی کے تقاضوں پر عمل نہ کریں تو یہ اپنے دعویٰ محبت میں سچے نہیں ہیں اور خدا پر ایمان نہیں لائے ۔ لہٰذا فطری بات ہے کہ خدا ایسے اشخاص کو دوست نہیں رکھتا ۔

۳۳۔ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوۡحًا وَّاٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ۝

۳۴۔ ذُرِّيَّةًۢ بَعۡضُهَا مِنۡۢ بَعۡضٍ‌ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ‌ ۝

ترجمہ

۳۳۔ اللہ نے آدم ، نوح ، آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو سب جہانوں پر منتخب کرلیا ۔

۳۴۔ وہ ایسے فرزند (اور خاندان) تھے جو (پاکیزگی ، تقویٰ اور فضیلت کے اعتبار سے) ایسے تھے کہ بعض کو بعض میں انتخاب کیا گیا اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے (اور اپنی رسالت کی راہ میں ان کی کاوشوں سے بھی آگاہ ہے)۔

تفسیر

اس آیت سے حضرت مریم اور ان کے آباؤ اجداد کی داستان شروع ہوتی ہے ۔

"اِصطفیٰ" لغت کے لحاظ سے "صفو" (بروزن "عفو") سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے "خالص چیز" ۔ اہل عرب صاف و شفاف پتھر کو بھی "صفا" خالص اور پاکیزہ ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں ۔ اس بناء پر "اصطفاء" کا معنی ہے "خالص چیز کے ایک حصے کو منتخب کرنا" ۔

قرآن حکیم مندرجہ بالا آیت میں کہتا ہے : خدا نے آدم ، نوح ، خاندانِ ابراہیم اور آلِ عمران کو تمام جہانوں پر منتخب

کریا ہے۔ یہ چناؤ ممکن ہے تکوینی طور پر بھی ہو اور تشریعی اعتبار سے بھی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی خلقت کو شروع ہی سے ممتاز قرار دیا ہے اگرچہ اس امتیاز کے باوجود وہ راہِ حق کے انتخاب میں مجبور نہ تھے بلکہ اپنے ارادے اور اختیار سے یہ راستہ طے کر رہے تھے لیکن ان کی اس مخصوص خلقت و آفرینش نے ان میں نوعِ بشر کی ہدایت کی صلاحیت پیدا کر دی تھی اور اور پیمبر فرمان خدا کی اطاعت۔ تقویٰ و پرہیزگاری اور انسانوں کی راہنمائی کے راستے میں جد و جہد کرنے کی وجہ سے ایک طرح کا اکتسابی امتیاز بھی انہیں حاصل ہو گیا جو ان کے ذاتی امتیاز سے مل گیا اور وہ برگزیدہ انسانوں کی حیثیت سے ظاہر ہوئے

پیغمبروں کا امتیاز

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انبیاء کو حاصل ہونے والا ذاتی امتیاز اگرچہ انہیں راہِ حق پر چلنے کے لیے مجبور نہ کرتا تھا اور یہ امر اختیار و ارادہ کے سینے کے بھی منافی نہیں بہرحال ایک طرح کی تبعیض تو ضرور ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی خلقت جو صحیح نظام سے ہم آہنگ ہو، اس میں ایسا فرق قابل قبول ہوتا ہے (غور کیجئے گا) مثلاً انسانی بدن ایک منظم خلقت ہے اور اس کے نظام کو صحیح رکھنے کے لیے اعضاء و جوارح میں فرق ہونا چاہیے ورنہ انسانی بدن کے تمام خلیے CELLS آنکھ کے اندرونی پردوں کی سی نزاکت، پنسلی کی ہڈی کے خلیوں جیسی طاقت دماغ کے خلیوں کی سی حساسیت یا دل کے خلیوں جیسی دھڑکن رکھتے ہوتے تو یقیناً بدن کی عمارت گر جاتی۔ ضروری ہے کہ دماغ جیسے خلیے بدن میں ہوں جو جسم کے عضلات اور اعضاء کی رہبری کی ذمہ داری سنبھالیں، ہڈیوں کے محکم خلیوں کو بھی ہونا چاہیے جو بدن کی استقامت کے ضامن ہوں۔ حساس خلیے بھی چاہئیں جو چھوٹے چھوٹے حوادث سے آگاہ ہوں اور متحرک خلیے بھی درکار ہیں جو حرکت پیدا کریں۔

کوئی شخص نہیں کہتا کہ تمام جسم دماغ اور مغز کیوں نہیں یا مثلاً گھاس کے خلیے پھول کی پتیوں کی سی نزاکت، لطافت اور زیبائی کیوں نہیں رکھتے کیونکہ یہ کیفیت تو گھاس کی ساخت کو ہی ختم کر دیتی۔

قابلِ توجہ نکتہ یہاں یہ ہے کہ ذاتی امتیاز جو ایک منظم نظام کے لیے انتہائی ضروری ہے وہ آسان کام نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایک بھاری ذمہ داری اور مسئولیت منسلک ہے جو اتنی ہی عظیم ہے جس قدر یہ امتیاز زیادہ ہے۔ یہ بھاری ذمہ داری خلقت کے ترازو کے دونوں پلڑوں میں اعتدال برقرار رکھتی ہے یعنی جس قدر پیغمبر اور ہادی نوعِ بشر سے امتیاز رکھتے ہیں اسی قدر ذمہ داری اور مسئولیت بھی رکھتے ہیں اور دوسروں کی ذمہ داری بھی اپنے امتیاز کے اندازے سے کم ہے۔

علاوہ ازیں بارگاہِ الٰہی میں تقرب کے لیے انسان کے ذاتی امتیازات ہرگز کافی نہیں بلکہ انہیں اکتسابی امتیازات کے ہمراہ ہونا چاہیے۔

چند اہم نکات

(۱) آلِ ابراہیم : آیت خدا کے تمام برگزیدہ بندوں کا ذکر نہیں کر رہی بلکہ ان میں سے صرف بعض کی طرف اشارہ کر

رہی ہے۔ لہٰذا اگر بعض انبیاء جو مذکورہ خانوادوں سے نہیں، یہ آیت ان کے برگزیدہ نہ ہونے پر دلیل نہیں ہے۔

ساتھ یہ بھی توجہ رہے کہ آل ابراہیم میں موسیٰ بن عمرانؑ، پیغمبر اسلامؐ اور آپؐ کے خاندان کے برگزیدہ افراد بھی شامل ہیں کیونکہ وہ سب اولاد ابراہیم علیہ السلام میں سے ہیں۔

۲۔ لفظ "آل" کا مفہوم: مفردات میں راغب نے لکھا ہے کہ "آل" "اھل" سے لیا گیا ہے اور فرق یہ ہے کہ "آل" عام طور پر بزرگ اور شریف افراد کے نزدیکی رشتہ داروں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور "اھل" زیادہ وسیع معنی رکھتا ہے اور سب کے لیے بولا جاتا ہے۔ اسی طرح "آل" کی اضافت انسانوں کے لیے ہوتی ہے لیکن "اھل" کی اضافت زمان و مکان اور دوسری ہر طرح کی چیزوں کے لیے مستعمل ہے۔ مثلاً کہتے ہیں "اہلِ شہر" لیکن "آل شہر" نہیں کہتے۔

۳۔ آل عمران اور آل ابراہیم کے مفہوم کی حدود: بغیر کہے ہی واضح ہے کہ آل ابراہیم اور آل عمران کو چن لینے سے یہ مراد نہیں کہ ابراہیم اور عمران کی ساری اولاد برگزیدہ ہے کیونکہ ممکن ہے ان کی اولاد میں کفر تک موجود ہوں بلکہ اس سے مراد ان کے خاندان اور دودمان سے کچھ برگزیدہ ہستیاں ہیں۔

۴۔ عمران کون ہیں: مندرجہ آیت میں مذکور "عمران" حضرت مریم کے باپ ہیں حضرت موسیٰؑ کے والد نہیں کیونکہ قرآن حکیم میں جہاں کہیں بھی عمران کا نام آیا ہے وہاں حضرت مریمؑ کے والد ماجد ہی مراد ہیں۔ بعد کی آیات جو حضرت مریم کے حالات کے بارے میں ہیں وہ بھی اس بات کی شاہد ہیں۔

۵۔ عصمتِ انبیاءؑ و آئمہ پر دلیل: اہل بیت علیہم السلام کے حوالے سے پہنچنے والی متعدد روایات میں اس آیت سے انبیاء اور آئمہ کی عصمت پر استدلال کیا گیا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کبھی بھی گناہ، شرک، کفر اور فسق سے آلودہ افراد کو منتخب نہیں کرتا بلکہ ایسے لوگوں کو منتخب کرتا ہے جو آلودگیوں سے کنارہ کش اور معصوم ہوں۔ البتہ آیت سے عصمت کے متعدد مراحل بھی معلوم ہوتے ہیں۔

۶۔ تکامل انواع پر استدلال: ماضی قریب کے بعض مؤلفین نے اس آیت سے تکامل انواع پر استدلال کیا ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ حضرت "آدم" اوّل البشر نہ تھے بلکہ ان کے زمانے میں بہت سے انسان موجود تھے جن میں سے خدا تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو منتخب فرمالیا اور ان کی اولاد میں سے ممتاز نسل کو وجود بخشا۔ اس نظریے کے حامل "علی العٰلمین" کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ کے دور میں "عالمین" یعنی "انسانی معاشرہ" موجود تھا اس لیے اس بناء پر یہ ماننے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ پہلا انسان لاکھوں سال قبل پیدا ہوا، وہ بھی باقی حیوانات کی طرح ارتقاء اور تکامل کی منزلیں طے کرتا رہا اس لیے حضرت آدمؑ تو ایک برگزیدہ انسان تھے۔

اس گفتگو کے مقابلے میں کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں کہ جس کی وجہ سے ہم یہ سمجھیں کہ "عالمین" سے یہاں مراد حضرت آدمؑ کے ہم عصر انسان تھے بلکہ ممکن ہے عالمین سے مراد یہاں تمام انسانی ادوار کے انسان ہوں۔ اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا: خدا نے تمام انسانی معاشروں میں انسانوں کی طویل تاریخ میں سے جنہیں منتخب فرمایا ان میں پہلے

آدمؑ ۔ پھر نوحؑ ، پھر "آل ابراہیم" اور "آل عمران" ہیں ۔ چونکہ یہ سب منتخب افراد مختلف زمانوں میں تھے اس سے ہم سمجھے کہ عالمین سے مراد تمام زمانوں اور ادوار کا انسانی معاشرہ ہے ۔ اس لیے ضروری نہیں کہ ہم یہ اعتقاد رکھیں کہ حضرت آدمؑ کے زمانے میں بہت سے انسان موجود تھے ۔ جن میں سے حضرت آدم چنے گئے تھے (غور کیجئے گا)

"ذریۃ بعضها من بعض"

"ذریت" کا معنی ہے "چھوٹی اولاد" ۔ لیکن کبھی کبھی بلاواسطہ یا بالواسطہ کی تمام اولاد کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے[1]

اس آیت میں قرآن اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ منتخب افراد اسلام ، پاکیزگی ، تقویٰ اور نوع بشر کی راہنمائی کے لیے کوشش کے لحاظ سے ایک جیسے تھے اور ایک ہی کتاب کے مختلف نسخوں کی مانند تھے جیسے ان میں سے ایک دوسرے کا اقتباس لیا گیا ہو "بعضها من بعض"۔

"واللہ سمیع علیم"

آیت کے آخر میں اس حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ اُن کی کوشش اور فعالیت کو دیکھتا ہے ، ان کی باتیں سنتا ہے اور ان کے اعمال سے آگاہ ہے ۔ اس جملے میں چنے ہوئے افراد کی خدا تعالیٰ اور مخلوق خدا کے بارے میں شدید ذمہ داریوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔

ضمنی طور پر آیت میں حضرت آدمؑ کے علاوہ تمام اولوالعزم پیغمبروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ حضرت نوحؑ کا ذکر تو صراحت سے موجود ہے اور آل ابراہیم میں خود ابراہیمؑ ، موسیٰؑ ، عیسیٰؑ اور پیغمبر اسلام بھی شامل ہیں ۔ نیز آل عمران میں حضرت مریمؑ اور حضرت مسیحؑ کی طرف مکرر اشارہ ہے ۔ اس تکرار کی وجہ یہ ہے کہ زیر نظر آیت ان کے حالات کی تفصیل کے لیے مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے ۔

۳۵ ۔ إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ○

۳۶ ۔ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ ۖ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۖ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ ۖ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا

---

[1] "ذریۃ" کا مادہ "ذرء" (بروزن "جزء") ہے اور اس کا معنی ہے آفرینش اور خلق کرنا۔

بِكَ وَ ذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○

ترجمہ

۳۵۔ (وہ وقت یاد کرو) جب عمران کی بیوی نے عرض کیا: خداوندا! جو کچھ میرے رحم میں ہے میں اسے تیری نذر کرتی ہوں تاکہ وہ (تیرے گھر کی خدمت کے لیے) محرر (اور آزاد) ہو اور تو یہ مجھ سے قبول فرمالے کہ تو سننے اور جاننے والا ہے۔

۳۶۔ لیکن جب اسے جنم دیا، تو دیکھا تو وہ لڑکی تھی، عرض کیا: خداوندا! میں نے لڑکی کو جنم دیا لیکن خدا اس سے آگاہ تھا کہ اس نے کیا جنم دیا ہے (پھر اس نے کہا) لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا (اور لڑکی عبادت گاہ کی خدمت کی ذمہ داری لڑکے کی طرح انجام نہیں دے سکتی) اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود (کے وسوسوں) سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔

تفسیر

حضرت مریمؑ کی ولادت

گذشتہ آیت میں آل عمران کا ذکر تھا اور ان آیات میں عمرانؑ کی بیٹی مریمؑ کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی ہے۔ ان آیات میں اس عظیم خاتون کی ولادت، پرورش اور زندگی کے دیگر اہم واقعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

تاریخ، اسلامی روایات اور مفسرین کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ حنہ اور اشیاع دو بہنیں تھیں۔ پہلی حضرت عمران کے نکاح میں آئیں۔ حضرت عمران بنی اسرائیل کی بہت اہم شخصیت تھے۔ دوسری کو اللہ کے ایک نبی زکریاؑ نے اپنی زوجیت کے لیے منتخب فرمالیا۔[1]

کئی سال گزر گئے۔ حنہ کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہ ہوا۔ ایک روز وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھی تھیں۔ دیکھا کہ ایک پرندہ اپنے بچوں کو غذا دے رہا ہے۔ یہ منظر دیکھا تو اولاد کی خواہش ان کے دل میں آگ کی طرح بھڑک اٹھی۔ انہوں نے خلوص دل سے بارگاہ خداوندی میں بیٹے کی درخواست کی۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا یہ مخلصانہ دعا ہدف اجابت کو پہنچی اور وہ حاملہ ہو گئیں۔

---

[1] [illegible]

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حنہ کے شوہر حضرت عمران کی طرف وحی کی تھی کہ انہیں ایک بابرکت لڑکا عطا کیا جائے گا۔ جو لاعلاج مریضوں کو شفا دے گا۔ حکم خدا سے مردوں کو زندہ کرے گا اور بنی اسرائیل کے لیے پیغمبری کے فرائض بھی سرانجام دے گا۔ انہوں نے یہ واقعہ اپنی بیوی حنہ سے بیان کیا۔ وہ حاملہ ہوئیں تو ان کا خیال تھا کہ یہی وہ لڑکا ہے جو اس وقت ان کے شکم میں ہے۔ وہ یہ خبر نہیں رکھتی تھیں کہ ان کے شکم میں تو اس لڑکے کی والدہ جناب مریمؑ ہیں۔ اسی لیے انہوں نے نذر کی تھی کہ بچے کو خانۂ خدا بیت المقدس کا خدمت گزار بنائیں گی۔ پیدائش ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ وہ لڑکی تھی۔ اب وہ پریشان ہوئیں۔ سوچنے لگیں کہ کیا کریں کیونکہ بیت المقدس کی خدمت تو لڑکے کیا کرتے ہیں۔ قبل ازیں کبھی کسی لڑکی کو بیت المقدس کی خدمت گزاری کے لیے منتخب نہیں کیا گیا تھا۔

اب ہم آیات کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس واقعے کے آخری حصے کو قرآن نے کیسے بیان کیا ہے۔

"اذ قالت امرات عمران ......"

اس آیت میں زوجۂ عمران کی نذر کا تذکرہ ہے۔ وہ حاملہ ہوئیں تو انہوں نے نذر کی کہ اپنے بچے کو بیت المقدس کا خدمت گزار بنائیں گی کیونکہ اللہ نے اُن کے شوہر عمران کو جو اطلاع دی تھی اُس سے وہ یہ سمجھے بیٹھی تھیں کہ اُن کے ہاں لڑکا ہوگا۔ اس لیے انہوں نے لفظ "محررا" استعمال کیا۔ اور "محررة" نہیں کہا۔ انہوں نے خدا سے درخواست کی کہ وہ اُن کی نذر قبول کرے "فتقبل منی انک انت السمیع العلیم"۔

"محرر" "تحریر" کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے "آزاد کرنا"۔ اُس زمانے میں یہ لفظ ایسی اولاد کے لیے بولا جاتا تھا جو عبادت خانے کی خدمت کے لیے معین کی جاتی تاکہ وہ عبادت خانے کی صفائی اور دوسری خدمات انجام دیں اور فراغت کے وقت خداوند عالم کی عبادت میں مشغول رہیں۔ "محرر" ان خدمت گزاروں کو اس لیے کہتے تھے کہ وہ ماں باپ کی ہر قسم کی خدمت سے آزاد ہوتے تھے اور عبادت خانے کی خدمت کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔

بعض کہتے ہیں جب بچے خدمت کے قابل ہو جاتے، بالغ ہونے تک ماں باپ کی نگرانی میں خدمت سرانجام دیتے تھے اور بعد ازاں خود سے کام کرنے لگتے۔ چاہتے تو عبادت خانے میں اپنا کام ختم کر کے باہر چلے جاتے اور چاہتے تو کام جاری رکھتے۔

"فلما وضعتها قالت رب انی وضعتها انثیٰ"

اس آیت میں بچی کی ولادت کے بعد حضرت مریمؑ کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ انہوں نے پریشان ہو کر کہا: خداوندا! میں نے بچی کو جنم دیا ہے اور تو جانتا ہے کہ جو نذر میں نے کی تھی اُس کے لیے لڑکی لڑکے کی طرح نہیں ہو سکتی اور لڑکی لڑکے کی طرح اِن فرائض کو انجام نہیں دے سکتی۔

"ولیس الذکر کالانثیٰ"

آیت میں موجود قرائن اور آیت کی تفسیر میں وارد ہونے والی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ "لیس الذکر کالانثیٰ" (لڑکا لڑکی کی طرح نہیں) یہ جملہ حضرت مریمؑ کی والدہ کا ہے نہ کہ کلام خدا ہے لیکن قاعدۃً حضرت مریمؑ کی والدہ کو کہنا چاہیے تھا "ولیس الانثیٰ کالذکر" "لڑکی لڑکے کی طرح نہیں ہے" کیونکہ انہوں نے تو لڑکی کو جنم دیا تھا نہ کہ لڑکے کو۔ اس لحاظ سے ممکن ہے کہ اس جملے میں تقدیم و تاخیر ہو۔ جیسا کہ اہل عرب اور غیر عرب کے کلام میں بہا

ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وضع حمل کے وقت پیش آنے والی اچانک پریشانی کے سبب بے سمجھے یوں کہہ دیا ہو کیونکہ وہ توقع رکھتی تھیں کہ اُن کے ہاں بیٹا ہوگا تا کہ وہ بیت المقدس کا خدمت گزار بنے۔ اسی رجحان کے پیش نظر ممکن ہے بے ساختہ انہوں نے پہلے بیٹے کا ذکر کیا ہو حالانکہ جملہ بندی اور مولود کا تقاضا تھا کہ وہ بیٹی کا نام پہلے لیتیں۔

آیت میں "واللہ اعلم بما وضعت" (خدا بہتر جانتا ہے کہ عمران کی بیوی نے کیا جنم دیا ہے) اصطلاح میں جملۂ معترضہ ہے۔ یعنی ضرورت نہ تھی کہ مریم کی والدہ کہتیں کہ خدایا! میں نے لڑکی کو جنم دیا ہے کیونکہ خدا تو جانتا ہی تھا کہ اس نے کیا جنم دیا ہے وہ شروع سے انعقاد نطفہ اور رحم مادر کے تمام مرحلوں سے آگاہ ہے۔

"وانی سمیتها مریم"

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کا یہ نام اُن کی والدہ کے ذریعے سے وضع حمل کے وقت ہی رکھ دیا گیا تھا۔ یاد رہے کہ "مریم" ان کی لغت میں "عبادت گزار خاتون" کو کہتے تھے۔ یہ نام حضرت مریم کی پاکباز والدہ کے اس انتہائی عشق اور لگاؤ کا مظہر ہے جو انہیں اپنے بچے کو عبادت الٰہی کے لیے وقف کرنے کے لیے تھا لہٰذا انہوں نے نام رکھنے کے ساتھ ہی خدا سے درخواست کی کہ وہ اس نومولود بچی اور اس کی آئندہ اولاد کو شیطانی وسوسوں سے بچائے رکھے اور انہیں اپنے لطف و کرم کی پناہ میں رکھے "وانی اعیذها بک وذریتها من الشیطان الرجیم"۔

۳۷۔ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۖ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِندَهَا رِزْقًا ۖ قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○

ترجمہ

۳۷۔ اُس کے پروردگار نے اُس (مریم) کو خوشی سے قبول فرمالیا اور اُس کے وجود (کے پودے) کو خوب اچھی طرح پروان چڑھایا، زکریا کو ان کا کفیل بنایا جب زکریا وہاں داخل ہوتے خاص غذا وہاں موجود پاتے تو اُس سے پوچھتے: یہ کہاں سے لائی ہو۔ وہ کہتی: یہ خدا کی طرف سے ہے، خدا جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

تفسیر

گزشتہ آیات حضرت مریمؑ کی ولادت کے بارے میں تھیں ۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے مریمؑ کو حسن قبول سے نوازا اور ان کی پرورش اچھے پودے کی طرح کی۔

درحقیقت جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے کہ جناب مریم کی والدہ کو یقین نہیں آتا تھا کہ کسی لڑکی کو خانۂ خدا بیت المقدس کی خدمت کے لیے قبول کر لیا جائے گا لہٰذا وہ چاہتی تھیں کہ ان کے شکم میں جو بچہ ہے وہ لڑکا ہو کیونکہ قبل ازیں کبھی کسی لڑکی کو اس مقصد کے لیے منتخب نہیں کیا گیا تھا۔

زیر نظر آیت کہتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس پاکیزہ لڑکی کو پہلی مرتبہ اس روحانی اور معنوی خدمت کے لیے قبول کر لیا۔

بعض مفسرین کہتے ہیں: قبولیت کی نشانی یہ تھی کہ حضرت مریم بیت المقدس کی خدمت کے دوران میں ماہواری میں کبھی مبتلا نہیں ہوئیں کہ انہیں اس روحانی مرکز سے دُور ہونا پڑتا ۔ ممکن ہے اس لڑکی کی قبولیت اور جناب مریمؑ کا قبولِ بارگاہ ہونا، اس کے بارے میں ان کی والدہ کو الہام کے ذریعے مطلع کیا گیا ہو۔

" انبات " یعنی "اگنا" یہ تعبیر حضرت مریم کی نشوونما اور پرورش کے بارے میں ان کے معنوی، روحانی، اور اخلاقی پہلوؤں کے تکامل وارتقاء کی طرف اشارہ ہے۔

ضمناً یہ جملہ ایک لطیف نکتے کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ خدا کا کام " ابنات " یعنی اگانا ہے جیسے پھولوں اور پودوں کے بیج میں اہلیت اور استعداد مخفی ہوتی ہے اور وہ باغبان کی نگرانی میں پرورش پاتے ہیں اور خود کو آشکار کرتے ہیں۔ اسی طرح انسانی وجود میں بھی ہر قسم کی بلند ترین انسانی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں اگر انسان اپنے تئیں تربیت کے لیے خدائی نمائندوں اور باغ انسانیت کے باغبانوں کے سپرد کر دے تو وہ بہت جلد تربیت حاصل کر لیتا ہے اور اس کی پنہاں استعداد ظاہر ہو جاتی ہے اور یوں " ابنات " کا مفہوم حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے۔

" وکفلھا زکریا "

" کفالت " کا معنی ہے " کسی چیز کو دوسری میں ضم کرنا " اسی مناسبت سے ان افراد کو " کافل " یا " کفیل " کہتے ہیں جو چھوٹے بچوں کی سرپرستی اپنے ذمے لے لیں کیونکہ وہ درحقیقت اپنے آپ کو اُن کے ساتھ منضم کر لیتے ہیں۔

یہ مادہ جب ثلاثی مجرد یعنی " کفل " بغیر شد کے کی صورت میں استعمال ہو تو کفالت و سرپرستی کو اپنے ذمے لینے کا مفہوم دیتا ہے اور جب ثلاثی مزید کی صورت میں " کفّل " شد کے ساتھ استعمال ہو تو کسی کے لیے کفیل منتخب کرنے کا مفہوم دیتا ہے۔

اس جملے میں قرآن کہتا ہے: خدا نے زکریا کو مریم کی کفالت کے لیے منتخب کیا تھا۔ کیونکہ جیسا کہ تاریخ میں لکھا ہے مریمؑ کے والد اُن کی پیدائش سے پہلے وفات پا چکے تھے ۔ اُن کی والدہ انہیں یہودی علماء کے پاس بیت المقدس میں لے آئیں اور کہا کہ یہ بچی بیت المقدس کا ہدیہ ہے، اس کی سرپرستی تم میں سے کوئی اپنے ذمے لے لے ۔ علماء بنی اسرائیل تے اس سلسلے میں آپس میں گفتگو کی ہر

کرنی چاہتا تھا کہ مریم کی سرپرستی کا افتخار اور منصب اُسے نصیب ہو۔ اس مقصد کے لیے مخصوص مراسم سے کہ جن کی تفصیل اسی سورہ کی آیہ ۴۴ کی تفسیر میں آئے گی اور اس نذر اور ان کی کفالت کے لیے حضرت زکریا کا انتخاب عمل میں آیا۔

"کلما دخل علیہا زکریا المحراب وجد عندہا رزقا"

"محراب" ایک مخصوص جگہ کو کہتے ہیں جو عبادت گاہ میں اس کے امام یا مخصوص افراد کے لیے معین کی جاتی ہے۔ لفظ سے اس جگہ کو موسوم کرنے کی دو وجہ بیان کی جاتی ہیں:

پہلی یہ کہ "محراب" مادہ "حرب" سے ہے جس کا معنی ہے "جنگ" اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل ایمان اس مقام پر شیطان، سرکش خواہشات اور ہوس کے خلاف جنگ کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اس لیے اسے محراب کہتے ہیں۔

دوسری یہ کہ "محراب" اصولی طور پر مجلس کی بالائی اور اوپر والی جگہ کے معنی میں ہے اور چونکہ محراب کو عبادت خانے کی اوپر والی جگہ پر بنایا جاتا ہے۔ اس لیے یہ نام رکھا گیا ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں محراب کی کیفیت ہمارے ہاں سے مختلف تھی وہ محراب سطح زمین سے بلند ... تھے اور اس کے لیے سیڑھیاں بنائی جاتی تھیں اور اس کے اطراف کو کمرے کی دیوار اور ریل کی طرح بناتے تھے جس کا اسے محفوظ کر دیا جاتا اور جو لوگ محراب کے اندر ہوتے وہ باہر سے بہت کم نظر آتے تھے۔

حضرت مریمؑ حضرت زکریاؑ کی سرپرستی میں پروان چڑھیں اور خدا کی عبادت و بندگی میں اس طرح مستغرق ہوئیں کہ ابن عباس کے بقول جب وہ نو سال کی ہوگئیں تو دن کو روزہ رکھتیں اور رات کو عبادت کرتیں۔ پرہیزگاری اور معرفت الٰہی میں انہوں نے اسی ترقی کی کہ اس دور کے احبار اور پارسا علماء سے بھی سبقت لے گئیں۔[1]

حضرت زکریاؑ اُن کے محراب کے پاس آکر دیکھتے تو خاص غذائیں وہاں پڑی ہوتیں۔ انہیں بہت حیرانی ہوتی۔ ایک دن کہنے لگے: "یمریم انی لک ھذا"

مریم! یہ غذا کہاں سے لائی ہو۔

مریم بولیں:

"قالت ھو من عند اللہ ان اللہ یرزق من یشآء بغیر حساب"

یہ خدا کی طرف سے ہے اور وہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

یہ غذا کیسی تھی؛ اور جناب مریمؑ کے لیے کہاں سے آتی تھی؟ اس بارے میں آیت میں کچھ بیان نہیں کیا گیا لیکن بہت سی شیعہ وسنی کتب کی روایات جو تفسیر عیاشی وغیرہ میں مذکور ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنت کے پھلوں کی ایک قسم تھی جو بے موسم خدا کے حکم سے جناب مریمؑ کے محراب کے پاس پہنچ جاتے اور یہ بات کوئی باعث تعجب نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے کسی پرہیزگار بندے کی یوں پذیرائی کرے۔

یہاں رزق سے مراد بہشت کی ایک غذا ہے اور یہ بات آیت میں موجود قرائن سے بھی ثابت ہوتی ہے کیونکہ "رزقا" یہاں نکرہ کی صورت میں ہے اور یہ اس بات کی وضاحت ہے کہ وہ کوئی خاص قسم کی غذا تھی جو حضرت زکریاؑ کے لیے بھی نئی تھی اور

[1] مجمع البیان، ج ۲، ص ۴۳۶

دوسری نشانی خود حضرت مریمؑ کا جواب ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور تیسری دلیل ہے حضرت زکریاؑ کا جوش میں آنا اور پروردگار سے فرزند کی آرزو کرنا جس کے بارے میں بعد والی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

لیکن صاحب المنار اور دیگر مفسرین کا اعتقاد ہے کہ " رزقاً " سے مراد یہی عام دُنیاکی غذائیں ہیں کیونکہ ابن جریر نے لکھا ہے:

> بنی اسرائیل قحط سالی میں مبتلا ہوگئے۔ اناج کی بڑی کمی تھی۔ حضرت زکریاؑ مریمؑ کے مصارف برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایسے عالم میں قرعہ ڈالا گیا۔ قرعہ نجار نامی ایک شخص کے نام نکلا۔ وہ بڑے فخر سے اپنی پاکیزہ آمدنی میں سے حضرت مریمؑ کے لیے غذا مہیا کرتا تھا زکریاؑ ان کے محراب کے پاس جاتے تو ایسے شدید حالات میں ان کے پاس ایسی غذا دیکھ کر انہیں تعجب ہوتا۔ جناب مریمؑ ان سے کہتیں: خدا نے ان حالات میں ایک صاحب ایمان کے ذریعے یہ کام کر دیا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ تفسیر نہ قرآن پاک میں موجود قرائن سے موافقت رکھتی ہے اور نہ ہی ان روایات سے موافقت رکھتی ہے جو آیت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں ان میں سے ایک روایت امام باقرؑ سے منقول ہے جسے تفسیر عیاشی میں درج کیا گیا ہے ہم یہاں اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

> " ایک روز پیغمبر اکرمؐ جناب فاطمہ زہراؑ کے گھر تشریف لائے۔ حالت یہ تھی کہ کئی روز سے ان کے ہاں ٹھیک سے کھانا بھی میسر نہ تھا اچانک آپؐ نے ان کے پاس مخصوص غذا دیکھی۔ آپؐ نے پوچھا:
>
> " یہ کھانا کہاں سے آیا ہے؟ "
>
> حضرت فاطمہؑ نے عرض کیا:
>
> " خدا کے ہاں سے۔ کیونکہ وہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے "۔
>
> اس پر پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:
>
> " یہ واقعہ حضرت زکریاؑ کے واقعے کی طرح ہے۔ وہ جناب مریمؑ کے محراب کے پاس آتے تھے، وہاں کھانے کی کوئی خاص چیز دیکھی تو پوچھنے لگے یہ کھانا کہاں سے آیا ہے تو انہوں نے جواب میں کہا کہ خدا کے ہاں سے آیا ہے۔"[1]

" بغیر حساب " کے مفہوم کے بارے میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۱۲ اور اس سورہ کی آیہ ۲۷ کے ذیل میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔

۳۸- هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ

مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ○

۳۹۔ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○

۴۰۔ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ○

ترجمہ

۳۸۔ (جب مریم میں یہ لیاقت و اہلیت دیکھی) اُس وقت زکریا نے اپنے پروردگار سے دُعا کی اور عرض کی: خداوندا! اپنی طرف سے مجھے (بھی) پاکیزہ فرزند عطا فرما کہ تو دُعا کو سننے والا ہے۔

۳۹۔ جب وہ محراب میں مشغولِ عبادت تھا تو فرشتوں نے اسے پکار کر کہا: خدا تجھے یحییٰ کی بشارت دیتا ہے وہ خدا کے کلمہ (مسیح) کی تصدیق کرے گا، رہبر و رہنما ہوگا، ہوا و ہوس سے دُور ہوگا، پیغمبر ہوگا اور صالحین میں سے ہوگا۔

۴۰۔ اُس نے عرض کیا: پروردگار! میرے ہاں لڑکا کیسے ہو سکتا ہے، جب کہ مجھے بڑھاپے نے آلیا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔ فرمایا: اسی طرح خدا جو کام چاہتا ہے انجام دیتا ہے۔

تفسیر

ہم کہہ چکے ہیں کہ حضرت زکریاؑ کی بیوی اور جناب مریمؑ کی والدہ آپس میں بہنیں تھیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ دونوں ابتداء میں بانجھ تھیں۔ جناب مریمؑ کی والدہ کو ایسی لائق بیٹی نصیب ہوئی، حضرت زکریاؑ نے حضرت مریمؑ کے خلوص اور حیران کن خصوصیات کو دیکھا تو آرزو کی اُن کی بھی مریمؑ جیسی پاکیزہ اور پرہیزگار اولاد ہو جس کا چہرہ عظمتِ الٰہی اور توحید کی علامت ہو۔ حضرت

زکریاؑ اور ان کی بیوی کی طویل زندگی اسی طرح گزر چکی تھی ظاہری طبیعی قوانین اور فطرت کے نقطۂ نظر سے یہ بعید نظر آتا تھا کہ اب اُن کی کوئی اولاد ہو لیکن عشقِ الٰہی اور مریمؑ کے محرابِ عبادت کے پاس بے موسم کے پھل دیکھنے کا اثر تھا کہ حضرت زکریاؑ کے دل میں بھی اُمید پیدا ہوئی اور اُنہوں نے بڑھاپے کے موسم میں خواہش کی کہ ان کے وجود کی شاخ پر بھی فرزند کی صورت میں میوہ پیدا ہو جائے لہٰذا جب وہ عبادت اور مناجات میں مشغول تھے اُنہوں نے خدا تعالیٰ سے فرزند کا تقاضا کیا "قال رب هب لي من لدنك ذرية طيبة ۚ انك سميع الدعاء" یعنی خداوندا! مجھے پاکیزہ فرزند عطا فرما کہ تو بندوں کی دعائیں سننے والا ہے۔

"فنادته الملئكة وهو قائم يصلي في المحراب."

زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ زکریاؑ کی دعا قبول ہوگئی۔ وہ محرابِ عبادت میں مناجات کر رہے تھے اور مشغولِ عبادت تھے کہ خدا کے فرشتوں نے انہیں آواز دی اور بشارت دی کہ خدا تعالیٰ انہیں بہت جلد ایک بیٹا دے گا جس کا نام یحییٰ ہوگا اور چار صفات کا حامل ہوگا۔

۱۔ وہ حضرت مسیحؑ پر ایمان لائے گا اور اپنے ایمان سے انہیں تقویت پہنچائے گا ("مصدقا بكلمة من الله")۔

یاد رہے کہ اس آیت میں اور بعض دیگر آیات میں جن کا ذکر آگے آئے گا "کلمہ" سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور جیسا کہ تاریخ میں آیا ہے حضرت یحییٰؑ حضرت عیسیٰؑ سے چھ ماہ بڑے ہیں اور وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے جناب مسیح علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق کی اور چونکہ وہ لوگوں میں پاکیزگی اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے بہت زیادہ شہرت رکھتے تھے لہٰذا جب حضرت مسیحؑ کی طرف اُنکی رغبت، حضرت عیسیٰؑ کی دعوت و نبوت کی طرف لوگوں کی توجہ کے لیے بہت مؤثر ثابت ہوئی۔

۲۔ علم و عمل کے لحاظ سے معاشرے کی رہبری ان کے ذمے ہوگی ("وسيدا") علاوہ ازیں وہ اپنے تئیں سرکش ہوا و ہوس اور دُنیا پرستی سے محفوظ رکھیں گے ("وحصورا")۔

"حصور" مادہ "حصر" سے ہے۔ اس کا معنی ہے وہ شخص جو کسی حوالے سے اپنے آپ کو محاصرے میں رکھے۔ کبھی یہ لفظ عدم ازدواج اور شادی نہ کرنے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیت میں اِس لفظ سے یہی دوسرا مفہوم مراد لیا ہے نیز بعض روایات میں بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

۳۔ وہ خدا کے پیغمبر اور صالحین میں سے ہوں گے۔

کیا شادی نہ کرنا باعثِ فضیلت ہے

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر حصور کا معنی شادی نہ کرنا ہے تو کیا یہ عمل کسی انسان کے لیے امتیاز اور خصوصیت شمار ہوتا ہے کیونکہ یہاں حضرت یحییٰؑ کا ذکر اس حوالے سے کیا گیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو ہمارے پاس کوئی یقینی دلیل موجود نہیں کہ آیت میں "حصور" سے مراد شادی کا ترک کرنا ہے نیز اس سلسلے میں منقول روایت سند کے لحاظ سے مسلّم نہیں ہے۔ بعید نہیں کہ لفظ "حصور" آیت میں شہوات، ہوا و ہوس اور دُنیا پرستی کو ترک کرنے کے معنی میں ہو اور زہد کی ایک صفت کے لحاظ سے ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ ممکن ہے حضرت یحییٰ بھی حضرت عیسیٰؑ کی طرح زندگی کے خاص حالات کی وجہ سے اور دین کے لیے بار بار سفر کرنے کی وجہ سے مجرد زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ اس لیے یہ سب کے لیے کُلّی قانون نہیں ہو سکتا اور خدا نے ان کی یہاں اس صفت سے اس لیے تعریف کی ہے کہ انہوں نے خاص حالات کے باعث شادی نہیں کی اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو گناہ سے باز رکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور وہ کسی طرح بھی گناہ سے آلودہ نہیں ہوئے، قانونِ ازدواج تو کلی طور پر ایک فطری قانون ہے اور ممکن نہیں کہ کوئی بھی دین اس فطری قانون کے خلاف کوئی حکم جاری کرے اس لیے اسلام یا کسی اور دین میں شادی نہ کرنا کوئی اچھا کام نہیں سمجھا جاتا تھا۔

یحییٰؑ اور عیسیٰؑ

"یحییٰ" "حیٰوۃ" کے مادہ سے ہے اور اس کا معنیٰ ہے "زندہ رہتا ہے" اور یہ اس عظیم پیغمبر کا نام رکھا گیا تھا۔ زندگی سے یہاں مراد مادی اور معنوی دونوں طرح کی زندگی ہے جو ایمان، منصبِ نبوت اور خدا سے رابطہ کے زیرِ سایہ ہو۔ سورہ مریم کی آیہ ۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت یحییٰؑ کی پیدائش سے قبل ہی یہ نام ان کے لیے انتخاب فرمایا تھا۔

"یا زکریا انا نبشرک بغلام اسمه یحییٰ
لم نجعل له من قبل سمیا"

"اے زکریا! ہم تجھے ایک فرزند کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہے اور قبل ازیں کسی کا یہ نام نہیں تھا۔"

جیسا کہ گزشتہ آیات سے معلوم ہوا ہے یحییٰ کے تولد کی خواہش حضرت زکریاؑ کے دل میں جنابِ مریمؑ کی روحانی پیش رفت دیکھ کر پیدا ہوئی۔ یہ بات یہاں جالبِ نظر ہے کہ اس دعا کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ کو ایک ایسا بیٹا عطا فرمایا جو کئی لحاظ سے حضرت مریمؑ کے بیٹے سے مشابہت رکھتا ہے۔

مثلاً:

———— بچپن میں بعثتِ نبوت کے لحاظ سے،

———— نام کے مفہوم کے اعتبار سے ———— کیونکہ عیسیٰ اور یحییٰ دونوں کا معنی ہے "زندہ رہتا ہے" اور

———— اللہ تعالیٰ نے دونوں پر پیدائش، موت اور حشر و نشر تین مواقع پر درود و سلام بھیجا ہے۔

"قال رب انی یکون لی غلام......"

ملائکہ نے یحیٰی کی پیدائش کی بشارت دی تو حضرت زکریاؑ تعجب میں پڑ گئے اور بارگاہ خداوندی میں عرض کرنے لگے: خداوندا! مجھے کس طرح سے بچہ ہو جبکہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔

جواب میں وحی آئی: "خدا اسی طرح جو کچھ چاہے انجام دے دیتا ہے"۔

اس آیت میں حضرت زکریاؑ اپنے بڑھاپے کا ذکر کرتے ہیں، کہتے ہیں: "وقد بلغنی الکبر" (بڑھاپا مجھ تک آپہنچا ہے) لیکن سورہ مریم کی آیہ ۸ میں ان کا یہ قول درج ہے۔

"وقد بلغت من الکبر عتیا"

میں بڑھاپے کے آخری درجے تک جا پہنچا ہوں

تعبیر کا یہ اختلاف اس لیے ہے کہ جیسے انسان بڑھاپے کی طرف جاتا ہے گویا بڑھاپا اور موت بھی دوسری طرف سے اس کی تلاش میں آگے بڑھتی ہے جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اذا کنت فی ادبار والموت فی اقبال فما اسرع الملتقی"

"چونکہ تم عمر کے آخری حصے کی طرف جا رہے ہو اور موت تمہاری طرف بڑھ رہی ہے اس لیے کس قدر جلدی تم ایک دوسرے سے مل جاؤ گے۔"

"غلام" لغت میں "جوان لڑکے" کو کہتے ہیں "عاقر" "عقر" سے ہے، اس کا معنی ہے "جڑ اور بنیاد" اس کا ایک معنی "حبس" بھی ہے۔ بانجھ عورتوں کو اس لیے "عاقر" کہتے ہیں کہ ان کا معاملہ آخر تک پہنچ چکا ہوتا ہے یا یہ کہ وہ بچہ جننے سے رک چکی ہوتی ہیں یعنی محبوس ہو چکی ہوتی ہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت زکریاؑ کا تعجب اور حیرانی کس بناء پر تھی جبکہ خدا تعالیٰ کی بے پایاں قدرت پر بھی ان کی نظر تھی۔

قرآن کی دیگر آیات پر نظر کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ حضرت زکریاؑ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ایک بانجھ عورت جو کئی سال سے ماہانہ عادت بھی چھوڑ چکی تھی اس کے ہاں بچہ پیدا ہونا کیونکر ممکن ہے۔ اس میں کیا تغیر و تبدل ہو گا کیا پھر سے جوان یا ادھیڑ عمر کی عورتوں کی طرح انہیں ماہواری آنے لگے گی یا وہ کسی اور طرح سے بچے کی پیدائش کے قابل ہو جائیگی۔ علاوہ ازیں قدرت خداوندی پر ایمان شہود اور مشاہدے سے الگ چیز ہے۔ حضرت زکریاؑ دراصل چاہتے تھے کہ ایمان درجۂ شہود تک پہنچ جائے۔ یہ بات حضرت ابراہیمؑ کے پرندوں کے واقعے سے ملتی جلتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معاد اور قیامت پر ایمان تو تھا لیکن وہ اس طرح اطمینان حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ فطری امر ہے کہ انسان جب طبیعی قوانین کے خلاف کسی امر کا سامنا کرتا ہے تو وہ خود فکر میں پڑ جاتا ہے اور اسے خواہش ہوتی ہے کہ اس کے لیے کوئی حسی دلیل حاصل کرے۔

لہ نہج البلاغہ، کلمات قصار ۳۰

۴۱- قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۟

ترجمہ

۴۱- (حضرت زکریاؑ نے) عرض کیا: پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی مقرر فرما۔ (خدا نے) کہا: تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو تین دن تک لوگوں سے اشارے سے گفتگو کرسکے گا (اور تیری زبان بغیر کسی ظاہری سبب کے لوگوں سے بات نہیں کر پائے گی) اور (اس عظیم نعمت پر شکرانے کے طور پر) اپنے پروردگار کو بہت یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔

تفسیر

یہاں حضرت زکریاؑ یحییٰؑ کی ولادت کی بشارت پر کسی نشانی کی درخواست کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس عجیب و غریب واقعے پر حضرت زکریاؑ کا اظہار تعجب اور پروردگار سے کسی نشانی کا تقاضا کسی طرح سے بھی اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر بے اعتمادی کی دلیل نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ "کذلک اللہ یفعل من یشاء" (اسی طرح خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے) کہہ کر بشارت الٰہی کی تاکید بھی کی جا چکی ہے۔ حضرت زکریاؑ چاہتے تھے کہ اس امر سے ان کا ایمان، ایمان شہودی کا درجہ حاصل کرے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا دل اطمینان سے مالامال ہو جائے جیسے حضرت ابراہیمؑ نے مشاہدہ حسی کے ذریعے اطمینان کے حصول کی خواہش کی تھی، وہ بھی اس مرحلے تک جا پہنچیں۔

"قال اٰیتک الا تکلم الناس ثلٰثۃ ایام الا رمزا"

"رمز" اصل میں ہونٹوں سے اشارہ کرنے کو کہتے ہیں۔ آہستہ آہستہ کی جانے والی گفتگو کو بھی "رمز" کہتے ہیں۔ تدریجاً "رمز" کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو گئی ہے اور اب ہر ایسی بات، اشارے اور نشانی کو رمز کہا جانے لگا ہے جو غیر صریح اور مخفی طور پر ہو۔

خدا تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ کی یہ درخواست بھی قبول فرمائی اور ان کے لیے ایک نشانی مقرر فرمائی گئی کہ ان کی زبان کسی طبیعی عامل کے بغیر تین دن کے لیے بے کار ہو گئی۔ وہ عام گفتگو نہ کر سکتے تھے لیکن خدا تعالیٰ کے ذکر اور اس کی تسبیح

کے وقت ان کی زبان بغیر کسی تکلیف کے کام کرتی تھی۔ یہ عجیب و غریب کیفیت تمام امور پر اللہ کی قدرت کے لیے ایک نشانی تھی۔ وہ خدا جو بند زبان کو اپنے ذکر کے وقت کھول دینے کی طاقت رکھتا ہے وہ یہ قدرت بھی رکھتا ہے کہ کسی بانجھ رحم سے ایک ایسا با ایمان بچہ پیدا کردے جو ذکرِ پروردگار کا مظہر ہو اسی سے اس نشانی کا اس چیز سے ربط ظاہر ہو جاتا ہے جو حضرت زکریاؑ چاہتے تھے۔

یہی مضمون سورۂ مریم کی ابتدائی آیات میں بھی ہے۔

ممکن ہے اس نشانی میں ایک اور نکتہ بھی پنہاں ہو اور وہ یہ کہ اس مسئلے میں جناب زکریاؑ کا زیادہ اصرار اور نشانی کا تقاضا اگرچہ فعل حرام اور مکروہ نہ تھا لیکن بہر حال ترکِ اولیٰ سے کچھ مشابہ ضرور تھا اسی لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے ایسی نشانی دی گئی جو قدرت نمائی بھی تھی اور ترکِ اولیٰ پر تنبیہ اور اشارہ بھی تھا۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیا پیغمبر کی زبان کی بندش انکے مقامِ نبوت اور تبلیغی فریضے سے مناسبت رکھتی ہے؟

اس سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں کیونکہ یہ بات اس وقت فریضۂ نبوت سے مناسبت نہ رکھتی جب اس کا عرصہ طویل ہوتا۔ ایسی تھوڑی سی مدت جس میں پیغمبر اپنی امت سے الگ ہو کر عبادتِ خدا میں مشغول رہے تو کچھ غیر مناسب نہیں جبکہ وہ اس مدت میں بھی ضروری امور اشارے سے بتا سکتے تھے یا آیاتِ خدا کے ذریعے حقائق سمجھا سکتے تھے کیونکہ آیاتِ خدا تو ذکرِ پروردگار شمار ہوتی تھیں اور اتفاق کی بات ہے کہ انہوں نے یہ کام کیا بھی اور اشارے سے لوگوں کو ذکرِ خدا کی تبلیغ کی۔

"واذکر ربک کثیرًا وسبح بالعشی والابکار"

لفظ "عشی" عموماً "دن کے آخری لمحات" کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے "دن کی ابتدائی گھڑیوں" کو "ابکار" کہتے ہیں۔ بعض کا نظریہ ہے کہ ابتدائے زوال سے لے کر غروب آفتاب تک "عشی" ہے اور طلوعِ فجر کی ابتداء سے لے کر زوال تک "ابکار" ہے[1] لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ دونوں لفظ زیادہ تر پہلے معانی کے لیے ہی استعمال ہوتے ہیں۔

اس جملے میں قرآن نے بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ کو پروردگار کی تسبیح اور ذکر کا حکم دیا۔ جب آپ کی زبان بند ہو چکی تھی ایسے میں یہ تسبیح اور ذکر اس بات کی بھی نشانی تھی کہ خدا تعالیٰ بند امور کو کھولنے کی قدرت رکھتا ہے نیز خدا کے عظیم عطیے پر شکر گزاری کے حوالے سے یہ ایک ذمہ داری بھی تھی۔

سورہ مریم کی ابتدائی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زکریاؑ نے خود ہی اس پروگرام پر عمل نہیں کیا بلکہ اشارے سے لوگوں کو بھی اس کی دعوت دی کیونکہ خدا تعالیٰ کی اس بخشش و عطا کا تعلق اُن کے معاشرے سے تھا اور حضرت یحییٰ کی صورت میں انہیں ایک لائق قیادت نصیب ہو رہی تھی۔ اس لیے انہیں دعوت دی گئی کہ صبح اور عصر کے وقت پروردگار کی تسبیح اور ذکر میں مشغول رہیں۔ درحقیقت یہ سب کے لیے شکر و تسبیح کے دن قرار پائے تھے۔

۴۲۔ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ

---

[1] "المصحف المفسر" از فرید وجدی، محل بحث آیت کے ذیل میں۔

وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ○

۴۳- يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ○

ترجمہ

۴۲- اور (وہ وقت یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! خدا نے تجھے چُنا، پاک کیا اور تمام جہان کی عورتوں پر برتری اور فضیلت دی۔

۴۳- اے مریم! (اس نعمت کے شکرانے کے طور پر) اپنے پروردگار کے سامنے خضوع کرو، سجدہ بجا لاؤ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں جناب عمرانؑ اور ان کی بیوی کے متعلق بحث تھی۔ اب حضرت مریمؑ کا نام بھی لیا گیا ہے اور ان آیات میں ان کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ پہلے اس طرف اشارہ ہوا ہے کہ فرشتوں نے مریمؑ سے باتیں کیں ("واذ قالت الملٰئکۃ یٰمریم ......") یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ ممکن ہے کہ فرشتے پیغمبروں کے علاوہ دوسرے انسانوں سے بھی گفتگو کریں نیز یہ جملہ حضرت مریمؑ کے بلند مرتبے کی بھی حکایت کرتا ہے۔

فرشتے حضرت مریمؑ کو بشارت دیتے ہیں کہ خدا نے انہیں برگزیدہ کیا اور چن لیا ہے اور انہیں پاک قرار دیا ہے یعنی تقویٰ، پرہیزگاری، ایمان اور عبادت کے نتیجے میں وہ خدا کے برگزیدہ اور پاک لوگوں میں سے ہو گئی ہیں اور انہیں حضرت عیسیٰؑ جیسے پیغمبر کی پیدائش کے لیے چن لیا گیا ہے۔

" واصطفٰک علٰی نساء العٰلمین ":

" اصطفٰک " کا تکرار کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا نے تجھے جہان کی عورتوں میں سے چن لیا ہے اور تجھے سب پر برتری عطا کی ہے۔

آیت کا پہلا حصہ جناب مریمؑ کی اعلیٰ انسانی صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور برگزیدہ انسان کے طور پر آپ کا نام لیتا ہے اور دوسرے حصے میں " اصطفٰک " ان کے اپنے زمانے کی تمام عورتوں پر برتری کی طرف اشارہ ہے۔

یہ آیت اس بات پر گواہ ہے کہ حضرت مریمؑ اپنے زمانے میں عظیم ترین منزلت کی مالک خاتون تھیں یہ امر بانوئے اسلام حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے بارے میں منقول ان روایات کی نفی نہیں کرتا جن میں آپ کے لیے فرمایا گیا ہے کہ آپ تمام جہانوں کی عورتوں سے برتر اور افضل ہیں کیونکہ متعدد روایات میں پیغمبر اسلامؐ اور امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے۔

"اما مریم کانت سیدة نساء زمانها
اما فاطمة فهی سیدة نساء العٰلمین
من الاولین والاخرین" [1]

جناب مریم تو اپنے زمانے کی عورتوں کی سردار تھیں لیکن جناب فاطمہ اوّلین و آخرین تمام زمانوں کی عورتوں کی سردار ہیں۔

"العٰلمین" کا لفظ بھی اس بات کے منافی نہیں ہے کیونکہ یہ لفظ قرآن حکیم میں اور دیگر عبارات میں ایسے لوگوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو ایک وقت اور ایک زمانے میں زندگی بسر کرتے تھے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے بارے میں ہے۔

"وانی فضلتکم علی العٰلمین" (بقرہ، آیت ۴۷)

اور میں نے تمہیں عالمین پر فضیلت دی

واضح ہے یہاں مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے مومنین کو اپنے زمانے کے لوگوں پر فضیلت حاصل تھی۔

"یٰمریم اقنتی لربک"

اس آیت میں حضرت مریمؑ سے فرشتوں کی گفتگو کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ انہوں نے حضرت مریمؑ کو خدا کی طرف سے برگزیدہ ہونے کی بشارت دینے کے بعد کہا: اب پروردگار کے حضور خضوع کرو اور سجدہ و قیام بجالاؤ۔ یہ درحقیقت اس عظیم نعمت پر شکرانہ تھا۔

یہاں فرشتوں کی طرف سے حضرت مریمؑ کو تین احکام دیے گئے ہیں:

پہلا — پروردگار کے سامنے "قنوت"۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ لفظ خضوع اور دائمی اطاعت کے معنی میں ہے
دوسرا — "سجود" اور یہ خدا کے حضور خضوع کامل کی ایک قسم ہے۔
تیسرا — "رکوع" اور یہ بھی خضوع اور انکساری کی ایک اور قسم ہے۔

"وارکعی مع الرّٰکعین" — یعنی رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ ممکن ہے یہ جملہ نمازِ جماعت کی طرف اشارہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ نمازگزاروں کی جمعیت اور خدا کے حضور خضوع کرنے والوں کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی جیسے خدا کے دیگر مخلص بندے رکوع کرتے ہیں، تم بھی کرو۔

اس آیت میں پہلے سجدے کا ذکر ہے بعد میں رکوع کا۔ یہ اس لیے نہیں کہ ان کی نماز میں سجدہ پہلے آتا تھا اور رکوع بعد میں بلکہ یہاں مراد دونوں عبادتوں کی انجام دہی ہے۔ ان کی ترتیب کا تذکرہ نہیں ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہم کسی سے کہیں

[1] "نور الثقلین" جلد ۱، ص ۳۳۶ اور "بحار" جلد ۱۰، ص ۲۴

نماز پڑھو، وضو کرو اور پاک و پاکیزہ رہو۔ یعنی ان تمام فرائض کو انجام دو کیونکہ واؤ سے جو عطف ہو وہ ترتیب پر دلالت نہیں کرتا علاوہ ازیں رکوع و سجود اصل میں عجز اور خضوع کے معنی میں ہے اور عام رکوع و سجود ان الفاظ کے مصادیق میں سے ایک شمار ہوتے ہیں۔

۴۴۔ ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ○

ترجمہ

۴۴۔ یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمہیں وحی کے ذریعے بتا رہے ہیں اور جب وہ اپنی قلمیں (قرعہ اندازی کے لیے پانی میں) پھینک رہے تھے کہ مریم کی کفالت اور سرپرستی کون کرے اور اس وقت (بھی) جب اس کی سرپرستی کا افتخار اور منصب حاصل کرنے کے لیے (علماء) آپس میں مصروفِ کشمکش تھے، تم موجود نہ تھے (اور یہ سب باتیں تمہیں وحی کی معرفت بتائی گئی ہیں)۔

تفسیر

جیسا کہ گذشتہ آیات کی تفسیر میں کہا جا چکا ہے جناب مریمؑ کی والدہ پیدائش کے بعد اپنی نوزائیدہ بچی کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر عبادت خانے میں لے آئیں۔ وہاں بنی اسرائیل کے علماء اور بزرگوں سے کہنے لگیں: یہ نومولود بچی خانۂ خدا کی خدمت کے لیے نذر کی گئی ہے اس کی سرپرستی اپنے ذمے لے لیں۔ جناب مریمؑ چونکہ حضرت عمران کے خاندان سے تھیں اور یہ ایک بزرگ خاندان تھا اس لیے بنی اسرائیل کے علماء اور عباد ان کی سرپرستی کا منصب حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ قرعہ ڈال کر فیصلہ کرنے پر ان کا اتفاق ہو گیا۔ وہ ایک نہر کے کنارے گئے وہاں انہوں نے اپنی قرعہ ڈالنے کی لکڑیاں پیش کیں۔ ان میں سے ہر ایک لکڑی یا قلم پر ان میں سے ایک ایک کا نام لکھا گیا۔ جو قلم پانی میں ڈوب جاتی اس کا قرعہ نکلتا صرف جس کی قلم سطح آب پر رہتی اس کے نام قرعہ شمار ہوتا۔ جس قلم پر حضرت زکریاؑ کا نام تھا پہلے پانی کی گہرائی میں چلی گئی اور پھر پانی پر ابھر آئی۔ یوں حضرت مریمؑ کی سرپرستی کا منصب حضرت زکریاؑ کے حصے آیا اور حقیقت میں بھی وہی اس کام کے لیے اہل تر تھے کیونکہ ایک تو وہ پیغمبرِ خدا تھے اور دوسرا ان کی بیوی حضرت مریمؑ کی خالہ تھیں۔

مندرجہ بالا آیت اس واقعے کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کر رہی ہے فرمایا گیا ہے: مریمؑ کی جو کچھ سرگذشت ہم نے

نہیں بیان کی ہے یہ غیب کی خبروں میں سے ہے کیونکہ یہ واقعہ اس طرح سے خرافات سے پاک گزشتہ تحریف شدہ کتب میں بھی کہیں موجود نہیں تھا اس لیے آسمانی وحی ہی اس کی سند بن سکتی تھی ("ذٰلک من انباء الغیب نوحیه الیک")۔

پھر اس واقعہ کے ایک حصّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے، مریمؑ کی سرپرستی کے تعین کے لیے جب وہ اپنی قلمیں پانی میں ڈال رہے تھے تم موجود نہ تھے (ما کنت لدیهم اذ یلقون اقلامهم ایهم یکفل مریم) یعنی جب وہ کفالت مریمؑ پر جھگڑ رہے تھے تم پاس نہ تھے اور یہ سب کچھ تم پر صرف وحی کے ذریعے نازل ہوا ہے۔

اختلاف دور کرنے کا آخری طریقہ قرعہ اندازی ہے

زیر نظر آیت اور سورہ صٰفٰت میں حضرت یونس کے بارے میں موجود آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکل کو حل کرنے کے لیے یا تنازعے میں معاملہ آخری حد تک پہنچ جانے پر جب جھگڑا ختم کرنے کا کوئی راستہ سجھائی نہ دے تو قرعہ اندازی سے مدد لی جاسکتی ہے ان آیات کے ساتھ ساتھ پیشوایان اسلام سے منقول روایات بھی اس سلسلے میں موجود ہیں۔ انہی آیات و روایات کے باعث فقہی کتابوں میں "قاعدہ قرعہ" فقہی قواعد و اصول میں سے ایک کے طور پر زیر بحث آنے لگا۔

لیکن جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ قرعہ اندازی فقط بے بسی اور مسئلے کے حل کی کوئی دوسری صورت باقی نہ رہ جانے کی صورت میں ہی کی جاسکتی ہے۔ اس لیے مسئلے کے حل کے لیے اور راستہ نکل آنے کی صورت میں قرعہ سے مدد نہیں لی جاسکتی۔ قرعہ نکالنے کے لیے اسلام میں کوئی خاص طریقہ معین نہیں ہے بلکہ تیر کی لکڑیوں سنگریزوں یا کاغذ کا اس طرح استعمال کیا جائے کہ کسی کے خلاف سازش یا کسی کو نقصان پہنچنے کا احتمال باقی نہ رہے۔

واضح ہے کہ اسلام میں قرعہ اندازی کے ذریعے کاروبار، لین دین اور معاملہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں جسے حل کرنے کے لیے قرعہ کو ذریعہ بنایا جائے اور ایسی کمائی جائز نہیں ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ قرعہ لوگوں کے تنازعات اور اختلافات سے ہی مخصوص نہیں بلکہ اس سے دیگر مشکلات کے حل میں بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ مثلاً جیسا کہ احادیث میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی کسی بھیڑ سے بدفعلی کرے اور پھر اسے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دے۔ اب اگر اسے پہچانا نہ جاسکے تو قرعہ اندازی کے ذریعے ان میں سے ایک بھیڑ نکال لی جائے اور اس کا گوشت کھانے سے پرہیز کیا جائے کیونکہ سارے ریوڑ کو چھوڑ دینا تو بڑے نقصان کا باعث بنے گا اور پھر ان سب کا گوشت کھانا بھی جائز نہیں۔ یہاں قرعہ اس مشکل کو حل کرتا ہے۔

۴۵۔ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ

بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝

ترجمہ

۴۵ ـــ وہ وقت (یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا: اے مریمؑ! خدا اپنی طرف سے تجھے ایک کلمہ (اور باعظمت شخصیت) کی بشارت دیتا ہے جس کا نام عیسٰی بن مریمؑ ہے، وہ دنیا و آخرت میں مقام و عظمت کا مالک ہوگا اور وہ مقربین میں سے ہے۔

تفسیر

اس آیت میں حضرت مسیحؑ کی ولادت کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ فرشتوں کی طرف سے جناب مریمؑ کو بشارت دینے سے شروع ہوتا ہے۔ فرشتے خدا کی طرف سے جناب مریمؑ کو خوشخبری دیتے ہیں کہ خدا انہیں ایک بچہ دے گا جس کا نام مسیح عیسٰی بن مریمؑ ہوگا۔ وہ دنیا و آخرت میں مقام و عظمت کا مالک ہوگا۔ اور بارگاہِ الٰہی کے مقربین میں سے ہوگا: ("واذ قالت الملٰئكة يٰمريم ان الله يبشرك بكلمة منه اسمه المسيح عيسى ابن مريم")۔

چند اہم نکات

۱۔ عیسٰیؑ کو کلمہ کیوں کہا گیا؟: اس آیت میں اور دو مزید آیات میں حضرت مسیحؑ کو "کلمۃ" کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ تعبیر عہد جدید کی کتب میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

اس بارے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کو "کلمۃ" کیوں کہا گیا ہے لیکن زیادہ تر یہی نظر آتا ہے کہ اس کا سبب ان کی غیر معمولی پیدائش ہے جو اس فرمان الٰہی کی مصداق ہے۔

"انما امره اذا اراد شيئا ان يقول له كن فيكون"

اس کا امر تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے۔ (یٰسٓ - ۸۲)

یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ولادت سے پہلے خدا تعالٰی نے ان کی والدہ کو ایک کلام کے ذریعے

بشارت دی تھی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس تعبیر کی وجہ یہ ہو کہ لفظ "کلمۃ" قرآن کی اصطلاح میں مخلوق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً:

"قل لو کان البحر مداداً لکلمات ربی
لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی
ولو جئنا بمثلہ مدداً۔"

کہہ دیجئے: میرے پروردگار کے کلمات لکھنے کے لیے اگر دریا سیاہی بن جائیں تو وہ ختم ہو جائیں گے لیکن میرے رب کے کلمات ختم نہیں ہوں اگرچہ انہی جتنے اور دریا بھی ان میں شامل ہو جائیں۔ (کہف۔۱۰۹)

اس آیت میں کلماتِ خدا سے مراد مخلوقاتِ خدا ہی ہے اور چونکہ حضرت "مسیح" خدا کی عظیم مخلوقات میں سے ایک تھے اس لیے ان پر "کلمۃ" کا اطلاق ہوا ہے۔ ضمناً اس میں حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے دعویداروں کا جواب بھی آگیا ہے۔

۲۔ حضرت عیسیٰؑ کو مسیح کیوں کہتے ہیں؟: ممکن ہے یہ اس لیے ہو کہ "مسیح" کا معنی ہے "مسح کرنے والا" یا "مسح شدہ" اور وہ ناقابل علاج بیماروں کے بدن پر ہاتھ پھیر کر حکم خدا سے انہیں شفایاب کر دیتے تھے۔ اس افتخار اور عظمت کی ان کے لیے پہلے سے پیش گوئی کی گئی تھی اس لیے خدا تعالیٰ نے ولادت سے پہلے ہی ان کا نام مسیح رکھ دیا۔

یا یہ اس بناء پر ہے کہ خدا تعالیٰ نے انہیں ناپاکی اور گناہ سے مسح یعنی پاک رکھا۔

۳۔ عیسیٰؑ مریمؑ کے بیٹے ہیں: قرآن نے اس آیت میں صراحت سے حضرت عیسیٰؑ کو جناب مریمؑ کے بیٹے کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے تاکہ یہ حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے دعویداروں کے لیے جواب ہو کیونکہ جو ماں سے پیدا ہوتا ہے، عالم جنین کے تغیرات میں سے گزرتا ہے اور عالم مادہ کے تغیرات و تحولات میں داخل ہے وہ کس طرح خدا ہو سکتا ہے۔ خدا تو تمام تغیرات اور تبدیلیوں سے بالاتر ہے۔

۴۶۔ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

ترجمہ

۴۶۔ اور وہ لوگوں سے گہوارے میں اور ادھیڑ عمر میں گفتگو کرے گا اور وہ صالحین میں سے ہے۔

تفسیر

اب اس آیت میں حضرت عیسٰی کی گہوارے میں گفتگو کا تذکرہ ہے کیونکہ جیساکہ سورہ مریم میں آئے گا وہ اپنی والدہ سے تہمت دور کرنے کے لیے گہوارے میں بول اٹھے اور فصیح زبان میں خدا کے حضور اپنے مقام بندگی اور مقام نبوت کو آشکار کیا۔ اور چونکہ ممکن نہیں کہ پیغمبر ناپاک اور آلودۂ گناہ رحم سے پیدا ہو اس لیے اس اعجاز کے ذریعے اپنی والدہ کی پاکیزگی کو ثابت کیا۔

توجہ رہے کہ "مهد" نوزائیدہ بچے کے سونے اور آرام کرنے کے لیے تیار کی جانے والی چیز یا جگہ کو کہتے ہیں۔ فارسی میں یہ "گہوارہ" کے مفہوم کے قریب قریب ہے البتہ "گہوارہ" پورے طور پر "مهد" کا ہم معنی نہیں کیونکہ گہوارہ میں حرکت کا مفہوم بھی پوشیدہ ہے لیکن مهد ہر ایسی جگہ کو کہتے ہیں جو نوزائیدہ بچے کے لیے بنائی جائے۔

ضمناً اس آیت میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ حضرت مسیحؑ اپنی ولادت سے لے کر ادھیڑ عمر تک حق بات کہتے رہیں گے۔ گویا تمام عمر مخلوق کو تبلیغ و ہدایت کے لیے قدم اٹھاتے رہیں گے اور ایک لمحے کے لیے بھی آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔

یہ بھی توجہ رہے کہ "کهولة" "کهل" کے مادہ سے ہے اور یہ "بوڑھے" کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ادھیڑ عمر افراد کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض علماء لغت نے صراحت کی ہے کہ ۳۴ سے لے کر ۵۱ سال تک کا درمیانی زمانہ کہولت ہے۔ اس سے کم عمر والے کو "شاب" (جوان) کہتے ہیں اور اس سے زیادہ عمر والے کو "شیخ" کہتے ہیں۔

حضرت عیسٰی کے بارے میں یہ تعبیر گویا ایک قسم کی پیش گوئی ہے کہ وہ اس دنیا میں دوبارہ آئیں گے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تواریخ کے مطابق ۳۳ سال کی عمر میں حضرت عیسٰی لوگوں کے درمیان سے اٹھ گئے اور آسمان کی طرف صعود کیا اور یہ امر ان تمام روایات سے ہم آہنگ ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ امام مہدی علیہ السلام کے زمانے میں لوگوں میں پلٹ آئیں گے اور آنجنابؑ کی تائید کریں گے۔

آیت کے آخر میں حضرت عیسٰی کی مختلف صفات کے تذکرے کے بعد فرمایا گیا ہے: وہ صالحین میں سے ہوں گے (ومن الصّٰلحین)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صالح ہونا بہت بڑا اعزاز اور افتخار ہے اور صالح کے مفہوم میں تمام انسانی قدریں مجتمع ہیں۔

۴۷۔ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا

قَضٰٓى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ○

ترجمہ

۴۷۔ (مریمؑ نے) کہا: پروردگار! مجھ سے بچہ کیوں کر ہوگا جب کہ کسی شخص نے مجھے چھوا نہیں (جواب میں) فرمایا: خدا اسی طرح جسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔

تفسیر

ہم جانتے ہیں کہ یہ جہاں عالم اسباب ہے۔ خدا تعالیٰ نے خلقت کے عمل کو اس طرح سے جاری فرمایا ہے کہ ہر موجود عوامل کے ایک سلسلے کے بعد ہی دائرۂ وجود میں قدم رکھتا ہے مثلاً ایک بچے کے پیدا ہونے کے لیے شادی بیاہ جنسی ملاپ اور "اسپرم" اور "اووَل" کا باہمی پیوند ضروری ہے۔ اس لیے یہ باعث تعجب نہیں کہ بہت جلد صاحب فرزند ہونے کی بشارت پر مریمؑ حیران و پریشان ہو گئیں۔ انہوں نے سوال کیا: میرے خدا کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھ سے بچہ پیدا ہو جب کہ کسی بشر نے مجھے مَس تک نہیں کیا۔ "قالت رب انّٰی یکون لی ولدٌ ولم یمسسنی بشرٌ۔"

خدا نے فوراً فرشتوں کے ذریعے انہیں خبر دی: خدا جسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے یعنی جہانِ طبیعت کا نظام خدا کا پیدا کردہ ہے، اس کے تابعِ فرمان ہے، وہ جب چاہے اسے دگرگوں کر سکتا ہے اور غیر مادی علل و عوامل سے بھی موجودات کو پیدا کر سکتا ہے "کذٰلک اللّٰہ یخلق ما یشآء۔"

اس کے بعد بات کی تکمیل کے لیے فرماتا ہے: جب وہ کسی چیز کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ فوراً ہو جاتی ہے "اذا قضٰی امرًا فانّما یقول لہٗ کن فیکون۔" "کن فیکون" سُرعتِ آفرینش کی طرف اشارہ ہے۔

واضح ہے کہ لفظ "کن" درحقیقت خدا کے حتمی ارادے کا بیان ہے ورنہ اسے کہنے کی ضرورت نہیں ہے یعنی کسی چیز کے بارے میں اس کا صرف ارادہ ہو اور فرمانِ آفرینش صادر ہو تو اسے فوراً لباسِ وجود پہنا دیا جاتا ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں حضرت عیسیٰؑ کی خلقت کے بارے میں لفظ "یخلق" (خلق کرتا ہے) استعمال ہوا ہے جب کہ گذشتہ چند آیات میں حضرت یحییٰؑ کی آفرینش کے بارے میں لفظ "یفعل" (انجام دیتا ہے) استعمال کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے تعبیر کا یہ اختلاف ان دو پیغمبروں کی خلقت کے اختلاف کی طرف اشارہ ہو کہ ایک معمول کے

مطابق اور دوسرا غیر معمولی طریقے سے عالم وجود میں آیا ہے۔

۴۸۔ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝
۴۹۔ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْىِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِىْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ

۴۸۔ اور اُسے کتاب و دانش اور تورات و انجیل کی تعلیم دے گا۔

۴۹۔ اور اُسے رسُول کی حیثیت سے بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گا (جو ان سے کہے گا) میں پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے نشانی لایا ہوں۔ میں گیلی مٹی سے پرندے جیسی صُورت بناتا ہوں۔ پھر اُس میں پھُونکتا ہوں تو وُہ حکم خدا سے پرندہ بن جاتا ہے۔ نیز مادر زاد اندھے کو اور برص میں مبتلا لوگوں کو شفا دیتا ہوں، مردوں کو زندہ کرتا ہوں اور جو کچھ تم کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو، اس کی تمہیں خبر دیتا ہوں بے شک اس میں تمہارے لیے نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

تفسیر

جو افراد خدا کی طرف سے لوگوں کی ہدایت، رہبری کے لیے ما... تے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ پہلے مرحلے میں

علم و دانش کے ذریعے لوگوں کو دعوت دیں، اور زندہ و انسان ساز آئین و قوانین پیش کریں۔ پھر دوسرے مرحلے میں خدا کے اپنے ارتباط کے لیے واضح اسناد دکھائیں اور یوں خدا کی طرف سے اپنے منصوب ہونے کا ثبوت پیش کریں۔

اس مقصد کے لیے ہر پیغمبر اپنے زمانے کے ترقی یافتہ علوم کی قسم کے معجزے سے لیس ہوتا تھا تاکہ جہاں ماورائے طبیعت سے ان کا ارتباط زیادہ واضح ہو جائے اور ہر زمانے کے علماء ان کے مقابلے میں اپنے عجز کی وجہ سے ان کی دعوت کی حقانیت کا اعتراف کریں۔

یہ بات ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے منقول ہے۔ ان سے سوال کیا گیا تھا، ہر پیغمبر کے پاس کچھ نہ کچھ معجزات کیوں ہوتے تھے۔ اس سوال کے جواب میں آپؑ نے وضاحت فرمائی جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

> حضرت موسیٰ کے زمانے میں جادوگر بہت زیادہ تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے ایسا عمل انجام دیا جس کے مقابلے میں تمام جادوگر عاجز آگئے۔ حضرت مسیحؑ کے زمانے اور دعوت کے موقع پر اطباء بیماروں کے علاج معالجے میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ جناب عیسیٰؑ نے لا علاج بیماروں کو مادی وسائل کے بغیر شفا دے کر اپنی حقانیت کو ثابت کر دیا۔ پیغمبر اسلامؐ کے زمانے میں خطباء، شعرا اور سخنور بہت زیادہ فصاحت و بلاغت کے مالک تھے اور ان سب نے قرآنی فصاحت و بلاغت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ [1]

مندرجہ بالا آیت میں حضرت مسیحؑ کی ماموریت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے پہلے فرمایا ہے: خدا نے انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دی ("ویعلمه الکتٰب والحکمة") اور اس کے بعد کتاب و حکمت کے مصداق کی نشاندہی کی گئی ہے۔ فرمایا: تورات و انجیل سکھائی ("والتورٰیة والانجیل")۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کے منحرف لوگوں کی ہدایت کے لیے ان کی ماموریت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کیونکہ وہ ان دنوں طرح طرح کے خرافات، آلودگیوں اور اختلافات میں گرفتار تھے، فرمایا: "ورسولا الیٰ بنیٓ اسرآءیل"

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مندرجہ بالا آیت سے ابتداء میں یہ لگتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے ذمہ صرف بنی اسرائیل کو دعوت دینا تھا لیکن یہ ان کے اولوالعزم ہونے کی نفی نہیں ہے کیونکہ اولوالعزم پیغمبر وہ ہے جو نیا دین و آئین لے کر آئے اگرچہ اس کی ماموریت عالمی نہ ہو۔ تفسیر نور الثقلین میں حضرت عیسیٰؑ کی بنی اسرائیل میں منحصر ماموریت کے بارے میں ایک روایت بھی منقول ہے۔ [2]

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی ماموریت عالمی تھی اور بنی اسرائیل میں منحصر نہ تھی۔ البتہ وہ کہتے ہیں کہ جن کی ہدایت ان کے ذمے تھی ان میں بنی اسرائیل پہلی صف میں تھے۔

مرحوم علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں اولوالعزم کے معنی میں روایات نقل کی ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی دعوت جہانی اور پوری دنیا کے لیے ہونی چاہیے۔ [3]

درحقیقت انبیاء کی دعوت حقیقی زندگی کی طرف دعوت ہے اس لیے مندرجہ بالا آیت میں حضرت مسیحؑ کے معجزات

---

[1] بحار، ج ۵، ص ۲۱۰ [2] نور الثقلین، ج ۱، ص ۳۴۴ [3] بحار، ج ۱۱، ص ۳۴ (طبع جدید)

کی تفصیل کے موقع پر سب سے پہلے حکم خدا سے بے جان چیزوں میں زندگی پیدا کرنے کا تذکرہ ہے اور حضرت عیسیٰ کی زبانی فرمایا گیا ہے۔ میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے نشانی لایا ہوں، میں گیلی مٹی سے پرندے کی شکل کی کوئی چیز بناتا ہوں اور اس میں پھونکتا ہوں تو وہ حکم خدا سے پرندہ بن جاتا ہے۔

حکم خدا سے ایجاد حیات کا مسئلہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ دنیا کے تمام زندہ موجودات مٹی اور پانی سے وجود میں آئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اسے تدریجی تحول و تغیر کہہ سکتے ہیں اور یہ تبدیلی عرصہ دراز میں وقوع پذیر ہوئی ہے تو کیا مانع ہے کہ خدا تعالیٰ تمام عوامل کو جمع کر دے اور وہ تمام مراحل تیزی سے صورت پذیر ہو جائیں اور مٹی زندہ موجود میں بدل جائے۔ جب کہ یہ معجزہ پیش کرنے والے کا ربط ماوراء الطبیعات اور پروردگار کی لامتناہی قدرت کے ساتھ ہے۔

اس کے بعد ان بیماریوں کے علاج کا تذکرہ ہے جن کا علاج بہت مشکل ہے یا جو معمول کے طریقوں سے قابل علاج نہیں ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: میں مادر زاد اندھے اور ابرص (برص اور سفید داغ والی بیماری میں مبتلا لوگوں) کا علاج کر سکتا ہوں اور مردوں کو بھی لباس حیات پہنا سکتا ہوں۔

واضح ہے کہ یہ امور خصوصاً اس زمانے کے اطباء اور علماء کے لیے ناقابل انکار معجزات تھے۔

بعد کے مرحلے میں لوگوں کے پوشیدہ اسرار کی خبر دینے کی بات کی گئی ہے کیونکہ ہر شخص کی اپنی انفرادی اور شخصی زندگی سے کچھ ایسے اسرار اور راز ہوتے ہیں جن سے دوسرے لوگ آگاہ نہیں ہوتے۔ اب اگر کوئی شخص کسی قسم کے سابقہ رابطہ کے بغیر ایسے امور کی اطلاع دے دے مثلاً جو کھانے انہوں نے کھائے ہیں ان کی خبر دے یا جو کچھ انہوں نے پس انداز کر رکھا ہے اس کی تمام تفصیلات بتا دے تو یہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ اس نے غیبی منبع و مصدر سے الہام حاصل کیا ہے۔ جناب مسیحؑ کہتے ہیں: میں ان امور سے آگاہ ہوں اور تمہیں ان کی خبر دیتا ہوں "وانبئکم بما تاکلون وما تدخرون فی بیوتکم"

آخر میں فرمایا گیا ہے، ان تمام چیزوں میں تمہارے لیے نشانیاں ہیں اگر تم صاحب ایمان ہو اور حقیقت کے متلاشی ہو "ان فی ذالک لاٰیۃ لکم ان کنتم مؤمنین۔"

کیا یہ معجزات باعث تعجب ہیں؟ تفسیر المنار کے مؤلف اور بعض دیگر مفسرین مصر ہیں کہ آیت بالا میں مذکور معجزاتی امور جو حضرت مسیحؑ کے بارے میں قرآن نے بیان کیے ہیں کی کچھ نہ کچھ توجیہ کی جانا چاہیے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے تو فقط دعویٰ کیا تھا کہ میں حکم خدا سے ایسا کر سکتا ہوں لیکن عملی طور پر یہ کام ہرگز انجام نہیں دیے۔ حالانکہ اگر فرض کریں کہ اس آیت میں یہ احتمال ہو پھر بھی سورہ مائدہ آیہ ۱۱۰ میں ہے:

"واذ تخلق من الطین کھیئۃ الطیر.....،"

(اے عیسیٰ) خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت تم پر یہ بھی تھی کہ تم گیلی مٹی سے پرندہ بناتے تھے، اس میں پھونکتے تھے اور وہ حکم خدا سے زندہ ہو جاتا تھا۔

لہٰذا مندرجہ بالا دلیل قابلِ قبول نہیں کیونکہ سورہ مائدہ کی مذکورہ آیت میں تو پوری صراحت سے اُن کے عملاً گزرنے کا ذکر ہے۔

علاوہ ازیں ایسی توجیہات پر اصرار کے لیے کوئی وجہ بھی نہیں کیونکہ اگر مراد انبیاء کے خارقِ عادت افعال کا انکار ہے تو قرآن نے بہت سے مواقع پر اس کی تصریح کی ہے اور بالفرض ایک آدھ جگہ پر توجیہ کر بھی لیں تو بقیہ مواقع پر کیا کریں گے۔

ان سب پہلوؤں سے صرف نظر کرتے ہوئے جب ہم خدا کو تمام قوانینِ فطرت و طبیعت پر حاکم جانتے ہیں تو کلی طور پر پھر کیا مانع ہے کہ اس کے حکم سے استثنائی مواقع پر طبیعت کے معمول کے قوانین میں غیر معمولی طریقے سے تبدیلی وقوع پذیر ہو جائے۔

اگر وہ یہ تصور کرتے ہیں کہ یہ امر خدا کی توحیدِ افعالی، اس کی خالقیت اور لاشریک ہونے کے ساتھ سازگار نہیں تو قرآن نے اس کا جواب دیا ہے کیونکہ تمام جگہوں پر ان واقعات کے وقوع کو حکمِ خدا سے مشروط قرار دیا ہے یعنی کوئی شخص بھی اپنی ذاتی قوت و طاقت کے ذریعے ایسے کاموں میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا مگر یہ کہ حکمِ خدا اور اس کی بے پایاں قدرت کو منظور ہو اور یہ عین توحید ہے شرک نہیں۔

ولایت تکوینی

اس آیت اور اس سے مشابہ دیگر آیات جن کے بارے میں ہم انشاء اللہ اشارہ کریں گے، سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے بھیجے ہوئے افراد اور اولیاء اللہ اللہ کے فرمان اور اذن سے بوقت ضرورت عالمِ تکوین و آفرینش میں تصرف کر سکتے ہیں اور خلافِ معمول اور طبیعی قوانین سے ہٹ کر کچھ واقعات کو جنم دے سکتے ہیں "ابرء" (شفا دیتا ہوں)، "احی الموتیٰ" (مردوں کو زندہ کرتا ہوں) اور اس قسم کے دیگر الفاظ جو فصل متکلم کی صورت میں ذکر ہوئے ہیں، اس بات کی دلیل ہیں کہ اس قسم کے افعال خود پیغمبروں سے صادر ہوتے ہیں اور ان عبارات کو انبیاء کی دعائیں قرار دینا بلا دلیل دعویٰ ہے۔ ان عبارات کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ وہ عالم تکوین میں تصرف کرتے تھے اور ان واقعات کو عالمِ وجود میں لاتے تھے۔

زیادہ سے زیادہ اس چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ کوئی شخص یہ تصور نہ کرے کہ خدا کے انبیاء و اولیاء ذاتی طور پر صاحب استقلال ہیں اور ان کی کوئی قدرت خدا کی قدرتِ خلقت کے مقابل تھی نیز دوگانہ پرستی کے احتمال کو برطرف کرنے کے لیے چند مواقع پر "باذن اللہ" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں (محلِ بحث آیت میں دو مرتبہ اور سورۂ مائدہ کی آیہ ۱۱۰ میں چار مرتبہ "باذن اللہ" کا تکرار ہے)۔

ولایتِ تکوینی سے بھی اس کے علاوہ کچھ مراد نہیں کہ انبیاء اور آئمہ علیہم السلام ضرورت کے وقت اذنِ پروردگار سے عالمِ خلقت میں تصرفات کر سکتے ہیں اور یہ چیز ولایتِ تشریعی یعنی عوام پر حکومت، قوانین کی نشر و اشاعت اور براہِ راست دعوت و ہدایت کرنے سے بالاتر ہے۔

جو کچھ کہا جا چکا ہے اس سے ان لوگوں کا جواب بھی اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ جو مردانِ خدا کی ولایتِ تکوینی کے منکر ہو

جانتے ہیں اور اسے شرک کی ایک قسم سمجھتے ہیں کیونکہ کوئی شخص بھی حضرات انبیاء اور آئمہ علیہم السلام کو خدا کے مقابلے میں صاحب قدرت نہیں سمجھتا ۔ وہ حضرات یہ سب کام خدا کے فرمان اور اس کی اجازت سے انجام دیتے ہیں لیکن ولایت تکوینی کے منکر یہ کہتے ہیں کہ انبیاء کا کام صرف تبلیغ احکام اور خدا کی طرف دعوت دینا ہے اور کبھی کبھی وہ بعض امور تکوینی کی انجام دہی کے لیے دعا سے استفادہ کرتے ہیں اور اس سے زیادہ ان سے کوئی کام نہیں ہو سکتا حالانکہ مندرجہ بالا آیت اور اس کے مشابہ دیگر آیات کچھ اور کہتی ہیں ۔

ضمنی طور پر مندرجہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم انبیاء کے بہت سے معجزات تو ایسے افعال ہیں جو خود انہی کے ذریعے انجام پاتے ہیں اگرچہ وہ فرمان خدا کے تحت اور خدائی طاقت کی مدد سے ہوتے ہیں ۔ اس لیے حقیقت میں کہا جا سکتا ہے کہ معجزہ انبیاء کا فعل بھی ہے کیونکہ ان کے ذریعے انجام پاتا ہے اور خدا کا کام بھی ہے کیونکہ پروردگار کی قدرت سے مدد طلب کرتے ہوئے اور اس کے اذن سے انجام پاتا ہے [1]

۵۰۔ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ۚ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ○

ترجمہ

۵۰۔ اور میں تصدیق کرتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں اس کی جو تورات میں سے مجھ سے پہلے تھا اور (میں آیا ہوں تاکہ) بعض چیزیں جو (ظلم و گناہ کی وجہ سے) تم پر حرام تھیں (جیسے بعض چوپایوں کا گوشت اور مچھلیاں) انہیں حلال کروں اور تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے نشانی لایا ہوں ۔ اس لیے تم خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو ۔

تفسیر

یہ آیت حضرت عیسیٰ کی زبان سے یوں نقل ہوئی ہے : میں تورات کی تصدیق کرنے اس کے مبانی و اصول محکم کرنے کے لیے آیا ہوں اور اس لیے بھی کہ دین موسیٰ میں جو بعض حد بندیاں (مثلاً اونٹ کا گوشت ، کچھ حیوانات کی چربیاں ، بعض پرندے اور مچھلیاں ممنوع تھیں) تمہاری خلاف ورزیوں کی وجہ سے تھیں انہیں تمہارے لیے مباح کروں ۔

---

[1] یہ بنیادی صورت آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کے بارے میں ہے (مترجم) ۔

جیسا کہ سورہ نساء کی آیہ ۱۶۰ کی تفسیر میں آئے گا گروہ یہود کی ہٹ دھرمی اور سرکشی کی وجہ سے کچھ پاکیزہ نعمتیں وقتی طور پر ان پر حرام ہو گئی تھیں:

"فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبات احلت لھم"

پس ان کے ظلم کی وجہ سے ان یہودیوں پر اللہ نے بہت سی پاکیزہ چیزیں حرام قرار دے دی تھیں۔

لیکن حضرت عیسیٰ کی رسالت اور اس عظیم پیغمبر کے ظہور پر قدردانی کے طور پر وہ ممانعتیں ختم کر دی گئیں۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰ کی زبانی ایک جملہ جو گذشتہ آیت میں کہا تھا اس کا تکرار کیا گیا ہے: میں خدا کی طرف سے اپنی دعوت کی صداقت کے لیے ایک نشانی لایا ہوں اس بنا پر یہ ہونا چاہیے کہ خدا سے ڈرو اور میرے احکام کی پیروی کرو

"وجئتکم بآیۃ من ربکم فاتقوا اللہ واطیعون"۔

۵۱۔ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ○

ترجمہ

۵۱۔ خدا میرا اور تمہارا پروردگار ہے پس اسی کی عبادت کرو (نہ کہ میری یا کسی اور چیز کی)، یہی سیدھی راہ ہے۔

تفسیر

اس آیت سے اور قرآن کی دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ ہر قسم کے ابہام اور اشتباہ کے خاتمے کے لیے اور اس لیے کہ آپ کی استثنائی ولادت کو آپ کی الوہیت پر سند نہ سمجھ لیں بار بار کہتے تھے: اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ نیز کہتے: میں اس کا بندہ ہوں اور اس کا بھیجا ہوا ہوں۔ اس کے برخلاف مروجہ تحریف شدہ انجیلوں میں حضرت مسیح کی زبان سے خدا کے بارے میں "باپ" کا لفظ نقل کیا گیا ہے۔ قرآن میں ایسے مقامات پر لفظ "رب" یا اس جیسے الفاظ نقل ہوئے ہیں "ان اللہ ربی و ربکم"۔ اور یہ چیز دعائے الوہیت کے خلاف اور اس کے مقابلے میں حضرت مسیح کی انتہائی توجہ کی نشاندہی کرتی ہے۔

آخر میں زیادہ تاکید کے لیے فرمایا: "فاعبدوہ" یعنی خدا کی پرستش اور عبادت کرو نہ کہ میری اور یہ توحید و یگانہ پرستی ہی سیدھی راہ ہے۔

۵۲۔ فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیۡسٰی مِنۡهُمُ الۡكُفۡرَ قَالَ مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الۡحَـوَارِيُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشۡهَدۡ بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ ○

ترجمہ

۵۲۔ حضرت عیسیٰؑ نے ان سے کفر (اور مخالفت) کو دیکھا تو کہا: کون خدا کی طرف (اور اس کے دین کے لیے) میرا یاور و مددگار بنے گا؟ حواریین (جو ان کے مخصوص شاگرد تھے) کہنے لگے ہم خدا کے یاور و مددگار ہیں، اس پر ایمان لاتے ہیں اور آپ (بھی) گواہ رہیں کہ ہم اسلام لے آئے ہیں۔

تفسیر

اہل یہود حضرت عیسیٰؑ کے آنے سے پہلے حضرت موسیٰؑ کی پیشین گوئی اور بشارت کے مطابق حضرت مسیحؑ کے ظہور کے منتظر تھے لیکن جب انہوں نے ظہور فرمایا اور بنی اسرائیل کے ایک ستمگر اور منحرف گروہ کو اپنے منافع خطرے میں نظر آئے تو صرف تھوڑے سے لوگ آپ کے گرد جمع ہوئے اور جن لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت مسیحؑ کی دعوت قبول کرنے اور احکام خدا کی پیروی سے ان کی حیثیت اور قدر و منزلت خطرے سے دوچار ہو جائے گی انہوں نے قوانین الٰہی کو قبول کرنے سے منہ پھیر لیا۔

دلیل و برہان سے انہیں کافی دعوت دینے کے بعد حضرت عیسیٰؑ اس نتیجے پر پہنچے کہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ مخالفت اور گناہ پر مصر ہے اور وہ کسی انکار اور بگڑی سے دستبردار نہیں ہوگا لہذا انہوں نے پکار کر کہا: کون ہے جو دین خدا کی حمایت اور میرا دفاع کرے "فلما احس عیسٰی منھم الکفر قال من انصاری الی اللہ"۔

صرف تھوڑے سے افراد نے اس کا مثبت جواب دیا۔ یہ چند پاک باز افراد تھے جنہیں قرآن نے حواریین کا نام دیا ہے۔

اُنہوں نے حضرت مسیحؑ کی پکار کا جواب دیا اور ہر قسم کی مدد کی ان کے مقدس مقاصد کی پیش رفت کی راہ میں دفاع کرنے سے دریغ نہ کیا۔

حواریین نے حضرت عیسیٰؑ کی ہر طرح سے مدد کا اعلان کیا اور جیسا کہ قرآن نے مندرجہ ذیل آیت میں اُن سے نقل کیا ہے کہنے لگے :

"قال الحواریون نحن انصار اللہ
اٰمنا باللہ ، واشھد بانا مسلمون ."

"ہم خدا کے یاور و مددگار ہیں ، خدا پر ایمان لائے ہیں اور
آپ کو اپنے اسلام پر گواہ بناتے ہیں "

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰؑ کی دعوت کے جواب میں یہ نہیں کہا کہ ہم آپ کے مددگار ہیں بلکہ اپنی انتہائی توحید پرستی اور خلوص کے ثبوت کے لیے اور اس مقصد کے لیے کہ ان کی بات سے کسی شرک کی بُو نہ آئے ، وہ کہنے لگے : ہم خدا کے مددگار اور ساتھی ہیں اور اس کے دین کی مدد کریں گے اور آپ کو اس حقیقت پر گواہ بناتے ہیں ، گویا وہ بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ منحرف اور کج رو افراد آئندہ حضرت مسیحؑ کی الوہیت کا دعوٰی کریں گے لہٰذا وہ ان کے ہاتھوں میں کوئی دلیل نہیں دینا چاہتے تھے ۔

حواری کون تھے

"حواریین" "حواری" کی جمع ہے اس کا مادہ "حور" ہے جس کا معنی ہے "دھونا اور سفید کرنا" ۔ کبھی کبھی یہ لفظ ہر سفید چیز کے لیے بھی بولا جاتا ہے اسی لیے سفید غذا کو عرب لوگ "حواری" کہتے ہیں ۔ بہشت کی حوروں کو بھی اُن کے سفید رنگ کی وجہ "حوریہ" کہتے ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ کے شاگردوں کو "حواری" کیوں کہا گیا ، اس کے لیے بہت سے احتمالات پیش کیے گئے ہیں مگر جو چیز زیادہ قرینِ عقل ہے اور دین کے عظیم رہبروں سے منقول احادیث میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے یہ ہے کہ وہ پاک دل لوگ تھے اور روح باصفا کے مالک تھے اس کے علاوہ وہ دوسروں کے افکار کو پاکیزہ اور روشن کرنے ، لوگوں کے دامن کو آلودگی اور گناہ سے دھونے اور انہیں پاک کرنے میں بہت کوشاں رہتے تھے ۔

عیون الرضا میں امام علی بن موسٰی علیہما السلام سے منقول ہے :
آپؑ سے سوال کیا گیا ۔
حواریین کا یہ نام کیوں رکھا گیا ؟
آپؑ نے فرمایا :

* بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اُن کا مشغلہ کپڑے دھونا تھا لیکن ہمارے نزدیک اس کی حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے خود کو بھی گناہ کی آلودگی سے پاک رکھا ہوا تھا اور دوسروں کو بھی پاک کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔

حواری قرآن اور انجیل کی نظر میں

قرآن نے سورہ صف آیہ ۱۴ میں حواریوں کے بارے میں گفتگو کی ہے اور ان کے ایمان کا تذکرہ کیا ہے لیکن انجیل میں حواریوں کے بارے میں جو جملے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سب حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں لغزش کرتے تھے۔
انجیل متی اور لوقا کے باب ۹ میں حواریوں کے نام اس طرح سے بیان کیے گئے ہیں۔

۱، پطرس ۲، اندریاس ۳، یعقوب

۴، یوحنا ۵، فیلوپس ۶، برتولوما

۷، توما ۸، متی ۹، یعقوب ابن حلفا

۱۰، شمعون (جن کا لقب غیور تھا) ۱۱، یہودا (جو یعقوب کے بیٹے تھے) ۱۲، یہودائے اسخریوطی (جس نے حضرت مسیح سے خیانت کی)

مشہور مفسر طبرسی مجمع البیان میں لکھتے ہیں:

حواری حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ جب کبھی انہیں بھوک یا پیاس لگتی، حکم خدا سے آب و غذا اُن کے لیے مہیا ہو جاتا۔ وہ اسے اپنے لیے عظیم افتخار اور بڑا اعزاز سمجھتے۔ وہ حضرت عیسیٰؑ سے پوچھتے: کیا ہم سے بڑھ کر بھی کوئی افضل و بالاتر ہے۔ تو وہ کہتے: ہاں، افضل منکم من یعمل بیدہ و یأکل من کسبہ۔ (یعنی وہ شخص تم سے افضل ہے جو اپنے ہاتھ سے کماتا ہے اور اپنی کمائی کھاتا ہے) اس کے بعد وہ لوگوں کے کپڑے دھوتے تھے اور اس کام سے اجرت لیتے تھے (یوں عملاً انہوں نے سب لوگوں کو درس دیا کہ کام اور کوشش کرنا کوئی ننگ و عار نہیں ہے)۔

۵۳۔ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ○

ترجمہ

۵۳۔ پروردگار! جو کچھ تو نے نازل کیا ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے (تیرے) رسول کی پیروی کی ہے۔ ہمیں گواہوں کے زمرے میں لکھ لے۔

تفسیر

حضرت مسیحؑ کی دعوت قبول کرنے کے بعد حواریوں نے ان کا ساتھ دیا، ان کی مدد کی اور انہیں اپنے ایمان پر گواہ بنایا۔ پھر بارگاہِ الٰہی کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنا ایمان پیش کیا اور کہنے لگے، پروردگار! جو کچھ تو نے بھیجا ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں ("ربنآ امنا بمآ انزلت") لیکن ایمان کا چونکہ دعویٰ ہی کافی نہیں تھا، اس لیے ساتھ ہی آسمانی احکام پر عمل کرنے اور پیغمبر خدا (حضرت عیسیٰؑ) کی پیروی کا ذکر کرنے لگے اور کہنے لگے: ہم نے تیرے بھیجے ہوئے مسیحؑ کی پیروی کی ("واتبعنا الرسول") اور یہ ہمارے ایمان راسخ کا زندہ ثبوت ہے۔ یہ اس لیے کہ جب ایمان روح انسانی میں اتر جاتا ہے تو اس کے عمل میں منعکس ہوتا ہے اور عمل کے بغیر ممکن ہے دعویٰ صرف خیالی ایمان ہو اور حقیقی و واقعی ایمان نہ ہو۔

اس کے بعد انہوں نے تقاضا کیا کہ خدا ان کے نام شہادت دینے والوں اور گواہوں کے زمرے میں شمار کرے ("فاکتبنا مع الشّٰھدین")۔ یہ گواہ وہی لوگ ہیں جو اس دنیا میں امتوں کی رہبری کرتے ہیں اور قیامت میں لوگوں کے نیک و بد اعمال کے گواہ ہوں گے۔

۵۴۔ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۟

ترجمہ

۵۴۔ اور (یہودیوں اور مسیح کے دشمنوں نے ان کی اور ان کے دین کی بربادی و نابودی کے لیے) سازش کی اور خدا نے (ان کی اور ان کے دین کی حفاظت کے لیے) چارہ جوئی کی اور خدا بہترین چارہ جوئی کرنے والا ہے۔

تفسیر

خدائی مکر سے کیا مراد ہے

"حواریون" کے ایمان کا تذکرہ کرنے کے بعد اب اس میں یہودیوں کی شیطانی

سازشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: انہوں نے مسیح کو نابود کرنے، ان کی آواز کو خاموش کرنے اور ان کے دین کی پیش رفت روکنے کے لیے کئی مکروفریب اور سازشیں کیں لیکن خدا کی تدبیر اور چارہ جوئی ان سب مکاریوں اور سازشوں سے بالاتر اور زیادہ موثر تھی۔

قرآن میں اس جیسی کئی ایک آیات دکھائی دیتی ہیں جن میں مکر کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے[1]۔

لغتِ عرب میں "مکر" کا معنی اس سے بہت مختلف ہے جو اس کا معنی آج کی فارسی میں ہے۔ فارسی میں آج کل "مکر" شیطانی سازشوں اور زیاں کاریوں کے لیے استعمال ہوتا ہے حالانکہ لغتِ عرب کے اصول معانی میں "مکر" ہر طرح کی چارہ جوئی" کو کہتے ہیں جو اچھی بھی ہوتی ہے اور کبھی بری بھی۔

مفرداتِ راغب میں ہے۔

"المکر صرف الغیر عما یقصدہ"

مکر یہ ہے کہ کسی کو اس کے مقصد سے ہٹا دیا جائے۔

(اس سے قطع نظر کہ اس کا مقصد اچھا ہے یا برا)

قرآن مجید میں بھی "مکر" کبھی لفظ "خیر" کے ساتھ آیا ہے، مثلاً

"واللہ خیر الماکرین"

یعنی - خدا بہترین چارہ جوئی کرنے والا ہے۔

اور کبھی لفظ "سیئ" (یعنی — برا) کے ساتھ مذکورہ ہے، مثلاً

"ولا یحیق المکر السیئ الا باھلہ"

یعنی - بری سازش اور سوچ اپنے اہل کے علاوہ کسی کا احاطہ نہیں کرے گی۔ (فاطر - ۴۳)

اس بناء پر محل بحث آیت سے مراد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے دشمن اپنی شیطانی سازشوں کے ذریعے اس خدائی دعوت کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی جان کی حفاظت اور اس کے دین کی پیش رفت کے لیے تدبیر کی اور ان کے نقشے نقش بر آب ثابت ہوئے۔

۵۵۔ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ

---

[1] مثلاً سورہ انفال کی آیت ۳۰، سورہ نمل کی آیت ۵۰ اور بعض دوسری آیات

فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ○

ترجمہ

۵۵۔ (وہ وقت یاد کرو) جب خدا نے عیسٰی سے کہا: میں تمہیں لے لوں گا اور اپنی طرف اُٹھالوں گا اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان سے پاک کروں گا اور جو لوگ تیری پیروی کرتے ہیں اُنہیں اُن لوگوں سے یومِ قیامت تک کے لیے برتر قرار دوں گا جو کافر ہو گئے ہیں۔ پھر تمہاری بازگشت میری طرف ہے اور جس چیز میں تم اختلاف کرتے ہو اس کا تمہارے درمیان فیصلہ کر دوں گا۔

تفسیر

ہم نے کہا ہے کہ یہودیوں نے بعض جرائم پیشہ عیسائیوں کی مدد سے حضرت مسیحؑ کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا تھا لیکن خدا تعالیٰ نے اُن کی سازشوں کو نقش بر آب کر دیا اور اپنے پیغمبر کو ان کے چنگل سے رہائی بخشی۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے اس سے پہلے جو احسان حضرت مسیحؑ پر کیا اُس کا ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اے عیسٰیؑ! میں تمہیں لے لوں گا اور اپنی طرف اُٹھالوں گا ("إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ")

سورۂ نساء کی آیت ۱۵۷ سے استناد کرتے ہوئے مفسرین میں یہ مشہور ہے کہ حضرت عیسٰیؑ قتل نہیں ہوئے اور خدا انہیں آسمان کی طرف لے گیا۔ لیکن خود عیسائی موجودہ اناجیل کے مطابق کہتے ہیں کہ حضرت عیسٰیؑ قتل ہوئے اور بعد ازاں انہیں دفن کر دیا گیا، پھر وہ مردوں کے درمیان سے اُٹھے، تھوڑی مدت زمین پر رہے اور آسمان کی طرف اُٹھ گئے۔

المنار کے مؤلف کی طرح بعض مفسرین اسلام کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیحؑ قتل ہوئے اور خدا صرف ان کی روح کو آسمان کی طرف لے گیا۔

اس بارے میں ضروری گفتگو یہ کہ ان دو نظریوں میں سے کونسا حق ہے اس سلسلے میں بحث انشاء اللہ سورۂ نساء کی آیت ۱۵۷ کے ذیل میں آئے گی۔

یہاں جس بات کی طرف توجہ ضروری ہے، یہ ہے کہ محلِ بحث آیت حضرت عیسٰیؑ کی موت پر دلالت نہیں کرتی اگرچہ بعض یہ تصور کرتے ہیں کہ "متوفیک" کا مادہ ہے "وفات" اور یہ موت کے معنی میں ہے

اس لیے ان کا خیال ہے کہ جو عقیدہ مسلمانوں میں مشہور ہے کہ حضرت عیسٰی نے وفات نہیں پائی اور وہ زندہ ہیں اس مفہوم کے منافی ہے حالانکہ احادیث بھی اس عقیدے کی تائید کرتی ہیں نیز "فوت" ہاتھ سے نکل جانے کے معنی میں ہے اور "توفی" (بروزن ترقی) "وفی" کے مادہ سے ہے جس کا مطلب ہے "کسی چیز کی تکمیل کرنا" . عہد و پیمان پر عمل کرنے کو "وفا" بھی تکمیل کرنے اور اسے انجام تک پہنچانے کی وجہ سے کہتے ہیں ۔ اسی بناء پر اگر کوئی شخص کامل طور پر اپنا حق دوسرے سے اپنی تحویل میں لے لے تو عرب کہتے ہیں " توفی دینہ " یعنی اپنا حق پورا پورا وصول کر لیا۔

آیات قرآنی میں بھی " توفی " بارہا " لینے " کے معنی استعمال ہوا ہے . مثلاً

" وھو الذی یتوفٰکم باللیل
ویعلم ما جرحتم بالنھار "

وہ ذات وہ ہے جو تمہاری روح کو رات کے
وقت لے لیتی ہے اور جو کچھ تم دن کو انجام دیتے ہو اس
سے آگاہ ہے۔ (انعام - ۶۰)

اس آیت میں نیند کو " توفی روح " کہا گیا ہے ۔ یہی معنی سورہ زمر کی آیہ ۴۲ میں بھی آیا ہے ۔ قرآن کی متعدد دیگر آیات میں بھی لفظ " توفی " " لینے " کے معنی میں نظر آتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ " توفی " بعض اوقات " موت " کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے لیکن وہاں بھی درحقیقت موت کے مفہوم میں نہیں بلکہ روح کو اپنی تحویل میں لے لینے کے معنی میں ہے ۔ اصولی طور پر " توفی " کے معنی میں " موت " پوشیدہ نہیں ہے ۔ اور " فوت " کا مادہ " وفی " کے مادہ سے بالکل جدا ہے۔

جو کچھ کہا جا چکا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے محل بحث آیت کی تفسیر پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے خداوند عالم فرماتا ہے ۔ : اے عیسٰی میں تجھے اپنی تحویل میں لے لوں گا ، تجھے اٹھا لے جاؤں گا اور یہ مفہوم حضرت عیسٰی کی حیات اور زندگی پر دلالت کرتا ہے نہ کہ ان کی موت پر (غور کیجئے)۔

" ومطھرک من الذین کفروا "

پروردگار نے حضرت عیسٰی سے جو خطاب فرمایا اس جملے میں اس کا ایک حصہ آیا ہے ۔ ارشاد ہے ، جو کافر ہیں ان سے میں تمہیں پاک و پاکیزہ رکھوں گا ۔ اس پاکیزگی سے مراد بے ایمان ، ناپاک اور حق و حقیقت سے ہٹے ہوئے افراد کے چنگل سے نجات دینا ہے ۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ ناروا تہمتوں اور بزدلانہ سازشوں کے ذریعے انہیں آلودہ کر دیں لیکن خدا نے ان کے دین کو کامیابی بخشی اور انہیں تہمتوں سے پاک کیا جیسا کہ سورہ فتح میں پیغمبر اسلام کے بارے میں ہے :

" انا فتحنا لک فتحا مبینا لیغفر لک اللہ
ما تقدم من ذنبک وما تاخر "

"ہم نے تمہیں واضح کامیابی عطا فرمائی تاکہ خدا تمہارے گذشتہ اور آئندہ گناہ بخش دے (اور تمہیں ان تہمتوں سے جو گناہ کی شکل میں دشمنوں نے تم سے باندھ دی تھیں، پاک رکھے) (فتح - ۲،۱)

یہ بھی ممکن ہے کہ پاک کرنے سے مراد حضرت مسیحؑ کو اس آلودہ ماحول سے باہر نکالنا ہو اور اس جملے سے پہلے والے جملے سے بھی یہی معنی مناسبت رکھتا ہے۔

"وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الیٰ یوم القیٰمۃ"

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: تیرے پیروکاروں کو قیامت تک کے لیے کافروں پر برتری دوں گا۔ یہ ایک بشارت ہے جو خدا نے حضرت مسیحؑ اور ان کے پیروکاروں کو دی تاکہ جو راہ انہوں نے منتخب کی تھی اس پر چلتے رہنے کے لیے ان میں ولولہ پیدا ہو۔ درحقیقت یہ آیت قرآن کی معجز نمائیوں اور غیبی پیشین گوئیوں میں سے ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے پیروکار ہمیشہ یہودیوں پر جو کہ مسیحؑ کے مخالف تھے، برتر رہیں گے۔ آج کی دُنیا میں ہم یہ حقیقت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ یہودی اور صیہونی عیسائیوں سے وابستگی اور ان پر بھروسہ کئے بغیر ایک دن بھی سیاسی اور سماجی طور پر زندہ نہیں رہ سکتے۔ واضح ہے کہ "الذین کفروا" سے یہاں مراد وہی یہودی ہیں جنہوں نے حضرت مسیحؑ کا انکار کیا۔

کیا اہل یہود اور مسیحؑ کا دین باقی رہے گا

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے وہ یہ کہ اس آیت کے مطابق یہود و نصاریٰ قیامت تک اس دُنیا میں رہیں گے اور ان مذاہب کے پیروکار ہمیشہ موجود رہیں گے جب کہ ظہور حضرت "مہدی علیہ السلام" سے مربوط اخبار اور روایات میں ہم پڑھتے ہیں کہ آپ تمام ادیان پر غالب آئیں گے اور آپ پوری دُنیا پر حکومت کریں گے۔

اس سوال کا جواب مذکورہ روایات پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کیونکہ حضرت "مہدی علیہ السلام" کے بارے میں مروی روایات میں ہے کہ کوئی گھر، شہر اور بیابان ایسا نہیں رہے گا جس میں توحید داخل نہ ہو۔ یعنی اسلام ایک باقاعدہ اور عمومی دین کی حیثیت سے دُنیا کو اپنے اندر سموئے گا اور اس وقت کی حکومت ایک اسلامی حکومت کے طور پر ابھرے گی اور اسلامی قوانین کے علاوہ دُنیا پر کسی چیز کی حکمرانی نہیں ہوگی۔ لیکن اس سے کوئی مانع نہیں کہ یہود و نصاریٰ کی ایک اقلیت حضرت "مہدی علیہ السلام" کی حکومت کے زیر سایہ "اہل ذمہ" کی حیثیت سے موجود ہو کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت "مہدی علیہ السلام" لوگوں کو جبری طور پر اسلام کی طرف نہیں کھینچیں گے بلکہ منطق و دلیل کے بل بوتے پر آگے بڑھیں گے اور آپ کی طاقت تو نظام عدل کے قیام، ظالم حکومتوں کو سرنگوں کرنے اور دُنیا کو زیر پرچم اسلام لانے کے لیے استعمال ہوگی، نہ کہ آپ لوگوں کو اپنا دین قبول

کرنے پر مجبور کریں گے ورنہ تو آزادی اور اختیار کا کوئی مفہوم نہیں رہے گا۔

"ثم الی مرجعکم فاحکم بینکم فیما کنتم فیہ تختلفون۔"

جو کچھ گذشتہ جملوں میں کہا جا چکا ہے وہ اس جہان کی کامیابیوں کے بارے میں تھا لیکن آخری فیصلہ جو در اصل اعمال کے نتائج پر مبنی ہے اس کا ذکر اس جملے میں کیا گیا ہے۔ فرمایا: تم سب میری طرف پلٹ آؤ گے اور میں تمہارے اور ان چیزوں کے درمیان جن میں تم اختلاف کرتے ہو فیصلہ کروں گا۔

۵۶۔ فَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ٘ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ○

۵۷۔ وَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ○

۵۸۔ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَیْكَ مِنَ الْاٰیٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِیْمِ ○

ترجمہ

۵۶۔ رہے وہ لوگ جو کافر ہو گئے ہیں (اور انہوں نے حق کو پہچاننے کے باوجود اس کا انکار کر دیا ہے) انہیں دنیا و آخرت میں سخت عذاب کروں گا اور ان کے یار و مددگار نہیں ہیں۔

۵۷۔ اور رہے وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل انجام دیے ہیں تو خدا انہیں ان کا پورا پورا اجر و ثواب دے گا اور خدا ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔

۵۸۔ یہ جو کچھ ہم تیرے لیے پڑھتے ہیں، تیری حقانیت کی نشانی اور حکیمانہ تذکرہ ہے

تفسیر

"فاما الذین کفروا فاعذبهم عذابا شدیدا فی الدنیا والاخرة وما لهم من نصرین"

یہ ذکر کرنے کے بعد کہ لوگوں کی بازگشت اللہ کی طرف ہے اور وہی ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اب اِس آیت میں اِس تضادت کا نتیجہ بیان ہوا ہے کہ وہ افراد جو کافر ہیں اور حق و عدالت کے مخالف ہیں، جیسے وہ اِس دُنیا میں دردناک عذاب اور تکلیف میں مبتلا ہوں گے اگلے جہان میں بھی ان کی یہی حالت ہوگی اور کوئی بھی ان کی حمایت اور مدد نہیں کرے گا۔

"واما الذین امنوا وعملوا الصلحت فیوفیهم اجورهم"

لیکن جو ایمان لائے ہیں اور عمل صالح بجا لاتے ہیں وہ لوگ اپنا پورا پورا اجر و ثواب حاصل کریں گے اور خُدا کبھی ظالموں کو پسند نہیں کرتا "والله لا یحب الظلمین۔"

پہلی آیت میں عذابِ دُنیا کی طرف بھی اشارہ ہوا تھا اِس سے ہم ضمناً یہ استفادہ کرتے ہیں کہ کفار (جن سے یہاں یہودی مراد ہیں) اِس جہان میں بھی پریشانیوں اور مصیبتوں میں گرفتار رہیں گے۔ یہودی قوم کی تاریخ اِس دعویٰ پر گواہ ہے۔ ان پر دوسری حکومتوں کے تفوق کا یہ ایک اثر ہے جس کی طرف گذشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

"ذلک نتلوه علیک من الایت والذکر الحکیم"

حضرت مسیح کی سرگزشت اور ان کی عجیب و غریب تاریخ کے ایک گوشے کا ذکر کرنے کے بعد اب رُوئے سخن پیغمبر اسلام کی طرف ہے۔ فرماتا ہے: اور جو کچھ ہم نے تیرے سامنے پڑھا ہے وہ تیری دعوت و رسالت کی صداقت کی آیات اور نشانیاں ہیں اور حکمت آمیز یاد آوری ہے جو آیاتِ قرآن کی صورت میں تجھ پر نازل ہوئی اور یہ وہ آیات محکم ہیں جو ہر قسم کے سہل، باطل اور خرافات سے پاک ہیں اور حقائق کو واضح کرتی ہیں۔

۵۹۔ اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰهِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ○

۶۰۔ اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُنۡ مِّنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ○

ترجمہ

۵۹۔ عیسیٰ کی مثال خدا کے نزدیک آدم کی سی ہے، جسے خدا نے مٹی سے پیدا کیا، پھر اُس سے کہا: ہو جا تو وُہ فوراً ہو گیا (اس لیے باپ کے بغیر مسیح کی ولادت ہرگز اُن کی الوہیت کی دلیل نہیں بن سکتی)۔

۶۰۔ یہ چیزیں تیرے پروردگار کی طرف سے حقائق ہیں لہٰذا تم تردّد و شک کرنے والوں میں سے نہ بنو۔

شانِ نزول

جیسا کہ سورہ کی ابتداء میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے اِس سورہ کی کافی آیات نجران کے عیسائیوں کے سوال کے جواب کے طور پر نازل ہوئیں۔ وہ ایک ساٹھ رکنی وفد کی صورت میں پیغمبر اسلامؐ کے پاس مدینہ میں آئے۔ اُس میں اُن کے چند نامور رؤسا اور بزرگ شامل تھے۔

انہوں نے جو مسائل پیغبر اکرمؐ کے سامنے پیش کیے ان میں سے ایک مسئلہ یہ تھا کہ وہ پوچھنے لگے کہ آپ ہمیں کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: خدائے یگانہ کی طرف اور یہ کہ میں اُس کی طرف سے ہدایت مخلوق کی رسالت کے منصب پر فائز ہوں نیز یہ کہ مسیحؑ اُس کے بندوں میں سے ایک تھے؛ حالاتِ بشری رکھتے تھے اور دوسرے لوگوں کی طرح غذا کھاتے تھے۔ انہوں نے یہ بات نہ مانی اور باپ کے بغیر حضرت عیسیٰ کی ولادت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے ان کی الوہیت کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا۔ اِس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور اُنہیں جواب دیا گیا۔ لیکن جب وہ یہ جواب قبول کرنے پر بھی تیار نہ ہوئے تو اُنہیں مباہلہ کی دعوت دی گئی، جس کی تفصیل عنقریب بیان کی جائے گی۔

تفسیر

پہلی آیت میں ایک مختصر اور واضح استدلال ہے جس میں نجران کے عیسائیوں کے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں دعوئ الوہیت کا جواب ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ باپ کے بغیر پیدا ہوئے تو یہ امر اس کی دلیل کبھی نہیں بن سکتا کہ وہ خُدا کے بیٹے یا خود خدا تھے، کیونکہ یہ بات تو حضرت آدمؑ کے بارے میں عجیب ترین صورت میں محقق اور ثابت ہو چکی ہے۔ وہ تو ماں باپ دونوں کے بغیر دُنیا میں آئے تھے۔ اِس لیے جیسے حضرت آدم کی مٹی

سے پیدائش کوئی تعجب کی بات نہیں اور خدا جو کام انجام دینا چاہے اس کا فعل اور ارادہ ہم آہنگ ہیں، اس طرح حضرت عیسیٰ کا اپنی والدہ سے بغیر باپ کے پیدا ہونا کوئی محال مسئلہ نہیں ہے بلکہ حضرت آدم کی پیدائش کئی لحاظ سے زیادہ تعجب خیز ہے۔ پس اگر بغیر باپ کے حضرت عیسیٰ کی پیدائش ان کی الوہیت کی دلیل ہے تو حضرت آدم اس امر کے زیادہ مستحق ہیں۔

مندرجہ بالا آیت میں پہلے حضرت آدمؑ کی خلقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "خلقہ من تراب" (یعنی - اسے مٹی سے پیدا کیا)۔ دوسرے جملوں کے قرینے سے، اس جملے سے مراد حضرت آدمؑ کے جسم اور مادی پہلو سے ان کی خلقت ہے۔ اس کے بعد دوسرے جملے میں ان کی حیات اور روح کی خلقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "ثم قال لہ کن فیکون" (پھر اس سے کہا ہو جا تو وہ ہو گیا) یعنی حکمِ خلقت کے ساتھ حیات اور روح آدم کے قالب میں پھونک دی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حضرات عوالم کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، عالمِ خلق (عالمِ مادہ) اور عالمِ امر (عالمِ ماورائے مادہ) اور یہ دونوں ہی فرمانِ خدا کے تابع ہیں ارشادِ الٰہی ہے:

"الا لہ الخلق والامر"

آگاہ رہو کہ عالمِ خلق و امر اُسی کی طرف سے ہے۔ (اعراف - ۵۴)

پھر اس بات کی تاکید کے طور پر فرمایا: جو کچھ ہم نے مسیح کے بارے میں تم پر نازل کیا ہے، یہ پروردگار کی طرف سے ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور اس کے بارے میں اپنے اندر کسی قسم کے تردد کو جگہ نہ دینا۔

"الحق من ربک" —— اس جملے کے بارے میں مفسرین نے دو احتمالات پیش کیے ہیں۔

پہلا یہ کہ یہ جملہ مبتداء اور خبر سے مرکب ہے۔ یعنی "الحق" مبتداء ہے اور "من ربک" خبر ہے۔ اس بناء پر اس کا معنی یہ ہوگا: حق ہمیشہ تیرے پروردگار ہی کی طرف سے ہوگا کیونکہ حق کا معنی ہے واقعیت اور واقعیت عین ہستی وجود ہے اور تمام ہستیاں اور وجود اُس کے وجود سے ہیں اور باطل عدم و نیستی ہے جو اس کی ذات سے بیگانہ ہے۔

دوسرا یہ کہ یہ جملہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے جو کہ "ذٰلک الاخبار" ہے۔ یعنی یہ خبریں جو آپ کو بتائی گئی ہیں، سب پروردگار کی طرف سے حقائق ہیں۔

یہ دونوں مفاہیم آیت کے لیے مناسب ہیں۔

۶۱۔ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ

الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ○

ترجمہ

۶۱۔ اس علم و دانش کے بعد جو (عیسٰی کے بارے میں) تمہارے پاس پہنچا ہے۔ پھر بھی کوئی تم سے جھگڑے تو اُسے کہہ دو: آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو بلاتے ہیں۔ تم اپنی عورتوں کو بلاؤ اور ہم اپنے نفسوں کو بلاتے ہیں تم اپنے نفسوں کو بلاؤ۔ پھر مباہلہ کریں گے اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں گے۔

تفسیر

مُباہلہ کیا ہے۔

"مُباھلہ" دراصل "بَہْل" کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے "رہا کرنا" اور کسی کی قید و بند کو ختم کر دینا۔ اسی بناء پر جب کسی جانور کو اُس کے حال پر چھوڑ دیں اور اُس کے پستان کسی تھیلی میں نہ باندھیں تاکہ اُس کا نوزائیدہ بچہ آزادی سے اُس کا دودھ پی سکے تو اُسے "باھل" کہتے ہیں۔ دعا میں "ابتہال" تضرع و زاری اور کام خدا کے سپرد کرنے کے معنی میں آتا ہے۔

کبھی کبھار یہ لفظ ہلاکت، لعنت اور خدا سے دوری کے معنی میں اس لیے استعمال ہوتا ہے کہ بندے کو اُس کے حال پر چھوڑ دینا منفی نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ یہ تو تھا "مُباھلہ" کا مفہوم اصل لغت کے لحاظ سے لیکن اس مروج مفہوم کے لحاظ سے جو اُوپر والی آیت میں مراد لیا گیا ہے یہ دو اشخاص کے درمیان ایک دوسرے پر نفرین کرنے کو کہتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ دو گروہ جو کسی اہم مذہبی مسئلے میں اختلاف رائے رکھتے ہوں، ایک جگہ جمع ہو جائیں، بارگاہِ الٰہی میں تضرع کریں اور اُس سے دعا کریں کہ وہ جھوٹے کو رسوا و ذلیل کرے اور اسے سزا و عذاب دے۔

دعوتِ مُباہلہ

مندرجہ بالا آیت میں خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا ہے کہ ان واضح دلائل کے بعد بھی کوئی شخص تم سے حضرت عیسٰی کے بارے میں گفتگو اور جھگڑا کرے تو

اسے "مُباھلہ" کی دعوت دو اور کہو کہ وہ اپنے بچوں، عورتوں اور نفسوں کو لے آئے اور تم بھی اپنے بچوں عورتوں اور نفسوں کو بلالو پھر دُعا کرو تاکہ خدا جھوٹوں کو رسوا کردے۔

"مُباھلہ" کی یہ صورت شاید قبل ازیں عرب میں مرقح نہ تھی اور یہ ایک ایسا راستہ ہے جو سو فی صد پیغمبر اکرم کے ایمان اور دعوت کی صداقت کا پتہ دیتا ہے۔

کیسے ممکن ہے کہ جو شخص کامل ارتباط کے ساتھ خدا پر ایمان نہ رکھتا ہو وہ ایسے میدان کی طرف آئے اور مخالفین کو دعوت دے کہ آؤ! اکٹھے درگاہ خدا میں چلیں، اس سے درخواست کریں اور دُعا کریں کہ وہ جھوٹے کو رسوا کردے اور پھر یہ بھی کہے کہ تم عنقریب اِس کا نتیجہ دیکھ لوگے کہ خدا کس طرح جھوٹوں کو سزا دیتا ہے اور عذاب کرتا ہے۔

یہ مسلّم ہے کہ ایسے میدان کا رُخ کرنا بہت خطرناک معاملہ ہے کیونکہ اگر دعوت دینے والے کی دُعا قبول نہ ہوئی اور مخالفین کو ملنے والی سزا کا اثر واضح نہ ہوا تو نتیجہ دعوت دینے والے کی رسوائی کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔

کیسے ممکن ہے کہ ایک عقلمند اور سمجھدار انسان نتیجے کے متعلق اطمینان کئے بغیر اس مرحلے میں قدم رکھے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے دعوتِ مُباھلہ اپنے نتائج سے قطع نظر، آپؐ کی دعوت کی صداقت اور ایمان قاطع کی دلیل بھی ہے۔

اسلامی روایات میں ہے کہ "مُباھلہ" کی دعوت دی گئی تو نجران کے عیسائیوں کے نمائندے پیغمبر اکرمؐ کے پاس آئے اور آپؐ سے مُہلت چاہی تاکہ اِس بارے میں سوچ بچار کریں اور اس سلسلے میں اپنے بزرگوں سے مشورہ کریں۔ مشورے کی یہ بات ان کی نفسیاتی حالت کی چغلی کھاتی ہے۔ بہرحال مشورے کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائیوں کے مابین یہ طے پایا کہ اگر محمد شور و غل، مجمع اور داد و فریاد کے ساتھ "مُباھلہ" کے لیے آئیں تو ڈرا نہ جائے اور مباہلہ کرلیا جائے کیونکہ اگر اس طرح آئیں تو پھر حقیقت کچھ بھی نہیں جیسی شور و غل کا سہارا لیا جائے گا اور اگر وہ بہت محدود افراد کے ساتھ آئیں، بہت قریبی خواص اور چھوٹے بچوں کو لے کر وعدہ گاہ میں پہنچیں تو پھر جان لینا چاہیے کہ وہ خدا کے پیغمبر ہیں اور اس صورت میں اُن سے "مباھلہ" کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ اِس صورت میں معاملہ خطرناک ہے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق عیسائی میدانِ مباہلہ میں پہنچے تو اچانک دیکھا کہ پیغمبرؐ اپنے بیٹے حسینؑ کو گود میں لیے حسنؑ کا ہاتھ پکڑے اور علیؑ و فاطمہؑ کو ہمراہ لیے آپہنچے ہیں اور انہیں فرما رہے ہیں کہ جب میں دُعا کروں، تم آمین کہنا۔

عیسائیوں نے یہ کیفیت دیکھی تو انتہائی پریشان ہوئے اور مباہلہ سے رک گئے اور صلح و مصالحت کے لیے تیار ہوگئے اور اہل ذمہ کی حیثیت سے رہنے پر آمادہ ہوگئے۔

"فمن حاجّك فيه من بعد ما جاءك من العلم ...."

گذشتہ آیات میں حضرت مسیح کی الوہیت کی نفی پر استدلال تھا۔ اب اِس آیت میں پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر اِس علم و دانش کے بعد بھی جو تمہارے پاس پہنچا ہے کچھ لوگ تم سے لڑیں جھگڑیں تو انہیں مباہلہ کی دعوت دو اور ان سے کہو

کہ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں تم بھی اپنے بیٹوں کو بلاؤ۔ ہم اپنی عورتوں کو دعوت دیتے ہیں تم بھی اپنی عورتوں کو بلاؤ اور ہم اپنے نفسوں کو بلاتے ہیں تم بھی اپنے نفسوں کو دعوت دو پھر ہم مباہلہ کریں گے اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں گے۔

بغیر کہے یہ بات واضح ہے کہ مباہلہ سے مراد یہ نہیں کہ طرفین جمع ہوں، ایک دوسرے پر لعنت اور نفرین کریں اور پھر منتشر ہو جائیں کیونکہ یہ عمل تو نتیجہ خیز نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ دُعا اور نفرین عملی طور پر اپنا اثر ظاہر کرے اور جو جھوٹا ہو فوراً عذاب میں مبتلا ہو جائے۔

آیت میں مباہلہ کا نتیجہ تو بیان نہیں کیا گیا لیکن چونکہ یہ طریقہ کار منطق و استدلال کے غیر مؤثر ہونے پر اختیار کیا گیا تھا اس لیے یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ مقصود صرف دعا نہ تھی بلکہ اس کا خارجی اثر پیشِ نظر تھا۔

عظمتِ اَھلِ بیتؑ کی ایک زندہ سند

شیعہ اور سُنی مفسرین اور محدثین نے تصریح کی ہے کہ آیۂ مُباھلہ "اَھلِ بیتِ رسُولؐ" کی شان میں نازل ہوئی ہے اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن افراد کو اپنے ہمراہ وعدہ گاہ کی طرف لے گئے تھے وہ صرف اُن کے بیٹے امام حسنؑ اور امام حسینؑ، ان کی بیٹی فاطمہ زہراؑ اور حضرت علیؑ تھے۔ اس بناء پر آیت میں "ابنآئنا" سے مراد صرف امام حسنؑ اور امام حسینؑ ہیں۔ "نسآئنا" سے مراد جناب فاطمہؑ ہیں اور "انفسنا" سے مراد صرف حضرت علیؑ ہیں۔

اس سلسلے میں بہت سی احادیث نقل ہوئی ہیں۔ اہل سنت کے بعض مفسرین نے جو بہت کم تعداد میں ہیں اس سلسلے میں وارد ہونے والی احادیث کا انکار کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً مؤلفِ "المنار" نے اس آیت کے ذیل میں کہا ہے:۔

یہ تمام روایات شیعہ طریقوں سے مروی ہیں۔ ان کا مقصد معین ہے۔ انہوں نے ان احادیث کی نشر و اشاعت اور ترویج کی کوشش کی ہے۔ جس سے بہت سے علماء اہل سنت کو بھی اشتباہ ہو گیا ہے۔

لیکن اہل سُنت کی بنیادی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے تو وہ نشاندہی کرتی ہیں کہ ان میں سے بہت سے طریقوں کا شیعوں یا اُن کی کتابوں سے ہرگز کوئی تعلق نہیں اور اگر اہل سُنت کے طریقوں سے مروی ان احادیث کا انکار کیا جائے تو ان کی باقی احادیث اور کتب بھی درجۂ اعتبار سے گر جائیں گی۔

اس حقیقت کو زیادہ واضح کرنے کے لیے اہل سنت کے طریقوں سے کچھ روایات ہم یہاں پیش کریں گے۔

قاضی نور اللہ شوستری اپنی کتاب نفیس "احقاق الحق" کی جلد سوم طبع جدید صفحہ ۴۶ پر لکھتے ہیں:

"مفسرین اس مسئلے میں متفق ہیں کہ "ابنآئنا" سے اس آیت میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ مراد ہیں، "نسآئنا"

سے " حضرت فاطمہؑ " مراد ہیں اور " انفسنا " میں حضرت علیؑ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے "

اس کے بعد کتاب مذکور کے حاشیے پر تقریباً ساٹھ بزرگان اہل سنت کی فہرست دی گئی ہے جنہوں نے تصریح کی ہے کہ آیت مباہلہ اہل بیت رسولؐ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ ان کے نام اور ان کی کتب کی خصوصیات صفحہ ۴۶ سے لے کر صفحہ ۷۰ تک تفصیل سے بیان کی گئی ہے ان شخصیتوں میں سے یہ زیادہ مشہور ہیں۔

۱۔ مسلم بن حجاج نیشاپوری۔ مؤلف صحیح مسلم جو نامور شخصیت ہیں اور ان کی حدیث کی کتاب اہل سنت کی چھ قابل اعتماد صحاح میں سے ہے ملاحظہ ہو مسلم، ج ۷، ص۱۲۰ طبع مصر زیر اہتمام محمد علی صبیح۔

۲۔ احمد بن حنبل نے اپنی "مسند" میں لکھا ہے ملاحظہ ہو جلد ۱، صفحہ ۱۸۵ طبع مصر۔

۳۔ طبری نے اپنی مشہور تفسیر میں اسی آیت کے ضمن میں لکھا ہے۔ دیکھئے جلد ۳، ص۱۹۲ طبع میمنیہ۔ مصر۔

۴۔ حاکم نے اپنی "مستدرک" میں لکھا ہے، دیکھئے جلد ۳، ص۱۵۰ مطبوعہ حیدرآباد دکن۔

۵۔ حافظ ابو نعیم اصفہانی، کتاب "دلائل النبوۃ" ص۲۹۷، مطبوعہ حیدرآباد دکن۔

۶۔ واحدی نیشاپوری، کتاب "اسباب النزول"، ص۷۴، طبع ہندیہ۔

۷۔ فخر الرازی، نے اپنی مشہور تفسیر کبیر میں لکھا ہے، دیکھئے جلد ۸، ص۸۵، طبع بہیہ، مصر۔

۸۔ ابن اثیر، "جامع الاصول"، جلد ۹، ص۴۷۰، طبع سنۃ المحمدیہ، مصر۔

۹۔ ابن جوزی "تذکرۃ الخواص"، صفحہ ۱۷، طبع نجف۔

۱۰۔ قاضی بیضاوی، نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے، ملاحظہ کریں جلد ۲، ص۲۲، طبع مصطفیٰ محمد، مصر۔

۱۱۔ آلوسی نے تفسیر "روح المعانی" میں لکھا ہے۔ دیکھئے جلد سوم، ص۱۶۷، طبع منیریہ۔ مصر۔

۱۲۔ معروف مفسر طنطاوی نے اپنی تفسیر "الجواہر" میں لکھا ہے۔ جلد ۲، ص۱۲۰، مطبوعہ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر۔

۱۳۔ زمخشری نے تفسیر "کشاف" میں لکھا ہے، دیکھئے جلد ۱، ص۱۹۳، مطبوعہ مصطفیٰ محمد، مصر۔

۱۴۔ حافظ احمد ابن حجر عسقلانی، "الاصابۃ"، جلد ۲، ص۵۰۳، مطبوعہ مصطفیٰ محمد، مصر۔

۱۵۔ ابن صباغ، "فصول المہمۃ"، ص۱۰۸، مطبوعہ نجف۔

۱۶۔ علامہ قرطبی، "الجامع لاحکام القرآن"، جلد ۳، ص۱۰۴، مطبوعہ مصر ۱۹۳۶۔

"غایۃ المرام" میں "صحیح مسلم" کے حوالے سے لکھا ہے۔

ایک روز معاویہ نے سعد بن ابی وقاص سے کہا: تم ابوتراب (علیؑ) کو سب و شتم کیوں نہیں کرتے۔ وہ کہنے لگا۔

جب سے علیؑ کے بارے میں پیغمبرؐ کی کہی ہوئی تین باتیں مجھے یاد آئی ہیں،

میں نے اس کام سے صرف نظر کر لیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ جب آیت مباہلہ نازل ہوئی تو پیغمبر نے صرف فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ اور علیؑ کو دعوت دی۔ اس کے بعد فرمایا " اللّٰھم ھٰؤلاء اھلی " (یعنی — خدایا! یہ میرے نزدیکی اور خواص ہیں)۔

تفسیر "کشاف" کے مؤلف اہل سنت کے بزرگوں میں سے ہیں۔ وہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

" یہ آیت اہل کساء کی فضیلت کو ثابت کرنے کے لیے قوی ترین دلیل ہے "

شیعہ مفسرین، محدثین اور مورخین بھی سب کے سب اس آیت کے "اہل بیت" کی شان میں نازل ہونے پر متفق ہیں چنانچہ "نور الثقلین" میں اس سلسلے میں بہت سی روایات نقل کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب "عیون اخبار الرضا" ہے۔ اس میں ایک مجلس مناظرہ کا حال بیان کیا گیا ہے۔ جو مامون نے اپنے دربار میں منعقد کی تھی۔ اس میں ہے کہ امام علی بن موسیٰ رضاؑ نے فرمایا:

خدا نے اپنے پاک بندوں کو آیت مباہلہ میں مشخص کر دیا ہے اور اپنے پیغمبر کو حکم دیا ہے:

" فمن حاجک فیہ من بعد ما جاءک من العلم فقل .... "

اس آیت کے نزول کے بعد پیغمبر علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کو اپنے ساتھ مباہلہ کے لیے لے گئے اور یہ ایسی خصوصیت اور اعزاز ہے کہ جس میں کوئی شخص اہل بیت پر سبقت حاصل نہیں کر سکا اور یہ ایسی منزلت ہے جہاں تک کوئی شخص بھی نہیں پہنچ سکا اور یہ ایسا شرف ہے جو اس سے پہلے کوئی حاصل نہیں کر سکا۔[1]

تفسیر "برہان"، "بحار الانوار" اور تفسیر "عیاشی" میں بھی اس مضمون کی بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جو تمام اس امر کی حکایت کرتی ہیں کہ مندرجہ بالا آیت "اہل بیت" کے حق میں نازل ہوئی ہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اس مقام پر ایک مشہور اعتراض کیا جاتا ہے۔ یہ اعتراض فخر الدین رازی اور بعض دوسرے لوگوں نے کیا ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ "ابناءنا" (ہمارے بیٹے) سے مراد "حسن و حسین" ہوں جب کہ "ابناءنا" جمع ہے اور (عربی میں) جمع کا لفظ دو کے لیے نہیں ہوتا، اس طرح کیسے ممکن ہے فسانا

---

[1] "نور الثقلین" جلد ۱ صفحہ ۳۴۹، "برہان" جلد ۱ صفحہ ۲۹۰، تفسیر "عیاشی" جلد ۱ صفحہ ۱۷۷، "بحار" طبع جدید جلد ۲۰ صفحہ ۵۲ اور جلد ۹ صفحہ ۱۵۲۔

(ہماری عورتیں) جو جمع کا لفظ ہے صرف شہزادیٔ اسلام فاطمہؑ کے لیے ہو اور یوں ہی "انفسنا" سے صرف علیؑ مراد ہوں ؟ اگر ایسا ہے تو پھر یہاں جمع کا صیغہ کیوں آیا ہے ؟

اس کے جواب میں عرض ہے کہ پہلی بات اسی ضمن میں یہ ہے کہ بہت سی احادیث ، بہت سے مشہور منابع اور معتبر اسلامی کتب میں جو کہ شیعہ سنی سب شامل ہیں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت "اہل بیتؑ" کے حق میں نازل ہوئی ہے اور ان میں تصریح کی گئی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ سوائے علیؑ ، فاطمہؑ ، حسنؑ اور حسینؑ کے کسی کو مباہلہ کے لیے نہیں لے گئے ۔ یہ بات آیت کی تفسیر کے لیے خود ایک واضح قرینہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ منجملہ ان قرائن کے جو آیاتِ قرآن کی تفسیر کرتے ہیں ایک سنت اور قطعی شانِ نزول بھی ہے ۔

اس بنا پر مذکورہ اعتراض کے جواب کی ذمہ داری فقط شیعوں پر نہیں ہے بلکہ تمام علماء اسلام کو اس کا جواب دینا ہوگا ۔

دوسری بات یہ ہے کہ جمع کے صیغے کا مفرد یا تثنیہ پر اطلاق کوئی نئی بات نہیں ۔ قرآن اور قرآن کے علاوہ ادبیاتِ عرب بلکہ ادبیاتِ غیر عرب میں ایسا کثرت سے دکھائی دیتا ہے ۔

اس کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک قانون بیان کرتے وقت یا کوئی عہد نامہ لکھتے وقت حکم کی شکل میں اور جمع کے صیغے کے ساتھ آتا ہے ۔ مثلاً کسی عہد نامہ میں یوں لکھا جاتا ہے :۔

اس کے اجراء کے ذمے دار عہد نامے پر دستخط کرنے والے اور ان کے بیٹے ہوں گے ۔

حالانکہ ممکن ہے کہ طرفین میں سے ایک طرف صرف ایک یا دو بیٹے ہوں اور ایسا ہونا قانون یا عہد نامے کے صیغہ جمع کے منافی نہیں ہے ۔

خلاصہ یہ کہ مرحلے دو ہیں ۔ ایک مرحلۂ قرارداد اور دوسرا مرحلۂ اجراء ، مرحلۂ قرارداد میں بعض اوقات الفاظ جمع کی صورت میں آسکتے ہیں تاکہ وہ تمام مصادیق پر منطبق ہوں لیکن مرحلۂ اجراء میں ممکن ہے مصداق ایک ہی فرد ہو اور ایک فرد کا ہونا مسئلے کے کلی ہونے کی نفی نہیں کرتا ۔

دوسرے لفظوں میں پیغمبر اکرمؐ نصاریٰ سے طے کی گئی قرارداد کے مطابق ذمہ دار تھے کہ اپنے مخصوص خاندان کے تمام فرزند ، عورتیں اور وہ تمام اشخاص جو آپ کی جان کے بمنزلہ تھے انہیں اپنے ساتھ مباہلہ کے لیے لاتے لیکن ان کا مصداق دو بچوں ، ایک خاتون اور ایک مرد کے سوا کوئی نہ تھا (غور کیجئے گا) ۔

آیاتِ قرآن میں ایسے متعدد مواقع ہیں جہاں عبارت میں جمع کا صیغہ آیا ہے لیکن اس کا مصداق کسی جہت سے ایک ہی فرد ہے ۔ مثلاً سورہ آل عمران ، آیہ ۱۷۳ میں ہے :

"الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم "۔

" وہ افراد کہ جنہیں لوگوں نے کہا کہ دشمنوں نے (تم پر حملے کے لیے) اکٹھ کر لیا ہے ، ان سے ڈرو "

مفسرین کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے کہ یہاں "الناس" سے مراد نعیم بن مسعود ہے جس نے ابو سفیان سے کچھ مال لے رکھا تھا تاکہ مسلمانوں کو مشرکین کی طاقت سے ڈرایا جائے۔

اسی طرح سورہ آل عمران آیہ ۱۸۱ میں ہے:-

"لقد سمع اللہ قول الذین قالوآ ان اللہ فقیر ونحن اغنیاء":

"خدا نے ان لوگوں کی بات سن لی جو کہتے تھے، خدا فقیر ہے اور ہم تونگر و بے نیاز ہیں۔ اسی لیے اس نے ہم سے زکوٰۃ کا مطالبہ کیا ہے۔"

مفسرین کی ایک جماعت کی تصریح کے مطابق آیت میں "الذین" سے مراد "حی بن اخطب" یا "فنحاص" ہے۔

ایک اور بات یہ ہے کہ کبھی مفرد کے لیے جمع کا صیغہ اس کی بزرگی کے اظہار کے لیے بھی ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں ہے۔

"ان ابراھیم کان امۃ قانتاً للہ":

ابراہیم بارگاہِ الٰہی میں خضوع کرنے والی اُمت تھے۔ (نحل - ۱۲۰)

بیٹی کی اولاد

آیۂ مباہلہ سے ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیٹی کی اولاد کو بھی "ابن" (بیٹا) کہا جاتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں اس کے برعکس مرسوم تھا کہ صرف بیٹے کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھا جاتا اور کہا جاتا تھا کہ:

بنونا بنوابنائنا وبناتنا

بنوھن ابناء الرجال الاباعد

یعنی ــــ ہماری اولاد تو فقط ہمارے پوتے ہیں۔ رہے ہمارے نواسے تو وہ دوسروں کی اولاد ہیں نہ کہ ہماری۔

بیٹوں اور عورتوں کو انسانی معاشرے کا حقیقی حصہ نہ سمجھنے کی طرز فکر بھی اسی غلط سنت جاہلیت کی پیداوار تھی مثلاً عورتوں کو اپنی اولاد کی نگہداری کے لیے فقط ظرف سمجھتے تھے۔

جیسا کہ ان کے شاعر نے کہا ہے:۔

وانما امهات الناس اوعیة
مستودعات وللانساب آباء

یعنی — لوگوں کی مائیں ان کی پرورش کے لیے ظروف کی حیثیت رکھتی ہیں
اور نسب کے لیے تو صرف باپ ہی پہچانے جاتے ہیں۔

اسلام نے اس طرز فکر کی شدید نفی کی اور اولاد کے احکام پوتوں اور نواسوں پر ایک ہی طرح سے جاری کیے۔
سورہ انعام آیہ ۸۴ اور ۸۵ میں حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کے بارے میں ہے:

"ومن ذریته داؤد وسلیمٰن وایوب و
یوسف وموسٰی وھارون وکذٰلک نجزی
المحسنین وزکریا و یحیی وعیسٰی و
الیاس کل من الصٰلحین"

"اور اولاد ابراہیم میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسٰی
اور ہارون تھے اور اس طرح ہم نیک لوگوں کو جزاء دیتے ہیں۔ نیز
زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ (بھی تھے)، جو سب کے سب صالحین میں سے تھے۔"

اس آیت میں حضرت عیسیٰ کو حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے شمار کیا گیا ہے حالانکہ وہ بیٹی کی اولاد تھے اور جو شیعہ سنی روایات امام حسنؑ و امام حسینؑ کے بارے میں مذکور ہیں ان میں بار "ابن رسول اللّٰہ" (فرزند رسولؐ) کا لفظ ان کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

وہ آیات جن میں ایسی عورتوں کا ذکر ہے جن سے نکاح کرنا حرام ہے ان کے لیے فرمایا گیا ہے:
"وحلائل ابنائکم"

یعنی — تمہارے بیٹوں کی بیویاں۔

فقہائے اسلام کے درمیان یہ مسئلہ مسلّم ہے کہ بیٹوں، پوتوں اور نواسوں کی بیویاں انسان پر حرام ہیں اور وہ سب مندرجہ بالا آیت میں داخل ہیں۔

کیا مباہلہ ایک عمومی حکم ہے

اس میں شک نہیں کہ مندرجہ بالا آیت میں مسلمانوں کو مباہلے کی دعوت نہیں دی گئی بلکہ روئے سخن پیغمبر اسلامؐ کی طرف ہے تاہم یہ بات مخالفین کے مقابلے میں مباہلے کے عمومی حکم سے مانع نہیں۔ یعنی جب دلائل پیش کرنے کے باوجود دشمن مصر ہوں اور ہٹ دھرمی کا ثبوت دیں تو کامل تقویٰ اور خداپرستی کے حامل اہل ایمان انہیں مباہلے

کی دعوت دے سکتے ہیں۔

اسلامی منابع میں اس ضمن میں مذکورہ روایات سے بھی اس حکم کی عمومیت ثابت ہوتی ہے۔ تفسیر نور الثقلین جلد ا صفحہ ۳۵۱ میں امام صادقؑ سے ایک حدیث منقول ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

مخالفین تمہاری حق کی باتیں قبول نہ کریں تو انہیں دعوتِ مباہلہ دو۔

راوی کہتا ہے:

میں نے سوال کیا کہ کیسے مباہلہ کریں۔

فرمایا:

تین دن تک اپنی اخلاقی اصلاح کرو۔

راوی مزید کہتا ہے:

"میرا گماں ہے کہ آپ نے فرمایا روزہ رکھو اور غسل کرو۔ جس سے مباہلہ کرنا چاہتے ہو اسے صحرا میں لے جاؤ۔ پھر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اس کے دائیں ہاتھ میں ڈالو اور اپنی طرف سے ابتداء کرو اور کہو: خداوندا! تو سات آسمانوں اور سات زمینوں کا پروردگار ہے اور پوشیدہ اسرار سے آگاہ ہے اور رحمٰن و رحیم ہے۔ میرے مخالف نے اگر حق کا انکار کیا ہے اور باطل کا دعویٰ کیا ہے تو آسمان سے اس پر بلا و مصیبت نازل فرما اور اسے دردناک عذاب میں مبتلا کر دے: اس دعا کو دہراؤ اور کہو: یہ شخص اگر حق کا انکار کرتا ہے اور باطل کا دعویدار ہے تو آسمان سے اس پر بلا نازل کر دے اور اسے عذاب میں مبتلا کر دے۔

اس کے بعد آپؑ نے فرمایا:

زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ اس دعا کا نتیجہ آشکار ہوگا۔ خدا کی قسم میں نے ہرگز ایسا کوئی شخص نہیں پایا جو تیار ہو کہ اس طرح اس کے ساتھ مباہلہ کیا جائے۔

ضمنی طور پر اس آیت سے اُن لوگوں کو بھی جواب مل جاتا ہے جو بے سوچے سمجھے اسلام کو مردوں کا دین قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں عورتیں کسی شمار میں نہیں ہیں۔ لیکن یہ آیت ثابت کرتی ہے کہ خاص مواقع پر اسلامی مقاصد کی پیش رفت کے لیے عورتیں بھی مردوں کے ساتھ ساتھ دشمن سے مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوتی تھیں۔

بانوئے اسلام جناب فاطمہ زہراؑ، ان کی دختر نیک اختر جناب زینب کبریٰؑ اور ایسی خواتین جو اُن کے نقشِ قدم پر چلیں ان کی زندگی کے درخشاں صفحات اس حقیقت پر گواہ ہیں۔

۶۲۔ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا

اللّٰہُ ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ○

ترجمہ

۶۲۔ یہ (حضرت عیسیٰؑ کی) حقیقی سرگذشت ہے (اور ان کی الوہیت اور خدا کا بیٹا ہونے کی سب باتیں بے بنیاد ہیں) اور خدائے یگانہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور خدا توانا و حکیم ہے۔

تفسیر

"قصص" مفرد ہے اور "قصہ" کے معنی میں ہے۔ دراصل یہ لفظ "قص" کے مادہ سے ہے اور کسی چیز کی جستجو کرنے کے معنی میں لیا گیا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ بن عمران کے واقعہ میں ہے۔

"وقالت لاختہ قصیہ"

حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے ان کی بہن سے کہا: موسیٰؑ کی جستجو میں رہو۔ (القصص: ۱۱)

یہ جو خون کے بدلے کو "قصاص" کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح مقتول کے حق کی جستجو کی جاتی ہے۔

گذشتہ واقعات اور گزرے ہوئے لوگوں کی تاریخ بھی اُن کے حالاتِ زندگی کی جستجو ہے اسی لیے ان کے واقعہ کو "قصہ" کہتے ہیں۔

حضرت مسیحؑ کی زندگی کے حالات بیان کرنے کے بعد مندرجہ بالا آیت میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں ہم نے جو تفصیل تم سے بیان کی ہے وہ ایک واقعیت اور حقیقت ہے جو پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوئی ہے اس لیے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں الوہیت، خدا کا بیٹا یا اس کی بجائے (معاذ اللہ) غیر شرعی بچہ قرار دینے کے سب دعوے بے بنیاد اور بے ہودہ ہیں۔

اس کے بعد تاکید کے طور پر مزید کہا گیا ہے: جو ذات پرستش کے لائق ہے وہ صرف خداوند توانا و حکیم ہے اور خدا کے علاوہ کسی کے لیے اس منصب کا قائل ہونا غیر مناسب اور خلافِ حقیقت ہے۔

۶۳۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌۢ بِالْمُفْسِدِیْنَ ؑ

ترجمہ

۶۳۔ اگر (ان واضح شواہد کے باوجود وہ قبولِ حق سے) روگردانی کرتے ہیں (تو جان لو کہ وہ حقیقت کے متلاشی نہیں اور) خدا فساد کرنے والوں سے آگاہ ہے۔

تفسیر

آیت کہتی ہے کہ مسیحؑ کے بارے میں قرآن کے منطقی دلائل کے باوجود اور دعوتِ مباہلہ کے بعد بھی اگر وہ حق کو تسلیم نہیں کرتے اور اپنی ہٹ دھرمی جاری رکھتے ہیں تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ طالبِ حق نہیں بلکہ ناروا تعصبات، سرکشی، ہوا و ہوس اور اندھی تقلید میں گرفتار ہیں اور ان کا کام بہرصورت معاشرے میں فساد پیدا کرنا ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ جو گروہ حق کے واضح ہو جانے کے باوجود اپنی ڈھٹائی ترک نہیں کرتا وہ حق کا متلاشی نہیں ہو سکتا بلکہ وہ طالبِ فساد ہے اور اس کا مقصد لوگوں کے صحیح عقائد کی بنیادوں کو کھوکھلا اور خراب کرنا ہے۔

۶۴۔ قُلْ يَآ أَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○

ترجمہ

۶۴۔ کہیے: اے اہلِ کتاب! آؤ ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ سوائے خدائے یگانہ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی چیز کو اُس کا شریک قرار نہ دیں اور ہم میں سے بعض خدا کو چھوڑ کر بعض دوسروں کو خدا کے طور پر قبول نہ کریں۔ جب (وہ اس دعوت سے) روگردانی کریں تو کہیے: گواہ رہو کہ ہم تو مسلمان ہیں۔

تفسیر

قرآن نے سب سے پہلے عیسائیوں کو گذشتہ آیات کے ضمن میں منطقی استدلال پیش کیا اور ان کی مخالفت کے کے بعد دعوتِ مباہلہ دی۔ جب اس دعوت نے اُن پر کافی نفسیاتی اثر ڈالا تو چونکہ وہ مباہلے کے لیے تیار نہ ہوئے اور شرائط ذمہ قبول کرلیں تو اُن کی اس روحانی آمادگی سے استفادہ کرتے ہوئے پھر سے استدلال شروع کیا لیکن یہ استدلال پہلے سے بہت مختلف ہے۔ گذشتہ آیات میں اسلام کی دعوت اس کی تمام تر خصوصیات کے ساتھ تھی لیکن اس آیت میں اسلام اور اہل کتاب کے مشترک نقاط کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ حقیقت میں اس طرز استدلال سے قرآن ہمیں سکھاتا ہے کہ اگر کچھ لوگ اس بات پر تیار نہیں کہ تمہارے تمام مقدس اہداف و مقاصد میں تمہارا ساتھ دیں تو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھ جاؤ اور کوشش کرو کہ کم از کم جس قدر تمہارے ساتھ وہ اشتراکِ ہدف رکھتے ہیں اتنا ہی ان کی ہمکاری حاصل کر لو اور اسے اپنے مقدس اہداف و مقاصد کی پیش رفت کے لیے بنیاد قرار دو۔

مندرجہ بالا آیت اہل کتاب کے لیے وحدت و اتحاد کی پکار ہے اور انہیں کہتی ہے کہ تم دعویٰ کرتے ہو بلکہ اعتقاد رکھتے ہو کہ مسئلہ "تثلیث"[1] "توحید" کے عقیدے کے منافی نہیں اس لیے تثلیث میں وحدت کے قائل ہو اور اس طرح یہودی شرک آلود باتوں کے باوجود اور عزیر کو خدا کا بیٹا جاننے کے باوجود توحید کے مدعی ہیں یوں تم سب کے سب اصل میں اپنی "توحید" کو مشترک سمجھتے ہو اس لیے آؤ ہم ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اس مشترک بنیاد کو مستحکم کریں اور ایسی غیر مناسب تفسیروں سے اجتناب کریں جن کا نتیجہ شرک ہو اور توحید خالص سے دوری ہو۔

"ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ"

آیت کی ابتداء میں دو مرتبہ مسئلہ توحید کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ایک "الا نعبد الا اللہ" (یعنی — آؤ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں) اور دوسرا "لا نشرک بہ شیئا" (یعنی — کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیں) اب زیر نظر جملے میں تیسری دفعہ اس اصل کا تذکرہ ہے لیکن زیادہ صراحت سے اور ذمہ داری کے حقیقی نقطے پر انگلی رکھ کر، کیونکہ جملے کا مفہوم یہ ہے کہ ہم میں سے بعض کو نہیں چاہیے کہ بعض دوسروں کو اپنا معبود اور پروردگار قرار دے لیں۔

ممکن ہے یہ تعبیر ان دو مطالب میں سے ایک کی طرف اشارہ ہو:

پہلا یہ کہ حضرت عیسیٰؑ جو انسان اور ہمارے ہمنوع ہیں انہیں الوہیت کے عنوان سے نہیں پہچانا جانا چاہیے۔

دوسرا یہ کہ منحرف اور کج رو علماء جو اپنے مقام سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور خدا کے حلال و حرام کو اپنی مرضی سے بدلتے ہیں اُنہیں سند نہیں سمجھنا چاہیے اور نہ ان کی پیروی کرنا چاہیے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ علماءِ اہل کتاب میں ایک ایسا گروہ بھی تھا جو احکامِ خدا کی اپنے منافع اور تعصبات کے مطابق تحریف کرتا تھا۔ منطقِ اسلام کی نظر سے جو شخص ایسے افراد کی جان بوجھ کر بلا مشروط پیروی کرے اُس نے ایک قسم کی عبودیت اور ان کی پرستش کی ہے۔

اس کے لیے روشن دلیل موجود ہے کیونکہ قانون بنانا اور حلال و حرام کی تشریع خدا سے مربوط ہے جو شخص کسی اور کو اس سلسلے

---

[1] تین خداؤں کا عقیدہ

میں صاحب اختیار سمجھ اس نے اُسے خدا کا شریک قرار دیا۔
مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ:

"عدی بن حاتم پہلے عیسائی تھا۔ پھر اسلام لے آیا۔ اس آیت کے نزول کے بعد اس نے لفظ "ارباب" سے یہ سمجھا کہ قرآن کہتا ہے کہ اہل کتاب اپنے بعض علماء کی پرستش کرتے ہیں۔ لہٰذا اُس نے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ گذشتہ زمانے میں ہم کبھی اپنے علماء کی عبادت نہیں کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تم لوگ جانتے تھے کہ وہ اپنی مرضی سے احکام خدا میں تغیر و تبدل کرتے ہیں اور پھر بھی تم ان کی پیروی کرتے تھے۔ عدی نے کہا: جی ہاں۔
پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: یہی پرستش و عبادت ہے۔[1]

درحقیقت اسلام غلامی اور فکری استعمار کو ایک قسم کی عبودیت و پرستش سمجھتا ہے اور اسلام نے جس شدت سے شرک اور بت پرستی کا مقابلہ کیا ہے اسی شدت سے فکری استعمار سے بھی جنگ کی ہے کیونکہ یہ بھی بت پرستی کی مانند ہے۔

توجہ رہے کہ "ارباب" جمع کا صیغہ ہے اس بناء پر اس آیت سے صرف حضرت عیسیٰؑ کی پرستش کی نفی نہیں ہوتی۔ لیکن ممکن ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰؑ کی عبودیت سے بھی نہی ہو اور منحرف و کجرو علماء کی عبودیت سے بھی۔

"فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون."

اگر وہ لوگ توحید کے مشترک نقطے کی طرف منطقی دعوت کے بعد بھی منہ پھیر لیں تو انہیں کہا جانا چاہیے کہ گواہ رہنا کہ ہم تو حق کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں اور تم نہیں کرتے۔ دوسرے لفظوں میں جان لو کہ کون لوگ حق کے متلاشی ہیں اور کون متعصب اور ہٹ دھرم۔

اس وقت انہیں "اشھدوا بانا مسلمون" (یعنی گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں) کے جملے سے خطرے کا الارم دو کہ حق سے تمہاری روگردانی اور دوری ہم پر کچھ بھی اثر نہیں رکھتی اور ہم اس طرح اپنے اسلام کے راستے پر چلتے رہیں گے، صرف خدا کی عبادت کریں گے، صرف اس کے قوانین قبول کریں گے (اور پختگی سے نبھائیں گے) اور ہمارے درمیان کسی بشر کی پرستش کا کسی شکل و صورت میں وجود نہیں ہوگا۔

پیغمبر اکرمؐ کے خطوط دنیا کے بادشاہوں کے نام

تاریخ اسلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سرزمین حجاز میں اسلام کافی نفوذ کر چکا تو پیغمبر اکرمؐ نے اس زمانے کے بڑے بڑے حکمرانوں کے نام کئی ایک خطوط روانہ کیے۔ ان میں بعض خطوط میں مندرجہ بالا آیت کا سہارا لیا گیا ہے، جس میں آسمانی ادیان کی قدر مشترک کا تذکرہ ہے۔

ان میں سے بعض اہم خطوط کا ذکر کیا جاتا ہے۔

---

[1] "مجمع البیان" اور کی آیت کے بارے میں۔ تفسیر "نور الثقلین" جلد اول، صفحہ ۳۵۲

۱۔ مقوقس[1] کے نام خط

"بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔

من ـــــ محمد بن عبد اللہ

الی ـــــ المقوقس عظیم القبط ،

سلام علی من اتبع الھدی ،

اما بعد: فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام ،
اسلم تسلم ، یؤتک اللہ اجرک مرتین فان
تولیت فانما علیک اثم القبط ـــــ یا اھل
الکتٰب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم
ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا
یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ فان
تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون ۔"

اللہ کے نام سے جو بخشنے والا بڑا مہربان ہے

از ـــــ محمد بن عبد اللہ

بطرف ـــــ قبطیوں کے مقوقس بزرگ

حق کے پیروکاروں پر سلام ہو ۔

میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں ۔ اسلام لے آؤ تاکہ سالم رہو ۔ خدا تجھے دوگنا اجر دے گا (ایک خود تمہارے ایمان لانے پر اور دوسرا ان لوگوں کی وجہ سے جو تمہاری پیروی کرکے ایمان لائیں گے) اور اگر تو نے قانون اسلام سے روگردانی کی تو قبطیوں[2] کے گناہ تیرے ذمہ ہوں گے ـــــ اے اہل کتاب! ہم تمہیں ایک مشترک بنیاد کی طرف دعوت دیتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم خدائے یگانہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیں اور ہم میں سے بعض دوسرے بعض کو خدا کے طور پر قبول نہ کریں اور جب وہ دین حق سے روگردانی کریں تو ان سے کہو کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں ۔

(مکاتیب الرسول ، ج ۱ ، ص[illegible])

---

[1] "مقوقس" (بروزن مفوض ۔ بضم میم و بفتح بردو قاف) ۔ "ھرقل" بادشاہ روم کی طرف سے مصر کا والی ۔

[2] قبطی قوم مصر میں آباد تھی ۔

جب مقوقس مصر کا حاکم تھا پیغمبر اسلامؐ نے دُنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں اور حکام کو خطوط لکھے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دی ۔ حاطب بن ابی بلتعہ کو آپؐ نے حاکم مصر مقوقس کی طرف یہ خط دے کر روانہ کیا ۔

پیغمبرؐ کا سفیر مصر کی طرف روانہ ہوا ۔ اُسے اطلاع ملی کہ حاکم مصر اسکندریہ میں ہے لہٰذا وہ اِس وقت کے ذرائع آمد و رفت کے ذریعے اسکندریہ پہنچا اور مقوقس کے محل میں گیا ۔ حضرتؐ کا خط اسے دیا ۔ مقوقس نے خط کھول کر پڑھا کچھ دیر تک سوچتا رہا ۔ پھر کہنے لگا :

" اگر واقعاً محمدؐ خدا کا بھیجا ہوا ہے تو اُس کے مخالفین اسے اس کی پیدائش کی جگہ سے باہر نکالنے میں کیوں کامیاب ہوئے اور وہ مجبور ہوا کہ مدینہ میں سکونت اختیار کرے ؟ اُن پر نفرین اور بددُعا کیوں نہیں کی تاکہ وہ نابود ہو جاتے ؟ "

پیغمبرؐ کے قاصد نے جواباً کہا :

" حضرت عیسیٰؑ خدا کے رسول تھے اور آپ بھی ان کی حقانیت کی گواہی دیتے ہیں ۔ بنی اسرائیل نے جب ان کے قتل کی سازش کی تو آپؑ نے ان پر نفرین اور بد دعا کیوں نہیں کی تاکہ خدا انہیں ہلاک کر دیتا ؟

یہ منطق سُن کر مقوقس تحسین کرنے لگا اور کہنے لگا :

" احسنت انت حکیم من عند حکیم "

" آفرین ہے ، تم سمجھدار آدمی ہو اور ایک صاحب حکمت کی طرف سے آئے ہو "

حاطب نے پھر گفتگو شروع کی اور کہا :

" آپ سے پہلے ایک شخص (یعنی فرعون) اس ملک پر حکومت کرتا تھا ۔ وہ مدتوں لوگوں میں اپنی خدائی کا سودا بیچتا رہا ۔ بالآخر اللہ نے اُسے نابود کر دیا تاکہ اس کی زندگی آپ کے لیے باعثِ عبرت ہو لیکن آپ کوشش کریں کہ آپ کی زندگی دوسروں کے لیے نمونۂ عبرت نہ بن جائے ۔ "

" پیغمبر اسلامؐ نے ہمیں ایک پاکیزہ دین کی طرف دعوت دی ہے ۔ قریش نے ان سے بہت سخت جنگ کی اور ان کے مقابل صف آراء ہوئے ، یہودی بھی کینہ پروری سے ان کے مقابلے میں آکھڑے ہوئے اور اسلام سے زیادہ نزدیک عیسائی ہیں ۔ "

" مجھے اپنی جان کی قسم جیسے حضرت موسیٰؑ نے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کی بشارت دی تھی اِس طرح حضرت عیسیٰؑ حضرت محمدؐ کے مبشر تھے ۔ ہم آپ کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں جیسے آپ لوگوں نے تورات کے ماننے والوں کو انجیل کی دعوت دی تھی ۔ جو قوم پیغمبر حق کی دعوت کو سُنے اُسے چاہیے کہ اس کی پیروی کرے ۔ میں

نے محمدؐ کی دعوت آپ کی سرزمین تک پہنچا دی ہے۔ مناسب یہی ہے کہ آپ اور مصری قوم یہ دعوت قبول کرے۔"

حاطب کچھ عرصہ اسکندریہ ہی میں ٹھہرا تاکہ رسول اللہؐ کے خط کا جواب حاصل کرے۔ چند روز گزر گئے۔ ایک دن مقوقس نے حاطب کو اپنے محل میں بلایا اور خواہش کی کہ اُسے اسلام کے بارے میں کچھ مزید بتلایا جائے۔

حاطب نے کہا:

"محمدؐ ہمیں خدائے یکتا کی پرستش کی دعوت دیتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ لوگ روز و شب میں پانچ مرتبہ اپنے پروردگار سے قریبی رابطہ پیدا کریں اور نماز پڑھیں، سال میں ایک ماہ روزے رکھیں، خانۂ خدا (مرکز توحید) کی زیارت کریں، اپنے عہد و پیمان پورے کریں، خون اور مردار کھانے سے اجتناب کریں۔"

علاوہ ازیں حاطب نے پیغمبر اسلامؐ کی زندگی کی بعض خصوصیات بھی بیان کیں۔

مقوقس کہنے لگا:

"یہ تو بڑی اچھی نشانیاں ہیں۔ میرا خیال تھا کہ خاتم النبیینؐ سرزمین شام سے ظہور کریں گے جو انبیاء کی سرزمین ہے۔ اب مجھ پر واضح ہوا کہ وہ سرزمین حجاز سے مبعوث ہوئے ہیں۔"

اس کے بعد اُس نے اپنے کاتب کو حکم دیا کہ وہ عربی زبان میں اس مضمون کا خط تحریر کرے:

محمدؐ بن عبداللہ کی طرف

قبطیوں کے بزرگ مقوقس کی جانب سے

"آپ پر سلام ہو۔ میں نے آپ کا خط پڑھا، آپ کے مقصد سے باخبر ہوا اور آپ کی دعوت کی حقیقت کو سمجھ لیا۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ ایک پیغمبر ظہور کرے گا لیکن میرا خیال تھا کہ وہ خطۂ شام سے مبعوث ہوگا۔ میں آپ کے قاصد کا احترام کرتا ہوں۔"

پھر خط میں ان ہدیوں اور تحفوں کی طرف اشارہ کیا جو اُس نے آپؐ کی خدمت میں بھیجے۔ خط اُس نے ان الفاظ پر تمام کیا۔

"آپ پر سلام ہو" [1]

تاریخ میں ہے کہ مقوقس نے کوئی گیارہ قسم کے ہدیے پیغمبر اکرمؐ کے لیے بھیجے۔ تاریخ اسلام میں ان کی تفصیلات موجود ہیں۔ ان میں سے ایک طبیب بھی تھا تاکہ وہ بیمار ہونے والے مسلمانوں کا علاج کرے۔ نبی اکرمؐ نے دیگر ہدیے تو قبول فرما لیے لیکن طبیب کو قبول نہ کیا اور فرمایا:

"ہم ایسے لوگ ہیں کہ جب تک بھوک نہ لگے کھانا نہیں کھاتے اور سیر ہونے سے

---

[1] مکاتیب الرسول، ص ...

پہلے کھانے سے ہاتھ روک لیتے ہیں ۔ یہی چیز ہماری صحت و سلامتی کے لیے کافی ہے۔
شاید صحت کے اس عظیم اصول کے علاوہ پیغمبر اسلامؐ اس طبیب کی وہاں موجودگی کو درست نہ سمجھتے ہوں کیونکہ وہ ایک متعصب عیسائی تھا لہٰذا آپؐ نہیں چاہتے تھے کہ اپنی اور مسلمانوں کی جان کا معاملہ اُس کے سپرد کر دیں ۔
مقوقس نے جو سفیر پیغمبرؐ کا احترام کیا، آپؐ کے لیے ہدیے بھیجے اور خط میں نام محمدؐ اپنے نام سے مقدم رکھا یہ سب اس بات کی حکایت کرتے ہیں کہ اس نے آپؐ کی دعوت کو باطن میں قبول کر لیا تھا یا کم از کم اسلام کی طرف مائل ہو گیا تھا لیکن اس بناء پر کہ اس کی حیثیت اور وقعت کو نقصان نہ پہنچے ظاہری طور پر اس نے اسلام کی طرف اپنی رغبت کا اظہار نہ کیا۔

۲۔ قیصرِ روم کے نام خط

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔

من ـــــ محمد بن عبد اللہ

الی ـــــ ھرقل عظیم الروم

سلامٌ علی من اتبع الھدیٰ ـــ اما بعد ؛

فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام اسلم تسلم،

یؤتک اللہ اجرک مرتین فان تولیت فانما

علیک اثم الاریسین ـــ "یآ اھل الکتٰب تعالوا

الیٰ کلمۃٍ سوآءٍ بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا

نشرک بہٖ شیئًا ولا یتخذ بعضنا بعضًا اربابًا

من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا

بانا مسلمون"

خدائے رحمٰن و رحیم کے نام سے

از ـــــ محمد بن عبد اللہ

بطرف ـــــ ہرقل بادشاہ روم

"اُس پر سلام ہے جو ہدایت کی پیروی کرے ۔۔۔۔۔ میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں ۔ اسلام لے آؤ تاکہ امان میں رہو ۔ خُدا تجھے دوگنا اجر دے گا (ایک تیرے ایمان لانے کا اور دوسرا ان لوگوں کا جو تیری وجہ سے ایمان لائیں گے) اور اگر تو نے روگردانی کی تو اریسیوں[1] کا گناہ بھی تیری گردن پر ہوگا ۔۔۔۔ اے اہل کتاب ہم تمہیں مشترک بنیاد کی طرف دعوت دیتے ہیں ۔۔۔۔ کہ غیر خدا کی عبادت نہ کرو اور کسی کو اس کا شریک قرار نہ دو ۔ ہم میں سے بعض دوسرے بعض کو خدا کے طور پر قبول نہ کریں اور اگر وہ دین حق سے سرتابی کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں ۔"

قیصر کے پاس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام پہنچانے کے لیے دحیہ کلبی مامور ہوا ۔ سفیر پیغمبرؐ عازم روم ہوا ۔ قیصر کے دارالحکومت قسطنطنیہ پہنچنے سے پہلے اسے معلوم ہوا کہ قیصر بیت المقدس کی زیارت کے ارادے سے قسطنطنیہ چھوڑ چکا ہے لہٰذا اُس نے بصری کے گورنر حارث بن ابی شمر سے رابطہ پیدا کیا اور اسے اپنا مقصد سفر بتایا ۔ ظاہراً پیغمبر اکرمؐ نے بھی اجازت دے رکھی تھی کہ دحیہ وہ خط حاکم بصری کو دے دے تاکہ وہ اُسے قیصر تک پہنچا دے ۔ سفیر پیغمبرؐ نے گورنر سے رابطہ کیا تو اُس نے عدی بن حاتم کو بلایا اور اُسے حکم دیا کہ وہ دحیہ کے ساتھ بیت المقدس کی طرف جائے اور خط قیصر تک پہنچا دے ۔ حمص میں سفیر کی قیصر سے ملاقات ہوئی لیکن ملاقات سے قبل شاہی دربار کے کارکنوں نے کہا:

"تمہیں قیصر کے سامنے سجدہ کرنا پڑے گا ورنہ وہ تمہاری پرواہ نہیں کرے گا"

دحیہ ایک سمجھدار آدمی تھا ، کہنے لگا :

"میں ان غیر مناسب بدعتوں کو ختم کرنے کے لیے اتنا سفر کر کے آیا ہوں ۔ میں اس مراسلے کے بھیجنے والے کی طرف سے آیا ہوں تاکہ قیصر کو یہ پیغام دوں کہ بشر پرستی کو ختم ہونا چاہیئے اور خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہیں ہونی چاہیئے ۔ اس عقیدے کے باوصف کیسے ممکن ہے کہ میں غیر خدا کے لیے سجدہ کروں ۔"

پیغمبرؐ کے قاصد کی قوی منطق سے وہ بہت حیران ہوئے ۔ درباریوں میں سے ایک نے کہا:

"تمہیں چاہیئے کہ خط بادشاہ کی مخصوص میز پر رکھ کر چلے جاؤ ۔ اس میز پر رکھے ہوئے خط کو قیصر کے علاوہ کوئی نہیں اُٹھا سکتا ۔"

دحیہ نے اس کا شکریہ ادا کیا ، خط میز پر رکھا اور خود واپس چلا گیا ۔ قیصر نے خط کھولا ۔ خط نے جو بسم اللہ سے شروع ہوتا تھا اسے متوجہ کیا اور کہنے لگا ۔

"حضرت سلیمانؑ کے خط کے سوا آج تک میں نے ایسا خط نہیں دیکھا"

اُس نے اپنے مترجم کو بلایا تاکہ وہ خط پڑھے اور اس کا ترجمہ کرے ۔ بادشاہ روم کو خیال ہوا کہ ہو سکتا ہے خط لکھنے والا وہی نبی ہو جس کا وعدہ انجیل اور تورات میں کیا گیا ہے ۔ وہ اس جستجو میں لگ گیا کہ آپؐ کی زندگی کی خصوصیات

معلوم کرے۔ اس نے حکم دیا کہ شام کے پورے علاقے میں چھان بین کی جائے۔ شاید محمد کے رشتہ داروں میں سے کوئی شخص مل جائے جو ان کے حالات سے واقف ہو۔ اتفاق سے ابوسفیان اور قریش کا ایک گروہ تجارت کے لیے شام آیا ہوا تھا شام اس وقت سلطنت روم کا مشرقی حصہ تھا۔ قیصر کے آدمیوں نے ان سے رابطہ قائم کیا اور انہیں بیت المقدس لے گئے۔ قیصر نے اُن سے سوال کیا:

کیا تم میں سے کوئی محمّد کا نزدیکی رشتہ دار ہے؟

ابوسفیان نے کہا:

میں اور محمّد ایک ہی خاندان سے ہیں اور ہم چوتھی پشت میں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔

پھر قیصر نے اُس سے کچھ سوالات کئے۔ دونوں میں یوں گفتگو ہوئی:

قیصر: اس کے بزرگوں میں سے کوئی حکمران ہوا ہے؟

ابوسفیان: نہیں

قیصر: کیا نبوت کے دعویٰ سے پہلے وہ جھوٹ بولنے سے اجتناب کرتا تھا؟

ابوسفیان: ہاں محمّد راست گو اور سچا انسان ہے۔

قیصر: کونسا طبقہ اس کا مخالف ہے اور کونسا موافق؟

ابوسفیان: اشراف اُس کے مخالف ہیں، عام اور متوسط درجے کے لوگ اُسے چاہتے ہیں۔

قیصر: اس کے پیروکاروں میں سے کوئی اس کے دین سے پھرا بھی ہے؟

ابوسفیان: نہیں

قیصر: کیا اُس کے پیروکار روز بروز بڑھ رہے ہیں؟

ابوسفیان: ہاں

اس کے بعد قیصر نے ابوسفیان اور اُس کے ساتھیوں سے کہا:

"اگر یہ باتیں سچی ہیں تو پھر یقیناً وہ پیغمبر موعود ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسے پیغمبر کا ظہور ہوگا لیکن مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ وہ قریش میں سے ہوگا۔ میں تیار ہوں کہ اس کے لیے خضوع کروں اور احترام کے طور پر اُس کے پاؤں دھوؤں[1] میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ اس کا دین اور حکومت سرزمین روم پر غالب آئے گی۔"

پھر قیصر نے دحیہ کو بلایا اور اس سے احترام سے پیش آیا۔ پیغمبر اکرمؐ کے خط کا جواب لکھا اور آپؐ کے لیے دحیہ کے ذریعے ہدیہ بھیجا اور آپؐ کے نام اپنے خط میں آپ سے اپنی عقیدت اور تعلق کا اظہار کیا۔[2]

---

[1] یہ احترام کے اظہار کا ایک طریقہ تھا جو ان دنوں مروج تھا۔ [2] مکاتیب الرسول، ۱۴۰، صفحہ

۶۵۔ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ مَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

۶۶۔ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○

۶۷۔ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○

۶۸۔ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

ترجمہ

۶۵۔ اے اہل کتاب! (حضرت) ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو (اور تم میں سے ہر ایک انہیں اپنے دین کا پیروکار سمجھتا ہے) حالانکہ تورات اور انجیل تو ان کے بعد نازل ہوئی ہیں، کیا تم عقل وفکر نہیں رکھتے۔

۶۶۔ تم تو وہی ہو جو اس چیز کے بارے میں گفتگو کرتے تھے جس کے بارے میں آگاہ ہوتے تھے اب ان چیزوں کے بارے میں گفت گو کیوں کرتے ہو جن سے آگاہ نہیں ہو، خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

۶۷۔ ابراہیم یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ وہ مخلص موحد اور مسلمان شخص تھے اور وہ ہرگز مشرکین میں

سے نہیں تھے ۔

۶۸۔ ابراہیم سے اولیت (اور زیادہ نسبت) رکھنے والے وہ لوگ ہیں جو ان کی پیروی کرتے ہیں (اور ان کے دور میں ان کے مکتب کے وفادار تھے اور اس طرح) یہ پیغمبر اور وہ لوگ جو (اس پر) ایمان لائے ہیں اور خدا مومنین کا ولی اور سرپرست ہے ۔

تفسیر

"یٰاھل الکتٰب لم تحاجون فی ابرٰھیم ...."

تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہودی ظہور اسلام کے وقت ہی سے اس دین سے خاص دشمنی اور عداوت رکھتے تھے ۔ اسلام کے نفوذ، پھیلاؤ اور اس جدید دین کے ذریعے دینِ مسیح کے منسوخ ہو جانے سے عیسائیوں کا ایک گروہ بھی اُس کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا ۔ یہ لوگ کبھی کبھی بحث مباحثے، حجت بازی اور جھگڑے کے لیے اپنے وفادار افراد کو نبی اکرمؐ کے پاس بھیجتے تھے اور وہ اس طرح اپنے دین کو بہتر ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔

اِن امور میں سے ایک یہ تھا کہ وہ سب کے سب کوشش کرتے کہ خدا کے عظیم پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کو اپنے میں سے ثابت کریں کیونکہ حضرت ابراہیمؑ تمام مذاہب کے پیروکاروں میں معظم و محترم سمجھے جاتے تھے ۔ یہودی مدعی تھے کہ وہ اُن میں سے ہیں اور اُن کے دین کے پیرو ہیں ۔ یہی دعویٰ عیسائی بھی کرتے تھے ۔

مندرجہ بالا آیت میں قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ اصولی طور پر خدا کے مبارز و مجاہد پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں تمہارا جھگڑا اور گفتگو ہی بیکار ہے کیونکہ وہ تو سالہا سال حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے پہلے ہو گزرے ہیں اور تورات و انجیل ان کے کئی سال بعد نازل ہوئیں ۔

("وما انزلت التوریٰۃ والانجیل الا من بعدہٖ")

کیا یہ چیز معقول ہے کہ گذشتہ پیغمبر اپنے سے بعد والے دین کا پیروکار ہو افلا تعقلون کیا تم تفکر و تعقل نہیں کرتے ۔

"ھآ انتم ھٰؤلاء حاججتم فیما لکم بہٖ علم فلم تحاجون فیما لیس لکم بہٖ علم"

یہاں خدا تعالیٰ انہیں سرزنش کرتا ہے کہ اپنے مذہب سے مربوط مسائل جن کا تمہیں علم تھا ان کے بارے میں تم نے گفتگو اور بحث کی ہے (اور تم نے دیکھ لیا جن مباحث کے بارے میں تمہارے خیال میں تمہیں علم تھا ان میں

بھی تم کیسے کیسے بڑے اشتباہات میں مبتلا اور حقیقت سے دور تھے اور واقع میں تمہارا علم جہل مرکب تھا۔ اس کے باوجود جس چیز کی تمہیں خبر نہیں اُس کے بارے میں بحث مباحثہ کرتے ہو اور نتیجے کے طور پر تم ایسا دعویٰ کرتے ہو جو کسی تاریخ کے مطابق درست نہیں۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں گذشتہ مطالب کی تاکید کے لیے اور بعد والی آیت کی بحث کی طرف متوجہ کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے "واللّٰہ یعلم وانتم لا تعلمون"۔

"ما کان ابرٰھیم یھودیًا ولا نصرانیًا ...."

یہاں صراحت سے ان کے دعووں کا جواب دیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے: ابراہیم یہودی تھے نہ عیسائی بلکہ پاک اور خالص موحد تھے اور خدا کے حضور سرِ تسلیم خم کیے ہوئے تھے اور کبھی تمہاری طرح شریکِ خدا کے قائل نہیں ہوئے تھے۔

توجہ رہے کہ لفظ "حنیف" مادہ "حنف" (بروزن "انف") سے ہے اور ایسے شخص یا چیز کے معنی میں بولا جاتا ہے جو کسی طرف مائل ہو اور قرآن کی زبان میں ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو اپنے زمانے کے باطل دین سے منہ موڑ کر دینِ حق کی طرف مائل ہو۔

مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی "حنیف" کے لقب سے توصیف کی ہے کیونکہ انہوں نے تقلید اور تعصب کے پردے چاک کر دیئے تھے آپ ایسے ماحول اور زمانے میں ہرگز بتوں کے سامنے نہیں جھکے جو بت پرستی میں غرق تھا لیکن زمانہ جاہلیت کے بُت پرست عرب بھی اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کے دین "حنیف" پر سمجھتے تھے اور یہ بات اتنی مشہور تھی کہ اہل کتاب انہیں "حنفاء" کہتے تھے یوں لفظ "حنیف" کا بالکل متضاد معنی پیدا ہو گیا تھا اور ان کی نظر میں یہ لفظ بُت پرستی کا مترادف اور ہم معنی ہو چکا تھا لہٰذا خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ کی "حنیف" کے عنوان سے توصیف کرنے کے بعد "مسلمًا" اور "وما کان من المشرکین" کہہ کر ہر قسم کے دوسرے احتمال کی نفی کر دی۔

حضرت ابراہیمؑ کس طرح مسلمان تھے

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو دینِ موسیٰؑ و عیسیٰؑ کا پیروکار نہیں کہا جا سکتا تو بطریق اولیٰ انہیں مسلمان بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ تو ان ادیان سے پہلے تھے، پھر قرآن ان کا تعارف "مسلم" کے طور پر کیوں کروا رہا ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن کی اصطلاح میں "مسلم" صرف پیغمبر اسلامؐ کے پیروکاروں کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اسلام کا ایک وسیع معنی ہے اور خدا کے حضور تسلیم مطلق، توحید کامل، نیز ہر قسم کے شرک اور دوگانہ پرستی سے پاک کے معنی میں ہے اور اسی کے حضرت ابراہیمؑ علمبردار تھے۔

مکتب و ہدف کا رشتہ

"ان اولی الناس بابرٰھیم للذین

اتبعوه ......"

خدا کے عظیم پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں اہل کتاب کی باتوں کے خاتمے کے لیے قرآن نے یہاں ایک بنیادی بات کی ہے۔ نیز ان میں سے ہر ایک انہیں اپنے میں سے سمجھتا تھا اور شاید زیادہ تر اس عظیم پیغمبر سے قرابت کے مسئلہ کا سہارا لیتے تھے یا نسب و قومیت کو ان سے قربت کی دلیل سمجھتے تھے اس لیے قرآن نے وضاحت کی ہے کہ انبیاء سے دوستی اور ارتباط صرف ایمان اور ان کی پیروی کے ذریعہ ہوتا ہے، اس بنا پر ابراہیمؑ سے زیادہ نزدیک وہی لوگ ہیں جو ان کے مکتب کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے اہداف و مقاصد کے زیادہ وفادار ہیں چاہے وہ لوگ جو ان کے زمانے میں موجود تھے "للذین اتبعوه" اور چاہے وہ لوگ جو ان کے بعد ان کے مکتب اور پروگرام کے وفادار رہے۔ مثلاً پیغمبرؐ اسلام اور آپ کے پیروکار۔ اس کی دلیل بھی واضح ہے اور وہ یہ کہ انبیاء کا احترام ان کے مکتب و مذہب کی وجہ سے تھا نہ کہ ان کی قوم، قبیلے اور نسب کے سبب۔ لہٰذا ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ اہل کتاب اپنے مشرکانہ عقائد کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کی سب سے اہم بنیاد ہی سے منحرف ہو گئے ہیں جب کہ پیغمبرؐ اسلام اور مسلمان اس بنیاد پر قائم ہیں اور اس اصل کو اسلام کے تمام اصول و فروع میں وسعت دیتے ہوتے اس کے مخلص ترین وفادار ہیں۔ اس لیے یہ اعتراف کرنا چاہیئے کہ ابراہیمؑ سے زیادہ قریب یہ لوگ ہیں نہ کہ وہ۔

مندرجہ بالا آیت میں انبیاء سے رابطے کے لیے صرف مکتب و ہدف سے ربط کو دلیل شمار کیا گیا ہے اور کسی اور چیز کو نہیں لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ پیشوایان اسلام سے مروی روایات میں صراحت سے اسی کا سہارا لیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک روایت تفسیر "مجمع البیان" اور "نور الثقلین" میں حضرت علیؑ سے منقول ہے۔ آپ نے فرمایا:

"انّ اولی الناس بالانبیاء اعملهم بما جاءوا به ثم تلا هٰذه الاٰیة . وقال انّ ولی محمّد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) من اطاع الله وان بعدت لحمته وانّ عدوّ محمّد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) من عصی الله وان قربت قرابته."

"انبیاء سے قریبی تعلق رکھنے والے لوگ وہ ہیں جو ان احکام پر سب سے زیادہ عمل کرتے ہیں ـــــ محمدؐ کا دوست وہ ہے جو فرمانِ خدا کی اطاعت کرتا ہے اگرچہ نسبی طور پر وہ آپ سے دور ہو اور محمدؐ کا دشمن وہ ہے جو خدا کی نافرمانی کرتا ہے اگرچہ وہ محمدؐ کا نزدیکی قرابت دار ہو"

"والله ولی المؤمنین"

آیت کے آخر میں خدا کے عظیم پیغمبروں کے مکتب کے حقیقی پیروکاروں کو بشارت دی گئی ہے کہ خدا ان کا ولی، سرپرست، محافظ، یاور اور نگہبان ہے۔

۶۹۔ وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ○

ترجمہ

۶۹۔ اہل کتاب (یہود) کا ایک گروہ چاہتا تھا کہ تمہیں گمراہ کر دے لیکن (انہیں جان لینا چاہیئے کہ وہ تمہیں گمراہ نہیں کر سکتے) وہ اپنے آپ کو ہی گمراہ کرتے ہیں۔ مگر سمجھتے نہیں۔

شان نزول

بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ بعض یہودیوں کی کوشش تھی کہ پاک دل مسلمانوں میں سے مشہور افراد مثلاً معاذ اور عمار وغیرہ کو اپنے دین کی طرف دعوت دیں اور شیطانی وسوسوں کے ذریعے انہیں اسلام سے موڑ لیں۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس کے ذریعے تمام مسلمانوں کو اس سلسلے میں خطرے سے باخبر کیا گیا۔

تفسیر

"ودت طآئفة من اهل الكتب لو يضلونكم"

جیسا کہ شان نزول میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ دشمنان اسلام خصوصاً یہودی مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ پیغمبر اسلامؐ کے نزدیکی صحابہ کے بارے میں بھی وہ خواہشمند تھے کہ انہیں اسلام سے پھیر لیں ظاہر ہے کہ اگر وہ رسول اللہؐ کے قریبی صحابہ میں سے ایک یا چند افراد ہی کو برگشتہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو اسلام پر ایک عظیم ضرب پڑتی اور دوسروں کو متزلزل کرنے کے لیے فضا ہموار ہو جاتی۔

مندرجہ بالا آیت میں دشمنوں کی اس سازش سے باخبر کیا گیا ہے۔ نیز انہیں کہا گیا ہے کہ وہ اس بے جا کوشش سے دست کش ہو جائیں۔ اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ مکتب پیغمبرؐ میں ان مسلمانوں کی تربیت بس حساب اور آگاہی سے ہوئی ہے کہ ان کے لوٹ جانے کا کوئی احتمال نہیں۔ انہوں نے اسلام کو دل و جان سے اپنا لیا ہے انہوں نے اس عظیم انسانی مکتب سے گہرا قلبی لگاؤ پیدا کر لیا ہے اور وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ لہٰذا دشمن انہیں گمراہ نہیں کر سکتے بلکہ وہ تو فقط اپنے تئیں گمراہ کرتے ہیں اور یہ اس لیے کہ وہ شبہات پیدا کرتے ہیں، اسلام اور پیغمبرؐ

کی طرف غلط نسبتیں دیتے ہیں یوں وہ خود بدنیتی کی روح اپنے وجود میں پروان چڑھاتے ہیں۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص عیب جوئی اور اعتراض کرنے ہی میں معروف رہتا ہے اسے نقاط قوت دکھائی نہیں دیتے یا پھر تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے نورانی نقاط بھی اسے تاریک معلوم ہوتے ہیں۔ اس امر میں اصرار کے نتیجہ میں روز بروز وہ حق سے دور ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے قرآن کہتا ہے:۔

("وما یضلون الا انفسھم وما یشعرون")

"وما یشعرون" ـــ یعنی وہ شعور اور توجہ نہیں رکھتے۔ یہ جملہ اس نفسیاتی نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ کبھی انسان اپنے آپ سے آشنا نہیں ہوتا اور وہ اپنی باتوں کے زیر اثر بھی ہو جاتا ہے۔ جب وہ کوشش کرتا ہے کہ جھوٹ اور تہمت کے ذریعے دوسروں کو گمراہ کرے تو وہ اپنے آپ کو بھی اس کے اثرات سے نہیں بچا سکتا اور یہ غلط باتیں آہستہ آہستہ خود اس کے قلب و جان پر اثر کرنے لگتی ہیں۔ زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ غلط بات اس کا راسخ عقیدہ بن جاتی ہے۔ ایسی باتوں کو اختیار کر کے وہ خود گمراہ ہو جاتا ہے۔

۷۰۔ يَاأَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ○

۷۱۔ يَاأَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۷۰۔ اے اہل کتاب! کیوں آیات خدا سے کفر کرتے ہو جب کہ (ان کی صحت و صداقت کی) گواہی (بھی) دیتے ہو۔

۷۱۔ اے اہل کتاب حق کو باطل سے کیوں ملاتے ہو (اور انہیں مشتبہ کرتے ہو تاکہ لوگ سمجھ نہ سکیں اور گمراہ ہو جائیں) اور حقیقت چھپاتے ہو حالانکہ تمہیں معلوم ہے۔

تفسیر

"يَاأَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ"

یہاں بھی روئے سخن اہل کتاب کی طرف ہے کہ وہ اپنی دشمنی اور ہٹ دھرمی سے کیوں دست کش نہیں ہوتے

اور تورات وانجیل میں پیغمبر اسلام کی نشانیاں پڑھنے اور ان سے علم وآگاہی رکھنے کے باوجود انکار کی راہ کیوں اختیار کرتے ہیں

"یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَلۡبِسُوۡنَ الۡحَـقَّ بِالۡبَاطِلِ."

دوبارہ اہل کتاب کو ٹوکا گیا ہے کہ وہ کیوں حق و باطل کو ایک دوسرے سے ملا دیتے ہیں اور علم رکھنے کے باوجود حقیقت کو کیوں چھپاتے ہیں اور تورات وانجیل کی وہ آیات جن میں پیغمبر اسلام کا تعارف کروایا گیا ہے اور جو ان کی حقانیت کی نشانیاں ہیں انہیں کیوں چھپاتے ہیں۔

درحقیقت پہلی آیت میں علم وآگاہی کے باوجود راہ حق سے خود ان کے انحراف پر مواخذہ کیا گیا ہے اور دوسری آیت میں دوسرے لوگوں کو منحرف کرنے پر۔

سورہ بقرہ آیہ ۴۲ کے ذیل میں بھی ہم اس سلسلے میں گفتگو کر چکے ہیں۔ وہ آیت مندرجہ بالا آیت کے مشابہ ہے:

۷۲۔ وَقَالَتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اٰمِنُوۡا بِالَّذِىۡۤ اُنۡزِلَ عَلَى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَجۡهَ النَّهَارِ وَاكۡفُرُوۡۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ۞

۷۳۔ وَلَا تُؤۡمِنُوۡۤا اِلَّا لِمَنۡ تَبِعَ دِيۡنَكُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنۡ يُّؤۡتٰٓى اَحَدٌ مِّثۡلَ مَاۤ اُوۡتِيۡتُمۡ اَوۡ يُحَآجُّوۡكُمۡ عِنۡدَ رَبِّكُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡفَضۡلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ۞

۷۴۔ يَّخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ ۞

ترجمہ

۷۲۔ اہل کتاب (یہود) کی ایک جماعت نے کہا (جاؤ اور) جو کچھ مومنین پر نازل ہوا ہے (ظاہراً) دن کی ابتداء میں اس پر ایمان لے آؤ اور دن کے آخر میں کافر ہو جاؤ (اور لوٹ آؤ) شاید وہ (تمہارے اس عمل سے اپنے دین سے) برگشتہ ہو جائیں (کیونکہ وہ تمہیں اہل کتاب اور گذشتہ آسمانی بشارتوں سے آگاہ سمجھتے ہیں اور یہ سازش انہیں متزلزل کرنے کے لئے کافی ہے)۔

۷۳۔ اور سوائے اس شخص کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتا ہے اور کسی پر ایمان نہ رکھو، کہو کہ ہدایت تو وہ ہے جو خدا کی طرف سے ہو (اور تمہاری یہ سازش اس کے مقابلے میں بے اثر ہے) (پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مزید کہنے لگے کہ یہ نہ سمجھنا کہ) کسی کو تمہاری طرح (آسمانی کتاب) دی جائے گی یا یہ کہ تمہارے پروردگار کے دربار میں کوئی تم سے بحث کر سکے گا (بلکہ نبوت اور منطق، یہ دونوں چیزیں صرف تمہاری قوم اور نسل میں ہیں) کہہ دو کہ فضل (نبوت، عقل اور منطق کی عطا کسی میں منحصر نہیں ہے بلکہ وہ) خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہ جسے چاہتا ہے (اور اس کا اہل سمجھتا ہے) عطا کرتا ہے اور خدا واسع (وسیع عطیات وعنایات کا مالک) اور (ان کے مناسب مواقع سے) آگاہ ہے۔

۷۴۔ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے نوازتا ہے اور اللہ عظیم عنایات وفضل کا مالک ہے۔

شان نزول

بعض گذشتہ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ خیبر اور دیگر مقامات کے بارہ[۱۲] یہودی علماء نے مل کر بعض مومنین کا ایمان متزلزل کرنے کے لیے ایک سازش بنائی۔ انہوں نے پروگرام بنایا کہ ایک صبح پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں

جائیں اور ظاہراً ایمان لے آئیں اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کریں لیکن دن کے آخر میں اس دین سے پلٹ آئیں اور جب ان سے پوچھا جائے کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے تو کہیں کہ ہم نے محمدؐ کی صفات کو قریب سے دیکھا ہے لیکن جب اپنی دینی کتب کی طرف رجوع کیا ہے یا اپنے علماء سے مشورہ کیا ہے تو دیکھا ہے کہ ان کی صفات اور طور طریقے اس سے مطابقت نہیں رکھتے جو کچھ ہماری کتب میں ہے لہٰذا ہم اپنے دین کی طرف پلٹ آئے ہیں۔

یہودی علماء کا خیال تھا کہ اس طرح بعض مسلمان کہیں گے کہ چونکہ یہ لوگ ہماری نسبت آسمانی کتب کا زیادہ علم رکھتے ہیں اس لیے جو کچھ یہ کہتے ہیں یقیناً صحیح اور حق ہے اور یوں وہ متزلزل ہو جائیں گے۔

آیت کے متعلق ایک اور شانِ نزول بھی مذکور ہے۔ لیکن درج بالا شانِ نزول آیت کے معنی سے زیادہ نزدیک ہے۔

تفسیر

مندرجہ بالا آیت یہودیوں کی ایک اور تباہ کن سازش سے پردہ اٹھاتی ہے اور نشاندہی کرتی ہے کہ وہ مسلمانوں کا ایمان متزلزل کرنے کے لیے ہر ذریعہ استعمال کرتے تھے۔ ایک گروہ کے اراکین جنہیں قرآن نے "طائفۃ من اھل الکتب" کہا ہے آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے: آؤ اور جو کچھ مسلمانوں پر نازل ہوا ہے دن کے آغاز میں اس پر ایمان لے آئیں اور دن کے آخر میں اس سے پلٹ آئیں۔ بعید نہیں کہ دن کے آغاز و اختتام سے مراد اتنی کم مدت ہو کہ لوگ کہہ سکیں کہ وہ اسلام کو دور سے کچھ اور سمجھتے تھے لیکن نزدیک سے کچھ اور پایا ہے۔ اس لیے بہت ہی جلد پلٹ آئے ہیں ان کا خیال تھا کہ یہ سازش یقینی طور پر ضعیف الاعتقاد لوگوں پر کافی اثر کرے گی خصوصاً اس لحاظ سے کہ وہ لوگ علماء یہود میں سے ہیں اور سب لوگ جانتے ہیں کہ وہ آسمانی کتابوں اور آخری پیغمبر کی نشانیوں سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ایمان و کفر کم از کم نئے مسلمانوں کے اعتقاد کی بنیادیں تو مزور ہلا دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اپنی ماہرانہ سازش کی کامیابی کی بہت اُمید تھی اور "لعلھم یرجعون" ان کی اسی اُمید کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

"ولا تؤمنوآ الا لمن تبع دینکم"

انہوں نے تاکید کی کہ تمہارا ایمان فقط ظاہری ہونا چاہیئے اور تمہارا رشتہ صرف اپنے دین کے پیروکاروں سے ہونا چاہیئے۔ بعض تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ خیبر کے یہودیوں نے مدینہ کے یہودیوں کو وصیت کی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان لوگوں کے زیر اثر آجاؤ جو پیغمبر اسلامؐ کے زیادہ قریب ہیں اور یوں ان پر ایمان لے آؤ کیونکہ ان کا عقیدہ اور نظریہ تھا کہ نبوت صرف نسل یہود میں رہے گی اور اگر کوئی پیغمبر ظہور کرے تو اسے یہودیوں میں سے ہونا چاہیئے۔

بعض مفسرین نے "لا تؤمنوا" کو "ایمان" کے مادہ سے "اعتماد و اطمینان" کے معنی میں لیا ہے۔ کیونکہ لغوی طور پر بھی اس کا یہی معنی ہے۔ اس بناء پر مندرجہ بالا جملے کا مفہوم یہ ہوا کہ یہ سازش بالکل مخفی ہونا چاہیئے اسے

سوائے یہودیوں کے یہاں تک کہ مشرکوں سے بھی بیان نہ کرو تاکہ یہ راز فاش نہ ہو جائے اور یہ پروگرام نقش برآب ہو کر نہ رہ جائے۔ مندرجہ بالا آیت کے ذریعے خدا تعالیٰ نے یہودیوں کی اس خفیہ سازش سے پردہ اٹھا کر انہیں رسوا کیا تاکہ مومنین کے لیے بھی یہ درس عبرت ہو اور مخالفین کے لیے بھی ذریعہ ہدایت بنے۔

" قل ان الھدٰی ھدی اللہ ":

یہ جملہ اصطلاح میں ایک جملۂ معترضہ ہے جو پروردگار کی طرف سے ہے جب کہ اس سے پہلے اور بعد والے جملے میں یہودیوں کی گفتگو نقل کی گئی ہے۔

یہودیوں کی گفتگو کے درمیان زیرِ نظر جملے میں خدا تعالیٰ نے انہیں ایک مختصر اور جامع جواب دیا ہے کہ ہدایت تو خدا کی طرف سے ہے اور وہ کسی خاص نسل اور قوم میں منحصر نہیں ہے اور کوئی ضروری نہیں کہ پیغمبر صرف یہود میں سے ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ جنہیں پروردگار کی ہر قسم کی ہدایت میسر ہے وہ ان سازشوں سے متزلزل نہیں ہوں گے اور یہ تخریبی منصوبے ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

" ان یؤتٰی احد مثل ما اوتیتم او یحاجوکم عند ربکم ":

یہ یہودیوں کی گفتگو کا آخری حصہ ہے۔ اس جملے کی ابتدا میں ولا تصدقوا (اعتراف اور اعتماد نہ کرو) مقدر ہے۔ [1]

اس بناء پر اس جملے کا معنی یہ ہوگا کہ کبھی یہ باور نہ کرو کہ ساری دنیا کے لوگوں میں سے کوئی شخص وہ افتخار اور امتیاز اور آسمانی کتب جو تمہیں نصیب ہیں، لے سکے گا اور یہ بھی باور نہ کرو کہ کوئی شخص روزِ قیامت درگاہِ خداوندی میں تم سے مباحثہ اور گفتگو کر کے تمہیں مغلوب کر سکے گا کیونکہ تم دنیا کی بہترین قوم اور خاندان ہو نیز نبوت، عقل، درایت، منطق اور استدلال صرف تمہارے پاس ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہودی اس فضول منطق کے ذریعے خدا سے اپنا ارتباط ظاہر کرتے اور تمام قوموں سے اپنے تئیں برتر سمجھتے تھے اسی لیے بعد والے جملے میں خدا تعالیٰ نے انہیں صراحت جواب دیا ہے۔

" قل ان الفضل بید اللہ یؤتیہ من یشآء واللہ واسع علیم ":

کہیئے کہ مقام نبوت ہو، عقلی و منطقی استدلال ہو یا کوئی اور امتیاز، سب فضل و عطا خدا کی طرف سے ہے وہ جسے چاہتا ہے اور اہل سمجھتا ہے اسے نوازتا ہے۔ کسی نے اس سے عہد و پیمان نہیں لے رکھا

---

[1] اگر گزشتہ جملے میں " لا تؤمنوا " (اطمینان نہ کرو) کے معنی میں ہو تو " ان یؤتی احد مثل ما اوتیتم او یحاجوکم عند ربکم " کے دونوں حصے ہو سکتا ہے اس پر معطوف ہوں۔

اور نہ ہی کوئی اُس سے قرابت یا رشتہ داری رکھتا ہے اس کا جود و عطا واسع ہے اور استحقاق کے مواقع سے وہ علیم و آگاہ ہے۔

"یختص برحمتہ من یشآء واللہ ذوالفضل العظیم"

اس آیت میں بھی گذشتہ بحث کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا جسے چاہتا ہے اور اہل سمجھتا ہے اپنی مخصوص رحمتوں سے نوازتا ہے (اور مقام نبوت و منصب رہبری بھی اس کی رحمتوں میں سے ہیں) اور کوئی شخص انہیں محدود نہیں کرسکتا اور ہر حالت میں عنایات، عطیات اور فضل عظیم اسی کی طرف سے ہے۔

پرانی سازشیں

مندرجہ بالا آیات دراصل قرآن کی پُر اعجاز آیات ہیں جو یہودیوں اور دشمنانِ اسلام کے اسرار سے پردہ اٹھاتی ہیں اور ان کی صدر اول میں مسلمانوں کو متزلزل کرنے کی سازشوں کو فاش کرتی ہیں۔ ان کی وجہ سے مسلمان بیدار ہو گئے اور دشمن کے تباہ کن وسوسوں سے بچ گئے۔ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ موجودہ دور میں بھی اسلام کے خلاف ایسے ہی منصوبے بنتے رہتے ہیں۔ دشمن کے ذرائع ابلاغ جو پوری دنیا میں سب سے قوی ہیں اس سلسلے میں استعمال ہو رہے ہیں۔ دشمنوں کی کوشش ہے کہ اصل اسلام خصوصاً ان کی نوجوان نسل کے افکار کو اسلامی عقائد سے متزلزل کردیں۔ وہ اس کے لیے عالم، دانشور، مورخ، سائنسدان، صحافی یہاں تک کہ فلمی اداکار کا بھیس بھی استعمال کرتے ہیں وہ یہ حقیقت نہیں چھپاتے کہ ان کے پراپیگنڈا کا مقصد مسلمانوں کو یہودی یا عیسائی بنانا نہیں بلکہ ان کا ہدف نوجوانوں کو اسلامی عقائد سے برگشتہ کرنا ہے اور انہیں اپنے دین اور ثقافت کے مفاخر سے لاتعلق کرنا ہے۔ قرآن آج مسلمانوں کو ان سازشوں سے ہوشیار رہنے کی دعوت دیتا ہے۔

۷۵۔ وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○

۷۶۔ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ

يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

ترجمہ

۷۵۔ اور اہل کتاب میں سے کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر تم انہیں بہت سی دولت بطور امانت دو تو وہ تمہیں لوٹا دیں گے اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر انہیں ایک دینار بھی سپرد کرو تو وہ تمہیں ہرگز واپس نہ کریں گے مگر اس وقت تک جب تک تم ان کے سر پر کھڑے رہو (اور ان پر مسلط رہو) یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم اُمیین (یہودیوں کے علاوہ کسی) کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں اور خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں۔

۷۶۔ جی ہاں جو شخص اپنے عہد و پیمان پورے کرے اور پرہیزگاری اختیار کرے (خدا اُسے دوست رکھتا ہے کیونکہ) خدا پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے۔

شان نزول

یہ آیت دو یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک امین اور صحیح آدمی تھا اور دوسرا خائن اور پست فطرت۔ پہلا شخص عبداللہ بن سلام تھا۔ اس کے پاس ایک دولت مند نے ۱۲۰۰ اوقیہ[1] سونا بطور امانت رکھا۔ عبداللہ نے وہ سب معین موقع پر واپس کر دیا۔

دوسرا شخص فنحاص بن عاندرا تھا۔ ایک قریشی نے اُس کے پاس ایک دینار بطور امانت رکھا۔ فنحاص نے اس میں خیانت کی۔ اس خیانت کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے زیر نظر آیت میں اس کی مذمت کی ہے۔

بعض کہتے ہیں پہلا جملہ نصاریٰ کی ایک جماعت کے بارے میں ہے اور خیانت کرنے والے یہودی تھے۔

اگر آیت ان دونوں واقعات کے متعلق ہو تو بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اگرچہ زیادہ تر قرآنی آیات خاص مواقع پر نازل ہوئی ہیں لیکن وہ عمومی پہلو بھی رکھتی ہیں اور اصطلاح کے مطابق موقع و محل سے مختص نہیں ہیں۔

تفسیر

یہ آیت اہل کتاب کے ایک اور چہرے سے نقاب پلٹتی ہے اور وہ یہ کہ بعض یہودی عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ

---

[1] اوقیہ: جمع اواق۔ رطل کے بارہویں حصے کو کہتے ہیں جو سات مثقال کے برابر ہوتا ہے۔

دوسروں کی امانتوں کی حفاظت کے جواب دہ نہیں ہیں ۔ یہاں تک کہ وہ سمجھتے تھے کہ انہیں حق پہنچتا ہے کہ وہ امانتوں کو اپنی ملکیت بنالیں ۔

وُہ کہتے تھے : ہم اہل کتاب ہیں ، پیغمبر ہم میں سے ہیں اور آسمانی کتاب ہمارے پاس ہے لہذا دوسروں کے اموال ہمارے لیے کوئی احترام نہیں رکھتے ۔ یہ خیال ان کے ہاں اتنا مسلم تھا کہ وہ اعتقادی اور مذہبی رُخ اختیار کر چکا تھا "یقولون علی اللہ الکذب" یعنی وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے ۔ یہ جملہ اُن کے اسی رُخ کی طرف اشارہ کر رہا ہے ۔

یہودی کہتے تھے ہم عربوں کے مال میں تصرف کرنے اور انہیں غصب کرنے کے مجاز ہیں کیونکہ وہ مشرک ہیں اور حضرت موسیٰ کے پروگرام پر عمل نہیں کرتے ۔

یہاں بات کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ یہودیوں کا عربوں سے اقتصادی معاہدہ تھا اور وہ عربوں سے تجارت کرتے تھے ۔ جب عرب اسلام لے آئے تو یہودیوں نے ان کے حقوق کی ادائیگی سے انکار کر دیا اور یہ استدلال پیش کیا کہ معاملہ کے وقت تم ہمارے مخالف نہیں تھے ، اب جب کہ تم نے نیا مذہب اختیار کر لیا ہے تمہارا حق ساقط ہو گیا ہے ۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیت تصریح کرتی ہے کہ تمام اہل کتاب اِس غیر انسانی طرزِ فکر کے موافق نہیں تھے ۔ بلکہ ان میں سے بعض لوگ دوسروں کے حقوق ادا کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے ۔ یہ اس امر کی علامت ہے کہ قرآن ہرگز نہیں چاہتا کہ ایک گروہ کی غلط کاری کی بناء پر سب کی مذمت کی جائے ۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے :

"ومن اھل الکتٰب من ان تأمنہ بقنطار یؤدہٖ الیک
ومنھم من ان تأمنہ بدینار لا یؤدہٖ الیک الا مادمت
علیہ قآئما "

یعنی ـــ بعض اہل کتاب ایسے ہیں کہ اگر انہیں کثیر دولت بھی امانت کے طور پر دی جائے تو وہ واپس کر دیں گے اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر انہیں ایک دینار بھی امانت کے طور پر سپرد کریں تو وہ لوٹاتے نہیں مگر یہ کہ کوئی ان کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہو۔[1]

" الا مادمت علیہ قآئما " ـــ یعنی جب تک تم ان کے سر پر مسلط نہ ہو ۔ آیت کے اِس حصے سے یہودیوں کے بارے میں ایک کلی اصول بھی معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ان میں سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کے بارے میں وہ طاقت و قدرت کے علاوہ کسی طریقے کو نہیں پہچانتے ۔ مسلمانوں کے پاس ان سے اپنے حقوق کے حصول کے لیے اِس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ طاقت حاصل کریں ۔ اسی طرح یہودی ان کے حقوق ادا کرنے کے لیے آمادہ ہو سکیں گے ۔ حالیہ سالوں میں ایشیا میں جو بہت سے حوادث رونما ہوئے ہیں اُنہوں نے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ عالمی رائے عامہ

[1] " قنطار " کے معنی کے متعلق میں اسی سورہ کی آیہ ۱۴ کے ذیل میں بحث ہو چکی ہے۔

دُنیا بھر کے لوگوں کے افکار و نظریات اور حق و عدالت اور ایسی کوئی چیز ہمارے دشمنوں کے لیے کوئی مفہوم نہیں رکھتی اور وہ صرف طاقت کے سامنے جھکتے ہیں، کسی اور چیز کو خاطر میں نہیں لاتے اور یہ ان قابل توجہ حقائق میں سے ایک ہے جن کی قرآن میں پیش گوئی کی گئی ہے۔

"ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ"

اس جملے میں ان کی وہ منطق بیان کی گئی ہے جو وہ دوسروں کا مال کھانے کے لیے اختیار کیے ہوئے تھے اور وہ یہ کہ "اهل الکتٰب" "اُمّیّٖن" (مشرکین اور عرب جو عموماً لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے) پر برتری رکھتے ہیں لہٰذا کوئی حرج نہیں اگر اہل کتاب ان کے مال کو اپنی ملکیت بنالیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا یہاں تک کہ اس جھوٹے امتیاز کی وہ خدا کی طرف نسبت دیتے تھے۔

مسلّم ہے کہ یہ منطق ترامانت میں خیانت کرنے سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ وہ خود کو اس معاملے میں حق بجانب سمجھتے تھے۔ قرآن ان کے جواب میں صراحت سے کہتا ہے:۔ "وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ" یعنی —— وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں اور اس کی طرف ناروا نسبت دیتے ہیں۔ وہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ان کی آسمانی کتب میں دوسروں کے مال میں خیانت کرنے کی کوئی اجازت نہیں دی گئی لیکن وہ اپنے بُرے اعمال کی توجیہ کے لیے ایسی دروغ سازی کرتے ہیں اور اس کی نسبت خدا کی طرف دیتے ہیں۔

"بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ"

عربی زبان میں "بَلٰى" کسی مطلب کے ثابت کرنے کے لیے آتا ہے لیکن عام طور پر ایسے موقع پر آتا ہے کہ جہاں سوال منفی صورت میں ہو۔ جیسا کہ خدا فرماتا ہے۔

"اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ"

کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟

"قَالُوْا بَلٰى" —— اُنہوں نے کہا ہاں۔ جیسے لفظ "نَعَمْ" اثبات کے لیے آتا ہے مثلاً "فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا قَالُوْا نَعَمْ...."

کیا جس چیز کا تمہارے پروردگار نے وعدہ کیا اُسے تم نے حقیقی طور پر پا لیا

اُنہوں نے کہا ہاں۔ (اعراف — ۴۴)

مذکورہ آیت یہودیوں کے کلام کی نفی ہے۔ وہ کہتے تھے: "لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ....." (یعنی —— غیر اہل کتاب کا مال کھانا ہمارے لیے حرام نہیں ہے) یہ کہہ کر وہ اپنے آپ کو عملی طور پر آزاد سمجھتے تھے۔ اسی بے دلیل اور غیر مناسب دعوے کی بنیاد پر وہ دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔

اس دور میں بھی جو لوگ انسانوں کی قسمت سے کھیل رہے ہیں، انسانی حقوق پامال کرتے ہیں اور تمام اصول

اور معاہدے اُن کے لیے بازیچہ اطفال ہیں اور انہیں فقط اپنی خوشحالی سے غرض ہے، شاید یہ بھی اسرائیلی منطق پر کار بند ہیں۔

اس کے برعکس قرآن نسلی اور شخصی پہلوؤں کو اہم نہیں سمجھتا اور خدا کے حقیقی دوست انہیں قرار دیتا ہے جو گناہ سے دور رہتے ہیں، معاشرے کے حقوق کا احترام کرتے ہیں اور اپنے مقام و منصب سے غلط فائدہ نہیں اٹھاتے۔

آیت میں دراصل انسان کی حقیقی قیمت اور خدا کی دوستی کی میزان ایفائے عہد بالخصوص امانت میں خیانت نہ کرنے اور ہر موقع پر تقوٰی اختیار کئے رہنے کو قرار دیا ہے: "مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ"

آج بھی ایسے شواہد موجود ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ اس منصب کے پیروکاروں کی ایک جماعت دنیا کے دیگر انسانوں کے بارے میں وہی عقیدہ رکھتی ہے اور دوسروں کے مال و دولت اور تمام چیزوں کو اپنے لیے مباح سمجھتی ہے۔ یہ شواہد قرآن کی عظمت اور اس کی منطق کی اصالت کی دلیل ہیں۔

یہ شواہد ان سے متعلقہ مقالوں اور مختلف کتب میں جمع کیے گئے ہیں۔ شوق رکھنے والے لوگ ان سے رجوع کر سکتے ہیں ـــــ

ایک اشکال اور اس کی وضاحت

ممکن ہے یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ اسلام میں بھی دوسروں کے مال کے متعلق یہی حکم نظر آتا ہے کیونکہ اسلام اجازت دیتا ہے کہ مسلمان دوسروں کے اموال کو اپنی ملکیت بنالیں۔

بلاشبہ اسلام کی طرف ایسی نسبت دینا تہمت ہے کیونکہ اسلام کے قطعی احکام میں سے ہے کہ امانت میں خیانت کرنا جائز نہیں چاہے وہ مسلمان کی ہو یا غیر مسلم کی یہاں تک کہ مشرک و بت پرست ہی کی کیوں نہ ہو۔ ایک مشہور حدیث میں امام سجادؑ سے منقول ہے:

"عَلَيْكُمْ بِاَدَاءِ الْاَمَانَةِ فَوَالَّذِیْ بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ نَبِيًّا لَوْ اَنَّ قَاتِلَ اَبِی الْحُسَيْنِ بْنِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ ائْتَمَنَنِیْ عَلَی السَّيْفِ الَّذِیْ قَتَلَهٗ بِهٖ لَاَدَّيْتُهٗ اِلَيْهِ" [1]

امانت ادا کرنا تم سب پر لازم ہے۔ قسم ہے اس خدا کی جس نے محمدؐ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا۔ اگر میرے والد حسین بن علی بن ابی طالب (علیہم السلام) کا قاتل وہی تلوار جس سے اُس نے انہیں شہید کیا ہے

[1] امالی صدوق، صفحہ ۱۴۹

میرے پاس بطور امانت رکھتا (اور میں قبول کر لیتا) تو (بھی) میں اس کی امانت اسے ادا کرتا۔

دوسری روایت میں امام صادقؑ سے منقول ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

"اِنَّ اللّٰہَ لَمْ یَبْعَثْ نَبِیًّا قَطُّ اِلَّا بِصِدْقِ الْحَدِیْثِ وَ اَدَاءِ الْاَمَانَةِ مُؤَدَّاتًا اِلَی الْبِرِّ وَالْفَاجِرِ" [1]

خدا نے کسی پیغمبر کو مبعوث نہیں کیا مگر یہ کہ ہر نیک و بد کے ساتھ راست گوئی اور امانت کی ادائیگی اس کے پروگراموں میں شامل تھی۔

اس لیے جو کچھ مندرجہ بالا آیت میں یہودیوں کی طرف سے امانت میں خیانت کرنے کے بارے میں بیان کیا گیا ہے، کسی طرح بھی مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں دی گئی اور مسلمان ذمہ دار ہیں کہ وہ بلا استثناء کسی کی امانت میں خیانت نہ کریں۔

۷۷۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

ترجمہ

۷۷۔ جو لوگ خدا سے باندھا ہوا عہد و پیمان اور (خدا کے مقدس ناموں سے کھائی گئی) اپنی قسموں کو تھوڑی سی قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا، خدا ان سے بات نہیں کرے گا، قیامت کے دن ان کی طرف (رحمت کی) نظر نہیں کرے گا، انہیں (گناہ سے) پاک نہیں کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

---

[1] "مشکوٰۃ الانوار" بنقل از "سفینۃ البحار"

شان نزول

بعض علماء یہود نے جن میں ابو رافع، حی بن اخطب اور کعب بن اشرف شامل تھا، جب دیکھا کہ ان کی اجتماعی حیثیت یہودیوں کے درمیان خطرے میں ہے تو کوشش کی کہ توراۃ میں آخری پیغمبر کے بارے میں جو نشانیاں تھیں اور توراۃ کے جو نسخے خود انہوں نے لکھے تھے ان میں تحریف کر دیں یہاں تک کہ وہ اس بات پر قسم بھی کھاتے کہ وہ تحریف شدہ جملے خدا کی طرف سے ہیں۔ اسی بناء پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انہیں شدت سے خطرے کا الارم دیا گیا۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت اشعث بن قیس کے بارے میں نازل ہوئی جو غلط طریقے سے کسی کی زمین پر قبضہ کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے جب وہ جھوٹی قسم کھانے پر آمادہ ہوا تو مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔ اس پر اشعث ڈر گیا اور اعترافِ حق کر لیا اور زمین اس کے مالک کو واپس کر دی۔

تفسیر

اس آیت میں یہود اور اہل کتاب کی بعض غلط کاریوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ البتہ آیت چونکہ عمومی صورت میں ہے اس لیے ان سب کے بارے میں ہے جن میں یہ صفات موجود ہیں۔

آیت کہتی ہے: جو لوگ خدا سے باندھے ہوئے عہد و پیمان اور اس کے مقدس نام کی قسموں کو تھوڑی سی قیمت پر بیچتے ہیں وہ متعدد سزاؤں میں گرفتار ہوں گے۔

پہلی یہ کہ وہ عالم آخرت کی بے شمار نعمتوں سے قابل ملاحظہ فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے "اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ"۔

دوسری یہ کہ خدا تعالیٰ روز قیامت صاحبانِ ایمان سے گفتگو کرے گا لیکن ایسے افراد سے کوئی کلام نہیں کرے گا "وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ"۔

تیسری یہ کہ اس دن اُن سے اپنی نگاہِ لطف و کرم اٹھائے گا "وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ"۔

چوتھی یہ کہ اس طرح انہیں گناہ کی آلودگیوں سے پاک نہیں کرے گا "وَلَا يُزَكِّيْهِمْ"۔

پانچویں یہ کہ اسی بناء پر اُن کے لیے دردناک عذاب ہوگا "وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ"۔

"ثَمَنًا قَلِيْلًا" (کم قیمت) سے مراد یہ ہے کہ انہیں ان عظیم گناہوں کے بدلے جو بھی مادی قیمت حاصل ہو جائے کم اور ناچیز ہے اگرچہ وہ وسیع حکومت ہی کیوں نہ ہو۔

واضح ہے کہ خدا کی گفتگو سے مراد زبان سے گفتگو نہیں ہے کیونکہ خدا تعالیٰ جسم و جسمانیت سے منزہ و مبرّا

ہے بلکہ اس سے مراد دل میں الہام کے ذریعے گفتگو ہے یا فضا میں صوتی موجوں کو ایجاد کرنا ہے جیسے حضرت موسیٰؑ نے شجرِ طور سے گفتگو سنی تھی۔

جس نکتے کی طرف یہاں توجہ ضروری ہے یہ ہے کہ عہد شکنی اور جھوٹی قسموں سے پیدا ہونے والے نتائج جن کا آیت میں ذکر ہے خدا سے قرب و بُعد کے تدریجی مراحل ہیں۔

جو شخص خدا کے قریب ہو جاتا ہے اور اس کے قرب کی بساط پر قدم رکھتا ہے پہلے تو معنوی عنایات کا ایک سلسلہ اس کے شاملِ حال ہوتا ہے اور جب زیادہ نزدیک ہو جاتا ہے تو خدا اس سے گفتگو کرتا ہے۔ جب اور زیادہ قریب ہوتا ہے تو خدا اس پر نظرِ رحمت کرتا ہے اس کے نتیجے میں وہ دردناک عذاب سے نجات پا جاتا ہے اور اس کی نعمتوں میں مستغرق ہو جاتا ہے لیکن جو لوگ عہد شکنی کرتے ہیں اور پروردگار کا نام غلط طور پر استعمال کرتے ہیں وہ ان تمام نعمات و برکات سے محروم ہو جاتے ہیں اور مرحلہ بمرحلہ دُور ہوتے جاتے ہیں۔ سورہ بقرہ کی آیہ ۱۷۴ ابھی زیرِ نظر آیت سے کئی لحاظ سے مشابہ ہے اُس کے ذیل میں اس آیت کے مفہوم کے بارے میں کئی ایک وضاحتیں آچکی ہیں۔

۷۸۔ وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۷۸۔ اِن (یہود) میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو (خدا کی) کتاب کی تلاوت کے وقت اپنی زبان یوں پھیرتے ہیں کہ تم گمان کرنے لگو کہ (جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں) کتابِ خدا میں سے ہے حالانکہ وُہ کتابِ خدا میں سے نہیں ہوتا (یہاں تک کہ وہ صراحت سے کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ جب کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا اور وہ

خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں ۔ حالانکہ جانتے ہیں ۔

تفسیر

"یَلْوٗنَ" "لَیّ" (بروزن "حَیّ") سے ہے ۔ اس کا معنی ہے پیچ وخم کھانا ۔ یہ آیت درحقیقت گذشتہ آیات کی تاکید کے طور پر آئی ہے ۔ اس آیت کی شانِ نزول بھی گذشتہ آیات کی شانِ نزول سے مشابہ ہے ۔ یہودیوں کا ایک گروہ کتابِ خدا پڑھتے وقت اپنی زبان کو پیچ وخم دیتا ہے اور ٹیڑھا کرتا ہے ۔ یہ تعبیر کلامِ خدا میں تحریف کرنے سے خوبصورت کنایہ ہے ۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے : وہ یہ کام ایسے ماہرانہ طریقے سے انجام دیتے ہیں کہ تمہیں گمان ہوگا کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں خدا کی طرف سے نازل شدہ آیات ہیں ، حالانکہ ایسا نہیں ہے ("لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ")۔

وہ اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ صراحت سے کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے نازل شدہ ہے جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے ("وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ")۔

قرآن دوبارہ کہتا ہے کہ اس سلسلے میں انہیں اشتباہ نہیں ہوا بلکہ وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں اور جانتے بوجھتے ہوئے وہ یہ بہتان باندھتے ہیں ("وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ")۔

۷۹۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝

۸۰۔ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

ترجمہ

۷۹۔ کسی شخص کو زیب نہیں دیتا کہ خدا آسمانی کتاب، حکم اور نبوت اُسے دے اور پھر وہ لوگوں سے کہتا پھرے کہ خدا کو چھوڑ کر میری عبادت کرو (بلکہ اُس کے شایانِ شان یہ ہے کہ وہ کہے) خدا والے بنو جیسا کہ کتابِ خدا کی تعلیم ہے اور جیسے تم نے درس پڑھا ہے (اور خدا کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرو)۔

۸۰۔ اور نہ یہ کہ تمہیں حکم دے کہ فرشتوں اور انبیاء کو اپنا پروردگار بنا لو۔ تو کیا وہ تمہیں کفر کی طرف دعوت دیتا ہے جب کہ تم مسلمان ہو چکے ہو۔

شانِ نزول

ان دو آیات کے بارے میں دو شان نزول مذکور ہیں:

پہلی- ایک شخص پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: ہم دوسروں کی طرح آپ پر سلام کرتے ہیں حالانکہ ہماری نظر میں ایسا احترام کافی نہیں۔ ہم تقاضا کرتے ہیں کہ آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم آپ کا امتیاز ملحوظ رکھیں اور آپ کو سجدہ کر لیا کریں۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: سجدہ خدا کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں۔ اپنے پیغمبر کا ایک بشر کے طور پر احترام کرو لیکن ان (انبیاء) کا حق پہچانو اور ان کی پیروی کرو۔

دوسری- ابو رافع ایک یہودی تھا۔ ایک مرتبہ وُہ نجران کے عیسائیوں کی طرف سے وفد کے قائد اور سرپرست کے ساتھ خدمت پیغمبرؐ میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کریں اور آپ کو مقامِ الوہیت پر فائز سمجھیں۔

شاید ان کا خیال تھا کہ پیغمبرؐ حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کی مخالفت اس بنا پر کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں اُن کا کوئی حصہ نہیں لہٰذا اگر حضرت عیسیٰؑ کی طرح ان کے لیے بھی مقام الوہیت کو تسلیم کر لیا جائے تو وہ خود بخود مخالفت چھوڑ دیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تجویز پیغمبر اکرم کو بدنام کرنے اور عوام کو منحرف کرنے کے لیے پیش کی گئی ہے۔

بہر حال پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

معاذ اللہ کیسے ممکن ہے کہ میں اجازت دوں کہ کوئی شخص رب واحد کے علاوہ کسی کی عبادت کرے خدا نے ہرگز مجھے ایسے معاملے کے لیے مبعوث نہیں کیا۔

تفسیر

اس سے پہلے ہم توجہ دلا چکے ہیں کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی بری عادات میں سے ایک یہ تھی کہ وہ حقائق میں تحریف کر دیا کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ان کا الوہیت کا دعویٰ انہی تحریفات میں سے ایک ہے۔ وہ کہتے تھے حضرت عیسیٰ نے خود ہمیں اس بات کا حکم دیا ہے۔ بعض لوگ چاہتے تھے کہ یہی موہوم خیال وہ پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں بھی رکھیں اور اس کی وجوہات کی طرف شان نزول میں اشارہ ہو چکا ہے۔ آیت نے انبیاء کی پرستش کی تجویز پیش کرنے والے ایسے تمام افراد کو صریح اور قطعی جواب دیا ہے۔

آیت کہتی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ، کسی اور نبی یا فرشتوں، میں سے کسی کی عبادت نہیں ہو سکتی اور اگر اہل کتاب یہ خیال کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے انہیں اپنی عبادت کی دعوت دی ہے تو وہ اشتباہ کرتے ہیں

"مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ......"

کسی انسان کو حق نہیں پہنچتا کہ خدا اُسے آسمانی کتاب، علم و دانش اور نبوت سے نوازے اور وہ لوگوں کو اپنی عبادت کی دعوت دے۔ حالانکہ تمام انبیاء نے بالاتفاق لوگوں کو ایک اکیلے خدا کی عبادت کی دعوت دی ہے۔ یہ آیت نفی مطلق کے معنی میں ہے۔

یعنی خدا کی طرف سے بھیجے گئے لوگ جنہیں علم و حکمت کا وافر حصہ بخشا گیا ہے کسی وقت بھی بندگی اور عبودیت کے مرحلے سے تجاوز نہیں کریں گے۔ خدا کے بھیجے ہوئے رہبر ہمیشہ عام لوگوں کی نسبت بارگاہ الٰہی میں زیادہ منکسر اور خاضع رہتے ہیں۔ لہٰذا وہ بندگی اور توحید کی شاہراہ نہیں چھوڑ سکتے اور لوگوں کو شرک کے گڑھے میں نہیں پھینک سکتے۔

"وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ"

"رَبّٰنِيّٖنَ" جمع ہے "ربانی" کی۔ یہ لفظ ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جس کا رشتہ اور ربط پروردگار سے محکم اور مضبوط ہو۔ چونکہ یہ لفظ "رب" کے مادہ سے بنا ہے اس لیئے اُس شخص کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو دوسروں کی تدبیر اصلاح اور تربیت کرے عرب ادب کے قواعد کی رو سے یہ لفظ "منسوب" ہے البتہ "یاءِ نسبت" کی اضافت کے وقت اس میں "الف" کا اضافہ ہو جاتا ہے جیسا کہ "بحرین" سے منسوب بہ کو "بحرانی" کہتے ہیں۔ یہاں بھی اسی صورت میں "ربّانی" کہا گیا ہے۔

مندرجہ بالا جملے میں قرآن کہتا ہے: انبیاء کو زیبا نہیں کہ وہ لوگوں کو اپنی پرستش کی دعوت دیں۔ ان کے

یہی مناسب ہے کہ وہ لوگوں کو آیات الٰہی کی "تعلیم" دیں اور حقائق دین کی "تدریس" کے ذریعے لوگوں کو علماء ربانی بنا دیں اور وہ ایسے لوگ تیار کریں جو خدا کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کریں اور علم و دانش اور معرفت کے سوا کسی چیز کی طرف دعوت نہ دیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مذکورہ جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کا مقصد فقط افراد کی تربیت کرنا نہ تھا بلکہ ان کا کام معلمین، تربیت کرنے والے اور مختلف گروہوں کے لیے رہبر تیار کرنا تھا۔ یعنی ایسے افراد تیار کرنا جن میں سے ہر کوئی ایک وسیع علاقے کو اپنے علم، ایمان اور دانش سے روشنی بخشے۔

اوپر والی آیت میں پہلے مسئلہ تعلیم کا ذکر ہے۔ پھر تدریس کا تذکرہ ہے۔ ان دو الفاظ میں یہ فرق ہے کہ تعلیم ایک وسیع و عریض معنیٰ کا حامل ہے۔ اس میں گفتار و کردار کے ذریعے پڑھے لکھے یا ان پڑھ ہر طرح کے لوگوں کو تعلیم دینا شامل ہے لیکن تدریس ایسی تعلیم کے لیے بولا جاتا ہے جس کا تعلق کتاب اور کاغذ سے ہو اور اصطلاح کے لحاظ سے تعلیم سے "اخص" اور خصوصی ہے

"وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ أَرْبَابًا"

اس آیت کی گفتگو گذشتہ بحث کی تکمیل ہے۔ اس میں فرمایا گیا ہے: جیسے انبیاء لوگوں کو اپنی پرستش کی دعوت نہیں دیتے اسی طرح انہیں فرشتوں اور دیگر انبیاء کی عبادت کی دعوت بھی نہیں دیتے

ایک طرف تو یہ جملہ مشرکین عرب کا جواب ہے، جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے اور یوں ان کی ایک طرح سے ربوبیت کے قائل تھے پھر بھی اپنے تئیں دین ابراہیمؑ کا پیروکار بتلاتے تھے، یونہی یہ "صابئین" کا بھی جواب ہے جو اپنے آپ کو حضرت "یحییٰ" کا پیروکار بتاتے تھے اور فرشتوں کا مقام پرستش کی حد تک اوپر لے جاتے تھے۔

دوسری طرف یہ یہودیوں کا بھی جواب ہے جو حضرت "عُزَیر" کو خدا کا بیٹا قرار دیتے تھے اور یوں ان کے لیے ربوبیت کے ایک حصے کے قائل تھے اور اس عقیدے کو پیغمبران خدا کی طرف منسوب کرتے تھے۔

آیت ان سب کا جواب دیتی ہے کہ یہ بات کسی پیغمبر کے شایان شان ہرگز نہیں کہ وہ لوگوں کو غیر خدا کی ربوبیت کی طرف دعوت دے۔

"أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ."

آخر میں فرمایا: کیا یہ ممکن ہے کہ پیغمبر تمہیں کفر کی دعوت دے جب کہ تم اسلام اور توحید کا راستہ اپنا چکے ہو۔

کہے بغیر واضح ہے کہ یہاں اسلام سے مراد دیگر بہت سے مواقع کی طرح اس کا وسیع معنی ہے یعنی فرمان خدا، ایمان اور توحید کے سامنے سر تسلیم خم کرنا۔

یعنی — کیسے ممکن ہے کہ کوئی ایسا پیغمبر ہو جو پہلے تو لوگوں کو ایمان اور توحید کی دعوت دے اور پھر

انہیں شرک کی راہ دکھائے یا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک پیغمبر دیگر تمام انبیاء کی زحمتوں کو برباد کر دے جنہوں نے اسلام کی دعوت دی ہے اور وہ لوگوں کو کفر و شرک کی طرف کیسے راغب کر سکتا ہے۔
ضمنی طور پر آیت عصمت انبیاء اور فرمان خدا سے اُن کے انحراف نہ کرنے کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔[1]

بشر پرستی ممنوع ہے

مندرجہ بالا آیات پوری صراحت سے غیر خدا کی ہر قسم کی پرستش، بالخصوص بشر پرستی کو ممنوع قرار دیتی ہیں اور انسان میں آزادی و استقلال کی روح پیدا کرتی ہیں۔ یہی وہ روح ہے جس کے بغیر انسان انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔

طویل انسانی تاریخ میں ایسے بہت سے افراد ہو گزرے ہیں جو اقتدار تک پہنچنے سے پہلے معصومانہ چہرہ رکھتے تھے اور لوگوں کو حق، عدالت، حریت، آزادی اور ایمان کی دعوت دیتے تھے لیکن جب ان کے اقتدار کی بنیادیں معاشرے میں مستحکم ہو گئیں تو آہستہ آہستہ انہوں نے اپنا راستہ بدل لیا اور وہ شخص پرستی کی طرف مائل ہوئے اور لوگوں کو اپنی پرستش کی دعوت دینے لگے۔

درحقیقت دعوت حق اور دعوت باطل دینے والوں کی پہچان کا یہی ایک راستہ ہے کہ حق کی دعوت دینے والے جن کے سرکردہ افراد انبیاءؑ اور آئمہ علیہم السلام ہیں اقتدار پالینے کے بعد بھی پہلے کی طرح لوگوں کو دین و انسانیت کے مقدس مقاصد کی طرف دعوت دیتے ہیں جن میں توحید، یگانہ پرستی اور آزادی کی دعوت شامل ہے لیکن باطل کی دعوت دینے والے جب اقتدار اور کامیابی تک پہنچتے ہیں تو پہلی چیز جو ان کے دماغ میں گھومتی ہے وہ اپنی طرف لوگوں کو دعوت دینا ہے اور وہ لوگوں کو ایک قسم کی اپنی عبودیت کی تشویق و ترغیب دیتے ہیں۔ ان کے گرد اگرد بے حیثیت لوگ جمع ہو جاتے ہیں جن کا کام خوشامد اور چاپلوسی ہوتا ہے اور وہ غرور و کم ظرفی کے ذریعے ایسی چیزوں کو ظاہر کرتے ہیں
ایک جاذب نظر حدیث حضرت علیؑ سے منقول ہے۔ یہ حدیث آنجنابؑ کے حقیقی روحانی چہرے کو واضح کرتی ہے اور یہ ہماری بحث کے لیے شاہد بھی ہے۔ جب امام عالی مقامؑ عراق کے سرحدی شہر انبار میں پہنچے تو کچھ کسان اپنے

---

[1] مشہور قرأت میں جس کے مطابق قرآن کا موجودہ متن ہے "وَلَا يَاْمُرَكُمْ" کا جملہ منصوب (راء پر زبر کے ساتھ) پڑھا جاتا ہے۔ اور حقیقت میں اس کا تعلق گذشتہ آیت کے "اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ" سے ہے اور یہ اس پر عطف ہے اور یہاں پر "لا" گذشتہ آیت میں آنے والے "ما" کی تاکید ہے جو نافیہ ہے۔ اس بناء پر اس جملے کا معنی کچھ یوں ہوگا۔

"وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يَّاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا"

یعنی۔ کسی بشر کو یہ حق نہیں کہ تمہیں حکم دے کہ انبیاء اور ملائکہ کو پروردگار بنالو۔

مروجہ طریقے کے مطابق آپؑ کے سامنے سجدے میں گر پڑے ۔ امام علیہ السلام نے نہ صرف یہ کہ اس فعل کو ناپسند کیا بلکہ بہت زیادہ غضبناک ہوئے اور انہیں کہنے لگے :

"ماھذاالذی صنعتموہ ؟"

تم نے یہ کیسا کام انجام دیا ہے ؟

فقالوا : "خلق منا نعظم بہ امرائنا ،"

وہ کہنے لگے : یہ کام ہم اپنے بادشاہوں اور امراء کی تعظیم کے طور پر انجام دیتے ہیں ۔

فقال : "واللہ ما ینتفع بھذا امرائکم وانکم لتشقون علی انفسکم فی دنیاکم وتشقون بہ فی اخرتکم وما اخسر المشقۃ وراءھا العقاب ، واربح الدعۃ معھا الامان من النار" [1]

آپؑ نے فرمایا :۔

بخدا تمہارے امراء اور حکام کو اس عمل سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور تم اپنے آپ کو اس سے دنیا میں رنج و تکلیف میں مبتلا کرتے ہوئے اور آخرت میں بدبختی میں گرفتار کرتے ہو ۔ کس قدر نقصان دہ ہے وہ تکلیف و مشقت کہ جس کے بعد عذابِ خدا بھی ہو اور کس قدر فائدہ بخش ہے وہ آرام و آزادی جس کے ساتھ آتشِ جہنم سے بھی امان حاصل ہو ۔

۸۱۔ وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰہُ مِیۡثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیۡتُکُمۡ مِّنۡ کِتٰبٍ وَّحِکۡمَۃٍ ثُمَّ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنۡصُرُنَّہٗ ؕ قَالَ ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰی ذٰلِکُمۡ اِصۡرِیۡ ؕ قَالُوۡۤا اَقۡرَرۡنَا ؕ قَالَ فَاشۡہَدُوۡا وَاَنَا مَعَکُمۡ مِّنَ الشّٰہِدِیۡنَ ○

[1] نہج البلاغۃ "کلمات قصار نمبر ۳۷"

ترجمہ

۸۱۔ وہ وقت (یاد کرو) جب خدا نے انبیاء (اور ان کے پیروکاروں سے) یہ تاکیدی عہد و پیمان لیا کہ جب میں تمہیں کتاب و حکمت دے دوں اس کے بعد تمہارے پاس ایک پیغمبر آئے جو اس کی تصدیق کرے جو تمہارے پاس ہے تو اس پر ایمان لے آنا اور اس کی مدد کرنا (پھر خدا نے ان سے) کہا: کیا اس چیز کا اقرار کرتے ہو اور اس پر تاکیدی عہد و پیمان باندھتے ہو۔ انہوں نے کہا: (جی ہاں) ہم اقرار کرتے ہیں۔ (خدا نے ان سے) کہا: (اس مقدس عہد و پیمان پر) گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

تفسیر

مقدس عہد و پیمان

"وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ":

یہ آیت ایک عمومی بنیاد کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ گزشتہ انبیاء اور ان کی اقتداء میں ان کے پیروکاروں نے خدا تعالیٰ سے ایک عہد و پیمان باندھا تھا اور وہ یہ کہ وہ بعد میں آنے والے انبیاء و رسل کے سامنے سر تسلیم خم کریں گے اور ان پر ایمان لانے کے علاوہ ان کے اہداف و مقاصد کی پیش رفت کے لیے ان کی کسی قسم کی مدد سے دریغ نہیں کریں گے۔

دراصل جیسے انبیاءؑ اور ان کی امتیں گزشتہ انبیاءؑ اور ان کے دین کا احترام کرتے تھے اس طرح گزشتہ انبیاءؑ اور ان کی امتوں پر آنے والے انبیاءؑ کے بارے میں ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ آیاتِ قرآن میں بارہا پیغمبرانِ خدا کے مقاصد کی وحدت کی طرف اشارہ ہوا ہے، زیرِ نظر آیت بھی اس امر کا زندہ نمونہ ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں کہا گیا ہے: خدا نے انبیاءؑ سے میثاق لیا تھا۔ "میثاق دراصل وثوق" کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے "ایسی چیز جو اطمینان اور اعتماد کا سبب بنے" عام طور پر "تاکیدی عہد و پیمان" کو میثاق کہتے ہیں۔

انبیاء سے پیمان لینا فطری طور پر ان کے پیروکاروں سے بھی پیمان لینے کے مترادف ہے۔ مذکورہ عہد و پیمان کا مطلب یہ تھا کہ اگر کوئی ایسا پیغمبر آئے جس کی دعوت ان کی دعوت سے ہم آہنگ ہو اور یوں اس کی حقانیت ثابت ہو

جائے تو انہیں چاہیے کہ اس پر ایمان لائیں اور اس کی مدد کریں۔ اس بات کی تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: "قَالَ ءَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي"[1] یعنی ۔ کیا تم اس پیمان کا اقرار کرتے ہو اور میرے عہد کو قبول کرتے ہو اور کیا اپنے پیروکاروں سے اس سلسلے میں تم نے پیمان لیا ہے؟ انہوں نے اس کے جواب میں کہا: جی ہاں! ہم اعتراف کرتے ہیں "قَالُوا أَقْرَرْنَا"۔

پھر خدا تعالیٰ نے اس اہم امر کی تاکید کے لیے انہیں دوبارہ فرمایا: تم اس امر پر گواہ رہو اور میں بھی تم پر اور تمہارے پیروکاروں پر گواہ ہوں ("قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ")۔

چند اہم نکات

(۱) میثاق کی وسعت: کیا مندرجہ بالا آیت صرف گذشتہ انبیاء کی بشارتوں اور پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں ان سے عہد و پیمان میں منحصر ہے یا ہر اس پیغمبر کے بارے میں ہے جو کسی دوسرے پیغمبر کے بعد آیا۔

آیت کا ظاہر تو کلی اور وسیع مفہوم کا حامل ہے اگرچہ خاتم الانبیاءؐ اس کے واضح تر اور روشن تر مصداق ہیں اور قرآن کے مفاہیم کی روح سے بھی یہی وسیع اور عمومی مفہوم مناسبت رکھتا ہے۔ لہٰذا اگر بعض روایات جو یہ تصریح نظر آتی ہے کہ اس سے مراد پیغمبر اسلامؐ ہیں تو وہ دراصل اس کے ایک واضح مصداق کے طور پر آیت کی تفسیر ہے نہ یہ کہ اس طرح آیت اسی مفہوم میں منحصر ہو گئی ہے۔

فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں حضرت علیؑ سے نقل کیا ہے:

> خدا نے جب آدم اور دوسرے انبیاء کو پیدا کیا تو ان سے عہد لیا کہ جب محمدؐ مبعوث ہوں تو وہ ان پر ایمان لائیں اور ان کی مدد کریں۔[2]

(۲) دو اولوا العزم پیغمبر ایک زمانے میں ہو سکتے ہیں؟ آیت کے مضمون کی طرف توجہ رکھتے ہوئے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا ہو سکتا ہے کہ ایک اولوا العزم پیغمبر کے زمانے میں دوسرا اولوا العزم پیغمبر مبعوث ہو اور اس کی ذمہ داری ہو تو وہ دوسرے پیغمبر کی پیروی کرے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جیسے آیت کی تفسیر میں اشارہ کیا گیا ہے کہ عہد و پیمان صرف انبیاء سے نہیں لیا گیا بلکہ ان کے پیروکاروں سے بھی لیا گیا ہے اور درحقیقت انبیاء سے عہد لینے سے مراد ان کی امتوں اور نسلوں سے عہد لینا ہے جو ان کے بعد وجود میں آتی ہیں اور بعد والے نبی کے زمانے کو پاتی ہیں اور فرض کیا اگر خود انبیاء بھی آنے والے انبیاء کے زمانے کو پائیں تو وہ ان پر ایمان لائیں گے یعنی پیغمبران خدا اپنے اہداف و مقاصد اور دعوت میں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہیں ہیں اور ان کی آپس میں کوئی جنگ نہیں ہے۔

(۳) آیت انبیاء کے جانشینوں کے بارے میں بھی ہے: اس آیت کے سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ اگرچہ یہ انبیاء کے بارے میں ہے لیکن واضح ہے کہ ان کے جانشینوں پر بھی صادق آتی ہے کیونکہ ان کے سچے

---

[1] "اِصْر": لغت میں تاکید والا عہد و پیمان کو کہتے ہیں جسے توڑنا سخت سزا کا موجب ہو۔ [2] "تفسیر کبیر"، جز ہفتم: صفحہ ۱۳۱۔

جانشین اُن سے جدا نہیں ہیں اور سب کے سب ایک ہی مقصد رکھتے ہیں۔ انبیاء ہمیشہ اپنے جانشینوں کا تعارف کرواتے تھے، ان کی بشارت دیتے تھے اور لوگوں کو ان پر ایمان لانے اور ان کی مدد کرنے کی دعوت دیتے تھے اس لیے اگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری تفسیر و حدیث کی کتب میں اس آیت کے ذیل میں چند روایات میں ——— " وَلَتَنْصُرُنَّهُ " سے حضرت علیؑ کی مدد کرنا مراد لیا گیا ہے اور اس میں مسئلہ ولایت کو بھی شامل قرار دیا گیا ہے تو وہ درحقیقت اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے۔

یہ بات کہے بغیر نہیں رہنا چاہیے کہ مندرجہ بالا آیت کے بارے میں مفسرین اور اہل ادب نے ترکیب نحوی کے حوالے سے بحث کی ہے۔ [۱]

مزاحم تعصبات

تاریخ نشان دہی کرتی ہے کہ ایک دین کے پیروکار آسانی سے اپنے دین سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہوتے اور خدا کی طرف سے نئے مبعوث ہونے والے انبیاء کے سامنے آسانی سے سر تسلیم خم نہیں کیا کرتے بلکہ جمود اور بڑی شدت سے اپنے قدیم دین پر جمے رہتے ہیں اور اس کا دفاع کرتے ہیں گویا اسے اپنا اور اپنے آپ کو اس کا سمجھتے ہیں اور اسے چھوڑ دینے کو اپنی ملی اور قومی بربادی خیال کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ بہت مشکل سے نیا دین قبول کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ تاریخ میں مذکور بہت سی جنگوں اور دردناک حوادث کا سرچشمہ قوموں کا یہی خشک تعصب اور پرانے ادیان پر اڑے رہنا ہے حالانکہ تکامل و ارتقا کا قانون مقتضی ہے کہ ادیان یکے بعد دیگرے آتے رہیں اور انسان کو خداشناسی، حق و عدالت، ایمان، اخلاق، انسانیت اور فضیلت کی راہ میں آگے لے جاتے رہیں تاکہ وہ آخری دین تک پہنچ جائیں جو کہ خاتم الادیان ہے اور اس بچے کی طرح یہ راستہ طے کریں جو تعلیم و تربیت کے مدارج یکے بعد دیگرے طے کرکے فارغ التحصیل ہو جاتا ہے۔

واضح ہے کہ اگر پرائمری پڑھنے والے بچے پرائمری سکول سے ایسا لگاؤ اور تعصب پیدا کرلیں کہ ہائی اسکول میں جانے ہی سے انکار کر دیں تو اس کا نتیجہ قافلۂ ترقی میں جمود اور پسماندگی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

زیر نظر آیت میں گذشتہ انبیاء اور ان کی امتوں سے مستحکم عہد و پیمان پر جو اصرار اور تاکید موجود ہے وہ گویا ایسے تعصبات، جمود اور ہٹ دھرمی سے اجتناب و احتراز ہی کے لیے تھا لیکن بہت افسوس کا مقام ہے کہ ان تمام تاکیدوں کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ پرانے ادیان کے پیروکار آسانی سے جدید حقائق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے۔

اس سوال کے ضمن میں کہ دینِ اسلام کیوں اور کیسے خاتم مذاہب اور آخری دین ہے، سورہ احزاب کی آیہ ۴۰ کے

---

[۱] " لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ " میں بعض " مَا " کو موصولہ اور مبتداء قرار دیتے ہیں، لام کو توطئہ قسم اور " لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ " کو خبر سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ " مَا " کو شرطیہ زمانیہ اور " لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ " کو اس کی جزا سمجھتے ہیں۔ یہی دوسرا احتمال آیت کے معنی سے زیادہ قریب ہے۔

ذیل میں انشاء اللہ تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

۸۲۔ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○

ترجمہ

۸۲۔ اس بناء پر جو شخص اس (مستحکم پیمان) کے بعد منہ پھیرے وہ فاسقین میں سے ہوگا۔

تفسیر

اس آیت میں قرآن کہتا ہے: ان سب تاکیدوں، اصرار اور مستحکم عہد و میثاق کے بعد بھی جو لوگ پیغمبر اسلام جیسے نبی پر ایمان لانے سے روگردانی کریں جن کے ظہور کی نشانیاں گذشتہ کتب میں آچکی ہیں تو وہ لوگ فاسق اور حکم خدا سے خارج ہیں۔

۸۳۔ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ○

۸۴۔ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○

۸۵۔ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِينَ ○

ترجمہ

۸۳۔ کیا وہ لوگ دین خدا کے علاوہ کوئی چیز چاہتے ہیں (اس کا دین تو اسلام ہے) اور تمام لوگ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اختیار یا مجبوری سے اس کے (حکم) کے سامنے تسلیم ہیں اور وہ اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔

۸۴۔ کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور (اس طرح) اس پر (بھی ایمان لائے ہیں) جو ہم پر، ابراہیم پر، اسماعیل پر، اسحق پر، یعقوب پر اور اسباط پر نازل ہوا ہے اور اس پر (بھی ایمان لاتے ہیں) جو موسیٰ، عیسیٰ اور (دوسرے) پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا ہے ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے اور اس کے (فرمان) کے سامنے تسلیم ہیں۔

۸۵۔ اور جو کوئی اسلام (اور حکم حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے) کے علاوہ اپنے لیے کوئی دین انتخاب کرے تو وہ اس سے قبول نہیں ہوگا اور آخرت میں وہ زیاں کاروں میں سے ہوگا۔

تفسیر

"اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ"

گذشتہ آیات میں اب تک گذشتہ مذاہب کے بارے میں تفصیلی بحث ہوئی ہے اب یہاں سے اسلام کے بارے میں بحث شروع ہوتی ہے اور اہل کتاب اور دیگر گذشتہ ادیان کے پیروکاروں کی توجہ اس کی طرف مبذول

کروائی گئی ہے۔

زیرِ نظر آیات میں سے پہلی میں قرآن کہتا ہے: کیا یہ لوگ خدا کے دین کے سوا کوئی اور چیز چاہتے ہیں، خدا کا دین تو قوانینِ الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں اور یہ بات کامل اور جامع صورت میں پیغمبر اسلامؐ کے دین میں موجود ہے لہٰذا وہ اگر دینِ حقیقی کی تلاش میں ہیں تو انہیں مسلمان ہو جانا چاہیے۔

اسلام تمام موجوداتِ عالم کا دین ہے

" وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ..... "

قرآن نے ایک مرتبہ پھر اسلام کو ایک زیادہ وسیع معنی میں پیش کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے: تمام آسمانوں اور زمین والے یا آسمان و زمین میں موجود تمام موجودات مسلمان ہیں اور وہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ طوعاً و کرھاً (اختیار سے یا جبر سے) کی تعبیر کا مطلب ہے کہ پروردگار کے فرمان کے سامنے سر جھکانا کبھی "اختیاری" اور "تشریعی قوانین" کے ذریعے ہوتا ہے اور کبھی "اجباری" اور "تکوینی قوانین" کے ذریعے۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ عالمِ ہستی میں خدا کے احکام دو طرح کے ہیں۔ اس کے فرامین کا ایک سلسلہ طبیعی قوانین اور ماوراء طبیعی کا ہے جو اس جہان کے مختلف موجودات پر حکومت کرتے ہیں اور وہ سب مجبور ہیں کہ ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں اور وہ لمحہ بھر کے لیے بھی ان قوانین سے روگردانی نہیں کر سکتے اور اگر خلاف ورزی کریں تو ہو سکتا ہے کہ بکھر اور نابود ہو جائیں۔ یہ فرمانِ خدا کے سامنے اسلام و تسلیم کی ایک قسم ہے۔ سورج کی شعاعیں دریاؤں پر پڑتی ہیں، پانی بخارات بن کر اٹھتا ہے، بادل کے ٹکڑے ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں، بارش کے قطرے آسمان سے گرتے ہیں، درخت ان سے نشوونما پاتے ہیں اور ان سے پھول کھلتے ہیں۔ یہ سب کے سب "مسلمان" ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک آفرینش و فطرت کے معین کردہ قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔

فرمانِ خدا کی دوسری قسم کا نام حکم تشریعی ہے یعنی وہ قوانین جو آسمانی شریعتوں اور انبیاءؑ کی تعلیمات میں موجود ہیں ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی وجہ سے "مسلمان" کہلانے کے اہل ہیں۔ البتہ ان قوانین سے روگردانی بھی قوانینِ فطرت سے روگردانی سے کم نہیں کیونکہ یہ بھی انحطاط اور پسماندگی یا نابودی کا سبب ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں لفظ "اَسْلَمَ" اسلام کے وسیع معنی میں ہے جس میں دونوں قسمیں شامل ہیں لہٰذا فرمایا گیا ہے کہ ایک گروہ اختیاری حالت میں سرِ تسلیم خم کرتا ہے یعنی "طَوْعًا" مثلاً مومنین اور دوسرا مجبوری کی حالت میں یعنی "کَرْهًا" مثلاً کافرین تکوینی قوانین کے لحاظ سے۔ اس بنا پر اگرچہ کفار کچھ احکامِ خدا کے سامنے اسلام قبول کرنے سے روگردانی کرتے ہیں لیکن بعض احکام قبول کیے بغیر انہیں کوئی چارہ نہیں، اس لیے خدا کے تمام قوانین اور دینِ حق کے سامنے وہ بالکل سرِ تسلیم خم کیوں نہیں کرتے۔[1]

---

[1] قابلِ توجہ ہے کہ زیرِ نظر آیت میں "طَوْعًا وَّکَرْهًا" کے الفاظ ذوی العقول کے بارے میں ہیں اور یہاں ان کا مفہوم سورہ فصلت کی آیہ ۱۱ میں آنے والے انہی الفاظ سے مختلف ہے وہاں ان کا تعلق صرف غیر ذوی العقول سے ہے۔ اس کے بارے میں متعلقہ آیت کے ذیل میں گفتگو کی جائے گی۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ہے جسے بہت سے مفسرین نے ذکر کیا ہے اور وہ مندرجہ بالا تفسیر کی نفی بھی نہیں کرتا۔ وہ یہ ہے کہ صاحب ایمان لوگ اطمینان کے عالم میں رضا و رغبت اور اختیار کے ساتھ خدا کی طرف جاتے ہیں اور بے ایمان لوگ صرف مصیبت، ابتلا اور سخت مشکلات کے وقت اس کی طرف بھاگتے ہیں اور اسے پکارتے ہیں جب کہ عام حالات میں اس کے لیے شرکاء کے قائل ہوتے ہیں لیکن ان سخت اور حساس لمحات میں اس کے علاوہ کسی کو پہچانتے ہیں نہ پکارتے ہیں۔

" وَاِلَیۡہِ یُرۡجَعُوۡنَ "

آیت کے گذشتہ حصے میں مبداء کی طرف متوجہ ہونے کے لیے گفتگو تھی، جو ایک فطری چیز ہے اور اب اس جملے میں معاد کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو اپنے مقام پر فطری ہے کیونکہ تمام اقوام و ملل موت کو تسلیم کرتی ہیں۔ اصل زیرِ غرض خلقت اور حکمتِ پروردگار کی طرف نظر رکھیں تو موت کا مطلب نابودی اور فنا ہرگز نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا مطلب ایک قسم کا تکامل و ارتقاء ہے اور یہ ایک زیادہ وسیع ماحول میں قدم رکھنے کا دوسرا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ خدا کی طرف بازگشت ہے۔

" قُلۡ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ .... "

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے پیغمبرؐ اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ جو کچھ پیغمبر اسلام پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان لانے کے علاوہ ان تمام آیات اور تعلیمات پر بھی عقیدہ رکھو جو گذشتہ انبیاء پر نازل ہوئیں اور کہو کہ ہم ان میں حقانیت اور خدا سے ارتباط کے لحاظ سے کسی قسم کے فرق کے قائل نہیں ہیں۔ ہم سب کو حقیقی طور پر (خدا کا نمائندہ) سمجھتے ہیں، سب خدا کے بھیجے ہوئے رہبر ہیں، سب مخلوق کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے ہیں اور ہم حکم خدا کے سامنے ہر لحاظ سے تسلیم ہیں۔ لہٰذا اس طرح سے ہم تفرقہ اندازی سے اپنا ہاتھ کھینچے ہوئے ہیں۔

سورہ بقرہ کی آیت ۱۳۶ زیر نظر آیت سے پوری مشابہت رکھتی ہے، اس میں کافی وضاحت کی جا چکی ہے[1]

" وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ "

لفظ "یَبۡتَغِ" "ابتغاء" کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے کوشش اور جستجو کرنا، یہ شائستہ اور ناشائستہ ہر موقع کے لیے استعمال ہوتا ہے یہاں یہ لفظ بحث کو نتیجہ پر پہنچانے کے لیے استعمال ہوا ہے اور وہ یہ کہ حقیقی دین اور آئین "اسلام" ہی ہے یعنی حکم خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو نسل، زبان، قومی تعصبات اور ایسی تمام چیزوں سے بالاتر ہے اور جو لوگ ایسی واقعیت کے علاوہ کسی چیز کو دین کے طور پر مان لیں وہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی، بلکہ اس کے بدلے انہیں سزا بھی دی جائے گی۔ " وَھُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ " —— یعنی وہ آخرت میں زیاں کاروں میں سے ہوگا، کیونکہ اس نے اپنے وجود کا سرمایہ غیر مناسب خرافات و تقلید، جاہلانہ تعصبات اور نسل پرستی کے عوض بیچ دیا ہے۔ مسلم ہے کہ ایسے معاملے میں وہ نقصان و زیاں ہی میں مبتلا ہوگا اور قیامت میں انسانی وجود کے سرمائے کے نقصان کا نتیجہ

[1] تفسیر نمونہ کی جلد اول کی طرف رجوع کیجئے۔

محرومیوں اور سزا و عذاب کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

انشاءاللہ سورۂ حجرات کی آیۃ ۱۴ کے ذیل میں "اسلام" اور "ایمان" کے درمیان فرق پر بحث کی جائے گی۔

۸۶۔ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۚ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ ۝

۸۷۔ أُولٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝

۸۸۔ خٰلِدِينَ فِيهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ۝

۸۹۔ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

ترجمہ

۸۶۔ خدا ان لوگوں کو کیونکر ہدایت کرے جو ایمان لانے، رسول کی حقانیت کی گواہی دینے اور ان کے لیے واضح نشانیاں آجانے کے بعد کفر کریں اور خدا ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔

۸۷۔ ان کا بدلا یہ ہے کہ ان پر اللہ، ملائکہ اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔

۸۸۔ وہ ہمیشہ اس لعنت (اور پھٹکار) میں (مبتلا) رہیں گے ان کے عذاب میں تخفیف

نہیں ہوگی اور انہیں مہلت نہیں دی جائے گی۔

۸۹۔ مگر وہ لوگ کہ جو بعد ازاں توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں (اور گذشتہ گناہوں کی تلافی کریں تاکہ ان کی توبہ قبول ہو) کیونکہ خدا بخشنے والا اور رحیم ہے۔

شانِ نزول

(مدینہ کے مسلمانوں میں سے) ایک انصاری حارث بن سوید تھا۔ اُس کے ہاتھوں ہذر بن زیاد نامی ایک بے گناہ قتل ہوگیا۔ وہ سزا کے خوف سے مرتد ہوگیا اور مکہ کی طرف بھاگ گیا۔ مکہ میں پہنچا تو اپنے کام سے سخت پشیمان ہوا اور سوچنے لگا اب کیا کروں۔ اُس نے سوچ سوچ کر فیصلہ کیا کہ ایک آدمی کو مدینہ میں اپنے رشتہ داروں کے پاس بھیجوں تاکہ وہ پیغبر اکرمؐ سے سوال کریں کہ کیا اُس کے لیے لوٹنے کا کوئی راستہ ہے یا نہیں۔

اِس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں جن میں چند خاص شرائط کے ساتھ اُس کی توبہ قبول ہونے کا تذکرہ ہے۔

حارث بن سوید پیغبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، دوبارہ اسلام لایا اور آخری عمر تک اسلام کا وفادار رہا۔

اُس کے پیروکاروں میں سے گیارہ افراد بھی اسلام سے پھر گئے تھے وہ اپنی حالت پر باقی رہے۔

تفسیر دُرِّ منثور اور بعض دوسری تفاسیر میں زیرِ نظر آیات کی کچھ اور شانِ نزول نقل کی گئی ہیں جو مذکورہ شانِ نزول سے زیادہ فرق نہیں رکھتیں۔

تفسیر

"كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ."

یہ آیات ان لوگوں کے بارے میں ہیں جنہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے اور پھر اس سے پھر گئے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اصطلاح میں "مُرتَد" کہتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے: ایسے لوگوں کی ہدایت کے لیے خدا مدد نہیں کرتا کیونکہ ان لوگوں نے واضح علامات کے ذریعے پیغبر کو پہچان لیا ہے اور اس کی رسالت کی گواہی دی ہے۔ یہ لوگ اسلام سے عدول کرکے اور اس سے پھر کر ظالم اور ستمگر بن گئے ہیں اور خدا ظالموں اور ستمگروں کی ہرگز ہدایت نہیں کرتا (وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ)۔

"أُولٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ."

اس آیت میں ایسے لوگوں کی سزا بیان کی گئی ہے جو پہچاننے کے بعد حق سے عدول کرتے ہیں اور وہ ہے پروردگار، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت۔

"لعن" اصل میں دھتکارنے اور غیظ و غضب کے ساتھ دور کرنے کے معنی میں ہے۔ لہٰذا پروردگار کی لعنت کا مطلب اس کی رحمت سے دوری ہے۔ باقی رہا فرشتوں اور لوگوں کی لعنت تو وہ غصہ، تنفر اور معنوی طور پر ہے یا پروردگار کی رحمت سے دور ہونے کی بددعا ہے۔

ایسے لوگ درحقیقت فساد اور گناہ میں اس طرح سے ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں کہ تمام عقلمندوں اور سارے جہان کے بامقصد افراد چاہے انسان ہوں یا فرشتے سب کے تنفر کا ہدف بن جاتے ہیں۔

"خٰلِدِیْنَ فِیْهَا لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ."

اس آیت میں مزید ارشاد ہوتا ہے کہ یہ لوگ صرف عمومی لعنت کا مرکز نہیں ہیں بلکہ ہمیشہ لعنت کا شکار رہیں گے۔ درحقیقت شیطان کی طرح ہیں جو ہمیشہ لعنت میں گرفتار رہتا ہے۔ مسلّم ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ دردناک اور ناقابل تخفیف عذاب میں مبتلا ہوں گے اور انہیں کسی قسم کی مہلت نہیں دی جائے گی۔

"اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ."

یہ آیت مندرجہ بالا احکام میں استثنائی صورت بیان کرتی ہے۔ اس آیت نے ایسے افراد کے لوٹ آنے کی راہ کھول دی ہے لیکن بہت سی دیگر آیات قرآن کی طرح مسئلہ توبہ کی طرف اشارہ کرنے کے بعد گذشتہ غلط کاریوں کی تلافی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ "وَاَصْلَحُوْا" کے ذریعے یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ توبہ صرف گذشتہ گناہ پر پشیمانی اور آئندہ اپنے نیک اعمال کے ذریعے گذشتہ بُرے اعمال کی تلافی کی جائے۔ اسی لیے بعض آیات میں توبہ کے بعد ایمان اور عمل صالح کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ مثلاً:

"لِمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا." طٰہٰ : ۸۲

یعنی وہ شخص جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور عمل صالح انجام دے۔ ورنہ اس کی توبہ کامل و مکمل نہیں ہے۔

ایسے ہی افراد بخشش اور رحمتِ خدا کے حق دار ہوں گے "فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ."

کیا مرتد کی توبہ قبول ہو جاتی ہے

مندرجہ بالا آیت اور شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اسلام قبول کرکے اس سے پلٹ جائیں وہ دو قسم کے ہیں:

"مُرتدِ فطری"

"مُرتدِ مِلّی"

فطری مرتد وہ ہے جو مسلمان باپ یا ماں سے پیدا ہو یا بعض کے بقول جب اس کا نطفہ ٹھہرے تو اس کا باپ یا ماں مسلمان ہوں۔ پھر وہ اسلام قبول کرے اور اس کے بعد اس سے پلٹ جائے۔

ملّی مرتد وہ ہے جو کافر ماں باپ سے پیدا ہو اور مسلمان ہو کر پھر کافر ہو جائے۔

مرتد ملّی کو توبہ قبول ہو جاتی ہے اور حقیقت میں اس کی سزا کم ہے کیونکہ وہ مسلمان سے پیدا نہیں ہوا لیکن مرتد فطری کے بارے میں اس سے سخت حکم ہے اگرچہ وہ توبہ کرے اور یہ توبہ بارگاہِ الٰہی میں قابلِ قبول بھی ہو لیکن اگر اس کی یہ کیفیت اسلامی عدالت میں ثابت ہو جائے تو اس کے قتل کا حکم دیا جائے گا اور اس کا مال میراث کے طور پر اس کے مسلمان وارثوں کو مل جائے گا اور اس کی بیوی اس سے الگ ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ اس کی توبہ بھی ایسے احکام کو نہیں ٹال سکتی۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ سختی صرف "مُرتدِ فطری" کے لیے ہے۔ وہ بھی اگر مرد ہو۔

ہو سکتا ہے کچھ لوگ اس سختی پر تعجب کریں اور اسے روحِ اسلام کے منافی ناقابلِ انعطاف سختی قرار دیں لیکن درحقیقت اس حکم کا ایک بنیادی سے فلسفہ ہے اور وہ ہے اسلامی حکومت کے اندرونی اور داخلی محاذ کی حفاظت اور اسے پراگندگی اور اغیار و منافقین کے اثرات سے بچانا کیونکہ مرتد ہونا دراصل اسلامی سلطنت کی طرزِ زندگی کے خلاف ایک قسم کا قیام ہے۔ آج کی دنیا کے بہت سے قوانین میں بھی اس کی سزا قتل ہے۔ اگر لوگوں کو اجازت دے دی جائے کہ جب جی چاہے خود کو مسلمان ظاہر کریں اور جب ان کا جی چاہے اس سے استعفیٰ دے دیں تو بہت جلد اسلام کا داخلی محاذ کھوکھلا ہو جائے گا۔ یوں دشمنوں اور ان کے ناپاک عوامل کے لیے نفوذ کی راہ کھل جائے گی اور سارا اسلامی معاشرہ ہرج مرج اور فتنہ فساد کا شکار ہو جائے گا۔ اس بنا پر مذکورہ حکم حقیقت میں ایک سیاسی حکم ہے جو اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرے کی حفاظت کے لیے ضروری تھے اور اغیار کے ہاتھوں اور ان کے عوامل سے بچاؤ کے لیے ناگزیر ہے۔

علاوہ ازیں جو شخص اسلام جیسے دین کو تحقیق کرنے اور قبول کر لینے کے بعد چھوڑ دے اور کسی دوسرے دین کی طرف چلا جائے تو عموماً اس کا صحیح اور قابلِ توجیہ سبب نہیں ہو سکتا لہٰذا ایسا شخص سخت سزا کا مستحق ہے اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں عورتوں کے لیے نسبتاً نرم حکم ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے بارے میں تمام سزاؤں میں تخفیف موجود ہے۔

۹۰۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ۝

ترجمہ

۹۰۔ جو لوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے ہیں اور پھر (اپنے) کفر میں بڑھ گئے ہیں (اور اس راہ میں اصرار کرتے ہیں) تو ان کی توبہ کبھی بھی (جو مجبوری کی بناء پر ہو یا مرتے وقت کی جائے) قبول نہیں ہوگی اور وہ (واقعاً) گمراہ ہیں (اور وہ خدا کی راہ بھی کھو چکے ہیں اور توبہ کی بھی)۔

شانِ نزول

جیسا کہ سابقہ آیات کی شانِ نزول میں اشارہ ہوا ہے حارث بن سوید اور اس کے گیارہ ساتھی بوجوہ اسلام سے پلٹ گئے تھے۔ حارث تو پشیمان ہوا اور توبہ کر کے پیغمبرِ اسلامؐ کی خدمت میں واپس آ گیا لیکن دوسرے افراد اس کے ساتھ لوٹ کر نہ آئے اور اس کی دعوت کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہم مکہ میں رہیں گے اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف کام کرتے رہیں گے اور ہمیں امید ہے کہ انہیں شکست ہوگی۔ اگر ہمارا مقصد پورا ہو گیا تو کیا ہی اچھا ہے۔ ورنہ توبہ کا راستہ تو کھلا ہی ہے، جب چاہیں گے توبہ کر لیں گے اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف پلٹ آئیں گے اور وہ بھی ہماری توبہ قبول کر لیں گے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی ایک اور شانِ نزول نقل کی ہے۔ اس کے مطابق مذکورہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو پیغمبرِ اسلامؐ کے ظہور سے قبل لوگوں کو آپؐ کے ظہور کی بشارت دیتے تھے اور آپؐ سے ایمان اور وفاداری کا اظہار کرتے تھے لیکن بعثت کے بعد نہ صرف یہ کہ وہ کافر ہو گئے بلکہ آپؐ کے مقابلے پر اکڑ بیٹھے۔

تفسیر

بے فائدہ توبہ

"اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ۔"

گذشتہ آیات میں ان لوگوں کے بارے میں گفتگو تھی جو واقعاً اپنے انحرافی راستے اور کج روی پر پشیمان ہو گئے تھے اور انہوں نے حقیقتاً توبہ کر لی تھی لیکن اس آیت میں ایسے اشخاص کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے جن کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو پہلے مرحلہ پر ایمان لائے، پھر کافر ہو گئے اور اپنے کفر پر ڈٹ گئے اور اس پر مُصر ہیں اس لیے کسی وقت بھی احکامِ حق کی پیروی کے لیے تیار نہیں ہیں مگر یہ کہ

معاملہ اُن کے لیے مشکل ہو جانے اور اطاعت و تسلیم کے علاوہ انہیں کوئی راستہ نظر نہ آئے ۔ خدا ایسے افراد کی توبہ قبول نہیں کرے گا کیونکہ وہ اختیاری طور پر راہِ حق پر قدم نہیں رکھتے بلکہ جب وہ اہل حق کا غلبہ دیکھتے ہیں تو ظاہراً پشیمان ہو کر توبہ کا اظہار کرتے ہیں اِس بنا و اُن کو توبہ ظاہری ہے جو قبول نہیں ہوگی۔

آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ ایسے افراد جب اپنے آپ کو موت کی چوکھٹ پر دیکھتے ہیں اور عمر کے آخری ایام میں ہوتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ پشیمان ہوں اور واقعاً توبہ کرلیں لیکن پھر بھی ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ جیسا کہ ہم بعد میں بتائیں گے ایسے اوقات میں توبہ کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ مندرجہ بالا آیت سے یہ مراد ہو کہ کفر کی حالت میں عام گناہوں سے توبہ کرنا قابل قبول نہیں ہے ۔یعنی اگر کوئی شخص راہ کفر پر اصرار کرتا ہے لیکن ظلم اور غیبت وغیرہ جیسے گناہوں سے توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ گہری اور شدید آلودگیوں کے ہوتے ہوئے سطحی آلودگیوں کو دھو ڈالنا مؤثر نہیں ہے۔

یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ مندرجہ بالا تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ممکن ہے کہ آیت کی نظر ان سب پر ہو ۔ اگرچہ پہلا احتمال گذشتہ آیات اور شانِ نزول کے حوالے سے زیادہ سازگار ہے ۔

" وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ":

وہ حقیقی گمراہ ہیں کیونکہ وہ راہِ خدا اور راہِ ایمان کی طرح توبہ کا راستہ بھی کھو چکے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ حقیقی آمادگی ، اخلاص اور بر موقع قلب و روح کی پاکیزگی کے بغیر توبہ کی حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں ۔ حالانکہ معاملہ اس طرح نہیں ہے ۔

۹۱۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۟

ترجمہ

۹۱۔ جو لوگ کافر ہو گئے ہیں اور حالتِ کفر میں مر گئے ہیں زمین اگر سونے سے پُر ہو اور وہ اسے (اپنے گناہوں کے کفارے کے طور پر) فدیہ کردیں تو بھی ان سے یہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی یاور و مددگار نہیں ۔

تفسیر

فضول کفارہ

"اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِھِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَھَبًا وَّلَوِ افْتَدٰی بِہٖ ۔"

یہ آیت ایسے افراد کے بارے میں ہے جنہوں نے حالت کفر میں زندگی گزاری ہے اور اسی حالت میں دنیا سے چلے گئے ہیں۔ قرآن کہتا ہے: جو لوگ راہ حق واضح ہو جانے کے باوجود طغیان و سرکشی کا راستہ اختیار کیے رہے ہیں اور حقیقتاً سر تسلیم خم نہیں کرتے ان کی بخششیں اور عطیات قابل قبول نہیں ہوں گے اور ان کے لیے راہ نجات نہیں ہے اگرچہ وہ تمام زمین کو سونے سے پُر کرکے راہ خدا میں خرچ کر دیں۔

واضح ہے کہ اتنا ڈھیر سارا سونا خرچ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان کی بخشش کتنی بھی زیادہ کیوں نہ ہو قلب و روح کی آلودگی اور حق سے دشمنی کے ہوتے ہوئے ان کے لیے مؤثر نہیں ہے ورنہ واضح ہے کہ اگر ساری زمین سونے سے پُر ہو جائے تو سونے کی قدر و قیمت مٹی کے برابر ہو جائے گی اس بناء پر مندرجہ بالا جملہ اس معاملے کی اہمیت ثابت کرنے کے لیے ہے۔

اس بارے میں کہ اس انفاق اور خرچ کرنے سے مراد اس جہان میں انفاق کرنا ہے یا دوسرے جہان میں۔ تو اکثر مفسرین نے دونوں احتمالات ذکر کیے ہیں لیکن آیت کا ظہور دوسرے جہان سے ربط رکھتا ہے یعنی حالت کفر میں مر جانے کے بعد اگر فرض کریں کہ زمین کی بہت بڑی دولت و ثروت ان کے اختیار میں ہو اور وہ خیال کریں کہ اس جہان کی طرح اس سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو سزا سے بچا لیں گے تو یہ ان کا بہت بڑا اشتباہ ہوگا اور یہ مالی جرمانہ اور فدیہ ان کی سزا کی کیفیت پر کسی قسم کا کوئی اثر نہیں ڈال سکے گا۔

"اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وَّمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ:"

ان کے لیے دردناک عذاب یقینی ہے اور اس عظیم سزا سے بچانے کے لیے انہیں کوئی حامی و مددگار نہیں مل سکے گا اور شفاعت کرنے والوں کی شفاعت بھی انہیں میسر نہ ہوگی۔

تفسیر نمونہ قرآن مجید کے تیسرے پارے کی تفسیر یہاں پر ختم ہوتی ہے

کی دوسری جلد کا ترجمہ رات گیارہ بج کر دس منٹ پر ۷ ربیع الثانی ۱۴۰۳ ہجری ۲۲ جنوری ۱۹۸۳ء کو الحاج سیٹھ نوازش علی کے مکان ۸۱۔ اسی ماڈل ٹاؤن لاہور میں اختتام پذیر ہوا۔

سید صفدر حسین نجفی ولد سید غلام سرور نقوی مرحوم

۹۲ لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ۬ؕ وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ ○

ترجمہ

۹۲۔ تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہوگا۔

تفسیر

ایمان کی ایک نشانی

لن تنالوا البر حتّٰی تنفقوا مما تحبون لفظ "بر" عربی زبان میں وسعت کا ہم معنی ہے اسی لیے وسیع صحرا کو "بَر" (با کی فتح کے ساتھ) کہا جاتا ہے اور اسی مناسبت سے ان نیک کاموں کو بِر (با کی زیر کے ساتھ) کہتے ہیں جن کا ثمرہ و نتیجہ عام اور وسیع ہو اور دوسروں تک پہنچے "بِر" اور "خیر" کے درمیان لغت عرب کے لحاظ سے یہ فرق ہے کہ "بِر" وہ نیک کام ہوتا ہے جو توجہ اور قصد و اختیار کے ساتھ ہو لیکن "خیر" ہر قسم کی نیکی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ خواہ وہ کسی توجہ اور التفات کے بغیر کی گئی ہو۔

مندرجہ بالا آیت میں فرمایا گیا ہے تم لوگ اس وقت تک "بِر" اور نیکی کی حقیقت کو نہیں پا سکتے جب تک اس چیز میں سے راہ خدا میں خرچ نہ کرو جس سے تم محبت کرتے ہو۔

اس آیت میں لفظ "بِر" کے متعلق مفسرین حضرات نے تفصیلی گفتگو کی ہے بعض نے اس کا معنیٰ بہشت بتایا ہے اور بعض کے نزدیک یہ تقویٰ اور پرہیزگاری کا ہم معنیٰ ہے جب کہ ایک گروہ مفسرین نے اس سے نیک جزا مراد لی ہے۔ لیکن قرآنی آیات سے جو مفہوم ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بر ایک وسیع معنی میں ہے جس میں تمام نیکیاں خواہ ایمان ہو یا پاک عمل شامل ہیں، جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۷ سے معلوم ہوتا ہے:

لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡہَکُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ وَ لٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ وَ الۡکِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ ۚ وَ اٰتَی الۡمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنَ وَ ابۡنَ السَّبِیۡلِ ۙ وَ السَّآئِلِیۡنَ وَ فِی الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ ۚ وَ الۡمُوۡفُوۡنَ بِعَہۡدِہِمۡ اِذَا عٰہَدُوۡا ۚ وَ الصّٰبِرِیۡنَ فِی الۡبَاۡسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِیۡنَ الۡبَاۡسِ ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا ؕ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ

یعنی — نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق و مغرب کی طرف پھیر لو۔ نیک لوگ تو وہ ہیں جو اللہ، یوم آخرت، ملائکہ، کتاب اور انبیاء پر ایمان لائے اور انہوں نے اس کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں اور فقیروں کو (اپنا) مال دیا اور اسی طرح مسافروں کے لیے، سوال کرنے والوں کے لیے اور غلاموں کو آزاد کروانے کے لیے اپنا مال خرچ کیا، نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی اور جب وہ عہد کرتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں اور وہ فقر، بیماری اور جنگ

میں صبر کرنے والے ہیں۔ یہی لوگ راستباز اور پرہیزگار ہیں۔

مذکورہ بالا آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پروردگار عالم، روز جزاء اور انبیاء و مرسلین پر ایمان لانا، حاجتمندوں کی مدد کرنا، نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، عہد پورا کرنا اور مشکلات و حوادث کا استقامت اور پامردی سے مقابلہ کرنا یہ سب نیکی کے شعبے شمار ہوتے ہیں۔

بنابراین حقیقی نیک لوگوں کا مقام حاصل کرنے کے لیے بہت سی شرائط ہیں ان میں سے ایک شرط ان اموال میں سے راہ خدا میں خرچ کرنا ہے جن سے انسان کا دل بندھا ہو کیونکہ خدا کے ساتھ حقیقی عشق و محبت اور اصول انسانیت و اخلاق کا احترام اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب انسان ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہو جہاں ایک طرف مال و ثروت یا مقام و منصب ہو جو کہ انسان کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور اس کے مقابلے میں دوسری طرف خدا حقیقت و انسانی ہمدردی اور نیکوکاری ہو۔ اگر اس نے پہلی جانب سے صرف نظر کرتے ہوئے دوسری جانب کو اختیار کیا تو اس سے اس کے عشق اور لگاؤ کا علم ہو سکتا ہے۔

آیات قرآنی کا مسلمانوں کے دلوں پر اثر

قرآن کریم کی آیات کا مسلمانوں کے دلوں پر اتنا گہرا اثر ہوتا تھا کہ آیات کے نازل ہوتے ہی ان کے اثرات ظاہر ہو جاتے تھے۔

اسی ضمن میں مذکورہ آیت کے متعلق تواریخ اور اسلامی تفسیروں میں یہ واقعات لکھے گئے ہیں:

۱۔ ایک صحابی رسول ابوطلحہ انصاری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مدینہ منورہ میں اس کا کھجوروں کا ایک بہت ہی صاف ستھرا اور خوبصورت باغ تھا پورے مدینہ میں اس کا چرچا تھا۔ اس باغ میں صاف و شفاف پانی کا ایک چشمہ بھی تھا۔ جس وقت پیغمبر اکرمؐ اس باغ میں تشریف لاتے تو وہ پانی نوش فرماتے اور اس سے چلو بھرتے۔ ان تمام خصوصیات کے علاوہ ابوطلحہ اس سے بہت زیادہ آمدنی حاصل کرتا تھا۔

آیت بر کے نزول کے بعد وہ آنحضرتؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ میرے اموال میں سے میرے نزدیک زیادہ محبوب صرف یہی باغ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے راہ خدا میں خرچ کر دوں تاکہ یہ میرے لیے توشۂ آخرت بنے۔ یہ سن کر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

بَخٍ بَخٍ ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ لَكَ ۔

آفرین، آفرین تجھ پر، یہ ایسی ثروت ہے کہ جو تیرے لیے نفع مند ہوگی۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا میرا مشورہ ہے کہ اسے اپنے رشتہ داروں کو دے دو۔ ابوطلحہ نے آپؐ کے حکم کی تعمیل کی اور اسے اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر دیا۔[1]

۲۔ ایک دن ابوذر کے ہاں ایک مہمان آیا۔ ابوذر انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ انہوں نے مہمان سے معذرت طلب کی کہ میں اپنی مشغولیت کی وجہ سے خود تیری پذیرائی نہیں کر سکتا میرے چند اونٹ فلاں مقام پر موجود ہیں زحمت کر کے ان میں سے ایک بہترین اونٹ لے آؤ (تاکہ اسے تمہارے لیے نحر کر دوں)۔ وہ ایک کمزور اونٹ لے آیا۔ جناب ابوذر نے اس سے کہا کہ تو نے میرے ساتھ خیانت کی، یہ اونٹ کس لیے لے کر آئے ہو؟ اس نے جواب دیا میں نے یہ سوچا کہ دوسرے اونٹوں کی کبھی آپ کو ضرورت پڑے گی۔ تو ابوذر نے کہا کہ مجھے

---

[1] مجمع البیان، صحیح مسلم و بخاری۔

ان کی اس وقت کے لیے ضرورت ہے جب میری آنکھیں اس جہان فانی سے بند ہوں گی (کیا ہی اچھا ہے کہ اس دن کے لیے سامان کرلوں)۔

خدا فرماتا ہے کہ:

لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون

۳ ہارون رشید کی زوجہ زبیدہ کے پاس قرآن مجید کا ایک بہترین قیمتی نسخہ تھا جو زر و جواہرات سے مزین و مرصع تھا اور وہ اس کو بہت پسند کرتی تھی۔ ایک روز وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے جب آیۂ لن تنالوا البر پر پہنچی تو آیت پڑھتے ہی وہ فکر و حیرت میں پڑ گئی اور اپنے دل میں خیال کرنے لگی کہ اس قرآن مجید سے میرے نزدیک کوئی چیز بہتر نہیں ہے لہٰذا اسے راہ خدا میں خرچ کرنا چاہیے اس نے جوہریوں کو بلوا کر اس کی زیب و زینت کی چیزیں، وہ جواہرات فروخت کر دیئے اور ان کی قیمت سے حجاز کے بیابانوں میں بادیہ نشینوں کے لیے پانی مہیا کیا۔

کہا جاتا ہے کہ آج بھی ان میں سے کچھ کنوئیں موجود ہیں اور اسی کے نام سے منسوب ہیں۔

۹۳ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

۹۴ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○

۹۵ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۗ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○

ترجمہ

۹۳ تمام (پاک) غذائیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں سوائے ان کے جنہیں اسرائیل (یعقوب) نے تورات کے نزول سے پہلے اپنے لیے حرام قرار دیا تھا (مثال کے طور پر اونٹ کا گوشت جو ان کے لیے ضرر رساں تھا) ان سے کہو اگر تم (اپنے اعتراض میں) سچے ہو تو لاؤ تورات اور اسے پڑھو (یہ غلط باتیں جو تم گذشتہ انبیاء کی طرف منسوب کرتے ہو تمہاری تحریف شدہ تورات میں بھی نہیں ہیں)۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۲، صفحہ ۴۷۴۔

۹۴ اس کے بعد بھی جو لوگ اپنی گھڑی ہوئی جھوٹی باتیں خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں (اور وہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں) وہی درحقیقت ظالم ہیں۔

۹۵ کہہ دو، اللہ نے سچ فرمایا (اور یہ ابراہیم کے پاک دین میں نہیں تھا) لہٰذا تم یکسو ہو کر ابراہیم کے آئین کی پیروی کرو جو حق پسند تھے اور یقیناً ابراہیم شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔

شانِ نزول

مفسرین کے اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودیوں نے پیغمبر اکرمؐ پر خصوصیت کے ساتھ دو اعتراض کیئے تھے:

۱ پیغمبر اسلامؐ نے اونٹ کے گوشت اور دودھ کو حرام کیوں قرار نہیں دیا جبکہ یہ نہ صرف ابراہیمؑ بلکہ حضرت نوحؑ کے دین میں بھی حرام تھے اور ان کی پیروی کرتے ہوئے یہودی بھی اسے حرام سمجھتے تھے۔

۲ رسول اسلامؐ کیونکر گذشتہ انبیاء خصوصاً حضرت ابراہیمؑ کے وفادار ہو سکتے ہیں حالانکہ تمام پیغمبر بیت المقدس کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کی طرف نماز پڑھتے تھے۔ لیکن نبی مرتبت نے اس کی بجائے کعبہ کو قبلہ بنایا۔

مندرجہ بالا آیات میں ان کی پہلی بات کا جواب دیا گیا ہے اور آئندہ آیات ان کے دوسرے اعتراض کا جواب دیں گی۔

تفسیر

کل الطعام کان حلا لبنی اسرائیل الا ما حرم اسرائیل علی نفسہ من قبل ان تنزل التوراۃ

مندرجہ بالا آیت مکمل وضاحت کے ساتھ یہودیوں کے ان خیالات کو رد کرتی ہے جو وہ کھانے کی پاک اور حلال اشیاء (مثلاً اونٹ کا دودھ اور گوشت) کے متعلق رکھتے تھے۔

یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ابتداء میں یہ تمام اشیاء بنی اسرائیل کے لیے حلال و جائز تھیں سوائے اُن اشیاء کے جن کو اسرائیل (یہ حضرت یعقوبؑ کا دوسرا نام تھا) نے اپنے اُوپر حرام قرار دی تھیں۔ اس آیت میں اس بات کی نشاندہی نہیں کی گئی کہ حضرت یعقوبؑ نے کونسی غذا کس سبب سے حرام قرار دی تھی لیکن روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت یعقوبؑ اونٹ کا گوشت کھاتے تو آپ پر مرض النساء[1] کا شدید حملہ ہوتا۔ لہٰذا انہوں نے اس غذا سے ہمیشہ کے لیے اجتناب کرنے کا ارادہ کر لیا اور آپ کی اتباع میں آپ کے پیروکاروں نے بھی اس سے اجتناب کیا اور یہ بات ان کے اذہان میں پختہ ہو گئی لہٰذا انہوں نے اسے حرام سمجھا اور اسے ایک دینی حکم کی طرح خدا کی طرف منسوب کیا۔ قرآن کریم کی مذکورہ آیت نے اُن کے اس خیال کو غلط قرار دیا اور یہ واضح کیا کہ یہ صرف اُن کی تہمت ہے۔

---

[1] مرض النساء ایک اعصابی مرض ہے اس کی وجہ سے کمر اور پاؤں کے اعصاب میں تکلیف ہوتی ہے جس سے بعض اوقات انسان چل پھر نہیں سکتا۔

اس آیت کے دوسرے حصہ " من قبل ان تنزل التوراۃ " سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ تورات سے پہلے کوئی پاکیزہ غذا بنی اسرائیل پر حرام نہ تھی۔ البتہ تورات کے نازل ہونے اور حضرت موسیٰؑ کی آمد کے بعد یہودیوں کے ظلم و ستم کے نتیجہ میں کچھ پاک چیزیں اُن پر حرام کر دی گئیں۔

قل فأتوا بالتوراۃ فاتلوها ان کنتم صٰدقین

اس جملے میں خداوند عالم نے اپنے نبیؐ کو حکم دیا ہے کہ وہ یہودیوں کو دعوت دیں کہ وہ اسی موجودہ تورات کو لے آئیں اور اسے کھول کر پڑھیں تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ ان اشیاء کی حرمت کے بارے میں ان کا دعویٰ غلط ہے۔ لیکن وہ اس بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اس لیے کہ انہیں یقین تھا کہ تورات میں اس قسم کی کوئی بات موجود نہیں ہے اور یہ صرف ان کی تہمت ہے۔

فمن افتریٰ علی اللہ الکذب من بعد ذٰلک فاولٰئک هم الظالمون

جب وہ لوگ تورات کو لانے پر آمادہ نہ ہوئے اور خدا پر ان کا بہتان باندھنا مسلّم ہو گیا تو اس آیت میں انہیں خبردار کیا گیا کہ جو لوگ خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ ظالم و ستمگر ہیں۔ ایک طرف وہ اپنے آپ کو خدائی سزا اور عذاب میں گرفتار کر کے اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ جھوٹ اور مکر و فریب سے اور لوگوں کو بھی سیدھی راہ سے بھٹکا کر دوسروں پر ظلم کرتے ہیں۔

موجودہ تورات اور گوشت کی حرمت

موجودہ تورات سفر " لاویان " گیارھویں فصل میں حلال و حرام گوشت کے بارے میں اس طرح کا حکم موجود ہے:

جگالی کرنے والے اور پھٹے ہوئے سُم والے جانوروں کو نہ کھاؤ اور اونٹ باوجود یہ کہ وہ جگالی کرتا ہے مگر اس کا سُم پھٹا ہوا نہیں ہے، وہ تمہارے لیے حرام ہے۔

مذکورہ جملوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہودی اونٹ کا گوشت اور باقی پھٹے ہوئے سُم والے جانوروں کو حرام جانتے تھے۔ لیکن دین ابراہیمؑ اور نوحؑ میں ان کی حرمت پر کسی قسم کی دلیل نہیں ملتی۔ ممکن ہے یہ چیزیں اُن غذاؤں میں سے ہوں جو یہودیوں پر سزا کے طور پر حرام کی گئی ہوں۔

قل صدق اللہ فاتبعوا ملۃ ابراهیم حنیفا و ما کان من المشرکین۔

جب تم نے دیکھ لیا کہ میں اپنی دعوت میں سچا اور راست گو ہوں تو تم میرے دین کی پیروی کرو جو کہ ابراہیمؑ کا پاک اور بے آلائش دین ہے۔ کیونکہ وہ حنیف تھا یعنی باطل ادیان کو چھوڑ کر حق کی طرف مائل تھا اور اس کے احکام میں پاک غذاؤں کے متعلق ایک حکم بھی انحرافی اور بے دلیل نہیں تھا اور وہ ہرگز مشرکین میں سے نہیں تھا اور یہ جو مشرکین عرب اپنے آپ کو دین ابراہیمؑ کا پیرو سمجھتے ہیں بالکل لغو اور بے معنیٰ ہے۔ بُت پرست کہاں اور بُت شکن کہاں۔

توجہ طلب امر یہ ہے کہ قرآن میں متعدد مقامات پر اس جملہ کو دہرایا گیا ہے کہ ابراہیمؑ مشرکین میں سے نہیں تھے۔ کیونکہ پہلے ہی اشارہ کیا گیا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے بُت پرست اپنے آپ کو دین ابراہیمؑ کا پیرو سمجھتے تھے اور وہ اس دعویٰ میں اتنے سخت تھے کہ دوسرے لوگ حنفاء (ابراہیم کے پیروکار) کے طور پر ان کا تعارف کراتے تھے۔ اس لیے قرآن بار بار اس بات کی نفی کرتا ہے۔

۹۶ إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ۝

۹۷ فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ ۖ وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا ۗ وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ۝

ترجمہ

۹۶ پہلا گھر جو لوگوں (اور خدا سے تضرع وخضوع) کے لیے مقرر کیا گیا ہے وہ سرزمین مکہ میں ہے جو بابرکت ہے اور دنیا کے لیے ہدایت و رہبری کا سبب ہے۔

۹۷ اس میں واضح و آشکار نشانیاں ہیں۔ ان میں سے مقام ابراہیم ہے اور جو شخص اس میں داخل ہو وہ امان میں ہے اور جو لوگ اس کی طرف جانے کی قدرت رکھتے ہیں ان پر واجب ہے کہ وہ خدا کے لیے (اس کے) گھر کی زیارت کریں اور جو کوئی کفر کرے۔ (حج ترک کرے۔ اس نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا)، تو پھر، خدا تو تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

تفسیر

لوگوں کے لیے پہلا گھر

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا۔

جیسا کہ گذشتہ آیات کے ضمن میں کہا جا چکا ہے کہ یہودیوں کو پیغمبر اسلامؐ پر دو اعتراض تھے جن میں سے پہلے کا جواب اُن آیات میں دیا گیا ہے۔ دوسرا اعتراض اُن کو یہ تھا کہ بیت المقدس کو خانہ کعبہ پر برتری حاصل ہے۔ اس کا جواب مندرجہ بالا آیات میں دیا جا رہا ہے۔ آیت بتلا رہی ہے کہ اگر کعبہ کو مسلمانوں کے قبلہ کی حیثیت سے منتخب کیا گیا ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے جبکہ روئے زمین پر وجود میں آنے والا یہ خدا کا پہلا گھر اور سب سے پہلی عبادت گاہ ہے۔ اس سے قبل دعا اور پروردگار عالم کی عبادت کا کوئی مرکز نہیں تھا۔ صرف یہی ایسا گھر ہے جو انسانی معاشرہ کے لیے ایسے نقطہ پر وجود میں لایا گیا ہے جو اجتماعیت کا مرکز ہے اور پُر برکت مقام ہے۔

اسلامی تاریخ کے مصادر بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ خانہ کعبہ حضرت آدمؑ کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے۔ جب طوفان نوحؑ

میں اسے کچھ نقصان پہنچا تو حضرت ابراہیمؑ نے اسے از سر نو تعمیر کیا۔ بنا بریں قبلہ کی حیثیت سے اس پہلے خانۂ توحید کا انتخاب دوسرے ہر مقام سے زیادہ مناسب ہے۔ البتہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں خانہ کعبہ جس کا دوسرا نام بیت اللہ ہے کا تعارف لوگوں کے گھر کے طور پر کرایا گیا ہے۔ اس تعبیر سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ جو کچھ خدا کے نام پر ہے اور اس کے لیے ہے اسے لوگوں اور اُن کے بندوں کی خدمت کے لیے استعمال کرنا چاہیے اور جو کچھ بندگانِ خدا کی خدمت کے لیے ہے وہ خدا کے لیے ہے۔

اس آیت سے ضمنی طور پر خدا کے اصلاحی پروگراموں میں سبقت کرنے کی اہمیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اسی لیے تو آیت بالا میں خانہ کعبہ کی پہلی فضیلت اس کا سب سے پہلا ہونے کو قرار دیا گیا ہے۔ یہیں سے حجر اسود کے احترام کے بارے میں ہونے والے اعتراض کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے کیونکہ ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس پتھر کے ٹکڑے کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے کہ سارا سال کئی لاکھ انسان اس کا بوسہ لینے اور اسے مس کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کام کو ایک تاکیدی مستحب کے طور پر کیوں خانہ کعبہ کی زیارت کے پروگرام میں شامل کیا گیا ؟ لیکن اس پتھر کی مختصر تاریخ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس میں ایک ایسی خصوصیت ہے جو پوری دنیا کے کسی پتھر میں پیدا نہیں ہو سکتی اور وہ یہ کہ یہ ایک انتہائی سابق ترین چیز ہے جو عمارتی مصالح کے طور مرکزِ عبادت میں نصب کی گئی ہے۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ صفحۂ ہستی کی تمام عبادت گاہوں یہاں تک کہ خانہ کعبہ کی بھی بار ہا از سر نو تعمیر ہوئی ہے اور جو مصالح ان کی تعمیر میں لگائے گئے وہ تبدیل ہو گئے صرف یہی پتھر کا ٹکڑا ہے جو ہزار ہا سالوں کے گذرنے کے باوجود ابھی تک اس قدیم ترین عبادت گاہ میں اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اس لیے دراصل اس کی اہمیت یہ ہو سکتی ہے کہ یہ خدا کی راہ میں اور لوگوں کی خدمت میں سب سے قدیم ہے۔

علاوہ ازیں یہ پتھر مختلف زمانوں کے مومنین کی بے شمار نسلوں کی ایک خاموش تاریخ ہے۔ یہ پتھر عظیم انبیاءؑ اور خدا کے خاص بندوں سے وابستگی کی یاد کو زندہ کرتا ہے جنہوں نے اس کے پاس کھڑے ہو کر خدا کی بارگاہ میں دعا اور تضرع و زاری کی ــــــ

اس مقام پر ایک اور قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ گذشتہ آیت یہ بتلا رہی ہے کہ یہ سب سے پہلا گھر ہے جو لوگوں کے لیے بنایا گیا۔ یہ واضح ہے کہ اس سے مقصود عبادت و پرستش کا پہلا گھر ہے۔ لہٰذا اس آیت سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ اس سے پہلے رہائش کے کچھ گھر زمین میں موجود ہوں اور یہ تعبیر ان لوگوں کا واضح جواب ہے جو (تفسیر المنار کے مؤلف کی طرح) یہ کہتے ہیں کہ خانہ کعبہ سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں بنا ہے اور وہ حضرت آدمؑ کے ہاتھ سے بننے کو ایک افسانہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ مسلّم ہے کہ ابراہیمؑ سے قبل بھی عبادت گاہ اور پرستش کی جگہ موجود تھی اور ان سے پہلے حضرت نوحؑ کی طرح دیگر انبیاء اس سے استفادہ کرتے تھے۔ اس بنا پر یہ کیسے ممکن ہے کہ خانہ کعبہ جو کہ دنیا کا سب سے پہلا عبادت خانہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں سب سے پہلے بنا ہو۔

بکّہ سے کیا مراد ہے ؟

"بکہ" اصل میں "بک" (بروزن "فک") کے مادہ سے اژدحام اور اجتماع کے معنی میں ہے اور خانہ کعبہ یا وہ زمین جس میں خانہ کعبہ موجود ہے اسے "بکہ" یہاں لوگوں کے اژدحام اور اجتماع کی وجہ سے کہا جاتا ہے یہ بھی بعید نہیں کہ پہلے اس کا یہ نام نہ ہو لیکن جب یہ عبادت کے لیے قائم ہو چکا ہو اسے یہ نام دیا گیا ہو۔ حضرت امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت میں منقول ہے کہ مکہ پورے شہر کا نام ہے اور بکہ اس مقام کو کہا جاتا ہے جہاں خانہ کعبہ بنا ہوا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ بکہ دراصل مکہ ہی ہے اور اس کی "میم" یہاں "باء" سے بدل گئی ہے جیسے "لازم" اور "لازب" دونوں عربی زبان میں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

خانہ کعبہ اور اس کی زمین کو بکہ کے ساتھ موسوم کرنے کے سلسلہ میں ایک اور وجہ بھی بیان کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اس لفظ کا معنی ہے نخوت و غرور کو دور کرنا۔ چونکہ اس عظیم مرکز میں ہر قسم کے امتیازات یکسر ختم ہو جاتے ہیں اور سرکش و مغرور لوگوں کو بھی یہاں عام لوگوں کی طرح تضرع و زاری کے لیے کھڑا ہونا چاہیے اس طرح ان کا تکبر و غرور ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لیے اس مقام کو بکہ کہا جاتا ہے۔

مسجد الحرام کی توسیع

پیغمبر اسلامؐ کے زمانے سے لے کر جس قدر مسلمان بڑھتے گئے تو فطری طور پر خانہ کعبہ کے زائرین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ لہٰذا حکام وقت کی طرف سے مسجد الحرام کی بھی توسیع ہوتی رہی۔

تفسیر عیاشی میں منقول ہے کہ عباسی خلیفہ منصور کے زمانے میں حجاج کی کثرت کی بنا پر پروگرام بنایا گیا کہ ایک بڑا سا مسجد الحرام کو وسیع کیا جائے۔ خلیفہ نے ان لوگوں کو بلایا جن کے گھر مسجد کے اردگرد تھے تاکہ ان کے گھر خرید لیے جائیں لیکن وہ کسی قیمت پر بھی انہیں بیچنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ منصور بڑی مشکل میں گرفتار ہوا کیونکہ ایک طرف وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ طاقت کے زور سے ان کے گھر خراب کرے کیونکہ اس کا اچھا اثر نہ ہوتا اور دوسری طرف وہ لوگ اپنے گھر دینے کے لیے تیار بھی نہ تھے۔ اس سلسلے میں اس نے حضرت امام صادقؑ سے استفسار کیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ اس بارے میں چنداں فکر کی ضرورت نہیں اس ضمن میں واضح دلیل موجود ہے جس سے تم استدلال کر سکتے ہو۔ اس نے پوچھا وہ کونسی دلیل ہے۔ فرمایا کلام خدا۔ پوچھنے لگا کلام الٰہی میں کہاں سے استدلال لایا جا سکتا ہے؟ آپؑ نے فرمایا کہ آیت "ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا" سے استدلال کیا جا سکتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہ خانہ کعبہ ہے۔ اس لیے اگر خانہ کعبہ سے پہلے ان کے گھر یہاں موجود ہوتے تو خانہ کعبہ کے اطراف ان کی ملکیت میں ہوتے لیکن اگر خانہ کعبہ ان سے پہلے ہے تو یہ حریم (جہاں تک خانہ کعبہ کے زائرین کی ضرورت ہے) کعبہ سے تعلق رکھتا ہے۔ منصور نے ان لوگوں کو بلا کر ان کے سامنے اسی انداز سے استدلال کیا وہ یہ سن کر لاجواب ہو گئے اور کہنے لگے جس طرح آپ کی مرضی ہو ہم آپ کی موافقت کریں گے۔

اسی تفسیر میں یہ بھی منقول ہے کہ اس قسم کا واقعہ مہدی عباسی کے دور میں پیش آیا۔ اس نے اس دور کے فقہاء سے جب پوچھا تو سب نے کہا کہ اگر گھروں کے مالک اس پر راضی نہ ہوں تو غصب شدہ جگہ کو مسجد الحرام میں داخل کرنا مناسب نہیں۔ علی ابن یقطین نے اس مسئلہ کو حضرت امام موسیٰ بن جعفرؑ سے حل کرانے کے لیے اجازت چاہی۔ مہدی نے والی مدینہ کو لکھا کہ وہ اس مشکل کا حل امام موسیٰ کاظمؑ سے طلب کرے۔ حضرتؑ نے ارشاد فرمایا لکھو۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اگر خانہ کعبہ پہلے بنا ہے اور لوگ بعد میں اس کے اطراف و کنار میں سکونت پذیر ہوئے ہیں تو اس کے اطراف کی فضا کا تعلق خانہ کعبہ سے ہے اور اگر لوگوں کی سکونت وہاں خانہ کعبہ سے پہلے تھی تو وہ اس کے زیادہ حقدار ہیں۔"

جب یہ جواب مہدی عباسی کو موصول ہوا تو اس کو اتنی مسرت ہوئی کہ اس نے وہ پروانہ لے کر اسے بوسہ دیا اور حکم دیا کہ ان گھروں

کو مسمار کیا جائے۔ گھروں کے مالک برافروختہ ہو کر امام موسیٰ بن جعفرؑ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ آپ مہدی کو خط لکھیں کہ وہ گھروں کی قیمت انہیں واپس کر دے۔ حضرتؑ نے ان کی خواہش پوری کر دی اور مہدی نے بھی انہیں راضی کیا۔

یہ دو روایات ایک باریک استدلال پر مشتمل ہیں جو حقوق کے بارے میں مروجہ قوانین سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ خانہ کعبہ جیسا عبادت خانہ جب ایک نئی زمین میں بنا تو اس کی ضروریات کے پھیلاؤ تک وہ اس سرزمین پر اولیت رکھتا ہے البتہ جب تک یہ احتیاج ضرورت کا پہلو پیدا نہیں کرتی دوسرے لوگ بھی اس کے جوار سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن جب ضرورت ہو تو اس کے حق اولیت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

خانہ کعبہ کی خصوصیات

ان دو آیات میں پہلی عبادت گاہ ہونے کے علاوہ خانہ کعبہ کی چار اور خصوصیات بیان ہوئی ہیں:

مبارکا

مبارک کا معنی بابرکت اور فائدہ مند ہے کعبہ اس لحاظ سے مبارک ہے کہ وہ مادی اور روحانی دونوں طرح سے بہت ہی برکت والی زمین پر واقع ہے۔ اس مقدس سرزمین کی روحانی برکتیں، خدائی جذبات حرکت و جنبش اور خصوصاً حج کے موقع پر وحدت و اتحاد کی فضا کے آثار کسی سے پوشیدہ نہیں اور اگر صرف حج کی ظاہری رسومات اور شکل و صورت کے پہلو پر اکتفا نہ کی جائے بلکہ اس کی روح اور فلسفہ زندہ ہو تو اس کی حقیقی برکت مزید واضح اور روشن ہو گی۔ اگرچہ یہ سرزمین مادی لحاظ سے خشک اور بے آب و گیاہ ہے اور طبعی طور سے وہ کسی طرح بھی کوائف زندگی سے مناسبت نہیں رکھتی پھر بھی طویل عرصے سے یہ ایک آباد اور متحرک شہر رہا ہے۔ خصوصاً تجارت کے لیے شروع سے اس کی مرکزیت قائم ہے۔

هدی للعالمین

کعبہ عالمین کے لیے رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے اور لوگ دور افتادہ علاقوں سے خشکی کے اور دریائی راستوں کو روندتے ہوئے اس عظیم عبادت گاہ کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں اور شان و شوکت سے اُن مراسم حج میں شریک ہوتے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے مروج ہیں۔ حتیٰ کہ زمانہ جاہلیت کے عرب بھی خانہ کعبہ کا احترام کرتے تھے اور مراسم حج کو دین ابراہیمؑ سمجھ کر بجا لاتے تھے اگرچہ اس میں انہوں نے اپنی طرف سے کچھ خرافات بھی شامل کر لی تھیں اور اپنے ان ناقص مراسم کے باوجود کافی حد تک اپنے غلط کاموں سے وقتی طور پر ہاتھ کھینچ لیتے تھے۔ اس طرح سب لوگ حتیٰ کہ بت پرست بھی اس عظیم گھر کی ہدایت سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ اس مقدس گھر کی روحانی اور معنوی کشش سب کو مجبوراً متاثر کرتی ہے۔

فیہ آیات بینات مقام ابراھیم

اس گھر میں خدا پرستی۔ توحید اور روحانیت و معنویت کی واضح نشانیاں نظر آتی ہیں۔ ان میں ایک اس کا دوام اور بقاء ہے اُن طاقتور دشمنوں کے مقابلہ میں جو اس کو نیست و نابود کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ دوسری نشانی حضرت ابراہیمؑ جیسے عظیم المرتبت پیغمبر کے وہ آثار ہیں جو اس کے قرب و جوار میں باقی رہ گئے ہیں۔ مثال کے طور سے زمزم، صفا و مروہ، رکن، حطیم، حجر اسود اور حجر اسماعیلؑ۔ ان میں سے ہر ایک

حاشیہ بر صفحہ آئندہ

گذشتہ زمانوں کی ایک مجسم تاریخ ہے جو ان کی عظیم اور دائمی یادوں کو زندہ رکھتی ہے۔

ان نشانیوں میں سے مقام ابراہیمؑ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ ایسی جگہ ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ تعمیر کعبہ اور مراسم حج کی انجام دہی یا عام لوگوں کو ان عظیم مراسم کے پورا کرنے کی دعوت دینے کے لیے کھڑے ہوتے تھے۔ بہرحال یہ ان اہم ترین قدیم نشانیوں میں سے ہے جو بے نظیر قربانیوں کی یادوں اور ان کے اخلاص و جامعیت کو زندہ کرتی ہیں۔ مقام ابراہیم سے مراد خاص وہی جگہ ہے جہاں اس وقت وہ مخصوص پتھر ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ کے قدم کا نقشِ مبارک موجود ہے یا اس سے تمام حرم مکہ مراد ہے اور یا تمام مواقف حج ہیں۔ اس سلسلہ میں مفسرین حضرات کے نظریات مختلف ہیں۔ لیکن اصولِ کافی میں امام جعفر صادقؑ سے ایک روایت منقول ہے جو پہلے احتمال کی تائید کرتی ہے۔

ومن دخلہ کان امنًا

حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کعبہ کے بعد شہر مکہ کے لیے جائے امن ہونے کی خداوند عالم سے درخواست کی تھی اور یہ دعا مانگی تھی؛

خدایا! اس سرزمین کو جائے امن و امان قرار دے (ابراہیم۔ ۳۵)۔ خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا کو مستجاب کیا اور اسے ایک مرکزِ امن قرار دیا۔ یہ جگہ روح کے آرام و اطمینان اور ان لوگوں کے امن و امان کا سبب ہے جو وہاں آتے ہیں اور اس سے روحانی تقویت حاصل کرتے ہیں اور مذہبی قوانین کے لحاظ سے اس کی اہمیت اس طرح محترم شمار ہوتی ہے کہ وہاں ہر قسم کی جنگ و جدال اور مقابلہ و مبارزہ ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

بالخصوص اسلامی نقطۂ نظر سے کعبہ ایک جائے امن اور پناہ گاہ کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے یہاں تک حکم ہے کہ اس خطۂ ارض میں رہنے والے جانور بھی امن و امان ۔ نے چاہئیں اور کسی کو ان سے سروکار نہیں ہونا چاہیے اور جو انسان اس میں جاکر پناہ حاصل کریں وہ بھی امان میں ہیں۔ حتیٰ کہ قاتل اور جارح ہی کیوں نہ ہوں ان سے بھی یہاں تعرض نہیں کیا جاسکتا مگر خانہ کعبہ کے احترام سے غلط فائدہ نہ اٹھایا جائے اور مظلوم لوگوں کے حقوق پامال نہ ہوں۔ اگر مجرم افراد وہاں جاکر پناہ لیں تو حکم یہ دیا گیا ہے کہ ان پر کھانے پینے میں سختی کی جائے تاکہ وہ مجبور ہو کر وہاں سے باہر نکلیں اور انہیں حدودِ حرم سے باہر کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔

وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلًا

اس جملے میں تمام لوگوں کو حج کی انجام دہی کا حکم دیا گیا ہے اور اسے لوگوں کے ذمہ خدائی فرض قرار دیا گیا ہے، چنانچہ "لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے لیے لوگوں کے ذمہ ہے۔ لفظ "حج" کے لغوی معنی "قصد و ارادہ" ہیں اسی مناسبت سے راستہ کو "محجۃ" کہا جاتا ہے کیونکہ وہ انسان کو اپنے مقصد تک پہنچا دیتا ہے اور دلیل و برہان کو حجت اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مقصود کو روشن کر دیتی ہے۔ باقی یہ بات کہ ان مخصوص رسومات کو حج سے کیوں تعبیر کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مراسم میں شرکت کے لیے چلتے وقت خانہ خدا کی زیارت کا قصد

حاشیہ صفحہ سابقہ۔ ۱؎ کعبہ کے چاروں کونوں کو رکن کہتے ہیں۔

۲؎ حجر اسود اور خانہ کعبہ کے دروازے کے درمیان کی جگہ کو حطیم کہتے ہیں، حطیم اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں اژدحام بہت ہوتا ہے اور یہ حضرت آدمؑ کی توبہ کی جگہ بھی ہے۔

۳؎ حجر اسماعیل ایک مخصوص جگہ ہے جو شمال مغرب میں قوس کی شکل میں ہے۔

کیا جاتا ہے۔ اسی بناء پر آیتِ مذکورہ میں حج کی اضافت بیت کی طرف ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ حج کے مراسم پہلی دفعہ حضرت ابراہیم کے دور میں رائج ہوئے تھے اور اس کے بعد ایک سنت کی شکل اختیار کی۔ یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت میں بھی اس کا سلسلہ جاری و ساری رہا۔ بعد از اں اسلام نے اس سے جاہلیت کے خرافات کو دور کر کے اسے خالص اور مکمل حج کی شکل دی۔[1]

البتہ نہج البلاغہ کے خطبہ قاصعہ اور دیگر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ فریضۂ حج حضرت آدمؑ کے زمانے سے شروع ہوا تھا لیکن اس نے حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں مزید دستوری شکل اختیار کی۔

ہر وہ شخص جو استطاعت حاصل کر لیتا ہے اس پر زندگی بھر میں صرف ایک مرتبہ حج واجب ہے اور مندرجہ بالا آیت بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ اس میں حکم مطلق ہے اور اس سے ایک دفعہ کی انجام دہی سے اطاعت ہو جاتی ہے۔ حج کے وجوب کے لیے صرف ایک شرط لگائی گئی ہے اور وہ ہے استطاعت و قدرت۔ جیسا کہ ارشاد ہو رہا ہے: من استطاع الیہ سبیلاً جو خانہ کعبہ کی طرف جانے کی قدرت رکھتا ہو —— البتہ اسلامی روایات اور فقہی کتب میں استطاعت کی تفسیر میں یہ چیزیں شامل کی گئی ہیں: زاد و راہ، سواری، جسمانی توانائی راستے میں امن اور حج سے واپسی کے بعد گزر اوقات کی طاقت لیکن در اصل یہ سب چیزیں اس آیت میں مندرج ہیں کیونکہ اس میں استطاعت کے معنی ہیں توانائی اور قدرت اور اس میں یہ تمام امور شامل ہیں۔

اس آیت سے ضمنی طور پر یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ قانون دیگر اسلامی قوانین کی طرح صرف مسلمانوں کے لیے مختص نہیں ہے بلکہ تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ اسے انجام دیں اور مشہور اصول "الکفار مکلفون بالفروع کما ہم مکلفون بالاصول" (کفار فروعات کے بھی اسی طرح مکلف ہیں جس طرح اصول کے) کی تائید مذکورہ آیت اور دیگر دلیلوں سے بھی ہوتی ہے۔ اگر چہ ان اعمال و عبادات کی صحت کی شرط یہ ہے کہ پہلے وہ اسلام قبول کریں اور اس کے بعد انہیں انجام دیں لیکن یہ مخفی نہ رہے کہ اسلام قبول نہ کرنا ان ذمہ داریوں کی جوابدہی کو نہیں روکتا۔ ان عظیم مراسم کی اہمیت، فلسفۂ حج اور اس کے انفرادی و اجتماعی آثار پر سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۶ سے لے کر ۲۰۳ تک تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔[2]

حج کی اہمیت

ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین

آیت کے آخری حصہ میں حج کی تاکید و اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ارشاد ہو رہا ہے کہ جو لوگ کفر اختیار کر کے اس خدائی حکم کی پرواہ نہ کریں اور اس کی مخالفت کریں تو وہ خود اپنے تئیں نقصان پہنچاتے ہیں کیونکہ خدا تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

---

[1] بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حج پہلی دفعہ دس ہجری میں فرض ہوا۔ اسی سال پیغمبر اکرمؐ نے کچھ لوگوں کو حکم دیا کہ وہ تمام جگہ کے لوگوں کو اطلاع دیں اور انہیں خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے آمادہ کریں۔ مراسم عمرہ اس سے پہلے بھی پیغمبر اکرمؐ اور کچھ مسلمان ادا کر چکے تھے۔

[2] متعلقہ آیات کے ضمن میں تفسیر نمونہ کی پہلی جلد کا مطالعہ فرمائیں۔

لفظ کفر کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں اور دینی اصطلاح میں اس کا ایک وسیع معنی ہے کیونکہ حق سے ہر طرح کی مخالفت اس میں شامل ہے چاہے مربوط اصول میں ہو یا فروعی احکام میں۔ اب اگرچہ اس کا استعمال اصول کی مخالفت میں ہونے لگا ہے مگر یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ اسی میں منحصر ہے۔ چنانچہ آیت مذکورہ میں ترک حج کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسی بنا پر حضرت امام جعفر صادقؑ نے ایک روایت میں اس آیت میں کفر کا مفہوم ترک حج بیان فرمایا ہے۔

دوسرے لفظوں میں ایمان کی طرح کفر کے بھی کئی مدارج و مراحل ہوتے ہیں جن میں ہر ایک مخصوص احکام کا حامل ہے۔ اس حقیقت کی طرف متوجہ ہونے سے کفر و ایمان سے مربوط آیات و روایات کے بہت سے اشتباہات دور ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اگر سود کھانے والوں کے بارے میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۷۵ میں اور جادوگروں کے متعلق سورہ بقرہ کی آیت ۱۰۲ میں کفر کا لفظ آیا ہے تو اس سے بھی یہی مقصود ہے ـــــ بہر صورت اس آیت سے دو مطلب نکل سکتے ہیں:

پہلا یہ کہ حج بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے جس کے ترک کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مرحوم صدوقؒ نے کتاب من لا یحضرہ الفقیہ میں رسالتمآبؐ سے روایت بیان کی ہے کہ آپ نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

یا علی تارک الحج وھو مستطیع کافر یقول اللہ تبارک و تعالیٰ وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا ومن کفر فان اللہ غنی عن العلمین یا علی! من سوف الحج حتی یموت بعثہ اللہ یوم القیمۃ یھودیا او نصرانیا۔

اے علی! جو شخص حج کو ترک کرے باوجودیکہ وہ استطاعت رکھتا ہو تو وہ کافر شمار ہوگا۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ استطاعت رکھنے والے لوگوں پر خدا کے گھر کی طرف حج بجالانے کے لیے جانا لازمی اور ضروری ہے اور جو کفر اختیار کرے (یعنی اسے چھوڑ دے) تو اس نے اپنا نقصان کیا ہے اور خدا ان سے بے نیاز ہے۔ اے علی! جو حج میں تاخیر کرے یہاں تک کہ دنیا سے چل بسے تو خدا اسے قیامت کے دن یہودی یا نصرانی محشور کرے گا۔[1]

دوسرا مطلب یہ کہ اس اہم خدائی فریضہ کی انجام دہی تمام دینی پروگراموں کی طرح لوگوں کی تربیت اور نفع کے لیے ہے اور خدا جو تمام سے بے نیاز ہے یہ اس کے لیے فائدہ مند نہیں ہے۔

۹۸ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ○

۹۹ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

۱۰۰ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ○

---

[1] تفسیر صافی، زیر نظر آیت کے ذیل میں، بحوالہ تہذیب۔

۱۰۱ وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ۗ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ○

ترجمہ

۹۸ (اے پیغمبر ان سے) کہو: اے اہل کتاب! تم کیوں (دیدۂ و دانستہ) اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کا شاہد حال ہے۔

۹۹ کہو: اے اہل کتاب! یہ کیا ہے کہ جو کوئی اللہ پر ایمان لانا چاہتا ہے تم اسے اللہ کی راہ سے روکتے ہو اور اسے ٹیڑھی چال چلانا چاہتے ہو۔ حالانکہ تم حقیقت حال سے بے خبر نہیں ہو۔ یاد رکھو جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔

۱۰۰ اے ایماندارو! اگر تم اہل کتاب میں کسی گروہ (کہ جن کا کام نفاق اور تمہارے درمیان کینہ و عداوت کی آگ بھڑکانا ہے) کی باتوں پر کاربند ہو گئے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ تمہیں ایمان سے کفر کی طرف لوٹا دیں گے۔

۱۰۱ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم (اب پھر) کفر کی راہ اختیار کرو۔ جب کہ تمہارا حال یہ ہے کہ اللہ کی آیتیں تمہیں سنائی جا رہی ہیں اور اس کا رسول (تعلیم و رہنمائی) کے لیے تم میں موجود ہے۔ (لہٰذا خدا سے تمسک رکھو) اور یاد رکھو کہ جو کوئی مضبوطی سے اللہ کا ہو رہا تو بلاشبہ اس پر سیدھی راہ کھل گئی (نہ تو اس کے لیے لغزش ہے اور نہ گمگشتگی کا اندیشہ)۔

شانِ نزول

ان آیات کے شان نزول کے سلسلے میں جو کچھ شیعہ اور سنی تصنیفات میں نقل ہوا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاس بن قیس ایک یہودی تھا جو ضعیف العمر، تاریک دل اور کفر و عناد میں کم نظیر تھا۔ ایک دن وہ مسلمانوں کے ایک مجمع کے پاس سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ اوس و خزرج جو سالہا سال ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہے تھے بعض افراد انتہائی صلح و آشتی اور محبت و خلوص سے ایک دوسرے کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں یہ مجلس کی فضا انس و محبت سے معطر ہے اور شدید اختلافات کی جو آگ زمانہ جاہلیت میں ان میں شعلہ زن تھی وہ یکسر بجھ چکی ہے۔

یہ حالت دیکھ کر وہ حسد کے مارے جل اٹھا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ اگر یہ لوگ حضرت محمدؐ کی پیروی کر کے اسی طرح آگے بڑھتے رہے تو یہودیت کے لیے بڑا خطرہ ہے۔ اسی دوران اس کے ذہن میں ایک سازش آئی اور اس نے ایک یہودی نوجوان کو حکم دیا کہ وہ ان کے ایک گروہ سے میل جول رکھے اور اوس و خزرج کے درمیان خونیں واقعات کی یاد تازہ کرے اور ان کی نظروں کے سامنے ان واقعات کی تصویر کشی کرے۔

اتفاقاً یہودی نوجوان کی یہ سازش کارگر ثابت ہوئی اور مسلمانوں کا ایک گروہ اس کے سننے سے وہی باتیں کرنے لگا یہاں تک کہ اوس و خزرج کے بعض لوگ از سر نو ایک دوسرے کو دھمکیاں دینے لگے۔ قریب تھا کہ بجھی ہوئی دیرینہ آگ پھر سے شعلہ زن ہو۔ پیغمبر اکرمؐ کو اس واقعہ کا علم ہوا۔ آپؐ فوراً چند مہاجرین سے کر ان کی تلاش میں نکلے اور دل ہلا دینے والے مواعظ و نصائح سے انہیں بیدار کیا۔ ان لوگوں نے جب آپؐ کی اطمینان بخش گفتگو سنی تو اپنے ارادوں سے باز آگئے اور سامانِ حرب و ضرب زمین پر ڈال کر باہم بغل گیر ہو گئے اور بہت روئے۔ اب وہ سمجھ گئے کہ یہ دشمنانِ اسلام کی ایک سازش تھی اور صلح و آشتی نے دوبارہ زندہ ہونے والے کینوں کو ختم کر ڈالا۔

اس موقع پر آٓیہ کی چار آیتیں نازل ہوئیں۔ جن میں سے پہلی دو آیات میں گمراہ کرنے والے یہودیوں کی مذمت کی گئی اور بعد کی دو آیات میں مسلمانوں کو بیدار کیا گیا۔

تفسیر

نفاق ڈالنے والے

قل یاھل الکتاب لم تکفرون بایات اللہ و اللہ شھید علی ما تعملون۔

اس آیت میں روئے سخن اہل کتاب کی طرف ہے جن سے مراد یہاں یہودی ہیں۔ اس ضمن میں خدا اپنے حبیب کو حکم دیتا ہے کہ ان سے کچھ ملامت اور سرزنش کے لب و لہجہ میں پوچھے کہ اللہ کی آیات سے ان کے کفر کا سبب کیا ہے؟ جب کہ وہ جانتے ہیں کہ خدا ان کے اعمال سے واقف ہے ——

آیات سے مراد یا تو وہ آیات ہیں جو تورات میں پیغمبر اسلامؐ کی نشانیوں کے بارے وارد ہوئی تھیں یا سب آیات و معجزات ہیں جو پیغمبرؐ پر نازل ہوئے تھے اور جو آپؐ کی حقانیت کی ترجمانی کرتے تھے۔

قل یاھل الکتاب لم تصدون عن سبیل اللہ من اٰمن تبغونھا عوجا و انتم شھداء۔

اس کے بعد خداوند عالم ان کی سرزنش کرتا ہے کہ اگر تم خود حق کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو تو دوسروں کو راہِ حق سے منحرف کرنے پر اصرار کیوں کرتے ہو اور خدائی راہِ مستقیم کو غلط طریقے سے پیش کیوں کرتے ہو حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ تم سب سے پہلے خدا کی آواز پر لبیک کہتے کیونکہ اس پیغمبرؐ کے متعلق تمہاری کتابوں میں پہلے سے نوید دی گئی تھی لیکن تم اس سنگین ذمہ داری سے پہلو تہی کر کے دوسروں کو منحرف کرتے ہو —— آخر ایسا کیوں ہے؟

وما اللہ بغافل عما تعملون۔

آیت کے آخر میں انہیں دھمکی دی گئی ہے کہ خدا ہرگز تمہاری کارستانیوں سے غافل نہیں ہے۔ شاید خدا کے غافل نہ ہونے کی تعبیر یہاں اس بناء پر ہو کہ یہودی اپنے غلط مقاصد کی برآری کے لیے زیادہ تر مخفی اور پوشیدہ سازشوں کا سہارا لیتے تھے جو غافل اور جاہل افراد میں زود اثر ثابت ہوتی تھیں۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ اگر بعض لوگ غفلت اور بے خبری کی وجہ سے ان تمام سازشوں کا شکار ہو جاتے ہیں تو خدا جو ان کے پوشیدہ اور نہاں اسرار سے آگاہ ہے ان سے بے خبر نہیں اور اس کی سزا تمہارے انتظار میں ہے۔

یٰایھا الذین اٰمنوا ان تطیعوا فریقا من الذین اوتوا الکتاب یردوکم بعد ایمانکم کافرین

اس کے بعد روئے سخن غافل مسلمانوں کی طرف کرتے ہوئے ان کو متنبہ کیا گیا کہ اگر وہ دشمن کی زہر آلود باتوں میں آگئے انہیں اپنے درمیان رخنہ اندازی کرنے کی اجازت دی اور ان کے وسوسوں سے متاثر ہوئے تو بعید نہیں کہ ان سے ایمان کا رشتہ ختم ہو جائے اور وہ کفر کی طرف پلٹ جائیں۔ کیونکہ دشمن اول تو یہ کوشش کرتا ہے کہ ان کے درمیان دشمنی و عداوت کی آگ بھڑکائے اور انہیں ایک دوسرے سے لڑائے۔ لیکن یہ مسلم ہے کہ وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے وسوسوں کو جاری و ساری رکھتا ہے تاکہ انہیں اسلام سے مکمل طور پر بیگانہ کر دے۔

گذشتہ بیان سے عیاں ہوتا ہے کہ مذکورہ آیت میں کفر کی طرف پلٹ جانے سے مراد حقیقی کفر اور اسلام سے مطلق بیگانگی بھی ہے اور ممکن ہے کہ کفر سے مراد زمانہ جاہلیت کی دشمنیاں اور عداوتیں ہوں جو کفر ہی کا حصہ ہیں۔ کیونکہ ایمان محبت اور اخوت کا سرچشمہ ہے اور کفر پراگندگی اور عداوت کا منبع ہے۔

وکیف تکفرون وانتم تتلی علیکم اٰیٰت اللہ وفیکم رسولہ ۔

اس کے بعد مومنین سے ایک تعجب خیز انداز میں سوال ہوتا ہے کہ کس طرح ممکن ہے کہ تم کفر کی راہ اختیار کرو حالانکہ پیغمبر بھی تمہارے درمیان موجود ہیں اور آیاتِ خدا کی بھی مسلسل تلاوت ہوتی ہے اور بارانِ وحی کے حیات بخش قطرات تمہارے دلوں پر پڑتے ہیں۔ حقیقت میں یہ جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر دوسرے لوگ گمراہ ہوں تو زیادہ تعجب نہیں۔ باعثِ تعجب تو یہ ہے کہ جو افراد پیغمبر کی صحبت میں بیٹھتے ہیں اور ہمیشہ عالم وحی سے ان کا تعلق رہتا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ گمراہ ہو جائیں اور اگر ایسے لوگ گمراہ ہوں تو یہ خود ہی کوتاہی کرنے والے ہیں اور اس کا عذاب بہت دردناک ہو گا ———

ان آیات کے آخر میں مسلمانوں کو وصیت کی گئی ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے وسوسوں سے چھٹکارہ حاصل کریں اور صراط مستقیم کی ہدایت کے لیے پروردگارِ عالم کے لطف کا دامن تھام لیں اور اس کی پاک ذات اور قرآن مجید کی مقدس آیات سے تمسک رکھیں اور انہیں صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ جو شخص خدا سے تمسک رکھے اسے راہِ راست کی ہدایت حاصل ہو جائے گی۔

یہ آیات کئی لطیف نکات سے معمور ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ پہلی آیات جہاں روئے سخن یہودیوں کی طرف ہے میں بالواسطہ خطاب کیا گیا ہے کیونکہ پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان سے کہیں، جس پر لفظ "قل" ("کہہ دو") دلالت کرتا ہے لیکن آخری دو آیات جہاں خطاب مومنین سے ہے، میں خطاب بلا واسطہ ہے اسی وجہ سے اس کی ابتداء لفظ قل سے نہیں کی گئی اور اس سے صاحب ایمان لوگوں پر خدا کا لطف و کرم ظاہر ہوتا ہے۔

۱۰۲۔ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○

۱۰۳۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْہَا کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَہْتَدُوْنَ ○

ترجمہ

۱۰۲ اے ایماندارو! اللہ سے ڈرو۔ اس طرح سے ڈرو جو ڈرنے کا حق ہے اور دیکھو! دنیا سے نہ جاؤ، مگر اس حالت میں کہ اسلام پر ثابت قدم ہو۔

۱۰۳ اور دیکھو! سب اہل جمع کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ۔ اللہ نے تمہیں جو نعمت عطا فرمائی ہے اس کی یاد سے غافل نہ ہو جانا۔ تمہارا حال یہ تھا کہ آپس میں تم ایک دوسرے کے دشمن تھے لیکن اس کے فضل و کرم سے ایسا ہوا کہ بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم بھڑکتی آگ کی بھٹی کے کنارے پہنچ چکے تھے اللہ نے وہاں تمہیں سہارا (اور نجات دی) اللہ اسی طرح اپنی آیتیں تمہارے سامنے آشکار کرتا ہے کہ شاید تم ہدایت پا جاؤ۔

شانِ نزول :

یہ معلوم ہے کہ دورِ جاہلیت میں مدینہ میں دو بڑے قبیلے "اوس" اور "خزرج" موجود تھے جن کے مابین سالہا سال سے جنگ و جدال اور خون ریزی کا سلسلہ جاری تھا۔ گاہے گاہے ایک دوسرے سے الجھ پڑتے اور ایک دوسرے کو جانی و مالی نقصان پہنچاتے تھے۔

پیغمبرِ اسلام کی برکات میں سے ایک یہ تھی کہ آپ نے ہجرت مدینہ کے بعد اسلام کے ذریعہ ان کے درمیان صلح و صفائی اور اخوت و محبت کا رشتہ قائم کیا۔ یوں مدینہ میں مسلمانوں کا ایک طاقتور گروہ ابھرنے لگا۔ لیکن چونکہ اختلافات کی جڑیں بہت زیادہ گہری اور مضبوط تھیں اور اتحاد کا رشتہ نیا نیا قائم ہوا تھا۔ لہٰذا کبھی کبھی چند ایک اسباب کے نتیجے میں بجھے ہوئے اختلافات پھر سے بھڑک اٹھتے تھے۔ گزشتہ آیات میں ایک ماہر دشمن کی تحریک سے اختلافات کا ایک واقعہ پیش کیا جا چکا ہے لیکن ان آیات میں ایک اور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ نادان دوستوں اور جاہلانہ تعصبات سے پیدا ہوا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ قبیلہ اوس اور خزرج کے دو آدمی جن کا نام "ثعلبہ بن غنم" اور "اسعد بن زرارہ" تھا۔ کسی مقام پر آمنے سامنے ہوئے اور ان میں ہر ایک قبول اسلام کے بعد ملنے والے سرمایہ افتخار کو شمار کرنے لگا۔ ثعلبہ نے کہا: خزیمہ بن ثابت اور حنظلہ (غسیل الملائکہ) جو مسلمانوں کے لیے باعث افتخار ہیں، ہم میں سے ہیں اور اسی طرح عاصم بن ثابت اور سعد بن معاذ بھی ہماری نسل سے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسعد بن زرارہ جو قبیلہ خزرج سے تھا، کہنے لگا قرآن کریم کی نشر و اشاعت اور تعلیم قرآن کا شرف ہمارے ہی قبیلے کے چار افراد کو حاصل ہے، ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت، ابو زید اور اہل مدینہ کے رئیس و خطیب سعد بن عبادہ بھی ہم میں سے ہیں۔

رفتہ رفتہ معاملہ نازک صورت اختیار کر گیا اور دونوں قبیلے اس واقعہ سے آگاہ ہوئے اور اسلحہ سے لیس ہو کر ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ اب دوبارہ جنگ کی آگ بھڑکنے اور ان کے خون سے زمین رنگین ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

پیغمبر کو اس کی اطلاع ہوئی تو حضرت فوراً وہاں تشریف لائے اور آپ نے اپنے بیان اور حسن تدبیر سے اس خطرناک صورتِ حال کو ختم کیا اور ان کے درمیان صلح و صفائی ہو گئی۔ اسی موقع پر مذکورہ آیات کا نزول ہوا اور ایک حکم عمومی کے طور پر ان کو ایک موثر اور تاکیدی بیان کے ذریعے اتحاد و اتفاق کی دعوت دی ــــــــ

تفسیر

تقویٰ اور پرہیزگاری کی دعوت

یٰایها الذین اٰمنوا اتقوا الله حق تقاته

اس بحث میں پہلے تقویٰ کی دعوت دی گئی ہے تاکہ وہ اتحاد کی دعوت کے لیے تمہید بنے۔ درحقیقت تقویٰ کی دعوت کسی اخلاقی اور عقیدہ کی مدد کے بغیر بے اثر یا کم اثر ہوتی ہے۔ اسی بنا پر اس آیت میں کوشش کی گئی ہے کہ اختلاف اور پراگندگی کے عوامل ایمان اور تقویٰ کے ذریعے کمزور کیے جائیں اور اس لیے ایماندار افراد کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ سب کے سب خدا سے ڈرو اور تقویٰ اور پرہیزگاری کا حق ادا کرو۔

"حق تقویٰ" سے کیا مراد ہے؟ اس ضمن میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ حق تقویٰ پرہیزگاری کا آخری درجہ ہے جس میں ہر قسم کے گناہ، دھیان اور حق سے انحراف کرنے سے پرہیز کرنا شامل ہے۔ اسی لیے تفسیر "درمنثور" میں پیغمبر اکرمؐ اور تفسیر عیاشی؟ اور "معانی الاخبار" میں امام جعفر صادقؑ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپؐ نے حق تقویٰ کی تفسیر میں فرمایا:

(ان یطاع فلا یعصی و یذکر فلا ینسی و یشکر فلا یکفر)

یعنی حق تقویٰ یہ ہے کہ ہمیشہ اس کے فرامین کی اطاعت کی جائے اور کبھی اس کی نافرمانی نہ کی جائے اور ہمیشہ اسے یاد رکھو اور کبھی بھی اسے فراموش نہ کرو اور اس کی نعمتوں پر شکرگزار رہو اور کفران نعمت نہ کرو۔

ظاہر اور واضح ہے کہ یہ حکم باقی احکام الٰہی کی طرح انسان کی ہمت و طاقت سے وابستہ ہے لہٰذا مندرجہ بالا آیت اور سورۂ تغابن کی آیت ۱۶ (فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (جتنا ہو سکے پرہیزگاری اختیار کرو) ان دونوں آیات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس لیے ان دو آیات کے تضاد کے بارے میں اور یہ کہ ان میں سے ایک دوسری کی ناسخ ہے، گفتگو بے بنیاد ہے، البتہ دوسری آیت حقیقت میں اصطلاحی لحاظ سے پہلی آیت کی تخصیص ہے اور اسے انسان کی توانائی کی مقدار سے مقید کرتی ہے۔ چونکہ ظاہراً قدماء کے ہاں لفظ نسخ تخصیص پر بھی بولا جاتا تھا۔ لہٰذا ممکن ہے ان لوگوں کی نسخ سے مراد تخصیص ہی ہو۔

ولا تموتن الا و انتم مسلمون۔

حقیقت میں یہ جملہ اوس و خزرج اور تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ وہ ہوشمندی سے رہیں۔ صرف اسلام قبول کرنا کافی نہیں ہے بلکہ اس سے اہم بات یہ ہے کہ ایمان و اسلام کو زندگی کے آخری لمحات تک محفوظ رکھیں اور زمانہ جاہلیت کے کینہ کی بجھی ہوئی آگ اور بیہودہ و غیر معقول تعصبات کی پیروی میں اپنے ایمان اور پاک اعمال کو بربادی کی بھینٹ نہ چڑھا دیں تاکہ آخرت میں انجام بدبختی سے ہمکنار نہ ہو لہٰذا اس بات کی تاکید کی گئی کہ خیال رکھنا کہ دنیا سے ایمان و اسلام کے بغیر نہ جانا۔

اتحاد کی دعوت

واعتصموا بحبل الله جمیعا و لا تفرقوا۔

اس آیت میں مسئلہ اتحاد اور ہر قسم کے اختلاف اور تفرقہ بازی سے اجتناب کا تذکرہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے سبھی اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑو اور ایک دوسرے سے جدا نہ ہو جاؤ۔

حبل اللہ (اللہ کی رسی) سے مراد کیا ہے؟ مفسرین نے اس کے متعلق کئی احتمالات کا ذکر کیا ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد قرآن ہے اور بعض اس سے مراد اسلام لیتے ہیں۔ کچھ حضرات کے نزدیک خاندانِ رسالت اور ائمہ معصومینؑ مراد ہیں۔ جو روایات پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ اہل بیتؑ سے نقل ہوئی ہیں اُن میں بھی کئی تعبیرات نظر آتی ہیں جیسا کہ تفسیر در منثور میں پیغمبر اکرمؐ اور معانی الاخبار میں حضرت امام صادقؑ سے نقل ہوا ہے کہ حبل اللہ قرآن کریم ہے اور تفسیر عیاشی میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ اللہ کی رسّی سے مراد آل محمدؑ ہیں اور لوگوں کو ان سے تمسک کرنے پر مامور کیا گیا ہے۔ لیکن ان احادیث اور اُن تفاسیر میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ اللہ کی رسّی سے مراد ہر قسم کا ذریعہ ہے جو ذات پاک کے ساتھ ربط رکھتا ہے۔ چاہے وہ وسیلہ اسلام ہو یا قرآن یا پیغمبرؐ اور ان کے اہل بیتؑ۔ بالفاظ دیگر تمام وہ چیزیں جو ذکر ہو چکی ہیں ارتباطِ خدا کے وسیع مفہوم میں داخل ہیں۔

"حبل اللہ" کی تعبیر کا مقصد

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ ان امور کو حبل اللہ سے تعبیر کرنے سے ایک حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ انسان عام حالات میں جب کہ کوئی مربی اور رہنما نہ ہو، طبیعت کے ذلت و سرکش سرشت کی گہرائیوں اور جہل و نادانی کے تاریک کنوئیں میں پڑا رہتا ہے۔ اس پستی سے نجات حاصل کرنے اور اس تاریک کنوئیں سے باہر نکلنے کے لیے ایک مضبوط رسّی کی ضرورت ہے جسے وہ پکڑ سکے اور اس سے باہر آسکے۔ یہ مضبوط رسّی وہ خدائی رابطہ ہے جو قرآن، اس کے لانے والے اور ان کے حقیقی جانشینوں تک پہنچتا ہے اور یہ لوگوں کو مادیت کی پستی سے نکال کر معنویت اور روحانیت کے عروج تک پہنچا دیتا ہے۔

کل کے دشمن اور آج کے دوست

اس کے بعد قرآن کریم اتحاد و اخوت کی عظیم نعمت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور مسلمانوں کو گذشتہ افسوس ناک حالت پر غور و فکر کرنے اور اُس پراگندگی کا اس اتحاد اور وحدت کے ساتھ تقابل کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے انہیں نہیں بھولنا چاہیے کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے لیکن خداوند عالم نے اسلام و ایمان کی برکت سے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے انس پیدا کیا اور تم آج بھائی بھائی بن گئے۔ قابل توجہ یہ بات ہے کہ اس آیت میں لفظ نعمت کو مکرر لایا گیا ہے اور اس طرح سے اتفاق و اخوت کی نعمت کی اہمیت ان کے گوش گذار کی گئی ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ خدا نے مومنین کی تالیفِ قلوب کو اپنی طرف نسبت دیتے ہوئے کہا کہ خدا نے تمہارے دلوں میں اُلفت و محبت پیدا کر دی۔ اس تعبیر سے اسلام کے ایک اجتماعی معجزہ کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ اگر عربوں کی سابقہ عداوت پر غور کیا جائے کہ کس طرح سالہا سال سے ان کے دلوں میں گہرے کینے بھرے ہوئے تھے اور کس طرح ایک معمولی سے مسئلے پر ان کے درمیان خونین جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی تھی، خصوصاً اس بات کی طرف توجہ کی جائے کہ عموماً نادان، ان پڑھ اور نیم وحشی افراد ہٹ دھرم ہوتے ہیں اور آسانی سے گذشتہ چھوٹے چھوٹے

سبھی کو طاق نسیاں پر رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اس صورت میں عظیم اسلام کے اجتماعی معجزہ کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عام اور روزمرہ کے طور طریقوں سے یہ ممکن نہیں تھا کہ اس قسم کی کینہ پرور نادان قوموں کی ایک ملت بنائی جائے اور انہیں ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا جائے۔

مندرجہ بالا امر (کینہ پرور عرب قبائل کے درمیان وحدت اور بھائی چارہ) کی اہمیت علماء اور مؤرخین حتیٰ کہ غیر مسلم مؤرخین کی نظر سے مخفی نہیں رہی اور سب نے بڑے تعجب خیز انداز سے اس کا ذکر کیا ہے۔

جان ڈیون پورٹ مشہور انگریز عالم رقمطراز ہے:

"..... محمد جیسے ایک عالم عرب نے اپنے ایک چھوٹے منتشر، برہنہ اور افلاس زدہ ملک کو ایک متحرک اور منظم معاشرے میں تبدیل کر دیا اور روئے زمین کی اقوام کے درمیان انہیں نئے صفات اور تازہ اخلاق کے ساتھ متعارف کرایا اور تیس سال سے کم عرصے میں اس طرز و روش نے حاکم قسطنطنیہ کو مغلوب کر دیا اور سلاطین ایران کو نیست و نابود کر دیا، شام، بین النہرین اور مصر کو مسخر کیا اور ان کی فتوحات اوقیانوس اطلس سے لے کر دریائے خزر اور سیحون تک جا پہنچیں۔"[1]

تومال کارل لکھتا ہے:

"خداوند عالم نے اسلام کے ذریعے عربوں کو تاریکی سے روشنی کی طرف ہدایت کی۔ ایک بے حرکت اور منجمد قوم کہ جس کی نہ کوئی آواز تھی اور نہ حرکت محسوس ہوتی تھی سے ایک ایسی ملت پیدا کی بے گناہی سے شہرت، سستی سے بیداری، پستی سے بلندی اور عجز و ناتوانی سے قوت و توانائی کی طرف لے گیا۔ ان کی روشنی چار دانگ عالم میں ضیاء پاشی کرنے لگی۔ اعلان اسلام کو ابھی ایک صدی نہیں ہوئی تھی کہ مسلمانوں نے ایک قدم ہندوستان اور دوسرا سرزمین اندلس میں رکھا اور آخر کار اس مختصری مدت میں اسلام نصف کرۂ ارض پر ضو افشانی کرنے لگا۔"[2]

"ڈاکٹر گوستاو لیبان" نے اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

"اس حیرت انگیز حادثہ یعنی اسلام سے قبل کہ جس نے عرب قوم کو جہانگیری اور نئے معانی کے اخلاق کے روپ میں ہمارے سامنے پیش کیا عربستان کا علاقہ نہ تاریخ و تمدن کی جزو سمجھا جاتا تھا اور نہ ہی وہاں علم یا مذہب کا نام و نشان تھا۔"[3]

ایک ہندو دانشمند اور سیاستدان نہرو اس بارے میں لکھتا ہے:

"عربوں کی سرگذشت اور داستان کہ وہ کس تیز رفتاری سے ایشیاء، یورپ اور افریقہ پر چھا گئے اور عالی شان و عظیم تمدن اور ثقافت کو انہوں نے جنم دیا، انسانی تاریخ میں ایک عجیب و غریب چیز ہے ——— نئی توانائی اور جدید فکر کہ جس نے

---

[1] عذر تقصیر بہ پیشگاہ محمد و قرآن، مترجمان ڈیون پورٹ، فارسی ترجمہ از سید غلام رضا سعیدی، صفحہ ۷۷۔

[2] نقشہ ہائے استعمار، از محمد محمود صاحب، صفحہ ۴۸۔

[3] تاریخ تمدن اسلام و عرب از گوستاو لیبان۔

ان کو بیدار کیا اور انہیں اطمینانِ نفس اور قدرت سے نوازا وہ دین اسلام تھا۔[1]

وکنتم علی شفا حفرة من النار فانقذکم منہا

شفا کے لغوی معنیٰ خندق یا کنوئیں کا کنارہ ہے اور شاید لب پر بھی "شفہ" کا ——— اطلاق اسی مناسبت سے ہوتا ہے۔ اسی طرح اس لفظ کا استعمال بیماری سے تندرست ہونے کے لیے بھی اسی مناسبت سے ہے کہ انسان سلامتی اور تندرستی کے کنارے پر آ پہنچتا ہے۔ مندرجہ بالا جملے میں خدا تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: تم گذشتہ زمانے میں آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ ہر آن ممکن تھا کہ تم اس میں گر جاؤ اور تمہارا سب کچھ خاکستر ہو جائے لیکن خداوند عالم نے تمہیں نجات بخشی اور ہلاکت کے اس گڑھے سے امن و امان کے نقطہ کی طرف تمہاری رہنمائی کی جو اخوت و محبت کا نقطہ تھا۔

آیت میں آگ سے مراد جہنم کی آگ ہے یا اس دنیا کی، اس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے لیکن پوری آیت پر توجہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگ جنگ و جدال اور لڑائی جھگڑوں سے کنایہ ہے جو ہر لحظہ زمانہ جاہلیت میں کسی نہ کسی بہانہ عربوں میں بھڑک اٹھتی تھی۔ قرآن مجید اس جملے میں زمانہ جاہلیت کے خطرناک حالات کی عکاسی کرتا ہے کہ ہر لحظہ جنگ اور خونریزی کا خطرہ ان کے سروں پر منڈلاتا رہتا تھا اور خداوند عالم نے نور اسلام کی برکت سے انہیں اس حالت سے نجات دی۔ یہ مسلّم ہے کہ انہوں نے اس خطرناک حالت سے غلامی پا کر جہنم کی جلانے والی آگ سے بھی نجات پائی۔

کذلک یبین اللہ لکم آیاتہ لعلکم تہتدون۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کی گئی ہے کہ خدا اسی طرح اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تمہاری ہدایت ہو جائے۔ اس بناء پر آخری مقصد اور غرض تمہاری ہدایت و نجات ہے اور چونکہ یہ تمہارے منافع اور سرنوشت کا معاملہ ہے لہٰذا جو کچھ کہا گیا اسے زیادہ سے زیادہ اہمیت دو۔

قوموں کی بقاء کے لیے اتحاد کی اہمیت

ان تمام باتوں کے باوجود کہ جو اتحاد کے اعجاز آمیز اثر کے بارے میں اجتماعی مقاصد اور معاشروں کی بلندی کی طرف پیش رفت کے سلسلے میں کہی گئی ہیں، کہا جا سکتا ہے کہ ابھی تک اس کا واقعی اثر نہیں پہچانا گیا۔

عصرِ حاضر میں دنیا کے مختلف حصوں میں بڑے بڑے بند باندھے گئے ہیں جو زیادہ صنعتی توانائیوں کی بدولت ہیں اور وہ وسیع و عریض زمینوں کی آبیاری اور روشنی کا سبب بنے ہیں۔ اگر صحیح طور سے غور و فکر کیا جائے تو ہمیں نظر آئے گا کہ یہ اتنی بڑی قدرت صرف ناچیز بارش کے قطرات کے ایک دوسرے سے وابستہ ہونے کی قدرت کے نتیجہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں۔ سے ہم انسانوں کے اتحاد اور مل کر کوشش کرنے کی اہمیت سے واقف ہو سکتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ اور دیگر بزرگ اسلامی رہنماؤں سے اکثر احادیث میں مختلف عبارات کے ذریعے اس کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

---

[1] نگاہی بہ تاریخ جہان، جلد ۱، صفحہ ۳۱۷۔

چنانچہ ایک مقام پر رسول اللہ فرماتے ہیں:

"المؤمن للمؤمن کالبنیان یشید بعضہ بعضا"

مومنین ایک دوسرے کے لیے ایک عمارت کے اجزاء کی مانند ہیں کہ جن میں ہر ایک جزو دوسرے کی مضبوطی سے نگہبانی کرتا ہے۔

آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

"المؤمنون کالنفس الواحدۃ"

مومنین ایک نفس و روح کی طرح ہیں۔

آپ نے مزید فرمایا:

مثل المؤمنین فی توادھم و تراحمھم کمثل الجسد الواحد اذا اشتکی بعضہ تداعی سائرہ بالسھر والحمی۔

صاحبان ایمان افراد دوستی اور ایک دوسرے پر رحم کرنے اور نیکی کرنے میں ایک جسم کے اعضاء کی طرح ہیں کہ جب ان میں ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو باقی اعضاء و جوارح کو قرار و آرام نہیں آتا[1]

۱۰۴ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

۱۰۵ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○

ترجمہ

۱۰۴ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہو جو بھلائی کی باتوں کی طرف دعوت دینے والی ہو۔ وہ نیکی کا حکم دے برائی سے روکے، اور بلاشبہ ایسے ہی لوگ کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔

۱۰۵ اور دیکھو! ان لوگوں کی سی چال نہ چلنا جو (خدا کے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے کی بجائے) الگ الگ ہوگئے اور باوجود یہ کہ (کتاب اللہ) کی روشن دلیلیں اُن کے سامنے آچکی ہیں۔ باہم دگر اختلافات میں پڑ گئے بس ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی، جلد ۲، صفحہ ۲۵۔

تفسیر

حق کی دعوت اور فساد کا مقابلہ

ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر و اولئک ھم المفلحون

اُمّت اصل میں مادہ "ام" سے ہے جس کا معنی ہے ہر وہ چیز جس کا دوسری چیزیں قصد کریں۔ اسی بنا پر اُمّت ایسے گروہ کو کہا جاتا ہے جن کے درمیان وحدت کا پہلو ہو۔ اس میں فرق نہیں کہ وحدت زمانی ہو یا مکانی یا مقصد میں وحدت ہو۔ لہٰذا متفرق اور پراگندہ اشخاص کو اُمّت نہیں کہا جا سکتا۔

- گذشتہ آیات اخوت و وحدت کے بارے میں ہیں۔ اب اس آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو حقیقت میں ایک اجتماعی زرہ کے مانند ہے اور جمعیت کی حفاظت کرتی ہے۔ کیونکہ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ ہو تو مختلف عوامل جو اجتماعی وحدت کی بقا کے دشمن ہیں دیمک کی طرح اندر سے معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کرتے رہتے ہیں اور لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتے ہیں۔ اسی لیے وحدتِ اجتماعی کی حفاظت عوام کی نگرانی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

آیت بالا میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہمیشہ مسلمانوں کے درمیان ایک ایسا گروہ ہونا چاہیے جو ان دو اجتماعی عظیم ذمہ داریوں کو انجام دے، لوگوں کو نیکی کی دعوت دے اور برائیوں سے منع کرے اور آیت کے آخری حصے میں باقاعدہ تصریح ہوئی ہے کہ فلاح و نجات صرف اسی راستے سے ممکن ہے۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "منکم امة" کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ یہ اُمّت بعض مسلمانوں میں سے تشکیل پاتی ہے نہ کہ سب کے سب یہ کام کریں تو اس طرح سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری عمومی پہلو کھو بیٹھے گی۔ بلکہ وہ صرف ایک خاص گروہ کی ذمہ داری ہوگی اگرچہ انتخاب اور جمعیت کو ترتیب دینا تمام لوگوں کا فرض ہے بالفاظ دیگر یہ واجب کفائی ہے نہ کہ واجب عینی۔ حالانکہ قرآن مجید کی دیگر آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں ذمہ داریاں عمومی پہلو رکھتی ہیں۔ یعنی واجب عینی ہیں نہ کہ کفائی، مثلاً بعد میں آنے والی آیات میں ارشاد ہوتا ہے:

کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر

تم بہترین اُمّت ہو جسے لوگوں کے نفع کے لیے پیدا کیا گیا ہے کیونکہ تم انہیں اچھی چیزوں کا حکم دیتے ہو اور بُری چیزوں سے روکتے ہو۔

اسی طرح سورہ عصر میں ارشاد ہوتا ہے:

تمام لوگ خسارے میں ہیں سوائے ان کے جو ایمان رکھنے کے ساتھ صالح عمل کرتے ہیں اور حق و صبر کی وصیت کرتے ہیں۔

ان جیسی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ذمہ داریاں کسی خاص گروہ کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتیں بلکہ یہ عام ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے:

ان جیسی تمام آیات میں غور و خوض کرکے اس سوال کا جواب مل سکتا ہے۔ کیونکہ ان سے پتہ چلتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دو مرحلے ہیں، ایک انفرادی مرحلہ ہے، اس میں ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ تنہا دوسروں کے اعمال کی نگہداشت کرے اور دوسرا مرحلہ اجتماعی ہے اس کے لیے ایک گروہ کا فریضہ ہے کہ وہ معاشرتی خرابیوں کو ختم کرنے کے لیے متحد ہو کر مشترکہ طور پر کوشش کرے۔

پہلی قسم میں ہر شخص پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس طرح تمام لوگ ذمہ دار ہوں گے اور چونکہ اس میں انفرادی پہلو ہے لہٰذا اس کی نفی فرد کی توانائی تک محدود ہے۔ لیکن دوسری قسم واجب کفائی ہے۔ یہ چونکہ ایک گروہ کی ذمہ داری ہے لہٰذا اس کا دائرہ اثر بھی وسیع ہے اور اس لیے فطری طور پر یہ کام حکومت اسلامی کی ذمہ داریوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ دو صورتیں (خرابی اور فساد کا مقابلہ کرنا اور حق کی طرف دعوت دینا) اسلامی قوانین کا شاہکار شمار ہوتی ہیں۔ حکومت اسلامی کے نظام میں تقسیم کار کا معاملہ، اجتماعی حالات اور حکومتی اداروں کی صورت حال ایک نگران گروہ کے وجود کو لازمی قرار دیتے ہیں۔

گذشتہ ادوار میں اسلامی ممالک میں اس آیت کی روشنی میں برائیوں کو روکنے اور اجتماعی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لیے ایسے ادارے تشکیل پاتے رہے ہیں۔ آج کل بھی حجاز وغیرہ میں ایسے ادارے موجود ہیں[1]۔ ایسے اداروں کو حسبہ اور ان کے مامورین کو محتسب یا "آمرین بمعروف" کہتے ہیں۔ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں میں ہونے والے ہر قسم کے برے کام کو روکیں اور حکومتی اداروں میں ہونے والے ہر قسم کے ظلم و فساد کی روک تھام کریں اور اسی طرح لوگوں میں نیک اور پسندیدہ کاموں کا شوق پیدا کریں۔

وسیع اختیارات کے حامل ان اداروں کا وجود محدود قدرت کے حامل فرد کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری ادا کرنے سے کوئی تضاد نہیں رکھتا۔

چونکہ یہ بحث قرآن مجید کی اہم مباحث میں سے ہے اور بہت سی آیات میں اس کا تذکرہ ہے لہٰذا ضروری ہے کہ یہاں اس کے بعض پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔

چند اہم نکات

(۱) معروف اور منکر: معروف کے اصلی حروف ع، ر، ف (عرف) ہیں اور اس کے لغوی معنی ہیں "پہچانے ہوئے" اور منکر کے معنی ہیں "نہ پہچانے ہوئے"، یہ لفظ انکار سے ہے۔ گویا اس مناسبت سے نیک کاموں کا پہچانے ہوئے امور اور ناپسندیدہ کاموں کا نہ پہچانے ہوئے کاموں سے تعارف کرایا گیا ہے کیونکہ انسان کی پاک فطرت پہلی قسم سے آشنا و آگاہ ہے اور دوسری قسم سے ناآشنا ہے۔

(۲) کیا امر بالمعروف ایک عقلی حکم ہے: بعض علماء اسلام کا خیال ہے کہ ان دو ذمہ داریوں کا وجوب نقلی دلیل سے ثابت ہے اور عقل سے

---

[1] ایسے ادارے عموماً برائے نام شرعی ہیں اور اکثر ان کی حالت حکومت کے عام اداروں سے بھی بدتر ہے (مترجم)

اس کا کوئی سروکار نہیں اور عقل اس بات کا حکم نہیں دیتی کہ انسان کسی دوسرے کو ایسے کام سے روکے جس کا نقصان صرف کرنے والے کو پہنچتا ہو۔ لیکن اجتماعی معاشرتی تعلقات اور اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ کوئی جرم انسانی معاشرے میں کسی خاص نقطہ تک محدود نہیں رہتا بلکہ یہ آگ کے شعلوں کی طرح پورے عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے یہ عقل کا فیصلہ ہے کہ ان دو ذمہ داریوں کو عملی جامہ پہنایا جائے۔

بالفاظ دیگر سوسائٹی میں کوئی چیز انفرادی ضرر کی حامل نہیں۔ ہر انفرادی ضرر میں یہ امکان ہے کہ وہ اجتماعی نقصان کی صورت اختیار کرے۔ اسی بناء پر عقل و منطق معاشرے کے افراد کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کے گرد و پیش کی فضا کو پاک و صاف رکھنے کے لیے ہر قسم کی جستجو اور کوشش کریں۔

اتفاق سے بعض احادیث بھی اس بات کی غمازی کرتی ہیں جیسا کہ رسول اسلام نے ارشاد فرمایا:

ایک گناہگار دوسرے لوگوں کے درمیان اس شخص کی مانند ہے جو ایک کشتی میں کچھ لوگوں کے ساتھ سوار ہو جب وہ کشتی سمندر کے بیچ میں پہنچے تو وہ کلہاڑی سے اس جگہ سوراخ کرنے لگے جہاں وہ بیٹھا ہوا ہے اور جب دوسرے لوگ اس کے اس فعل پر اعتراض کریں تو وہ یہ جواب دے کہ میں تو صرف اپنی جگہ پر یہ کام کر رہا ہوں۔ اس وقت دوسرے لوگ اس کو اس خطرناک کام سے نہ روکیں تو چند لمحوں میں سمندر کا پانی کشتی میں داخل ہو جائے گا اور یکدم سب کے سب غرق ہو جائیں گے۔

پیغمبر اکرمؐ نے اس واضح مثال کے ذریعے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے منطقی ہونے کی تصویر کشی کی ہے اور معاشرے کے لیے ہر فرد کی نگرانی کے حق کو ایک فطری حق قرار دیا ہے۔

(۳) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت: قرآن مجید کی آیات کے علاوہ بہت سی معتبر احادیث اور اسلامی مصادر میں بھی ان دو عظیم اجتماعی وظائف کی اہمیت بیان کی گئی ہے کہ جن میں ان خطرات اور برے نتائج کی نشاندہی کی گئی ہے جو ان دو ذمہ داریوں کے ترک کرنے کی صورت میں جنم لیتے ہیں۔ جیسا کہ امام محمد باقرؑ سے مروی ہے کہ:

ان الامر بالمعروف و النهی عن المنکر فریضة عظیمة بها تقام الفرائض وتأمن المذاهب وتحل المکاسب وترد المظالم وتعمر الارض وینتصف من الاعداء و یستقیم الامر۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر عظیم خدائی فریضہ ہے۔ باقی فرائض انہی کی بدولت قائم ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے راستے محفوظ رہتے ہیں، لوگوں کا کسب و کار حلال ہوتا ہے اور لوگوں کے حقوق انہی کی وجہ سے واپس ملتے ہیں اور ان کے سبب زمین آباد رہتی ہے، دشمنوں سے انتقام لیا جاتا ہے اور انہی کے طفیل تمام کام چلتے رہتے ہیں[۱]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

مَنْ اَمَرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهٰى عَنِ الْمُنْكَرِ فَهُوَ خَلِيْفَةُ اللّٰهِ فِيْ اَرْضِهٖ وَخَلِيْفَةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ خَلِيْفَةُ كِتَابِهٖ

---

[۱] وسائل، کتاب امر بالمعروف و نہی عن المنکر، باب ۱، حدیث ۶، جلد ۱۱، صفحہ ۳۹۵۔

جو نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے وہ زمین پر خدا، اس کے رسول اور اس کی کتاب کا جانشین ہے[1]

اس حدیث سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ یہ عظیم فریضہ ہر چیز سے پہلے ایک خدائی پروگرام ہے۔ انبیاء کی بعثت اور آسمانی کتب کا نزول سب کے سب اسی پروگرام کا حصہ ہیں۔

ایک شخص پیغمبرؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور آپؐ منبر پر جلوہ افروز تھے اس نے پوچھا مَنْ خَیْرُ النَّاسِ تمام لوگوں میں سے بہتر کون ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

آمرهم بِالْمَعْرُوْفِ وَاَنْهَاهُمْ عن المنکر و اتقاهم لله وارضاهم

جو سب سے زیادہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتا ہو اور جو زیادہ پرہیزگار ہو اور جو خوشنودئ خدا کی راہ میں زیادہ قدم بڑھانے والا ہو[2]

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو ورنہ خدا کسی ستمگر اور ظالم کو تم پر مسلط کرے گا۔ جو نہ تمہارے بوڑھوں کا احترام کرے گا اور نہ بچوں پر رحم کرے گا۔ تمہارے نیک اور صالح لوگ دعا کریں گے لیکن مستجاب نہیں ہوگی۔ وہ خدا سے مدد طلب کریں گے لیکن خدا ان کی مدد نہیں کرے گا یہاں تک کہ اگر وہ لوگ توبہ کریں گے تو خدا ان کے گناہ معاف نہیں کرے گا[3]

یہ سب کچھ اس گروہ کے اعمال کی عکاسی ہے جو اس عظیم معاشرتی ذمہ داری کو پورا نہیں کریں گے کیونکہ جب عمومی نگرانی کے بغیر معاملات کی باگ ڈور نیک لوگوں کے ہاتھ سے نکل جائے گی تو برے اور نااہل لوگ معاشرے کے ہر میدان پر قابض ہو جائیں گے مندرجہ بالا حدیث میں ان کی توبہ کی عدم قبولیت کا مطلب یہ ہے کہ برائیوں کے مقابلہ میں مسلسل خاموشی کی وجہ سے دعا کوئی اثر نہیں رکھتی مگر یہ کہ وہ اپنے عمل میں تجدید نظر کریں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"و ما اعمال البر کلها و الجهاد فی سبیل الله عند الامر بالمعروف والنهی عن المنکر الا کنفثة فی بحر لجی"

تمام نیک کام یہاں تک کہ اللہ کی راہ میں جہاد بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقابلے میں ایک گہرے سمندر میں تھوکنے اور پھونکنے کی مانند ہیں[4]

اس قدر تاکید کا سبب یہی ہے کہ یہ دو عظیم ذمہ داریاں باقی اجتماعی اور انفرادی ذمہ داریوں کے اجراء کی ضامن ہیں اور ان کی روح شمار

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] ایضاً

[3] ایضاً

[4] نہج البلاغہ، کلمات قصار، صفحہ ۳۷۴۔

ہوتی ہیں۔

(۴) **کیا امر بالمعروف سلب آزادی کا سبب ہے ؟** : اس سوال کے جواب میں یہ کہنا مناسب ہے کہ اگرچہ یہ بات مسلّم ہے کہ افراد بشر کے لیے مل جل کر رہنا ان گنت فوائد و برکات کا حامل ہے حتیٰ کہ اس قسم کی خوبیوں نے انسان کو اجتماعی زندگی پر مجبور کر دیا ہے لیکن ساتھ ہی انسان کو چند امور کا پابند کیا گیا ہے لیکن چونکہ اجتماعی زندگی کے بے شمار فوائد کے مقابلے میں اس قسم کی پابندیاں معمولی ہیں لہٰذا انسان روزِ اول سے ان پابندیوں کو قبول کر کے اجتماعی زندگی کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔ چونکہ اجتماعی زندگی میں حیاتِ انسانی کا نظام ایک دوسرے سے مربوط ہے اور اصطلاحی طور سے معاشرے کے افراد ایک دوسرے کی تقدیر پر اثر انداز ہوتے ہیں لہٰذا دوسروں کے اعمال پر نظارت و نگرانی کا حق فطری اور اجتماعی زندگی کی خصوصیت کا حق ہے جیسا کہ اس مفہوم کو رسالتمآبؐ کی سابقہ ایک حدیث میں عمدہ طور سے بیان کیا گیا ہے لہٰذا اس فریضہ کی انجام دہی سے نہ صرف انفرادی آزادی سلب نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جو ہر فردِ بشر کا ایک فطری حق ہے جو اسے دوسروں کے مقابلے میں حاصل ہے۔

(۵) **کیا امر بالمعروف سے کوئی حرج تو پیدا نہیں ہوتا ؟** : اس مقام پر ایک اور سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب تمام لوگ اجتماعی امور میں دخیل و شریک ہیں اور ایک دوسرے کے اعمال کے نگران و محافظ ہیں تو کیا اس سے معاشرے میں گوناگوں مسائل کھڑے نہ ہو جائیں گے اور کیا یہ چیز ذمہ داریوں کی تقسیم اور معاشرے میں الگ الگ جوابدہی کے برخلاف نہیں ہے ؟ اس سوال کے جواب کے متعلق گذشتہ بیان سے بھی یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دو مرحلے ہیں۔ ایک مرحلہ جو کہ عمومی پہلو رکھتا ہے۔ اس کا دائرہ محدود ہے اور یہ صرف یاددہانی، پند و نصیحت، نقد و تنقید اور اس قسم کی چیزوں تک محدود ہے اور یہ بات مسلّم ہے کہ ایک زندہ معاشرے کے تمام افراد برائیوں کے بارے میں اس قسم کی جوابدہی رکھتے ہیں۔

لیکن دوسرا مرحلہ جو ایک خاص گروہ سے متعلق ہے اور وہ حکومتِ اسلامی کی ذمہ داری شمار ہوتا ہے، اس کا دائرہ بہت وسیع ہے بایں معنی کہ اگر اس میں سختی کی ضرورت پڑے یہاں تک کہ قصاص و حدود تک معاملہ پہنچ جائے تو بھی یہ گروہ حاکم شرعی اور کار پردازان حکومتِ اسلامی کی نگرانی میں اپنا فریضہ انجام دے سکتا ہے۔ بنابریں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مختلف مراحل اور ہر ایک کی حدود کو مدنظر رکھتے ہوئے نہ صرف یہ کہ ان سے معاشرے میں حرج و مرج اور فسادات پیدا نہیں ہوتے بلکہ مردہ معاشرے میں جان پیدا ہو جاتی ہے۔

(۶) **امر بالمعروف تلخی اور سختی نہیں** : بحث کے آخر میں اس نکتہ کی یاددہانی ضروری ہے کہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے، فریضہ بھلائی کی طرف دعوت دینے اور فتنہ و فساد کا مقابلہ کرنے میں حسن نیت اور پاکیزگی مقصد کو نہیں بھولنا چاہیے اور سوائے ضرورت کے ہر موقع پر صلح و صفائی کو ملحوظ نظر رکھنا چاہیے اور اس فریضہ کی انجام دہی میں خشونت اور سختی سے اجتناب کرنا چاہیے۔

لیکن افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ بعض لوگ اس کی انجام دہی میں خشونت آمیز انداز اپناتے ہیں اور بعض اوقات وہ بُرے اور چبھنے والے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کا امر بالمعروف نہ یہ کہ اچھے اثرات نہیں چھوڑتا بلکہ بعض اوقات یہ اُلٹا اثر دکھاتا ہے۔ حالانکہ پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ ہدیٰؑ کی سیرت طیبہ نشاندہی کرتی ہے کہ وہ ان دو فرائض کی انجام دہی میں انتہائی محبت و پیار اور لطف و کرم سے کام لیتے تھے۔ اسی بناء پر بڑے سخت مزاج افراد بھی بہت جلد ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیتے تھے۔

تفسیر المنار میں اس آیت کے ذیل میں لکھا گیا ہے کہ:

• ایک نوجوان خدمت رسولؐ میں حاضر ہوا۔ اس نے پوچھا کہ اے رسول خدا کیا اجازت ہے کہ میں زنا کروں اس بات پر وہاں کے لوگ برافروختہ ہوگئے اور ادھر ادھر سے اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کردی لیکن آپ نے بڑے تحمل اور نرمی سے فرمایا میرے قریب آؤ! وہ آپ کے قریب آیا اور آنحضرتؐ کے سامنے بیٹھ گیا۔ حضرتؐ نے محبت اور پیار کے لہجے میں اس سے پوچھا کیا تو اس پر راضی ہے کہ تیری ماں کے ساتھ یہ کام کیا جائے۔ اس نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا کہ اس طرح دوسرے لوگ بھی اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ان کی ماں کے ساتھ یہ کام کیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تو اپنی بیٹی کے ساتھ اس عمل پر راضی ہے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس طرح دوسرے لوگ بھی اپنی بیٹیوں کے ساتھ اس فعل پر راضی نہیں ہیں۔ آپ نے پھر پوچھا کہ اپنی بہن کے ساتھ اس کام کو پسند کرتے ہو۔ نوجوان نے انکار کیا اور اپنے سوال پر مکمل طور پر نادم ہوا۔ بعد ازاں آپ نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر اس کے لیے دعا کی اور فرمایا خداوندا! اس کے دل کو پاک کر اور اس کے گناہ کو معاف کر اور اس کے دامن کو معصیت کی آلودگی سے صاف رکھ۔ اس واقعے کے بعد اس نوجوان کے نزدیک سب سے زیادہ قابل نفرت کام زنا تھا۔ یہ نہی عن المنکر میں ملائمت اور محبت کا ثمرہ تھا۔

ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءھم البینات

اس آیت میں از سر نو مسئلہ اتحاد اور تفرقہ بازی سے اجتناب کرنے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ یہ آیت مسلمانوں کو گذشتہ اقوام مثلاً یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح تفرقہ اور اختلاف کی راہ اختیار کرنے اور اپنے لیے عظیم عذاب مول لینے سے ڈراتی ہے اور درحقیقت انہیں اختلاف و تفرقہ بازی کے بعد کی گذشتہ لوگوں کی تاریخ کے مطالعہ کی دعوت دیتی ہے۔

ان آیات میں اتحاد پر اصرار کرنے اور تفرقہ و نفاق سے اجتناب کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہارے معاشرے میں بھی ایسا ہونے والا ہے کیونکہ جہاں کہیں کسی چیز سے ڈرانے میں اصرار کیا جاتا ہے وہ اس کے وقوع کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے یہ پیشین گوئی کی تھی اور صراحت سے مسلمانوں کو یہ خبر دی تھی کہ یہودی قوم حضرت موسیٰؑ کے بعد ۷۱ اور عیسائی ۷۲ فرقوں میں بٹ گئی تھی اور میری امت میرے بعد تہتر ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی۔[1]

ظاہری طور سے ستر کا عدد کثرت کی طرف اشارہ ہے اور اصطلاح کے مطابق اس سے صرف کسی چیز کی کثرت بھی جاتی ہے جبکہ صحیح تعداد یعنی یہودیوں میں ایک فرقہ حق پر تھا اور بہت سے گروہ باطل پرست تھے۔ عیسائیوں کے درمیان باطل پرست فرقوں کی کثرت ہو گئی اور مسلمانوں میں ان سے بھی زیادہ فرقے بن جائیں گے۔

قرآن مجید اور پیغمبر اکرمؐ کی اس پیشین گوئی کے مطابق مسلمان آنحضرتؐ کی وفات کے بعد صراط مستقیم سے بھٹک گئے اور مذہبی عقائد بلکہ اصل دین کے معاملے میں پراگندہ ہو گئے یہاں تک کہ ایک دوسرے کو کافر کہنے لگے۔ نوبت بایں جا رسید کہ بعض اوقات تو آپس میں سب و شتم اور ایک دوسرے پر لعنت سے دریغ نہ کیا گیا۔ معاملہ اتنا سنگین ہو تا گیا کہ بعض مسلمان ایک دوسرے کی جان و مال کو حلال سمجھنے

---

[1] یہ روایت مختلف شیعہ سنی طریقوں سے مروی ہے۔ شیعہ طریقوں سے یہ روایت خصال، معانی، احتجاج، امالی صدوق، اصل سلیم بن قیس اور تفسیر عیاشی میں منقول ہے اور سنی طریقوں سے یہ روایت در منثور، جامع الاصول اور ملل و نحل میں نقل ہوئی ہے۔

گے اور مسلمانوں کے درمیان اتنی عداوت اور دشمنی پھیل گئی کہ کچھ مسلمان کفار سے جا ملے اور اپنے دینی بھائیوں سے جنگ و جدال کرنے پر تل گئے یوں اتحاد و وحدت جس میں مسلمانوں کی کامیابی کا راز مضمر تھا، اختلاف و انتشار میں بدل گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ شقاوت و بدبختی میں مبتلا ہو گئے اور اپنی عظمت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اولئك لهم عذاب عظيم

جو لوگ واضح دلیلوں کے بعد بھی دین میں اختلاف کرتے ہیں، وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ اس میں کلام نہیں کہ اختلاف و انتشار کا فوری نتیجہ ذلت و خواری کے سوا کچھ نہیں اور ہر قوم کی ذلت و خواری کے راز کو ان کے اختلاف و نفاق میں تلاش کرنا چاہیے۔

وہ معاشرہ جس کی قدرت و توانائی کی بنیاد اس کے ارکان کی تفرقہ بازی کے ہمیشہ سے پاش پاش ہو جائے، ان کی سرزمین ہمیشہ غیروں کی چراگاہ بن جاتی ہے اور کسی سامراجی حکومت کے تصرف میں داخل ہو جاتی ہے۔ واقعاً یہ کتنا بڑا عذاب ہے۔

باقی رہا آخرت کا عذاب تو جیسا قرآن نے بھی بیان کیا ہے وہ اس عذاب سے کہیں زیادہ سخت ہے اور وہ تفرقہ ڈالنے والوں کے انتظار میں ہے۔

۱۰۶۔ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ○

۱۰۷۔ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○

ترجمہ

۱۰۶ (نفاق ڈالنے والوں پر وہ عظیم عذاب) اس دن ہوگا جب کچھ چہرے سفید اور کچھ سیاہ ہو جائیں گے۔ وہ لوگ جن کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے (ان سے کہا جائے گا) کیا تم ایمان (اور سایۂ اخوت میں آنے) کے بعد کافر ہو گئے تھے تو (اب) اپنے کئے ہوئے کفر کے عذاب کا مزہ چکھو۔

۱۰۷ لیکن وہ جن کے چہرے سفید ہوں گے وہ خدا کی رحمت میں ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر

نورانی اور تاریک چہرے

يوم تبيض وجوه وتسود وجوه

اس تنبیہ کے بعد کہ جو گذشتہ آیات میں تفرقہ بازی، نفاق اور کفر و جاہلیت کے زمانے کے آثار کی طرف پلٹ جانے کے بارے میں

کی گئی تھی، ان دو آیات میں ان کے آخری نتائج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کس طرح کفر، تفرقہ بازی، نفاق و جاہلیت کی طرف پلٹ جانا روسیاہی کا سبب ہے اور کس طرح اسلام و ایمان اور اتحاد و خلوص سفید روئی کا سبب ہیں۔

مندرجہ بالا آیات تصریح کر رہی ہیں کہ روزِ قیامت کچھ چہرے نورانی ہوں گے اور کچھ تاریک۔ جن کے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے کہا جائے گا کہ تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیوں اختیار کیا اور اسلام کے زیرِ سایہ اتحاد و اخوت کی راہ اپنانے کے بعد نفاق و جاہلیت کی راہ کیوں اختیار کی۔ ان کے مقابلے میں وہ مومنین جو متحد و متفق رہے ہوں گے دریائے رحمتِ الٰہی میں ڈوب جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے وہاں راحت و آرام کی زندگی بسر کریں گے۔

کئی دفعہ یہ یاد دہانی کرائی جا چکی ہے کہ دوسرے جہان میں انسان کی زندگی کے حالات و کیفیات اور جزا و سزا اس جہان کے اعمال اور افکار کے مجسمے ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں اس جہان میں جو کام بھی انسان سے سرزد ہوتا ہے وہ روح کی گہرائیوں میں وسیع اثرات مرتب کرتا ہے۔ ممکن ہے اس دنیا میں اسے نہ سمجھا جا سکے، لیکن قیامت میں یہ حقیقی صورت میں جلوہ گر ہوں گے اور چونکہ وہاں روح کی حاکمیت و تجلی زیادہ ہوگی اس لیے اس کے آثار جسم پر بھی مرتب ہوں گے۔ جیسا کہ اس جہان کا ایمان و اتحاد سفید روئی کا سبب ہے اور اس کے برعکس بے ایمان لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ اگلے جہان میں یہ مجازی سفیدی اور سیاہی حقیقی شکل اختیار کرے گی اور لوگ روشن یا سیاہ چہروں کے ساتھ محشور ہوں گے۔

قرآن کی دیگر آیات بھی اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔ مثلاً جو لوگ بار بار گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں ان کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا (یونس: ۲۷)

گویا ان کے چہروں کو اندھیری رات کے تاریک ٹکڑوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔

جو لوگ خدا پر جھوٹ یا افترا باندھتے ہیں ان کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہے:

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ (زمر: ۶۰)

قیامت کے دن تو ان لوگوں کو دیکھے گا جو خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں کہ ان کے چہرے سیاہ ہیں اور یہ سب کچھ ان کے کئے ہوئے اعمال کی پاداش ہے۔

۱۰۸۔ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ○

۱۰۹۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ○

ترجمہ

۱۰۸۔ کتاب کی یہ برحق آیات ہیں جنہیں ہم تیرے سامنے پڑھ کر سناتے ہیں اور خدا ہرگز عالمین کے لیے ظلم و ستم کا ارادہ نہیں رکھتا۔

۱۰۹ اور (کس طرح ممکن ہے کہ خدا ظلم چاہے جبکہ) جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے وہ اس کی ملکیت میں ہے اور تمام کاموں کی بازگشت اسی کی طرف ہے (اور اس کے حکم سے ہے)۔

تفسیر

تلك آيات الله نتلوها عليك بالحق وما الله يريد ظلما للعالمين ۔

مندرجہ بالا آیت گذشتہ مطالب اتحاد و اتفاق، ایمان و کفر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور ان کے نتائج کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہ خدا کی برحق آیات ہیں جو ہم تیرے سامنے پڑھتے ہیں اور ان احکامات کی خلاف ورزی کی وجہ سے جو کچھ لوگوں کو بھگتنا پڑتا ہے ان کے اعمال کی پاداش ہے اور خداوند تعالیٰ کسی پر کسی قسم کا ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ وہی بُرے اثرات ہیں جو انہوں نے اپنے ہاتھ سے فراہم کئے ہیں۔

وللہ ما فی السموات وما فی الارض والی اللہ ترجع الامور

یہ آیت خدا کے ظالم نہ ہونے پر دو دلیلیں پیش کرتی ہے:

پہلی یہ کہ وہ خدا جو ان تمام کا خالق و مالک ہے، اس کے بارے میں ظلم کا تصور نہیں ہو سکتا کیونکہ ظلم و زیادتی تو وہ کرتا ہے جس کے پاس وہ چیز نہ ہو جو دوسروں کے پاس موجود ہے۔ لہٰذا اسے حاصل کرنے کے لیے وہ ظلم کا ارتکاب کرتا ہے۔

دوسری دلیل یہ کہ ظلم و ستم کا تصور اس کے بارے میں ہو سکتا ہے جس کی خوشنودی حاصل کئے بغیر کوئی کام وقوع پذیر ہو سکتا ہو لیکن اس ذات کے بارے میں ظلم و ستم چہ معنی کہ جس کی اجازت کے بغیر کوئی کام انجام پذیر نہیں ہو سکتا اور تمام امورِ کائنات کا آغاز و انجام اسی کی ذات سے وابستہ ہے۔

۱۱۰۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ ۚ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ ○

ترجمہ

۱۱۰ تم وہ بہترین قوم تھے جسے لوگوں کے فائدے کے لیے پیدا کیا گیا ہے تاکہ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو اور خدا پر ایمان لے آؤ اور اگر دیگر اہلِ کتاب (اس پروگرام اور واضح آئین پر) ایمان لے آئیں تو ان کے لیے فائدہ ہے لیکن ان میں سے تھوڑے ہی صاحبِ ایمان ہیں ورنہ اکثر فاسق (اور پروردگار کی اطاعت سے خارج) ہیں۔

تفسیر

فتنہ و فساد کا مقابلہ کرنے اور دعوتِ حق کی یاد دہانی

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف۔

اس آیت میں امر بالمعروف نہی عن المنکر اور خدا پر ایمان رکھنے کی دعوت کا اعادہ کیا گیا ہے اور جیسا کہ آیہ ۱۰۴ کے ذیل میں کہا گیا ہے یہ آیت بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک اجتماعی فریضہ کے طور پر بیان کرتی ہے جبکہ گذشتہ آیت نے اس کے ایک خاص مرحلہ کو بیان کیا تھا جو خصوصی اور واجب کفائی ہے اور اس کی تفصیلی تشریح بیان کی جا چکی ہے۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں مسلمانوں کو بہترین اُمت کہا گیا ہے جسے انسانی معاشرہ کی خدمت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اس کی دلیل یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اور خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی معاشرے کی اصلاح ایمان، دعوتِ حق اور فتنہ و فساد کا مقابلہ کیے بغیر ممکن نہیں۔

ضمنی طور پر اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ دو عظیم فرائض دینِ اسلام میں جو وسعت رکھتے ہیں وہ گذشتہ ادیان میں نہ تھی اور اس اُمت کا بہترین ہونا واضح ہے کیونکہ یہ آخری آسمانی دین کی حامل ہے اور آخری دین تکامل کی اساس پر کامل ترین دین ہے۔ مندرجہ بالا دو آیات میں مزید دو نکات کی طرف بھی توجہ کیا گیا ہے؛

پہلا نکتہ یہ ہے کہ "کنتم" (تم تھے) فعل ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے یعنی تم گذشتہ زمانے میں بہترین اُمت تھے اس لفظ کے بارے میں اگرچہ مفسرین نے بہت سے احتمالات ذکر کیے ہیں، لیکن اکثریت کا نظریہ یہ ہے کہ فعل ماضی کی تعبیر تاکید کے لیے ہے اور قرآن مجید میں اس قسم کی تعبیرات کثرت سے موجود ہیں۔ ————

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس مقام پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایمانِ خدا پر مقدم کیا گیا ہے جس سے ان دو عظیم خدائی فرائض کی اہمیت و عظمت مترشح ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ان دو عظیم فرائض کی انجام دہی دائرہ ایمان پھیلانے اور تمام انفرادی و اجتماعی قوانین کے اجراء کی ضمانت ہے اور عملی طور پر اجراءِ قانون کا ضامن خود قانون پر مقدم ہوتا ہے۔ تمام باتوں کو چھوڑ کر اگر ان دو فرائض کو انجام نہ دیا جائے تو دلوں میں ایمان کی جڑیں بھی کمزور ہو جاتی ہیں اور اس کے ستون بھی گر جاتے ہیں اسی سبب سے انہیں ایمان پر مقدم رکھا گیا ہے۔

اس بیان سے اس بات کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ مسلمان اس وقت تک ایک ممتاز اُمت شمار ہوتے رہیں گے جب تک نیکی کی دعوت دینے اور فتنہ و فساد کا مقابلہ کرنے کو فراموش نہیں کریں گے اور جب انہوں نے اس سے صرفِ نظر کر لیا لہذا یہ بہترین اُمت رہیں گے اور نہ انسانی معاشرے کے لیے فائدہ مند۔

اس بات کی طرف بھی متوجہ ہونا چاہیے کہ اس آیت میں تمام مسلمانوں سے خطاب کیا جا رہا ہے جیسا کہ قرآن میں کئی مقامات پر یہی انداز و روش ہے۔ کچھ لوگوں نے اس سے مہاجرین یا سابق مسلمان مراد لیے ہیں لیکن اس پر کوئی دلیل موجود نہیں۔

ولو امن اھل الکتاب لکان خیرا لھم منھم المومنون واکثرھم الفاسقون

بعد ازاں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ مذہب جو اس طرح روشن ہے اور وہ قوانین جو اس قدر باعظمت ہیں ان کے فوائد سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بنا بریں اگر اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) ان باتوں پر ایمان لے آئیں تو ان کا اپنا ہی فائدہ ہے لیکن بہت افسوس کا مقام ہے کہ ان کی اقلیت نے جا بجا رتعصب پر ٹھوکر مار کر کھلے دل سے اسلام قبول کیا ہے جب کہ ان کی اکثریت فرمانِ خداوندی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کے متعلق اپنی کتب میں موجود بشارتوں کی بھی پرواہ نہیں کی اور وہ اپنے کفر و تعصب پر اسی طرح ڈٹے ہیں۔

۱۱۱۔ لَنْ يَضُرُّوكُمْ إِلَّا أَذًى ۖ وَإِن يُقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنصَرُونَ ○

۱۱۲۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ○

ترجمہ

۱۱۱۔ اور وہ (اہل کتاب خصوصاً یہودی) تمہیں ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتے سوائے تھوڑی سی آزار و اذیت کے اور اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تمہیں پیٹھ دکھا کر (بھاگ) جائیں گے۔ اس کے بعد کوئی بھی ان کی مدد کو نہیں آئے گا۔

۱۱۲۔ وہ جہاں کہیں بھی ملیں گے ان پر ذلت و رسوائی کی مہر لگی ہوئی ہے مگر یہ کہ وہ خدا سے رابطہ قائم کریں (اور اپنی ناپسندیدہ روش پر تجدید نظر کریں) یا لوگوں سے وابستگی کے ذریعے (ادھر ادھر سے مدد حاصل کریں)۔

اور وہ خدا کے غضب میں گھرے ہوئے ہیں اور بیچارگی کی مہر ان پر ثبت ہو چکی ہے۔ کیونکہ وہ آیاتِ خداوندی کا انکار کرتے تھے اور خدا کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ سب کچھ ان کے گناہوں کی وجہ سے ہے اور وہ (دوسروں کے حقوق پر) تجاوز کرتے ہیں۔

شانِ نزول

جب بعض روشن ضمیر سرداران یہود مثلاً عبداللہ بن سلام اپنے رفقاء کے ہمراہ دینِ اسلام میں داخل ہو گئے تو یہودیوں کے بعض سرداران کے پاس آئے اور انہیں سرزنش و ملامت کی یہاں تک کہ انہیں دھمکی دی اور کہا کہ تم اپنے آباؤ اجداد کا دین چھوڑ کر اسلام کیوں لے آئے ہو اس پر مندرجہ بالا آیات انہیں اور باقی مسلمانوں کو مژدہ سنانے کے لیے نازل ہوئیں۔

تفسیر

لن یضروکم الا اذی وان یقاتلوکم یولوکم الادبار ثم لا ینصرون

بعض مسلمان اپنی سابقہ کافر قوم کے ہاتھوں مصیبت میں مبتلا تھے وہ انہیں قبولِ اسلام پر سرزنش و ملامت کرتے تھے اور بعض اوقات انہیں دھمکیاں دیتے تھے یہ آیت انہیں بشارت دیتی ہے کہ مخالفین تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور بہت کم ضرر پہنچا سکتے ہیں اور بدکلامی سے بڑھ کر کچھ نہیں کر سکتے۔

ان دونوں آیات میں درحقیقت مسلمانوں کے لیے چند پیشین گوئیاں اور خوشخبریاں ہیں جو تمام کی تمام حضورؐ کے دور میں ظاہر ہوئیں:

۱ اہلِ کتاب کبھی مسلمانوں کو کوئی قابلِ اعتنا ضرر نہیں پہنچا سکیں گے اور ان کے معمولی نقصانات دیرپا نہیں ہوں گے (لن یضروکم الا اذی)۔

۲ جب وہ مسلمانوں کے ساتھ میدانِ کارزار میں برسرِ پیکار ہوں گے تو انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑے گا اور آخری فتح و کامیابی مسلمانوں کو نصیب ہوگی اور یہودیوں کی حمایت کے لیے کوئی بھی نہیں کھڑا ہوگا (وان یقاتلوکم یولوکم الادبار ثم لا ینصرون)۔

۳ یہ کبھی اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوں گے اور ہمیشہ ذلیل و خوار رہیں گے مگر یہ کہ اپنے پروگرام کو تبدیل کریں اور خدا کی راہ پر چلیں یا دوسرے لوگوں سے مل جائیں اور وقتی طور پر ان کی طاقت سے فائدہ اٹھائیں (ضربت علیھم الذلۃ این ما ثقفوا)۔

بہت جلد یہ تینوں وعدے نبی اکرمؐ کے زمانے میں پورے ہو گئے خصوصاً حجاز کے یہودی (بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع، بنی مصطلق اور خیبر کے یہودی)، کئی مرتبہ مسلمانوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں آمنے سامنے ہوئے اور بالآخر سب شکست سے دوچار ہو کر روپوش ہو گئے۔

ضربت علیھم الذلۃ اینما ثقفوا الا بحبل من اللہ وحبل من الناس۔

ثقفوا کا مادہ ثقف (بروزن سقف) ہے۔ اور ثقافت کے لغوی معنی کسی چیز کو مہارت کے ساتھ پا لینے کے ہیں اور جس چیز کو انسان باریک بینی اور مہارت کے ساتھ حاصل کرے اسے ثقافت کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید کے اس جملے میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ جہاں کہیں ہوں ذلت کی مہر ان کی پیشانی پر ثبت ہو چکی ہے۔

اگرچہ ان آیات میں یہودیوں کا نام لے کر ان کو نہیں پکارا گیا، تاہم سورۂ بقرہ کی آیت ۶۱ اور ان آیات کے قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ بھی یہودیوں کے بارے میں ہے۔

اس کے بعد اس جملے کے ذیل میں کہا گیا ہے کہ صرف دو صورتیں ہیں جن کی وجہ سے وہ اس ذلت کی مہر کو مٹا سکتے ہیں پہلی صورت خدا کی طرف بازگشت اور اس سے رشتہ جوڑنا ہے اور اس کے سچے دین پر ایمان لانا ہے (الا بحبل من اللہ) یا لوگوں سے وابستگی اور ان کا سہارا لینا ہے (وحبل من الناس)۔

اگرچہ ان دو تعبیرات (حبل من اللہ وحبل من الناس) کے بارے میں مفسرین نے کئی احتمالات ذکر کیے ہیں لیکن جو کچھ کہا گیا

ہے وہ آیت کے معنی کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے کیونکہ جس وقت "حبل من اللہ" (خدا سے ارتباط) "حبل من الناس" (لوگوں سے ارتباط) کے مقابلے میں ہو تو اس سے دو مختلف معانی مراد ہوں گے نہ کہ ان میں سے ایک ایمان لانے کے معنی میں ہے اور دوسرا مسلمانوں کی طرف سے امن و امان ہونے کے معنی میں۔

بنابرایں آیت کے مفہوم کا ظاہر یہ ہوگا کہ یا تو وہ اپنی زندگی کے پروگرام پر تجدید نظر کریں اور خدا کی طرف پلٹ آئیں اور اپنے انکار سے شیطنت وکینہ پروری کو مٹا دیں اور یا لوگوں سے وابستگی پیدا کر کے اپنی نفاق آلود زندگی کو جاری رکھیں۔

وَبَاؤُا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ۔

"باؤ" لغت میں رجوع کرنے اور سکونت کرنے کے معنی میں ہے اور یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ خلاف ورزیوں کی بنا پر خدا کی سزا کی مستحق ہو گئی ہے اور وہ غضب خداوندی کو اپنی منزل مقصود قرار دے چکی ہے۔

"مسکنت" کے معنی ہیں "بیچارگی" بالخصوص ایسی سخت بیچارگی جس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہو اور یہ "سکونت" کے مادہ سے ہے۔ کیونکہ مسکین افراد کمزوری اور احتیاج کی وجہ سے اپنی جگہ سے حرکت کی قدرت نہیں رکھتے۔ البتہ یہ یاد رہے کہ مسکین کا معنی صرف مال و دولت کی وجہ سے محتاج نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی کمزوری وناتوانی اس کے مفہوم میں داخل ہے۔ بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ مسکنت و ذلت میں یہ فرق ہے کہ "ذلت" دوسروں کی طرف سے وارد ہوتی ہے جبکہ "مسکنت" کسی شخص کی ذاتی اور اندرونی کم مائیگی و کم ہمتی کا معنی دیتی ہے۔

اس لحاظ سے اس جملے کا معنی یہ ہے کہ یہودی اول تو اپنی کارستانیوں کی وجہ سے دوسروں کی طرف سے دھتکارے گئے ہیں اور غضب خدا میں گرفتار ہوئے ہیں پھر آہستہ آہستہ یہ ان کے لیے ایک ذاتی صفت بن گیا ہے حتیٰ کہ وہ تمام امکانات کے باوجود احساس حقارت میں مبتلا ہیں۔ اس لیے اس جملے میں کوئی استثناء موجود نہیں ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ۔

آیت کے آخری حصے میں یہودیوں کی بدبختی کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ اگر وہ ایسی بدبختی میں گرفتار ہیں تو اس کی وجہ نسلی و خاندانی ہے نہ کہ دوسری خصوصیات بلکہ یہ ان کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ اول تو یہ خدا کی آیات کا انکار کرتے تھے اور ثانیاً یہ کہ پیشوایان خلق اور نجات دہندگانِ بشر کو قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے اور تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ مختلف نوعیت کے گناہوں، ظلم وستم کرنا، دوسروں کے حقوق پر قبضہ کرنا اور باقی لوگوں کے منافع پر تجاوز کرنا میں مبتلا تھے اور مسلم ہے کہ جو قوم اس قسم کے اعمال کا ارتکاب کرے گی، اس کی حالت بھی ان سے مشابہ ہو گی۔

یہودیوں کی عبرتناک داستان

یہودیوں کی تاریخ گذشتہ آیات کے مطالب ومفاہیم کی مکمل تائید کرتی ہے اور ان کی موجودہ حالت بھی اس کی بشارت دیتی ہے۔ ان آیات میں ضربت علیہم الذلۃ (ان پر مہر ذلت لگ چکی ہے) تشریعی حکم نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین اس کے قائل ہیں بلکہ یہ تکوینی ہے اور تاریخ کا اٹل فیصلہ ہے کہ جو قوم گناہوں میں ڈوبی ہوئی ہو اور جن کا پروگرام دوسروں کے حقوق پر ہاتھ ڈالنا اور بشریت کے رہنماؤں کو قتل کرنے پر مشتمل ہو ان کا انجام کار یہی ہوگا مگر یہ کہ وہ اپنی طرز زندگی میں تبدیلی پیدا کریں اور اس راستے سے پلٹ آئیں اور یا دوسرے لوگوں

سے رابطہ قائم کر کے چند روزہ زندگی گذاریں۔ جو واقعات اس دور میں اسلامی ممالک میں رونما ہو رہے ہیں یعنی مسلمانوں کے مقابلے میں صہیونیت کا ایک خاص مقام حاصل کرنا، انہیں دوسروں کی حمایت حاصل ہونا اور بہت سے دیگر عوامل جن کی وجہ سے انہیں مقام حاصل ہے، یہ سب امور اس حقیقت کے شاہد ہیں جو ان آیات سے معلوم ہوتی ہے۔

شاید گذشتہ تلخ تجربات اور ان حوادث سے جنہوں نے ان کی تاریخ کی راہ کو بدل دیا ہے یہ باعث نہیں کر وہ اپنے پروگرام میں تجدید نظر کریں اور وہ دیگر اقوام کے ساتھ صلح و آشتی کے ساتھ پیش آئیں اور دوسروں کے حقوق کا احترام کر کے ان کے ساتھ صلح آمیز زندگی گذاریں۔

۱۱۳۔ لَيْسُوا سَوَآءً ۗ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيَاتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝

۱۱۴۔ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرَاتِ ۗ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

۱۱۵۔ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۱۳۔ وہ سب برابر نہیں ہیں۔ اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا ہے جو (حق و ایمان کے ساتھ) قائم ہے اور وہ اوقات شب میں مسلسل حالتِ سجدہ میں آیات خدا کی تلاوت کرتے ہیں۔

۱۱۴۔ وہ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اور نیک کاموں کی انجام دہی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں اور وہ نیک لوگوں میں سے ہیں۔

۱۱۵۔ جو نیک اعمال وہ سر انجام دیتے ہیں انہیں ہرگز نظر انداز نہیں کیا جائے گا اور وہ اچھی جزا پائیں گے) اور خدا پرہیزگاروں کو جانتا ہے۔

شانِ نزول

کہا جاتا ہے کہ جب عبداللہ بن سلام جو ایک یہودی عالم تھا۔ کچھ لوگوں کے ہمراہ مسلمان ہوا تو یہودیوں کے سرداروں کو بہت رنج پہنچا اور وہ اس بات کے درپے ہو گئے کہ انہیں شرارت کا الزام دیں تا کہ یہ لوگوں کی نگاہ میں گر جائیں تا کہ ان کا عمل دوسروں کے لیے نمونہ اور قابل تقلید نہ بنے لہٰذا علماءِ یہود نے یہ نعرہ بلند کیا کہ ہم سے صرف شریر لوگ مسلمان ہوئے ہیں اگر وہ صحیح لوگ ہوتے تو اپنے آباؤ اجداد کا دین نہ چھوڑتے اور ملتِ یہود کے ساتھ خیانت نہ کرتے۔ خداوند عالم نے ان آیات کو نازل کر کے ان کا دفاع کیا ہے۔

تفسیر

"لیسوا سواء من اھل الکتاب امة قائمة یتلون آیات اللہ آناء اللیل" ؎

گذشتہ آیات میں یہودیوں کے بُرے افراد کی شدید مذمت کے بعد قرآن کریم اس آیت میں عدالت کے پیش نظر اوران کے اچھے افراد کے حقوق کے احترام کی وجہ سے اور یہ حقیقت بتانے کے لیے، کہ ان سب کو ایک نگاہ سے نہیں دیکھا جاسکتا، کہتا ہے کہ اہل کتاب تمام کے تمام ایک جیسے نہیں بلکہ تباہ کار افراد کے مقابلے میں ایسے نیک طینت افراد بھی موجود ہیں جو خدا کی اطاعت اور ایمان پر ثابت قدم ہیں وہ ہمیشہ نیم شب کو آیاتِ خدا کی تلاوت کرتے رہتے ہیں اور عظمت پروردگار کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں اور خدا و روزِ جزا پر ایمان رکھتے ہیں، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور نیک کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ وہ صالح اور باایمان افراد ہیں۔

اسی طرح یہاں سے اس سے کہ خدا یہودی نسل کی کلی طور پر مذمت کرے اور ان کی مخالفت کرے یا ان کے خون کو بُرا کہے، صرف ان کے بُرے اعمال کی نشاندہی کرتا ہے اور ان افراد کی تعظیم و تکریم کرتا ہے اور اچھائی سے یاد کرتا ہے جنہوں نے فاسد اکثریت سے جدا ہو کر حق و ایمان کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا ہے اور یہی اسلام کی روش ہے کہ کبھی رنگ یا نسل و قبیلہ کو مدنظر نہیں رکھتا بلکہ وہ صرف لوگوں کے عقائد اور ان کے اعمال کو نظر میں رکھتا ہے۔

ضمناً چند ایک روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آیات صرف عبداللہ بن سلام اور اس کے ساتھیوں کے لیے منحصر نہیں بلکہ ان کے علاوہ نجران کے چالیس عیسائی، حبشہ کے بائیس افراد اور آٹھ رومی بھی اس آیت کے مصداق ہیں اور اہلِ کتاب کی وسیع تعبیر اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

"وما یفعلوا من خیر فلن یکفروہ"

یہ آیت دراصل پہلی آیات کی تکمیل کرتی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے اس گروہ کے نیک اعمال کی بہترین جزا ہوگی یعنی گذشتہ عمر میں اگرچہ غلطیوں کے مرتکب رہے ہوں، جب انہوں نے اپنی روش بدلی اور پرہیزگاروں کی صف میں شامل ہوگئے تو یہ اپنے نیک اعمال کا ثمرہ دیکھ لیں گے اور خدا کی طرف سے ہرگز ناقدری نہیں پائیں گے۔

"واللہ علیم بالمتقین"

باوجودیکہ خدا تمام چیزوں کو جانتا ہے، اس جملے میں خصوصیت سے کہتا ہے کہ خداوند عالم پرہیزگاروں سے آگاہ ہے اور یہ تعبیر پرہیزگار لوگوں کی اقلیت کی غمازی کرتی ہے۔ خصوصاً پیغمبرؐ کے زمانے کے یہودیوں میں سے تو یہ راستہ اختیار کرنے والے بہت ہی اقلیت میں تھے اور یہ فطری بات ہے کہ اس قسم کے کم تعداد افراد نظر میں نہیں رہتے لیکن پروردگارِ عالم کے وسیع علم کی تیز نگاہ سے یہ لوگ ہرگز مخفی نہیں رہیں گے اور خدا ان سے آگاہ ہے۔ ان کے نیک اعمال کم ہوں یا زیادہ ہرگز رائیگاں نہیں ہوں گے۔

؎ "آناء" دراصل "انا" (بروزن "رضا") کی جمع ہے اور "انا" (بروزن "نحا") کا معنی ہے اوقات۔

۱۱۶۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡہُمۡ اَمۡوَالُہُمۡ وَ لَاۤ اَوۡلَادُہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ شَیۡـًٔا ؕ وَ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ○

۱۱۷۔ مَثَلُ مَا یُنۡفِقُوۡنَ فِیۡ ہٰذِہِ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا کَمَثَلِ رِیۡحٍ فِیۡہَا صِرٌّ اَصَابَتۡ حَرۡثَ قَوۡمٍ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ فَاَہۡلَکَتۡہُ ؕ وَ مَا ظَلَمَہُمُ اللّٰہُ وَ لٰکِنۡ اَنۡفُسَہُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ○

ترجمہ

۱۱۶۔ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ ہرگز اپنے اموال اور اولاد کے ذریعے اللہ کے عذاب وسزا سے نہیں بچ سکتے۔ وہ اہل جہنم ہیں اور ہمیشہ کے لیے اس میں رہیں گے۔

۱۱۷۔ جو کچھ وہ اس دنیاوی زندگی میں خرچ کرتے ہیں وہ جلانے والی (گرم) ہوا کی مانند ہے جو اس قوم کی زراعت پر چل پڑے جس نے اپنے اوپر ظلم کیا (اور نامناسب وقت پر زراعت کی) پس وہ اسے نیست و نابود کر دے۔ خدا نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔

تفسیر

"ان الذین کفروا لن تغنی عنھم اموالھم ولا اولادھم من اللہ شیئا"

گذشتہ آیت میں حق جو اور باایمان افراد کی ستائش کی گئی ہے۔ ان کے مقابلے میں بے ایمان اور ستمگر لوگ ہیں ان کی حالت ان دو آیات میں بیان کی گئی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے وہ ہرگز اپنے مال و دولت اور اولاد کی کثرت کے گھمنڈ میں خدا کی سزا سے چھٹکارہ نہیں پا سکتے کیونکہ روز جزا صرف نیک عمل، صدق ایمان اور خلوص نیت ہی انسان کے کام آئے گا نہ کہ اس جہاں کے مادی امتیازات۔

"یوم لا ینفع مال ولا بنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم"

اس دن مال واولاد ذرہ برابر فائدہ نہیں دیں گے مگر یہ کہ وہ پاک وصاف دل سے کر بارگاہ الٰہی میں حاضر ہو۔

(الشعراء آیہ ۸۸، ۸۹)

مادی وسائل میں سے صرف دولت اور اولاد کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لیے ہوا ہے کہ اہم ترین مادی سرمایہ ایک تو افرادی قوت ہے جس

کی طرف اولاد سے اشارہ کیا گیا ہے اور دوسرا اقتصادی سرمایہ ہے اور دیگر مادی وسائل کا سرچشمہ یہی دونوں چیزیں ہیں۔

قرآن واضح طور پر اعلان کر رہا ہے کہ صرف مال ومتاع اور افرادی قوت کے بل بوتے پر خدا کے ہاں امتیاز حاصل نہیں کیا جا سکتا اور انہی پر بھروسہ کرنا خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے مگر یہ کہ انہیں ایمان اور خلوصِ نیت کے ساتھ صحیح راستوں میں خرچ کیا جائے، ورنہ بصورت دیگر ان کے مالکوں کا انجام کار دائمی عذاب ہے (اولٓئک اصحاب النار ھم فیھا خلدون)۔

"مثل ما ینفقون فی ھذہ الحیٰوۃ الدنیا کمثل ریح فیھا صر......."

صر اور اصرار ایک ہی اصل سے ہیں اور ان کے معنی شدت کے ساتھ جکڑ دیں چیز کو باندھنے کے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد ہوا کی شدت وسختی ہے چاہے وہ ہوا جلانے والی ہو یا ٹھنڈی اور خشک کرنے والی۔

- اس آیت میں ان کی ریاکارانہ سخاوت اور خرچ کرنے کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے اور ایک بہترین مثال کے ذریعے ان کے انجام کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

قرآن کریم کفار کے خرچ کرنے کو سخت قسم کی جلانے والی یا بہت سرد اور خشک کر دینے والی ہوا سے تشبیہ دیتا ہے جو کسی زراعت پر چل پڑے اور اسے خشک کر دے۔ البتہ ہوا کی فطرت وطبیعت جلا دینے والی نہیں ہے چنانچہ نسیم بہار شگوفوں پر نوازش کرتی ہے۔ غنچوں کے دہن کھول دیتی ہے اور درختوں کے سانچوں میں روح پھونک کر انہیں بار آور کر دیتی ہے۔ اسی طرح انفاق اور خرچ کرنے کا سرچشمہ بھی ایمان وخلوص ہو تو اسی طرح ثمر آور ہے۔ وہ اجتماعی مشکلات کو بھی حل کر دیتا ہے اور احسان کرنے والے کے دل میں ایک دیرپا اثر بھی چھوڑ جاتا ہے اور اس کے قلب میں اچھی صفات اور فضائل کے سرچشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ لیکن اگر یہ حیات آفرین بادِ نسیم طوفان بن جائے یا بہت زیادہ ٹھنڈی ہوا میں تبدیل ہو جائے تو وہ جس پھول اور سبزہ پر چلے گی اسے تباہ کر دے گی۔

بے ایمان اور گناہ آلود افراد کا چونکہ انفاق میں صحیح مقصد نہیں ہوتا اس لیے خود نمائی اور ریاکاری کی روح کو جلانے والی خشک ہوا ان کے انفاق کی زراعت پر چل پڑتی ہے اور اسے ناکارہ بنا دیتی ہے۔ اس قسم کے اخراجات نہ اجتماعی مشکلات کا سدباب کر سکتے ہیں (چونکہ زیادہ تر بے جا صرف ہوتے ہیں) اور نہ خرچ کرنے والے کے لیے کوئی اخلاقی ثمرہ دیتے ہیں۔ توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ ارشاد ہوا ہے: حرث قوم ظلموا یعنی اس جلانے اور خشک کرنے والی ہوا کا نشانہ ایسے لوگوں کی زراعت ہے جو اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ زراعت کے لیے وقت اور جگہ کے انتخاب میں غور وفکر سے کام نہیں لیتے اور انہوں نے ایسی زمین میں تخم ریزی کی ہے کہ جو طوفانی ہواؤں کی زد میں تھی اور ایسا وقت چنا ہے جو گرم ہوا کے چلنے کا تھا۔ اس طرح انہوں نے اپنے اوپر خود ظلم کیا ہے۔ یونہی بے ایمان افراد انفاق کرتے وقت اور جگہ کے انتخاب میں اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں اور اپنا سرمایہ نامناسب مقام پر برباد کرتے ہیں گذشتہ تفصیل اور آیت کے قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تشبیہ درحقیقت دو علیحدہ علیحدہ چیزوں کے درمیان ہے ایک تو ان کے انفاق کو بے موقع بے محل زراعت سے تشبیہ دی گئی ہے اور دوسری خرچ کرنے کی وجہ اور علت کو ٹھنڈی اور جلانے والی ہوا سے تشبیہ دی گئی ہے۔

بنا برایں آیت میں کچھ تقدیر ضرور ہے اور "مثل ما ینفقون" کے معنی یہ ہیں کہ ان کے انفاق کے اسباب وعلل کی مثال خشک سرد اور جلانے والی ہوا کی طرح ہے (غور کیجیے گا)۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت ان اموال کی طرف اشارہ کرتی ہے جو دشمنانِ اسلام دین کو تباہ و برباد کرنے کے لیے صرف کرتے تھے اور اس کے ذریعے وہ مخالفینِ اسلام کو رسولِ اسلام کے خلاف اکساتے تھے یا وہ اموال جو یہودی اپنے علماء کو کتب آسمانی میں تحریف کرنے کے عوض دیتے تھے لیکن واضح ہے کہ آیت کے مفہوم میں عمومیت ہے اور یہ ان لوگوں کے علاوہ اس قسم کے باقی افراد کے لیے بھی ہے۔

" وما ظلمهم الله ولكن انفسهم يظلمون "

آیت کے آخر میں کہا گیا ہے کہ خدا نے اس سلسلے میں اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور وہ اپنا سرمایہ خود برباد کرتے ہیں کیونکہ فاسد اور بُرے کام کا نتیجہ فاسد اثر کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

۱۱۸۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ ۝

۱۱۹۔ هَا أَنتُمْ أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

۱۲۰۔ إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ۝

ترجمہ

۱۱۸۔ اے ایمان والو! اپنوں کے علاوہ کسی کو رازدار نہ بناؤ۔ وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کے بارے میں کوتاہی نہیں کریں گے وہ تمہاری تکلیف اور رنج پر خوش ہوتے ہیں، ان کے دل کی دشمنی اور عداوت ان کے منہ سے نکل پڑتی ہے اور جو کچھ ان کے دلوں میں ہے وہ اس سے بھی شدید تر ہے۔ ہم نے آیات (اور ان سے محفوظ رہنے کی تدابیر) تمہارے لیے واضح کر دی ہیں بشرطیکہ تم عقل و خرد سے کام لو۔

۱۱۹۔ تم عجیب لوگ ہو کہ انہیں دوست رکھتے ہو لیکن وہ تمہیں دوست نہیں رکھتے حالانکہ تم تمام آسمانی کتب پر ایمان رکھتے ہو (لیکن

وہ تمہاری آسمانی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے) اور جس وقت وہ تم سے ملتے ہیں تو (جھوٹ موٹ) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں لیکن جب وہ تنہائی میں ہوتے ہیں تو شدید غیظ و غضب سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگ جاتے ہیں (ان سے) کہہ دو کہ تم اپنے غصہ میں جل مرو خدا سینوں میں چھپے ہوئے (اسرار) سے آگاہ ہے۔

۱۲۰ اگر تمہیں کوئی راحت ملتی ہے تو انہیں برا لگتا ہے اور اگر تمہیں کوئی ناخوشگوار حادثہ پیش آ جائے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں لیکن تم اگر ان کے مقابلے میں ثابت قدمی اور پرہیزگاری اختیار کرو گے تو ان کی (خائن) سازشیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ خدا اس چیز پر احاطہ رکھتا ہے جو وہ انجام دیتے ہیں۔

شان نزول

ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں جب کچھ مسلمان یہودیوں سے قرابت داری و ہمسائیگی رشتہ رضاعت یا قبل اسلام کے عہد و پیمان کی وجہ سے دوستی رکھتے تھے اور ان کے ساتھ اس خلوص و محبت سے پیش آتے تھے یہاں تک مسلمانوں کے بھید ان پر ظاہر کر دیتے تھے۔ اس طریقے سے یہودی مسلمانوں کے رازوں سے آگاہ ہو جاتے تھے حالانکہ وہ اندرونی طور پر مسلمانوں کے سخت دشمن تھے اگرچہ ظاہری طور پر اپنے آپ کو ان کے دوست ظاہر کرتے تھے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی کہ چونکہ وہ لوگ تمہارے دین میں نہیں آئے اس لیے انہیں اپنا رازدار نہ بناؤ کیونکہ وہ تمہارے بارے میں کسی برائی سے دریغ نہیں کریں گے۔ ان کی خواہش ہے کہ تم ہمیشہ مصیبت میں رہو۔

تفسیر

اغیار کو رازداں نہ بناؤ

"یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ ......"

"بطانت" کے لغوی معنی ہیں نچلا لباس اور اس کے مقابلے میں "ظہارہ" (اوپر کا لباس) ہے یہاں یہ رازداں سے کنایہ ہے اور "خبال" اصل میں کسی چیز کے نیست و نابود ہونے کے معنیٰ میں ہے اور زیادہ تر ان نقصانات پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو عقل انسانی پر اثر انداز ہوں۔

گذشتہ آیات میں مسلمانوں اور کفار کا تقابل کیا گیا۔ اس آیت میں ایک حساس مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے اور ایک حسین و لطیف تشبیہ کے ذریعے تنبیہ کی گئی ہے کہ اپنے ہم مسلک افراد کے علاوہ کسی کو اپنا دوست اور ہمراز نہ بناؤ اور اغیار کو اپنے اندرونی راز نہ بتاؤ یعنی کفار تمہاری دوستی کے لائق نہیں اور نہ ہی انہیں تمہارا دوست اور ہمراز ہونا چاہیے کیونکہ وہ مسلمانوں کو گزند پہنچانے میں

کوتاہی نہیں کرتے (لا یالونکم خبالا) سابقہ دوستی ہرگز ان کے لیے رکاوٹ نہیں بنتی کہ وہ مذہب و مسلک کی بنا پر تمہاری تکلیف و نقصان کا نہ سوچیں بلکہ ان کی ہمیشہ خواہش یہ ہے کہ تم غم و اندوہ میں مبتلا رہو (ودوا ما عنتم)۔

وہ عموماً اپنی رفتار و گفتار میں احتیاط برتتے ہیں اور سوچ سمجھ کر بات کرتے ہیں تاکہ تم پر ان کے راز فاش نہ ہوں اور نہ ان کی مخفی باتوں کا تمہیں علم ہو۔ لیکن اس کے باوجود دشمنی و عداوت کے آثار ان کی باتوں سے جھلکتے ہیں اور کبھی کبھار لاشعوری طور پر کچھ باتیں ان کی زبان پر آجاتی ہیں جو ان کے دلوں میں آگ کی چنگاریوں کی مانند ہیں اور ان کی وجہ سے ان کے باطن کو سمجھا جا سکتا ہے (قد بدت البغضاء من افواههم)۔

آیت وہ حقیقت بیان کر رہی ہے جس کی طرف حضرت علی علیہ السلام نے اپنے خطبے میں اشارہ فرمایا ہے کہ:

"ما اضمر احد شيئا الا ظهر فی صفحات وجهه او فلتات لسانه"

کوئی شخص اپنے باطن میں کسی راز کو نہیں چھپا سکتا مگر یہ کہ وہ اس کے چہرے کے رنگ اور اکھڑی اکھڑی، توجہ سے خالی باتوں سے ظاہر ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس سے خداوند عالم نے دشمنوں کے باطن کو پہچاننے کے طریقہ کی نشاندہی کی ہے اور ان کی اندرونی باتوں کے متعلق فرمایا ہے کہ جو کچھ عداوت اور دشمنی وہ اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے کئی درجہ زیادہ ہے جس کا وہ زبان سے اظہار کرتے ہیں (وما تخفی صدورهم)۔

اس کے بعد مزید کہا گیا کہ ہم نے یہ آیات اس لیے بیان کیں کہ ان میں تدبر کرنے سے تم دوست، دشمن کو بآسانی سمجھ سکو گے اور دشمنوں کے شر سے خلاصی حاصل کرو گے (قد بينا لكم الايات ان كنتم تعقلون)۔

ها انتم اولاء تحبونهم ولا يحبونكم وتؤمنون بالكتاب كله ....

اے گروہ مسلمین! تم ان سے قرابت، ہمسائیگی یا کسی اور سبب سے دوستی کا رشتہ قائم کرتے ہو مگر اس سے غافل ہو کہ وہ تمہیں ہرگز دوست نہیں رکھتے۔ حالانکہ تم اللہ کی طرف سے نازل کردہ تمام آسمانی کتب پر ایمان رکھتے ہو (چاہے وہ تمہاری کتاب ہو یا ان کی آسمانی کتب) لیکن وہ تمہاری آسمانی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے۔

"واذا لقوكم قالوا امنا واذا خلوا عضوا عليكم الانامل من الغيظ"

اہل کتاب کا یہ گروہ دوغلا پن کرتا ہے جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ہم تمہارے دین کی تصدیق کرتے ہیں لیکن جب علیحدگی میں ہوتے ہیں تو کینہ و عداوت اور غصے سے اپنی انگلیوں کی پوریں کاٹتے ہیں (قل موتوا بغيظكم) کہہ دو! اپنے غصے میں جل مرو اور یہ غیظ و غضب مرتے دم تک تم سے جدا نہیں ہوگا۔

"ان الله عليم بذات الصدور"

تم ان کی کیفیت سے آگاہ نہیں ہو لیکن خدا ان کی خبر رکھتا ہے کیونکہ وہ دلوں میں چھپے ہوئے بھیدوں سے واقف ہے۔

ان تمسسكم حسنة تسؤهم وان تصبكم سيئة يفرحوا بها.....

اس آیت میں ان کے بغض و کینہ کی ایک علامت بیان کی گئی ہے کہ اگر تمہیں فتح و کامیابی نصیب ہو تو وہ ناخوش ہوتے ہیں اور تمہیں

کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آئے تو وہ مسرور ہوتے ہیں۔

"وان تصبروا و تتقوا لا یضرکم کیدھم شیئًا ان اللہ بما یعملون محیط»

لیکن اگر تم ان کی کینہ پروریوں کے مقابلے میں صبر سے کام لو اور خودداری و پرہیزگار ہو جاؤ تو وہ اپنی خائن سازشوں کے ذریعے تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے کیونکہ جو کچھ وہ کرتے ہیں، اس پر خدا مکمل کنٹرول رکھتا ہے۔ بنابرایں آیت کے سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے دشمنوں کی بڑی سازشوں سے بچنے کے لیے استقامت، ہوشیاری اور تقویٰ شرط ہے اور اسی صورت میں ان سے امان رہنے کی ضمانت دی گئی ہے۔

مسلمانوں کے لیے تنبیہ

خداوند عالم اس آیت میں مسلمانوں کو تنبیہ کرتا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کو اپنا عزیز نہ سمجھیں اور مسلمانوں کی راز کی باتیں اُن کے سامنے ظاہر نہ کریں۔ یہ خطرے کی نشاندہی عمومی شکل میں ہے، ہر زمانے اور ہر حالت میں مسلمانوں کو اس تنبیہ کی طرف متوجہ رہنا چاہیے لیکن تأسف ہے کہ قرآن کے بہت سے ماننے والے اس تنبیہ سے غفلت برتتے ہیں اور اس کے نتیجے میں بہت سی مشکلات میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

عصر حاضر میں بھی مسلمانوں کے گرد و پیش ایسے خفیہ دشمن ہیں جو اپنے آپ کو اُن کا دوست ظاہر کرتے ہیں اور ظاہری طور پر مسلمانوں کی حمایت کا دم بھرتے ہیں لیکن ان کی کارستانیاں ان کا جھوٹ ظاہر کرتی ہیں۔ مسلمان ان کے ظاہر سے دھوکا کھا کر ان پر اعتماد کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ مسلمانوں کے لیے پریشانی اور روسیاہی کے علاوہ کچھ نہیں چاہتے اور ان کی راہ میں کانٹے بچھا کر ان کی مشکلات میں اضافہ کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں گذشتہ چند سالوں میں مسلمان دو بڑی جنگوں میں مبتلا ہوئے ہیں۔ پہلی جنگ میں انہیں دردناک شکست کا سامنا کرنا پڑا جب کہ دوسری جنگ میں وہ واضح کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوئے اور دشمنوں کا دہشت ناک رعب اور ناقابل شکست ہونے کا افسانہ صحرائے سینا اور جولان کی پہاڑیوں کے معرکے میں پہلے دن دفن ہو گیا اور مسلمانوں نے پہلی مرتبہ کامیابی کا ذائقہ چکھا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا کہ اس مختصر سی مدت میں حالات دگرگوں ہو گئے۔

اس سوال کے لیے ایک طویل و عریض جواب کی ضرورت ہے لیکن اس شکست و کامیابی کا ایک مؤثر عامل یہ تھا کہ پہلی جنگ میں اغیار جن میں سے بعض ظاہراً دوستی کا دم بھرتے تھے، مسلمانوں کے جنگی منصوبوں سے آگاہ تھے لیکن دوسری جنگ میں سوائے دو تین اسلامی سربراہوں کے کوئی ان کے منصوبوں سے واقف نہیں تھا اور یہی ان کی کامیابی کا راز تھا اور یہ اس حکم قرآنی کی عظمت کی بیّن دلیل تھی۔

۱۲۱۔ وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ○

۱۲۲۔ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَ اللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○

ترجمہ

۱۲۱ اور (یاد کرو) وہ وقت جب تم صبح کے وقت اپنے گھر والوں سے مومنین کے لیے لشکر جنگ انتخاب کرنے باہر نکلے خدا سننے اور جاننے والا ہے (جنگ کے بارے میں جو بات چیت کی گئی اور جو افکار بعضوں کے دماغ میں پرورش پا رہے ہیں خدا انہیں جانتا ہے)۔

۱۲۲ اور (یاد کرو) وہ وقت جب تم میں سے دو گروہوں نے سستی کا مظاہرہ کرنے کا مصمم ارادہ کیا (اور چاہا کہ وہ راستے سے پلٹ جائیں) اور خدا اُن کا مددگار تھا (کہ وہ اس فکر سے باز آجائیں) اور اہل ایمان کو صرف خدا پر توکل کرنا چاہیے۔

تفسیر

"واذ غدوت من اھلک تبوئ المؤمنین مقاعد للقتال واللہ سمیع علیم"

یہاں سے ایک اہم اور وسیع اسلامی واقعہ یعنی جنگ احد کے بارے میں آیات شروع ہوئی ہیں۔ گذشتہ آیات کے قرائن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں آیات جنگ احد کے بعد نازل ہوئیں اور اس وحشتناک جنگ کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور بہت سے مفسرین کا بھی یہی نظریہ ہے۔

سب سے پہلے یہ پیغمبرؐ کے مدینہ سے کوہ اُحد کے دامن میں لشکرگاہ کے انتخاب کے لیے باہر آنے کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور ارشاد ہوتا ہے: اے پیغمبرؐ یاد کرو! اس دن کو کہ صبح کے وقت تم اپنے عزیز و اقارب کو چھوڑ کر مدینہ سے باہر آئے تاکہ دشمن سے جنگ کرنے کے لیے مومنین کے لیے کوئی لشکرگاہ تیار کرسکو۔ اس روز مسلمانوں کے درمیان چہ میگوئیاں ہوئیں اس کی طرف ہم واقعہ اُحد کی تفصیل میں اشارہ کریں گے۔ مقام جنگ کے انتخاب کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف تھا کہ آیا مدینہ میں ہو یا باہر اور رسالتمآبؐ نے اکثریت کے نظریہ کو قبول کر لیا اور لشکرگاہ شہر سے باہر کوہِ اُحد کے دامن میں منتقل کر دی۔ فطری طور پر ان میں کچھ ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے کچھ باتیں دل میں چھپا رکھی تھیں اور کئی وجوہات کی بنا پر انہیں ظاہر کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے "واللہ سمیع علیم" کا جملہ گویا ان سب کی حالت کی غمازی کرتا ہے کہ خدا تمہاری باتوں کو بھی سنتا ہے اور تمہارے مخفی بھیدوں کو بھی جانتا ہے۔

"اذ ھمت طائفتان منکم ان تفشلا......"

اس جملہ کا روئے سخن اس ماجرے کے ایک اور پہلو کی طرف ہے اور وہ یہ کہ اس وقت مسلمانوں کے دو گروہ (تاریخ کے مطابق قبیلہ اوس میں سے بنو سلمہ اور خزرج میں سے بنو حارثہ) نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ جنگ سے پہلو تہی کرتے ہوئے ایک راستے سے مدینہ کی طرف پلٹ آئیں گے اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ مدینہ کے اندر جنگ کرنے کے حق میں تھے لیکن پیغمبر اکرمؐ نے اس بات کو قبول نہ کیا علاوہ ازیں جیسا کہ واقعہ کی تفصیل سے معلوم ہو جائے گا کہ عبداللہ بن سلول تین سو یہودیوں کے ہمراہ لشکرِ اسلام میں آیا تھا اور اس صورت حال کی وجہ سے وہ لوگ بھی مدینہ کی طرف واپس آگئے تھے یہ بات نے دو مسلمان گروہوں کے لوٹ جانے کے پختہ ارادوں کو متزلزل اور کمزور کر دیا لیکن جیسا کہ آیت کے

ذیل سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دونوں گروہ اپنے ارادے سے پلٹ آئے اور دیگر مسلمانوں سے آملے۔ اس لیے قرآن کہتا ہے کہ "واللّٰہ ولیھما وعلی اللّٰہ فلیتوکل المومنون" یعنی خدا ان دو گروہوں کا مددگار و معاون ہے اور اہلِ ایمان کو خدا پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

ضمنی طور پر اس بات کی طرف بھی متوجہ رہنا چاہیے کہ واقعہ اُحد کا ذکر ان آیات کے بعد جو کفار پر اعتماد نہ کرنے کے بارے میں ہیں۔ اس زندہ حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح پہلے بھی گذر چکا ہے اور بعد میں بھی تفصیل کے ساتھ بتائیں گے کہ پیغمبر اکرمؐ نے ان یہودیوں کو اجازت نہ دی جو بظاہر مسلمانوں کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور وہ اسلامی لشکرگاہ میں ٹھہرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ پھر بھی بیگانے تھے اور ان نازک حالات میں ان کا مسلمانوں کے ساتھ ہونا مناسب نہ تھا۔

جنگِ اُحد

اسبابِ جنگ

اس مقام پر ضروری ہے کہ پہلے جنگ احد کے مجموعی واقعات کا تذکرہ کیا جائے۔ روایات اور اسلامی تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب کفارِ مکہ جنگ بدر میں شکست خوردہ ہوئے اور ستر مقتول ستر قیدی چھوڑ کر مکہ کی طرف پلٹ گئے تو ابوسفیان نے لوگوں کو خبردار کیا کہ وہ اپنی عورتوں کو مقتولین بدر پر گریہ وزاری نہ کرنے دیں کیونکہ آنسو غم واندوہ کو دور کر دیتے ہیں اور اس طرح محمدؐ کی دشمنی اور عداوت ان کے دلوں سے زائل ہو جائے گی۔ ابوسفیان نے خود یہ عہد کر رکھا تھا کہ جب تک جنگ بدر کے قاتلوں سے انتقام نہ لے لے اس وقت تک وہ اپنی بیوی سے ہمبستری نہیں کرے گا۔ بہرحال قریش ہر ممکن طریقے سے لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف اکساتے تھے اور انتقام کی صدا ہر گھر میں بلند ہو رہی تھی۔

ہجرت کے تیسرے سال قریش تین ہزار سوار اور دو ہزار پیدل فوج کے ساتھ بہت سا سامانِ جنگ لے کر آپ سے جنگ کرنے کے لیے مکہ سے نکلے اور میدان جنگ میں ثابت قدمی سے لڑنے کے لیے اپنے بڑے بڑے بُت اور اپنی عورتیں بھی ہمراہ لے آئے۔

جناب عباس کی بروقت اطلاع

حضرت رسول خداؐ کے چچا حضرت عباس جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے[۱] اور قریش کے درمیان ان کے ہم مشرب و ہم مذہب تھے لیکن اپنے بھتیجے سے فطری محبت کی بنا پر جب انہوں نے دیکھا کہ قریش کا ایک طاقتور لشکر پیغمبرؐ سے جنگ کرنے کے لیے مکہ سے نکلا ہے تو فوراً ایک خط لکھا اور قبیلہ بنی غفار کے ایک آدمی کے ہاتھ مدینہ بھیجا۔ عباس کا قاصد بڑی تیزی سے مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب آپ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے سعد بن ابی کو عباس کا پیغام پہنچایا اور حتی الامکان اس واقعہ کو پردہ راز میں رکھنے کی کوشش کی گو پیغمبر نے مسلمانوں سے مشورہ کیا۔ جس دن عباس کا قاصد آپ کو موصول ہوا آپ نے چند مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ مکہ و مدینہ کے راستے پر جائیں اور لشکر کفار کے کوائف معلوم کریں۔ آپ کے دو نمائندے ان کے حالات معلوم کر کے بہت جلدی واپس آئے اور قریش کی قوت و طاقت سے آنحضرتؐ کو مطلع کیا اور یہ بھی اطلاع دی کہ یہ طاقتور لشکر خود ابوسفیان کی کمان میں ہے۔

---

[۱] ابھی ظاہراً مسلمان نہیں ہوئے تھے (مترجم)

پیغمبر اکرمؐ نے چند روز کے بعد تمام اصحاب اور اہلِ مدینہ کو بلایا اور ان درپیش حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے میٹنگ کی۔ اس میں جنگ کے خطرہ کو بھی پیش کیا گیا اور اس کے بعد مقام جنگ کے بارے میں رائے لی گئی۔ اس میٹنگ میں ایک گروہ نے رائے دی کہ جنگ دشمن سے مدینہ کی تنگ گلیوں میں کی جائے کیونکہ اس صورت میں کمزور مرد، عورتیں بلکہ کنیزیں بھی مددگار ثابت ہو سکیں گی۔ عبداللہ بن ابی نے تائیداً کہا یا رسول اللہ! آج تک ایسا نہیں ہوا کہ ہم اپنے قلعوں اور گھروں میں ہوں اور دشمن ہم پر کامیاب ہو گیا ہو۔ اس رائے کو آپؐ بھی اس وقت کی مدینہ کی پوزیشن کے مطابق بنظر استحسان دیکھتے تھے۔ کیونکہ آپؐ بھی مدینہ ہی میں ٹھہرنا چاہتے تھے لیکن نوجوانوں اور جنگجو افراد کا ایک گروپ اس کا مخالف تھا۔ چنانچہ سعد بن معاذ اور قبیلہ اوس کے چند افراد نے کھڑے ہو کر کہا اے رسولِ خدا! گذشتہ زمانے میں عربوں میں سے کسی کو یہ جرأت نہ تھی کہ ہماری طرف نظر کرے جبکہ ہم مشرک اور بت پرست تھے، اب جبکہ ہمارے درمیان آپؐ کی ذات ستودہ صفات موجود ہے۔ کس طرح وہ ہمیں دبا سکتے ہیں اس لیے شہر سے باہر جنگ کرنی چاہیے۔ اگر ہم میں سے کوئی مارا گیا تو وہ جامِ شہادت نوش کرے گا اور اگر کوئی بچ گیا تو اسے جہاد کا اعزاز و افتخار نصیب ہوگا۔ اس قسم کی باتوں اور جوشِ شجاعت نے مدینہ سے باہر جنگ کے حامیوں کی تعداد کو بڑھا دیا یہاں تک کہ عبداللہ بن ابی کی پیشکش سرد خانے میں جا پڑی۔ خود پیغمبرؐ نے بھی اس مشورے کا احترام کیا اور مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کے طرفداروں کی رائے کو قبول فرمایا اور ایک صحابی کے ساتھ مقام جنگ کا انتخاب کرنے کے لیے شہر سے باہر تشریف لے گئے آپؐ نے کوہِ احد کا دامن لشکرگاہ کے لیے منتخب کیا کیونکہ جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام زیادہ مناسب تھا۔

مسلمانوں کی دفاعی تیاریاں

جمعہ کے دن آپؐ نے یہ مشورہ لیا اور نمازِ جمعہ کا خطبہ پڑھتے ہوئے آپؐ نے حمد و ثنا کے بعد مسلمانوں کو لشکرِ قریش کی آمد کی اطلاع دی اور فرمایا کہ تہ دل سے جنگ کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور پورے جذبے سے دشمن سے لڑو تو خداوند قدوس تمہیں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرے گا اور اسی دن آپؐ ایک ہزار افراد کے ساتھ لشکرگاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ آپؐ خود لشکر کی کمان کر رہے تھے۔ مدینہ سے نکلنے سے قبل آپؐ نے حکم دیا کہ لشکر کے تین علم بنائے جائیں جن میں ایک مہاجرین اور دو انصار کے ہوں۔ پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ اور احد کے درمیانی فاصلے کو پاپیادہ طے کیا اور سارے راستے لشکر کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ خود لشکر کی صفوں کو منظم و مرتب رکھا تاکہ وہ ایک ہی سیدھی صف میں مارچ کریں۔

ان میں سے کچھ ایسے افراد کو دیکھا جو پہلی دفعہ آپؐ کو نظر پڑے۔ پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ بتایا گیا کہ یہ عبداللہ بن ابی کے ساتھی کچھ یہودی ہیں اور اس مناسبت سے مسلمانوں کی مدد کے لیے آئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ مشرکین سے جنگ کرنے میں مشرکین سے مدد نہیں لی جا سکتی مگر یہ کہ یہ اسلام قبول کریں۔ یہودیوں نے اس شرط کو قبول نہ کیا اور سب مدینہ کی طرف پلٹ آئے۔ یوں ایک ہزار میں سے تین سو افراد کم ہو گئے ہیں[1]

لیکن مفسرین نے لکھا ہے کہ چونکہ عبداللہ بن ابی کی رائے کو رد کیا گیا تھا اس لیے وہ اثنائے راہ میں تین سو سے زیادہ افراد کو لے کر

---

[1] سیرت حلبی، جلد ۲، واقعہ جنگ احد۔

مدینہ کی طرف پلٹ آیا۔ بہر صورت پیغمبر اکرمؐ لشکر کی ضروری چھان پھٹک (یہودیوں یا ابن ابی کے ساتھیوں کو نکالنے) کے بعد سات سو افراد کو ہمراہ لے کر کوہِ اُحد کے دامن میں پہنچ گئے اور نمازِ فجر کے بعد مسلمانوں کی صفوں کو آراستہ کیا۔ عبداللہ بن جبیر کو پچاس ماہر تیر اندازوں کے ساتھ پہاڑ کے درّہ پر تعینات کیا اور انہیں تاکید کی کہ وہ کسی صورت میں اپنی جگہ نہ چھوڑیں اور فوج کے پچھلے حصے کی حفاظت کریں اور اس حد تک تاکید کی کہ اگر ہم دشمن کا مکمل پیچھا کریں یا ہم شکست کھا جائیں اور دشمن ہمیں مدینہ تک جانے پر مجبور کر دے پھر بھی تم اپنا مورچہ نہ چھوڑنا۔

دوسری طرف سے ابوسفیان نے خالد بن ولید کو منتخب سپاہیوں کے ساتھ اس درہ کی نگرانی پر مقرر کیا اور انہیں ہر حالت میں وہیں رہنے کا حکم دیا اور کہا کہ جب اسلامی لشکر اس درّہ سے ہٹ جائے تو فوراً لشکر اسلام پر پیچھے سے حملہ کر دو۔

آغازِ جنگ

دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے صف بستہ ہو کر جنگ کے لیے آمادہ ہو گئے اور یہ دونوں لشکر اپنے نوجوانوں کو ایک خاص انداز سے برانگیختہ کرتے تھے۔ ابوسفیان کعبہ کے بتوں کے نام لے کر اور خوبصورت عورتوں کے ذریعے اپنے جنگی نوجوانوں کی توجہ مبذول کرا کے ان کو ذوق و شوق دلاتا تھا جب کہ پیغمبر اسلامؐ خدا کے اسم مبارک اور انعامات اعلیٰ کے حوالے سے مسلمانوں کو جنگ کی ترغیب دیتے تھے۔

اچانک مسلمانوں کی صدائے اللہ اکبر سے میدان اور دامن کوہ کی فضا گونج اٹھی جب کہ میدان کی دوسری طرف قریش کی لڑکیوں نے دف اور سارنگی پر اشعار گا کر قریش کے جنگجو افراد کے احساسات کو ابھارا۔ جنگ کے شروع ہوتے ہی مسلمانوں نے ایک شدید حملے سے لشکر قریش کے پرخچے اڑا دیئے اور وہ حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے اور لشکرِ اسلام نے اُن کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ خالد بن ولید نے جب قریش کی یقینی شکست دیکھی تو اس نے چاہا کہ درہ کے راستے نکل کر مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کیا جائے لیکن تیر اندازوں نے اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ قریش کے قدم اکھڑتے دیکھ کر تازہ مسلمانوں کے ایک گروہ نے دشمن کو شکست خوردہ سمجھ کر مالِ غنیمت جمع کرنے کے لیے اچانک اپنی پوزیشن چھوڑ دی۔ ان کی دیکھا دیکھی درّے پر تعینات تیر اندازوں نے بھی اپنا مورچہ چھوڑ دیا۔ ان کے کمانڈر عبداللہ بن جبیر نے انہیں آپؐ کا حکم یاد دلایا مگر سوائے چند (تقریباً دس افراد) کے کوئی اس اہم جگہ پر نہ ٹھہرا۔

حکم پیغمبر اکرمؐ کی مخالفت کا نتیجہ یہ نکلا کہ خالد بن ولید نے درّہ خالی دیکھ کر بڑی تیزی سے عبداللہ بن جبیر پر حملہ کیا اور اسے اس کے ساتھیوں سمیت قتل کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے پیچھے سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ اچانک مسلمانوں نے ہر طرف چمکیلی تلواروں کی تیز دھاروں کو اپنے سروں پر دیکھا تو حواس باختہ ہو گئے اور اپنے آپ کو منظم نہ رکھ سکے۔ قریش کے بھگوڑوں نے جب یہ صورتحال دیکھی تو وہ بھی پلٹ آئے اور مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اسی موقع پر لشکر اسلام کے بہادر افسر سید الشہدا حضرت حمزہؑ نے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ جام شہادت نوش کیا۔ سوائے چند شمعِ رسالت کے پروانوں کے باقی مسلمانوں نے دہشت زدہ ہو کر میدان کو دشمن کے حوالے کر دیا۔ اس خطرناک جنگ میں جس نے سب سے زیادہ فداکاری کا مظاہرہ کیا اور پیغمبر اکرمؐ پر ہونے والے دشمن کے ہر حملے کا دفاع کیا وہ حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام تھے۔ حضرت علیؑ بڑی جرأت اور بے جگری سے جنگ کر رہے تھے یہاں تک کہ آپ کی تلوار ٹوٹ گئی اور پیغمبر اکرمؐ نے اپنی تلوار آپؑ کو عنایت فرمائی جو ذوالفقار کے نام سے مشہور ہے۔ بالآخر آپؐ ایک مورچہ میں ٹھہر گئے اور حضرت علیؑ مسلسل آپ کا دفاع کرتے رہے یہاں تک کہ بعض مورخین کی تحقیق کے مطابق حضرت علیؑ کے جسم کو ساٹھ زخم آئے اور اسی موقع پر قاصدِ وحی نے پیغمبرؐ سے

عرض کیا: اے محمدؐ! یہ ہے مواسات و معاونت کا حق۔ تو آپؐ نے فرمایا (ایسا کیوں نہ ہو کر) علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں۔ تو جبرئیلؑ نے اضافہ کیا: میں تم دونوں سے ہوں۔ امام صادقؑ ارشاد فرماتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے قاصدِ وحی کو آسمان میں یہ کہتے ہوئے دیکھا کہ
لاسیف الا ذوالفقار وَلَا فَتٰی اِلَّا عَلی " (ذوالفقار کے علاوہ کوئی تلوار نہیں اور علیؑ کے سوا کوئی جوانمرد نہیں)۔

اس اثناء میں یہ آواز بلند ہوئی کہ محمدؐ قتل ہو گئے۔

کون پکارا کہ محمدؐ قتل ہو گئے ہیں

بعض سیرت نگار رقمطراز ہیں کہ ابن قمعہ نے اسلامی سپاہی مصعب کو پیغمبرؐ سمجھ کر اس پر کاری ضرب لگائی اور با آواز بلند کہا:
لات و عزیٰ کی قسم محمدؐ قتل ہو گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ افواہ چاہے مسلمانوں نے اڑائی یا دشمن نے لیکن مسلمانوں کے لیے نفع رساں ثابت ہوئی اس لیے کہ جب آواز بلند ہوئی تو دشمن میدان چھوڑ کر مکہ کی طرف چل پڑے ورنہ قریش کا فاتح لشکر جو حضورؐ کے لیے دلوں میں کینہ رکھتا تھا اور انتقام لینے کی نیت سے آیا تھا کبھی میدان نہ چھوڑتا۔ قریش کے پانچ ہزار افراد پر مشتمل لشکر نے میدان جنگ میں مسلمانوں کی کامیابی کے بعد ایک رات بھی صبح تک وہاں نہ گذاری اور اسی وقت مکہ کی طرف چل پڑے۔

پیغمبرؐ کی شہادت کی خبر نے بعض مسلمانوں میں زیادہ اضطراب و پریشانی پیدا کر دی۔ جو مسلمان اب تک میدانِ کارزار میں موجود تھے، انہوں نے اس خیال سے کہ دوسرے مسلمان پراگندہ نہ ہوں، آنحضرتؐ کو پہاڑ کے اوپر لے گئے تاکہ مسلمانوں کو پتہ چل جائے کہ آپؐ بقیدِ حیات ہیں۔ یہ دیکھ کر بھگوڑے واپس آ گئے اور آنحضرتؐ کے گرد پروانوں کی طرح جمع ہو گئے۔ آپؐ نے اُن کو ملامت و سرزنش کی کہ تم نے ان خطرناک حالات میں کیوں فرار کیا؟ مسلمان شرمندہ تھے انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا: اے رسول خدا! ہم نے آپؐ کی شہادت کی خبر سنی تو خوف کی شدت سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ یوں مسلمانوں کو جنگ اُحد میں بہت زیادہ جانی و مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلمانوں کے ستر افراد شہید ہوئے اور بہت سے زخمی ہو گئے لیکن مسلمانوں کو اس شکست سے بہت بڑا درس ملا جو بعد کی جنگوں میں اُن کی کامیابی و کامرانی کا باعث بنا۔ آئندہ آیات میں انشاء اللہ اُس کا ذکر آ جائے گا۔

۱۲۳۔ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

۱۲۴۔ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ○

۱۲۵۔ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ○

۱۲۶ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۙ ○

۱۲۷ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ○

ترجمہ

۱۲۳ خدا نے بدر میں تمہاری مدد کی (اور تم خطرناک دشمنوں پر کامیاب ہوئے) جبکہ تم ان کی نسبت ناتواں تھے پس خدا سے ڈرو (اور دشمن کے مقابلے میں حکم پیغمبرؐ کی نافرمانی نہ کرو) تاکہ تم اس کی نعمت کا شکر ادا کرنے والوں میں شمار رہو۔

۱۲۴ جس وقت تم مومنین سے کہتے تھے کہ کیا یہ کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار تین ہزار ملائکہ (آسمان سے) اتار کر تمہاری مدد کرے۔

۱۲۵ ہاں! (آج بھی) اگر تم صبر و استقامت اور پرہیزگاری اختیار کرو اور جب دشمن تم پر چڑھ آئے گا تو خدا پانچ ہزار مخصوص نشان رکھنے والے فرشتوں کے ذریعے تمہاری مدد کرے گا۔

۱۲۶ لیکن یہ سب کچھ تو صرف تمہیں بشارت دینے کے لیے اور تمہارے اطمینان کی خاطر ہے ورنہ کامیابی تو فقط خدائے توانا و حکیم کی طرف سے ہے۔

۱۲۷ (یہ وعدہ جو خدا نے تمہارے ساتھ کیا ہے) اس لیے ہے تاکہ لشکر کفار کے ایک حصہ کو قطع کر دے یا انہیں ذلت کے ساتھ پلٹائے تاکہ وہ مایوس ہو کر (اپنے علاقے کو) پلٹ جائیں۔

تفسیر

جنگ کا خطرناک مرحلہ

جنگ اُحد کے اختتام پر مشرکین کا فاتح لشکر بڑی تیزی کے ساتھ مکہ کی طرف پلٹ گیا لیکن راستے میں انہیں یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ انہوں نے اپنی کامیابی کو ناقص کیوں چھوڑ دیا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ مدینہ کی طرف پلٹ جائیں اور اسے غارت و تاراج کر دیں اور اگر محمدؐ زندہ ہوں تو انہیں قتل کر دیں تاکہ ہمیشہ کے لیے اسلام اور مسلمانوں کی فکر ختم ہو جائے۔ اسی بنا پر انہیں واپس لوٹنے کا حکم دیا گیا اور درحقیقت جنگ احد کا یہ خطرناک مرحلہ تھا کیونکہ کافی مسلمان شہید اور زخمی ہو چکے تھے اور فطری طور پر وہ از سرِ نو جنگ کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے جبکہ اس کے برعکس اس مرتبہ دشمن مضبوط جذبہ کے ساتھ جنگ کر سکتا تھا اور اس کا حتمی نتیجہ حاصل کر سکتا تھا۔ اس بات کی اطلاع جلد ہی آپؐ تک پہنچ گئی۔

اگر اس موقع پر آپ غیر معمولی جرأت اور بے مثال ہمت کا مظاہرہ نہ کرتے تو تاریخ اسلام یہیں پر ختم ہو جاتی یہ آیات اس نازک مرحلے پر نازل ہوئیں اور ان سے مسلمانوں کے جذبے کو تقویت پہنچی یہاں تک کہ فوراً بعد آپ کی طرف سے مشرکین کی طرف جانے کا ایک عمومی حکم ہوا۔ یہاں تک کہ جنگ کے زخمی (جن میں حضرت علیؑ بھی تھے جنہیں ساٹھ سے زیادہ زخم آئے تھے) بھی دشمن سے لڑنے کے لیے آمادہ ہو گئے اور مدینے سے چل پڑے۔ یہ خبر سردارانِ قریش تک پہنچی اور وہ مسلمانوں کے اس عجیب و غریب جذبے سے وحشت زدہ ہوئے اور سوچنے لگے کہ شاید تازہ دم فوج، مدینے سے مسلمانوں کے ساتھ آملی ہے اور ہو سکتا ہے کہ نئی جنگ کا نتیجہ ان کے لیے نقصان کا باعث ہو۔ لہٰذا انہوں نے اپنی سابقہ کامیابی پر اکتفا کرنے اور مکہ کی طرف پلٹ جانے میں ہی بہتری سمجھی اور وہ تیزی کے ساتھ مکہ کی طرف چل پڑے۔

"ولقد نصرکم اللہ ببدر و انتم اذلۃ"

جیسا کہ کہا جا چکا ہے یہ آیات مسلمانوں کے جذبے کو تقویت دینے کے لیے نازل ہوئیں اور ان میں پہلے مسلمانوں کی میدانِ بدر کی کامیابی کی طرف اشارہ کیا گیا تاکہ اس کے ذکر سے ان کے دلوں میں آئندہ کے لیے جوش و جذبہ بڑھ جائے۔ ارشاد ہوا: خدا نے تمہیں بدر میں کامیابی سے سرفراز فرمایا جب کہ تم دشمن کی نسبت کمزور تھے تو تعداد اور جنگی ساز و سامان کے لحاظ سے تمہارا اور دشمن کا کوئی تقابل ہی نہ تھا۔ (تمہاری تعداد ۳۱۳ اور بہت کم ساز و سامان تھا جب کہ مشرکین کے پاس بہت زیادہ ساز و سامان تھا اور ان کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی) ان حالات میں تم خدا سے ڈرو اور اپنے پیشوا (پیغمبر اکرمؐ) کی حکم عدولی کو نہ دہراؤ تاکہ اس طرح سے اس کی گوناگوں نعمات کا شکر بجا لاؤ (فاتقوا اللہ لعلکم تشکرون)۔

"اذ تقول للمؤمنین الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلثۃ آلاف من الملئکۃ......"

بعد ازاں میدان بدر میں فرشتوں کے ذریعے مسلمانوں کی مدد کرنے کے واقعہ کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ اس دن کو فراموش نہ کرو جب پیغمبرؐ نے تم سے کہا تھا کہ کیا تمہاری مدد کے لیے تین ہزار فرشتے کافی نہیں ہیں۔

بلیٰ ان تصبروا و تتقوا و یاتوکم من فورھم ھٰذا یمددکم ربکم بخمسۃ آلاف ......

ہاں! اگر آج بھی پائمردی اور استقامت کا مظاہرہ کرو، قریش کے مقابلے میں نکلو، تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرو اور گذشتہ کی طرح فرمانِ رسول کی مخالفت نہ کرو تو اس صورتحال میں اگر مشرکین تیزی کے ساتھ تمہاری طرف پلٹ آئیں تو خدا پانچ ہزار مخصوص نشان والے فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔

وما جعلہ اللہ الا بشریٰ لکم ولتطمئن قلوبکم بہ وما النصر

۱؎ "بدر" ایک شخص کا نام تھا۔ وہ مکہ و مدینہ کے درمیانی علاقے میں رہتا تھا۔ اس کا ایک کنواں تھا۔ اسی کے نام سے اس علاقے کا نام بھی "بدر" ہو گیا۔ لغوی لحاظ سے "بدر" "پر" "پڑ" کو کہتے ہیں، اسی لیے چودھویں کے چاند کو بھی بدر کہتے ہیں۔

۲؎ "فور" کا اصل معنی ہے دیگ وغیرہ کا جوش اور ابال۔ اسی مناسبت سے تیزی سے انجام پذیر ہونے والے کاموں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے یعنی جیسے دیگ میں ابال سے نکلنے والی چیز تیزی سے اوپر آتی ہے یہ کام بھی اسی طرح انجام پذیر ہوا ہے۔

الا من عند اللہ . . . . .

لیکن یہ بات یاد رہے کہ تمہاری مدد کے لیے ملائکہ کی آمد تو صرف تمہاری تشویق، اطمینان قلب اور تقویت جذبہ کے لیے ہے ورنہ کامیابی تو صرف خدا کی طرف سے ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور تمام کاموں میں اس کی حکمت کارفرما ہے۔ وہ کامیابی کے راستے بھی جانتا ہے اور اسے جاری کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

"لیقطع طرفا من الذین کفروا او یکبتھم فینقلبوا خائبین "

اگرچہ مفسرین حضرات اس آیت کی تفسیر میں اختلافات کے شکار ہیں لیکن اگر سابقہ آیات کی طرح خود آیات اور موجودہ تاریخ سے مدد لی جائے تو اس آیت کی تفسیر بھی واضح ہوتی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے کہ یہ جو دشمن سے نئی جنگ کرنے کی صورت میں فرشتوں کے ذریعہ تمہاری مدد کا وعدہ کیا گیا ہے یہ اس بنا پر ہے کہ لشکر مشرکین کے حصہ کو قطع کر دے اور انہیں ذلت کے ساتھ پلٹا دے۔ آیت میں "طرف" کا معنیٰ ٹکڑا ہے اور "یکبتھم" "کبت" سے ہے جس کے معنیٰ کسی کو زبردستی اور ذلیل کر کے واپس کرنے کے ہیں۔

اس مقام پر فرشتوں کا مسلمانوں کی مدد کرنا، اس کی کیفیت اور اس کی ضرورت کے سلسلہ میں چند سوالات ہو سکتے ہیں جن کا جواب شرح وبسط کے ساتھ سورہ انفال آیت ۹ تا ۱۲ کے ذیل میں پیش کیا جائے گا۔

۱۲۸- لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ ○

ترجمہ

۱۲۸- کسی قسم کا اختیار (کفار اور جنگ سے فرار کرنے والے مسلمانوں کے فیصلے کے بارے میں) تمہیں نہیں ہے مگر یہ کہ خدا چاہے کہ انہیں درگذر کر دے یا سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔

تفسیر

اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ یہ آیت جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی اور اس کے واقعات سے متعلق ہے۔ سابقہ آیات بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ البتہ آیت کی تفسیر میں دو باتیں توجہ طلب ہیں پہلی یہ کہ آیت مستقل ایک جملہ ہے لہٰذا "او یتوب" کا معنیٰ "الا ان یتوب علیھم" ہے۔

اس آیت کا مطلب یوں بنتا ہے کہ ان کے انجام کار کے بارے تم کچھ نہیں کر سکتے مگر یہ کہ خدا انہیں بخش دے یا اس ظلم کی وجہ سے انہیں سزا دے اور لفظ "انہیں" سے مراد کفار ہیں، جنہوں نے مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔ حتیٰ کہ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کے دندان مبارک کو شہید کیا اور جبیں مبارک کو زخمی کر دیا یا وہ مسلمان مراد ہیں جنہوں نے میدان کارزار سے فرار کیا ہے اور جنگ کے اختتام پر نادم و پشیمان ہوئے اور آپؐ سے معافی طلب کی۔ آیت بتلا رہی ہے کہ ان کی عفو و بخشش یا سزا و عذاب خدا کے ہاتھ میں ہے اور پیغمبر اکرمؐ حکم خدا کے بغیر کوئی کام انجام نہیں دیتے۔

دوسری تفسیر اس طرح کی گئی ہے "لیس لک من الامر شیء" جملہ معترضہ ہے (جس کا پہلے اور بعد والے جملوں سے

ربط نہ ہو) اور جملہ "او یتوب علیہم" کا عطف "او یکبتہم" پر ہے۔ اس صورت میں دونوں آیات کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا کامیابی کے اسباب تمہارے قبضہ میں دے دیگا اور کفار کے لیے چار قسم کا انجام مقرر کرے گا یا لشکرِ مشرکین کے ایک حصّہ کو نیست و نابود کر دے گا یا انہیں کسی ذریعہ سے واپس جانے پر مجبور کر دے گا یا انہیں شائستگی اور توبہ کی صورت میں بخش دے گا اور یا انہیں ظلم کی وجہ سے سزا دے گا۔ خلاصہ یہ کہ ان کے ہر گروہ کے ساتھ عدالت و حکمت کا برتاؤ روا رکھے گا اور تم ان کے بارے میں اپنی طرف سے کسی قسم کا اقدام نہیں کر سکتے۔

اس آیت کی شانِ نزول روایات میں مختلف انداز سے پیش کی گئی ہے۔ ان میں سے یہ بھی ہے کہ جب جنگ اُحد میں آنحضرتؐ کے دندان مبارک شہید ہوئے اور جبین مبارک زخمی ہو گئی اور مسلمانوں کو بہت سخت نقصان پہنچا تو پیغمبرؐ کفار کے امروز و فردا کے متعلق سوچنے لگے کہ یہ لوگ کس طرح راہِ ہدایت پر آئیں گے اور فرمایا:

"کیف یفلح قوم فعلوا هذا بنبیهم و هو یدعوهم الی ربهم"

یہ گروہ کیسے فلاح پائے گا جس نے اپنے پیغمبرؐ سے یہ سلوک کیا جب کہ وہ انہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہے۔

اس مقام پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور پیغمبرؐ کو تسلی و تشفی دی گئی کہ آپ ان کی ہدایت کے جوابدہ نہیں ہیں بلکہ آپ کی ذمہ داری صرف تبلیغ ہے۔

ایک اشتباہ اور اس کا ازالہ

یہاں دو نکات توجہ طلب ہیں:

(۱) نابغۂ روزگار مفسّر مؤلف "المنار" کا عقیدہ ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کو حصولِ کامیابی کے لیے مادی وسائل سے استفادہ کرنے کے سلسلے میں ایک ناقابلِ فراموش درس دیتی ہے اور وہ یہ کہ اگر خدا انہیں کامیابی کی نوید سنا دیتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان مادی وسائل، سامانِ حرب و ضرب اور منصوبہ بندی کو فراموش کر دیں اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں اور کامیابی کے لیے پیغمبرؐ کی دعا کا انتظار کریں۔ پیغمبرؐ کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے "لیس لك من الامر شیء" یعنی کامیابی کا معاملہ تیرے سپرد نہیں بلکہ وہ مشیت ایزدی کے تابع ہے۔ لہٰذا خدا نے ان کے لیے جو راستے مقرر کیے ہیں ان سے استفادہ کیا جائے اور پیغمبرؐ کی دعا بھی اگرچہ مؤثر ہے لیکن اس میں استثنائی پہلو موجود ہے اور وہ معیّن مواقع کے ساتھ مخصوص ہے مؤلف موصوف کی یہ گفتگو اگرچہ منطق و حکمت سے لبریز ہے لیکن یہ آیت کے ان مطالب سے مناسبت نہیں رکھتی جو کفار کی سزا یا توبہ کے بارے میں ہیں۔ لہٰذا اسے اس آیت کی تفسیر نہیں کہا جا سکتا۔

(۲) یہ آیت مخالفین اسلام کے بارے میں عفو و بخشش یا سزا کے متعلق پیغمبرؐ سے ہر قسم کے اختیارات سلب کر رہی ہے لیکن یہ اس بات کی نفی نہیں کرتی کہ عفو و درگذر کے لیے دعا اور شفاعت مؤثر ہیں۔ کیونکہ آیت بالا کا مقصد یہ ہے کہ آپ خود سے کوئی کام انجام نہیں دے سکتے البتہ خداوند تعالیٰ کے حکم و اذن سے معافی دے سکتے ہیں اور سزا بھی دے سکتے اور کامیابی کے عوامل بھی فراہم کر سکتے ہیں حتیٰ کہ پروردگار عالم کے اذن و اجازت سے حضرت عیسیٰؑ کی طرح مُردوں کو بھی زندہ کر سکتے ہیں۔ جو لوگ جملہ "لیس لك من الامر شیء" کے حوالے سے پیغمبر اکرمؐ کی طاقت کا انکار کرتے ہیں اور ان کے سلبِ اختیارات

پر اصرار کرتے ہیں، انہوں نے درحقیقت قرآن کی دیگر آیات کو فراموش کر دیا ہے۔ قرآن مجید سورہ نساء آیت ۶۴ میں کہتا ہے:

وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا

اگر وہ لوگ جب اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے، تمہارے پاس آجاتے اور معافی طلب کرتے اور پیغمبر ان کے لیے طلب مغفرت کرتے تو خدا کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔

اس آیت کی رُو سے آپ کی استغفار کو گناہ کی بخشش کا ایک عامل شمار کیا گیا ہے۔

آئندہ کے مباحث میں مناسب آیات کے ذیل میں اس مطلب پر مزید روشنی ڈالی جائے گی۔

۱۲۹۔ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

ترجمہ

۱۲۹۔ اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ کی ملکیت ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے (اور مناسب سمجھتا ہے) بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عذاب دے دیتا ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

درحقیقت یہ آیت گذشتہ آیت کی تاکید ہے کہ بخشنا اور سزا دینا پیغمبرؐ کے ہاتھ میں نہیں بلکہ وہ حکم خداوندی کے تابع ہے۔ آسمانوں اور زمین کی حکومت جس کے قبضہ قدرت میں ہے پیدا کرنا اسی خدا کا کام ہے۔

"وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ"

باوجودیکہ اس کا عذاب بہت سخت ہے وہ بخشنے والا اور مہربان بھی ہے۔ اس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔ کوئی حرج نہیں کہ ہم یہاں ایک مسلم اسکالر کی پُراز حکمت گفتگو کی طرف اشارہ کریں جو سخت ہونے کے باوجود بعض سوالوں کا جواب ہے۔

مفسّر عالی قدر (علامہ) طبرسیؒ اس آیت کے ذیل میں رقمطراز ہیں کہ ایک عالم سے پوچھا گیا کہ خداوند عالم کس طرح اپنے بندوں کو ان کے گناہوں کی بناء پر باوجود اپنی وسیع و بے پایاں رحمت کے عذاب دے گا تو اس عالم نے جواب دیا کہ خدا کی رحمت اس کی حکمت کو ختم نہیں کر سکتی کیونکہ اس کی رحمت کا سرچشمہ ہمارے جذبۂ ترحم کی طرح احساسات اور رقت قلبی نہیں ہے بلکہ اس کی رحمت ہمیشہ اس کی حکمت سے وابستہ ہوتی ہے اور حکمت کا اقتضاء یہ ہے کہ معصیت کاروں کو (سوائے خاص مواقع کے) سزا دی جائے۔

۱۳۰۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً ۖ وَاتَّقُوا

اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝

۱۳۱۔ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝

۱۳۲۔ وَأَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝

ترجمہ

۱۳۰ اے ایماندارو! (بڑھا چڑھا کر سود) نہ کھاؤ خدا سے ڈرو تاکہ فلاح پا جاؤ۔

۱۳۱ اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

۱۳۲ اور خدا اور پیغمبر کی اطاعت کرو تاکہ رحمتِ (الٰہی) تمہارے شاملِ حال ہو۔

تفسیر

قرآنی آیات کا ایک دوسرے کے ساتھ ربط

گذشتہ آیات میں جنگ اُحد کے واقعات اور بہت سے درس موجود ہیں جو مسلمانوں نے اس عبرت آموز واقعے سے حاصل کیے لیکن زیرِ نظر تین اور بعد والی چھ آیات چند ایک اقتصادی، اجتماعی اور تربیتی پروگراموں پر مشتمل ہیں اور ان نو آیات کے بعد پھر از سرِ نو جنگ اُحد کا تذکرہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اندازِ بیان بعض لوگوں کے لیے باعث تعجب ہو۔ لیکن بنیادی امر پر توجہ کرنے سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے:

قرآن کوئی کلاسیکی کتاب نہیں ہے جو کئی فصول و ابواب کی حامل ہو اور اس کے ابواب و فصول کے درمیان ایک خاص ربط ملحوظ رکھا گیا ہو بلکہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو تئیس سال کی مدت میں مختلف تربیتی ضروریات کے مطابق مختلف اوقات و مقامات میں قسط وار نازل ہوتی رہی ہے۔ ایک دن واقعہ اُحد پیش آتا ہے اور مختلف جنگی پروگرام چند ایک آیات کے ضمن میں بتائے جاتے ہیں دوسرے روز ایک اقتصادی مسئلہ درپیش آتا ہے مثلاً سود یا حقوق کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے مثلاً شادی بیاہ سے متعلق مسائل یا ایک تربیتی اور اخلاقی معاملہ درپیش ہوتا ہے مثلاً توبہ اور پھر کئی ایک آیات کا نزول ہوتا ہے۔ البتہ تمام سورتیں اور آیاتِ قرآن ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور وہ یہ کہ سب کی سب ایک انسان سازی اور اعلیٰ ترین سطح کے ایک تربیتی پروگرام کو پیشِ نظر رکھے ہوئے ہیں اور ایک پُر امن مادی اور روحانی لحاظ سے ترقی یافتہ معاشرے کی تشکیل کے لیے نازل ہوئی ہیں۔ لہٰذا اگر مندرجہ بالا آیات قبل و بعد کی آیات سے کوئی خاص ربط نہیں رکھتیں تو اس کی یہی وجہ ہے۔

سود خوری کی حرمت کے چند مراحل

ہم جانتے ہیں کہ قرآن کا یہ طریقہ ہے کہ وہ معاشرے کی ایسی برائیاں جن کی جڑیں گہری ہو چکی ہیں ان کی بیخ کنی کرنے کے لیے آہستہ آہستہ زمین ہموار کرتا ہے اور لوگوں کو تدریجاً ان کے مفاسد سے آگاہ کرتا ہے اور جب قرآنی احکام قبول کرنے کے لیے آمادگی حاصل ہو جائے قانون تصریحی شکل میں بیان کر دیتا ہے (خصوصاً ایسے مواقع پر جہاں گناہ سے آلودگی کا امکان بہت زیادہ ہو)۔

یہ بھی واضح ہے کہ دنیائے عرب زمانہ جاہلیت میں سود خوری میں شدت سے ملوث تھی خصوصاً مکہ کا گرد و نواح سود خوروں کا مرکز تھا اور وہاں کی بہت سی قبیح اجتماعی برائیوں کا سبب یہی بُرا کاروبار تھا۔ بنا بر ایں قرآن مجید نے سود خوری ختم کرنے کے لیے حرمت کا حکم چار مراحل میں بیان کیا ہے،

(۱) پہلے پہل سود کے بارے میں سورہ روم آیہ ۳۹ میں ایک اخلاقی نصیحت پر زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاۡ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ

یعنی صرف کوتاہ نظر افراد کی نگاہ میں سود کھانے والوں کی ثروت میں سود لینے سے زیادتی ہوتی ہے لیکن خدا کے ہاں اس میں کوئی زیادتی نہیں ہوتی بلکہ زکوٰۃ اور راہ خدا میں خرچ کرنا دولت و ثروت کی زیادتی کا باعث ہے۔

(۲) سورہ نساء آیہ ۱۶۱ میں یہودیوں کی غلط رسوم و عادات پر تنقید کرتے ہوئے ان کی سود خوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

"واخذھم الربٰوا وقد نھوا عنہ"

ان کی ایک بُری عادت یہ تھی کہ وہ سود کھاتے تھے حالانکہ انہیں اس سے منع کیا گیا تھا۔

(۳) زیر بحث آیت میں جیسا کہ اس کی تفسیر کے ذیل میں بتایا جائے گا، سود کی حرمت کا صریح حکم ذکر ہوا ہے لیکن سود کی صرف ایک قسم کی طرف جو بہت بُری قسم ہے۔ اشارہ ہوا ہے۔

(۴) آخر میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۷۵ سے ۲۷۹ تک ہر قسم کی سود خوری کی شدت سے ممانعت کا اعلان کیا گیا ہے اور اسے خدا سے جنگ کرنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔

یایھا الذین امنوا لا تاکلوا الربٰوا اضعافا مضاعفۃ ....

اس آیت میں سود کی قبیح ترین قسم کی حرمت کی طرف اشارہ ہوا ہے اور "اضعافا مضاعفۃ" (چند در چند) کی تعبیر موجود ہے۔ ربائے فاحش سے مراد یہ ہے اصل سرمایہ ہی اضافی سود کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہے۔ یعنی سود پہلے مرحلے میں اصل سرمائے میں جمع ہو جائے اور آئندہ اصل سرمائے میں سود جمع ہونے پر جو سرمایہ بنا ہے اس پر سود لگے اور اسی ترتیب سے ہر مرتبہ کا سود اضافی سرمایہ بن کر

گذشتہ سرمائے میں جمع ہوتا جائے اور سرمائے کی نئی رقم تشکیل دیتا جائے، اس طرح قلیل مدت میں ایک دوسرے پر سود کی زیادتی کی وجہ سے مقروض کے قرضہ کا مجموعہ اصل قرضہ سے کئی گنا زیادہ ہو جائے اور اس کی زندگی مکمل طور پر دیوالیہ ہو جائے۔ جیسا کہ روایات و تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں یہ معمول تھا کہ اگر مقروض قرض کی مدت ختم ہونے پر قرض نہیں ادا کر سکتا تھا تو قرض خواہ سے تقاضا کرتا کہ وہ سود اور اصل قرض کا مجموعہ نئے سرمائے کی شکل میں اسے بطور قرض دیدے اور اس کا سود لے۔ ہمارے دور میں بھی اس قسم کی ظالمانہ سودخوری کثرت سے رائج ہے۔

"و اتقوا اللّٰہ لعلکم تفلحون"

آیت کے آخر میں ارشاد رب العزت ہوتا ہے، اگر فلاح و کامیابی سے ہمکنار ہونا چاہتے ہو تو تقوٰی اپناؤ اور اس گناہ سے بچو۔

"و اتقوا النار التی اعدت للکفرین"

یہ آیت از سر نو تقوٰی کی تاکید کرتی ہے اور اس آگ سے جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے ڈراتی ہے۔ لفظ "کافرین" کے ساتھ تعبیر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصولی طور پر سودخوری ایمان کے ساتھ سازگار نہیں ہے اور سودخوروں کے لیے بھی اس آگ کا ایک حصہ ہے جو کفار کی منتظر ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی آگ بنیادی طور پر کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ باقی رہے گناہگار اور معصیت کار تو ان کے لیے اس کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا وہ کفار سے شباہت اور ہم آہنگی رکھتے ہیں۔

"و اطیعوا اللّٰہ و الرسول لعلکم ترحمون"

گذشتہ آیت کی دھمکی اس تشویق و ترغیب کے ساتھ تکمیل پاتی ہے جو اس آیت میں مطیع اور فرمانبرداروں کے لیے ہے کہ خدا اور رسول کی اطاعت کرو اور سودخوری چھوڑ دو تاکہ تم پر اللہ کی رحمت کا سایہ ہو۔

۱۳۳۔ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

۱۳۴۔ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

۱۳۵۔ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ڞ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

۱۳۶۔ أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ۝

ترجمہ

۱۳۳ ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرو اپنے پروردگار کی مغفرت اور جنت کے لیے جس کی وسعت تمام آسمانوں اور زمین کے برابر ہے اور جو پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

۱۳۴ وہی لوگ جو تنگی اور کشادگی میں خرچ کرتے ہیں اور اپنا غصہ پی جاتے ہیں اور لوگوں کی خطاؤں سے درگزر کرتے ہیں اور خدا نیکوکار لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔

۱۳۵ اور وہ لوگ کہ جب وہ کسی عمل بد کا ارتکاب کریں یا اپنے اوپر ظلم کریں تو خدا کو یاد کرتے ہیں اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں اور خدا کے سوا گناہوں کو بخشنے والا کون ہے اور وہ گناہ پر اصرار نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں۔

۱۳۶ ان کی جزاء پروردگار کی بخشش اور وہ باغات بہشت ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے ان میں رہیں گے اور یہ عمل کرنے والوں کے لیے کتنا اچھا معاوضہ ہے۔

تفسیر

سعادت کی راہ میں ایک دوسرے پر سبقت

"وسارعوا الی مغفرة من ربکم"

تسارعوا "سارعت" سے ہے جس کے معنی ہیں کسی مقصد تک پہنچنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے لیے دو یا دو سے زیادہ افراد کی کوشش۔ نیک کاموں میں یہ قابل ستائش ہے اور بُرے کاموں میں مذموم۔

گذشتہ آیات کے بعد کہ جو بدکاروں کو جہنم کی تہدید اور نیک لوگوں کو رحمت الٰہی کی تشویق کرتی ہیں، اس آیت میں نیک لوگوں کی کوشش اور جستجو کو معنوی مقابلے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس کا آخری مقصد خدا کی بخشش اور بہشت کی دائمی و ابدی نعمات ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ اس مقصد تک رسائی کے لیے ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرو۔

درحقیقت قرآن ایک نفسیاتی پہلو کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے کہ انسان اگر کسی کام کی انجام دہی میں تنہا ہو تو عموماً اس کام کو وہ حسب عادت تاخیر سے پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے لیکن اگر اس میں مقابلے کا پہلو ہو اور مقابلہ بھی ایسا جس میں ایک بیش بہا انعام پر داؤ لگایا گیا ہو تو

وہ اپنی تمام تر قوت و توانائی صرف کرتا ہے اور بڑی تیزی کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف پیش رفت کرتا ہے اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس مقابلے کا پہلا مقصد مغفرت قرار دیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر معنوی مقام تک رسائی گناہوں کی آلودگی سے پاک و صاف ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے اپنے آپ کو گناہ سے پاک کیا جائے اور اس کے بعد مقام تقرب الٰہی کی طرف قدم اٹھایا جائے۔

"وجنة عرضها السمٰوٰت و الارض"

اس معنوی مقابلے کا دوسرا ہدف بہشت ہے جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے عرض کے برابر ہے۔ (یہ مخفی نہ رہے کہ اس آیت میں عرض سے مراد علم ہندسہ کی اصطلاح نہیں ہے کہ عرض طول کے مقابلے میں ہو، بلکہ اس سے مراد وسعت اور پھیلاؤ ہے) اسی طرح قرآن صراحت سے کہتا ہے کہ جنت کی وسعت آسمانوں اور زمین کی وسعت جتنی ہے اور سورۂ حدید کی آیت ۲۱ میں یہی تعبیر معمولی فرق کے ساتھ آئی ہے۔

"سابقوا الی مغفرة من ربکم وجنة عرضها کعرض السماء و الارض"

اس آیت میں مسارعت کی بجائے صراحت کے ساتھ لفظ مسابقت آیا ہے اور سماء مفرد کی شکل میں ہے اور اس کے ساتھ الف لام جنس کے اعتبار سے ہے جو یہاں عموم کا مفہوم دے رہا ہے اور کاف سے تشبیہ معلوم ہوتی ہے بایں طور کہ محل بحث آیت میں تصریح کے ساتھ کہا گیا ہے کہ بہشت کی وسعت آسمانوں اور زمین کی وسعت کے برابر ہے لیکن سورہ الحدید کی آیت میں ہے کہ اس کی وسعت آسمانوں اور زمین کی مانند ہے لیکن دونوں تعبیروں کا معنیٰ و مفہوم ایک ہے۔ آیت کے آخر میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ یہ بہشت اس عظمت کے ساتھ پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے "اعدت للمتقین"۔

اب یہاں یہ سوال ذہن میں اٹھ سکتا ہے :

اولاً یہ کہ کیا جنت و جہنم پیدا ہو چکے ہیں اور وہ وجودِ خارجی رکھتے ہیں یا بعد میں لوگوں کے اعمال کے حساب سے ایجاد ہوں گے۔

ثانیاً یہ کہ اگر وہ خلق ہو چکے ہیں تو وہ کہاں ہیں (اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن کہتا ہے کہ صرف جنت کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے)۔

کیا جنت و دوزخ اس وقت موجود ہیں؟

اکثر علماء اسلام کا عقیدہ ہے کہ یہ دونوں اس وقت وجودِ خارجی رکھتے ہیں اور قرآنی آیات کا ظاہری معنیٰ بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ نمونہ کے طور پر :

(۱) محل بحث آیت اور دیگر کثیر آیات میں اعدت (تیار کی جا چکی ہے) استعمال ہوا ہے یا بعض دوسری تعبیرات جو اسی مادہ سے ہیں جو بعض مقامات پر بہشت کے بارے میں اور بعض جگہ دوزخ کے بارے آئی ہیں[1] ان آیات سے معلوم ہوتا ہے

---

[1] سورۂ توبہ آیت ۸۹ و آیت ۱۰۰، سورۂ فتح آیت ۶، بقرہ آیت ۲۴، آل عمران ۱۳۱ و ۱۳۳، سورۂ الحدید آیت ۲۱ کی طرف رجوع فرمائیں۔

کہ بہشت و دوزخ اس وقت تیار موجود ہیں اگرچہ انسانوں کے نیک و بد اعمال کے نتیجہ میں ان میں وسعت پیدا ہوتی رہتی ہے (غور کریں)۔

(۲) معراج سے متعلق سورۂ والنجم کی آیات میں یوں ہے:

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى

دوسری مرتبہ پیغمبر نے جبرئیل کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا جہاں دائمی جنت ہے (والنجم۔ ۱۳ تا ۱۵)۔

یہ تعبیر جنت کے وجود پر دوسری شہادت ہے۔

(۳) سورۂ تکاثر آیت ۵، ۶، ۷، میں ارشاد ہوتا ہے:

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ

اگر تمہیں علم الیقین ہوتا تو دوزخ کا مشاہدہ کرتے پھر اسے عین الیقین کے ساتھ دیکھتے۔

معراج سے مربوط اور دیگر آیات میں بھی اس مسئلہ کی واضح نشاندہی کی گئی ہے[1]

جنت اور دوزخ کہاں ہیں

اس بحث کے بعد یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر یہ دونوں موجود ہیں تو کہاں ہیں اس سوال کا جواب دو طرح سے دیا جا سکتا ہے:

پہلا یہ کہ جنت و جہنم اس دنیا کے باطن میں موجود ہیں ہم زمین و آسمان اور مختلف کرات کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں لیکن ان کے اندر موجود جو دنیائیں ہیں انہیں ہم نہیں دیکھ پاتے کہ جہاں کثرت سے موجودات ہیں جو ہماری آنکھوں کی قوت ادراک سے ماوراء ہیں اور آیات كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝ بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ چند ایک احادیث سے بھی عیاں ہوتا ہے کہ بعض بندگانِ خدا اس جہاں میں اتنی قوت بینائی رکھتے تھے کہ وہ یہاں رہ کر جنت و جہنم کو اپنی حقیقت بین نگاہوں سے دیکھ سکتے تھے۔ مزید توضیح کے لیے ایک مثال دی جا سکتی ہے۔ ایک طاقتور ریڈیائی آلہ (آواز کی لہریں بھیجنے والا آلہ) کسی خطۂ ارض میں موجود ہو جو فضائی لہروں کی مدد سے پوری دنیا میں تلاوت قرآن کا دل آویز زمزمہ بہت ہی دلنشین اور روح پرور آواز سے نشر کر رہا ہو۔ اسی طرح کا ایک اور آلہ زمین کے کسی خطہ میں موجود ہو جو بہت ہی پریشان کن آواز دوسری فضائی لہروں میں پھیلا دے۔ جس وقت ہم ایک مقام پر بیٹھے ہوں تو اپنے ارد گرد کے لوگوں کی آواز تو ہم سن لیتے ہیں لیکن ان دو لہروں کا احساس تک نہیں ہوتا جو فضائے عالم میں پرواز کر رہی ہیں۔ لیکن اگر ان کو گرفت میں لینے والی مشین موجود ہو تو فوراً وہ ہمارے کانوں میں پڑ جائیں گی اگرچہ عام حالت میں ہمارے کان اس کے سننے سے عاجز ہوتے ہیں گذشتہ مثال اگرچہ کئی لحاظ سے ناقص ہے تاہم جنت و دوزخ جیسے باطنی امور کی تصویر کشی کے لیے کافی ہے۔

---

[1] توجہ رہے مسئلہ عالم آخرت کی جنت اس سے مختلف ہے جس میں حضرت آدمؑ رہے تھے۔ کیونکہ وہ حضرت آدمؑ کی خلقت سے قبل موجود تھی۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ عالم آخرت اور جنت وجہنم اس عالم مادی پر احاطہ کئے ہوئے ہیں اور یہ اس کے اندر اس جنین کی مانند ہیں جو اس دُنیا کے اندر ایک علیحدہ مستقل عالم میں رہتا ہے اور وہ اس عالم سے جُدا نہیں۔ اسی طرح عالم دنیا بھی عالم آخرت کے اندر واقع ہے۔ یہاں قرآن کریم نے جو جنت کی وسعت آسمانوں اور زمین کے مساوی قرار دی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کی نظر میں زمین اور آسمان سے زیادہ وسیع چیز کوئی نہیں۔ لہٰذا قرآن نے جنت کی عظمت و وسعت کی تصویر کشی زمین و آسمان کی وسعت کے حوالے سے کی، اور اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار بھی نہیں تھا جیسا کہ اگر شکم مادر میں ایک بچہ ہو اور ہم چاہیں کہ اس سے گفتگو کریں تو ایسی منطق میں اس سے بات کریں گے کہ جو اس کے لیے قابلِ ادراک ہو۔

گذشتہ تبصرے سے ہمارے اس سوال کا جواب بھی روشن ہو جاتا ہے کہ اگر جنت کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے تو پھر جہنم کہاں ہے؟ کیونکہ پہلے جواب کی رُو سے دوزخ بھی اِس جہان کے اندر ہے اور اس جہاں میں ان دونوں کے موجود ہونے میں کوئی اشکال نہیں (جیسا کہ آواز کی لہریں بھیجنے والی مشین کی مثال میں اس کا ذکر ہو چکا ہے)۔ باقی رہا دوسرا جواب کہ جنت، دوزخ اس جہاں پر محیط ہیں تو یہ کچھ زیادہ روشن ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ دوزخ اور جنت دونوں اس جہاں پر محیط ہوں اور جنت کچھ زیادہ وسیع ہو۔

پرہیزگاروں کی نشانیاں

"الذین ینفقون فی السراء والضراء......"

گذشتہ آیت میں پرہیزگاروں کو دائمی جنت کی نوید سنائی گئی تھی، اس لئے اس آیت میں ان کا تعارف کرایا جا رہا ہے اور ان کی پانچ اعلیٰ امتیازی خصوصیات بیان کی گئیں ہیں؛

وہ ہر حالت میں خرچ کرتے ہیں چاہے وہ آرام و فراخ دستی میں ہوں یا پریشانی اور محرومیت میں مبتلا ہوں۔ وہ اس عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ دوسروں کی مدد کرنے اور نیکی کا جذبہ اُن کی رُوح کی گہرائیوں میں اترا ہوا ہے۔ اسی بنا پر وہ ہر حالت میں اس کے لیے عملی طور پر تیار رہتے ہیں کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ آسودگی کی حالت میں خرچ کرنا سخاوت جیسی بلند صفت کی نشانہ ہی نہیں کرتا البتہ وہ لوگ جو ہر حالت میں ضرورت مندوں کو نوازتے ہیں، وہ اس کا بیّن ثبوت مہیا کرتے ہیں کہ ان میں یہ صفت راسخ ہے۔

ہاں! اس مقام پر ذہنوں میں یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ تنگدستی کی حالت میں انسان کیونکر خرچ کر سکتا ہے؟ لیکن اس سوال کا جواب واضح ہے کہ تنگدست افراد بھی اپنی قدرت کے مطابق دوسروں کی مدد کر سکتے ہیں۔ ثانیاً یہ کہ خرچ و انفاق صرف مال و ثروت میں منحصر نہیں بلکہ خدا کے ہر عطیہ سے اس کا تعلق ہے۔ چاہے مال و ثروت ہو، نعمت علم و دانش ہو یا دیگر نعمات الٰہی۔ اس عمل سے خدا چاہتا ہے کہ صاحبانِ دولت کے علاوہ قربانی و فداکاری کی رُوح غریبوں کے دلوں میں بھی پروان چڑھ جائے تاکہ وہ بسیار اخلاقی برائیوں سے دور ہوں جو بہت زیادہ ہیں اور جن تمام کا سرچشمہ بخل ہے۔ اس مقام پر ان لوگوں کا جواب موجود ہے جو راہ خدا میں قلیل امداد کو کم سمجھتے ہیں ان کے اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر ایک امداد پر علیحدہ علیحدہ نظر رکھتے ہیں ورنہ یہی تھوڑی تھوڑی امداد اگر جمع کی جائیں مثال کے طور پر ایک ملک کے تمام رہنے والے امیر و غریب تھوڑے تھوڑے پیسے بندگانِ خدا کے لیے جمع کریں تو

وہ جذبے سے بڑا کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں انفاق کا اخلاقی اور روحانی اثر زیادہ خرچ کرنے سے نہیں ہے بلکہ اس کے تمام اثرات انفاق کرنے والے کی نیت پر مرتب ہوتے ہیں۔ قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ یہاں پرہیزگاروں کی پہلی عمدہ صفت انفاق (راہِ خدا میں خرچ کرنا) ذکر ہوئی ہے کیونکہ یہ آیات سود خوروں اور سامراجیوں کے مدمقابل صفات کو بیان کر رہی ہیں کہ جن کا ذکر گذشتہ آیات میں ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں خوشی اور تنگدستی کی حالت میں مال و دولت کی قربانی تقویٰ کی واضح ترین علامت ہے۔

۲ والکاظمین الغیظ ــــــــ وہ اپنے غصہ کو پی جاتے ہیں۔

"کظم" کے لغوی معنی پانی بھری مشک کے دھانے کو باندھنے کے ہیں اور کنایہ کے طور پر ان لوگوں کی صفت بیان کی جاتی ہے کہ جو آتش غیظ و غضب سے بھرے ہوں لیکن اسے استعمال نہ کریں۔ لفظ غیظ کا معنی شدتِ غضب ہے جو ایک روحانی ہیجان ہے جو طبیعت کے خلاف چیزوں کو دیکھ کر انسان پر طاری ہو جاتا ہے اور انسان کو آپے سے باہر کر دیتا ہے۔ غصہ کی حالت خطرناک ترین حالت ہوتی ہے اور اگر اسے روکا نہ جائے تو ایک دیوانگی کا عالم ہوتا ہے اور اعصابی نظام کنٹرول سے باہر ہو جاتا ہے۔ جس سے معاشرے میں بہت سے جرائم نمودار ہوتے ہیں۔ اس لیے درج بالا آیت میں پرہیزگاروں کی دوسری صفت غصہ کو پی جانا ظاہر کی گئی ہے۔ حضرت رسولِ خدا فرماتے ہیں:

"من کظم غیظاً وھو قادر علی انفاذہ ملاہ اللہ امنا و ایمانا"

جو شخص اپنے غصے کو پی جائے جبکہ اسے استعمال کرنے پر قادر ہو تو خدا اس کے دل کو امن و ایمان کی روشنی سے منور کرتا ہے۔

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ غصہ پی جانا انسان کی معنوی و روحانی ترقی اور ایمان کی پختگی کے لیے بہت مؤثر ہے۔

۳ والعافین عن الناس ـــــ اور وہ لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

غصہ کو پی جانا (اپنے مقام پر) بڑی اچھی خوبی ہے لیکن یہ انسان کے دل کو بغض و کینہ سے پاک نہیں کرتا لہٰذا بغض و کینہ کی بُرائی ختم کرنے کے لیے ان دونوں (غصے کو پی جانا اور درگذر کرنا) کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ البتہ ایسے افراد سے درگذر کرنا ملحوظ ہے کہ جو اس کے اہل ہوں۔

۴ واللہ یحب المحسنین ـــــ اور وہ نیکی کرنے والے (لوگ ہونے کی وجہ سے) اللہ کو محبوب ہیں۔

اس حصے میں عفو و بخشش سے بلند تر مرحلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور زنجیر کی کڑیوں کی طرح ترقی و تکامل کے مراتب کی تصویر کشی کی گئی ہے، اور وہ اس طرح کہ انسان نہ صرف اپنا غصہ پی جائے اور عفو و بخشش سے کینے کے داغ دل سے دھو ڈالے بلکہ بُرائی کے مقابلے میں احسان اور نیکی کر کے (جہاں مناسب ہو) مدمقابل کے دل سے بھی دشمنی کی بیخ کنی کر دے اور اس کے دل میں نرمی پیدا کر دے تاکہ پھر کبھی اس قسم کا حادثہ سر نہ اٹھائے۔

خلاصہ یہ کہ پہلے غصے کے مقابلے میں اپنے اوپر قابو پانے کا حکم ہے اس کے بعد اپنے دل کو پاک و صاف کرنے کا فرمان ہے اور آخر میں مدمقابل کے دل کو پاک کرنے کا ارشاد ہے۔

مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں ایک حدیث وارد ہوئی ہے جو شیعہ اور سنی کتب میں موجود ہے وہ یہ کہ ایک دفعہ

حضرت امام علی بن حسین زین العابدینؑ کی ایک کنیز آپ کے ہاتھ دھلا رہی تھی کہ پانی کا برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اس سے امامؑ کا جسم اقدس زخمی ہوگیا۔ امامؑ نے غصے میں سر اٹھایا تو کنیز نے فوراً کہا: خدا قرآن میں فرماتا ہے "والکاظمین الغیظ" امامؑ نے فرمایا: میں نے اپنا غصہ پی لیا اس نے عرض کیا "و العافین عن الناس" امامؑ نے فرمایا: میں نے تجھے معاف کیا خدا تجھے معاف کرے۔ اس نے پھر کہا "واللہ یحب المحسنین" امامؑ نے فرمایا: میں نے تجھے راہ خدا میں آزاد کر دیا۔ یہ حدیث[1] اس بات پر واضح شاہد ہے کہ مذکورہ تین مراحل میں سے ہر ایک دوسرے سے بلند تر ہے۔

۵ والذین اذا فعلوا فاحشۃ ..... "وہ گناہوں پر اصرار نہیں کرتے۔

"لفظ فاحشہ" فحش یا فحشاء سے ہے جس کا معنیٰ ہے ہر وہ عمل جو بہت ہی برا ہو اور یہ مفہوم عفت و پاک دامنی کے منافی اعمال میں منحصر نہیں ہے کیونکہ اصل میں یہ حد سے تجاوز کے معنی میں ہے جس میں ہر طرح کا گناہ شامل ہے۔

درج بالا آیت میں پرہیزگاروں کی ایک اور صفت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ وہ لوگ گذشتہ مثبت صفات سے متصف ہونے کے علاوہ اگر کسی گناہ کے مرتکب ہو جائیں تو فوراً یاد خدا میں پڑ جاتے ہیں اور توبہ کر کے پھر کبھی اس گناہ کا ارتکاب نہیں کرتے اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان جب تک یادِ خدا میں مشغول ہے وہ گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا اور وہ گناہ کا اس وقت مرتکب ہو جاتا ہے جب کلی طور پر اس کا دل یادِ خدا سے خالی ہو اور وہ محوِ غفلت ہو۔ لیکن پرہیزگار افراد میں یہ غفلت زیادہ عرصہ نہیں رہتی بلکہ وہ جلد ہی یادِ خدا میں مصروف ہو جاتے ہیں اور گذشتہ کی تلافی کر لیتے ہیں اور اس وقت وہ محسوس کرتے ہیں کہ خدا کے علاوہ کوئی پناہ گاہ نہیں ہے اور صرف اسی سے گناہوں کی بخشش طلب کرنا چاہیے۔

"ومن یغفر الذنوب الا اللہ"

کون ہے خدا کے علاوہ جو گناہوں کو بخشتا ہے۔

اس بات کی طرف بھی توجہ رہے کہ آیت میں فاحشہ کے علاوہ اپنے اوپر ظلم کرنے کا ذکر بھی ہوا ہے (او ظلموا انفسھم) ممکن ہے کہ ان دونوں میں فرق یہ ہو کہ فاحشہ سے گناہان کبیرہ اور ظلم سے گناہان صغیرہ مراد ہوں۔ آیت کے آخری حصے میں تاکید کہا گیا ہے (ولم یصروا علی ما فعلوا وھم یعلمون) اور وہ علم و آگاہی کی صورت میں گناہ پر اصرار نہیں کرتے۔

اس آیت کے ذیل میں حضرت امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"الاصرار ان یذنب الذنب فلا یستغفر اللہ ولا یحدث نفسہ بتوبۃ فذٰلک الاصرار"

گناہ پر اصرار کرنا یہ ہے کہ انسان گناہ کرے اور اس کے بعد استغفار نہ کرے اور توبہ کی فکر میں نہ ہو یہ ہے گناہ پر اصرار۔[1]

کتاب امالی صدوق میں امام جعفر صادقؑ سے ایک پُر معنیٰ حدیث منقول ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ جب درج بالا آیت نازل ہوئی اور توبہ کرنے والوں کو خدا کی طرف سے بخشش کی خوشخبری دی گئی تو ابلیس بہت ہی پریشان ہوگیا اس نے بلند آواز سے اپنے تمام یار و انصار کو بلا کر ایک اجلاس منعقد کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اس دعوت کی وجہ پوچھی تو اس نے اس آیت کے نزول کی بنا پر اظہار پریشانی کیا تو اس کے ایک ہمنوا نے کہا کہ میں انسانوں کو اس گناہ کی دعوت دے دے کر اس آیت کو بے اثر کر دوں گا۔

---

[1] تفسیر عیاشی زیر نظر آیت کے ضمن میں۔

ابلیس نے اس کی تجویز کو قبول نہ کیا۔ ایک دوسرے نے اس قسم کی پیشکش کی کہ وہ بھی منظور نہ ہوئی کہ اس کے دوران ایک کہنہ مشق شیطان کہ جس کا نام وسواس خناس تھا، کہنے لگا میں اس مشکل کو حل کرتا ہوں۔ ابلیس نے پوچھا کیسے؟ وہ کہنے لگا اولاد آدم کو وعدوں اور امیدوں کے ساتھ گناہ میں آلودہ کروں گا اور جب وہ گناہ کے مرتکب ہو جائیں گے تو ان کے دلوں سے یاد خدا کو دور کردوں گا۔ ابلیس نے کہا یہی راستہ درست ہے اور یہ ذمہ داری رہتی دنیا تک اس کے سپرد کردی۔

واضح ہے کہ سہل انگاری اور شیطانی وسوسوں کا تجربہ فراموش کاری ہے اور صرف وہ لوگ اس میں گرفتار ہوتے ہیں جو اس کے سامنے سر جھکا دیں اور اصطلاح کے مطابق وسواس خناس کے ساتھ قریبی تعلق استوار کرلیں۔ لیکن بیدار مغز اور کامل ایمان کے حامل لوگ اس بات پر کڑی نظر رکھتے ہیں کہ جب کبھی ان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اولین موقع پر اس کے آثار کو توبہ و استغفار کے ذریعے دھو ڈالتے ہیں اور اپنے دل کے دریچے شیطان اور اس کے لشکر کے لیے بند کر دیتے ہیں اس طرح وہ ان میں داخل نہیں ہو پاتے۔

اولئك جزاؤهم مغفرة من ربهم وجنات تجري من تحتها الانهار خلدين فيها۔

اس آیت میں ان پرہیزگاروں کی جزا اور اجر بیان کیا گیا ہے (کہ جن کی صفات گذشتہ آیات میں بیان ہو چکی ہیں)۔ وہ پروردگار کی بخشش اور بہشت بریں ہے، جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں (اور ایک لحظہ کے لیے ان سے پانی منقطع نہیں ہوتا) وہ جنت کہ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ درحقیقت اس مقام پر پہلے تو معنوی و روحانی نعمات مغفرت، قلب و روح کو پاکیزہ کرنے اور روحانی ترقی کی طرف اشارہ ہوا ہے اس کے بعد مادی نعمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور آخر میں کہا گیا کہ "ونعم اجر العاملین" یہ کیسی ہی اچھی جزا اور اجر ہے نیک عمل کرنے والوں کے لیے جو کہ مرد میدان ہیں نہ کہ سست و بیکار افراد جو ہمیشہ اچھے وعدوں اور ذمہ داریوں میں لاپرواہی برتتے ہیں۔

۱۳۷۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ○

۱۳۸۔ هَٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ ○

ترجمہ

۱۳۷ تم سے پہلے کچھ سنتیں موجود تھیں (اور ہر قوم کی سرنوشت ان کے اعمال و صفات کے مطابق تھی اور تمہارا حال بھی ان کا سا ہے) زمین میں چل پھر کر دیکھو (کہ آیات خدا کی) تکذیب کرنے والوں کا انجام کیا ہوا۔

۱۳۸ یہ بیان ہے لوگوں کے لیے اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت و نصیحت ہے۔

تفسیر

گذشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ

قرآن مجید کا ایک انفرادی اسلوب ہے کہ یہ گذشتہ ادوار کو موجودہ اور زمانۂ حاضر کو گذشتہ تاریخ سے مربوط کرتا ہے اور حقائق کو سمجھنے کے لیے موجودہ نسل کا گذرے ہوئے لوگوں کے ساتھ فکری و ثقافتی رابطہ لازمی اور ضروری قرار دیتا ہے کیونکہ ان دو زمانوں (ماضی اور حال) کے پختہ ارتباط سے آنے والوں کی ذمہ داری واضح ہو جاتی ہے جیسا کہ زیر نظر آیت میں کہتا ہے کہ "قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض" خدا کی کچھ سنتیں (تعلیمات) گذشتہ اقوام میں تھیں جو ہرگز صرف اُن کے لیے مخصوص نہ تھیں اور وہ قوانین زندگی کے سلسلہ کی ایک شکل میں تمام گذرے ہوئے اور آنے والوں کیلئے جاری ہوتی تھیں۔ ان سنتوں میں مومن و مجاہد اور متحد و بیدار مغز افراد کی پیشرفت اور بلند پروازی کی نشاندہی کی گئی ہے اور اسی طرح بے ایمان اور گناہ کی نجاست سے آلودہ اقوام کی شکست و ریخت کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے جو کہ تاریخ بشریت میں ثبت ہے۔

تاریخ ہر قوم کے لیے زندگی سے کم اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ تاریخ کا کمال ہے کہ وہ گذشتہ لوگوں کی اخلاقی خصوصیات ان کے بُرے بھلے کام اور ان کے نظریات و افکار ہمارے سامنے دہراتی ہے اور مختلف معاشروں کی ترقی و تنزل اور کامیابی و ناکامی کے اسباب کی نشاندہی کرتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ لوگوں کی تاریخ انسانی معاشروں کی روحانی و معنوی زندگی کا آئینہ ہے اور آنے والوں کی بیداری کا سبب ہے۔ بنا بریں قرآن مجید مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ جاؤ زمین میں چلو پھرو اور گذشتہ قوموں، سربراہوں، سرکش فرعونوں اور جبار بادشاہوں کی طاغوتیت و بربریت کے آثار میں غور و فکر کرو اور دیکھو کہ جب انہوں نے خدا کا انکار کیا اور خدا کے پیغمبروں کو جھٹلایا اور زمین میں ظلم و فساد کی بنیاد رکھی تو ان کا انجام کیا ہوا۔ گذشتہ لوگوں کے آثار آنے والوں کے لیے پند و نصیحت کا سامان ہیں اور لوگ ان سے مستفید ہو کر زندگی کی راہ سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔

جہاں گردی

گذشتہ لوگوں کی زندگی کے جو نشانات زمین کے مختلف خطوں میں قدیم ادوار سے باقی ہیں، وہ زندہ اسناد اور بولنے والی تاریخ ہیں۔ یہاں تک کہ ہم ان کے متعلق لکھی ہوئی تاریخ کی نسبت ان سے زیادہ بہرہ ور ہو سکتے ہیں کیونکہ ان نشانات سے اقوام کی جسمانی ساخت، اُن کا زاویۂ فکر اور ان کی قدرت و عظمت کو بآسانی جان سکتے ہیں جب کہ صفحات تاریخ صرف وقوع پذیر واقعات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ستمگروں کے محلات کی ویرانی، اہرام مصر کی تعجب خیز عمارتیں، بابل کے برج، کسریٰ کے محل، قوم سبا کے آثار، تمدن اور اس طرح کی بیسیوں نشانیاں جو اس عالم کے گوشہ و کنار میں بکھری پڑی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نشانی زبان حال سے ان لوگوں کی تاریخ بیان کرتی ہے اور بے زبانی کی زبان میں باتیں کرتی ہے۔ یہ حقیقت اس وقت آشکار ہو جاتی ہے جب کوئی نکتہ سنج شاعر ان محلات کے کھنڈرات میں جا کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنی روح میں ایک اضطراب محسوس کرتا ہے اور ہیجان انگیز اشعار کہتا ہے جیسا کہ خاقانی اور دوسرے عالی

شہرت یافتہ شعراء نے کسریٰ وغیرہ کے ٹوٹے پھوٹے محلات کے اندر سے یہ آوازیں دل کے کانوں سے سنی ہیں اور انہیں ادبی شاہکار کی زینت بنایا ہے [1]۔

ان زندہ تاریخی آثار میں سے ایک کا مطالعہ کرنا ایک ضخیم تاریخی کتاب پڑھنے کے برابر ہے یہ مطالعہ انسان کی روحانی بیداری کے لیے ایک موثر چیز ہے کیونکہ جب ہم ان آثار کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اچانک ایسا لگتا ہے کہ ان ویرانوں میں زیر خاک بوسیدہ ہڈیاں زندہ ہو گئی ہیں اور پہلے جوش و ولولے کا مظاہرہ کر رہی ہیں لیکن جب ہم دوبارہ ان کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو انہیں خاموش و فراموش شدہ دیکھتے ہیں۔ ان دو حالتوں کا موازنہ اس راز گزشت زمانہ کا انجام کرتا ہے کہ خود سرافراد کتنے کوتاہ نظر ہیں کہ جو بہت جلدی گذر جانے والی ہوسرانیوں کے لیے ہزار طرح کا گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس لیے قرآن مجید حکم دیتا ہے کہ مسلمان روئے زمین پر سیر و سیاحت کریں اور گذشتہ لوگوں کے آثار کا مشاہدہ کر کے ان سے عبرت حاصل کریں۔

اسلام میں بھی جہاں گردی اور سیر و تفریح کی اہمیت پسند رہا گیا ہے لیکن آج کے ہوس پرست سیاحوں کی طرح نہیں بلکہ گذشتہ لوگوں کے آثار و انجام کے مطالعہ اور گوشہ ہائے عالم میں عظمت خدا کے مشاہدہ کے لیے اور اسی کا نام قرآن نے "سیروا فی الارض" رکھا ہے اور کئی ایک آیات میں اس کا حکم دیا ہے۔ مثلاً

۱۔ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ۔

یعنی ان سے کہیں کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرموں کا کیا انجام ہوا۔ (نمل ـ ۶۹)

۲۔ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ

یعنی کہو کہ زمین میں گھوم پھر کر دیکھو کہ خدا نے کیسے تخلیق کی۔ (عنکبوت ـ ۲۰)

۳۔ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا...... (الحج ـ ۴۶)

کیا یہ لوگ روئے زمین پر چلے پھرے نہیں تاکہ ان کے دل اس سے کچھ عقل حاصل کرتے

---

[1] خاقانی اپنے ایک مشہور قصیدے میں جبکہ وہ ایوان مدائن میں آنسو بہا رہا تھا، کہتا ہے :

بر دیدہ من خندید کا یجا ز چہ می گریید   خندند بر آن دیدہ کا یجا نشود گریان

یعنی وہ میری آنکھوں پر ہنسا کہ یہاں کیوں روتی ہیں اور وہ ان آنکھوں پر ہنستی ہیں جو یہاں نہ روئیں۔

معروف عالم مرحوم شیخ بہاء الدین عاملی تخت جمشید کے سامنے کھڑے ہوئے اپنے مشہور قصیدے میں کہتے ہیں :

جم عبرت مردم شد نسل و نشش گم شد   سرگشت سر خم شد ہاں ای سر باہش ہال

یہ تخت جمشید آج باعث عبرت ہے کہ آج اس پر بیٹھنے والا حاکم موجود نہیں ہے۔

این پند خموشان است گر پند زبان خواہی   رو آیہ "اور ثنا" از کتب قرآن خوان

یہ تو خاموش لوگوں کی نصیحت ہے اور اگر تو زبان کی نصیحت چاہتا ہے تو کتب قرآن سے "اور ثنا" کی آیت پڑھ۔

یہ آیت کہتی ہے کہ یہ معنوی و روحانی سیاحی اور زمین کی سیر انسان کے دل کو دانائی، آنکھ کو بینائی اور کان کو سماعت عطا کرتی ہے اور اسے سکوت و جمود سے خلاصی دلاتی ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ اسلامی حکم و قانون بہت سے دیگر قوانین کی طرح طاق نسیاں کی نذر کر دیا گیا ہے۔ اب مسلمان اسے بھی نظرِ التفات سے نہیں دیکھتے یہاں تک کہ بعض علما نے اپنی فکر کا دائرہ صرف گرد و پیش تک محدود رکھا ہے۔ وہ گویا اس عالم کے علاوہ کسی اور عالم میں زندگی بسر کرتے ہیں اور دنیا کے اجتماعی انقلابات و وسائل سے بے خبر ہیں اور ان جزوی اور کم اثر کاموں میں اپنے آپ کو مشغول کر رکھا ہے۔ جو اصولی اور بنیادی کاموں کے مقابلے میں خاص قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ اس دنیا میں پوپ اور عیسائیوں کے بڑے بڑے پادری مدیر، گوشہ نشینی اور علیحدگی کے بعد زمین کی سیر و سیاحت کے لیے نکلتے ہیں تاکہ وہ ضروریاتِ زمانہ کو سمجھیں۔ تو اس صورت میں کیا مسلمانوں کو قرآن کے اس حکم پر عمل پیرا نہیں ہونا چاہیے اور اپنے محدود فکری تنگ دائرے سے نہیں نکل چاہیے تاکہ عالمِ اسلام اور مسلمانوں میں ایک انقلاب و حرکت کارفرما ہو۔

هٰذا بيان للناس و هدى و موعظة للمتقين۔

اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ جو کچھ گذشتہ آیات میں بیان ہو چکا ہے وہ تمام انسانوں کے لیے ایک واضح اعلان اور تمام پرہیزگاروں کے لیے ہدایت اور وعظ و نصیحت کا ایک بہترین ذریعہ ہے یعنی باوجودیکہ یہ بیانات تمام انسانوں کے لیے ہر گیر پہلو رکھتے ہیں لیکن ان سے ہدایت کا ثمر صرف پرہیزگار ہی حاصل کر سکتے ہیں۔

۱۳۹۔ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ○

۱۴۰۔ إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ○

۱۴۱۔ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ ○

۱۴۲۔ أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ ○

۱۴۳۔ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ○

ترجمہ

۱۳۹۔ اور سست نہ ہو جاؤ اور حزن و ملال نہ کرو اور تم ہی برتر ہو اگر تم ایمان والے ہو۔

۱۴۰۔ اگر تمہیں (میدانِ احد میں) زخم لگے ہیں (اور تمہیں نقصان پہنچا ہے) تو اس گروہ کو بھی (میدانِ بدر میں) اسی طرح زخم لگ چکے ہیں اور ہم (شکست و کامیابی کے) ان دنوں کو لوگوں میں الٹ پھیر کرتے رہتے ہیں (کیونکہ یہ اس جہان کی زندگی کی خاصیت ہے) نیز اس لیے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ پہچانے جائیں اور خدا تم میں سے قربان ہونے والوں کو منتخب کرے اور

خدا ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔

۱۴۱ اور اس لیے کہ خدا صاحب ایمان لوگوں کو خالص قرار دے (اور وہ الگ ہو جائیں) اور کافروں کو رفتہ رفتہ نابود کر دے۔

۱۴۲ کیا تمہارا گمان ہے کہ تم صرف دعویٰ ایمان کی بنا پر جنت میں داخل کر دیئے جاؤ گے جبکہ ابھی تک خدا نے تم میں سے مجاہدین اور صابرین کو مشخص اور جدا نہیں کیا۔

۱۴۳ اور تم موت (اور راہِ خدا میں شہادت) کی تمنا کرتے تھے جبکہ ابھی تمہارا اور اس کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا اور پھر تم نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور تمہیں وہ نظر آ رہی تھی (لیکن تم اپنے تئیں اس کے حوالے کرنے کو تیار نہ تھے، تمہارے گفتار و کردار میں کتنا فرق ہے)۔

شانِ نزول

ان آیات کی شان نزول کے بارے میں کئی ایک روایات ہیں مجموعی طور پر ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ان آیات کا ضمیمہ ہیں جو جنگ اُحد کے بارے میں پہلے آچکی ہیں۔ یہ آیات جنگ اُحد کے اسباب و نتائج کا بہترین تجزیہ پیش کرتی ہیں اور ضمنی طور پر مسلمانوں کی روحانی تقویت اور ان کی تسلی کا سامان بھی فراہم کرتی ہیں۔ کیونکہ جیسا بیان کیا گیا ہے کہ جنگ احد کچھ مسلمانوں کی نافرمانی اور جنگی اصولوں سے انحراف کی وجہ سے شکست پر منتج ہوئی اور اس میں اسلام کی چند درخشاں شخصیات نے جام شہادت نوش فرمایا جن میں سے سرفہرست پیغمبر اکرمؐ کے چچا حضرت حمزہ کا نام گرامی آتا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ اسی رات اپنے صحابہ کے ہمراہ شہداء کی لاشوں کے قریب گئے شہداء کی ارواح مقدسہ کی عظمت کو مدنظر رکھتے ہوئے آپؐ ایک ایک شہید کی لاش مبارک کے پاس بیٹھتے اور گریہ کرتے اور ان کے لیے طلب مغفرت کرتے بعد میں ان سب کی لاشوں کو کوہ احد کے دامن میں بہت ہی رنج و ملال کے ساتھ دفن کیا گیا۔ ان حساس لمحات میں درج بالا آیات کا نزول ہوا کیونکہ اس موقع پر مسلمان روحانی تقویت اور شکست کے نتائج سے معنوی فائدہ حاصل کرنے کے شدید محتاج تھے۔

تفسیر

جنگ اُحد کے نتائج

ولا تھنوا ولا تحزنوا و انتم الاعلون ان کنتم مومنین۔

"تھنوا" "وہن" کے مادے سے لیا گیا ہے۔ وہن لغت میں ہر قسم کی سستی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ خواہ اس کا تعلق جسم ہو یا ارادہ و ایمان سے۔ اس آیت میں پہلے تو مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک جنگ میں شکست کی وجہ سے تم میں

سستی اور کمزوری پیدا ہو اور تم محزون ہو کر آخری کامیابی سے مایوس ہو جاؤ۔ کیونکہ بیدار مغز افراد جس طرح کامیابیوں سے استفادہ کرتے ہیں اسی طرح شکست سے بھی درس حاصل کرتے ہیں اور اس کے سایہ میں کمزوری کے نقاط اور شکست کی وجوہات تلاش کرتے ہیں اور انہیں دور کر کے آخری کامیابی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین ۔ (تم ہی برتر ہو اگر تم میں ایمان ہو) ایک بہت ہی پُر معنی جملہ ہے یعنی تمہاری شکست درحقیقت روح ایمان اور اس کے آثار کھو بیٹھنے کی وجہ سے تھی۔ اگر تم فرمانِ خدا و رسولؐ کو پائے نافرمانی سے نہ روندتے تو اس قسم کی مصیبت میں گرفتار نہ ہوتے تاہم تمہیں رنج و ملال نہیں ہونا چاہیے اگر راہِ ایمان پر ثابت قدم رہے تو آخری فتح تمہاری ہوگی اور ایک میدان میں شکست سے دوچار ہونے کا معنی حتمی شکست نہیں ہے۔

ان یمسسکم قرح فقد مس القوم قرح مثلہ ۔

"قرح" کا معنی ایسا زخم ہے جو بدن میں کسی خارجی عامل کی وجہ سے پیدا ہو۔ اس آیت میں ایک دوسرا درس آخری کامیابی تک پہنچنے کے لیے مسلمانوں کو دیا جا رہا ہے کہ تمہیں دشمن سے کمتر نہیں ہونا چاہیے ۔ وہ بدر میں سنگین شکست سے دوچار ہوئے تھے ان کے ستر آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور بہت سے لوگ زخمی اور قید ہوئے تھے۔ بایں ہمہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے نہیں رہے بلکہ میدانِ اُحد میں تمہاری غفلت کی وجہ سے انہوں نے اپنی شکست کی تلافی کی ہے۔ اب اگر تم اس میدان میں شکست کھا گئے ہو تو تم بھی نقصان کی تلافی کیے بغیر بیٹھ نہ جاؤ۔ اسی لیے ارشاد ہوا کہ اگر تمہیں زخم لگے ہیں تو ان کو بھی اس طرح کے زخم لگے ہیں۔ بنا برایں تمہاری سستی اور غم و اندوہ کی وجہ کیا ہے۔ بعض مفسرین اس آیت میں زخموں سے مراد کفار کے وہ زخم لیتے ہیں جو انہیں جنگ اُحد میں لگے تھے۔ لیکن پہلے تو یہ زخم مسلمانوں کے زخموں جیسے نہیں تھے۔ لہٰذا یہ لفظ مثلہ کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے اور دوسرا یہ کہ یہ بعد کے جملے کے ساتھ بھی مناسبت نہیں رکھتے جس کی تفسیر عنقریب آجائے گی۔

وتلک الایام نداولھا بین الناس ولیعلم اللہ الذین امنوا ویتخذ منکم شھداء

اس حصے میں پہلے ایک سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ انسانی زندگی میں تلخ و شیریں حوادث آتے رہتے ہیں کہ جن میں سے کسی کے لیے پائیداری نہیں ہے۔ فتوحات و ناکامیاں، قدرتیں اور ناتوانیاں سب کی حالت بدلتی رہتی ہے۔ لہٰذا ایک میدان کی شکست اور اس کے آثار کو پائیدار نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ شکست کے عوامل اور اسباب کا مطالعہ کر کے ان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے استفادہ کیا جائے اور اسے کامیابی سے بدلا جائے دنیا میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں اور زندگی اپنے اصول کے مطابق تبدیل ہوتی رہتی ہے اور خدا ان ایام کو لوگوں کے درمیان گردش دیتا رہتا ہے تاکہ ان حوادث و واقعات میں سے سنتِ تکامل آشکار ہو جائے۔[1] بعد ازاں ان ناگوار واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ "ولیعلم اللہ الذین امنوا" یہ سب کچھ اس سبب سے ہے تاکہ صاحبانِ ایمان افراد، ایمان کے دعویداروں سے الگ ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں جب تک دردناک واقعات

---

[1] "ایام" "یوم" کی جمع ہے۔ "یوم" کا معنی ہے "دن"۔ لوگوں کی کامیابی کے زمانے کو بھی ایام کہا جاتا ہے۔ "نداولھا" "مداولہ" سے ہے اس کا معنی ہے ایک چیز کو مختلف لوگوں کے درمیان گردش دینا۔

کسی قوم میں واقع نہ ہوں تو ان کی صفیں ایک دوسرے سے مشخص نہیں ہوں گی کیونکہ کامیابیاں لوگوں کو غفلت کی نیند سلا دیتی ہیں جب کہ شکستیں تیار افراد کے لیے بیدار کرنے والی ہوتی ہیں اور ان کی قدر و قیمت کی نشاندہی کرتی ہیں۔

• ویتخذ منکم شہداء • میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس شکست کے نتائج میں سے ایک یہ تھا کہ تم راہ اسلام میں شہادتیں اور قربانیاں پیش کرو اور جان لو کہ یہ پاک دین و آئین تمہیں مفت میں نہیں مل گیا مبادا آئندہ اسے تھوڑی سی قیمت پر ہاتھ سے دے بیٹھو۔ جو قوم مقدس مقاصد اور اہداف کے لیے قربانی نہ دے، وہ انہیں کم تر سمجھتی ہے لیکن جب ان کے لیے قربانیاں دے تو پھر خود اور آئندہ نسلیں بھی انہیں عظمت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ لفظ شہداء سے مراد یہاں گواہ ہوں یعنی خدا چاہتا ہے کہ اس حادثے سے تم میں سے کچھ گواہ دے سکیں کہ کس طرح نافرمانیوں کا انجام شکست ہوا کرتا ہے اور آئندہ جب کبھی انہیں اس قسم کے حادثوں کا سامنا ہو یہ گواہ ان کے لیے معلم کا کردار ادا کریں گے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ خدا ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔ اس لیے ان کی حمایت بھی نہیں کرے گا۔

پرورش و تربیت کا میدان

ولیمحص اللہ الذین اٰمنوا .....

• لیمحص • تمحیص کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کو ہر قسم کے نقص و عیب سے پاک و صاف کرنا • یمحق • مادہ محق (بروزن مرد) سے ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کا آہستہ آہستہ کم ہونا۔ اسی مناسبت سے مہینے کی آخری رات کو • محاق • کہا جاتا ہے کیونکہ آہستہ آہستہ چاند کی روشنی کم اور ختم ہو جاتی ہے۔

اس آیت میں جنگ احد کے ایک اور فطری نتیجہ کی طرف اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ اس قسم کی شکستیں جماعتوں کی کمزوری اور عیوب کے پہلو واضح کرتی ہیں اور ان عیوب کو دور کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا چاہتا تھا کہ اس معرکہ حق و باطل میں باایمان افراد کو خالص قرار دے اور انہیں کمزوری کے نقاط کی نشاندہی کرے تاکہ وہ آئندہ کی اس قسم کی آزمائش کی کٹھالی سے گزر کر اپنی ہوشیاری کا اندازہ لگالیں جیسا کہ حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

"فی تقلب الاحوال یعلم جواھر الرجال"

حالات کی دگرگونی اور زندگی کے کٹھن حوادث میں لوگوں کے جوہر کا پتہ چلتا ہے اور وہ اپنی صلاحیتوں سے باخبر ہوتے ہیں۔

یہ وہ مقام ہے جہاں بعض شکستیں ایسی اصلاح پرور ہوتی ہیں کہ جن کے اثرات انسانی معاشروں میں ظاہری خواب آور کامیابیوں سے کئی درجے زیادہ ہوتے ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ تفسیر المنار کا مؤلف اپنے استاد مصر کے عظیم مفتی محمد عبدہ سے نقل کرتا ہے کہ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کو خواب میں دیکھا اور آپؐ نے اس سے فرمایا کہ اگر مجھے میدان احد میں فتح و شکست کا حق دار قرار دیا جاتا تو میں اس میدان میں شکست کو ترجیح دیتا کیونکہ یہ شکست تاریخ اسلام میں ایک اصلاح کنندہ عامل بن گئی۔

ویمحق الکافرین

یہ جملہ در حقیقت پہلے جملہ کا نتیجہ ہے کیونکہ جب مومنین حوادث کی کٹھالی میں مضبوط اور پاک ہو گئے تو ان میں کفر و شرک کی برائی کو دور کرنے

اور اپنے معاشرہ کو ان گندگیوں سے پاک کرنے کی کافی آمادگی پیدا ہوگئی یعنی پہلے خود پاک ہونا چاہیے اور پھر دوسروں کو پاک کرنا چاہیے۔ حقیقت میں جس طرح کہ چاند اپنی جلوہ گری کے ساتھ آہستہ آہستہ کم روشن ہوجاتا ہے اور وہ حالت محاق میں چلا جاتا ہے، اسی طرح کفر و شرک اور ان کے حامیوں کی عظمت مسلمانوں کی مضبوطی اور پاکیزگی سے زوال پذیر ہوگئی۔

ام حسبتم ان تدخلوا الجنة و لما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم و یعلم الصٰبرین

قرآن مجید واقعہ احد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسلمانوں کے ایک فکری اشتباہ کی تصحیح کرتا ہے کہ تم یہ خیال کرتے ہو کہ جہاد میں استقامت کا مظاہرہ کیے بغیر بہشت بریں میں قیام پذیر ہوجاؤ گے کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ اس معنوی سعادت کے اندر داخل ہونا صرف مسلمان کہلوانے یا عمل کے بغیر صرف عقیدہ سے ممکن ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو معاملہ نہایت سہل ہوتا لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے اور جب تک حقیقی عقائد کی میدانِ عمل میں عکاسی نہ ہو کوئی شخص بھی ان سعادتوں سے بہرہ ور نہیں ہوسکتا آزمائش کی منزل پر (حق و باطل کی) صفیں ایک دوسرے سے ممتاز ہوجاتی ہیں اور مجاہد و صابر بے قیمت و بے ارزش افراد سے ممتاز نظر آتے ہیں۔

کھوکھلی باتیں

و لقد کنتم تمنون الموت من قبل ان تلقوہ فقد رایتموہ و انتم تنظرون۔

جنگ بدر میں بعض مسلمانوں کی پر افتخار شہادت کے بعد بعض مسلمان جب باہم مل بیٹھتے تو ہمیشہ شہادت کی آرزو کرتے اور کہتے کاش یہ اعزاز میدان بدر میں ہمیں بھی نصیب ہوتا۔ یقیناً ان میں کچھ لوگ سچے بھی تھے لیکن ان میں ایک چھوٹا گروہ بھی تھا جس نے اپنے آپ کو سمجھنے میں اشتباہ کیا بہرحال زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ جنگ احد کا وحشتناک معرکہ درپیش ہوا تو ان سچے مجاہدین نے بہادری سے جنگ کی اور جام شہادت نوش کیا اور اپنی آرزو کو پالیا لیکن جھوٹوں کے گروہ نے جب لشکر اسلام میں شکست کے آثار دیکھے تو وہ قتل ہونے کے ڈر سے بھاگ کھڑے ہوئے تو یہ آیت انہیں سرزنش کرتے ہوئے کہتی ہے کہ تم ایسے لوگ تھے کہ جو دلوں میں آرزو اور تمنائے شہادت کے دعویدار تھے، پھر جب تم نے اپنے محبوب کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا تو کیوں بھاگ کھڑے ہوئے۔

جنگ احد میں شکست کے اسباب کا مختصر جائزہ

اوپر کی آیات میں بعض ایسی قابل توجہ تعبیرات نظر آتی ہیں جن میں سے ہر ایک جنگ احد کی شکست کے کسی نہ کسی راز سے پردہ اٹھاتی ہے۔ مختصر یہ کہ چند ایک ایسے عوامل موجود تھے کہ جن کی بنا پر یہ دلخراش اور عبرت آموز حادثہ رونما ہوا۔

۱ بعض نو مسلموں میں معانئ اسلام کے ادراک میں اشتباہ پیدا ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ صرف ایمان کا اظہار ہی کامیابی کے لیے کافی ہے۔ لہٰذا تمام جنگوں میں غیبی امداد کے ذریعے خدا ان کی حمایت کرے گا۔ اس طرح انہوں نے کامیابی کے فطری عوامل صحیح منصوبہ سازی اور ضروری وسائل فراہم کرنے کے سلسلے میں سنت الٰہی کو پس پشت ڈال دیا۔

۲ فوجی نظم و ضبط کی پابندی نہ کرنا، پیغمبر اکرمؐ کا تاکیدی فرمان تھا کہ تیر انداز اپنے حساس مورچے پر ڈٹے رہیں اس فرمان کی مخالفت اس شکست کا ایک موثر عامل بنی۔

۳ تو مسلموں کی دنیا پرستی کہ جنہوں نے جنگی غنائم کی جمع آوری کو دشمن کا پیچھا کرنے پر ترجیح دی اور اسلحہ اتار کر غنیمت حاصل کرنے کے لیے چل پڑے حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ راہِ خدا میں جہاد کرتے وقت ان باتوں کی طرف دھیان نہیں دینا چاہیے۔

۴ تکبر و غرور جو جنگ بدر کی کامیابی سے پیدا ہوا تھا یہاں تک کہ وہ دشمن کی طاقت کو اپنے اذہان سے نکال بیٹھے تھے اور اس کے ساز و سامان کو معمولی سمجھ بیٹھے تھے۔ یہ اس شکست کا چوتھا اہم عامل تھا۔ یہ وہ کمزور پہلو تھے جنہیں اس شکست کے کھولتے ہوئے پانی سے دھونے کی ضرورت تھی۔

۱۴۴۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ○

۱۴۵۔ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ○

ترجمہ

۱۴۴ محمدؐ صرف خدا کے رسول ہیں اور ان سے پہلے بھی بہت سے رسول ہو گزرے ہیں کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا انہیں قتل کر دیا جائے تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے (اور ان کے فوت ہونے سے اسلام کو چھوڑ کر کفر و بت پرستی کے زمانہ کی طرف پلٹ جاؤ گے) اور جو شخص پلٹ جائے گا وہ ہرگز خدا کو کوئی ضرر نہیں پہنچائے گا اور خدا تعالیٰ عنقریب شکرگزاروں (اور استقامت رکھنے والوں) کو جزا دے گا۔

۱۴۵ اور کوئی شخص حکم خدا کے بغیر نہیں مرتا یہ معین شدہ سرنوشت ہے (اس بنا پر پیغمبر اور دوسرے لوگوں کی وفات سنتِ الٰہی ہے) تو جو شخص بھی دنیا کا ثواب اور جزا چاہتا ہے (اور اپنی زندگی میں اس کے لیے کوشش کرتا ہے) تو اس میں کچھ نہ کچھ ہم اسے دیں گے اور جو آخرت کا ثواب اور جزا چاہتا ہے تو اس میں اسے عطا کریں گے اور عنقریب شکرگزاروں کو جزا دیں گے۔

شانِ نزول

یہ آیت بھی جنگ اُحد کے ایک حادثہ کے بارے میں ہے اور وہ یہ کہ جس وقت جنگ کی آگ مسلمانوں اور بت پرستوں کے درمیان شعلہ زن تھی، اچانک ایک آواز بلند ہوئی اور کسی نے کہا: "میں نے محمدؐ کو قتل کر دیا" "میں نے محمدؐ کو قتل کر دیا"۔ یہ ٹھیک اس وقت کی بات ہے جب ایک شخص عمرو بن قمیۂ حارثی نے ایک پتھر آنحضرتؐ کی طرف پھینکا اور پیغمبرؐ کی پیشانی اور دندان مبارک شہید ہو گئے، ہونٹ پھٹ گیا اور آپ کا رخسار مبارک لہولہان ہو گیا۔[۱] اس موقع پر ہر ایک دشمن چاہتا تھا کہ آپؐ کو قتل کر دے۔ اس دوران میں لشکرِ اسلام کے ایک علمدار مصعب بن عمیر نے ان کے حملوں کو تو روک دیا لیکن خود شہید ہو گیا۔ اس کی شکل چونکہ پیغمبرؐ سے ملتی جلتی تھی تو دشمن نے یہی گمان کیا کہ پیغمبرؐ خاک و خون میں تڑپ رہے ہیں۔ یہ آواز فضائے عالم میں گونج اٹھی اس آواز سے جتنا بت پرستوں کے جذبات پر مثبت اثر پیدا ہوا اتنا ہی مسلمانوں میں عجیب اضطراب پیدا ہو گیا چنانچہ ایک کثیر گروہ کے ہاتھ پاؤں جواب دے گئے اور وہ بڑی تیزی سے میدان جنگ سے نکل گئے یہاں تک کہ ان میں سے بعض نے سوچا کہ پیغمبرؐ تو شہید ہو گئے ہیں لہٰذا اسلام ہی کو خیر باد کہہ دیا جائے اور بت پرستوں کے سرداروں سے امان طلب کر لی جائے لیکن ان کے مقابلے میں فداکاروں اور جانثاروں کی بھی ایک قلیل جماعت تھی جن میں حضرت علیؑ، ابو دجانہ اور طلحہ جیسے بہادر لوگ موجود تھے جو باقی لوگوں کو پامردی اور استقامت کی دعوت دے رہے تھے ان میں سے انس بن نضر لوگوں کے درمیان آیا اور کہنے لگا: اے لوگو! اگر محمدؐ شہید ہو گئے ہیں تو محمدؐ کا خدا تو قتل نہیں ہوا۔ چلو اور جنگ کرو اس نیک اور مقدس ہدف کے حصول کے لیے درجۂ شہادت پر فائز ہو جاؤ۔ یہ گفتگو تمام کرتے ہی انہوں نے دشمن پر حملہ کر دیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ تاہم جلد ہی معلوم ہو گیا کہ پیغمبرِ اکرمؐ سلامت ہیں اور اطلاع اشتباہاً دی گئی تھی۔ مندرجہ بالا آیت اسی مقام پر نازل ہوئی اور اس نے پہلے گروہ کی مذمت کی۔

تفسیر

شخصیت پرستی کی ممانعت

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم

جنگ اُحد کے واقعات سے استفادہ کرتے ہوئے یہ آیت مسلمانوں پر ایک اور حقیقت واضح کرتی ہے وہ یہ کہ اسلام شخصیت پرستی کا دین نہیں ہے اور فرض کر لیں کہ اگر پیغمبرؐ اس میدان جنگ میں جام شہادت نوش فرماتے تب بھی مسلمانوں کا فرض تھا کہ لڑائی کو جاری رکھتے کیونکہ پیغمبرؐ کی (طبعی) وفات یا شہادت سے اسلام کا خاتمہ نہیں ہوتا بلکہ یہ ابد تک باقی رہنے والا دین حق ہے۔ شخصیت پرستی ایک خطرناک مسئلہ ہے جو با مقصد لڑائی کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی خاص شخص چاہے وہ پیغمبر ہی ہو،

---

[۱] بعض تواریخ میں ہے کہ چند آدمیوں نے مل کر آنحضرتؐ پر حملہ کیا تھا جس کے نتیجے میں آپؐ کو یہ زخم آئے۔

ہوں سے بے مقصد کی وابستگی کا معنی یہ ہے کہ جب وہ شخص اس دنیا سے چلا جائے تو پیشرفت کی کوشش اور اس کی تلاش ختم ہو سکتی ہے اور یہ وابستگی اجتماعی رشد و ترقی کے نہ ہونے کی ایک واضح نشانی ہے۔ شخصیت پرستی سے مقابلہ آپ کی حقانیت اور عظمت کی ایک اور نشانی ہے کیونکہ آپ نے اگر اپنی ذات کے لیے قیام کیا ہوتا تو آپ اس فکر کو لوگوں میں فروغ دیتے کہ تمام چیزیں ان کے وجود سے وابستہ ہیں، اور اگر وہ درمیان سے چلے جائیں تو تمام چیزیں ختم ہو کر رہ جائیں گی۔ لیکن آپ جیسے صحیح اور سچے رہبر کبھی اس قسم کے افکار لوگوں میں پنپنے نہیں دیتے بلکہ سختی کے ساتھ ان کی بیخ کنی کرتے ہیں اور انہیں اس بات کی تعلیم دیتے ہیں کہ ہمارا مقصد ہماری ذات سے بلند ہے اور وہ ہمارے چلے جانے سے نابود نہیں ہوگا۔ لہٰذا قرآن صراحت کے ساتھ اوپر کی آیت میں اعلان کرتا ہے کہ محمدؐ صرف خدا کے بھیجے ہوئے (رسول) ہیں ان سے پہلے بھی بھیجے ہوئے افراد تھے جو دنیا سے چل بسے۔ کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا قتل ہوں تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور بت پرستی کا راستہ اختیار کرو گے۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ آیت میں رجعت قہقہری (پیچھے کی طرف پلٹنا) کے لیے "انقلبتم علی اعقابکم" کے الفاظ لائے گئے ہیں کیونکہ اعقاب جو کہ عقب (بروزن خشن) کی جمع ہے اس کا معنی ایڑی ہے اور یہ رجعت قہقہری کی واضح تصویر کشی ہے۔

ومن ینقلب علی عقبیہ فلن یضر اللہ شیئا

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ پیچھے کی طرف پھر جائیں اور کفر و بت پرستی کے دور کی طرف لوٹ جائیں وہ صرف اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہے ہیں نہ کہ خدا کو۔ کیونکہ اس عمل سے نہ صرف ان کی نیک بختی جاتی رہتی ہے بلکہ جو کچھ اب تک کما چکے ہیں وہ بھی تیزی کے ساتھ اپنے ہاتھ سے دے بیٹھیں گے۔

وسیجزی اللہ الشاکرین

آیت کے آخر میں اس قلیل جماعت کی طرف اشارہ کیا گیا جو تمام مشکلات اور پیغمبر اکرمؐ کی خبرِ شہادت عام ہونے کے باوجود جہاد سے دست بردار نہیں ہوئی۔ اس میں ان کی جد و جہد کو سراہا گیا ہے اور ان کا تعارف شاکرین اور نعمات الٰہی سے بہرہ ور ہونے والے اشخاص کے عنوان سے کرایا گیا ہے اور ارشاد ہوتا ہے: خدا ان شکر گزاروں کو اچھی جزا دے گا۔ اس آیت نے تمام مسلمانوں اور ہر زمانہ کے لوگوں کے لیے شخصیت پرستی کا مقابلہ کرنے کا ایک نصیحت آموز درس دیا ہے کہ بامقصد مسائل کبھی ایک یا کئی محدود اشخاص سے وابستہ نہیں ہوتے بلکہ وہ کئی ایک اصول اور ابدی پروگراموں کے گرد گھومتے ہیں اور افراد کے بدلنے یا ان کے فوت ہو جانے سے انہیں معطل نہیں ہونا چاہیے، چاہے وہ فرد خدا کے عظیم پیغمبرؐ ہی کیوں نہ ہوں اور اصولی طور پر ایک مذہب اور پروگرام کی بقا کا راز اسی میں مضمر ہے اس لیے کہ جو پروگرام اور مشن کسی شخصِ واحد سے مربوط ہوتے ہیں وہ تا دیر نہیں رہتے بلکہ بہت جلد ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اکثر اسلامی اداروں کے پروگرام ابھی تک اشخاص سے قائم ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتے۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ درج بالا آیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مختلف اداروں کی داغ بیل اس طرح ڈالیں کہ وہ لائق و فائق افراد سے پوری طرح فائدہ اٹھائیں تاہم وہ کسی شخص سے وابستہ نہ رہیں۔

وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتابا مؤجلا

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ میدان احد میں پیغمبرؐ کی شہادت کی بے بنیاد خبر نے بہت سے مسلمانوں کو وحشت و اضطراب میں مبتلا کیا

تک کہ وہ میدان چھوڑ گئے بلکہ بعض تو اسلام سے ہی علیحدہ ہونا چاہتے تھے اس لیے از سرِ نو اس آیت میں اس گروہ کو تنبیہ اور بیداری کے لیے ارشاد ہوا کہ موت خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس کے ہاں ہر شخص کے لیے مقرر شدہ وقت ہے جس سے وہ بھاگ نہیں سکتا بنا برایں اگر پیغمبر اس میدان میں جامِ شہادت نوش فرما لیتے تو سوائے ایک سنتِ الٰہی انجام پانے کے اور کوئی بات نہیں تھی لیکن ان حالات میں مسلمانوں کو وحشت و اضطراب میں مبتلا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ لڑائی جاری نہ رکھیں اور دوسری طرف میدانِ جنگ سے فرار موت سے غلامی نہیں دلا سکتا جیسا کہ میدان جنگ میں شریک ہونا بھی انسان کی موت کو پہلے نہیں لا سکتا۔ اس لیے جان کی حفاظت کے لیے میدان جنگ سے فرار بے معنیٰ دارد۔ اجل اور اس طرح اجل "حتمی" اور "معلق" کے درمیان فرق پر سورۂ انعام میں ہم سیر حاصل تبصرہ کریں گے۔

ومن یرد ثواب الدنیا نؤتہ منھا ومن یرد ثواب الآخرۃ نؤتہ منھا

آیت کے آخر میں ارشاد ہوا کہ انسان کی کوشش کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ اگر کسی کا مقصد صرف مادی فوائد تک محدود ہو اور مقصد جنگِ احد کے بعض سپاہیوں کی طرح صرف مالِ غنیمت جمع کرنا ہو تو بالآخر کچھ نہ کچھ اس سے بہرہ ور ہوگا لیکن اگر اس کا مقصد عظیم ہو اور حیاتِ جاودانی اور انسانی فضائل کی راہ میں کوشش کی جائے تو پھر بھی اپنے مقصد تک پہنچ جائے گا۔ بنا بریں جب دنیا یا آخرت کا حصول دونوں ہی کوشش کے محتاج ہیں تو پھر انسان کیوں اپنے وجود کے سرمائے کو بلند ترین اور پائیدار راستہ میں صرف نہ کرے۔

اس کے بعد دوبارہ تاکیداً کہا گیا کہ ہم بہت جلد شکر گزاروں کو جزا دیں گے (وسنجزی الشاکرین)۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں یہی جملہ فعل غائب کی شکل میں ذکر ہوا تھا اور یہاں فعل متکلم کی صورت میں ہے جس سے وعدۂ خداوندی کی انتہائی تاکید ہوتی ہے اور سادہ الفاظ میں خدا کہتا ہے کہ ان کی جزا کا میں ضامن ہوں۔ تفسیر مجمع البیان میں امام باقرؑ سے اس آیت کے ذیل میں منقول ہے:

حضرت علیؑ کو اُحد کے دن اکسٹھ زخم لگے تھے اور پیغمبر نے "ام سلیم" اور "ام عطیہ" کو حکم دیا کہ وہ دونوں حضرت علیؑ کے زخموں کا علاج کریں۔ تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ وہ حالت پریشانی میں آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کرنے لگیں کہ حضرت علیؑ کے بدن کی کیفیت یہ ہے کہ ہم جب ایک زخم باندھتی ہیں تو دوسرا کھل جاتا ہے اور اُن کے بدن کے زخم اس قدر زیادہ اور خطرناک ہیں کہ ہم اُن کی زندگی کے بارے میں پریشان ہیں تو حضرت رسولِ خداؐ اور کچھ دیگر مسلمان حضرت علیؑ کی عیادت کے لیے ان کے گھر آئے جبکہ ان کے بدن پر زخم ہی زخم تھے تو پیغمبرِ اکرمؐ اپنے دستِ مبارک ان کے جسم سے مَس کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ جو شخص راہِ خدا میں اس حالت کو دیکھے وہ اپنی ذمہ داری کے آخری درجہ کو پہنچ چکا ہے اور جن جن زخموں پر آپؐ ہاتھ رکھتے تھے وہ فوراً مل جاتے تھے تو اس وقت حضرت علیؑ نے فرمایا کہ الحمد للہ کہ ان حالات میں بھی میدانِ جنگ سے نہیں بھاگا اور دشمن کو پشت نہیں دکھائی، خدا نے ان کی کوشش کی قدردانی کی اور قرآن کی دو آیات میں آپؑ کی اور مجاہدینِ اُحد میں سے دیگر قابلِ تقلید افراد کی فداکاریوں کی طرف اشارہ کیا۔ وسیجزی اللہ الشاکرین، اور دوسرے مقام پر ارشاد ہوا (وسنجزی الشاکرین)۔

۱۴۶ وَكَأَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَا اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ

يُحِبُّ الصّٰبِرِينَ ○

۱۴۷۔ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّآ أَن قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِيٓ أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِينَ ○

۱۴۸۔ فَآتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ○

ترجمہ

۱۴۶ اور کتنے پیغمبر تھے جن کی معیت میں بہت سے خدا والوں نے جنگ کی تو انہوں نے راہ خدا میں پہنچنے والی مصیبت کے مقابلے میں سستی نہیں کی اور نہ وہ کمزور و ناتواں ہوئے اور نہ ہی انہوں نے سر جھکایا اور خدا صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

۱۴۷ ان کی گفتگو صرف یہ تھی کہ پروردگار ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمارے کاموں میں زیادتی سے صرف نظر فرما ہمیں ثابت قدم رکھ اور ہمیں کفار پر کامیابی عطا کر۔

۱۴۸ لہٰذا خدا نے دنیا اور آخرت کا حسنِ ثواب انہیں دیا اور خدا نیک کاروں کو پسند کرتا ہے۔

تفسیر

گذشتہ زمانوں کے مجاہدین

وکاین من نبی ......

"کاین" کے معنی ہیں کتنے زیادہ اور ادب کے ماہرین کہتے ہیں کہ یہ لفظ کاف تشبیہ اور "این" سے مرکب ہے کہ جو اب ایک ہی کلمہ بن چکا ہے اور پہلے اجزاء کا انفرادی معنی متروک ہو گیا ہے اور اس کا معنیٰ ہو گیا ہے "کتنے زیادہ"

"ربیون" ربی (بروزن ملی) کی جمع ہے اور ربی اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جس کا خدا سے مضبوط اتصال ہو جو صاحب ایمان، عالم، صابر اور مخلص ہو۔

جنگ احد کے واقعات کے بعد اوپر کی آیت گذشتہ زمانہ کے مجاہدین اور اصحاب انبیاءؑ کی قوت، شجاعت پختگی ایمان

اور استقامت کی یاد دلا کر مسلمانوں کو شجاعت اور فداکاری کی تشویق و ترغیب دلاتی ہے اور ضمنی طور پر میدان سے فرار کرنے والوں کی سرزنش کرتی ہے اور کہتی ہے کہ بہت سے انبیاء ایسے تھے جن کے یار و انصار کی صف میں خدا پرست مجاہد موجود تھے۔ اس کے بعد ان کا طرزِ عمل یوں بیان کرتی ہے: وہ انبیاء کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، بہت کٹھن مشکلات میں انہوں نے سستی اور ناتوانی نہیں دکھائی اور دشمن کے سامنے کبھی سرِ تسلیم خم نہیں کیا اور نہ ہی اپنے آپ کو ان کے سپرد کیا ہے (ما ضعفوا وما استکانوا) اور واضح ہے کہ خدا ایسے ہی افراد کو پسند کرتا ہے جو لڑائی میں پیچھا نہیں دکھاتے (واللہ یحب الصابرین)۔ وہ لوگ جو کبھی سستی یا لغزش کی وجہ سے دشمن کے سامنے مشکلات میں گھر جاتے تھے تو بجائے اس کے کہ میدان ان کے حوالے کر دیں یا اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیں یا ان کے دماغ میں کفر و ارتداد کی خلش پیدا ہو، وہ بارگاہِ خداوندی سے صبر و استقامت اور پامردی کی درخواست کرتے تھے اور کہتے تھے "ربنا اغفرلنا ذنوبنا و اسرافنا فی امرنا و ثبت اقدامنا و انصرنا علی القوم الکافرین" پروردگارا! ہمارے گناہوں کو بخش دے ہماری جلد بازی سے درگزر فرما اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور ہمیں کافروں پر کامیابی عطا کر۔ وہ اس قسم کے طرزِ عمل سے خدا سے جلد اپنی جزا اور ثواب حاصل کرتے تھے اس دنیا کی جزا بھی جو دشمن پر فتح و کامرانی ہے اور دوسرے جہان کی جزا و ثواب بھی۔ "فاتاھم اللہ ثواب الدنیا وحسن ثواب الاخرۃ"

آیت کے آخر میں انہیں نیکوکاروں میں شمار کر کے ارشاد ہوتا ہے "واللہ یحب المحسنین" خدا نیکوکاروں کو دوست رکھتا ہے۔ اس طرح سے خدا تازہ مسلمانوں کے لیے گذشتہ امتوں کے مجاہدین کے پروگراموں اور مشکلات کے مقابلے میں ان کے طرزِ عمل کا ذکر ایک درس کے طور پر کر رہا ہے۔

اوپر کی آیات ان چیزوں کے علاوہ کئی اور نکات بھی واضح کرتی ہیں:

۱ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ صبر کے معنی ہیں استقامت و پامردی۔ اس لیے اس آیت میں اسے ضعف اور تسلیم کے مقابلے میں لایا گیا ہے اور ضمناً صابر اور نیکوکار ایک درجہ میں قرار پائے ہیں کیونکہ آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے "واللہ یحب الصابرین" اور دوسری آیت میں ہے "واللہ یحب المحسنین"۔ اس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ نیکوکاری صبر و استقامت کے بغیر ممکن نہیں۔ کیونکہ ہر نیکوکار شخص کے سامنے ہزار ہا مشکلات کھڑی ہیں۔ اگر اس میں استقامت نہ ہوگی تو وہ بہت جلد ہی اپنا کام چھوڑ دے گا۔

۲ حقیقی مجاہد بجائے اس کے کہ وہ اپنی شکست کا سبب دوسرے کو قرار دیں یا اسے وہمی عوامل کا نتیجہ قرار دیں، وہ اپنی ذات میں اس کا سرچشمہ تلاش کرتے ہیں اور اپنے اشتباہات کی تلافی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ شکست کا لفظ اپنی زبان پر بھی نہیں لاتے اور اس کے بجائے اپنے نفسوں پر زیادتی کا ذکر کرتے ہیں بخلاف ہمارے کہ ہم آج کی دنیا میں کوشش کرتے ہیں کہ ضعف و کمزوری کے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیں جو ہماری ناکامیوں کا سرچشمہ ہیں اور ان سب کو خارجی اسباب کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم کبھی ان کمزوریوں کو ختم نہیں کر سکتے۔

۳ درج بالا آیت میں دنیاوی جزا کو "ثواب الدنیا" کہا گیا ہے جبکہ آخرت کی جزا کو "حسن ثواب الاخرۃ" سے تعبیر کیا گیا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ آخرت کی جزا دنیاوی جزا سے بہت زیادہ امتیاز رکھتی ہے کیونکہ دنیاوی جزا کتنی ہی اچھی کیوں

نہ ہو وہ آخر فنا ہو جائے گی اور خلافِ مزاج چیزوں کے ساتھ ملی ہوئی ہوگی، جبکہ آخرت کی جزا سراپا بہتر، خالص اور ہر قسم کی تکلیف سے پاک ہوگی۔

۱۴۹۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓي اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ○

۱۵۰۔ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ○

۱۵۱۔ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ○

ترجمہ

۱۴۹ اے ایمان والو! اگر ان لوگوں کی اطاعت کروگے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو وہ تمہیں پیچھے کی طرف دھکیل دیں گے اور آخر کار تم نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے۔

۱۵۰ (وہ تمہارا سہارا نہیں ہیں) بلکہ تمہارا سہارا اور سرپرست خدا ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔

۱۵۱ چونکہ وہ (کفار) بلا دلیل کچھ چیزوں کو اللہ کا شریک قرار دیتے ہیں، اس لیے بہت جلد ان کے دلوں پر ہم رعب و خوف طاری کریں گے اور ان کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کا ٹھکانا کس قدر بُرا ہے۔

تفسیر

بار بار خطرے سے آگاہی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓي اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ

یہ آیات بھی گذشتہ آیات کی طرح جنگ احد کے واقعات کا تجزیہ و تحلیل کرتی ہیں اور اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جنگ احد کے ختم ہونے کے بعد دشمنانِ اسلام زہریلے پروپیگنڈا سے نصیحت کے بھیس میں مسلمانوں کے درمیان منافرت و اختلاف کا بیج بوتے تھے اور چند مسلمانوں کی نفسیاتی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں اسلام سے بدظن کرنا چاہتے تھے شاید یہودی اور عیسائی بھی اس کام میں منافقین کے شریک تھے۔ جیسا کہ جنگ احد میں بھی پیغمبر اکرم کی شہادت کی بے بنیاد افواہ پھیلا کر مسلمانوں کی نفسیات کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی۔ پہلی آیت مسلمانوں کو کفار کی پیروی کرنے سے ڈراتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر تم کفار کی

پیروی کروگے تو وہ تمہیں پیچھے کی طرف دھکیل دیں گے اور تعلیمات اسلام کے زیرِ سایہ روحانی، معنوی اور مادی ترقی کے بعد تمہیں پہلے نقطہ کی طرف گرا دیں گے جو کفر و فساد ہے اور اس وقت تمہیں بہت زیادہ نقصان پہنچے گا کیونکہ اس سے زیادہ خسارہ اور کیا ہوگا کہ انسان اسلام کو کفر سے اور سعادت کو شقاوت سے اور حق کو باطل سے بدل ڈالے۔

اس کے بعد انہیں تسلی دیتے ہوئے تاکید کی گئی ہے کہ تمہارا بہت بڑا مددگار موجود ہے (بل اللہ مولاکم وھو خیر الناصرین) خدا تمہارا حامی و مددگار ہے اور وہ بہترین مددگار ہے جو کبھی مغلوب نہیں ہو سکتا جبکہ دوسرے مددگار شکست و ہزیمت سے دوچار ہو سکتے ہیں۔

سنلقی فی قلوب الذین کفروا الرعب۔

یہاں جنگ اُحد کے بعد مسلمانوں کے معجزانہ طور پر نجات پانے کی طرف اشارہ ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں اپنی نصرت و حمایت کا ایک موقع یاد دلاتا ہے۔ آئندہ کے لیے بھی ان کا جوش اُبھارا گیا ہے اور کامیابی کا وعدہ کیا گیا ہے کیونکہ جیسا بیان ہو چکا ہے کہ کفار بت پرست جنگ اُحد میں شاندار کامیابی حاصل کر چکے تھے اور ظاہراً لشکرِ اسلام مغلوب ہو چکا تھا اب چاہیے تو یہ تھا کہ وہ میدان کی طرف پلٹ کر آتے اور مسلمانوں کی باقی ماندہ قوت کو کچل دیتے، مدینہ کو تاخت و تاراج کرتے، پیغمبر کی بے بنیاد خبرِ شہادت سے مطلع ہونے کے بعد انہیں قتل کر دیتے اور اس بارے میں کسی شک و شبہ کا شکار نہ ہوتے لیکن خدا نے اُن کے دلوں میں عجیب خوف ڈال دیا ایسا خوف جو کفر و بت پرستی کا خاصہ ہے۔ یہ خوف اُن میں اتنا جاگزیں ہوا کہ روایات کے مطابق جس وقت وہ میدانِ اُحد سے پلٹ کر مکہ کے قریب پہنچے تو ایک شکست خوردہ لشکر کی صورت میں نظر آتے تھے۔ آیت کہتی ہے: "ہم بہت جلد ہی کفار کے دلوں میں خوف ڈال دیں گے" (یعنی جس طرح جنگِ اُحد کے موقع پر تم دیکھ چکے ہو) اسی طرح آئندہ کے لیے بھی یہی اُمید رکھو۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ ان کے دلوں میں رعب و خوف کا سبب یوں بیان کیا گیا ہے: بما اشرکوا باللہ مالم ینزل بہ سلطانا یعنی اسی وجہ سے کہ انہوں نے بلا دلیل بہت سی چیزوں کو خدا کا شریک قرار دیا تھا۔ در حقیقت جب بے ہودہ لوگ دلیل و برہان کی پیروی نہیں کرتے اور رائی کو پہاڑ بنا لیتے ہیں اور پتھر اور لکڑی کو اپنا معبود سمجھتے ہیں وہ حوادثِ زمانہ کے مقابلے سے عاجز ہوتے ہیں کیونکہ وہ بہت جلد رعب کے اشتباہ میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور زندگی میں کسی معمولی حادثہ کا بھی سامنا نہیں کر پاتے۔ مثال کے طور پر وہ یہ سن لیں کہ مدینہ کے مسلمان جنگِ اُحد کے زخمیوں کو ساتھ لیے ہوئے دوبارہ میدانِ اُحد میں پلٹ گئے ہیں تو یہ بات ان کی نگاہ میں بہت بڑی ہوتی ہے اور وہ اس سے لرزہ براندام ہو جاتے ہیں جیسا کہ آج کی دنیا میں بھی ہم یہ دیکھتے ہیں بڑے بڑے صاحبانِ اقتدار معمولی سے واقعہ پر پریشان ہو جاتے ہیں اور رائی کو پہاڑ سمجھ لیتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی کے لیے محکم اور مضبوط سہارے کا انتخاب نہیں کیا ہوتا۔

ومأوٰھم النار وبئس مثوی الظّٰلمین۔

یہ افراد اپنے اور معاشرے پر ظلم کرتے ہیں اس بنا پر ان کے لیے سوائے (جہنم کی) آگ کے کوئی پناہ گاہ نہیں اور وہ کیسی بُری پناہ گاہ ہے۔

دشمن کا خوفزدہ ہونا کامیابی کا ایک راستہ ہے

بہت سی روایات میں ملتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ فرمایا کرتے تھے کہ خداوندِ عالم کی طرف سے مجھے عطا کی گئی خصوصیات میں سے ایک

یہ ہے کہ وہ دشمن کے دل میں خوف ڈال کر مجھے کامیابی سے نوازتا ہے۔[1]

یہ بات جنگ میں کامیابی کے ایک اہم عامل کی طرف اشارہ ہے جو آج کل کے زمانہ میں خصوصی توجہ کے لائق ہے کہ کامیابی کا اہم ترین عامل مجاہد کا جذبہ ہوتا ہے اور جتنا مؤثر یہ عامل ہے اتنا ان کی افرادی قوت اور ساز و سامان کی زیادتی بھی مؤثر نہیں۔ اسلام روحِ ایمان کو تقویت بخشتا ہے جہاد کے لیے عشق و ولولہ پیدا کرتا ہے۔ اعزازِ شہادت کی تمنا پیدا کرتا ہے اور خدائے قادر پر بھروسہ کرنا سکھاتا ہے اسلام اس روح اور جذبے کی پرورش اپنے مجاہدین میں عالی ترین طریقے سے کرتا ہے۔ جبکہ خرافات کے متوالے بت پرست جن کا سہارا بے شعور بے ارادہ اور بے جان بت تھے اور جو معاد و قیامت اور حیات بعد موت کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے، جن کے افکار بیہودگیوں سے آلودہ تھے ان کا جذبہ بکھرا ہوا اور ناتواں تھا اور مسلمانوں کی ان پر کامیابی کا مؤثر عامل یہی روحانی امتیاز تھا۔

۱۵۲۔ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ○

۱۵۳۔ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓي اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○

۱۵۴۔ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَاۗىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَاۗىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْھُمْ اَنْفُسُھُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى

---

[1] کتاب خصال اور مجمع البیان سے رجوع کیجیے۔

مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ○

ترجمہ

۱۵۲ خدا نے تم سے اپنا وعدہ (جنگ اُحد میں دشمن پر کامیابی کا) سچ کر دکھایا جبکہ (ابتداء جنگ اُحد میں) تم دشمنوں کو اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے (اور یہ کامیابی جاری تھی) یہاں تک کہ تم سست ہو گئے اور (مورچوں کو چھوڑنے لگے اور) آپس میں نزاع کرنے لگے اور جو (دشمن پر غلبہ) تم چاہتے تھے وہ تمہیں دکھایا لیکن اس کے بعد تم نے نافرمانی کی۔ تم میں سے بعض دنیا کے خواہشمند تھے اور بعض آخرت کے خواہاں تھے پھر خدا نے تمہیں ان سے پھیر دیا (اور تمہاری فتح شکست سے بدل گئی) تاکہ تمہارا امتحان لے اور اس نے تمہیں معاف کر دیا اور خدا مومنین کے لیے فضل کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

۱۵۳ (یاد کرو وہ وقت) جب تم پہاڑ پر چڑھ رہے تھے (اور تمہارا ایک گروہ بیابان میں بکھرا ہوا تھا) اور تم پیچھے رہ جانے والوں کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے اور پیغمبر پیچھے سے تمہیں پکار رہے تھے۔ اس کے بعد تم پر پے در پے مصائب آئے اور یہ اس لیے تھا (تاکہ جنگی غنائم کے) ہاتھ سے چلے جانے سے تم غمگین نہ ہو اور نہ ہی ان آلام کی وجہ سے جو تم پر آپڑے ہیں اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

۱۵۴ پھر اس غم و اندوہ کے بعد امن و آرام کا تم پر سایہ نازل کیا اور یہ ایک اونگھ کی صورت میں تھا جو (واقعہ اُحد کی بعد والی رات میں) تم میں سے ایک گروہ کو عارض ہوئی تھی لیکن ایک دوسرے گروہ کو اپنی جان کی فکر تھی (اور انہیں نیند نہیں آئی تھی) وہ لوگ خدا کے بارے میں زمانہ جاہلیت کے سے بُرے گمان کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کیا کامیابی کا کچھ حصہ ہمیں نصیب ہوگا۔ کہہ دو: تمام (کامیابیاں اور) کام اللہ کے ہاتھ میں ہیں وہ اپنے دل میں کچھ باتیں چھپائے ہوئے ہیں جن کا تمہارے سامنے اظہار نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کامیابی میں ہمارا کوئی حصہ ہوتا تو ہم قتل نہ ہوتے۔ کہہ دو: اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو وہ لوگ کہ قتل ہونا جن کی قسمت میں تھا، وہ (دشمن) ان کے بستروں پر آپڑتے (اور انہیں قتل کر دیتے) اور یہ اس لیے کہ خدا تمہارے سینوں میں چھپی ہوئی باتوں کی آزمائش کرے اور تمہارے دلوں میں جو (ایمان) ہے اس کے خلوص کو پرکھے۔ اور تمہارے سینوں کے اندر جو کچھ ہے اللہ اس سے باخبر ہے۔

تفسیر

کامیابی کے بعد شکست

جنگ احد کے واقعات میں گزر چکا ہے کہ مسلمان ابتداء جنگ میں اتحاد اور بڑی دلیری کے ساتھ لڑے اور جلد ہی کامیاب ہو گئے اور دشمن کا لشکر پراگندہ و منتشر ہو گیا جس سے سارے لشکر اسلام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی لیکن کوہ عینین کے درے میں عبداللہ بن جبیر کی سرکردگی میں لڑنے والے تیراندازوں کی نافرمانی اور ان کے اس حساس مورچے کو چھوڑنے اور دوسرے لوگوں کی مال غنیمت جمع کرنے کی مشغولیت سے ورق ہی الٹ گیا اور لشکر اسلام ایک زبردست شکست سے دوچار ہوا۔

کافی شہید دے کر اور بہت نقصان اٹھا کر جب مسلمان مدینہ کی طرف پلٹ آئے تو ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ کیا خدا نے ہم سے فتح و کامیابی کا وعدہ نہیں کیا تھا، پھر اس جنگ میں ہمیں کیوں شکست ہوئی؟ اس پر مندرجہ بالا آیات میں انہیں جواب دیا گیا اور شکست کے اسباب کی نشاندہی کی گئی۔ اب ہم آیات کی تفصیلی تفسیر کی طرف آتے ہیں۔

ولقد صدقکم اللہ وعدہ اذ تحسونھم[1] باذنہ حتی اذا[2] فشلتم

اس جملے میں ارشاد خداوندی ہے کہ کامیابی کے بارے میں خدا کا وعدہ بالکل درست تھا اور اس کی وجہ ہی سے تم ابتداء جنگ میں کامیاب ہوئے اور حکم خدا سے تم نے دشمن کو تتر بتر کر دیا۔ کامیابی کا یہ وعدہ اس وقت تک تھا جب تک تم استقامت و پامردی اور فرمان پیغمبر کی پیروی سے دست بردار نہیں ہوئے اور شکست کا دروازہ اس وقت کھلا جب سستی اور نافرمانی نے تمہیں آگھیرا۔ یعنی اگر تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ کامیابی کا وعدہ بلاشرط تھا تو تمہاری بڑی غلط فہمی ہے بلکہ کامیابی کے تمام وعدے فرمان خدا کی پیروی کے ساتھ مشروط ہیں۔ البتہ یہ کہ خدا نے مسلمانوں سے اس جنگ میں کامیابی کا وعدہ کب کیا تھا، اس بارے میں دو احتمال ہیں۔ پہلا یہ کہ مراد عمومی وعدے ہیں جو خدا کی طرف سے مسلمانوں کو دشمنوں پر کامیابی کے بارے میں دیئے جا چکے تھے۔ دوسرا یہ کہ پیغمبر خدا نے خصوصی طور پر جنگ احد سے پہلے وعدہ دے چکے تھے اور ان کا وعدہ خدا کا وعدہ ہے۔

وتنازعتم فی الامر وعصیتم من بعد ما ارٰکم ما تحبون

اس میں کوہ عینین کے تیراندازوں کی طرف اشارہ ہے اور ان کی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ وہ تیرانداز جو پہاڑ کے درے پر تھے ان میں مورچہ چھوڑنے کے بارے میں اختلاف پڑ گیا اور ان میں سے بیشتر نے نافرمانی اور مخالفت کی۔ یہ قرآن کہتا ہے کہ جیسی تمہاری آرزو تھی ویسی ہی نظروں میں سما جانے والی کامیابی دیکھ لینے کے بعد تم نے یہ راہ عصیان اختیار کی اور حقیقت میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے تم نے جو لازمی تھی وہ کوشش کی لیکن اس کو برقرار رکھنے کے لیے تم نے استقامت و پامردی نہیں دکھائی اور پیشہ

---

[1] تحسونھم ۔۔۔ مادہ حس سے ہے۔ اس کا معنی ہے کسی کے حواس ختم کر دینا اور اسے قتل کر دینا ۔۔۔ یعنی تم انہیں قتل کرتے تھے۔

[2] " اذا " ۔۔۔ یہاں پر شرطیہ نہیں ہے بلکہ " حین " اور " وقت " کے معنی میں ہے۔

کامیابیوں کی حفاظت کرنا ان کے حصول سے زیادہ مشکل ہوا کرتا ہے۔

منکم من یرید الدنیا و منکم من یرید الاخرۃ

اس موقع پر تم میں سے ایک گروہ دنیا چاہتا تھا وہ مالِ غنیمت اکٹھا کرنے لگا جب کہ دوسرا گروہ جس میں عبداللہ بن جبیر اور دیگر تیرانداز شامل تھے جو ثابت قدم رہے وہ آخرت اور خدائی جزا و ثواب کے خواہاں تھے۔

ثم صرفکم عنھم لیبتلیکم

یہاں ورق اُلٹ گیا اور خدا نے تمہاری کامیابی کو شکست سے بدل ڈالا تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور تمہیں تنبیہ کرے اور تمہاری تربیت کرے۔

ولقد عفا عنکم و اللہ ذو فضل علی المومنین

اس کے بعد خدا نے تمہاری ان سب نافرمانیوں سے درگزر کیا جبکہ تم سزا کے مستحق تھے کیونکہ خداوند عالم مومنین کے بہر قسم کی نعمتوں کو فروگذار نہیں کرتا۔

اذ تصعدون[1] ولا تلون علی احد و الرسول یدعوکم فی اخرٰکم[2]

اس آیت میں خدا تعالیٰ مسلمانوں کے لیے جنگ اُحد کے انجام کا نقشہ کھینچتا ہے اور فرماتا ہے: یاد کرو اس وقت کو جب تم ہر طرف منتشر تھے اور بھاگ رہے تھے اور پیچھے کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے کہ تمہارے باقی بھائی کس حالت میں ہیں جبکہ پیغمبر پیچھے سے تمہیں پکار رہے تھے «الیّ عباد اللہ الیّ عباد اللہ فانی رسول اللہ» خدا کے بندو میری طرف پلٹ آؤ میری طرف پلٹ آؤ میں خدا کا رسول ہوں لیکن تم میں سے کوئی ان کی پکار پر کان نہیں دھرتا تھا۔

فاثابکم غما بغم

اس وقت یکے بعد دیگرے غم و اندوہ تم پر ٹوٹے کیونکہ تم ایک طرف جنگ میں شکست، کئی افسروں اور بہادر سپاہیوں کی شہادت اور کئی زخمیوں کے غم میں مبتلا تھے تو دوسری طرف پیغمبر اکرمؐ کی خبرِ شہادت کے پھیل جانے کی پریشانی اور پھر ان کے زخمی ہونے کا غم تھا اور یہ سب کچھ مخالفتوں اور نافرمانیوں کا نتیجہ تھا۔

لکیلا تحزنوا علی ما فاتکم ولا ما اصابکم

غم و اندوہ کا یہ سیلاب اس لیے تھا تاکہ اب تم مالِ غنیمت ہاتھ سے جانے پر غمگین نہ ہونے پاؤ اور کامیابی کی راہ میں جو مشکلات اور زخم تمہیں پہنچے ہیں ان کی فکر کرو۔

واللہ خبیر بما تعملون

---

[1] تصعدون مادہ اصعاد سے ہے۔ مفردات میں راغب کے بقول اس کا معنی ہے سطح زمینوں پر چلنا یا اوپر کی طرف جانا جبکہ صعود کا معنی صرف اوپر کی طرف جانا ہے۔ آیت میں یہ لفظ شاید اس لیے کیا ہے کہ بھاگنے والوں میں کچھ پہاڑ پر چڑھ گئے تھے اور بعض بیاباں میں سرگرداں تھے۔

[2] «اخرٰکم» یہاں «وراءکم» کے معنی میں ہے یعنی تمہارے پیچھے۔

خدا تمہارے اعمال سے آگاہ تھا اور پوری طرح سے اطاعت کرنے والوں، حقیقی مجاہدین اور اسی طرح بھاگنے والوں کی کیفیت کو جانتا تھا۔ بنا بریں تم میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو فریب نہ دے اور جو کچھ جنگ احد میں ہوا ہے اس کے برخلاف دعویٰ نہ کرے اور اگر واقعاً تم پہلے گروہ میں داخل ہو تو خدا کا شکر ادا کرو ورنہ گناہوں سے توبہ کرو۔

زمانۂ جاہلیت کے وسوسے

ثم انزل علیکم من بعد الغم امنة نعاسا[1]

واقعۂ احد کے بعد والی رات بہت دردناک اور اضطراب انگیز تھی۔ مسلمان سمجھتے تھے کہ قریش کے فاتح سپاہی دوبارہ مدینہ کی طرف پلٹ آئیں گے اور مسلمانوں کے باقی ماندہ مقابلے کی طاقت ختم کر دیں گے اور شاید کسی طور پر بت پرستوں کے واپس لوٹنے کی خبر بھی انہیں پہنچی تھی اور یہ مسلم تھا کہ اگر وہ پلٹ آتے تو جنگ کا خطرناک ترین مرحلہ پیش آتا۔ اس دوران حقیقی مجاہدین اور فرار کرنے والوں میں سے پشیمان افراد جنہوں نے توبہ کر لی تھی اب پروردگار کے لطف و کرم پر اعتماد رکھتے تھے اور آنحضرت کے یعنی پیغمبر اکرمؐ کے وعدوں پر مطمئن تھے۔

اس حالت وحشت میں وہ آرام کی نیند سو گئے تھے جبکہ جنگی لباس میں ملبوس اور ہتھیاروں سے لیس تھے لیکن منافق ضعیف الایمان اور بزدل گروہ ساری رات فکر و پریشانی میں مبتلا رہا اور بادل نخواستہ حقیقی مومنین کی پہرہ داری کرتا رہا۔ درج بالا آیت رات کی اس کیفیت کی تشریح کرتے ہوئے کہتی ہے کہ پھر احد کے دن کے ان تمام غم و اندوہ کے بعد تم پر امن و امان اور راحت و آرام نازل کیا اور یہ وہی ہلکی پھلکی نیند تھی جو تم میں سے ایک گروہ کو آئی۔ لیکن ایک ایسا گروہ بھی تھا کہ جسے صرف اپنی جان کی فکر تھی وہ لوگ سوائے اپنی جانیں بچانے کے اور کوئی چیز نہیں سوچتے تھے۔ اس لیے وہ راحت و آرام سے محروم ہو گئے تھے۔

یہ ایمان کا ایک اہم ترین ثمرہ ہے کہ مرد مومن اس دنیا میں بھی راحت و آرام سے رہتا ہے جبکہ بے ایمان یا منافق اور کمزور ایمان والے افراد کبھی بھی اس کا ذائقہ نہیں چکھتے۔ بعد ازاں قرآن منافقین اور کمزور ایمان والے لوگوں کی گفتگو اور طرز فکر کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے: یظنون باللہ غیر الحق ظن الجاهلیة وہ خدا کے بارے میں زمانۂ جاہلیت کا غلط اور ناحق گمان رکھتے اور اپنی گفتگو میں کہتے کہ شاید پیغمبر کے وعدے غلط ہی ہوں۔ اپنے آپ کو یا ایک دوسرے کو کہتے تھے: ھل لنا من الامر من شیء یعنی کیا یہ ممکن ہے کہ اس دلخراش کیفیت کے بعد ہمیں کامیابی نصیب ہو یعنی بہت ہی بعید یا ناممکن ہے۔ قرآن ان کو جواباً کہتا ہے: قل ان الامر کلہ للہ کہہ دو، جی ہاں! کامیابی تو خدا کے ہاتھ میں ہے، اگر وہ چاہے اور تمہیں اس لائق سمجھے تو تمہیں کامیابی نصیب کرے۔ وہ اب بات کو ظاہر کرنے کے لیے تیار نہیں تھے جو وہ اپنے دلوں میں چھپائے بیٹھے تھے کیونکہ وہ اس سے ڈرتے تھے کہ کہیں کفار کی صف میں ان کا شمار نہ ہو۔

یخفون فی انفسهم ما لا یبدون لک

---

[1] "امنة" کا معنی ہے امن و امان اور نعاس کا مطلب ہے ہلکی سی نیند یا اونگھ۔

گویا ان کا خیال تھا کہ جنگ اُحد کی شکست دین اسلام کے ناحق ہونے کی علامت ہے۔ اسی لیے وہ کہتے تھے: لو کان لنا من الامر شیء ما قتلنا ھٰھنا۔ یعنی اگر ہم حق پر ہوتے اور کامیابی ہمارے نصیب میں ہوتی تو یہاں ہمارے اتنے لوگ نہ مارے جاتے۔ خداوند عالم ان کے جواب میں دو چیزوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پہلے یہ کہ یہ تصور نہ کرو کہ کوئی شخص میدانِ جنگ کے سخت حوادث سے بھاگ کر موت سے بچ سکتا ہے (جبکہ ان کا استقبال کرنا چاہیے) جن کی اجل آگئی ہے چاہے وہ اپنے گھروں میں رہ جائیں ان کے بستر پر دشمن آپڑیں گے اور انہیں قتل کر دیں گے (قل لو کنتم فی بیوتکم لبرز الذین کتب علیہم القتل الیٰ مضاجعہم)

اصولی طور پر وہ قوم جس کی اکثریت کے خلاف شکست کا فیصلہ اس کی سستی کی وجہ سے کیا گیا ہو وہ آخر کار موت کا ذائقہ چکھے گی تو کیا ہی اچھا ہے کہ وہ میدانِ جہاد میں دشمن کی ضرب سے جام شہادت مقابلے میں اسے بیک کہے نہ یہ کہ بستر پر ذلت آمیز موت سے اس کا کام تمام ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ حوادث رونما ہونے چاہئیں تاکہ دلوں میں جو کچھ ہے وہ آشکار ہو جائے۔ علاوہ ازیں لوگوں کی آہستہ آہستہ تربیت ہو اور ان کی نیتیں خالص، ایمان پختہ اور دل پاک ہوں (ولیبتلی اللہ ما فی صدورکم ولیمحص ما فی قلوبکم)

آیت کے آخر میں کہا گیا ہے: واللہ علیم بذات الصدور یعنی خدا سینوں کے بھیدوں کو جانتا ہے اسی بنا پر وہ صرف لوگوں کے اعمال پر نگاہ نہیں رکھتا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ ان کے دلوں کو بھی آزمائے اور انہیں شرک، نفاق، شک اور تردد کی ہر قسم کی آلودگی سے پاک کرے۔

۱۵۵۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝

ترجمہ

۱۵۵۔ وہ لوگ جنہوں نے دو گروہوں کے آمنے سامنے ہونے کے دن (جنگ اُحد کے روز) فرار کیا تو انہیں شیطان نے اُن کے چند گناہوں کی وجہ سے بہکا دیا اور خدا نے انہیں معاف کر دیا خدا بخشنے والا اور بردبار ہے۔

تفسیر

ایک گناہ دوسرے گناہ کا سرچشمہ ہے

ان الذین تولوا منکم......

یہ آیت بھی جنگ اُحد کے واقعات سے متعلق مسلمانوں سے ایک اور حقیقت بیان کرتی ہے اور وہ یہ کہ جو لغزشیں انسان سے شیطانی وسوسوں کے باعث صادر ہوتی ہیں، وہ دراصل ان گذشتہ گناہوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی روحانی کمزوریوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جو انسان کے لیے دوسرے گناہوں کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ ورنہ پاک و پاکیزہ دل میں شیطانی توہمات کبھی اثر انداز نہیں ہو سکتے

اسی لیے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ لوگ جو میدان اُحد سے فرار کر گئے شیطان نے انہیں چند ایک گناہوں کی وجہ سے پھسلا دیا مگر خدا نے انہیں بخش دیا اور خدا بخشنے والا اور حلیم ہے۔ یوں خدا ان کی آزمائش کرتا ہے تاکہ وہ آئندہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے کوشش کریں وہ پہلے اپنے دل کو گناہ سے پاک کریں۔ اس بات کا امکان ہے کہ اس گناہ سے مراد وہی دنیا پرستی، مال غنیمت کو جمع کرنا اور دوران جنگ پیغمبر کی حکم عدولی کرنا ہو یا دوسرے گناہ مراد ہوں جن کے وہ جنگ اُحد سے پہلے مرتکب ہوئے تھے اور انہوں نے ان کی ایمانی قوت کمزور کر دی تھی۔ مفسر عظیم مرحوم طبرسی اس آیت کے ذیل میں ابوالقاسم بلخی سے نقل کرتے ہیں کہ جنگ اُحد کے دن (پیغمبر کے علاوہ) سوائے تیرہ افراد کے تمام بھاگ گئے تھے اور ان تیرہ میں سے آٹھ انصار اور پانچ مہاجر تھے۔ جن میں سے حضرت علیؑ اور طلحہ کے علاوہ باقی ناموں میں اختلاف ہے البتہ دونوں کے بارے میں تمام کا اتفاق ہے کہ انہوں نے فرار نہیں کیا۔

۱۵۶۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ يُـحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○

۱۵۷۔ وَلَىِٕنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ○

۱۵۸۔ وَلَىِٕنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِالَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ○

ترجمہ

۱۵۶ اے ایماندارو! تم کفار کی مانند نہ ہو جاؤ کہ جب اُن کے بھائی سفر پر یا جنگ کے لیے جاتے ہیں (اور مر جاتے ہیں یا قتل ہو جاتے ہیں) تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور قتل نہ ہوتے (تم ایسا نہ کہو) تاکہ خدا یہ حسرت اُن کے دلوں میں رکھ دے اور زندہ کرنے والا اور مارنے والا خدا ہے (اور زندگی اور موت اس کے ہاتھ میں ہے) اور وہ تمہارے اعمال سے آگاہ ہے۔

۱۵۷ (اب) اگر تم راہِ خدا میں قتل ہو جاؤ یا مر جاؤ (تو تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوا) کیونکہ خدا کی رحمت اور مغفرت ان تمام چیزوں سے جو انہوں نے (ساری زندگی میں) جمع کیا ہے بہتر ہے۔

۱۵۸ اور اگر تم مر جاؤ یا قتل ہو جاؤ تو خدا کی طرف پلٹ جاؤ گے (لہٰذا تم فنا نہیں ہو گے کہ اس سے تم پریشان ہو)۔

تفسیر

منافقین کی مفاد پرستی

یا ایھا الذین امنوا لا تکونوا کالذین کفروا........

واقعۂ احد دو لحاظ سے مسلمانوں کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے پہلی یہ کہ یہ واقعہ اس وقت کے تمام حالات و کیفیات کا آئینہ دار ہے جس میں مسلمانوں کی حقیقی صورت حال کی عکاسی ہوتی ہے اور انہیں اپنی کیفیت کی اصلاح کرنے پر ابھارا گیا اور کمزور پہلوؤں کو بہتر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اسی بنا پر قرآن نے اس واقعہ کو نہایت اہتمام سے بیان کیا ہے۔ بہت سی گذشتہ اور آئندہ آیات میں بھی اس واقعے سے تربیت کے لیے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ دوسری طرف یہ واقعہ دشمنوں اور منافقوں کے لیے زہر پاشی کا کام دیتا تھا اس لیے بہت سی آیات میں اس کو زائل کیا گیا ہے مندرجہ بالا آیات بھی ایسی ہی ہیں۔

مذکورہ بالا آیات منافقین کی تخریبی کارروائیوں کو ناکام بنانے اور مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لیے پہلے صاحب ایمان افراد سے خطاب کرتی ہیں کہ تم کفار کی طرح نہ ہو جاؤ کہ جس وقت ان کے بھائی سفر یا جنگ لڑنے کے لیے جاتے ہیں اور وہ قتل ہو جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ افسوس اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے اگرچہ وہ یہ باتیں ہمدردی کے بہانے ہی کرتے ہیں لیکن تم ان زہریلی باتوں سے بچو اور ایسے جملے زبان پر نہ لاؤ۔

لیجعل اللہ ذلک حسرۃ فی قلوبھم ؕ

اگر تم مومنین ان کی گمراہ کن باتوں سے متاثر ہوئے اور ایسی ہی باتیں کیں تو فطری طور پر تمہارے جذبے ماند پڑ جائیں گے اور میدانِ جنگ کی طرف جانے سے اور راہِ خدا میں سفر سے رک جاؤ گے اور اس طرح لوگ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن تم ایسا نہ کرو اور مضبوط جذبے کے ساتھ میدانِ جہاد میں جاؤ تاکہ ایسی حسرت منافقین کے دلوں میں ہمیشہ کے لیے رہ جائے۔ اس کے بعد قرآن ان کی زہر آلود باتوں کے تین منطقی جواب دیتا ہے:

۱ موت و حیات ہر حالت میں اللہ کے دستِ قدرت میں ہے، سفر اور جنگ کرنے سے اس کی قطعی و یقینی حالت نہیں بدل سکتی اور خدا بندوں کے سب اعمال سے آگاہ ہے (واللہ یحی و یمیت واللہ بما تعملون بصیر)۔

۲ اب اگر تم راہِ خدا میں مر جاؤ یا قتل ہو جاؤ اور منافقین کے خیال کے مطابق تم پر موت جلد آپڑے تو تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوا کیونکہ پروردگار کی رحمت و مغفرت ان اموال سے بدرجہا بہتر ہے جو تم یا منافقین اپنی زندگی میں جمع کرتے ہیں (ولئن قتلتم فی سبیل اللہ او متم لمغفرۃ من اللہ و رحمۃ خیر مما یجمعون) اصولی طور پر ان دونوں کا آپس میں تقابل نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن ان کی پست ذہنیت مال و دولت اور چند روزہ زندگی کو اعزاز جہاد و شہادت سے بہتر سمجھتی تھی، اس لیے اس کے علاوہ چارہ نہیں تھا کہ کہا جاتا کہ جن اموال کو کفار شہوت بھری زندگی اور دنیا پرستی کے جنون میں جمع کرتے ہیں، اس سے وہ اعزاز حاصل کہیں بہتر ہے جو تم راہ شہادت اور راہِ خدا میں مر جانے سے پاتے ہو۔

۳ موت کا معنی فنا اور نابودی نہیں ہے جس سے تم اتنے پریشان ہوتے ہو بلکہ موت دوسری زندگی کے لیے ایک دریچہ ہے جو بہت وسیع اور جاودان ہے (ولئن متم او قتلتم لا الی اللہ تحشرون) ۔ قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ ان آیات میں سفر میں مرجانے کو شہادت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ان سفروں سے مراد وہ سفر تھے جنہیں وہ خدا کے لیے کیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر میدانِ جنگ یا تبلیغی پروگراموں کے لیے سفر کرنا وغیرہ۔ اس دور کے سفر مشکلات و مصائب سے پُر ہوتے تھے بیماریاں بھی آگھیرتی تھیں لہٰذا ان میں مرجانا میدان جہاد میں مرنے سے کم نہیں ہوتا تھا البتہ بعض مفسرین نے اس سے تجارتی سفر مراد لیا ہے لیکن یہ معنی اس آیت سے بہت بعید ہے کیونکہ یہ حصولِ مال کا ایک ذریعہ تھا اور کافروں کو ایسے سفر پر کیا افسوس ہوسکتا تھا۔ علاوہ ازیں یہ بات جنگ اُحد کے بعد مسلمانوں میں کمزوری پیدا کرنے کے لیے مؤثر نہیں ہوسکتی تھی نیز اس سلسلے میں مسلمان اگر کافروں سے ہم آہنگ نہ ہوں تو یہ ان کے لیے باعثِ حسرت و یاس نہیں ہوسکتا تھا۔ لہٰذا یہاں سفر میں مرنے سے مراد وہ سفر ہے جو میدانِ جہاد کی طرف تھا یا دیگر اسلامی مقاصد کے لیے۔

۱۵۹۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ○

۱۶۰۔ إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا الَّذِي يَنصُرُكُم مِّن بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ○

ترجمہ

۱۵۹ رحمت الٰہی کے سبب تم ان کے سامنے نرم (اور مہربان) ہو اور اگر تم سخت خو ہوتے تو وہ تم سے دور ہوجاتے لہٰذا انہیں معاف کردو اور ان کے لیے مغفرت طلب کرو اور کاموں میں ان سے مشورہ کیا کرو لیکن جب تم ارادہ کرلو تو پھر ڈٹ جاؤ اور خدا پر توکل کرو کیونکہ خدا توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

۱۶۰ اگر خدا تمہاری مدد کرے تو کوئی بھی تم پر غلبہ نہیں پاسکتا اور اگر وہ تمہاری مدد سے دستبردار ہوجائے تو اس کے علاوہ کون تمہاری مدد کرنے والا ہے اور مومنین کو صرف خدا پر توکل کرنا چاہیے۔

تفسیر

عام معافی کا حکم

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ

اگرچہ اس آیت میں گرد و پیش کے حوالے سے عمومی پروگراموں سے متعلق احکام پیغمبرؐ کو دیئے گئے لیکن شانِ نزول کے لحاظ سے اس کا تعلق جنگ اُحد کے ساتھ ہے کیونکہ جو لوگ واقعۂ اُحد کے دوران جنگ سے فرار ہو گئے تھے وہ پیغمبرؐ کے گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے ندامت و پشیمانی کے عالم میں معافی کی درخواست کی تو خدا تعالیٰ نے اس آیت میں پیغمبر اکرمؐ سے انہیں عام معافی دینے کے لیے فرمایا لہٰذا یہ آیت نازل ہوتے ہی آپؐ نے فراخ دلی سے توبہ کرنے والے خطا کاروں کو معاف کر دیا۔

درج بالا آیت میں پیغمبر اکرمؐ کی ایک بہت بڑی اخلاقی خوبی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تم پروردگار کے لطف و کرم کے سبب ان پر مہربان ہو گئے اور اگر تم ان کے لیے سنگدل، سخت مزاج اور تند خو ہوتے اور عملاً ان پر لطف و عنایت نہ کرتے تو وہ تمہارے پاس سے بکھر جاتے۔ فظ — لغت میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی باتیں تیز اور سخت ہوں اور غلیظ القلب اسے کہتے ہیں جو سنگدل ہو اور لطف و محبت کا عملی اظہار بھی نہ کرے۔ اس بنا پر ان دونوں میں سختی کا معنی پایا جاتا ہے لیکن اوّل الذکر گفتگو میں سختی کرنے اور مؤخر الذکر کام میں سختی کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گویا خدا تعالیٰ نادانوں اور گنہگاروں کے لیے پیغمبر اکرمؐ کی کامل نرمی اور لطف و عنایت کا ذکر کرتا ہے۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ

اس کے بعد حکم دیا گیا کہ ان کی کوتاہیوں سے درگزر فرمایئے اور انہیں اپنے دامنِ عفو میں جگہ دیجئے اور اس جنگ میں انہوں نے جو بے وفائیاں آپ سے کی ہیں اور جو تکالیف اس جنگ میں آپ کو پہنچائی ہیں، ان کے لیے ان کی مغفرت طلب کیجئے اور میں خود ان کے لیے تم سے سفارش کرتا ہوں کہ انہوں نے میری جو مخالفتیں کی ہیں، مجھ سے ان کی مغفرت طلب کرو۔ دوسرے لفظوں میں جو تم سے مربوط ہے اسے تم معاف کر دو اور جو مجھ سے ربط رکھتا ہے اسے میں بخش دیتا ہوں۔ آنحضرتؐ نے فرمانِ خدا پر عمل کرتے ہوئے ان تمام کو عام معافی دے دی۔ واضح ہے کہ عفو و درگزر کرنے کے لیے یہ ایک اہم اور بہت مناسب موقع تھا اور اگر آپؐ ایسا نہ کرتے تو لوگوں کے بکھر جانے کے لیے فضا ہموار تھی۔ وہ لوگ جو اتنی بڑی شکست کا سامنا کر چکے تھے اور بہت سے مقتول و مجروح پیش کر چکے تھے اگرچہ یہ سب کچھ ان کی اپنی غلطی سے ہوا تاہم ایسے لوگوں کو محبت، دلجوئی اور تسلی کی ضرورت تھی تاکہ ان کے دل اور جسم کے زخم پر مرہم لگ سکے اور وہ ان سے جانبر ہو کر آئندہ کے معرکوں کے لیے تیار ہو سکیں۔

اس آیت میں ہر رہبر و رہنما کے لیے ایک ناگزیر صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے ان لوگوں سے درگزر کرنا، نرم مزاجی سے کام لینا اور محبت و مہربانی سے پیش آنا جن سے غلطی سرزد ہوئی ہو اور وہ بعد میں پشیمان ہوئے ہوں۔ اس لیے ظاہر ہے اگر ایک رہبر سخت مزاج اور تند خو ہو اور محبت و ہمدردی کے جذبے سے سرشار نہ ہو تو وہ بہت جلد اپنے پروگراموں میں ناکام ہو جائے

گا اور لوگ اس کے پاس سے منتشر ہو جائیں گے اور وہ رہبری کی ذمہ داری سے بحسن و خوبی عہدہ برآ نہ ہو سکے گا۔ اسی لیے نہج البلاغہ کے کلمات قصار میں حضرت علیؑ کا ایک فرمان ہے:

"آلۃ الریاسۃ سعۃ الصدر"

"رہبری فراخ دلی کے ذریعے ہونی چاہیے۔"

مشورہ کرنے کا حکم

"وشاورھم فی الامر"

عام معافی دینے کے حکم کے بعد ان کی شخصیتوں کی حیات تازہ اور فکری و روحانی طور پر انہیں پھر سے زندہ کرنے کے لیے حکم دیا گیا کہ مسلمانوں سے مختلف کاموں میں مشورہ کیجیے اور ان کی رائے اور نظریہ معلوم کیجیے۔ یہ حکم اس لیے دیا گیا کہ پیغمبر اکرمؐ نے جنگ احد کے شروع میں مسلمانوں سے اس معاملے میں مشورہ کیا تھا کہ دشمن کا مقابلہ کس طرح کرنا چاہیے۔ ان میں سے اکثر کا نظریہ تھا کہ کوہ احد کے دامن میں لشکر کو پڑاؤ ہونا چاہیے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نقطہ نظر کے اچھے نتائج نہ نکل سکے اس لیے عمومی طور پر یہ رائے ابھری کہ پیغمبر اکرمؐ کو آئندہ کسی سے مشورہ نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن قرآن اس طرز فکر کا جواب دیتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ پھر بھی ان سے مشورہ کیجیے گا اگرچہ ان کے مشورے کئی مقامات پر مفید ثابت نہیں ہوئے تاہم کلی طور پر مشورہ کے فوائد اس کے نقصانات سے زیادہ ہوتے ہیں اور انفرادی و اجتماعی تربیت اور شخصیت کی سطح کو بلند کرنے میں اس کے فوائد نقصانات سے کہیں بالاتر ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ پیغمبرؐ کن مسائل میں لوگوں سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

اگرچہ آیت "وشاورھم فی الامر" میں لفظ امر ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں ہر قسم کا کام شامل ہے۔ لیکن مسلّم ہے کہ آپ احکام الٰہی میں ان سے مشورہ نہیں کیا کرتے تھے بلکہ انہیں وحی الٰہی کے تابع رکھتے تھے۔ اس بنا پر مشورہ کا دائرہ کار صرف ان احکام کے اجراء کے طرز و طریقہ اور ان کو عملی جامہ پہنانے تک محدود ہوتا تھا دوسرے لفظوں میں آپ صرف اجرائے قانون کے طریقے کے بارے مسلمانوں کا نظریہ معلوم کر لیتے تھے۔ قانون بنانے میں کبھی کسی سے مشورہ نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرتؐ کوئی پروگرام ان کے سامنے پیش کرتے تو مسلمان یہ پوچھتے کہ کیا یہ حکم الٰہی ہے جس میں اظہار رائے کی گنجائش نہ ہو یا قوانین کے اجراء سے مربوط ہے جس کے لیے وہ لوگ اپنا نظریہ پیش کر سکیں۔ اگر امر دوسری قسم کا ہوتا تو وہ اپنی رائے پیش کرتے ورنہ قبول کر لیتے چنانچہ جنگ بدر میں مسلمان آپؐ کے حکم کے مطابق ایک مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہتے تھے تو ایک صحابی "حباب بن منذر" نے پوچھا کیا اس مقام کو خدا کے حکم سے منتخب کیا گیا ہے یا آپؐ کی رائے ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں کوئی خاص حکم تو نہیں آیا تو اس نے مختلف وجوہ پیش کیں اور کہا کہ یہ جگہ مناسب نہیں آپ حکم دیجیے کہ لشکر اسلام یہاں سے چل پڑے اور پانی کے قریب پڑاؤ ڈالے۔ آنحضرتؐ نے اس کی رائے کو پسند کیا اور اس کے مطابق عمل فرمایا[1]

---

[1] تفسیر المنار جلد ۴ صفحہ ۲۰۱ (ظاہراً اصولی طور پر یہ روایت درست معلوم نہیں ہوتی۔ مترجم)

اسلام میں مشورہ کی اہمیت

مشورہ اسلام میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پیغمبر اکرمؐ وحی آسمانی سے قطع نظر ایسی قوت فکر کے مالک تھے کہ انہیں کسی قسم کے مشورہ کی ضرورت نہ تھی، پھر بھی آپؐ مسلمانوں کو مشورہ کی اہمیت بتلانے کے لیے قانون سازی کو چھوڑ کر دیگر عام معاملات میں مشورہ کیا کرتے تھے تاکہ ان کی قوت فکر و نظر پروان چڑھ سکے اور خصوصیت کے ساتھ صاحب الرائے افراد کی قدر افزائی کیا کرتے تھے یہاں تک کہ بعض دفعہ ان کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان کی رائے کو ترجیح دیا کرتے تھے جیسا کہ ایک واقعہ جنگ احد کے تذکرے میں پیش کیا گیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی اسلامی پروگراموں میں کامیابی کا ایک اہم راز ان کا یہی طرز عمل تھا۔ اصولی طور پر جو لوگ اپنے اہم کاموں کو ایک دوسرے کے صلاح و مشورہ سے انجام دیتے ہیں اور متعلقہ امور کے ماہر غور و خوض کے بعد ان کے بارے میں مشورہ دیتے ہیں اس کے برعکس جو لوگ اپنے آپ کو دوسروں کے صلاح و مشورہ سے بے نیاز سمجھتے ہیں وہ کتنے ہی بڑے صاحب فکر و نظر کیوں نہ ہوں زیادہ تر خطرناک اور المناک اشتباہات میں گرفتار ہو جاتے ہیں علاوہ ازیں مشورہ سے بے نیازی کی وجہ سے عام انسانوں میں شخصیت کا وقار ختم ہو جاتا ہے اور افکار و نظریات کی ترقی میں رکاوٹ پڑ جاتی ہے اور موجود استعدادیں ختم ہو جاتی ہیں اور اس طرح کسی ملت کا بہت بڑا انسانی سرمایہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ مزید برآں جو شخص اپنے کام دوسروں کے صلاح و مشورہ سے کرتا ہے اگر وہ کامیابی سے ہمکنار ہو جائے تو دوسرے لوگ اس کو حسد کی نگاہ سے نہیں دیکھتے کیونکہ دوسرے لوگ اس کی کامیابی کو اپنی طرف سے ہی سمجھتے ہیں اور عموماً انسان اس کام سے حسد نہیں کرتا جسے اس نے خود سر انجام دیا ہو اور اگر کبھی وہ شکست کھا جائے تو وہ دوسروں کے اعتراضات کا نشانہ نہیں بنتا کیونکہ کوئی شخص اپنے کام کے نتیجہ پر اعتراض نہیں کرتا نہ صرف یہ کہ اعتراض نہیں کرتا بلکہ ہمدردی و غم خواری بھی کرتا ہے۔

مشورے کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان دوسرے افراد کی شخصیت کی قدر و قیمت اور ان کی دشمنی و دوستی کا اندازہ بھی لگا لیتا ہے اور یہ چیز کامیابی کے لیے درکار شناسائی و آشنائی کا سبب بھی بنتی ہے۔

اسلامی روایات میں مشورے کے بارے میں بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے ایک حدیث میں رسولِ خداؐ نے فرمایا!

"ما شقی عبد قط بمشورة ولا سعد باستغناء رای"

کوئی شخص ہرگز مشورے سے بدبخت اور استبداد رائے سے خوش بخت نہیں ہو سکتا[1]

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

"من استبد برایه هلك ومن شاور الرجال شارکها فی عقولها"

جو شخص استبداد رائے رکھتا ہو وہ ہلاک ہو جاتا ہے اور جو بڑے لوگوں سے مشورہ کرتا ہے وہ ان کی عقل میں شریک ہو جاتا ہے[2]

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی۔

[2] نہج البلاغہ۔

پیغمبر اکرمؐ نے ایک دوسری حدیث میں فرمایا:

"اذا کان امرائکم خیارکم و اغنیائکم سمحائکم و امرکم شوری بینکم فظہر الارض خیر لکم من بطنہا و اذا کان امرائکم شرارکم و اغنیائکم بخلائکم و لم یکن امرکم شوری بینکم فبطن الارض خیر لکم من ظہرہا۔"

جس وقت تمہارے حاکم نیک لوگ ہوں اور تمہارے امیر سخی ہوں اور تمہارے کام مشورے سے انجام پائیں تو اس وقت زمین کا ظاہری حصہ باطنی کی نسبت تمہارے لیے بہتر ہے (یعنی یہ زمین جینے کے قابل ہے) لیکن اگر تمہارے حکمران برے ہوں، دولت مند بخیل ہوں اور کام ایک دوسرے کے مشورہ سے نہ ہوتے ہوں تو اس وقت تمہارے لیے زمین کا نچلا (باطنی) حصہ، بالائی (ظاہری) حصے سے بہتر ہے۔[1]

یہ مسلم ہے کہ ہر شخص سے مشورہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بعض اوقات ان میں کمزوری کے پہلو ہوتے ہیں جن کی بنا پر ان کا مشورہ بدبختی اور پسماندگی کا سبب بن سکتا ہے جیسا کہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ تین قسم کے لوگوں سے مشورہ نہ کرو۔

۱۔ بخیل افراد سے مشورہ نہ کرنا کیونکہ وہ تجھے بخشش اور دوسروں کی مدد کرنے سے روکیں گے اور فقر و غربت سے ڈرائیں گے (لا تدخلن فی مشورتک بخیلا یعدل بک عن الفضل و یعدک الفقر)[2]

۲۔ بزدلوں سے بھی مشورہ نہ کرنا کیونکہ وہ تجھے اہم کاموں کی انجام دہی سے روکیں گے (ولا جبانا یضعفک عن الامور)[2]

۳۔ حریص افراد سے مشورہ نہ کرنا کیونکہ وہ دولت کی طمع میں تمہیں ظلم و ستم کی طرف رغبت دلائیں گے (ولا حریصا یزین لک الشرہ بالجور)۔

جس سے مشورہ کیا جائے اس کی ذمہ داری

جس طرح اسلام میں مشورہ کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے اسی طرح ان افراد کے بارے میں احکام ہیں جن سے مشورہ کیا جاتا ہے مثلاً یہ کہ خیر خواہی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ مشورہ میں خیانت کرنے کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے یہاں تک کہ یہ حکم غیر مسلموں کے لیے بھی ہے کہ وہ مشورہ طلب کریں تو ان سے کسی قسم کی خیانت نہ کی جائے اور جو صحیح رائے ہو وہی انہیں دی جائے۔

امام زین العابدین علیہ السلام سے نقل شدہ "رسالہ حقوق" میں آپؑ نے فرمایا:

"وحق المستشیر ان علمت لہ رأیا اشرت علیہ و ان لم تعلم ارشدتہ الی من یعلم وحق المشیر علیک ان لا تتہمہ فیما لا یوافقک من رأیہ"

تجھ سے مشورہ کرنے والے کا حق یہ ہے کہ اگر کوئی نظریہ رکھتے ہو تو اسے بتا دو اور اگر اس کام کے بارے میں تجھے

---

[1] تفسیر ابو الفتوح رازی۔ [2] نہج البلاغہ فرمان بنام مالک اشتر۔

علم نہیں تو اسے ایسے شخص کی طرف رہنمائی کرو جو جانتا ہے اور مشورے دینے والے کا حق تم پر یہ ہے کہ جس نظریے میں وہ تمہارا موافق نہیں ہے اس میں اس پر تہمت تراشی نہ کرو۔[1]

حضرت عمر کی مجلس شوریٰ

اہل سنت کے مفسرین درج بالا آیت کے ذیل میں حضرت عمر کی اس چھ رکنی مشاورتی کمیٹی کا تذکرہ کرتے ہیں جو انہوں نے تیسرے خلیفہ کے انتخاب کے لیے تشکیل دی تھی یہ لوگ مندرجہ بالا آیت اور مشورہ کی تمام روایات کو اسی واقعہ پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگرچہ اس موضوع کے متعلق عقائد کی کتابوں میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے لیکن یہاں چند ایک نکات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ امام اور جانشین پیغمبرؐ کا انتخاب صرف اللہ کے حکم سے ہونا چاہیے کیونکہ اسے بھی پیغمبرؐ کی طرح عصمت اور ایسے دیگر کمالات کا حامل ہونا چاہیے کہ جن کا علم صرف خدا کے پاس ہے۔ دوسرے لفظوں میں جس طرح پیغمبرؐ کو مشورے سے منتخب نہیں کیا جا سکتا ہے اسی طرح امام کا انتخاب بھی مشورے سے ناممکن ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مذکورہ افراد کی مجلس شوریٰ ہرگز مشورے کے تقاضوں اور شرائط کو پورا نہیں کرتی کیونکہ اگر مقصود تمام مسلمانوں سے مشورہ کرنا تھا تو اسے چھ افراد میں منحصر کرنے کا کیا معنی ہے اور اگر مقصد امت کے صاحبانِ فکر و نظر سے مشورہ کرنا تھا تو وہ صرف چھ نہیں تھے۔ امت کے دانا اور اہل رائے افراد مثلاً سلمان جو خود حضرت پیغمبر اکرمؐ کے مشیر تھے اسی طرح ابوذر، مقداد، ابن عباس اور ان جیسے دیگر افراد مجلسِ شوریٰ میں شامل نہ تھے۔ مجلسِ مشاورت کی ہیئت مشاورت کی بجائے ایک سیاسی چال زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر مشورے کے لیے صاحبانِ اثر و رسوخ کو جمع کرنا مقصود تھا تاکہ دوسرے لوگ ان کی رائے قبول کر لیں پھر بھی یہ ہیئت درست نہ تھی کیونکہ کئی ایک اہم شخصیتیں ان میں شامل نہ تھیں مثلاً سعد بن عبادہ جو انصار کے سربراہ تھے، ابوذر غفاری جو قبیلہ غفار کی ایک عظیم شخصیت تھے اور ان جیسے دیگر افراد اس مجلسِ مشاورت سے الگ تھلگ تھے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ اس مجلس شوریٰ کے لیے بڑی سخت اور سنگین شرائط مقرر کی گئی تھیں اور مخالفین کو موت کی دھمکی تک دی گئی تھی حالانکہ اسلام کے مشاورتی اصولوں اور طریقوں میں ایسی کسی چیز کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آخری فیصلے کا مرحلہ

فاذا عزمت فتوکل علی اللہ

مشورہ کرتے وقت نرم مزاجی اور محبت سے کام لینا چاہیے لیکن جب پختہ ارادہ کر لیا جائے تو اتنا ہی مضبوط بھی ہونا چاہیے اور اپنے آپ کو ہر قسم کے تردد اور اختلاف آراء سے دور رکھتے ہوئے مصمم ارادہ کر لینا چاہیے۔ اسی کو قرآن مجید نے مندرجہ بالا آیت میں عزم سے تعبیر کیا ہے اور یہی تصمیم قاطع ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۱ صفحہ ۴۰۵۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں جمع (و شاورھم) کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے لیکن آخری فیصلہ پیغمبر اکرمؐ کے ذمہ کر دیا گیا ہے اور یہاں واحد کا صیغہ (عزمت) استعمال ہوا ہے۔ جمع و مفرد کا یہ فرق ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ اجتماعی معاملات کے مختلف پہلوؤں کا حل پا کر اور اجتماعی صورت میں جائزہ لینا چاہیے اور تحقیق کرنا چاہیے لیکن جب ایک چیز کو درست سمجھ لیا جائے تو پھر اس کے اجراء کے لیے ایک ہی ارادے کو کام میں لانا چاہیے ورنہ ہرج مرج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اگر ایک پروگرام پر کسی ایک سرپرست کی بجائے کئی رہبروں کے ذریعے عمل درآمد ہو تو یقینی طور پر وہ اختلاف اور شکست سے دوچار ہوگا۔ اسی بنا پر آج کی دنیا میں بھی مشورہ تو اجتماعی صورت میں ہوتا ہے لیکن فیصلے کا اظہار ایسی حکومتوں کے ذریعے ہوتا ہے جس کے پروگرام ایک شخص کے زیر نظر رہ کر انجام پاتے ہیں۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ زیر نظر آیت کہتی ہے کہ پختہ ارادہ کرتے ہوئے خدا پر توکل کرنا چاہیے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ عمومی اسباب و وسائل فراہم ہو جانے کے بعد خدا کی لامتناہی قدرت سے مدد طلب کرنا فراموش نہ ہو جائے۔ البتہ توکل کا یہ مطلب نہیں کہ انسان مادی دنیا میں خدا کے عطا کردہ اسباب و وسائل کو کام میں نہ لائے۔ جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ ایک عرب نے اپنے اونٹ کے پاؤں نہیں باندھے تھے اور اسے محافظ کے بغیر چھوڑ دیا تھا اور اسے وہ خدا پر توکل کرنا سمجھتا تھا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا:

اعقلها و توکل

یعنی — پہلے اس کا پاؤں باندھو اور پھر توکل کرو۔

یہاں آیت میں یہ مقصد ہے کہ انسان عالم مادہ کی چار دیواری اور اپنی محدود قدرت و توانائی پر انحصار نہ کرے اور اپنی نگاہیں پروردگار کی حمایت و لطف پر لگائے رکھے۔ یہ مخصوص توجہ انسان کو امن و سکون، اطمینان اور عظیم روحانی تقویت سے ہمکنار کرتی ہے جو مشکلات کے عالم میں انسان کے لیے بہت موثر ہوتی ہے۔

اس کی مزید تفصیل مسئلہ توکل اور عالم طبیعت سے استفادہ کرنے کے زیر عنوان انشاء اللہ سورہ طلاق کی آیت ۲ — ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا — کے ذیل میں پیش کی جائے گی۔

ان اللہ یحب المتوکلین

بعد والی آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ اہل ایمان کو صرف خدا پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ خدا توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

ضمناً اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ توکل کا مرحلہ مکمل مشورہ کرنے اور تمام امکانی وسائل جو انسانی اختیار میں ہیں سے استفادہ کرنے کے بعد آتا ہے۔

توکل کا نتیجہ

ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم و ان یخذلکم فمن ذا الذی ینصرکم من بعدہ

یہ آیت گذشتہ آیت کی تکمیل کرتی ہے اس میں خدا پر توکل کے سلسلے میں ایک نکتہ بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ خدا کی قدرت تمام قدرتوں سے بالاتر ہے لہٰذا وہ جس کی حمایت کرے گا دوسرا کوئی بھی اس پر کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ ذات جو ایسی تمام کامیابیوں کا سرچشمہ ہے اس پر بھروسہ کرنا چاہیے اور اسی سے مدد مانگنی چاہیے۔

یہ آیت اہلِ ایمان کو ترغیب دلاتی ہے کہ ہر قسم کے ظاہری وسائل میسر ہونے کے باوجود خدا تعالیٰ کی ناقابلِ شکست قدرت پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

درحقیقت گذشتہ آیت میں روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف تھا اور انہیں حکم دیا گیا تھا لیکن اس آیت میں تمام مومنین مخاطب ہیں۔ انہیں فرمایا گیا ہے کہ وہ رسول اللہ کی طرح خدا کی ذات پاک پر بھروسہ کریں۔ اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: وعلی اللہ فلیتوکل المومنون - یعنی مومنین کو صرف ذاتِ خدا پر توکل کرنا چاہیے۔

بنا کہے واضح ہے کہ خدا تعالیٰ مومنین کی حمایت یا عدم حمایت بلا وجہ نہیں کرتا بلکہ ان کی اہلیت کے مطابق ہی کرتا ہے۔ جو خدا کے حکم کو پاؤں تلے روندتے ہیں اور مادی و روحانی توانائیاں فراہم کرنے سے غافل رہتے ہیں خدا کی مدد اور حمایت ان کے لیے نہیں ہوتی مگر جو لوگ صف بستہ خالص نیت اور عزم راسخ سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، تمام ممکنہ دیگر وسائل بھی دشمن کے مقابلے میں فراہم کرتے ہیں انہی کے سر پر خدا کا دستِ حمایت ہوتا ہے۔

۱۶۱۔ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۱۶۱۔ (تم گمان کرتے ہو کہ ہو سکتا ہے پیغمبرؐ تم سے خیانت کرے حالانکہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی پیغمبر خیانت کرے اور جو شخص خیانت کرے گا وہ روز قیامت اسی چیز کے ہمراہ (میدان حشر میں) پیش ہو گا پھر ہر شخص کو وہ کچھ دیا جائے گا جو اس نے کمایا ہو گا (اس بنا پر) ان پر ظلم نہیں ہو گا (بلکہ وہ اپنے اعمال کا نتیجہ ہی دیکھیں گے)۔

تفسیر

ہر قسم کی خیانت ممنوع ہے

وما كان لنبي ان يغل

اس طرف توجہ رکھتے ہوئے کہ مندرجہ بالا آیت جنگ احد کے سلسلے کی آیات کے بعد آئی ہے اور ان روایات پر نظر رکھتے ہوئے جو صدر اول کے مفسرین نے نقل کی ہیں، یہ آیت جنگ احد کے سپاہیوں کی بعض بے بنیاد عذر تراشیوں کے جواب میں ہے۔ اس کی

وضاحت کچھ یوں ہے کہ جنگ احد کے بعض تیرانداز جب اپنا اساسی مورچہ مالِ غنیمت جمع کرنے کے لیے چھوڑنا چاہتے تھے تو ان کے سردار نے انہیں حکم دیا کہ وہ یہ مورچہ نہ چھوڑیں اور ساتھ ہی ان سے کہا کہ رسولِ خدا تمہیں مالِ غنیمت سے محروم نہیں رکھیں گے لیکن ان دنیا پرستوں نے اپنے اصلی چہرے چھپانے کے لیے کہا کہ ہمیں یہ ڈر ہے کہ پیغمبر تقسیمِ غنائم میں ہمیں نظرانداز کر دیں گے لہٰذا ہمیں اپنے لیے خود ہاتھ پاؤں مارنے چاہئیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنا مورچہ چھوڑا اور مالِ غنیمت سمیٹنے لگ گئے اور پھر وہ دردناک حوادث پیش آئے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے، کیا تم گمان کرتے ہو کہ پیغمبر تم سے خیانت کریں گے جبکہ ممکن نہیں کہ کوئی پیغمبر خیانت کرے (وماکان لنبی ان یغل[1])

اس آیت میں خداوندِ عالم نے ساحتِ مقدس انبیاء کو خیانت سے کاملاً منزہ قرار دیا ہے۔ ارشاد فرماتا ہے، بنیادی طور پر ایسی چیز مقامِ نبوت کے شایانِ شان ہی نہیں یعنی خیانت کا نبوت سے کوئی جوڑ نہیں اگر پیغمبر خائن ہو تو پھر رسالتِ الٰہی کی ادائیگی اور تبلیغِ احکام میں اس پر اطمینان نہیں کیا جا سکتا۔

بغیر کہے واضح ہے کہ اس آیت میں انبیاء سے ہر قسم کی خیانت کی نفی کی گئی ہے اس کا تعلق مالِ غنیمت کی تقسیم سے ہو یا لوگوں کی امانتوں کی حفاظت سے یا پھر وحی حاصل کرنے اور اسے بندگانِ خدا تک پہنچانے سے۔

تعجب ہے کہ جو شخص پیغمبر کو وحیِ الٰہی کے بارے میں امین سمجھتا ہو کیسے گمان کر سکتا ہے کہ وہ نعوذ باللہ جنگی مالِ غنیمت کے بارے میں ناروا حکم دے گا یا اسے اس کے حق سے محروم کر دے گا۔

البتہ واضح ہے کہ خیانت کی کسی شخص کو اجازت نہیں چاہے وہ پیغمبر ہو یا کوئی اور، لیکن جنگِ احد کے بہانہ سازوں کی گفتگو چونکہ پیغمبر کے بارے میں تھی لہٰذا آیت بھی پہلے انبیاء کے متعلق بات کرتی ہے اور پھر مزید کہتی ہے: ومن یغلل یأت بما غل یوم القیٰمۃ۔ یعنی جو شخص بھی خیانت کرے گا وہ روزِ قیامت اس چیز کا بار اپنے دوش پر بطور سند اٹھائے ہوئے حاضر ہوگا جس میں اس نے خیانت کی ہوگی یا میدانِ محشر میں اسے اپنے ساتھ لائے گا۔ اس طرح وہ سب کے سامنے ذلیل و رسوا ہوگا۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ دوش پر اٹھا لانے یا اپنے ساتھ لے آنے سے مراد یہ نہیں کہ بعینہ وہی چیز اٹھا لائیں گے بلکہ یہاں اس کی جوابدہی کا بوجھ مراد ہے لیکن قیامت میں انسانی اعمال مجسم ہونے کے مسئلے کی طرف نظر کی جائے تو اس تفسیر کی ضرورت باقی نہیں رہتی بلکہ جیسے مندرجہ بالا آیت کا ظاہری مفہوم شاہد ہے بعینہ وہی چیزیں بطورِ سند خیانت کاروں کے دوش پر ہوں گی یا ان کے ہمراہ ہوں گی جن میں خیانت کی گئی ہے۔

ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون

پھر ہر شخص کو وہ کچھ دیا جائے گا جو اس نے انجام دیا ہے یا کسب کیا ہے یعنی لوگ اپنے اعمال کو بعینہ وہاں پائیں گے لہٰذا

---

[1] "یغل" "غلّ" سے خیانت کے معنی میں لیا گیا ہے۔ اصل میں "غلّ" کا معنی ہے پانی کا تدریجی اور مخفی طور پر درختوں کی جڑوں میں پہنچنا۔ خیانت چونکہ مخفی طور پر اور تدریجاً ہوتی ہے اس لیے اسے بھی "غلول" کہتے ہیں تشنگی سے پیدا ہونے والی اندرونی حالت کو بھی "غلیل" اسی وجہ سے کہتے ہیں۔

اس بنا پر کسی شخص پر ظلم و ستم نہیں ہوگا کیونکہ ہر شخص کو وہ کچھ مل جائے گا جو اس نے حاصل کیا تھا یا کمایا تھا، چاہے اچھا ہو یا بُرا۔

مندرجہ بالا آیت اور وہ احادیث جو پیغمبر اکرمؐ پر خیانت کا الزام لگانے کی مذمت کے ضمن میں صادر ہوئیں انہوں نے مسلمانوں پر عجیب تربیتی اثرات مرتب کیے۔ ان کی تاثیر تھی کہ ان سے چھوٹی سے چھوٹی خیانت بھی سرزد نہیں ہوتی تھی خصوصاً مال غنیمت اور دیگر مالی معاملات میں ہوتا یہ تھا کہ بہت قیمتی غنائم کم حجم ہونے کے باوجود جن میں خیانت کرنا کچھ مشکل نہ تھا، خود پیغمبر اکرمؐ اور آپؐ کے بعد برسرِ اقتدار حکام کے پاس بغیر دست برد کے لائے جاتے تھے اور یہ ہر دیکھنے والے کے لیے تعجب خیز امر تھا۔ یہ وہی زمانۂ جاہلیت کے وحشی اور غارت گر عرب تھے جو تعلیمات اسلامی کے نتیجے میں انسانی تربیت کے اس درجے پر پہنچ گئے تھے — گویا میدان محشر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ جس میں اموال میں خیانت کرنے والوں کو سب کے سامنے اس عالم میں پیش کیا جائے گا کہ وہ اموال ان کے دوش پر ہوں گے جن میں انہوں کی خیانت کی ہوگی۔ یہی وہ ایمان تھا جو انہیں اس قدر بیدار کرتا تھا کہ وہ خیانت کا خیال بھی ترک کر دیں۔

طبری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے:

جب مسلمان مدائن میں داخل ہوئے اور مال غنیمت جمع کرنے لگے ایک مسلمان مال غنیمت میں سے ایک نہایت قیمتی چیز مال غنیمت جمع کرنے والوں کے پاس لے آیا۔ وہ اس چیز کو دیکھ کر تعجب کرنے لگے اور اس سے کہنے لگے، ہم نے آج تک اس قسم کی قیمتی چیز نہیں دیکھی۔ پھر انہوں نے اس سے پوچھا: تم نے اس میں سے کچھ لیا بھی ہے؟ وہ کہنے لگا: خدا کی قسم اگر یہ خدا کے لیے نہ ہوتا تو میں ہرگز اسے تمہارے پاس نہ لاتا۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ شخص بڑی روحانی شخصیت کا حامل ہے۔ پھر انہوں نے اس سے خواہش کی کہ وہ اپنا تعارف کروائے۔ وہ کہنے لگا: بخدا میں ہرگز تم سے اپنا تعارف نہیں کرواؤں گا، کہیں تم میری تعریف و توصیف کرنے لگو میں نہیں چاہتا کہ دوسرے میری تعریف کریں لیکن میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس کی جزا و ثواب پر راضی ہوں[1]

۱۶۲۔ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○

۱۶۳۔ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۱۶۲ وہ جو رضائے خدا کی پیروی کرے کیا وہ اس کی مانند ہے جو خشم و غضبِ خدا کی طرف لوٹے اور جس کی جائے قرار جہنم ہے جس کا انجام بہت ہی بُرا ہے۔

۱۶۳ ان میں سے ہر ایک کے لیے بارگاہِ خدا میں درجہ و مقام ہے اور جو کچھ وہ انجام دیتے ہیں خدا اسے دیکھتا ہے۔

---

[1] تاریخ طبری، جلد ۴، صفحہ ۱۶۔

تفسیر

جہاد میں شرکت نہ کرنے والے

افمن اتبع رضوان اللہ

آیاتِ گذشتہ میں جنگ اُحد کے مختلف پہلوؤں اور اس کے نتائج پر بحث ہو چکی ہے۔ اب باری ہے منافقین اور ان کمزور ایمان والے مسلمانوں کی جو منافقین کی اتباع کرتے ہوئے میدان جنگ میں حاضر نہ ہوئے۔ روایات میں ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ نے جنگ اُحد کے لیے چلنے کا حکم صادر فرمایا تو منافقین کا ایک گروہ اس بہانے سے شامل نہ ہوا کہ بقول ان کے انہیں جنگ کے وقوع پذیر ہونے کا یقین نہیں تھا۔ بعض کمزور ایمان والے مسلمان بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ زیرِ نظر آیت ان کی اسی حالت کی وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہے: وہ لوگ جو حکم خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کی رضا کی پیروی کرتے ہیں کیا وہ ان لوگوں کی طرح ہیں جو غضبِ خدا کی طرف لوٹ گئے ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم اور ان کا انجام کار بُرا اور تکلیف دہ ہے۔

اس کے بعد فرمایا: ھم درجات عند اللہ — یعنی ان میں سے ہر کوئی بارگاہِ الٰہی میں درجہ اور اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ نہ فقط یہ کہ تن پرور منافق اور مجاہدین آپس میں فرق رکھتے ہیں بلکہ ہر شخص جو ان دو صفوں میں سے کسی میں کھڑا ہے فداکاری و جانبازی یا نفاق و حق دشمنی میں فرق کا ایک خاص درجہ رکھتا ہے جو صفر سے شروع ہو کر حدِ تصور سے بالاتر تک جاری و ساری رہتا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ایک روایت میں حضرت امام علیؑ بن موسیٰؑ رضا سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

ہر درجے کے درمیان آسمان و زمین کے درمیانی فاصلے جتنا فاصلہ ہے۔[1]

ایک اور روایت میں ہے:

اہلِ بہشت درجاتِ بالا میں رہنے والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے آسمان پر ستارہ دکھائی دیتا ہے۔[2]

البتہ توجہ رہے کہ عموماً درجہ سیڑھیوں کو کہا جاتا ہے کہ جن کے ذریعے انسان بلند نقطے کی طرف جاتا ہے لیکن جن سیڑھیوں کے ذریعے نیچے کی طرف جایا جاتا ہے انہیں "درک" (بروزن مرگ) کہا جاتا ہے۔ اسی لیے سورۂ بقرہ آیہ ۲۵۳ میں انبیاء کے بارے میں ہے:

ورفع بعضھم فوق بعض درجات

سورۂ نساء آیہ ۱۴۵ میں منافقین کے بارے میں ہے:

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۱، صفحہ ۴۰۶

[2] تفسیر مجمع البیان، زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

ان المنٰفقین فی الدرك الاسفل من النار

لیکن زیر بحث آیت میں کیونکہ دونوں گروہوں کے متعلق گفتگو ہے اس لیے مومنین سے متعلق تعبیر اختیار کی گئی اور لفظ "درجہ" استعمال کیا گیا (اس طرز بیان کو ادبی اصطلاح میں تغلیب کہتے ہیں)۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: واللہ بصیر بما یعملون۔ یعنی خدا سب کے اعمال دیکھتا ہے اور کامل طور پر جانتا ہے کہ ہر شخص اپنی نیت، ایمان اور عمل کے لحاظ سے کس درجے کا اہل ہے۔

ایک موثر طریقۂ تربیت

قرآن مجید میں دینی، اخلاقی اور اجتماعی معارف سے مربوط حقائق کو سوال کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے اور مسئلہ کے دونوں پہلو سننے والے کے سامنے پیش کر دیئے گئے ہیں تاکہ وہ اپنی عقل و فکر سے ایک کو انتخاب کرے۔ یہ طریقہ جسے غیر مستقیم (INDIRECT) کہنا چاہیے تربیتی امور میں بہت موثر ہوتا ہے کیونکہ انسان عموماً مختلف امور میں سے سب سے زیادہ اہمیت اپنے افکار و نظریات کو دیتا ہے۔ جب کوئی مسئلہ ایک قطعی اور حتمی صورت میں پیش کیا جائے تو بعض اوقات انسان اس کے مقابلے کی کوشش کرتا ہے اور اسے ایک اجنبی فکر کی حیثیت سے دیکھتا ہے لیکن جب اسے سوال کی صورت میں پیش کیا جائے اور اس کا جواب وہ اپنے وجدان اور دل کے اندر سے سنے تو اسے اپنی فکر اور اپنی رسائی سمجھتا ہے اور اسے ایک جانی پہچانی فکر کی حیثیت سے قبول کرتا ہے لہٰذا اس کے مقابلے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ طرز تعلیم بالخصوص ہٹ دھرم لوگوں اور بچوں کے لیے موثر ہے۔ قرآن مجید میں اس طریقے سے بہت کام لیا گیا ہے، اس کے چند نمونے یہ ہیں۔

۱ ھل یستوی الذین یعلمون و الذین لا یعلمون

یعنی — کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں۔ (زمر - ۹)

۲ قل ھل یستوی الاعمٰی و البصیر افلا تتفکرون

یعنی — کہیے: کیا نابینا اور بینا برابر ہیں، کیا تم سوچتے نہیں۔ (انعام - ۵۰)

۳ قل ھل یستوی الاعمٰی و البصیر ام ھل تستوی الظلمٰت والنور

یعنی — کہیے کیا نابینا اور بینا برابر ہیں، آیا تاریکیاں اور روشنی برابر ہیں۔ (رعد - ۱۶)

۱۶۴۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

ترجمہ

۱۶۴۔ خدا نے مومنین پر احسان کیا (انہیں ایک عظیم نعمت بخشی) جبکہ ان میں انہی کی جنس سے ایک پیغمبر مبعوث کیا جو ان کے

سامنے اس کی آیات پڑھتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ اس سے پہلے وہ واضح گمراہی میں تھے۔

تفسیر

خدا کی بہت بڑی نعمت

لقد من الله علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم

اس آیت میں عظیم ترین نعمت ــــ یعنی "بعثت پیغمبر اسلام" کے متعلق گفتگو ہے۔ حقیقت میں یہ ان سوالات کا جواب ہے جو مسلمانوں کے دل میں جنگ احد کے بعد اٹھتے تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ ہم ان مشکلات و مصائب میں کیوں گرفتار ہوں۔ قرآن انہیں کہتا ہے: اگر تمہیں اس راہ میں نقصان اٹھانا پڑتا ہے تو یہ نہ بھول جاؤ کہ اللہ نے تمہیں ایک بہت بڑی نعمت عطا کی ہے، اس نے پیغمبر مبعوث کیا ہے جو تمہاری تربیت کرتا ہے اور تمہیں کھلی گمراہیوں سے روکتا ہے، اس عظیم نعمت کی حفاظت کے لیے تم جتنی بھی کوشش کرو اور تمہیں جتنی بھی قیمت دینا پڑے تھوڑی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس نعمت کو ذکر لقد من الله علی المؤمنین (خدا نے مومنین پر احسان کیا) سے شروع ہوتا ہے، جو ابتدائی نظر میں مناسب معلوم نہیں ہوتا لیکن "منت" کے اصلی معنی کی طرف توجہ دی جائے تو مطلب پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ مفردات میں راغب کہتا ہے کہ یہ لفظ دراصل "من" سے ہے جس کا معنی ہے "وہ پتھر جن سے چیزوں کو تولا جاتا ہے" اسی لیے ہر قیمتی چیز اگر وہ عملی پہلو رکھتی ہو تو اسے "منت" کہتے ہیں یعنی کسی نے دوسرے کو عملی طور پر عظیم نعمت عطا کی ہو تو اس کا استعمال بالکل زیبا اور مناسب ہے لیکن اگر کوئی اپنے چھوٹے سے کام کو باتوں سے بڑا کر کے دکھائے تو یہ انتہائی بُرا اور قبیح ہے لہٰذا احسان جتلانا جو بُرا اور مذموم ہے وہ باتوں میں اپنے احسانات کو بڑا شمار کرنا ہے لیکن اس احسان کا تذکرہ جو عظیم نعمتوں کی عطا ہو، مناسب اور زیبا ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، پروردگار نے مومنین پر احسان کیا یعنی انہیں عظیم نعمت عطا کی۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ صرف مومنین کا ذکر کیوں کیا گیا ہے جبکہ بعثت پیغمبر تو تمام نوع بشر کی ہدایت کے لیے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نتیجہ اور تاثیر کے لحاظ سے صرف مومنین ہی اس عظیم نعمت سے استفادہ کرتے ہیں اور عملاً اسے اپنے سے مخصوص کر لیتے ہیں۔

اس کے بعد فرماتا ہے: پیغمبر کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ خود انہی کی جنس اور نوع بشر میں سے ہے (من انفسھم) وہ فرشتوں یا دیگر مخلوق کی نوع میں سے نہیں ہے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ وہ ضروریات بشر کو مکمل طور پر جان سکے اور انسانوں کے دکھ درد، مشکلات مصائب اور مسائل زندگی کو لمس کر سکے اور یوں ان کی تربیت کے لیے اقدام کرنے کی طرف خود متوجہ ہو سکے۔ علاوہ ازیں انبیاء کے تربیتی پروگرام کا اہم ترین حصہ ان کی اپنی زندگی اور عملی تبلیغات تھیں۔ ان کے اعمال تربیت کے لیے بہترین نمونہ اور ذریعہ تھے کیونکہ "عمل کی زبان" سے ہر زبان میں بہتر تبلیغ کی جا سکتی ہے اور یہ اس صورت میں ممکن ہے جب تبلیغ کرنے والا سننے والے کا ہم جنس ہو۔ اس کی جسمانی طبیعی اور روحی بناوٹ ایک سی ہو۔ مثلاً اگر انبیاء ملائکہ کے ہم جنس ہوتے تو لوگوں کی طرف سے یہ سوال باقی رہتا کہ اگر وہ گناہ نہیں کرتے تو کیا اس کی یہ وجہ نہیں کہ وہ شہوت و غضب اور طرح طرح کی انسانی احتیاجات اور بشری غرائز و سرشت کے حامل

نہیں ہیں اور یوں انبیاء کا عملی تبلیغات کا پروگرام ختم ہو کر رہ جاتا ہے اس لیے انبیاء کا انتخاب انسانوں میں سے انہی حاجات، ضروریات، غرائز اور طبائع کے ساتھ کیا گیا ہے تاکہ وہ سب کے لیے نمونہ عمل بن سکیں۔

یتلوا علیہم اٰیٰتہ و یزکیہم و یعلمہم الکتٰب و الحکمۃ

پھر فرمایا: پیغمبر نے ان کے سامنے تین اہم پروگرام پیش کیے ہیں:

پہلا ان کے سامنے پروردگارِ عالم کی آیات پڑھنا، تلاوت کرنا اور ان کے کانوں اور افکار کو ان آیات سے آشنا کرنا۔

دوسرا تعلیم ـــــ یعنی ان حقائق کو ان کی روح تک پہنچانا۔

تیسرا تزکیہ نفس یعنی اخلاقی و انسانی ملکات کی تربیت اور نشوونما۔ چونکہ اصلی ہدف تربیت ہے لہٰذا آیت میں اس کا ذکر تعلیم سے پہلے آیا ہے حالانکہ فطری تربیت کے لحاظ سے تعلیم تربیت پر مقدم ہے۔

وہ لوگ جو انسانی حقائق سے بالکل دور ہیں وہ تربیت کا اثر آسانی سے قبول نہیں کرتے بلکہ ایک مدت تک ان کے کانوں کو ارشاداتِ الٰہی سے آشنا کرنا پڑے گا اور ان میں پہلے سے موجود وحشت و اجنبیت کو دور کرنا پڑے گا پھر تعلیم کا مرحلہ شروع ہوگا اور اس کے بعد تربیت کی باری آئے گی جو کہ سارے پروگرام کا ماحصل ہے۔

ممکن ہے آیت میں تزکیہ سے مراد شرک، باطل عقائد اور بیہودہ خصائل اور بری حیوانی عادات کی آلودگی سے پاک کرنا ہو کیونکہ جب تک انسان کا باطن ان غلاظتوں سے پاک نہ ہو تو ممکن نہیں کہ وہ کتاب الٰہی اور حقیقی حکمت و دانائی کی تعلیم کے لیے آمادہ ہو سکے جیسے ایک تختی پر موجود برے نقوش جب تک صاف نہ ہو جائیں اس پر خوبصورت اور دلکش نقوش بجا طور پر ثبت نہیں ہو سکتے اس لیے مندرجہ بالا آیت میں تزکیہ نفس کو تعلیم یعنی بلند اور اعلیٰ اسلامی معارف پر مقدم کیا گیا ہے۔

و ان کانوا من قبل لفی ضلٰلٍ مبین

ایک عظیم نعمت کی اہمیت اس وقت واضح ہوتی ہے جب اس سے فائدہ حاصل کرنے کے زمانے کا اس سے قبل کے زمانے سے موازنہ کیا جائے اور ان دونوں کا فرق جان لیا جائے۔ زیرِ نظر جملے میں قرآن کہتا ہے: اسلام سے قبل کے زمانے پر ایک نگاہ کرو تمہاری کیا حالت تھی اور تمہارے ایام کیسے گزر رہے تھے اور اب کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہو۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ قرآن زمانۂ جاہلیت کی کیفیت کو "ضلال مبین" یعنی "واضح گمراہی" قرار دیتا ہے کیونکہ گمراہی و ضلالت کی کئی قسمیں ہیں۔ بعض گمراہیاں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان آسانی سے ان کے باطل ہونے کو نہیں سمجھ سکتا اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص تھوڑی سی عقل بھی رکھتا ہو اسے سمجھ لیتا ہے۔

دنیا کے لوگ اور خصوصاً جزیرۃ العرب کے رہنے والے پیغمبر اسلامؐ کی بعثت کے زمانے میں واضح ضلالت و گمراہی میں مبتلا تھے۔ ناجائز کاروبار، بدبختی، جہل و نادانی اور طرح طرح کی معنوی آلودگیوں نے اس زمانے میں تمام دنیا کو گھیر رکھا تھا اور یہ غیر مناسب کیفیت کسی پر بھی ڈھکی چھپی نہ تھی۔

۱۶۵۔ اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِیْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَیْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ

قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

ترجمہ

۱۶۵ (جنگ اُحد میں) تم پر مصیبت آئی جبکہ (جنگ بدر میں) اس سے دوگنا (دشمن) پر بھی تم غالب آچکے ہو، تو تم کہنے لگے کہ یہ مصیبت کہاں سے آئی ہے، کہہ دو کہ یہ خود تمہاری طرف سے ہے (کہ تم نے جنگ اُحد کے میدان میں حکم پیغمبر کی مخالفت کی) خدا ہر چیز پر قادر ہے (اور اب بھی اگر تم اپنی اصلاح کرو تو آئندہ وہ تمہیں کامیابی دے گا)۔

تفسیر

جنگ اُحد پر ایک اور نظر

اس آیت میں واقعہ اُحد پر ایک اور نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ بعض مسلمان جنگ کے المناک نتائج پر غمگین اور پریشان تھے اور بار بار اپنی پریشانی کا اظہار کرتے تھے۔ خداوند عالم مندرجہ بالا آیت میں ان سے تین نکات کا ذکر کرتا ہے

۱ تم صرف ایک ہی جنگ کے نتائج سے پریشان نہ ہو جاؤ بلکہ جتنی مرتبہ دشمن سے مقابلہ ہوا ہے اس کا موازنہ کرو۔ اگر اس میدان میں تم پر مصیبت آئی ہے تو دوسرے میدان (بدر) میں اس سے دوگنا دشمن پر تم بھی غالب آچکے ہو کیونکہ انہوں نے اُحد میں تمہارے ستر آدمی شہید کیے ہیں جبکہ تم میں سے کوئی قید نہیں ہوا لیکن جنگ بدر میں تم نے ان کے ستر آدمی قتل کیے اور ستر ہی گرفتار کیے تھے۔

اولما اصابتکم مصیبۃ قد اصبتم مثلیھا۔

حقیقت میں " قد اصبتم مثلیھا " یعنی تم نے دشمن کو دوگنا نقصان پہنچایا تھا۔ ایک جواب ہے جو سوال سے پہلے آیا ہے۔

۲ تم کہتے ہو کہ یہ مصیبت ہمیں کہاں سے دامن گیر ہوئی۔ " قلتم انی ھذا " لیکن اے پیغمبر! ان سے کہیے: اس مصیبت کا باعث خود تم ہو اور عوامل شکست کو اپنی ہی ذات میں تلاش کرو۔ (قل ھو من عند انفسکم)۔ تم ہی تو تھے جنہوں نے حکم پیغمبر کی مخالفت میں کوہ عینین کا حساس مورچہ چھوڑ دیا اور تم ہی نے جنگ ختم ہونے سے پہلے اور اس کے حتمی فیصلے سے قبل مال غنیمت جمع کرنا شروع کر دیا اور تم ہی دشمن کے نئے حملے کے وقت میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ تمہاری یہی کوتاہیاں اور گناہ اس شکست اور اتنے لوگوں کے قتل کا سبب بنیں۔

۳ اب آئندہ تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے کیونکہ خدا ہر چیز پر قادر و توانا ہے اور اگر تم اپنی کمزوریوں کی تلافی کرو تو اس کی حمایت تمہارے شامل حال ہوگی (ان اللہ علی کل شیء قدیر)۔

۱۶۶۔ وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ

۱۶۷۔ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ۚ

ترجمہ

۱۶۶۔ اور اُس روز (اُحد کے دن)، جب دو گروہ (مومنین و کفار) آپس میں نبرد آزما ہوئے تو تمہیں جو مصیبت پہنچی وہ حکم خدا (اور قانون مکافات) کے مطابق تھی اور اس بنا پر تھی کہ اہل ایمان پہچانے جائیں۔

۱۶۷۔ اور (یہ بھی وجہ تھی کہ) جن لوگوں نے منافقت کی ہے وہ پہچانے جائیں، وہ جنہیں کہہ دیا گیا تھا کہ آؤ اور راہ خدا میں جنگ کرو یا (کم از کم) اپنے حریم کا دفاع کرو۔ انہوں نے کہا اگر ہمیں یقین ہوتا کہ واقعاً جنگ ہوگی تو ہم تمہاری پیروی کرتے (لیکن ہمیں تو پتہ ہے کہ جنگ نہیں ہوگی)۔ وہ لوگ اُس دن ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ نزدیک تھے۔ وہ اپنے منہ سے وہ کچھ کہتے تھے جو ان کے دل میں نہیں ہوتا تھا اور خدا اس چیز کو جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں۔

تفسیر

مختلف گروہوں کو الگ الگ پہچانا جانا چاہیے

مندرجہ بالا آیت یہ بات یاد دلاتی ہے کہ (اُحد کی طرح) جو مصیبت بھی پیش آتی ہے ایک تو یہ کہ وہ بلا سبب نہیں ہوتی اور دوسرا یہ کہ وہ آزمائش کا ذریعہ بھی ہوتی ہے۔ اسی لیے اس آیت میں سچے مجاہدین اور منافقین یا کمزور ایمان لوگوں کی صفوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کا ذکر ہے۔ اسی لیے آیت کے پہلے حصے میں فرمایا گیا ہے وما اصابکم یوم التقی الجمعن فباذن الله ۔ اُحد کے دن جب مسلمانوں کا بت پرستوں سے آمنا سامنا ہوا اُس وقت جو کچھ تم پر گزرا وہ حکم خدا سے تھا اور اُسی کی مشیت اور ارادے سے ظہور پذیر ہوا۔

خلقت کے عمومی قانون کے مطابق ہر واقعے کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے اور بنیادی طور پر یہ جہان علل و اسباب کی بنیا

ہے اور یہ ایک ثابت و دائمی اصول ہے اور اس کے مطابق بھی کوئی فوج بھی میدان جنگ میں سستی کرے گی اور مال و دولت اور غنیمت کی لالچ میں پڑ جائے گی اور اپنے ہمدرد حاکم کا حکم فراموش کر دے گی تو وہ شکست کھا جائے گی۔ اس بنا پر اذن اللہ (حکم خدا) سے مراد اُس کا وہی ارادہ و مشیت ہے جو قانونِ علیت کی شکل میں عالم ہستی پر حکم فرما ہے۔

آیت کے دوسرے حصے میں فرمایا گیا ہے: ولیعلم المؤمنین و لیعلم الذین نافقوا۔ اس جنگ کا ایک مقصد یہ تھا کہ مومنین اور منافقین کی صفیں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور صاحبِ ایمان اور کمزور ایمان والوں میں امتیاز ہو سکے۔

• واقعہ اُحد میں مسلمانوں میں سے تین گروہ نمایاں ہو گئے:

پہلا — اس میں چند محدود افراد تھے جو آخری لمحوں تک ثابت قدم رہے اور دشمن کے جم غفیر کے سامنے آخری دم تک ڈٹے رہے۔ ان میں سے بعض نے جامِ شہادت نوش کیا اور بعض شدید زخمی ہوئے۔

دوسرا — یہ وہ لوگ تھے جن کے دلوں میں اضطراب اور تزلزل پیدا ہو گیا تھا اور وہ آخر تک استقامت نہ دکھا سکے اور بالآخر بھاگ کھڑے ہوئے۔

تیسرا — یہ منافقین کا گروہ تھا۔ یہ لوگ راستے ہی سے واپس لوٹ گئے تھے، طرح طرح کے بہانے کر کے جنگ سے منہ موڑ گئے اور مدینہ کی طرف پلٹ گئے۔ ہم جلد ہی ان کے بہانوں کا تذکرہ کریں گے۔ یہ گروہ عبداللہ بن ابی سلول اور اس کے تین سو ساتھیوں پر مشتمل تھا۔

اگر اُحد میں سخت معرکہ پیش نہ آتا تو یہ صفیں کبھی الگ الگ نہ ہوتیں اور ہر گروہ کے لوگ اپنی مخصوص صفات کے باوجود کسی معین صف میں نہ سمجھے جاتے اور ممکن تھا کہ دعویٰ کرتے وقت ہر شخص اپنے آپ کو بہترین مومن قرار دیتا۔

درحقیقت آیت میں دو چیزوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ پہلی جنگ اُحد کی شکست کی علّتِ فاعلی اور دوسری اس کی علّت غائی اور اس کا آخری نتیجہ۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں فرمایا گیا ہے: لیعلم الذین نافقوا (تاکہ وہ لوگ پہچانے جائیں جنہوں نے نفاق کیا ہے)۔ یہ نہیں فرمایا: لیعلم المنافقین (تاکہ منافق پہچانے جائیں)، دوسرے لفظوں میں نفاق کا ذکر فعل کی صورت میں ہوا ہے صفت کے طور پر نہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ نفاق ابھی تک ان سب میں صفتِ ثابت کے طور پر نہیں تھا۔ اسی لیے تاریخ اسلام میں ہے کہ ان میں سے بعض کو توبہ کی توفیق نصیب ہوئی اور وہ مومنین کی صفوں سے وابستہ ہو گئے۔

اس کے بعد قرآن اس گفتگو کا تذکرہ کرتا ہے جو جنگ سے قبل مسلمانوں اور منافقوں کے درمیان ہوئی، فرمایا:

وقیل لھم تعالوا قاتلوا فی سبیل اللہ او ادفعوا

ایک مسلمان (ابن عباس کے قول کے مطابق عبداللہ بن عمرو بن حزام) نے جب دیکھا کہ عبداللہ بن ابی سلول اپنے ساتھیوں کے ساتھ لشکرِ اسلام سے کنارہ کش ہو کر مدینہ کی طرف پلٹنے کا مصمم ارادہ کر چکا ہے تو اس سے کہا: آؤ خدا کے لیے اور

اس کی راہ میں جنگ کرو یا کم از کم جو خطرہ تمہارے وطن اور قوم قبیلے کو درپیش ہے اس کا ہی دفاع کرو۔

مگر ان لوگوں نے ایک بے ہودہ بہانہ کیا اور کہنے لگے: لو نعلم قتالاً لا تبعناکم۔ ہمیں اگر معلوم ہوتا کہ جنگ ہوگی تو ہم بے دریغ تمہاری پیروی کرتے، ہمارا خیال ہے کہ یہ بحث کسی جنگ اور خون ریزی کے بغیر ختم ہو جائے گی۔

ایک اور مفہوم کے مطابق منافقین کہنے لگے، اگر ہم اسے جنگ سمجھتے تو تمہارا ساتھ دیتے لیکن ہماری نگاہ میں تو یہ جنگ نہیں بلکہ ایک طرح کی خودکشی ہے کیونکہ لشکر اسلام اور کفار میں جو عدم توازن نظر آرہا ہے اس کے پیش نظر ان سے جنگ کرنا عقلمندی کا کام نہیں خصوصاً جبکہ لشکر اسلام کے پڑاؤ کی جگہ بھی نامناسب ہے۔

بہرحال یہ باتیں بہانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھیں۔ جنگ کا ہونا بھی یقینی تھا اور مسلمان ابتداء میں کامیاب اور فتح مند بھی ہو گئے تھے۔ اب اگر انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے تو یہ ان کے اپنے اشتباہات اور خلاف ورزیوں کا نتیجہ تھا۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا، وہ جھوٹ بولتے ہیں، هم للكفر يومئذ اقرب منهم للايمان اس روز وہ ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے اس جملے سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کفر و ایمان کے کئی درجے ہیں جو انسان کے عقیدے اور طرز عمل سے وابستہ ہیں۔

یقولون بافواههم ما ليس فى قلوبهم وہ زبان سے ایسی بات کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے اور ان کی نیت اُن کی گفتگو سے بالکل میل نہیں کھاتی۔ انہوں نے اپنی اس تجویز میں اصرار کرتے ہوئے کہ جنگ مدینہ کے اندر ہونی چاہیے یا دشمن کے حملوں کے خوف سے اور یا پھر اسلام سے لاتعلق ہونے کی وجہ سے جنگ میں شرکت نہیں کی۔ واللّٰه اعلم بما يكتمون لیکن خدا اُس سے مکمل طور پر آگاہ ہے جو کچھ منافق چھپائے ہوئے ہیں اور وہ اس جہان میں بھی اُن کے چہرے سے نقاب اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کو ان کے مقاصد سے آگاہ کرتا ہے اور آخرت میں بھی اُن کا حساب چکائے گا۔

۱۶۸۔ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۶۸۔ (منافقین) وہ ہیں جنہوں نے اپنے بھائیوں سے اُن کی حمایت سے دستکش ہو کر کہا کہ اگر وہ ہماری پیروی کرتے تو قتل نہ ہوتے۔ کہہ دو (کیا تم لوگوں کی موت کی پیش بینی کر سکتے ہو تو) پھر موت کو اپنے آپ ہی سے دور کر لو، اگر تم سچے ہو۔

تفسیر

منافقین کی بے بنیاد باتیں

منافقین خود بھی جنگ اُحد سے کنارہ کش رہے اور دوسروں کے حوصلے کم کرنے کی کوشش کرتے رہے اور پھر مجاہدین واپس آئے

تو انہیں سرزنش کرنے لگے اور کہنے لگے کہ اگر تم ہماری بات مانتے تو تمہارے آدمی قتل نہ ہوتے۔

مندرجہ بالا آیت میں قرآن اُن کی اس بے بنیاد بات کا جواب دیتا ہے اور کہتا ہے: الذین قالوا لاخوانھم و قعدوا۔ یعنی - جنہوں نے جنگ سے کنارہ کشی کی اور اپنے بھائیوں سے کہا کہ اگر ہماری اطاعت کی ہوتی تو تم قتل نہ ہوتے۔ ان سے کہیے اگر تم آئندہ کے حوادث کی پیش بینی کر سکتے ہو تو اپنے آپ ہی سے موت دور کر لو، اگر سچے ہو۔

یعنی حقیقت میں تمہارا دعویٰ ہے کہ تم عالم الغیب ہو اور آنے والے حوادث سے باخبر، تو ایسا دعویٰ کرنے والے شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی موت کے علل و عوامل کی پیش بینی کرتے ہوئے انہیں بے کار کر دے، کیا تم میں یہ قدرت و طاقت ہے۔

پھر اگر تم میدان جہاد اور راہِ افتخار میں قتل نہیں ہوتے تو کیا تمہیں عمر جاوداں مل جائے گی اور کیا تم موت کو ہمیشہ کے لیے اپنے سے دور کر سکتے ہو۔ جب تم موت کے مسلم قانون کو ختم نہیں کر سکتے تو پھر ذلت کے بستر پر کیوں مرتے ہو اور میدان جہاد میں دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے عزت سے جام شہادت نوش کیوں نہیں کرتے۔

زیر نظر آیت میں ایک اور قابل غور نکتہ بھی ہے اور وہ یہ کہ مومنین کو بھائی کہا گیا ہے جبکہ مومن ہرگز منافق کا بھائی نہیں ہے۔ دراصل یہ انہیں ایک قسم کی سرزنش ہے کہ تم تو مومنین کو اپنا بھائی سمجھتے تھے تو پھر ان حساس لمحوں میں ان کی حمایت سے دست کش کیوں ہو گئے ہو۔ اسی لیے اخوانھم کے فوراً بعد بلا فاصلہ لفظ قعدوا (جنگ سے بیٹھ گئے) آیا ہے، تو کیا انسان برادری کا دعویٰ بھی کرتا ہے اور پھر ایک دم اپنے بھائی کی حمایت چھوڑ کر بھی بیٹھ جاتا ہے۔

۱۶۹۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۙ

۱۷۰۔ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۘ

۱۷۱۔ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ

ترجمہ: ۱۶۹۔ راہ خدا میں قتل ہونے والوں کے بارے میں ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں سے روزی پاتے ہیں۔

۱۷۰۔ وہ خدا کی عطا کردہ فراواں نعمتوں پر خوش ہیں اور وہ (مجاہد) کہ جو اُن سے پیچھے رہ گئے ہیں اور اُن سے ابھی آکر نہیں ملے اُن کے بارے میں بھی خوش ہیں (کیونکہ وہ اُس جہان میں اُن کے عظیم مراتب کو دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں) کہ نہ اُن کے لیے کوئی خوف ہے اور نہ ملال۔

۱۷۱ اور وہ خدا کی نعمت اور اس کے فضل سے (خوشحال و مسرور ہوتے ہیں) اور (وہ دیکھتے ہیں کہ) خدا (شہید ہونے والوں اور نہ شہید ہونے والے مجاہد) مومنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

تفسیر

زندۂ جاوید

بعض مفسرین کے نزدیک مندرجہ بالا آیات شہدائے اُحد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور بعض دوسرے سمجھتے ہیں کہ یہ شہدائے بدر سے متعلق ہیں لیکن حق یہ ہے کہ گذشتہ آیات سے ان کا ربط ظاہر کرتا ہے کہ یہ جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی ہیں لیکن ان کا عمومی مفہوم بھی ہے جو تمام شہداء جن میں بدر کے چودہ شہدا بھی شامل ہیں پر محیط ہے۔ اسی لیے امام محمد باقرؑ سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا یہ آیات شہداء بدر و اُحد ہر دو کے بارے میں نازل ہوئی ہیں[1]۔ ابن مسعود پیغمبر اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں:

خدا نے شہداء اُحد کی ارواح کو خطاب کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ تمہاری کیا آرزو ہے تو انہوں نے کہا: پروردگار ہم اس سے زیادہ کیا آرزو کر سکتے ہیں کہ ہم ہمیشہ کی نعمتوں میں مستغرق ہیں اور تیرے عرش کے سائے میں رہتے ہیں، ہمارا تقاضا صرف یہ ہے کہ ہم دوبارہ دنیا کی طرف پلٹ جائیں اور پھر سے تیری راہ میں شہید ہوں۔ اس پر خدا نے فرمایا: میرا اٹل فیصلہ ہے کہ کوئی شخص دوبارہ دنیا کی طرف نہیں پلٹے گا[2]۔ انہوں نے عرض کیا: جب ایسا ہی ہے تو ہماری تمنا ہے کہ ہمارا سلام پیغمبر اسلام کو پہنچا دے، ہمارے حالات ہمارے پسماندگان کو بتا دے اور انہیں ہماری حالت کی بشارت دے تاکہ انہیں کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔

اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں۔

بہرحال یوں لگتا ہے کہ جنگ اُحد کے بعد کچھ کمزور ایمان لوگ بیٹھ جاتے اور اپنے ان دوستوں اور عزیزوں کا افسوس کرتے جو اس جنگ میں شہید ہو گئے تھے اور کہتے کہ وہ کیوں مارے گئے اور ختم ہو گئے۔ خصوصاً جب انہیں کوئی نعمت ملتی اور ان کی عدم موجودگی کے خیال سے انہیں بہت دُکھ ہوتا۔ وہ اپنے آپ سے کہتے کہ ہم تو ایسے ناز و نعمت سے بہرہ ور ہیں لیکن ہمارے بھائی بیٹے قبروں میں سوئے ہوئے ہیں اور ان کے ہاتھ بالکل خالی ہیں۔

ایسے افکار اور ایسی باتیں نہ فقط یہ کہ درست اور واقع کے مطابق نہ تھیں بلکہ باقی رہ جانے والوں کے جذبوں کو بھی کمزور کرنے کا باعث تھیں۔ زیر نظر آیات نے ایسے افکار پر خط بطلان کھینچ دیا اور شہیدوں کے بلند مقام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ولا تحسبن

---

[1] نور الثقلین جلد ۱، صفحہ ۴۰۹ بحوالہ عیاشی۔

[2] عموماً ایسا ہی ہوتا ہے البتہ بعض مواقع استثنائی حیثیت رکھتے ہیں جیسے امام زمانہ کے دور حکومت میں رجعت (مترجم)

الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا ۔ یہاں روئے سخن پیغمبر کی طرف ہے تاکہ دوسرے خود اندازہ کریں۔
آیت کے اس حصے کا مفہوم ہے کہ اے پیغمبر! یہ گمان ہرگز نہ کیجئے کہ جو لوگ راہ خدا میں مارے گئے ہیں وہ مردہ ہیں۔ بل احیاء عند ربھم یرزقون بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے ہاں سے نعمتیں حاصل کرتے ہیں۔
یہاں زندگی سے مراد برزخ کی زندگی ہے جو موت کے بعد کے زمانے میں ارواح کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ مادی وجسمانی زندگی نہیں۔ البتہ یہ زندگی شہداء سے مخصوص نہیں اور دیگر بہت سے لوگ بھی اس زندگی کے حامل ہیں[1]۔ لیکن شہیدوں کی زندگی چونکہ بہت انواع واقسام کی نعمتوں سے مالامال ہے۔ علاوہ ازیں آیت میں موضوع سخن شہداء ہی ہیں اس لیے صرف انہی کا نام لیا گیا ہے اور وہاں تعدد حیات معنوی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہیں گویا برزخ میں رہنے والے باقی لوگوں کی زندگی ان کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔
اس کے بعد شہداء کی حیات برزخ کی بہت سی خوبیوں میں سے ایک پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:
فرحین بما اٰتٰھم اللہ من فضلہ ۔ وہ فراواں نعمتیں جو خدا نے اپنے فضل وکرم سے انہیں دی ہیں ان سے وہ خوشحال ہیں۔
ان کی دوسری مسرت اپنے ان مجاہد بھائیوں کے بارے میں ہے جنہوں نے میدان جنگ میں جام شہادت نوش نہیں کیا اور ان سے مل نہیں پائے۔ وہ ان کے مقامات اور اجروثواب کو اس جہان میں اچھی طرح دیکھتے ہیں اس بناء پر وہ مسرور وشاداں ہیں جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ویستبشرون بالذین لم یلحقوا بھم من خلفھم[2]۔ اس کے بعد فرماتا ہے: الا خوف علیھم ولا ھم یحزنون یعنی شہداء محسوس کرتے ہیں کہ ان کے مجاہد بھائی ان چیزوں کے بارے میں کوئی غم نہیں کرتے جو وہ بعد از موت دنیا میں چھوڑ آئے ہیں اور نہ ہی انہیں قیامت اور اس کے وحشتناک حوادث کا خوف ہے۔
اس جملے کی ایک اور تفسیر بھی ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ شہداء اپنے ان مجاہد بھائیوں کے مقامات بلند دیکھ کر خوش ہوتے ہیں جو ان کے ساتھ نہیں مل سکے اور اس کے علاوہ انہیں خود بھی آئندہ کا کوئی خوف اور گذشتہ کا غم نہیں ہے[3]۔

یستبشرون بنعمۃ من اللہ وفضل
یہ آیت درحقیقت ان بشارتوں کی زیادہ تاکید اور توضیح ہے جو شہادت کے بعد شہداء کو حاصل ہوتی ہیں۔ وہ دو وجوہ کی بناء پر خوش اور مسرور ہیں:
پہلی یہ کہ وہ خدا کی نعمتیں پالیتے ہیں، نعمتیں ہی نہیں، بلکہ اس کا فضل جس کا معنی ہے ان نعمتوں کی زیادتی اور تکرار۔
دوسری یہ کہ وہ دیکھتے ہیں کہ خدا مومنین کا اجر ضائع نہیں کرتا نہ شہیدوں اور سچے مجاہدین جو جام شہادت نوش نہیں کر سکے، کا اجر ضائع کرتا ہے۔ وان اللہ لا یضیع اجر المؤمنین ۔ درحقیقت جو کچھ انہوں نے پہلے سنا ہوا تھا اب وہ اسے واضح طور پر دیکھیں گے۔

---

[1] بعض محققین دو طرح کے لوگوں کے لیے حیات برزخ کے قائل ہیں ایک بہت زیادہ نیک اور دوسرے بہت زیادہ برے۔
[2] استبشار کا معنی ہے بشارت پانا یا خود نعمت حاصل کرنے پر خوش ہونا یا دوستوں کے نعمت پانے پر مسرور ہونا اور اس کا معنی بشارت دینا نہیں ہے۔
[3] دوسرے الفاظ میں پہلی تفسیر کی رو سے "لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون" کی ضمیریں دنیا میں رہ جانے والوں کی طرف لوٹتی ہیں جبکہ دوسری تفسیر کی رو سے خود شہداء کی طرف لوٹتی ہیں۔

روح کی بقاء کا شاہد

جو آیات صراحت سے بقاء روح پر دلالت کرتی ہیں ان میں سے زیر نظر آیات بھی ہیں جو موت کے بعد حیات شہداء کے بارے میں ہیں۔ بعض نے یہ جو احتمال دیا ہے کہ حیات سے مراد ان کی مجازی زندگی ہے اور مقصد ان کی زحمات کے آثار اور نام و نشان کی بقا ہے یہ مفہوم آیات کے معنی سے بہت بعید ہے۔ یہ مفہوم مندرجہ بالا آیات کے کسی جملے سے پیدا نہیں ہوتا چاہے شہداء کے روزی حاصل کرنے کا معاملہ ہو یا مختلف حوالوں سے ان کے سرور و انبساط کا تذکرہ۔ علاوہ ازیں زیر نظر آیات وجود برزخ اور نعمات برزخ پر واضح دلیل ہیں۔ اس کی تشریح سورہ مومنون کی آیہ ۱۰۰ کے ذیل میں تفصیل سے پیش کی جائے گی۔ مذکورہ آیت یوں ہے:

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ

شہیدوں کا اجر

مقام شہداء کی اہمیت کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ہر قوم و ملت اپنے شہدا کے لیے ایک مخصوص مرتبے کی قائل ہے لیکن اسلام نے راہ خدا کے شہداء کو جو احترام دیا ہے وہ بے نظیر ہے۔ ذیل میں ایک مثال پیش کی جارہی ہے جو اسلام کی نظر میں احترام شہداء کا ایک واضح نمونہ ہے۔ اسلام کی اپنی تعلیمات کی وجہ سے ایک مختصر سی پسماندہ جماعت میں ایسی قوت و طاقت آگئی جس نے دنیا کے عظیم ترین شاہی نظاموں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا۔ مذکورہ روایت یہ ہے:

امام علی بن موسیٰ رضا علیہما السلام امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں:

> ایک مرتبہ آنحضرتؑ خطبہ دے رہے تھے اور لوگوں کو جہاد کا شوق دلا رہے تھے۔ اس دوران میں ایک نوجوان کھڑا ہو گیا۔ اس نے عرض کیا: اے امیرالمومنینؑ! مجھ سے راہ خدا میں جنگ کرنے والوں کی فضیلت بیان فرمائیے۔ امام نے جواب میں فرمایا: ایک دفعہ میں پیغمبر خدا کی سواری پر آپؐ کے پیچھے سوار تھا۔ ہم جنگ ذات السلاسل سے واپس آرہے تھے۔ یہی سوال جو تو نے مجھ سے کیا ہے میں نے رسول اللہ سے کیا، تو آپؐ نے فرمایا: جب مجاہد میدان جہاد میں شرکت کا پختہ ارادہ کرلیتے ہیں تو خداوند عالم جہنم سے آزادی ان کے لیے مقدر کر دیتا ہے اور جب وہ ہتھیار اٹھا کر میدان جنگ کا رخ کرتے ہیں تو ملائکہ ان پر فخر کرتے ہیں اور جب ان کی بیوی بچے، عزیز و اقارب انہیں الوداع کہتے ہیں تو وہ اپنے گناہوں سے آزاد ہو جاتے ہیں..... پھر وہ جو بھی کام کرتے ہیں اس کا اجر دوگنا ہو جاتا ہے اور ہر دن کے بدلے ان کے لیے ہزار عابد کی عبادت کا اجر لکھا جاتا ہے اور جب وہ دشمن کے آمنے سامنے ہوتے ہیں تو پورے عالم کے لوگ ان کے میزان ثواب کا اندازہ نہیں کرسکتے اور جب وہ میدان جنگ میں قدم رکھتے ہیں، نیزہ و تیر کا تبادلہ ہونے لگتا ہے اور پھر دست بدست لڑائی شروع ہو جاتی ہے تو فرشتے اپنے پر و بال سے انہیں گھیر لیتے ہیں اور خدا سے میدان میں ان کی ثابت قدمی کی دعا کرتے ہیں۔ اس وقت ایک منادی آواز دیتا ہے: الجنة تحت ظلال السیوف (یعنی جنت تلواروں کے سائے میں ہے)۔ اس وقت شہید کے جسم پر دشمن کے وار زیادہ آسان اور گرمیوں میں ٹھنڈا

پانی پینے سے زیادہ خوشگوار ہوتے ہیں اور جب شہید اپنی سواری سے نیچے گرتا ہے تو زمین تک پہنچنے سے پہلے حوران بہشت اس کے استقبال کو آتی ہیں اور اسے ان تمام عظیم روحانی و مادی نعمتوں کی خبر دیتی ہیں جو خدا تعالیٰ نے اس کے لیے فراہم کر رکھی ہیں اور جب شہید زمین پر گرجاتا ہے تو زمین کہتی ہے، آفرین ہے پاکیزہ روح کے لیے جو پاکیزہ بدن سے پرواز کر رہی ہے، تیرے لیے خوشخبری ہے، ان لك ما لا عين رأت ولا اذن سمعت ولا خطر على قلب بشر (یعنی تیرے انتظار میں ایسی نعمتیں ہیں جنہیں کسی آنکھ نے نہ دیکھا ہے نہ کسی کان نے ان کے بارے میں سنا ہے اور نہ کسی دل میں ان کا خیال آیا ہے)۔ نیز خدا فرماتا ہے: میں اس کے پس ماندگان کا سرپرست ہوں، جو کوئی انہیں خوش کرے گا اس نے مجھے خوش کیا اور جو انہیں ناراض کرے گا اس نے مجھے ناراض اور غضب ناک کیا[1]

۱۷۲۔ اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝

۱۷۳۔ اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا ۖۗ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ ۝

۱۷۴۔ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِیْمٍ ۝

ترجمہ

۱۷۲ جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی خدا اور رسول کی دعوت کو قبول کیا (اور ابھی اُن کے جنگ اُحد کے زخم تازہ تھے کہ وہ حمراء الاسد کے میدان کی طرف چل پڑے) ان میں سے نیک عمل کرنے والوں اور تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لیے اجر عظیم ہے۔

۱۷۳ وہ ایسے اشخاص تھے جن سے (بعض) لوگوں نے کہا کہ (لشکر دشمن کے) افراد نے تم پر (حملہ کرنے کے لیے) اکٹھ کر لیا ہے ان سے ڈرو لیکن ان کا ایمان اور زیادہ ہو گیا اور وہ کہنے لگے کہ خدا ہمارے لیے کافی ہے اور وہ ہمارا بہترین حامی ہے۔

---

[1] یہ اس روایت کا خلاصہ ہے جو عظیم اسلامی مفسر مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں درج کی ہے۔

۱۷۴ اسی وجہ سے وہ (اس میدان سے) پروردگار کی نعمت و فضل کے ساتھ اس عالم میں لوٹے کہ انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچی اور انہوں نے اللہ کی خوشنودی کی اتباع کی اور اللہ تو بڑا صاحبِ فضل ہے۔

تفسیر

غزوہ حمراء الاسد

ہم کہہ چکے ہیں کہ جنگ اُحد کے اختتام پر ابوسفیان کا فاتح لشکر بڑی تیزی سے مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ روحاء کے مقام پہنچے تو اپنے کیے پر بہت پشیمان ہوئے اور انہوں نے مدینہ کی طرف لوٹنے اور باقی ماندہ مسلمانوں کو نابود کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ اطلاع پیغمبر اکرمؐ کو پہنچی تو آپؐ نے فوراً حکم دیا کہ جنگ اُحد میں شریک ہونے والا لشکر دوسری جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ آپؐ نے یہ حکم خصوصیت سے دیا کہ جنگ اُحد کے زخمی بھی لشکر کی صفوں میں جا شامل ہوں۔ ایک صحابی کہتے ہیں:

> میں بھی زخمیوں میں سے تھا لیکن میرے بھائی کے زخم مجھ سے زیادہ شدید تھے۔ ہم نے ارادہ کر لیا کہ جو بھی حالت ہو ہم پیغمبر اسلام کی خدمت میں پہنچیں گے۔ میری حالت چونکہ میرے بھائی سے کچھ بہتر تھی، جہاں میرا بھائی نہ چل پاتا میں اُسے کندھے پر اٹھا لیتا۔ بڑی تکلیف سے ہم لشکر تک جا پہنچے پیغمبر اکرمؐ اور لشکر اسلام "حمراء الاسد" کے مقام پر پہنچ گئے اور وہاں پڑاؤ ڈالا۔ یہ جگہ مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھی۔

یہ خبر جب لشکر قریش تک پہنچی خصوصاً جب انہوں نے مقابلے کے لیے ایسی آمادگی دیکھی کہ زخمی بھی میدان جنگ میں پہنچ گئے ہیں تو وہ پریشان ہو گئے اور شاید انہیں یہ فکر بھی لاحق ہوئی کہ مدینے سے تازہ دم فوج ان سے آملی ہے۔

اس موقع پر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کے دلوں کو اور کمزور کر دیا اور ان میں مقابلے کی ہمت نہ رہی۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک مشرک جس کا نام معبد خزاعی تھا مدینہ سے مکہ کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے پیغمبر اکرمؐ اور ان کے اصحاب کی کیفیت دیکھی تو انتہائی متاثر ہوا۔ اس کے انسانی جذبات میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے پیغمبر اکرمؐ سے عرض کیا: آپ کی یہ حالت و کیفیت ہمارے لیے بہت ہی ناگوار ہے، آپ آرام کرتے تو ہمارے لیے بہتر ہوتا۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل پڑا اور روحاء کے مقام پر ابوسفیان کے لشکر سے ملا۔ ابوسفیان نے اس سے پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں سوال کیا تو اس نے جواب میں کہا: میں نے محمد (ص) کو دیکھا ہے کہ وہ ایسا عظیم لشکر لیے ہوئے تمہارا تعاقب کر رہے ہیں جس جیسا لشکر اس سے پہلے میں نے نہیں دیکھا اور وہ تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

ابوسفیان نے اضطراب اور پریشانی کے عالم میں کہا: تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہم نے انہیں قتل کیا، زخمی کیا اور منتشر کر کے رکھ دیا تھا۔

معبد خزاعی نے کہا: میں نہیں جانتا کہ تم نے کیا کیا ہے، میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ ایک عظیم اور کثیر لشکر اس وقت تمہارا تعاقب کر رہا ہے۔

ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ وہ تیزی سے پیچھے ہٹ جائیں اور مکہ کی طرف پلٹ جائیں اور اس مقصد کے لیے

کہ مسلمان ان کا تعاقب نہ کریں اور انہیں پیچھے ہٹ جانے کا کافی موقع مل جائے۔ انہوں نے قبیلہ عبدالقیس کی ایک جماعت سے خواہش کی کہ وہ پیغمبر اسلام اور مسلمانوں تک یہ خبر پہنچا دیں کہ ابوسفیان اور قریش کے بت پرست باقی ماندہ اصحاب پیغمبر کو ختم کرنے کے لیے ایک عظیم لشکر کے ساتھ تیزی سے مدینہ کی طرف آ رہے ہیں۔ یہ جماعت گندم خریدنے کے لیے مدینہ جا رہی تھی جب یہ اطلاع پیغمبر اسلام اور مسلمانوں تک پہنچی تو انہوں نے کہا: حسبنا اللّٰہ و نعم الوکیل (خدا ہمارے لیے کافی ہے اور وہ ہمارا بہترین حامی اور مدافع ہے)۔

انہوں نے بہت انتظار کیا لیکن دشمن کے لشکر کی کوئی خبر نہ ہوئی۔ لہٰذا تین روز توقف کے بعد وہ مدینہ کی طرف لوٹ گئے۔ مندرجہ بالا آیات اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں[1]

الذین استجابوا للّٰہ والرسول من بعد ما اصابھم القرح ۛ للذین احسنوا منھم واتقوا اجر عظیم۔

جنہوں نے خدا اور پیغمبر کی دعوت قبول کی اور جنگ احد میں اٹھائے گئے زخموں کے باوجود دشمن سے دوسری جنگ کے لیے آمادہ ہو گئے ان میں سے نیک عمل کرنے والوں اور تقویٰ اختیار کرنے والوں یعنی پاکیزہ نیت اور خلوص کامل سے میدان میں شرکت کرنے والوں کے لیے اجر عظیم ہے۔

زیر نظر آیت میں ایک گروہ کے لیے اجر عظیم مخصوص کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی کچھ ایسے افراد تھے جو مکمل طور پر مخلص نہ تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ منھم (ان میں سے بعض) اس طرف اشارہ ہو کہ احد کے جنگجو لوگوں میں سے بعض کسی بہانے سے اس میدان سے کنارہ کش ہو گئے۔

اس کے بعد قرآن نے ان کی پامردی و استقامت کی ایک درخشاں نشانی کا یوں تذکرہ کیا ہے: الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم ایمانا ۖ وقالوا حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل ———— یعنی یہ وہی لوگ تھے جنہیں کچھ لوگوں نے (قبیلہ عبدالقیس کے لوگ یا ایک روایت کے مطابق نعیم بن مسعود جو خبر لائے تھے) کہا کہ دشمن کی فوج جمع ہو گئی ہے اور وہ حملہ کرنے کو تیار ہے، ان سے ڈرو لیکن وہ نہ صرف یہ کہ ڈرے نہیں بلکہ اس کے برعکس ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے کہا خدا ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین حامی ہے۔

اس استقامت، ایمان اور زبردست پامردی کے تذکرے کے بعد قرآن ان کے عمل کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: فانقلبوا بنعمۃ من اللّٰہ و فضل ——— یعنی وہ اس میدان سے اللہ کے فضل و نعمت کے ساتھ لوٹے۔ نعمت و فضل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا کہ دشمن سے کسی خطرناک ٹکراؤ کے بغیر ہی دشمن ان سے بھاگ گیا اور یہ صحیح سالم بغیر کوئی زحمت اٹھائے مدینہ پلٹ آئے۔

فضل و نعمت میں ممکن ہے یہ فرق ہو کہ نعمت استحقاق کے طور پر اجرت کے مفہوم میں ہو اور فضل استحقاق سے بڑھ کر اور اس پر اضافہ ہو۔

---

[1] نورالثقلین، مجمع البیان، المنار اور دیگر کتب۔

اس کے بعد تاکید کے طور پر ہے لم یمسسہم سوء — یعنی انہیں اس واقعہ میں تھوڑی سی تکلیف بھی نہیں پہنچی جبکہ واتبعوا رضوان اللہ خوشنودیٔ خدا ان کے ہاتھ آئی انہوں نے فرمانِ خدا کی اتباع کی واللہ ذو فضل عظیم اور خدا کے پاس عظیم فضل و انعام ہے جو حقیقی مومنین اور سچے مجاہدین کے انتظار میں ہے۔

تربیت الٰہی کی فوری تاثیر

جنگ احد اور واقعہ حمراء الاسد جس کی تفصیل گزر چکی ہے، ان دونوں مواقع پر مسلمانوں کے جذبے کا موازنہ کیا جائے تو انسان کو تعجب ہوتا ہے کہ ایک شکست خوردہ جماعت جس کے جذبے بلند نہ تھے، تعداد کافی نہ تھی اور جس میں بہت سے زخمی بھی موجود تھے اتنی تھوڑی سی مدت میں جو شاید چوبیس گھنٹے بھی نہ بنتی تھی اس کی حالت اتنی بدل کر وہ عزم راسخ اور جلے ولولے اور جذبے کے ساتھ دشمن کے تعاقب پر آمادہ ہو گئی یہاں تک کہ قرآن ان لوگوں کے متعلق کہتا ہے جب انہیں اطلاع ملی کہ دشمن نے ان پر حملے کے لیے لشکر کر لیا ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ ڈرے نہیں بلکہ ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور ان کی استقامت میں اضافہ ہو گیا۔ دراصل یہ ہدف و مقصد پر ایمان رکھنے کی خاصیت ہے کہ انسان پر مشکلات و مصائب جس قدر بڑھیں اور وہ انہیں زیادہ قریب سے دیکھے اس کی پامردی و استقامت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ درحقیقت ایسے میں اس کی تمام روحانی و مادی قوتیں خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے مجتمع ہو جاتی ہیں۔ ایک چھوٹی سی جماعت میں یہ عجیب و غریب تغیر انسانی تربیت کرنے والی آیاتِ قرآن اور پیغمبر اسلام کے موثر و دل آویز ارشادات کی فوری اور گہری تاثیر کا غماز ہے اور یہ بات بذاتِ خود ایک معجزے سے کم نہیں۔

۱۷۵۔ إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ○

ترجمہ

۱۷۵۔ یہ صرف شیطان ہی ہے جو اپنے پیروکاروں کو (بے بنیاد باتوں اور افواہوں کے ذریعے) ڈراتا ہے۔ ان سے نہ ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو اگر ایمان رکھتے ہو۔

تفسیر

یہ آیت غزوہ حمراء الاسد کے بارے میں نازل ہونے والی آیات کا ضمیمہ ہے۔ لفظ "ذٰلکم" ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں کو فوجِ قریش کی طاقت سے ڈراتے تھے تاکہ ان کے دلوں کو کمزور کریں۔ اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہے کہ نعیم بن مسعود یا کاروانِ عبدالقیس کا عمل فقط ایک شیطانی عمل ہے جو شیطان کے دوستوں کو ڈرانے کے لیے ہے یعنی ایسے وسوسے صرف شیطان کے دوستوں پر ہی اثر انداز ہوتے ہیں لیکن اہلِ ایمان اور ثابت قدم لوگ ایسے وسوسوں سے کبھی اثر نہیں لیتے۔ اس بناء پر جب شیطان

کے پیرو نہیں ہو تو تمہیں ان وسوسوں سے متزلزل نہیں ہونا چاہیے۔

نعیم بن مسعود یا کاروان عبدالقیس کو اس لیے شیطان قرار دیا گیا ہے کیونکہ ان کا عمل واقعاً شیطانی تھا اور یہ اس کے الہام اور وسوسے سے ظہور پذیر ہوا تھا۔ قرآن واحادیث میں بری ریے اور غلط کام کو شیطانی عمل قرار دیا گیا ہے چونکہ ایسے ہر کام کا انجام شیطانی وسوسوں کا سا ہے۔

یا شیطان سے مراد خود وہی اشخاص ہیں اور یہ ان مواقع میں سے ایک ہے جہاں لفظ شیطان اپنے انسانی مصداق کے لیے استعمال ہوتا ہے کیونکہ شیطان کا ایک وسیع معنی ہے اور اس کے مفہوم میں تمام گمراہ کرنے والے شامل ہیں، وہ انسان ہوں یا غیر انسان۔ جیسا کہ سورہ انعام آیہ ۱۱۲ میں ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ

یعنی — اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانی اور جناتی شیطانوں میں سے دشمن قرار دیے ہیں۔

وخافون ان کنتم مومنین — آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ اگر ایمان رکھتے ہو تو مجھ سے اور میرے حکم کی نافرمانی سے ڈرو یعنی ایمان اور غیر خدا کا خوف ان دونوں کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ہے:

فَمَنْ يُّؤْمِنْ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا

یعنی — جو شخص اپنے پروردگار پر ایمان لے آتا ہے وہ کسی نقصان اور طغیان سے نہیں ڈرتا۔ (جن — ۱۳)

اس بنا پر اگر کسی دل میں غیر خدا کا خوف پیدا ہو تو یہ ایمان کے کامل نہ ہونے کی دلیل ہے اور شیطانی وسوسوں کے نفوذ کی نشانی ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس بے کنار عالم ہستی میں پناہ گاہ صرف خدا ہے اور صرف وہی موثر بالذات ہے اور اس کی قدرت کے مقابلے میں کسی کی کوئی قدرت نہیں۔

اصولی طور پر مومنین اپنے ولی یعنی خدا کا مشرکین ومنافقین کے ولی یعنی شیطان سے موازنہ کریں تو یہ بات ان پر قطعاً واضح ہو جائے گی کہ خدا کے مقابلے میں اُس کی کچھ قدرت وطاقت نہیں ہے۔ اس لیے اہلِ ایمان کو معمولی سی پریشانی بھی نہیں ہونی چاہیے۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں کہیں ایمان نفوذ کر جاتا ہے لازمی طور پر وہاں جرأت وشجاعت بھی نفوذ کرتی ہے۔

۱۷۶۔ وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○

۱۷۷۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۱۷۶۔ جو لوگ راہِ کفر میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں وہ تمہیں غمگین نہ کردیں کیونکہ وہ ہرگز خدا کو نقصان نہیں پہنچا سکتے (علاوہ ازیں) خدا چاہتا ہے (کہ انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دے اور اس کے نتیجے میں) آخرت میں ان کا کوئی حصہ قرار نہ دے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔

۱۷۷۔ جنہوں نے ایمان کے بدلے کفر خریدا ہے وہ خدا کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تفسیر

پیغمبر کے لیے تسلی

و لا یحزنک الذین یسارعون فی الکفر

اس آیت میں روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہے۔ اُحد کے دردناک واقعہ کے بعد خدا تعالیٰ نے انہیں تسلی دی کہ اے پیغمبر! یہ جو تم دیکھتے ہو کہ راہِ کفر میں ایک گروہ دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے درپے ہے تو اس سے غمگین و محزون نہ ہونا، وہ خدا کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے (انھم لن یضروا اللہ شیئًا) بلکہ وہ خود اس راہ میں نقصان اٹھائیں گے۔ اصولی طور پر نفع و ضرر اور سود و زیاں ایسے موجودات کے لیے ہے جن کا وجود خود ان سے نہیں ہے لیکن خداوند ازلی و ابدی جو ہر لحاظ سے بے نیاز ہے اور اس کا وجود غیر محدود ہے، لوگوں کا کفر و ایمان اور سعی و کاوش اس کے لیے کیا اثر رکھتی۔ جبکہ لوگوں کا ایمان ان کے اپنے تکامل و ارتقا کا باعث ہے اور کفر کی وجہ سے وہ خود تنزل و سقوط کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔

یرید اللہ الا یجعل لھم حظا فی الاخرۃ و لھم عذاب عظیم

خدا چاہتا ہے کہ اس راہ میں انہیں آزاد رکھے اور وہ اتنی تیزی سے راہ کفر طے کریں کہ آخرت میں تھوڑا سا حصہ بھی نہ پائیں بلکہ عذاب عظیم ان کے انتظار میں ہو۔

درحقیقت آیت کہتی ہے کہ اگر وہ لوگ راہ کفر میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرتے ہیں تو اس کی یہ وجہ نہیں کہ خدا ان کی گرفت نہیں کر سکتا بلکہ خدا نے تو انہیں آزادیٔ عمل دے رکھی ہے وہ جو کچھ کر سکتے ہیں کریں اور اس کا نتیجہ نعماتِ اخروی سے ان کی محرومی ہے۔ اس بناء پر نہ صرف یہ کہ آیت جبر پر دلالت نہیں کرتی بلکہ آزادیٔ ارادہ کی ایک دلیل ہے۔

بعد والی آیت میں بات کو وسعت دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے، ان الذین اشتروا الکفر بالایمان لن یضروا اللہ شیئا یعنی راہ کفر پر تیزی سے جانے والے ہی ایسے نہیں بلکہ وہ تمام لوگ جو ایمان ہاتھ سے دے کر راہِ کفر اختیار کیے ہوئے ہیں اور ایمان کے بدلے کفر خرید چکے ہیں وہ ہرگز خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے بلکہ اس کا نقصان خود انہی کو پہنچے گا۔ آیت کے آخر میں خدا تعالیٰ

لوٹاتا ہے۔ و لھم عذاب الیم — ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

یہاں "عذاب الیم" ہے جبکہ گذشتہ آیت میں "عذاب عظیم" آیا ہے۔ تعبیر کا یہ فرق اس بنا پر ہے کہ پہلی آیت میں جن کا ذکر ہے وہ کفر کے راستے میں زیادہ تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

۱۷۸۔ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِأَنْفُسِهِمْ ۚ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ○

ترجمہ

۱۷۸۔ جو کافر ہو گئے ہیں (اور انہوں نے راہ سرکشی اختیار کی ہے) وہ یہ خیال نہ کریں کہ اگر ہم انہیں مہلت دیتے ہیں تو یہ ان کے نفع میں ہے۔ ہم تو مہلت انہیں اس لیے دیتے ہیں کہ وہ زیادہ گناہ کریں اور ان کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔

تفسیر

جن پر بھاری بوجھ ہے

ولا یحسبن الذین کفروا انما نملی لھم[1]

گذشتہ آیت میں دشمنان حق کی بہت زیادہ سعی و کوشش کے ضمن میں رسول اکرمؐ کو تسلی دی گئی ہے اور ان کی دل جوئی کی گئی ہے اب اس آیت میں روئے سخن دشمنوں کی طرف ہے۔ اس میں انہیں مدد پہلی بار حق کے بارے میں گفتگو ہے۔ یہ آیت درحقیقت جنگ احد اور اس کے بعد کے واقعات سے مربوط مباحث کی تکمیل کرتی ہے کیونکہ ایک جگہ روئے سخن نبی کریمؐ کی طرف تھا، دوسرے مقام پر مومنین کی طرف اور اب اس جگہ مشرکین مخاطب ہیں۔

مندرجہ بالا آیت مشرکین کو تنبیہ کرتی ہے اور انہیں ڈراتی ہے کہ وہ خدا کے عطا کردہ وسائل کبھی کبھار مل جانے والی کامیابیوں اور آزادیٔ عمل کو اس بات کی دلیل قرار نہ دیں کہ وہ صالح افراد ہیں اور جو کچھ وہ کرتے ہیں صحیح ہے یا یہ ان کے لیے خوشنودیٔ خدا کی نشانی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ گناہوں سے کم آلودہ گنہگاروں کو تیز بیداری کے ذریعے متوجہ کرتا ہے، کبھی ان اعمال کے عکس العمل کے ذریعے بیدار کرتا ہے اور یا کبھی ان سے سرزد ہونے والے اعمال کی مناسب سزاؤں کے ذریعے بیدار کرتا ہے اور اس طرح انہیں راہ حق کی طرف واپس لاتا ہے۔ یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ابھی ہدایت کی

---

[1] "نملی" کا معنی ہے "مدد کرنا" لیکن بہت سے مواقع پر یہ لفظ مہلت دینے کے معنی میں بھی آتا ہے، جبکہ مہلت خود ایک قسم کی مدد ہے یہاں یہ لفظ مہلت کے معنی میں ہی ہے۔

اہمیت رکھتے ہیں اور لطف الٰہی کے حامل ہیں۔ حقیقت میں، مصائب، مشکلات اور تکالیف و زحمات ایسے لوگوں کے لیے نعمت شمار ہوتی ہیں۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

ظہر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقہم بعض الذی عملوا لعلہم یرجعون

خشکی اور سمندر میں تباہی و خرابیاں لوگوں کے اعمال کا نتیجہ ہے تاکہ خدا ان کے بعض اعمال کا مزہ انہیں چکھائے شاید اس طرح یہ لوگ پلٹ آئیں۔ (روم - ۴۱)

لیکن وہ لوگ جو گناہ و عصیان میں غرق ہو جائیں یا طغیان و سرکشی اور نافرمانی کے آخری مرحلے تک جا پہنچیں، خدا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ اصطلاح میں یوں کہا جاتا ہے کہ انہیں ڈھیل دے دیتا ہے کہ ان کی کمر بار گناہ سے بوجھل ہو جائے اور وہ زیادہ سے زیادہ سزا کے مستحق ہو جائیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پیچھے کے تمام پل تباہ کر دیے ہیں، واپس پلٹنے کے لیے ان کے پاس کوئی راستہ نہیں رہا، حیا و شرم کا پردہ چاک کر چکے ہیں اور سعادت مند زندگی کی اہلیت بالکل کھو چکے ہیں۔

مندرجہ بالا آیت اس مفہوم کی تاکید کرتے ہوئے کہتی ہے: جو کافر ہو گئے ہیں وہ یہ گمان نہ کریں کہ ہم نے انہیں جو مہلت دی ہے وہ ان کے فائدے میں ہے۔ ہم انہیں مہلت اس لیے دیتے ہیں تاکہ وہ گناہوں میں اضافہ کریں اور ان کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔

دنیائے اسلام کی عظیم خاتون حضرت زینب کبریٰ علیہا السلام نے شام کی جابر و ظالم حکومت کے دربار میں یزید کے سامنے جو خطبہ دیا اس میں اسی آیت سے استدلال کیا۔ یزید نشہ فتح میں ناقابل برداشت گفتگو کر رہا تھا۔ خطبہ میں آپ نے فرمایا:

تو اس زعم میں ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ چونکہ تو نے وسیع زمین ہم پر تنگ کر دی ہے اور آسمان کے کناروں کو ہم پر بند کر دیا ہے اور قیدیوں کی طرح ہمیں دیار بدیار پھرا رہا ہے اس لیے یہ تیری قدرت و طاقت کی نشانی ہے اور یا خدا کے ہاں تیری قدر و منزلت ہے اور ہمارے لیے اس کے ہاں کوئی وقعت نہیں۔ یہ سب تیرا اشتباہ ہے۔ یہ مہلت اور آزادی خدا نے تجھے اس لیے دی ہے تاکہ تیری پشت بار گناہ سے بھاری ہو جائے اور دردناک عذاب تیرے انتظار میں ہے۔ خدا کی قسم اگر حوادث زمانہ مجھے ایک قیدی عورت کی شکل میں تیرے پایۂ تخت میں لے آئے ہیں تو اس سے یہ خیال مت کر کہ میری نظر میں تمہاری کوئی تھوڑی سی بھی حیثیت یا قدر و قیمت ہے۔ میں تجھے چھوٹا، پست، ہر لحاظ سے حقیر اور ملامت، سرزنش اور دھتکار کا مستحق سمجھتی ہوں۔ جو کچھ تجھ سے ہو سکتا ہے کر لے۔ خدا کی قسم تو ہمارے نور کو خاموش نہیں کر سکتا۔ تو وحی جاوداں اور ہمارے آئین حق کو محو نہیں کر سکتا۔ تو نابود ہو جائے گا اور یہ تابناک ستارہ یونہی چمکتا رہے گا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہ سوال بہت سے ذہنوں میں موجود ہے کہ بہت سے ستمگر، گنہگار اور آلودہ دامن لوگ اس طرح نعمات میں کیوں مستغرق ہیں اور

انہیں سزا کیوں نہیں ملتی۔ زیر نظر آیت سے ضمنی طور پر اس کا جواب بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ ایسے لوگ ہیں جو قابل اصلاح نہیں اور انہیں سنت آفرینش اور آزادی ارادہ و اختیار کے اصول کے مطابق ان کی حالت پر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ یہ سقوط کے آخری مرحلے تک پہنچ جائیں اور زیادہ سے زیادہ سزا کے مستحق ہو جائیں۔

علاوہ ازیں قرآن کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات خدا ایسے لوگوں کو فراواں نعمتیں دیتا ہے اور جب وہ کامیابی اور مسرت کی لذت میں غرق ہوتے ہیں تو اچانک تمام چیزیں ان سے چھین لیتا ہے تاکہ اسی دنیا میں زیادہ سے زیادہ عذاب اور سزا کا مزہ چکھ لیں کیونکہ ایک دم خوشحال زندگی کا چھن جانا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

فلما نسوا ما ذکروا به فتحنا علیهم ابواب کل شیء حتی اذا فرحوا بما اوتوا اخذناهم بغتة فاذا هم مبلسون

جب انہوں نے وہ نصیحتیں جو انہیں کی گئی تھیں فراموش کر دیں، تو ہم نے ہر اچھائی اور خیر کے دروازے ان کے لیے کھول دیے تاکہ وہ خوش ہو جائیں پھر اچانک جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا تھا واپس لے لیا لہٰذا وہ انتہائی تکلیف اور غم میں مبتلا ہو گئے۔ (انعام۔ ۴۴)

درحقیقت ایسے اشخاص ان لوگوں کی طرح ہیں جو ظلم و تشدد سے کسی درخت پر چڑھ جاتے ہیں، وہ جتنا اوپر جاتے ہیں زیادہ خوش ہوتے ہیں یہاں تک کہ وہ درخت کی چوٹی پر جا پہنچتے ہیں۔ اچانک سخت آندھی آتی ہے جو انہیں اوپر سے نیچے گرا دیتی ہے جس سے ان کی سب ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔

ایک ادبی نکتہ

آیت کی تفسیر میں ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ لیزدادوا اثما میں لام "لام عاقبت" ہے نہ کہ لام غایت، اس کی وضاحت یہ ہے کہ بعض اوقات حرف لام عربی لغت میں ایسے موقع پر آتا ہے جو انسان کو محبوب و مطلوب ہو۔ مثلاً:

لتخرج الناس من الظلمٰت الی النور

ہم نے قرآن تمہاری طرف اس لیے بھیجا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکی سے روشنی کی طرف دعوت دو۔ (ابراہیم ۱)

واضح ہے کہ لوگوں کی ہدایت خدا کو محبوب و مطلوب ہے۔ لیکن کبھی لام حرف ایسی جگہ بھی استعمال ہوتا ہے جو انسان کی ہدف غرض اور پسند نہ ہو بلکہ اس کے عمل کا نتیجہ ہو۔ مثلاً

لیکون لهم عدوا وحزنا

فرعون کے ساتھیوں نے موسیٰ کو پانی میں سے اٹھالیا تاکہ انجام کار وہ ان کا دشمن ہو جائے۔ (قصص ۔ ۸)

یہ بات مسلم ہے کہ فرعون کے ساتھیوں نے موسیٰ کو پانی سے اس لیے نہیں اٹھایا تھا کہ وہ کل کو ان کا دشمن ہو جائے لیکن یہ سب ان کے کام کا نتیجہ تھا۔ یہ دونوں تعبیریں نہ صرف ادبیات عرب میں بلکہ باقی زبانوں میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

یہاں سے ایک اور سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ خدا نے کیوں کہا ہے کہ لیزدادوا اثما وہ چاہتے ہیں کہ ان کے

گناہ زیادہ ہوں) یہ اعتراض اس صورت میں ہو سکتا تھا جب لام "لام علت" ہوتا اور یہ ہدف و غرض کے طور پر ہوتا اور "لام عاقبت" کے طور پر نہ ہوتا اور نتیجے کے لیے نہ ہوتا۔ اس بناء پر آیت کا معنی یوں ہوگا، ہم انہیں مہلت دیتے ہیں، ان کا انجام یہ ہے کہ ان کی پشت بارگناہ سے بوجھل ہو جائے۔ لہٰذا یہ آیت نہ صرف یہ کہ جبر کی دلیل نہیں بلکہ اختیار و ارادے کی آزادی کی دلیل ہے۔

۱۷۹۔ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَي الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ○

ترجمہ

۱۷۹۔ ممکن نہ تھا کہ خدا مومنین کو اسی شکل میں چھوڑ دیتا جس میں تم ہو مگر یہ کہ ناپاک کو پاک سے جدا کر دے۔ نیز (یہ بھی) ممکن نہ تھا کہ خدا تمہیں مخفی رازوں سے آگاہ کرے (کہ اس طرح تم علم غیب کے ذریعے مومنین اور منافقین میں تمیز کرنے لگے کیونکہ یہ طریقہ سنتِ الٰہی کے خلاف ہے) لیکن خدا اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا چن لیتا ہے (اور کچھ مخفی رازوں پر انہیں مطلع کرتا ہے جو ان کی رہبری کے لیے ضروری ہوتے ہیں) پس (اب جب کہ یہ دنیا پاک اور ناپاک میں تمیز کے لیے کٹھالی ہے) خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آؤ اگر تم ایمان لے آئے اور تم نے تقویٰ اختیار کر لیا تو تمہارے لیے اجرِ عظیم ہوگا۔

تفسیر

مسلمانوں کی تطہیر

واقعۂ اُحد سے پہلے منافقین کا موضوع مسلمانوں میں زیرِ بحث نہیں آیا تھا اسی لیے وہ زیادہ تر کفار ہی کو اپنا دشمن سمجھتے تھے لیکن اُحد کی شکست کے بعد سچے مسلمانوں کی وقتی کمزوری اور منافقین کی کارکردگی کے لیے زمین ہموار ہو جانے پر انہیں سمجھ آیا کہ ان کے اور بھی خطرناک دشمن ہیں جن پر کڑی نگاہ رکھنا پڑے گی۔ یہ خطرناک دشمن منافق تھے۔ جنگ اُحد کے نتائج میں سے یہ ایک اہم تجربہ تھا۔

زیرِ نظر آیت جو اس مقام پر واقعہ اُحد کے سلسلے کی آخری آیت ہے اس حقیقت کو ایک عمومی قانون کی صورت میں بیان کرتے ہوئے کہتی ہے: ما کان اللہ لیذر المؤمنین علی ما انتم علیه حتی یمیز الخبیث من الطیب — ممکن نہیں کہ خدا مومنین کو اسی حالت میں رہنے دے جس میں تم ہو اور ان کی تطہیر نہ کرے اور طیب کو خبیث سے ممتاز نہ کردے۔ یہ حکم سب کے لیے

ایک جیسا اور ہوتی ہے۔ پروردگار کی ایک دائمی سنت ہے کہ جو شخص ایمان کا دعویٰ کرے اور مسلمانوں میں مل جل کر رہنے لگے اسے اس کی حالت پر چھوڑا نہیں جائے گا بلکہ پے در پے آزمائشوں سے آخرکار اس کے اندرونی راز فاش ہو جائیں گے۔

ممکن تھا یہاں یہ سوال کیا جاتا (اور بعض روایات کے مطابق کچھ مسلمانوں نے یہ سوال کیا بھی) کہ وہ خدا جو سب کے مخفی اسرار سے آگاہ ہے اس کے لیے کیا امکان ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی کیفیت سے آگاہ کرے اور علم غیب کے ذریعے مومن اور منافق میں تمیز کر دی جائے۔

آیت کا دوسرا حصہ اسی سوال کا جواب ہے جس میں فرمایا گیا ہے: وما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب۔ یعنی خدا تمہیں پوشیدہ راز اور علم غیب نہیں دے گا کیونکہ مخفی اسرار پر آگاہی عام لوگوں کے خیالات کے برعکس مشکل کو حل نہیں کرتی بلکہ بہت سے مواقع پر ان کے عیاں ہو جانے سے ہرج مرج کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اجتماعی کڑیاں [illegible] ٹوٹ جاتی ہیں اور عام لوگ ایک دوسرے کو بالکل چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ لوگوں کی قسمت کا تعین ان کی کارکردگی کے حوالے سے ہونا چاہیے [illegible] اس کے باوجود جیسا کہ بعد والے استثنا میں بیان کیا گیا ہے: ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء۔

لہٰذا جب ایسا ہے تو [illegible] علم غیب [illegible] اسرار کی آگاہی [illegible] لوگوں کی ہدایت [illegible] اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] آگاہ ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ [illegible] غیب سے آگاہ ہو سکتے ہیں [illegible] کی مشیت سے وابستہ ہے۔

یہ نکتہ بھی واضح ہے کہ اس آیت میں بھی مشیت سے مراد دیگر آیات کی طرح وہی ارادہ ہے جس میں حکمت و مصلحت کا ملحوظ ہوتی ہے یعنی خدا جسے اہل سمجھتا ہے اور اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے اسے اسرار غیب سے آگاہ کر دیتا ہے۔

فامنوا باللہ ورسلہ وان تؤمنوا وتتقوا فلکم اجر عظیم۔

آیت کے آخر میں یہ بات ذہن نشین کروائی گئی ہے کہ یہ زندگی ایک آزمائش ہے، اس میں پاک اور ناپاک کو جدا جدا کر دیا جاتا ہے اور مومن و منافق میں تمیز کی جاتی ہے تو پھر تم اس آزمائش کی کٹھالی سے اچھی طرح سے نکل آؤ اور خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لے آؤ لیکن صرف ایمان لانے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ فرماتا ہے: اگر ایمان لے آؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو عظیم اجر و ثواب تمہارے انتظار میں ہے۔

آیت میں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ مومن کو طیب (پاکیزہ) قرار دیا گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں پاکیزہ اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنی پہلی خلقت پر برقرار ہے اور خارجی چیزیں اسے خبیث اور ناپاک نہ کریں۔ پاکیزہ پانی، پاکیزہ کپڑا اور دیگر اشیاء تب پاکیزہ ہیں جب انہیں خارجی آلودگی کے عوامل نہ لگیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان انسان کی پہلی فطرت ہے۔

۱؎ ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع ۔۔۔ (بقرہ۔ ۱۵۵) کی تفسیر میں خدا کی آزمائشوں کے تذکرے میں اس بات کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے کہ خدا کی آزمائشیں ایک طرح کی تربیت ہیں نہ کہ خدا ان کے ذریعے علم حاصل کرتا ہے۔ مزید وضاحت کے لیے مذکورہ آیت کی تفسیر دیکھیے۔

۱۸۰۔ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝

ترجمہ

۱۸۰۔ جو بخل کرتے ہیں اور خدا نے اپنے فضل و کرم سے جو کچھ دیا ہے خرچ نہیں کرتے وہ یہ گمان نہ کریں کہ یہ ان کے لیے کوئی اچھی چیز ہے بلکہ یہ ان کے لیے بُری چیز ہے۔ بہت جلدی روزِ قیامت جس کے بارے میں انہوں نے بخل کیا وہی چیز طوق کی طرح ان کی گردن میں ڈال دی جائے گی اور آسمانوں اور زمین کی میراث خدا کے لیے ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

تفسیر

قید و بند کا بھاری طوق

ولا یحسبن الذین یبخلون بما اٰتٰھم اللّٰہ

زیرِ نظر آیت میں قیامت کے دن بخیلوں کے انجام کی وضاحت کی گئی ہے۔ بخیل جو مال جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں اور دولت و ثروت کی حفاظت میں کوشاں رہتے ہیں لیکن اسے بندگانِ خدا پر خرچ کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔

آیت میں اگرچہ واجب مالی حقوق کا نام نہیں لیا گیا لیکن روایاتِ اہلِ بیتؑ میں اور اقوالِ مفسرین میں اسے مانعین زکوٰۃ سے مخصوص قرار دیا گیا ہے اور آیت میں جس قدر شدت دکھائی دیتی ہے وہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے مراد مستحب انفاق اور خرچ کرنا نہیں۔ فرمایا گیا ہے: جو لوگ بخل کرتے ہیں اور خدا نے جو اپنے فضل و کرم سے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ نہیں کرتے وہ یہ گمان نہ کریں کہ یہ ان کے نفع میں ہے بلکہ یہ تو ان کے نقصان میں جا پڑتا ہے۔ پھر قیامت میں ان کے انجام کا تذکرہ ہے: سیطوقون ما بخلوا بہ یوم القیٰمۃ — جن اموال میں وہ بخل کرتے ہیں بہت جلد انہیں طوق بنا کر ان کی گردن میں ڈال دیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس مال سے واجب حقوق ادا نہیں کیے گئے اور معاشرے کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ فضولیات کی نذر ہو گیا ہے اور بعض اوقات احمقانہ امور میں خرچ ہو گیا ہے اور یا بلا وجہ اسے جمع کر کے رکھ دیا گیا اور اس سے کسی نے فائدہ نہیں

بنیادی طور پر دیگر اعمال انسانی کی طرح تجسیم اعمال کے قانون کے مطابق روزِ قیامت مجسم ہوگا اور دردناک صورت عذاب کا ذریعہ بن کر آئے گا۔

ایسا مال طوق کی شکل میں مجسم ہوگا اور گردن میں ڈالا جائے گا۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اس کا تمام تر بوجھ اٹھانے کا ذمہ دار ہے اگرچہ اس نے اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ کیا ہو۔ وہ زیادہ مال جو جنون کی حد تک کوشش سے جمع کیا جائے اور اس کی حفاظت کی جائے مگر وہ معاشرے کی خدمت کے لیے نہ ہو وہ اپنے مالک کے لیے زنجیر اور زندان کے سوا کچھ نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے مال سے معین حد تک ہی فائدہ اٹھاتا ہے لیکن حد سے گزر جائے تو ایک طرح کی قید اور بے کار بوجھ کے سوا اس کا کوئی تعبیر نہیں مگر یہ کہ اس کی روحانی برکات سے فائدہ حاصل کیا جائے اور اسے مثبت کاموں پر خرچ کیا جائے۔ ایسا مال نہ فقط روزِ قیامت اپنے مالک کے لیے ایک بھاری طوق بنے گا بلکہ اس دنیا میں بھی ایسا ہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ فرق ہے کہ قیامت میں آشکار ہوگا اور اس دنیا میں انتہائی مخفی ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر جنون اور حماقت کیا ہوگی کہ انسان مال کے حساب کتاب، حفاظت اور بچاؤ کے لیے دردِ سر، مشکلیں اٹھانے کے علاوہ مال حاصل کرنے کی بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھائے لیکن اس سے اسے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو۔

کیا قید و بند کا طوق اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟

تفسیر عیاشی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

جو شخص اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا خدا اس مال کو آگ کے طوقوں میں بدل دے گا۔ اس کے بعد کہا جائے گا کہ جیسے دنیا میں تو اس مال کو کسی صورت اپنے سے دور نہیں کرتا تھا اب بھی اسے اٹھائے اور اپنی گردن میں ڈال لے۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ آیت میں مال کو ما اتٰھم اللہ من فضلہ کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام اموال اور دولت کے پیداواری ذرائع کا حقیقی مالک خدا ہے۔ جو کچھ کسی کو دیا گیا ہے یہ اس کا فضل و کرم ہے۔ اس لیے یہ گنجائش نہیں کہ کوئی شخص اس مال و دولت کو مالکِ حقیقی کی راہ میں خرچ کرنے سے بخل کرے۔ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس جملے کا مفہوم عام ہے اور اس میں تمام نعماتِ الٰہی یہاں تک کہ علم و دانش بھی شامل ہے لیکن یہ احتمال آیت کے ظاہری مفاہیم پر منطبق نہیں ہوتا۔

اس کے بعد آیت ایک اور نکتے کی طرف اشارہ کرتی ہے: وللہ میراث السمٰوٰت والارض — یعنی یہ مال راہِ خدا میں اور بندگانِ خدا کے لیے خرچ ہو یا نہ ہو آخر کار اپنے مالکوں سے جدا ہو جائیں گے اور خدا تمام آسمانوں اور زمین کی میراثوں کا وارث ہے۔ جب ایسا ہی ہے تو پھر کیا ہی اچھا ہے کہ ان اموال کے جدا ہونے سے پہلے ان کی معنوی و روحانی برکات سے فائدہ اٹھایا جائے نہ کہ ان کی حسرت اور ذمہ داری کا بوجھ اٹھایا جائے۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہے: خدا تمہارے اعمال سے آگاہ ہے۔ بخل کرو گے تو بھی وہ جانتا ہے اور اگر انسانی معاشرے کے مفاد میں نیک کام انجام دو گے تو بھی اسے معلوم ہے اور وہ ہر شخص کو اس کے حسب حال اجر دے گا۔ واللہ بما تعملون خبیر۔

۱۸۱۔ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝

۱۸۲۔ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝

ترجمہ

۱۸۱ خدا نے ان لوگوں کی بات سُنی ہے جو کہتے ہیں کہ خدا فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے ہم لکھ دیں گے اور اسی طرح ان کا پیغمبروں کو ناحق قتل کرنا بھی (ہم نے لکھ رکھا ہے) اور ہم انہیں کہیں گے کہ جلانے والا عذاب چکھو۔

۱۸۲ یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی آگے بھیجی ہوئی کمائی ہے اور خدا (اپنے) بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

شانِ نزول

یہ آیات یہودیوں کی سرزنش کے لیے نازل ہوئی ہیں۔

ابن عباس کہتے ہیں:

پیغمبر اکرمؐ نے بنی قینقاع کے یہودیوں کو خط لکھا۔ اس میں انہیں نماز ادا کرنے، زکوٰۃ دینے اور خدا کو قرض[1] دینے کی دعوت دی گئی۔

آنحضرتؐ کا قاصد اس گھر میں گیا جو یہودیوں کی مذہبی تعلیم و تدریس کا مرکز تھا اس کا نام بیت المدارس تھا۔ قاصد نے یہ خط یہودیوں کے سب سے بڑے عالم فنحاص کے ہاتھ میں دیا۔ اس نے خط پڑھنے کے بعد طنزیہ لہجے میں کہا: اگر تمہاری باتیں سچی ہیں تو پھر یہ کہنا چاہیے کہ خدا فقیر ہے اور ہم غنی ہیں کیونکہ اگر وہ فقیر نہ ہوتا تو ہم سے قرض کی خواہش نہ کرتا[2] علاوہ ازیں محمد (ص) کا اعتقاد ہے کہ خدا نے تمہیں سود کھانے سے منع کیا ہے حالانکہ وہ خود تمہارے انفاق اور خرچ کرنے کے بدلے ربا اور سود کا وعدہ کرتا ہے[3]

بعد میں فنحاص نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ اس نے یہ باتیں کہی ہیں۔ اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں[4]

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: خدا نے یہودیوں کی کفر آمیز باتیں سُنیں، وہ کہتے تھے کہ خدا فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ اب گروہ لوگوں کے سامنے انکار کرتے ہیں مگر خدا کے سامنے تو انکار نہیں کر سکتے کہ وہ سب باتوں کو سنتا ہے، وہ آواز کی ان کمزور ترین اور قوی ترین سب لہروں کو سُنتا ہے جن کے ادراک سے انسانوں کے کان عاجز ہیں (لقد سمع اللّٰه قول الذين قالوا ان اللّٰه فقير و نحن اغنياء) ـــ اس لیے ان کا انکار کرنا فضول ہے۔

---

[1] خدا کو قرض دینے سے مراد راہ خدا میں خرچ کرنا ہے۔ یہاں قرض کا لفظ انسانوں کے جذبوں کو متحرک کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

[2] یہ اشارہ ہے آیہ من ذا الذی يقرض اللّٰه قرضا حسنا کی طرف۔ (حدید - ۱۱)

[3] آیہ يربي الصدقات کی طرف اشارہ ہے۔ (بقرہ - ۲۷۶)

[4] اسباب النزول از واقدی، صفحہ ۹۹ اور تفسیر روح البیان زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

اس سے مزید فرمایا، سنکتب ما قالوا — یعنی نہ صرف یہ کہ ہم ان کی باتیں سنتے ہیں ان سب کو لکھتے بھی ہیں۔ واضح ہے کہ لکھنے سے مراد ہماری طرح کاغذ پر لکھنا نہیں ہے بلکہ مراد آثارِ عمل کی حفاظت کرنا ہے۔ قانون بقائے مادہ کی ترمیم کے مطابق مادہ ختم نہیں ہوتا لیکن توانائی (ENERGY) میں بدل سکتا ہے اور یوں باقی رہتا ہے۔ اسی طرح فرشتگانِ خدا کا لکھنا بھی حفاظتِ عمل کی ایک قسم ہے جو ہر قسم کی کتابت سے بالاتر ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ ان کی ایسی کفر آمیز باتوں ہی کو نہیں لکھا جاتا بلکہ وہ جو انبیاء و مرسلین کو قتل کرتے رہے ہیں اسے بھی ثبت کیا گیا ہے (وقتلہم الانبیاء)۔ یعنی یہودیوں کی طرف سے انبیاء کا مقابلہ کرنا اور ان کے سامنے صف آراء ہونا کوئی نئی چیز نہیں یہ پہلی مرتبہ کسی پیغمبر کا مذاق نہیں اڑا رہے بلکہ اپنی طویل تاریخ میں ایسے بہت سے جرائم کا ارتکاب کر چکے ہیں۔ وہ لوگ کہ جن کی جسارت اس حد تک پہنچ گئی ہو کہ وہ انبیاء کو قتل کر دیں ان کے لیے کونسی تعجب کی بات ہے کہ وہ ایسی کفر آمیز باتیں اپنی زبان پر لائیں۔

ممکن ہے کہا جائے کہ قتل انبیاء کا تعلق پیغمبر اسلامؐ کے زمانے سے تو نہیں تھا لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ یہ نسبت اس بناء پر ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے کاموں پر راضی تھے۔ اس لیے اس جوابدہی میں شریک تھے۔

باقی رہا ان کے اعمال ثبت کیے جانے اور ان کے اعمال کی نگرانی کا مسئلہ تو یہ بے وجہ نہیں ہے بلکہ یہ تو اس لیے ہے تاکہ روزِ قیامت یہ سب ان کے سامنے رکھ دیا جائے اور ہم ان سے کہیں کہ اس وقت اپنے اعمال کا نتیجہ جلانے والے عذاب کی شکل میں چکھو (وذوقوا عذاب الحریق)۔

یہ دردناک عذاب جس کی اس وقت تم تلخی چکھ رہے ہو خود تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ تم ہی تھے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا، خدا کسی پر ظلم نہیں کرے گا ذٰلک بما قدمت ایدیکم و ان اللہ لیس بظلام للعبید — اصولی طور پر اگر تم جیسے ظالم اپنے اعمال کا بدلہ نہ پائیں اور وہ بھی نیک لوگوں کی صف میں کھڑے کیے جائیں تو یہ انتہائی ظلم ہے اور اگر خدا ایسا کرے تو وہ ظلام یعنی بہت زیادہ ظلم کرنے والا ہوگا۔ نہج البلاغہ میں حضرت امیر المومنین علیؑ سے منقول ہے:

وایم اللّٰہ ما کان قوم قط فی خفض نعمۃ من عیش فزال عنہم الا بذنوب اجترحوھا لان اللّٰہ لیس بظلام للعبید۔

خدا کی قسم نعمت یافتہ گروہ سے اس وقت تک نعمت نہیں چھینی گئی جب تک وہ گناہوں کا مرتکب نہیں ہوا۔

(اس کے بعد امام علیہ السلام نے قرآن کا یہی جملہ بطور سند پیش کیا کہ) لان اللّٰہ لیس بظلام للعبید (کیونکہ خدا اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا اور کسی نعمت کے اہل شخص سے نعمت سلب نہیں کرتا)۔

یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو ایک طرف سے جبریوں کے مذہب کی نفی کرتی ہیں اور دوسری طرف افعال کے معاملے میں عدالت کا عمومی اصول بیان کرتی ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ زیر نظر آیت صراحت سے کہتی ہے کہ خدا کی طرف سے ہر سزا اور ماجرا ان اعمال کی وجہ سے ہے جو لوگ اپنے قصد و ارادے سے انجام دیتے ہیں۔ ذٰلک بما قدمت ایدیکم یعنی یہ ان کاموں کے سبب ہے جنہیں تمہارے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں[1]

حاشیہ بر صفحہ آئندہ

دوسری طرف زیرِ بحث آیت صراحت سے کہتی ہے کہ خدا کبھی ظلم نہیں کرتا اور اس کی سزا کا قانون عدالت مطلقہ کے محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ عدلیہ اسی چیز کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ شیعہ اور اہلِ سنت کا ایک گروہ جسے معتزلہ کہتے ہیں۔ عدل کے قائل ہیں۔ ان کے مقابلے میں اہلِ سنت کا دوسرا گروہ جسے اشاعرہ کہتے ہیں، اس کا اس سلسلے میں عجیب و غریب عقیدہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اصولی طور پر خدا کے بارے میں ظلم کا تصور ہی نہیں ہو سکتا اور وہ جو کام انجام دے عین عدالت ہے یہاں تک کہ اگر تمام نیک لوگوں کو جہنم میں اور تمام ظالموں کو بہشت میں لے جائے تو بھی اس نے کوئی ظلم نہیں کیا اور کوئی شخص اس میں چوں وچرا نہیں کر سکتا۔

زیرِ نظر آیت میں ایسے عقائد کو قطعی طور پر رد کر دیا گیا ہے۔ آیت کہتی ہے کہ اگر خدا کچھ افراد کو غلط کام کیے بغیر سزا دے تو وہ ظالم بلکہ ظلام ہو گا۔ لفظ ظلام مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے بہت ظلم کرنے والا۔

خدا تو کم سے کم ظلم نہیں کرتا پھر یہاں اس لفظ کا استعمال شاید اس بناء پر ہو کہ اگر وہ لوگوں کو کفر و گناہ پر مجبور کرے اور جبر کے عوامل پر ابھارنے والے امور ان میں پیدا کرے پھر ان اعمال کے جرم میں جو انہوں نے مجبوراً انجام دیے ہیں انہیں سزا دے تو یہ چھوٹا سا ظلم نہیں ہو گا بلکہ اس طرح تو وہ ظلام (بہت زیادہ ظلم کرنے والا) ہی قرار پائے گا۔

۱۸۳۔ اَلَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَیْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِیْ بِالْبَیِّنٰتِ وَ بِالَّذِیْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○

۱۸۴۔ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ ○

ترجمہ

۱۸۳ (یہ) وہی (ہیں) جنہوں نے کہا کہ خدا نے ہم سے پیمان لیا ہے کہ ہم کسی پیغمبر پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ (معجزہ کے طور پر) ایسی قربانی نہ کرے جسے (آسمانی) آگ کھا جائے۔ ان سے کہیے کہ پھر تم نے مجھ سے پہلے آنے والے انبیاء کو کیوں قتل کیا اگر تم سچے ہو جبکہ وہ واضح دلائل اور جو کچھ تم کہتے ہو سے کر آئے تھے۔

۱۸۴ پس اگر یہ (بہانہ تراش) تیری تکذیب کرتے ہیں (تو یہ کوئی نئی بات نہیں) یہ تم سے پہلے پیغمبروں کی (بھی) تکذیب کر چکے

حاشیہ از صفحہ سابقہ۔ ۱؎ افعال کی نسبت ہاتھوں کی طرف اس لیے دی گئی ہے کیونکہ بیشتر کام ہاتھوں سے انجام پاتے ہیں لیکن یہ حکم ہاتھ کے اعمال سے مخصوص نہیں اسی لیے تو کہتے ہیں کہ فلاں کام اس کے ہاتھ سے انجام پایا ہے حالانکہ ہو سکتا ہے کہ کام میں اس کے ہاتھ کا کوئی دخل نہ ہو۔

ہیں جبکہ وہ (پیغمبر) واضح دلائل، متین و محکم تحریریں اور ضیا بخش کتاب لائے تھے۔

شانِ نزول

یہودیوں کے چند سرکردہ افراد پیغمبر اکرمؐ کے پاس حاضر ہوئے اور کہنے لگے: تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ خدا نے تمہیں ہماری طرف بھیجا ہے اور تم پر کتاب بھی نازل کی ہے حالانکہ خدا نے توراۃ میں ہم سے یہ عہد لیا ہے کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے ہم اس پر ایمان نہ لائیں مگر شرط یہ ہے کہ وہ ہمارے سامنے ایک جانور کی قربانی کرے اور آسمان سے (صاعقہ کی صورت میں) آگ آئے جو اسے جلا دے، اگر تم ایسا کر دکھاؤ تو ہم تم پر ایمان لے آئیں گے۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں۔

تفسیر

یہودیوں کی بہانہ تراشی

الذین قالوا ان اللہ عھد الینا......

قبولِ اسلام سے بچنے کے لیے یہودی عجیب و غریب بہانے تراشتے تھے۔ ان میں سے ایک کی طرف زیرِ نظر آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ کہتے تھے: خدا نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم کسی پیغمبر کی دعوت اس وقت تک قبول نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ کرے جسے آسمان سے آگ آکر اچک لے۔

مفسرین کہتے ہیں یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ انبیاءِ الٰہی اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لیے لازمی طور پر اس مخصوص معجزے کے حامل ہوتے ہیں کہ وہ جانور ذبح کرتے ہیں اور آسمانی بجلی کے ذریعے وہ لوگوں کے سامنے جل جاتا ہے۔

یہودی یہ فرمائش اگر واقعاً ایک معجزے کے لیے کرتے نہ کہ ہٹ دھرمی اور بہانہ سازی کے طور پر تو ایک بات تھی لیکن ان کی گذشتہ تاریخ اور پیغمبرِ اسلامؐ سے ان کی کشمکشیں واضح طور پر یہ حقیقت ثابت کرتی ہیں کہ ان کا مقصد ہرگز تحقیقِ حق نہ تھا بلکہ وہ معاشرتی دباؤ اور واضح قرآنی استدلالات سے فرار کے لیے نت نئی تجویزیں پیش کرتے رہتے تھے اور اگر ان کی کوئی تجویز زیرِ عمل آ بھی جاتی تب بھی وہ ایمان نہیں لاتے تھے۔ وہ تو اپنی کتب میں پیغمبرِ اسلامؐ کی سب نشانیاں پڑھ چکے تھے پھر بھی قبولِ حق سے گریزاں تھے۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: قل قد جاءکم رسل من قبلی بالبینات وبالذی قلتم فلم قتلتموھم ان کنتم صٰدقین — یعنی ان بہانہ تراشوں کے جواب میں ان سے کہیے کہ مجھ سے پہلے بنی اسرائیل کے کئی انبیاء آئے، وہ اپنے ساتھ واضح نشانیاں بھی لائے یہاں تک کہ انہوں نے اس طرح سے قربانی بھی تمہارے سامنے کی، اگر تم سچے ہو تو پھر ان پر ایمان کیوں نہیں لائے اور انہیں کیوں قتل کیا (حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ اور چند دیگر انبیاءِ بنی اسرائیل کی طرف اشارہ ہے جو ان کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے)۔

بعض متاخرین تفسیر نگار حضرات مثلاً تفسیر المنار کے مؤلف قربانی کے مسئلے کے بارے میں ایک اور احتمال ذکر کرتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ کوئی جانور ذبح ہو اور آگ معجزانہ طور پر آسمان سے آکر اسے جلائے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ ان کے مذہبی احکامات میں قربانی کی ایک قسم جلی ہوئی قربانی کی تھی۔ اس کے مطابق وہ ایک جانور ذبح کرتے تھے اور خاص رسوم کے مطابق اسے آگ لگا دیتے تھے (ان مراسم کی تفصیل تورات سفر لاویان کی پہلی فصل میں موجود ہے)۔ ان کا دعویٰ تھا کہ خدا نے ہم سے عہد لیا ہے کہ جلی ہوئی قربانی کا یہ حکم ہر آسمانی دین میں ہوگا اور چونکہ دین اسلام میں یہ نہیں ہے لہٰذا ہم تم پر ایمان نہیں لاتے۔

لیکن یہ احتمال تفسیر آیت میں بہت بعید ہے کیونکہ اول تو اس لفظ کا عطف بینات پر ہے کہ ان کا مقصود ایک معجزانہ کام ہے جو کہ اس تفسیر پر منطبق نہیں ہوتا دوسرا یہ کہ ایک جانور ذبح کر کے جلا دینا ایک فضول کام ہے اور ایسا کام انبیاء کے لائے ہوئے آسمانی احکامات میں سے نہیں ہو سکتا۔

فان کذبوك فقد کذب رسل من قبلك

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو تسلی دیتا ہے اور ان کی دلجوئی کرتا ہے کہ اگر یہ لوگ آپ کی باتیں نہیں مانتے تو آپ پریشان نہ ہوں کیونکہ ایسا پہلے بھی بہت دفعہ ہو چکا ہے۔ آپ سے پہلے کئی پیغمبر آئے ہیں جن کی انہوں نے تکذیب کی ہے۔

جاءوا بالبینات والزبر والکتاب المنیر

جبکہ ان انبیاء کے پاس واضح نشانیاں بھی تھیں، وہ آشکار معجزے بھی لائے تھے (البینات)، محکم و بلند مرتبہ کتب بھی ان کے پاس تھیں (الزبر) اور وہ ضیاء بخش کتابوں کے بھی حامل تھے (الکتاب المنیر)۔ توجہ رہے کہ زبر، زبور کی جمع ہے جس کا معنی ہے ایسی کتاب جو استحکام اور پختگی سے لکھی گئی ہو کیونکہ یہ مادہ در اصل لکھنے کے معنی میں ہے لیکن اس سے ہر طرح کا لکھنا مراد نہیں بلکہ ایسا لکھنا جس میں استحکام ہو۔ باقی رہی یہ بات کہ "الزبر" اور "المنیر" میں کیا فرق ہے، جبکہ دونوں الفاظ کتاب کے بارے میں ہیں، تو ممکن ہے یہ اس وجہ سے ہو کہ پہلا لفظ ان انبیاء کی کتب کے بارے میں ہو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے تھے اور دوسرا لفظ تورات و انجیل کے بارے میں ہو کیونکہ قرآن نے سورہ مائدہ آیت ۴۴ و ۴۶ میں ان کے لیے لفظ "نور" استعمال کیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

انا انزلنا التورٰة فیها هدی ونور

اور دوسری آیت ہے:

واتیناه الانجیل فیه هدًی ونور

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ زبور آسمانی کتب کے صرف اس حصے کو کہتے ہیں جو وعظ و نصیحت پر مشتمل ہو لیکن آسمانی کتاب یا کتاب منیر کتب کے اس حصول کو کہتے ہیں جن میں انفرادی و اجتماعی قوانین ہوں (جیسا کہ موجودہ زبور جو حضرت داؤد کی طرف منسوب ہے تمام کی تمام ہی وعظ و نصیحت ہی ہے)۔

۱۸۵۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝

ترجمہ

۱۸۵ ہر شخص موت کا ذائقہ چکھتا ہے اور تم روزِ قیامت اپنا اجر مکمل طور پر حاصل کرو گے پس جو لوگ (جہنم کی) آگ کی زد سے دُور رہے اور بہشت میں داخل ہو گئے وہ سعادت سے ہمکنار ہوئے اور حیاتِ دنیا سرمایۂ فریب کے سوا کچھ نہیں۔

تفسیر

موت کا اٹل قانون

مخالفین اور بے ایمان لوگوں کی ہٹ دھرمی کے تذکرے کے بعد اس آیت میں موت کے عمومی قانون کا تذکرہ ہے اور قیامت میں لوگوں کے انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تاکہ اس سے پیغمبر اکرمؐ اور مومنین کی دلجوئی بھی ہو جائے اور گناہ پیشہ مخالفین کو تنبیہ بھی ہو۔ پہلے تو آیت میں ایک ایسے قانون کا تذکرہ ہے جو اس عالم کے تمام زندہ موجودات پر حاکم ہے۔ فرمایا: تمام زندہ چیزیں چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے ایک دن موت کا مزہ چکھیں گی (کل نفس ذائقة الموت)۔

اگرچہ بہت سے لوگ چاہتے ہیں کہ وہ یہ بھول جائیں کہ وہ فنا پذیر ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر ہم اسے فراموش بھی کر دیں تب بھی وہ ہمیں نہیں بھلائے گی۔ اس دنیا کی زندگی آخر کار ختم ہو جائے گی اور ایک دن ایسا آئے گا جب موت ہر شخص کی تلاش میں آئے گی اور پھر مجبوراً اس جہان سے رختِ سفر باندھنا پڑے گا۔

اس آیت میں "نفس" سے مراد جسم و جان کا مجموعہ ہے اگرچہ بعض اوقات قرآن میں "نفس" صرف روح کے لیے استعمال ہوا ہے۔ چکھنا یہاں احساس کامل کی طرف اشارہ کر رہا ہے کیونکہ بعض اوقات انسان کوئی غذا آنکھ سے دیکھتا ہے یا ہاتھ سے چھوتا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی مکمل احساس پیدا نہیں کرتا لیکن چکھنے سے مکمل احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ گویا کارگہِ خلقت میں بالآخر موت ہی ہر موجودِ زندہ کے لیے ایک طرح کی غذا ہے۔

وانما توفون اجورکم یوم القیٰمة

پھر فرمایا کہ اس دنیا کی زندگی کے بعد جزا و سزا کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ یہاں عمل ہے جزا کے بغیر اور وہاں جزا ہے عمل کے بغیر "توفون" کا معنی ہے "مکمل وصولی"۔ یہ لفظ نشاندہی کرتا ہے کہ روزِ قیامت انسان کو پورے طور پر جزا دی جائے گی۔ اس بنا پر اس میں کوئی مانع نہیں کہ عالم برزخ میں بھی انسان اپنے اعمال کے کچھ نتائج اور جزا کا سامنا کرے گا کیونکہ برزخ کی جزا و سزا مکمل نہیں ہے۔

فمن زحزح عن النار وادخل الجنة فقد فاز۔

"زحزح" کا اصل معنی ہے "انسان کا اپنے تئیں کسی چیز کی قوتِ کشش سے آہستہ آہستہ نکالنا" اور "فاز" کا اصل معنی ہے "ہلاکت سے نجات اور محبوب تک رسائی"۔

زیرِ نظر جملے میں فرمایا گیا ہے: جو لوگ آتشِ جہنم کے دائرۂ کشش سے دُور ہوں گے اور بہشت میں داخل ہوں گے وہ نجات یافتہ

ہوں گے اور اپنے محبوب و مطلوب کو پالیں گے۔

گویا دوزخ اپنی پوری قوت سے انسانوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جو عوامل انسان کو دوزخ کی طرف کھینچتے ہیں ان میں عجیب و غریب قوت جذب موجود ہوتی ہے۔ کیا تیز رو ہوس رانیاں، غیر مشروع جنسی لذتیں، جاہ و منصب اور ناجائز دولت و ثروت انسان کے لیے قوت جاذبہ نہیں رکھتیں؛

اس تعبیر سے ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر لوگ کوشش نہ کریں اور ان پر فریب عوامل کی قوت جاذبہ سے دور نہ ہوں تو آہستہ آہستہ ان کی طرف کھینچے جائیں گے۔ لیکن جو لوگ تعلیم و تربیت کے ذریعے اپنے اوپر تدریجاً کنٹرول پا لیتے ہیں اور نفس مطمئنہ کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں تو وہ حقیقی نجات یافتہ لوگوں میں شمار ہوتے ہیں اور امن و اطمینان کا لطف اٹھاتے ہیں۔

وما الحیوة الدنیا الا متاع الغرور

یہ جملہ گذشتہ بحث کی تکمیل کرتا ہے۔ اس میں فرمایا گیا ہے کہ حیات دنیا تو فقط غرور آمیز متاع ہے۔ یہ زندگی اور اس کے سرگرم عوامل دور سے بہت پر فریب ہیں لیکن جب انسان اسے پا لیتا ہے اور اسے قریب سے چھو لیتا ہے تو عملی طور پر اسے اندر سے خالی چیز نظر آتی ہے اور متاع غرور کا بھی بس یہی مفہوم ہے۔

علاوہ ازیں مادی لذتیں دور سے تو خالص دکھائی دیتی ہیں لیکن جب انسان ان کے قریب جاتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ یہ طرح طرح کے رنج و الم سے آلودہ ہیں۔ یہ بھی مادی دنیا کے فریبوں میں سے ایک فریب ہے۔ اسی طرح عموماً انسان ان کی فنا پذیری کی طرف بھی توجہ نہیں کرتا لیکن بہت جلد اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کس قدر جلدی زائل اور فنا ہونے والی ہیں۔

یہ تعبیرات قرآن و احادیث میں بارہا آئی ہیں اور ان سب کا ہدف ایک ہی ہے کہ انسان عالم مادہ اور اس کی لذات کو اپنا آخری ہدف و مقصد قرار نہ دے کیونکہ اس کے نتیجے میں تو انسان طرح طرح کے جرائم اور گناہوں میں غرق ہو جاتا ہے اور انسانی تکامل و ارتقاء کی حقیقت سے دور ہو جاتا ہے لیکن مادی دنیا اور اس کی نعمات سے اس حوالے سے استفادہ کرنا کہ یہ تکمیل بشریت کا ذریعہ ہیں نہ صرف مذموم و قبیح نہیں بلکہ لازم اور ضروری ہے۔

۱۸۶۔ لَتُبْلَوُنَّ فِيٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۚ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝

ترجمہ

۱۸۶ یہ طے شدہ ہے کہ تمہارے اموال اور تمہاری جانوں کے ذریعے تمہاری آزمائش کی جائے گی اور جن لوگوں (یعنی یہودیوں) کو تم سے پہلے آسمانی کتاب دی گئی ہے اور اسی طرح جنہوں نے شرک کی راہ اختیار کر رکھی ہے ان سے

تم بہت سی تکلیف دہ اور آزار رساں باتیں سنو گے اور اگر تم نے صبر و استقامت اور تقویٰ اختیار کیا (کہ جو تمہارے لیے زیادہ مناسب ہے) تو یہ پر عزم اور قابلِ اطمینان امور میں سے ہے۔

شان نزول

جب مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی اور اپنے گھر اور کاروبار سے دُور ہو گئے تو مشرکین نے ان کے اموال کی طرف دستِ تجاوز دراز کیا اور انہیں اپنے زیرِ تصرف لے آئے اور جو شخص بھی ان کے ہاتھ لگا اسے زبانی اور جسمانی اذیت پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

دوسری طرف جب مسلمان مدینہ آئے تو وہاں پر انہیں یہودیوں کی بدگوئی اور آزار رسانی کا سامنا کرنا پڑا۔ خاص طور پر ان میں سے ایک بدزبان اور کینہ پرور شاعر تھا۔ اس کا نام کعب بن اشرف تھا۔ وہ مسلسل پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں کی ہجو کرتا تھا اور مشرکین کو ان کے خلاف اُبھارتا تھا۔ یہاں تک کہ مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کے بارے میں غزل سرائی اور عشق بازی سے نہیں چوکتا تھا۔ اس کی بے حیائی اور گستاخی آخر اس حد تک پہنچ گئی کہ پیغمبر اکرمؐ نے مجبوراً اس کے قتل کا حکم صادر کر دیا اور وہ مسلمانوں کے ہاتھوں فی النار والسقر ہو گیا۔

مفسرین کی نقل کردہ روایات کے مطابق مندرجہ بالا آیت انہی موضوعات کی طرف اشارہ کرتی ہے اور مسلمانوں کو مقابلہ جاری رکھنے کے لیے شوق دلاتی ہے۔

تفسیر

مقابلے اور پامردی سے تھک نہ جاؤ

لتبلون فی اموالکم و انفسکم

جان و مال کے ذریعے تمہارا امتحان لیا جائے گا اور اصولی طور پر یہ دنیا تو میدانِ آزمائش ہی ہے اور اپنے آپ کو سخت اور ناگوار حوادث و مشکلات کے مقابلے میں آمادہ رکھے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ درحقیقت یہ سب مسلمانوں کے لیے ایک تنبیہ ہے اور آمادہ رہنے کے لیے تلقین ہے تاکہ وہ یہ گمان نہ کریں کہ سخت حوادث ان کی زندگی سے ختم ہو چکے ہیں اور یا کعب بن اشرف جیسے بدگو، بدزبان اور فتنہ پرور شاعر کے خاتمے سے دشمن کی طرف سے کوئی اذیت یا زبان کا زخم نہیں پہنچے گا۔

اسی لیے فرمایا: و لتسمعن من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم و من الذین اشرکوا اذی کثیرا۔

یعنی یہ بات طے شدہ ہے کہ تم آئندہ بھی اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔

دشمن سے ناروا باتیں سننا ان آزمائشوں کا حصہ ہے جن کا ذکر آیت کے ابتدائی حصے میں کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود یہاں اس کا

ذکر خصوصیت سے ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ زبان کے چرکے حساس اور شریف انسانوں کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں جیسا کہ مشہور ہے کہ تلوار کے زخم تو بھر جاتے ہیں لیکن زبان کے زخم مندمل نہیں ہوتے۔

وان تصبروا وتتقوا فان ذلك من عزم الامور

یہاں شدید اور المناک حوادث کے موقع پر مسلمانوں کی ذمہ داری بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، اگر استقامت اور پامردی سے کام لو، صابر و بردبار رہو، تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرو تو یہ ایسے کام ہیں جن کا نتیجہ واضح ہے۔ لہٰذا ہر عقلمند آدمی کو ایسا کرنے کا مصمم ارادہ کر لینا چاہیے۔

لغت میں "عزم" کا معنی ہے "پختہ ارادہ"۔ بعض اوقات ہر محکم و مضبوط چیز کو عزم کہا جاتا ہے اس لیے عزم الامور کا معنی ہے شائستہ اور مناسب کام، جن کی انجام دہی کے لیے انسان کو مصمم ارادہ کر لینا چاہیے یا پھر اس کا مطلب ہے ہر قسم کے محکم اور قابلِ اطمینان کام۔

صبر اور تقویٰ کا آیت میں ایک ساتھ ذکر آیا ہے۔ یہ گویا اس طرف اشارہ ہے کہ بعض افراد استقامت و پامردی کے باوجود ناشکری کا اظہار کرتے ہیں اور زبانِ شکایت کھولے رکھتے ہیں لیکن حقیقی مومن وہ ہیں جو سہارا استقامت کے ساتھ تقویٰ و پرہیزگاری کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور ناشکری اور شکوہ و شکایت سے دور رہتے ہیں۔

۱۸۷۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ○

ترجمہ

۱۸۷۔ اور وہ وقت (یاد کرو) جب خدا نے اہلِ کتاب سے میثاق لیا کہ اسے لوگوں کے سامنے لازمی طور پر آشکار کریں اور چھپائیں نہیں لیکن انہوں نے اسے پسِ پشت ڈال دیا اور اسے تھوڑی سی قیمت پر فروخت کر دیا، انہوں نے کیسی بُری متاع خریدی۔

تفسیر

واذ اخذ اللّٰه میثاق الذین اوتوا الکتٰب لتبیننه للناس و لا تکتمونه

اہلِ کتاب کی چند غلط کاریوں کے تذکرے کے بعد اس آیت میں ان کے ایک اور بُرے کام کی نشاندہی کی گئی ہے اور وہ ہے حقائق کو چھپانا۔ فرمایا گیا ہے: وہ وقت نہ بھول جاؤ جب خدا نے اہلِ کتاب سے پیمان لیا کہ وہ آیاتِ الٰہی کو لوگوں کے سامنے آشکار کریں اور انہیں ہرگز نہ چھپائیں۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ لفظ "لتبیننہ" میں اگرچہ لامِ قسم اور نونِ تاکیدِ ثقیلہ موجود ہے جس سے انتہائی تاکید ظاہر ہوتی ہے پھر "ولا تکتمونہ" کہہ کر مزید تاکید کی گئی ہے جس میں نہ چھپانے کا حکم ہے۔ ان تمام تعبیرات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے گزشتہ انبیاء کے ذریعے ان سے اس بات پر نہایت تاکیدی عہد لیا کہ وہ حقائق کو بیان کریں گے لیکن ان تمام امور کے باوجود انہوں نے خدا سے باندھے گئے عہد و پیمان میں خیانت کی اور آسمانی کتب کے حقائق کو چھپایا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے: فنبذوہ وراء ظهورهم۔ یعنی انہوں نے کتابِ خدا کو پسِ پشت ڈال دیا۔ یہ جملہ عمل نہ کرنے اور اسے فراموش کر دینے کے بارے میں عمدہ کنایہ ہے کیونکہ جس پروگرام پر انسان کے عمل کا دارومدار ہوتا ہے اسے وہ اپنے سامنے رکھتا ہے اور اسے دیکھتا رہتا ہے لیکن اگر وہ اس پر عمل نہ کرنا چاہے اور اسے فراموش کر دینا چاہے تو سامنے سے اٹھا کر اسے پس پشت ڈال دیتا ہے۔

واشتروا به ثمنا قليلا فبئس ما يشترون۔

یہ جملہ ان کی شدید دنیا پرستی اور فکری انحطاط کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ فرمایا گیا ہے: اس کام کے بدلے انہوں نے حقیر سی قیمت حاصل کی اور یہ تجارت کیسی بُری ہے جو انہوں نے حاصل کی ہے۔ اگر انہوں نے اخفائے حق کے اس جرم کے بدلے بہت بڑی قیمت حاصل کی ہوتی تو یہ کہا جاتا کہ کثرتِ مال و ثروت نے ان کی آنکھ کو اندھا اور کان کو بہرہ کر دیا لیکن تعجب تو اس بات پر ہے کہ انہوں نے یہ سب کچھ متاعِ قلیل کے بدلے بیچ دیا ہے (البتہ اس جملے سے پست ہمت علماء کا کام مراد ہے)۔

علماء کی عظیم ذمہ داری

مندرجہ بالا آیت اگرچہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کے علماء کے بارے میں ہے لیکن حقیقت میں تمام مذہبی علماء کو اس میں تنبیہ کی گئی ہے کہ ان کی ذمہ داری ہے کہ فرامینِ الٰہی اور معارفِ دینی واضح کرنے کی کوشش کریں اور خدا تعالیٰ نے ان سب سے اس سلسلے میں تاکیدی عہد و پیمان لیا ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں لفظ تبیین آیا ہے۔ اس کے مادے کی طرف توجہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں مقصود صرف آیاتِ خدا کی تلاوت اور کتبِ آسمانی کی نشر و اشاعت نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کے حقائق کو واضح و آشکار کر کے لوگوں تک پہنچایا جائے تاکہ ہر طرح کے لوگ پوری وضاحت سے ان سے آگاہ ہو سکیں اور ان کی روح اور حقیقت تک پہنچ جائیں اور جو تبیین، توضیح اور تفسیر نہ کریں گے اور مسلمانوں تک حقائق کی روشنی پہنچانے میں کوتاہی کریں گے وہ اسی انجام کے مستحق ہوں گے، جس کا ذکر زیرِ نظر آیت میں اور دیگر آیات میں یہودی علماء کے لیے بیان کیا گیا ہے۔

اسلام کے پیغمبر گرامیؐ سے منقول ہے، آپؐ نے فرمایا:

من كتم علما عن اهله الجم يوم القيمة بلجام من نار

جو شخص علم و دانش کو اس کے اہل (اور ضرورت مند) سے چھپائے گا، قیامت کے دن خدا اُن کے منہ میں (جہنم کی) آگ کی لگام دے گا۔

حسن بن عمار راوی ہے:

ایک دن میں زہری کے پاس گیا جبکہ اُس نے لوگوں کو احادیث پہنچانے کا سلسلہ ترک کر رکھا تھا۔ میں نے اُس سے کہا: جو احادیث تم نے سن رکھی ہیں وہ مجھ سے بیان کرو۔ وہ بولا: کیا تجھے معلوم نہیں کہ اب میں کسی سے حدیث بیان نہیں کرتا۔ میں نے کہا: بہر حال تم مجھ سے حدیث بیان کرو یا پھر میں تمہیں حدیث سناؤں گا۔ اُس نے کہا: تم حدیث بیان کرو۔ اس پر میں نے حضرت علیؑ کا یہ قول بیان کیا:

ما اخذ الله علی اهل الجهل ان یتعلموا حتی اخذ علی اهل العلم ان یعلموا۔

(یعنی۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ جہالت سے علم و دانش کے حصول کا عہد لینے سے پہلے علماء سے عہد لیا کہ وہ انہیں علم سکھائیں)۔

جب میں نے یہ ہلا دینے والی حدیث اس کے سامنے پڑھی تو اُس نے اپنی مہرِ سکوت توڑتے ہوئے کہا: سنو اب میں تمہارے سامنے بیان کروں گا۔

پھر اُس نے اسی نشست میں چالیس احادیث مجھ سے بیان کیں۔[1]

علماءِ اہلِ کتاب کی خیانت کے بارے میں مزید تفصیلات جاننے کے لیے سورہ بقرہ آیات ۷۹، ۱۷۴، ۱۵۹ اور سورہ آلِ عمران کی آیات ۱۸۷ تا ۱۷۸ کی طرف رجوع فرمائیں۔

۱۸۸۔ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

۱۸۹۔ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

ترجمہ

۱۸۸ یہ گمان نہ کیجئے کہ جو لوگ اپنے (بُرے) اعمال پر خوش ہوتے ہیں اور (دوسری طرف یہ بھی چاہتے ہیں کہ ایسے (نیک) کام کے ضمن میں ان کی تعریف کی جائے جو انہوں نے سرانجام نہیں دیا، وہ عذاب الٰہی سے امان میں ہیں (ایسا نہیں ہے بلکہ) ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

۱۸۹ اور آسمانوں اور زمین کی حکومت اللہ کے لیے ہے اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی و تفسیر مجمع البیان، زیر نظر آیت کے ذیل میں۔ حضرت علیؑ سے مروی حدیث کا متن نہج البلاغہ کے کلمات قصار میں موجود ہے۔

شانِ نزول

محدثین و مفسرین نے مندرجہ بالا آیت کے بارے میں کئی ایک شانِ نزول نقل کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:
جب بعض یہودی اپنی آسمانی کتب کی تحریف اور ان میں موجود چیزوں کو چھپانے میں لگے ہوئے تھے اور اپنے گمان میں اس سے کوئی نتیجہ حاصل کر رہے تھے تو وہ اپنے اس عمل پر بہت ہی شاد و مسرور تھے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ لوگ انہیں حامیٔ دین عالم اور ذمہ دار افراد سمجھیں۔
بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب بھی کوئی اسلامی جنگ درپیش ہوتی وہ طرح طرح کے بہانے کر کے جنگ میں شرکت نہ کرتے اور جب مجاہدینِ اسلام میدانِ جنگ سے واپس آتے تو یہ قسمیں کھاتے کہ اگر انہیں مجبوری نہ ہوتی تو وہ ہرگز جہاد ترک نہ کرتے اور وہ توقع رکھتے کہ اپنے "ان کیے کاموں" پر مجاہدین اور فداکاروں کی طرح تحسین و آفرین حاصل کریں، اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی[1]

تفسیر

خود پسندی

لا تحسبن الذین یفرحون بما اتوا و یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا

بُرے کام کرنے والے لوگ دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو حقیقتاً اپنے اعمال پر شرمندہ ہیں اور اپنی سرشت وجبلت کی سرکشی کی وجہ سے برائیوں اور گناہوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی نجات بہت ہی آسان ہے کیونکہ یہ لوگ ہمیشہ گناہ کے بعد پشیمان ہوتے ہیں اور ان کا بیدار وجدان انہیں سرزنش کرتا ہے۔
دوسرے وہ ہیں جو نہ صرف یہ کہ احساسِ ندامت نہیں کرتے بلکہ وہ مغرور اور خود پسند ہوتے ہیں اور اپنے قبیح اور سنگین گناہوں پر خوش ہوتے ہیں یہاں تک کہ ان پر فخر و مباہات کرتے ہیں اور پھر اس سے بھی آگے وہ یہ خواہش کرتے ہیں کہ لوگ ان کی تعریف ایسے نیک کاموں کے ضمن میں کریں جو انہوں نے انجام بھی نہیں دیے۔
مندرجہ بالا آیت کہتی ہے:
یہ گمان نہ کرو کہ ایسے لوگ جو اپنے اعمال پر خوش ہوتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ انہوں نے جو کام نہیں کیے ان (کاموں) کی وجہ سے ان کی عزت کی جائے اور شان و شوکت بیان کی جائے کہ وہ عذابِ خدا سے دور ہیں اور نجات پالیں گے حالانکہ نجات تو ان اشخاص کے لیے ہے جو کم از کم اپنے بُرے کاموں پر شرمندہ ہیں اور یہ سوچ کر کہ وہ نیک کام نہیں کر سکے پشیمان ہیں۔

---

[1] اسباب النزول از واحدی، تفسیر المنار اور تفسیر مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

ولهم عذاب الیم۔

نہ صرف اس قسم کے خود پسند اور مغرور افراد نجات کے حقدار نہیں ہیں بلکہ دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

بہت ممکن ہے کہ اس آیت سے یہ بات بھی جانے کہ یہ ان نیک کاموں پر اظہار مسرت کے بارے میں ہے جن کے انجام دینے کی ہمیں توفیق دی گئی ہے۔ اگر یہ خوشی اعتدال کی حالت میں ہو اور غرور کا سبب نہ بنے تو یہ قابلِ مذمت نہیں ہے۔ اسی طرح ان نیک کاموں کے سلسلے میں جو انجام پا چکے ہیں اظہارِ مسرت کرنا اگر وہ بھی اعتدال کی حد میں ہو اور اس کا سبب اس کے اپنے اعمال نہ ہوں تو یہ بھی مذموم نہیں ہے کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے لیکن اس کے باوجود خدا کے دوست یعنی وہ افراد جو ایمان کی بلند سطح پر فائز ہیں اور اس قسم کی شرور شادمانی سے دور رہتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے اعمال کو کمتر سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو عظمت پروردگار کے سامنے ہیچ محسوس کرتے ہیں۔

ضمناً یہ تصور نہیں کرنا چاہیے کہ مندرجہ بالا آیت صرف ان منافقوں کے ساتھ ہی مخصوص ہے جو صدرِ اسلام میں تھے یا اسی قسم کے اور لوگ بلکہ وہ تمام افراد جو ہمارے زمانے میں مختلف اجتماعی حالات و کیفیات میں رہتے ہیں اور اپنے بُرے اعمال پر خوش ہیں یا جو لوگوں کو ابھارتے ہیں کہ وہ قلم اور زبان سے ان کے اعمال کی تعریف کریں وہ سب کے سب اس آیت کے مفہوم و مطلب میں شامل ہیں۔ ایسے لوگوں کا نہ صرف آخرت کا عذاب منتظر ہے بلکہ وہ دنیاوی زندگی میں بھی لوگوں کے غیظ و غضب کی وجہ سے مخلوق خدا سے الگ تھلگ سے رہتے ہیں اور طرح طرح کی مشکلات کا نشانہ ہیں۔

و لله ملك السمٰوٰت و الارض والله علی کل شیء قدیر

خدا آسمان و زمین کا مالک ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ یہ آیت مومنین کے لیے خوشخبری اور کافروں کے لیے دھمکی ہے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ مومن ترقی کے لیے ٹیڑھے راستوں پر چلیں اور جو کام انہوں نے نہیں کیا اس کی تعریف چاہیں۔ ہاں وہ یہ کر سکتے ہیں کہ آسمان و زمین کے مالک خدا کی قدرت کے سائے میں رہتے ہوئے جائز اور صحیح طریقوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آگے بڑھتے رہیں نیز بدکار اور منافق لوگ جو یہ چاہتے ہیں کہ ٹیڑھے راستوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی حیثیت اور مقام حاصل کریں تو وہ یہ تصور نہ کریں۔ کیونکہ وہ اس خدا کے عذاب سے جس کی تمام موجودات پر حکومت ہے نجات حاصل نہ کر سکیں گے۔

۱۹۰۔ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۝

۱۹۱۔ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

۱۹۲۔ رَبَّنَاۤ اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَهٗ وَمَا لِلظّٰلِمِیۡنَ

مِنْ اَنْصَارٍ ○

۱۹۳۔ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ڰ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ○

۱۹۴۔ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ○

ترجمہ

۱۹۰ بے شک زمین وآسمان کی تخلیق اور رات دن کے آنے جانے میں صاحبان عقل کے لیے (روشن) نشانیاں ہیں۔

۱۹۱ وہ لوگ خدا کو اٹھتے بیٹھتے اور اس وقت جبکہ وہ پہلو کے بل لیٹے ہوں یاد کرتے ہیں اور زمین وآسمان کی پیدائش کے اسرار میں غور وفکر کرتے ہیں اور (کہتے ہیں) اے خدا! تو نے ہمیں فضول پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

۱۹۲ پالنے والے جس کو تو نے (اس کے اعمال کی وجہ سے) آگ میں ڈال دیا اُسے تو نے ذلیل وخوار کیا اس قسم کے ظالم لوگوں کا کوئی مددگار نہیں۔

۱۹۳ اے پروردگار! ہم نے توحید کے منادی کی آواز سنی ہے، جو پکار رہا تھا کہ اپنے پالنے والے پر ایمان لاؤ اور ہم ایمان لے آئے (اب جبکہ ایسا ہے) اے خدا! ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری کوتاہیوں کی پردہ پوشی کر دے اور ہمیں نیکوں کے ساتھ (ان کے راستے پر) موت دینا۔

۱۹۴ اے خالق! جس چیز کا تو نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے ہم سے وعدہ کیا ہے وہ ہمیں مرحمت فرما اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کرنا کیونکہ تو کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

آیات کی اہمیت

یوں تو قرآن مجید کی سب کی سب آیتیں اہمیت کی حامل ہیں کیونکہ وہ سب خدا کا کلام ہیں اور نوع بشر کی تعلیم وتربیت کے لیے

نازل ہوئی ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں سے بعض خاص قسم کی چمک دمک رکھتی ہیں۔ ان میں سے مندرجہ بالا پانچ آیات قرآن کی دل ہلا دینے والی عبارتوں میں سے ہیں۔ یہ معارف دینی کا ایک ایسا نادر مجموعہ ہیں جن میں لطیف مناجات اور تضرع وزاری کی آمیزش ہے اور وہ ایک آسمانی سرود معلوم ہوتی ہیں۔ اسی لیے تو احادیث اور روایات میں انہیں خاص اہمیت دی گئی ہے۔

عطا ابن ابی رباح کہتا ہے کہ میں ایک دن حضرت عائشہ کے پاس گیا اور ان سے سوال کیا کہ سب سے زیادہ عجیب چیز جو آپ نے پیغمبر اسلام سے دیکھی ہے وہ کیا ہے؛

وہ کہنے لگیں، پیغمبر کا سب کچھ تعجب خیز تھا لیکن عجیب تر یہ تھا کہ ایک رات آنحضرتؐ میرے حجرے میں استراحت کرنے لگے، ابھی آرام نہیں کیا تھا کہ کھڑے ہو گئے۔ لباس پہنا، وضو کیا اور نماز شروع کر دی۔ حالتِ نماز میں اور مخصوص جذبہ الٰہی میں اس قدر آنسو بہائے کہ آپؐ کے لباس کا اگلا حصہ آپ کے اشکوں سے تر ہو گیا۔ اس کے بعد آپؐ نے سر سجدے میں رکھا اور اتنا گریہ کیا کہ زمین آپؐ کے آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ آپؐ طلوع صبح تک اسی طرح گریاں و منقلب رہے۔ جب بلال نے آپؐ کو نماز صبح کے لیے پکارا تو آپؐ کو اشکوں سے تربتر دیکھا تو پوچھا کہ آپؐ اس قدر گریہ کیوں فرما رہے ہیں آپؐ کے تو لطف الٰہی شامل حال ہے، آپؐ نے فرمایا؛

افلا اکون للہ عبدا شکورا

کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں، میں کیوں گریہ نہ کروں خدا تعالیٰ نے کل رات مجھ پر ہلا دینے والی اور پریشان کر دینے والی آیات نازل کی ہیں۔

پھر آپؐ نے یہ پانچ آیات (جو زیر نظر ہیں) کی تلاوت شروع کی اور آخر میں فرمایا؛

ویل لمن قرأھا و لم یتفکر فیھا

وائے ہو اس پر جو انہیں پڑھے لیکن ان میں غور و فکر نہ کرے[1]

روایت کا آخری جملہ آیات میں گہرے غور و فکر کا حکم دیتا ہے۔ ایسے جملے بہت سی روایات میں مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہیں۔

ایک روایت میں حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ پیغمبر خداؐ جب بھی نماز تہجد کے لیے اٹھتے پہلے مسواک کرتے پھر آسمان کی طرف دیکھتے اور یہ آیات پڑھتے[2]

روایاتِ اہل بیتؑ میں حکم دیا گیا ہے کہ جو شخص بھی نمازِ تہجد کے لیے اٹھے ان آیات کی تلاوت کرے[3]

نوف بکالی حضرت علیؑ کے خاص اصحاب میں سے تھے۔ وہ کہتے ہیں؛

ایک شب میں آپؑ کی خدمت میں حاضر تھا۔ ابھی مجھے نیند نہ آئی تھی میں نے دیکھا کہ امامؑ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور آپؑ نے ان آیات کی تلاوت شروع کر دی ہے۔ پھر مجھے پکارا اور فرمایا: اے نوف! سو رہے ہو یا جاگتے ہو؟

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی۔ زیر نظر آیات کے ذیل میں۔
[2] و [3] نور الثقلین و مجمع البیان

میں نے عرض کیا: میں بیدار ہوں اور اس وسیع و عریض آسمان کو دیکھ رہا ہوں۔ آپؑ نے فرمایا: کیا کہنا اُن لوگوں کا جنہوں نے اس زمین کی آلودگیوں کو قبول نہیں کیا اور اس طرح سے آسمان کی طرف گئے ہیں (یعنی — جنہوں نے عالم مادہ کی چاردیواری سے پرواز کی ہے اور ان کی بلند روح ملکوتِ آسمان کی سیر کرتی ہے)۔

تفسیر

خداشناسی کا روشن ترین راستہ

ان فی خلق السمٰوٰت والارض ......

قرآنی آیات صرف پڑھنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ لوگوں کے سمجھنے اور ادراک کے لیے نازل ہوئی ہیں۔ ان کی تلاوت تو ان کا سمجھنے کی تمہید ہے۔ اس لیے تو مندرجہ بالا آیت میں آسمان و زمین کی عظمت کا تذکرہ ہے اور فرمایا گیا ہے: آسمان و زمین کی خلقت اور روز و شب کی آمد و رفت میں صاحبانِ عقل و خرد اور اہل فکر و نظر کے لیے واضح نشانیاں ہیں[1] یہ کہہ کر لوگوں کو اس عظیم خلقت میں غور و فکر کے لیے ابھارا گیا ہے تاکہ ہر شخص اپنی استعداد اور پیمانۂ فکر کے مطابق اس بے کنار سمندر سے اپنا حصہ لے اور اسرارِ آفرینش کے شفاف چشمے سے سیراب ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ جہانِ آفرینش کے بدیع نقوش، دلکش تصویریں اور اس پر حاکم خیرہ کرنے والا نظام ایک بہت بڑی کتاب ہے جس کا حرف حرف اور لفظ لفظ اس عالم کے پیدا کرنے والے کے وجود اور اس کی یکتائی کی بہت ہی واضح دلیل ہے[2]

الذین یذکرون اللہ قیاما و قعودا

اس جہان کے گوشہ و کنار کی جو رعنائی اور دلکشی وسیع عالمِ ہستی میں دکھائی دیتی ہے وہ صاحبانِ عقل کے دلوں کو یوں جذب کرتی ہے کہ وہ کھڑے ہوں یا بیٹھے، بستر پر محوِ آرام ہوں یا پہلو کے بل لیٹے وہ اس نظام کے خالق اور اس کے اسرار کی یاد میں مگن ہوتے ہیں۔ لہٰذا مندرجہ بالا آیت میں ارشادِ الٰہی ہے: عقلمند وہ ہیں جو قیام میں ہوں یا قعود میں یا پہلو کے بل محوِ استراحت، خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کے اسرار میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں یعنی ہمیشہ اور ہر حالت میں اس حیات بخش فکر میں غوطہ زن رہتے ہیں۔

اس آیت میں پہلے ذکر کا تذکرہ ہے اور پھر فکر کا یعنی صرف خدا کو یاد کرنا کافی نہیں۔ یہ تذکر اس وقت بہترین ثمرات کا حامل

---

[1] قرآن میں "اولوالالباب" زیرِ نظر آیت کے علاوہ بعض دیگر آیات میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یہ صاحبانِ عقل کے لیے لطیف اشارہ ہے کیونکہ "لب" دراصل ہر چیز کے خالص جوہر کو کہتے ہیں اور انسانی وجود کا جوہر عقل و فکر ہی ہے۔

[2] اختلافِ شب و روز اور اس کے اسرار کے بارے میں سورہ بقرہ کی آیہ ۱۶۴ تفسیر نمونہ جلد اوّل میں بحث کی جا چکی ہے۔ کائنات کی خلقت میں جو نظم و ضبط موجود ہے وہ خداشناسی کی روشن ترین دلیل ہے۔ اس کی مزید توضیح کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ کیجیے: آفریدگارِ جہان، معمای ہستی اور جستجوی خدا۔

ہو گا اگر اس کے ساتھ غور و فکر بھی شامل ہو۔ جیسے آسمان و زمین کی خلقت پر غور کرنے میں یادِ خدا شامل نہ ہو تو یہ غور و فکر بھی کسی کام کا نہیں۔
ایسے کتنے ہی صاحبانِ علم و دانش ہیں جو فلکیات کا مطالعہ کرتے ہیں اور آسمانی کرّات کی خلقت کے باہمی ربط میں عجیب و غریب نظم و ضبط کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن چونکہ وہ یادِ خدا سے غافل رہتے ہیں اور توحید کی عینک ان کی آنکھوں پر نہیں ہے اور وہ عالم ہستی کو مبداءِ عالم کی شناسائی کے زاویے سے نہیں دیکھتے لہٰذا وہ انسانی تربیت کا لازمی نتیجہ اس مشاہدے سے اخذ نہیں کر پاتے۔ ان لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایسی غذا کھاتا ہے جو صرف اس کے جسم کو تقویت بخشتی ہے اور اس کی فکر و نظر اور روح پر کوئی اثر نہیں کرتی۔

ربنا ما خلقت ھذا باطلا

خلقتِ آسمان و زمین میں غور و فکر کرنے سے انسان کو ایک خاص آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اس تفکر کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اس طرف متوجہ ہوتا ہے کہ یہ مخلوق بے کار، فضول اور مہمل نہیں ہے کیونکہ جب انسان اس جہان کی چھوٹی سے چھوٹی چیز میں بھی ایک عظیم مقصد کا مشاہدہ کرتا ہے تو کیا پھر وہ یہ باور کر سکتا ہے کہ سارے کا سارا جہان بغیر کسی ہدف و مقصد کے ہو۔
انسان کو گھاس کے تنکے کی مخصوص ساخت میں واضح اغراض و مقاصد دکھائی دیتے ہیں۔ انسان کا دل، دل کی گہرائیاں اور دریچے ہر کوئی ایک پروگرام کا حامل ہے۔ آنکھ کے طبقوں کی ساخت کسی مقصد کے بغیر نہیں ہے۔ یہاں تک کہ پلکوں اور ناخنوں تک ایک معین مقصد کے حامل ہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ جس موجود کا ذرہ ذرہ مقصد و ہدف کا حامل ہو وہ خود مجموعی اعتبار سے بالکل بے مقصد ہو۔
اسی لیے تو صاحبانِ عقل اس زمزمہ پر سر دھنتے ہیں کہ — اے خداوند عالم تو نے اس عظیم کارخانے کو فضول پیدا نہیں کیا، بارالہٰا! یہ اتنا بڑا جہان اور یہ عجیب و غریب نظام سب کا سب یقیناً حکمت و مصلحت اور کسی صحیح ہدف و غرض کے تحت پیدا کیا گیا ہے۔ پروردگار! یہ سب تیری وحدانیت کی نشانیاں ہیں اور تو عبث و فضول کام سے منزہ اور پاک ہے۔

فقنا عذاب النار

عالمِ خلقت میں مقصد کے وجود کا اعتراف کرنے کے فوراً بعد صاحبانِ عقل و خرد اپنی خلقت کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ انسان جو اس جہانِ ہستی کا ثمرہ و نتیجہ ہے عبث نہیں پیدا کیا گیا اور مقصد اس کی تربیت اور تکامل کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا اور وہ اس جہان کی جلد گزر جانے والی اور بے قیمت زندگی ہی کے لیے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے آگے ایک اور گھر ہے جہاں اس کے اعمال کی جزا و سزا ہو گی — جب اہلِ عقل یہ سوچتے ہیں تو اپنی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور خدا سے ان کی انجام دہی کی توفیق کا تقاضا کرتے ہیں تا کہ وہ عذابِ الٰہی سے مامون ہو جائیں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں: خداوندا! ہمیں آتشِ جہنم سے بچا لے۔

ربنا انک من تدخل النار فقد اخزیتہ و ما للظلمین من انصار

بارالہٰا! جسے تو (اس کے اعمال کے نتیجے میں) دوزخ میں ڈال دے اُسے تو نے رسوا و ذلیل کر دیا اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہو گا۔

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبانِ عقل جہنم کی آگ کی نسبت رسوائی سے زیادہ ڈرتے ہیں اور وحشت زدہ ہیں بلکہ سے انسان ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ رنج و غم اور دکھ درد تو برداشت کرنے کو آمادہ ہوتے ہیں لیکن اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسے لوگوں کی نظر میں روزِ قیامت دردناک ترین عذاب خدا اور بندوں کے سامنے رسوا اور ذلیل ہونا ہے۔

"ماللظلمین من انصار" میں جو نکتہ پوشیدہ ہے وہ یہ ہے کہ صاحبانِ بصیرت غرضِ آفرینش سے آگاہی کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسان کی کامیابی اور نجات کا ذریعہ صرف اس کے اعمال و کردار ہیں۔ اس لیے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا کیونکہ اصلی مددگار تو نیک عمل ہے جسے وہ گنوا بیٹھے ہیں۔

لفظ "ظلم" یہاں پر اس لیے ہے کہ ظلم گناہوں میں زیادہ اہم گناہ ہے اور یا اس لیے ہے کہ تمام گناہوں کا مطلب اپنے اوپر ظلم کرنا ہی ہے۔

البتہ آیت شفاعت (اپنے حقیقی مفہوم میں) کے منافی نہیں ہے کیونکہ — جیسا کہ ہم شفاعت کے ضمن میں کی گئی بحث میں کہہ چکے ہیں کہ شفاعت مخصوص آمادگی کی محتاج ہے اور آمادگی کچھ نیک اعمال کے ذریعے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

ربنا اننا سمعنا منادیا ینادی للایمان ان امنوا بربکم فامنا

صاحبانِ عقل و خرد مقصدِ تخلیق جان لینے کے بعد اس نکتے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ نشیب و فراز کے اس راستے کو خدائی رہنماؤں کی رہبری کے بغیر ہرگز طے نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے وہ ہر وقت ایمان اور صداقت کے منادیوں کی ندا سننے کے منتظر رہتے ہیں۔ جب ان کی پہلی آواز ان کے کانوں میں پڑتی ہے تو وہ ان کی طرف لپکتے ہیں، ضروری غور و فکر اور جستجو کے بعد وہ ان کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور اپنے پورے وجود کے ساتھ ایمان لے آتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے پروردگار کے سامنے عرض کرتے ہیں: بارالٰہا! ہم نے توحید کے منادی کی آواز سنی جو ہمیں ایمان کی طرف دعوت دے رہا تھا اس کے بعد ہم ایمان لے آئے۔

ربنا فاغفرلنا ذنوبنا وکفر عنا سیاٰتنا و توفنا مع الابرار۔

بارالٰہا! جب معاملہ اس طرح سے ہے اور ہم مکمل طور پر ایمان لے آئے ہیں لیکن ہم غرائزِ انسانی اور خواہشاتِ نفسانی کے شدید طوفانوں اور آندھیوں کی زد میں ہیں اس لیے ہم سے لغزشیں سرزد ہو جاتی ہیں اور ہم مختلف گناہوں کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں — اس لیے ہمیں بخش دے، ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور ہماری کوتاہیوں کی پردہ پوشی کر دے۔ ہمیں نیک اور صالح لوگوں کے راستے پر مرنے کی سعادت عطا فرما۔

اہل عقل انسانی معاشرے سے وابستہ ہیں مگر فرد پرستی سے بیزار ہیں۔ وہ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ نہ صرف ان کی زندگی نیک لوگوں کے ساتھ ہو بلکہ ان کی موت بھی — چاہے وہ طبیعی موت ہو یا راہِ خدا میں شہادت — نیک لوگوں کے ساتھ ہو اور انہی کے طور طریقے کے مطابق ہو کیونکہ بُروں کے ساتھ مرنا بھی دوبھر ہے۔

یہاں سوال پیش آتا ہے کہ گناہوں سے بخشش کے تقاضے کے ساتھ برائیوں پر پردہ پوشی اور ان کی بخشش کے کیا معنی ہیں۔ قرآن حکیم کی دیگر آیات کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ سورۂ نساء کی آیت ۳۱ یوں ہے:

ان تجتنبوا کبائر ما تنھون عنہ نکفر عنکم سیئاتکم

اگر گناہانِ کبیرہ سے اجتناب کرو تو ہم تمہاری برائیوں کی پردہ پوشی کریں گے اور انہیں محو کر دیں گے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیئات گناہانِ صغیرہ کو کہا جاتا ہے۔ اس لیے اہلِ عقل پہلے تو اللہ سے بڑے گناہوں کی مغفرت کا تقاضا کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی گناہانِ صغیرہ کے آثار کے خاتمے کی دعا کرتے ہیں۔

ربنا و اتنا ما وعدتنا علی رسلک . . .

وہ لوگ آخری مرحلے میں راہِ توحید طے کرنے، روزِ قیامت پر ایمان لانے، پیغمبروں کی دعوت قبول کرنے اور اپنی ذمہ داریاں انجام دینے کے بعد خدا سے تقاضا کرتے ہوئے کہتے ہیں، اب جب ہم اپنا عہد و پیمان پورا کر چکے ہیں، بارالہا! تو نے اپنے پیغمبروں کی معرفت ہم سے جو وعدہ فرمایا ہے اور خوشخبری دی ہے اس کو پورا فرما اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کرنا کیونکہ تو جس چیز کا وعدہ کرتا ہے اس میں وعدہ خلافی نہیں ہو سکتی۔

رسوا نہ ہونے کی خواہش کا پھر سے اظہار اس حقیقت کی تاکید کرتا ہے کہ وہ لوگ اپنی شخصیت کی اہمیت کے قائل ہیں اس لیے وہ رسوائی کو دردناک ترین سزاؤں میں سے سمجھتے ہیں لہٰذا وہ پھر اسی پر انگشت رکھتے ہیں۔

امام صادقؑ سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

جس شخص کو کوئی مہم درپیش ہو اور وہ پانچ مرتبہ "ربنا" کہے تو خدا اسے اس چیز سے رہائی بخشے گا جس سے وہ خوفزدہ ہے اور وہ جس چیز کی اُمید رکھتا ہے اُسے پالے گا۔

کسی نے عرض کیا:

وہ پانچ مرتبہ کس طرح "ربنا" کہے۔

آپؑ نے فرمایا:

ان آیات کو پڑھے جن میں پانچ مرتبہ "ربنا" آتا ہے، تو فوراً ہی پروردگار کی طرف سے دعا قبول کر لی جاتی ہے کیونکہ وہ فرماتا ہے: فاستجاب لھم ربھم۔

پھر کہے بغیر واضح ہے کہ ان آیات کی حقیقی اور گہری تاثیر اسی صورت میں ہے جب انسان کی زبان اس کے دل اور عمل سے ہم آہنگ ہو۔ اہلِ خرد کی طرزِ فکر، خدا سے ان کا عشق، ذمہ داریوں کی طرف ان کی توجہ اور نیک اعمال کی انجام دہی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ دعا کرنے والوں کو یہی راہ اپنانا چاہیے اور وہی خشوع و خضوع پیدا کرنا چاہیے جو اہلِ عقل خدا سے مناجات کرتے وقت پیدا کرتے ہیں۔

۱۹۵۔ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَ قٰتَلُوْا وَ قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ

سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ○

ترجمہ

۱۹۵ خدا نے ان (صاحبانِ عقل) کی درخواست قبول کرلی ہے اور فرمایا ہے کہ میں تم میں سے عمل کرنے والے کے عمل کو چاہے وہ عورت ہو یا مرد ضائع نہیں کروں گا، تم سب ایک ہی نوع میں سے ہو اور ایک دوسرے کی جنس ہو۔ جنہوں نے راہ خدا میں ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکال دیے گئے اور انہوں نے میری راہ میں تکلیف اور اذیت کا سامنا کیا ہے اور جنگ کی ہے اور مارے گئے ہیں میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میں ان کے گناہ بخش دوں گا اور انہیں ان باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ یہ خدا کی طرف سے ثواب ہے اور خدا کے ہاں ہی بہترین ثواب ہے۔

شان نزول

یہ آیت گذشتہ آیات کا ضمیمہ ہے۔ اس میں صاحبانِ عقل و خرد کے اعمال کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے۔ آیت کے شروع میں فاء تفریع اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ گذشتہ آیات سے مربوط ہے۔ اس کے باوجود اس کے بارے میں کئی ایک شان نزول مروی ہیں۔ لیکن یہ بات اس کے گذشتہ آیات سے مربوط ہونے کے منافی نہیں ہے۔

ایک شان نزول یہ ہے کہ رسول اللہ کی ایک زوجۂ محترمہ جناب اُمّ سلمہ نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ قرآن میں مردوں کے جہاد، ہجرت اور فداکاری کی بہت گفتگو ہے، کیا عورتوں کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے۔ زیر نظر آیت اسی سوال کے جواب میں نازل ہوئی۔

یہ بھی منقول ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے جب فاطمہ بنت اسد، فاطمۂ بنت رسولؐ اللہ اور فاطمہ بنت زبیر (جنہیں فواطم کہا گیا ہے) کے ہمراہ ہجرت کی اور اُمّ ایمن جو ایک صاحبِ ایمان خاتون تھیں راستے میں آپؐ سے آملیں تو مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ شانہائے نزول اس بات کے منافی نہیں کہ زیر نظر آیت گذشتہ آیات سے مربوط ہے جیسے دونوں شانہائے نزول بھی ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔

تفسیر

اہلِ خرد کے اعمال کا نتیجہ

گذشتہ آیات میں اہلِ خرد کے ایمان، اعمال، دعاؤں اور تضرع وزاری کا ذکر تھا۔ اس آیت میں فرمایا گیا ہے:
فاستجاب لھم ربھم ــــ یعنی اُن کے پروردگار نے ان درخواستوں کو فوراً قبول کر لیا۔ ربھم (اُن کا پروردگار) ــــ یہ تعبیراُن پر پروردگار کے انتہائی لطف وکرم کی حکایت کرتی ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: انی لا اضیع عمل عامل منکم ــــ اس بناء پر کہ کہیں اشتباہ نہ ہو اور نجات وکامرانی کو انسان کے اعمال وکردار سے الگ نہ سمجھ لیا جائے فرمایا گیا: تم میں سے عمل کرنے والے کے کسی عمل کو میں ہرگز ضائع نہیں کروں گا۔ اس میں عمل کا ذکر بھی ہے اور عامل کا بھی تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ قبولیتِ دعا کا محور اصلی وہ اعمالِ صالح ہیں جو ایمان کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور ایسی درخواستیں فوراً قبول ہو جاتی ہیں جن کی ڈھال عملِ صالح ہو۔

من ذکر او انثٰی بعضکم من بعض۔

اس بناء پر کہ کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ خدا کا یہ وعدہ کسی خاص گروہ سے مخصوص ہے، فرمایا گیا ہے کہ یہ عمل کرنے والا چاہے مرد ہو یا عورت اس میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ تم سب خلقت میں ایک دوسرے سے وابستہ ہو تم میں سے بعض، بعض دوسروں سے پیدا ہوتے ہیں، عورتیں مردوں سے اور مرد عورتوں سے۔

بعضکم من بعض ــــ ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ تم سب کے سب ایک دین کے پیرو اور ایک ہی حقیقت کے طرفدار ہو اور ایک دوسرے سے ہم کاری رکھتے ہو لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ خدا تمہارے درمیان تبعیض روا رکھے۔

فالذین ھاجروا واخرجوا من دیارھم واوذوا فی سبیلی وقاتلوا وقتلوا لاکفرن عنھم سیاٰتھم ــــ اس سے پھر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس بناء پر وہ تمام لوگ جنہوں نے خدا کی راہ میں ہجرت کی ہے اور اپنے گھر اور وطن سے نکالے گئے ہیں انہوں نے راہِ خدا میں تکلیفیں اٹھائی ہیں جہاد کیا ہے اور جانیں دی ہیں۔

پہلا احسان جو خداوندِ عالم کی طرف سے ان پر ہوگا وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ ان کے گناہوں کو بخش دے گا اور ان کی تکالیف اور شدائد کو گناہوں کا کفارہ قرار دے گا تاکہ وہ گناہوں سے بالکل پاک ہو جائیں۔

ولادخلنھم جنات تجری من تحتھا الانھٰر

اس کے بعد فرماتا ہے کہ میں گناہوں کو بخشنے کے علاوہ یقیناً انہیں ایسی جنت میں جگہ دوں گا جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں جو گوناگوں نعمتوں سے بھری پڑی ہیں۔

ثوابا من عند اللّٰہ واللّٰہ عندہ حسن الثواب

یہ وہ جزا و ثواب ہے جو ان کی جانثاری کی وجہ سے خداوندِ عالم ان کو مرحمت فرمائے گا۔ بے شک بہترین ثواب اور اجر اسی کے پاس ہے۔ یہ اشارہ اس طرف ہے کہ دنیا والوں کے لیے خدا کے اجر و ثواب کی تعریف و توصیف مکمل طور پر نہیں کی جا سکتی۔ بس یہ سمجھ لیں کہ اس کی ذاتِ والاصفات ہر ثواب اور جزا سے بالاتر ہے۔

آیتِ مندرجہ بالا سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تو اعمالِ صالح کے سائے میں گناہوں سے پاک ہونا چاہیے
اس کے بعد قرب خدا اور بہشت اور اس کی نعمتوں کی طرف رُخ کرنا چاہیے کیونکہ ابتدا میں فرماتا ہے: لاکفرن عنھم
سیٰاتھم اور اس کے بعد ولادخلنھم جنات یعنی بہشت پاک لوگوں کا مقام ہے اور جب تک انسان پاک نہ ہو جنت
کے قریب نہیں پھٹک سکتا۔

مرد اور عورت کی روحانی قدر و قیمت

اس کے علاوہ قرآن کی دوسری بہت سی آیات کی طرح عورت اور مرد کو خدا کی درگاہ کے باطنی اور روحانی مقامات تک پہنچنے کے لیے ایک دوسرے کے برابر قرار دیتی ہے۔ آیت کی نظر میں جنس کا اختلاف، جسمانی ساخت کا فرق اور ان کے لیے بعض اجتماعی ذمہ داریوں کا فرق، مرد اور عورت دونوں کے لیے کمالِ انسانی کے حصول میں کسی فرق کی دلیل نہیں۔ بلکہ آیت اس حیثیت سے دونوں کو مکمل طور پر ایک ہی سطح پر رکھتی ہے اسی لیے ان کا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بات بالکل اسی طرح ہے جیسے ایک ادارے کے انتظام کے لیے ایک شخص کو رئیس ادارہ بنا لیتے ہیں اور دوسرے کو معاون یا رکن۔ رئیس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے کام میں زیادہ تجربہ اور اطلاعات وغیرہ رکھتا ہو، لیکن یہ فرقِ مراتب ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ رئیس ادارہ انسانی شخصیت اور قدر و قیمت میں اپنے ماتحتوں سے زیادہ ہے۔

قرآن مجید وضاحت کے ساتھ فرماتا ہے:

ومن عمل صالحًا من ذکر او انثٰی وھو مومن فاولٰئک یدخلون الجنۃ یرزقون
فیھا بغیر حساب۔ (سورۂ المؤمن آیت ۴۰)

مرد اور عورت میں سے جو بھی نیک عمل کرے اور ایماندار ہو وہ بہشت میں داخل ہوگا اور اسے بے حساب روزی دی جائے گی (اور وہ اس جہان کی روحانی اور جسمانی نعمتوں سے فیض یاب ہوگا)۔

اسی طرح دوسری آیت میں ہے:

من عمل صالحًا من ذکر او انثٰی وھو مومن فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ ولنجزینھم
اجرھم باحسن ما کانوا یعملون۔ (سورۂ نحل آیت ۹۷)

مرد اور عورت میں سے جو بھی نیک کام کرے اور مومن ہو، ہم اسے پاکیزہ زندگی دیں گے اور بہت اچھی جزا دیں گے۔

یہ آیت اور اسی قسم کی دوسری متعدد آیتیں اس زمانے میں نازل ہوئیں جب دنیا کی تمام قومیں عورت کے انسانی نوع اور جنس بشر ہونے کے متعلق ڈانواں ڈول تھیں اور اسے حقیر و ذلیل مخلوق اور گناہ اور موت کا سرچشمہ سمجھتی تھیں۔

بہت سی گذشتہ قومیں یہ اعتقاد بھی رکھتی تھیں کہ عورت کی عبادت درگاہِ الٰہی میں قبول نہیں ہوتی۔ بہت سے اہلِ یونان تو عورت کو گندی مخلوق اور شیطانی عمل جانتے تھے۔ رومی اور بعض یونانی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اصولی طور پر عورت میں انسانی روح کار فرما نہیں ہے۔ روحِ انسانی تو صرف مردوں کو دی گئی ہے۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ماضی قریب میں ہسپانیہ کے

عیسائی عالم اس بارے میں بحث کر رہے تھے کہ کیا عورت مرد کی طرح روحِ انسانی رکھتی ہے اور کیا اس کی روح موت کے بعد بھی ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ آخر وہ بہت سی بحث اور تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے چونکہ عورت کی روح انسان اور حیوان کے درمیان برزخ کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے سوائے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی روح کے کسی عورت کی روح ہمیشہ نہیں رہے گی۔[1]

مندرجہ بالا آراء سے یہ امر بخوبی روشن ہو جاتا ہے کہ بعض جاہل اور بے خبر لوگ جو کبھی کبھی اسلام پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ تو مردوں کا دین ہے نہ کہ عورتوں کا، وہ حقیقت سے کس قدر دور ہیں۔ اگر اسلام کے کچھ قانون عورت اور مرد کے جسمانی اور نفسانی فرق کی وجہ سے معاشرے کی ذمہ داریوں کے حوالے کسی قدر مختلف ہیں، تو وہ کسی صورت میں بھی عورت کی حقیقی اور باطنی قدر و منزلت کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ اس لیے عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ دونوں کے لیے نیک بختی اور سعادت کے دروازے یکساں طور پر کھلے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ ہم اس آیت کی بحث میں پڑھ چکے ہیں بعضکم من بعض (تم سب کے سب ایک ہی جنس اور ایک ہی معاشرہ کے فرد ہو)۔

۱۹۶۔ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ۝

۱۹۷۔ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

۱۹۸۔ لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۗ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِلْأَبْرَارِ ۝

ترجمہ

۱۹۶۔ کافروں کا شہروں میں (کامیابی سے) آنا جانا تمہیں دھوکا نہ دے۔

۱۹۷۔ یہ متاع ناچیز ہے پھر ان کے لیے رہنے کی جگہ دوزخ ہے اور (دوزخ) کتنی بری جگہ ہے۔

۱۹۸۔ ۔۔۔ جو ایمان لے آئے ہیں اور) اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کے لیے باغات بہشت ہیں کہ جن کے درختوں تلے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ ان کے لیے خدا کی طرف سے پہلی پذیرائی ہے اور جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ نیک لوگوں کے لیے بہتر ہے۔

شانِ نزول

بہت سے مشرکین مکہ تجارت پیشہ تھے۔ اس تجارت سے انہیں بہت سی دولت ہاتھ آئی اور وہ ناز و نعمت کی زندگی بسر کرتے

---

[1] کتاب درد مرگ مارک، عذر تقصیر بہ پیشگاہ محمد، حقوق زن در اسلام اور سلسلے کی دیگر کتب ملاحظہ فرمائیے۔

تھے۔ مدینہ کے یہودی بھی تجارت میں مہارت رکھتے تھے۔ تجارتی سفروں سے اکثر وہ بھرے ہاتھوں واپس لوٹتے تھے۔ مسلمان ان دنوں مخصوص حالات کی وجہ سے مادی طور پر بڑی زحمتوں اور مشکلوں میں گرفتار تھے۔ ان مشکلات کی وجوہ میں کہ سے مسلمانوں کی مدینہ کی طرف ہجرت اور طاقتور دشمن کی طرف سے اقتصادی محاصرہ اور بائیکاٹ شامل ہیں۔ مسلمان عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بعض لوگ جب یہ دو مختلف حالتوں کی طرف دیکھتے تو سوچتے کہ بے ایمانوں کے لیے یہ ناز و نعمت اور اہلِ ایمان کے لیے یہ رنج و الم آخر کیوں ہے۔ مسلمان کیوں فقر و پریشانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مندرجہ بالا آیات اسی سوال کا جواب ہیں۔

تفسیر

ایک تکلیف دہ سوال

شانِ نزول میں جو سوال سامنے آیا ہے وہ زمانۂ پیغمبرؐ کے مسلمانوں کے حسبِ حال ہے۔ یہ دراصل ایک عمومی سوال ہے جو ہر دور میں اکثر لوگ پوچھتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر ظالموں، سرکشوں، فرعونوں کی خوشحالی اور ناز و نعمت سے معمور زندگی کا موازنہ ایسے اہلِ ایمان سے کرتے ہیں جن کی زندگی مشقت و زحمت ہی سے بھری ہوئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بُرے لوگ اپنی ظالمانہ اور گناہ آلود زندگی کے باوجود خوشحال کیوں ہیں لیکن اہلِ ایمان اپنے ایمان و تقویٰ کے باوصف سختی و تنگی کی زندگی کیوں گزار رہے ہیں۔ بعض اوقات یہ چیز کمزور ایمان والوں میں شک و شبہ پیدا کرتی ہے۔

اس سوال کا اگر بغور جائزہ لیا جائے اور اس کے دونوں پہلوؤں پر گہری نظر کی جائے تو واضح اور روشن جوابات سامنے آئیں گے جن میں سے بعض کی طرف آیۂ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مزید توجہ سے مطالعہ کیا جائے تو دوسرے جوابات بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔

آیت کہتی ہے: لا یغرنك تقلب الذین كفروا فی البلاد — مختلف شہروں میں کافروں کی کامیابی سے آمد و رفت تجھے ہرگز دھوکے میں نہ ڈال دے۔ اگرچہ ظاہراً آیت میں رسول اللہؐ مخاطب ہیں لیکن واضح ہے کہ مقصود تمام مسلمان ہیں۔

اس کے بعد فرمایا ہے: متاع قلیل — یہ کامیابیاں اور یہ بلاشرط مادی فائدے جلد گزر جانے والے اور ناچیز ہیں۔

ثم مأوٰهم جهنم و بئس المهاد — ان کامیابیوں کے پیچھے ان کے لیے انجامِ بد اور ایسی ذمہ داریاں ہیں جو ان کا دامن پکڑے رہیں گی اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ کیسا بُرا ٹھکانا ہے۔

مندرجہ بالا آیت درحقیقت دو نکتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے:

پہلا یہ کہ سرکشوں اور ظالموں کی بہت سی کامیابیوں کا دائرہ محدود رہے۔ جیسے بہت سے اہلِ ایمان کی محرومیاں اور تکلیفیں بھی محدود ہیں۔ اس امر کا گواہ اسلام کا ابتدائی دور ہے۔ اس میں مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کی حالت ہم دیکھ سکتے ہیں۔ اس وقت حکومتِ اسلامی بالکل نوساختہ تھی۔ طاقتور دشمنوں کی طرف سے ان پر طوفان آپڑے تھے۔ انہیں ڈرایا دھمکایا جاتا تھا۔ اس لیے حکومت اسلامی کے پر و بال سمٹے ہوئے تھے۔ خصوصاً مکہ کے مسلمانوں کی ہجرت کی وجہ سے وہ مسلمان جو انتہائی کم تعداد میں

تھے بالکل ساکت ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ کیفیت صرف انہی سے مخصوص نہ تھی بلکہ وہ تمام لوگ جو کسی ایک بنیادی اور روحانی انقلاب کے حامی ہوں اور ایک فاسد معاشرے میں رہتے ہوں انہیں محرومیت کے ایک شدید دور سے گزرنا پڑتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہ رہی۔ حکومتِ اسلامی کی جڑیں مضبوط ہوگئیں اور اس کی شاخیں قوی ہوگئیں۔ اسلامی ملک میں دولت کا سیلاب امنڈ آیا اور عیش و عشرت میں رہنے والے بدترین دشمن خاک سیاہ پر جا بیٹھے۔ آیت میں اسی صورت حال کو "متاع قلیل" کہا گیا ہے۔

دوسرا یہ کہ بعض بے ایمانوں کی مادی ترقی اس لیے بھی ہے کہ وہ دولت سمیٹنے میں کسی اصول اور قانون کے قائل نہیں ہوتے اور جائز ناجائز ہر طریقے سے، یہاں تک کہ بے کسوں کا خون چوس کر بھی دولت سمیٹنے میں لگے رہتے ہیں جبکہ اہل ایمان حق و عدالت کے اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہیں اور ناجائز طریقوں سے دولت سمیٹنے پر پابندیاں ہونا بھی چاہئیں۔ اس لیے دونوں کے حالات کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اہلِ ایمان کو ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے جبکہ بے ایمانوں کی نظر میں کوئی ذمہ داری نہیں اور چونکہ یہ دنیا ارادہ و اختیار کی آزادی کی دنیا ہے اس لیے خدا تعالیٰ نے دونوں گروہوں کو آزاد چھوڑ رکھا ہے تاکہ ہر ایک کا انجام اس کے عمل کی روشنی میں مرتب ہو سکے۔ اسی امر کی طرف آیۂ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے:

ثم مأوٰهم جهنم وبئس المهاد .

قوت اور ضعف کے پہلو

بعض بے ایمان افراد کی ترقی اور بعض ایمان والوں کی پسماندگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ایمان نہ رکھنے کے باوجود پہلے گروہ میں قوت کے بعض پہلو موجود ہیں جن کی وجہ سے وہ اہم کامیابیاں حاصل کر لیتے ہیں اور دوسرے گروہ میں ایمان کے باوجود کمزوری کے بعض پہلو موجود ہیں جو ان کی پسماندگی کا سبب ہیں۔

مثلاً ہم بعض ایسے لوگوں کو جانتے ہیں جو خدا سے بیگانہ ہیں لیکن امورِ زندگی میں جدوجہد اور استقامت کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے ہم آہنگی اور حالاتِ زمانہ سے آگاہی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ یقیناً مادی زندگی میں کامیابیاں حاصل کریں گے۔ درحقیقت یہ لوگ دین سے وابستہ ہوئے بغیر اس کے کچھ بنیادی اصولوں کو اپنائے ہوئے ہیں۔

ان کے مقابلے میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو عقائد مذہبی کے تو پابند ہیں لیکن اس کے بہت سے عملی احکامات کو بھولے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ کم حوصلہ، بے حال، استقامت سے عاری، بالکل منتشر اور ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ لہٰذا مسلم ہے کہ ایسے لوگوں کو دنیاوی زندگی میں پے در پے شکستوں کا سامنا ہوگا۔ ان کی یہ شکست ایمان کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان کمزور پہلوؤں کی بناء پر ہے جو ان میں موجود ہیں۔ بعض اوقات وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فقط نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے سے انہیں تمام کاموں میں کامیابی حاصل ہو جانا چاہیے۔ جبکہ دین نے زندگی کی پیشرفت کے لیے عملی پروگرام دے رکھا ہے جسے فراموش کر دینے سے شکست اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ دونوں گروہوں کے کچھ قوی اور کچھ ضعیف پہلو ہیں جن میں سے ہر ایک کے اپنے اثرات ہیں۔ البتہ کبھی کبھار محاسبہ کرتے وقت یہ اثرات ایک دوسرے سے مشتبہ ہو جاتے ہیں۔

مثلاً ایک بے ایمان شخص جو مسلسل محنت و مشقت کرتا ہے وہ اطمینانِ قلب و روح، اعلیٰ انسانی مقاصد اور پاکیزہ خیالات و جذبات سے عاری ہوتا ہے لیکن چونکہ شوق اور استقامت سے کام کرتا ہے لہٰذا مادی زندگی میں آگے نکل جاتا ہے۔

یہاں بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ یہ بے ایمان شخص دنیاوی زندگی میں کیوں کامیاب ہوگیا ہے گویا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کامیابی کا کوئی اور عامل تھا۔

اب یہ بات جیسے ایک فرد پر صادق آتی ہے اسی طرح اسے ایک ملک پر بھی منطبق کیا جاسکتا ہے ضمنی طور پر یہ امر بھی واضح رہنا چاہیے کہ بے ایمان اشخاص کی کامیابی کے تینوں مذکورہ عوامل یعنی جد وجہد، ایک دوسرے سے ہم آہنگی اور حالاتِ زمانہ پر نظر، سب ایک ہی جگہ صادق نہیں آتے بلکہ ان میں سے ہر ایک کسی خاص موقع و محل کے ساتھ مخصوص ہے۔

لکن الذین اتقوا ربھم لھم جنات تجری من تحتہا الانھر خالدین فیہا۔

گزشتہ آیت میں بے ایمان افراد کے انجام کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس آیت میں پرہیزگاروں کے انجام کا تذکرہ ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: لیکن وہ لوگ جنہوں نے تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کی (اور انہوں نے مادی سرمائے کے حصول کے لیے حق و عدالت کے اصول محوظِ نظر رکھے یا خدا پر ایمان رکھنے کی بنا پر اپنے وطن سے نکال دیے گئے اور اجتماعی و اقتصادی مشکلات کا شکار ہوئے) انہیں ان مشکلات کے صلے میں خدا تعالیٰ نے باغاتِ بہشت عطا کیے ہیں کہ جن کے درختوں تلے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔

نزلا من عند اللہ و ما عند اللہ خیر للابرار

لغت میں "نزل" کا معنی ہے "ایسی چیز جو مہمان کی ضیافت کے لیے پیش کی جائے"۔ بعض کہتے ہیں اس کا معنی ہے "وہ پہلی چیز جو مہمان کی پذیرائی کے لیے پیش کی جائے" (مثلاً شربت یا پھل جو ابتداء میں مہمان کو پیش کیے جاتے ہیں)، اس لیے مندرجہ بالا آیت میں فرمایا گیا ہے: باغ جنت میں مادی نعمتیں پرہیزگاروں کی ضیافت کا آغاز ہیں۔ باقی رہی اہم ترین اور عالی ترین ضیافت تو وہ روحانی اور معنوی نعمتیں ہیں جن کی طرف وما عند اللہ خیر للابرار (خدا کے پاس جو نیک لوگوں کے لیے بہتر ہے) کے جملے میں اشارہ کیا گیا ہے۔

۱۹۹۔ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○

ترجمہ

۱۹۹۔ اہلِ کتاب میں بعض ایسے افراد ہیں جو خدا پر اور جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ ان پر نازل ہوا ہے ایمان رکھتے ہیں، وہ خدا کے (حکم کے) سامنے خضوع کرتے ہیں اور آیاتِ الٰہی کو کم قیمت پر نہیں بیچتے۔ ان کا اجر و ثواب ان کے پروردگار

کے پاس ہے، خدا سریع الحساب ہے (وہ ان کے نیک اعمال کا جلدی سے حساب کرتا ہے اور انہیں اجر دیتا ہے)۔

شانِ نزول

بہت سے مفسرین کے قول کے مطابق یہ آیت اہلِ کتاب کے مومنین کے بارے میں ہے، جنہوں نے ناروا تعصب سے کنارہ کشی اختیار کی ہے اور مسلمانوں کی صفوں میں آ شامل ہوئے ہیں۔ یہ لوگ عیسائیوں اور یہودیوں کی ایک معقول تعداد پر مشتمل تھے۔

کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت حبشہ کے رعیت پرور بادشاہ نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی ہے اگرچہ اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔

ماہ رجب ۹ھ ہجری میں نجاشی کی وفات کی خبر ایک خدائی الہام کے ذریعے روزِ وفات ہی آنحضرتؐ کو پہنچی۔ رسول اللہؐ نے مسلمانوں سے فرمایا:

تمہارا ایک بھائی سرزمینِ حبشہ سے باہر دنیا سے چل بسا ہے۔ تم جمع ہو جاؤ تاکہ مسلمانوں کے حق میں اس نے جو خدمات سرانجام دی ہیں اس کے صلے میں اس کی نمازِ جنازہ پڑھیں۔

بعض نے سوال کیا: وہ کون ہے؟

آپؐ نے فرمایا: نجاشی۔

پھر آپؐ مسلمانوں کے ہمراہ قبرستان جنت البقیع میں آئے اور اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھائی اور اس کے لیے دعائے مغفرت کی۔ آپؐ نے اپنے اصحاب کو بھی حکم دیا اور انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

بعض منافقین کہنے لگے، محمد (ص) نے ایک ایسے کافر کی نمازِ جنازہ پڑھی ہے جسے کبھی نہیں دیکھا، حالانکہ اس نے ان کا دین قبول نہیں کیا۔

اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا گیا[1]

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نجاشی نے مکمل طور پر اسلام قبول کر لیا تھا اگرچہ وہ اس کا اظہار نہیں کرتا تھا۔

تفسیر

سب اہلِ کتاب ایک جیسے نہیں

---

[1] اسباب النزول از واحدی

وان من اھل الکتاب لمن یؤمن باللہ

یہ بات کہی جا چکی ہے کہ قرآن مجید میں دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے بارے میں جو گفتگو ہے اس میں کبھی بھی سب کو ایک جیسا قرار نہیں دیا گیا۔ قرآن کا یہ طریق کار ہے کہ وہ کسی قوم یا جماعت کے بارے میں ضد اور تعصب کا رنگ اختیار نہیں کرتا بلکہ اس کا فیصلہ ان کے لائحہ عمل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اس اقلیت کو فراموش نہیں کرتا جو ایمان اور عمل صالح کی حامل ہو اور گمراہ اکثریت کے درمیان زندگی گزار رہی ہو۔ یہاں بھی اہل کتاب کو بہت زیادہ سرزنش کی گئی کیونکہ وہ آیات خدا کو چھپاتے تھے اور سرکشی اختیار کرتے اور پھر ان میں سے اس اقلیت کا تذکرہ ہے جس نے پیغمبر اکرمؐ کی دعوت کو قبول کر لیا تھا۔ ان لوگوں کی پانچ ممتاز صفات بیان فرمائی گئی ہیں۔

۱ یؤمن باللہ ــ وہ ایسے لوگ ہیں جو دل و جان سے خدا پر ایمان لے آتے ہیں۔

۲ وما انزل الیکم ــ اور قرآن پر اور جو کچھ تم مسلمانوں پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان لاتے ہیں۔

۳ وما انزل الیھم ــ درحقیقت پیغمبر اسلامؐ پر ان کے ایمان لانے کی وجہ اپنی آسمانی کتاب پر ان کا حقیقی ایمان ہے جس میں پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں بشارتیں موجود ہیں۔

۴ خاشعین للہ ــ فرمانِ خدا کے سامنے وہ سرِ تسلیم خم کیے ہوتے ہیں اور یہ ان کا خشوع و خضوع ہی ہے جس نے حقیقی ایمان اور جاہلانہ تعصبات میں حدِ فاصل کھینچی ہے۔

۵ لا یشترون بایت اللہ ثمنا قلیلا ــ وہ آیاتِ الٰہی کو کبھی کم قیمت پر فروخت نہیں کرتے اور وہ ایسے علماء یہود کی طرح نہیں جو اپنے منصب کے تحفظ کے لیے لوگوں پر اپنے اقتدار کی بقاء کے لیے اور رشوت لے کر آیاتِ خدا میں تحریف کر دیتے ہیں۔ واضح ہے کہ مطلب یہ نہیں کہ کم قیمت پر فروخت نہیں کرتے بلکہ مراد یہ ہے کہ کسی قیمت پر بھی فروخت نہیں کرتے۔ کم قیمت کی طرف اشارے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان علماء کی طرح نہیں ہیں جو دنیا پرست اور کم ہمت ہیں۔ علاوہ ازیں ان آیات کے مقابلے میں جو کچھ بھی وصول کیا جائے بے وقعت ہے۔

اولٓئک لھم اجرھم عند ربھم

جن لوگوں کا اپنے پروردگار کے ہاں واضح درخشندہ لائحہ عمل اور اعلیٰ انسانی صفات کی بنا پر اجر و ثواب ہے ان کے لیے یہاں " ربھم " کا لفظ ان پر پروردگار کے انتہائی لطف و کرم کا مظہر ہے نیز یہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ راہِ ہدایت میں اللہ تعالیٰ ان کی تربیت اور مدد کرتا ہے۔

ان اللہ سریع الحساب

خدا تعالیٰ بڑی تیزی سے بندوں کا حساب بے باق کر دے گا۔ نہ نیکو کاروں کو اپنا اجر و ثواب معلوم کرنے کے لیے مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا اور نہ بدکاروں کی سزا میں تاخیر ہو گی۔ یہ جملہ نیکوں کے لیے بشارت اور بدکاروں کے لیے تنبیہ و تہدید کی حیثیت رکھتا ہے[1]۔

---

[1] اس بحث کی مزید توضیح کے لیے سورہ بقرہ آیہ ۲۰۲ کی تفسیر کی طرف رجوع کریں۔

۲۰۰۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ؑ

ترجمہ

۲۰۰ اے ایمان والو! (مشکلات اور ہوا و ہوس کے مقابلے میں) استقامت و پامردی دکھاؤ اور دشمنوں کے مقابلے میں (بھی) استقامت کا مظاہر کرو اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کرو اور خدا سے ڈرو شاید تم کامیاب ہو جاؤ۔

تفسیر

یہ سورہ آلِ عمران کی آخری آیت ہے۔ اس میں چار نکات پر محیط ایک جامع لائحہ عمل تمام مسلمانوں کے لیے پیش کیا گیا ہے، اسی لیے اس کا آغاز "یاایھا الذین اٰمنوا" سے ہوا ہے۔

۱ اصبروا ـــ یہ اس پروگرام کا پہلا نکتہ ہے جو کہ مسلمانوں کی سربلندی اور کامیابی کا ضامن ہے۔ اس کا مطلب استقامت و صبر اور حوادث کے مقابلے میں ڈٹ جانا ہے۔ دراصل صبر و استقامت ہی ہر قسم کی مادی و روحانی کامیابی کی حقیقی جڑ ہے۔ اجتماعی و انفرادی پیش رفت کے لیے اس کی جس قدر اہمیت بیان کی جائے وہ کم ہے اسی کو حضرت علیؑ نے کلمات قصار میں بدن کے ساتھ سر سے تشبیہ دی ہے فرماتے ہیں:

ان الصبر من الایمان کالراس من الجسد

یعنی ـــ صبر کا ایمان سے وہی تعلق ہے جو سر کا بدن سے ہے۔

۲. وصابروا ـــ یہ "مصابرہ" سے مفاعلہ کے باب سے ہے۔ اس کا معنیٰ ہے دوسروں کے صبر و استقامت کے مقابلے میں صبر و استقامت دکھانا۔

اس طرح خدا تعالیٰ پہلے تو صاحبانِ ایمان کو صبر و استقامت کا حکم دیتا ہے (جس میں ہر طرح کا جہاد نفس اور مشکلات حیات شامل ہیں) اور دوسرے مرحلے میں دشمن کے مقابلے میں استقامت کا حکم دیتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ جب تک کوئی قوم جہاد بالنفس اور اندرونی کمزوری کے پہلوؤں کی اصلاح میں کامیاب نہیں ہوتی دشمن پر اس کی کامیابی ممکن نہیں ہے اور دشمنوں کے مقابلے میں ہماری زیادہ تر شکستیں اسی وجہ سے ہیں کہ جہاد بالنفس نہیں کیا گیا اور اپنے کمزور پہلوؤں کی اصلاح نہیں کی گئی جو ہمارے لیے ضروری ہے۔

ضمنی طور پر اس حکم (صابروا) سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمن جس قدر زیادہ استقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں اس سے بڑھ کر استقامت و پامردی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

۳ ورابطوا ـــ اس لفظ کا مادہ "رباط" ہے۔ اس کا معنیٰ ہے "کسی چیز کو کسی مکان میں باندھ دینا (مثلاً گھوڑے

کو کسی جگہ باندھنا۔ اسی لیے سرائے یا کاروانوں کے ٹھہرنے کی جگہ کو رباط کہتے ہیں۔ ربط قلب کا مطلب ہے دل کا اطمینان اور سکون خاطر، گویا وہ کسی جگہ بندھا ہوا ہے۔ مرابطہ کا معنی ہے سرحدوں کی نگرانی کرنا کیونکہ وہاں سپاہی، سواریاں اور جنگی وسائل فراہم کیے جاتے ہیں اور انہیں وہاں رکھا جاتا ہے۔

یہ لفظ مسلمانوں کو دشمن کے مقابلے کے لیے تیار رہنے اور اسلامی ملکوں کی سرحدوں کی حفاظت کا حکم دیتا ہے۔ تاکہ دشمن ان پر بے خبری کے عالم میں اچانک حملہ نہ کر دے۔ نیز انہیں شیطان اور سرکش ہوا و ہوس کے مقابلے کے لیے بھی ہمیشہ تیار رہنے اور ان کے ہتھکنڈوں سے چوکنا رہنے کا حکم دیتا ہے تاکہ وہ غفلت میں نہ پڑ جائیں۔

اسی لیے بعض روایتوں میں ہے کہ امیر المومنین علیؑ نے اس لفظ کی تفسیر ایک نماز کے بعد دوسری نماز کی پابندی اور انتظار کی ہے کیونکہ جو شخص عبادت کے ذریعے اپنے دل و جان کو ہمیشہ اور لگاتار بیدار رکھے وہ ایسے سپاہی کی مانند ہے جو ہر وقت دشمن سے مقابلے کے لیے تیار (ATTENTION) ہو۔

غرضیکہ رابطہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو اپنی ذات اور اسلامی معاشرے کے دفاع کی تیاری پر محیط ہے۔ چنانچہ فقہ اسلامی کے باب جہاد میں ایک بحث "مرابطہ" (یعنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے دشمن کے احتمالی حملے کے مقابلے کے لیے آمادگی) کے عنوان سے ہے۔ جس میں خاص خاص احکام بیان کیے گئے ہیں۔

بعض روایات میں علمائے کرام کو بھی "مرابط" کہا گیا ہے چنانچہ ایک روایت کے مطابق حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

علماء شیعتنا مرابطون فی الثغر الذی یلی ابلیس وعفاریتہ ویمنعونہ عن الخروج علی ضعفاء شیعتنا وعن ان یتسلط علیھم ابلیس

ہمارے شیعہ علماء سرحدوں کی حفاظت اور نگرانی کرنے والوں کی طرح ہیں، جو شیطان کی فوج کے سامنے صف باندھے کھڑے ہیں اور ان لوگوں کا (شیطان اور اس کی فوج کے حملے سے) دفاع کرتے ہیں جو ان کے حملوں کی تاب نہیں لا سکتے۔[1]

اس حدیث کے ذیل میں علمائے کرام کا مرتبہ اور شان سرحدوں کی حفاظت کرنے والے افسروں اور سپاہیوں کے مقابلے میں جو اسلام کے دشمنوں سے جنگ کر رہے ہیں کہیں بڑھ کر بیان کی گئی ہے اور یہ اس بنا پر ہے کہ علماء عقائد و ثقافتِ اسلامی کے نگہبان ہیں۔ جبکہ فوج جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کرتی ہے اور یہ طے شدہ امر ہے کہ جس قوم کے عقیدے، فرہنگ اور ثقافت دشمنوں کے حملے کی زد میں ہو اور وہ ان کا قرار واقعی دفاع نہ کر سکے تو وہ جلد ہی سیاسی اور فوجی نقطۂ نظر سے بھی شکست کھا جائے گی۔

۴۔ و اتقوا اللہ اور آخری حکم جو تمام احکامات پر سایہ فگن ہے وہ پرہیزگاری کا حکم ہے۔ استقامت، صبر اور رابطہ

---

[1] احتجاج طبرسی جلد اول۔

کے ساتھ ساتھ تقویٰ اور پرہیزگاری کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے تاکہ ہر قسم کی خود پسندی، ریاکاری اور شخصی اغراض ترک کئے جاسکیں لعلکم تفلحون تم ان چاروں حکموں کی پابندی کے سائے میں فلاح و کامیابی حاصل رکھتے ہو اور ان سے روگردانی کرنے سے کامیابی کا راستہ تم پر بند ہو جائے گا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

کبھی کبھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں بہت سے جملے لفظ "لعل" سے کیوں شروع ہوتے ہیں مثلاً "لعلکم تفلحون" شاید تم کامیاب ہو جاؤ "لعلکم تتقون" ۔ شاید تم پرہیزگار بن جاؤ۔ "لعلکم ترحمون" شاید رحمت خدا تمہارے شاملِ حال ہو۔

جبکہ لفظ لعل تردید اور شک کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ تو ہر چیز کو جانتا ہے۔ اس لیے اس کی ذات اقدس کے لیے مناسب نہیں۔ یہ جملہ بعض دشمنانِ اسلام نے بھی دستاویز بنا رکھا ہے۔ وہ اس کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ اسلام کسی سے قطعی اور یقینی نجات کا وعدہ نہیں کرتا، اس کے وعدے میں شک و شبہ پایا جاتا ہے کیونکہ اس کے اکثر وعدے "لعل" سے شروع ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تعبیر قرآن مجید کی عظمت، حقیقت بینی اور اظہارِ حق کی ایک واضح دلیل ہے کیونکہ قرآن یہ لفظ ایسی جگہ استعمال کرتا ہے جہاں نتیجہ حاصل کرنے کے لیے کچھ شرائط کی پابندی ضروری ہو اور وہ لفظ "لعل" کے ذریعے ان شرطوں کی طرف اجمالی اشارہ کرتا ہے مثلاً آیاتِ قرآن سننے کے وقت خاموش رہنا اور آیات کے مضمون کو کان لگا کر سننا انسان کے لیے رحمت خداوندی کا مستحق ہونے کے لیے کافی نہیں بلکہ اس کے علاوہ آیتوں کا سمجھنا اور ان پر کاربند ہونا لازمی اور ضروری ہے اسی لیے قرآن فرماتا ہے؛

واذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون (اعراف : ۲۰۴)

جس وقت قرآن پڑھا جا رہا ہو تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموشی اختیار کرو، ہو سکتا ہے کہ خدا کی رحمت تمہارے شاملِ حال ہو جائے۔

اگر قرآن یہ کہتا کہ یقیناً تم رحمتِ الٰہی کے مستحق ہو گے تو یہ حقیقت سے دُور ہوتا۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے تحریر کر چکے ہیں کہ اس امر کی کچھ اور بھی شرطیں ہیں۔ لیکن جب وہ "لعلکم" فرماتا ہے تو باقی شرطوں کا حصّہ محفوظ رہ جاتا ہے اس حقیقت کی طرف توجہ نہ دینے کی وجہ سے اعتراض کی گنجائش پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ بعض ہمارے علماء بھی اس بات کے معتقد ہو گئے کہ لفظ "لعل" ایسے موقعوں پر "شاید" کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ حالانکہ یہ قرآن کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہے جس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ (غور کیجئے گا)۔

زیرِ بحث آیت میں بھی باوجودیکہ اسلام کے اعلیٰ ترین احکام میں سے چار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے پھر بھی اس بنا پر کہ کہیں دوسرے اسلامی اصلاحی منصوبوں سے غفلت نہ برتی جائے، لفظ "لعل" استعمال کیا گیا ہے۔

بہرحال اگر آج کے مسلمان مندرجہ بالا آیت کو ایک شعارِ اسلامی کے حوالے سے اپنی زندگی کے پروگراموں میں شامل کریں تو

بہت سی مشکلیں دُور ہو جائیں گی جن کا انہیں اس وقت سامنا ہے۔ آج اسلام اور مسلمانوں پر جو حملے کیے جا رہے ہیں وہ سب ان چاروں یا ان میں سے بعض احکام سے غفلت برتنے یا انہیں بھلا دینے کی وجہ سے ہیں اور یہ ایک انتہائی تکلیف دہ صورت حال ہے۔ اگر مسلمانوں میں استقامت و استقلال کی روح زندہ و بیدار ہو جائے تو وہ دشمنوں کے مقابلے میں بڑھ چڑھ کر کوشش کر سکیں گے۔

حکم خداوندی کے مطابق مرابطہ یعنی جغرافیائی، ثقافتی اور اعتقادی سرحدوں کی بھرپور دیکھ بھال اور حفاظت کریں۔ ہر وقت دشمنوں کی سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہیں اور ان سب باتوں کے علاوہ انفرادی و اجتماعی طور پر تقویٰ و پرہیزگاری کے ذریعے گناہ و فساد کو اپنے معاشرے سے ختم کر دیں تو یقیناً ان کی کامیابی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔

اے خدائے بزرگ و برتر ہم سب کو یہ توفیق عطا فرما کہ ہم تیری آسمانی کتاب کے ان حیات بخش احکام کو اپنی چند روزہ زندگی میں اپنائیں اور اپنی غیر محدود رحمت اور الطاف بے پایاں کو ہمارے شاملِ حال فرما۔ آمین۔

سورۂ نساء

مدنی سورۃ ہے جس کی ایک سو ستر آیات ہیں

سُورۃ نساء

آیات سورہ کی تفسیر سے پہلے چند نکات پر توجہ ضروری ہے۔

۱۔ سورۂ نساء کا محل نزول

بعض مفسرین کے مطابق اس سورہ کی تمام آیتیں (سوائے آیت ۵۸ کے) مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہیں۔ ترتیب و نزول کے لحاظ سے یہ سورہ سورۂ ممتحنہ کے بعد ہے۔ قرآن مجید پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی سورتوں کی موجودہ ترتیب ان کے نزول کے مطابق نہیں ہے۔ چنانچہ بہت سی سورتیں جو کہ مکہ میں نازل ہوئی ہیں وہ قرآن کے آخر میں ہیں اور بہت سی ایسی سورتیں جو مدینہ میں نازل ہوئی ہیں وہ قرآن مجید کے شروع میں ہیں۔ البتہ جس طرح ہم جلد اول کے شروع میں لکھ چکے ہیں کہ ایسے مدارک و اسناد ہمارے پاس موجود ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ قرآن کی سورتوں کی جمع اور موجودہ ترتیب خود حضرت رسول اکرمؐ کے زمانہ میں ہو چکی ہے۔ اس بنا پر قرآن کو جمع کرتے وقت خود حضرت ختمی مرتبتؐ نے مختلف وجوہات کی وجہ سے جن میں سے ایک مطالب کی ... اور ان کی ... طبعی ہے، موجودہ ترتیب میں جمع کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ اس ترتیب کے مطابق پہلی سورت "الحمد" اور آخری سورۃ "الناس" ہے۔ اس میں کوئی لفظ بلکہ حرف تک کسی آیت یا سورت میں کم و بیش نہیں ہوا۔ یہ سورہ آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد کے لحاظ سے سورۂ بقرہ کے بعد طویل ترین سورت ہے اور ۱۷۶ آیات پر مشتمل ہے۔ اس امر کے پیش نظر کہ اس میں بہت سے مباحث عورتوں کے احکام اور حقوق کے بارے میں ہیں اس کا نام "سورۂ نساء" رکھا گیا ہے۔

۲۔ اس سورہ کے اہم موضوعات

ہم یہ تحریر کر چکے ہیں کہ یہ سورت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔ یعنی عین اس وقت جب رسالت مآبؐ حکومت اسلامی کی تاسیس اور ایک صحیح انسانی معاشرے کی تشکیل میں مصروف تھے۔ اسی بنا پر بہت سے قوانین جو معاشرے کو راہ راست پر لانے کے لیے موثر تھے، اس سورت میں نازل ہوئے ہیں۔ چونکہ وہ افراد جو اس معاشرے کی تار و پود کی تشکیل میں لگے ہوئے تھے کل ایسے بت پرست تھے جو زمانہ جاہلیت کی تمام آلودگیوں میں ملوث رہ چکے تھے، اس لیے سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ پہلی رسومات بد کو ان کی روح اور دماغ سے نکالا جائے اور ان کی بجائے ایسے قانون اور منصوبے جو ایک فرسودہ نظام کی بجائے ضروری ہیں، بنائے جائیں۔

اس سورہ کی مباحث کو تین عمومی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱ ۔ ایمان و عدالت کی دعوت اور بدترین دشمنوں کا بائیکاٹ۔

۲ ۔ بُرے معاشرے کا نتیجہ اور انجام سمجھانے کے لیے گزرے ہوئے لوگوں کے حالاتِ زندگی سے روشناس کرانا۔

۳ ۔ امداد کے مستحق افراد کی حمایت مثلاً یتیم اور ان کے حقوق کے متعلق ضروری احکامات۔

۴ - میراث کا قانون طبعی، فطری اور عادلانہ طریقے کی بنیاد پر اس صورت کے خلاف جو اس زمانے میں رائج تھی، جس کے ذریعے نہایت تکلیف دہ حیلے بہانوں سے کمزور لوگوں کو ان کے جائز حق سے محروم کر دیا جاتا تھا۔

۵ - شادی بیاہ کے متعلق قانون اور عام پاک دامنی کی حفاظت کے لیے لائحہ عمل۔

۶ - اموال کی حفاظت کے لیے کلی اور عمومی قوانین۔

۷ - معاشرے کی بنیادی اکائی یعنی خاندان کی حفاظت اور بہبودی کا پروگرام۔

۸ - لوگوں کے ایک دوسرے کے مقابلے میں متقابل حقوق اور ذمہ داریاں۔

۹ - اسلامی معاشرے کے دشمنوں کا تعارف اور ان کے مقابلے کے لیے مسلمانوں کو بیدار رہنے کی تلقین۔

۱۰ - حکومت اسلامی اور حکومت اسلامی کے رہبر کی اطاعت اور فرمانبرداری کا لزوم۔

۱۱ - مسلمانوں کو واضح دشمنوں سے مقابلے اور ان سے جنگ کے لیے ابھارنا۔

۱۲ - ایسے دشمنوں کی پہچان جو ڈھکے چھپے سازشیں کرتے رہتے ہیں۔

۱۳ - ہجرت کی اہمیت اور اس کا ضروری ہونا جبکہ فاسد اور بُرے معاشرے کا سامنا کرنا پڑے۔

۱۴ - میراث کے متعلق مباحث اور جمع شدہ دولت کی وارثوں میں تقسیم۔

اس سورت کی تلاوت کی فضیلت

ایک روایت کے مطابق حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جو شخص سورۂ نساء کی تلاوت کرے گویا اس نے اس قدر مال و زر راہ خدا میں دیا ہے جتنا کہ سورہ نساء کے لحاظ سے بطور وارث ہر ایک مسلمان کا حصہ ہے اور اسی طرح اُسے اس شخص کے برابر ثواب دیا جائے گا جس نے ایک غلام آزاد کیا ہو۔

واضح ہے کہ اس روایت میں اور اس قسم کی دوسری تمام روایتوں میں صرف آیتوں کا پڑھنا مقصد نہیں ہے۔ بلکہ پڑھنا تو سمجھنے کے لیے مقدمہ اور تمہید ہے اور وہ بھی اپنے مقام پر۔

یہ ایک قدم ہے اُسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپنانے کے لیے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان اس سورہ کی آیات سے اپنی زندگی میں عملی نصیحت حاصل کرے تو وہ یہ تمام اجر و ثواب دنیاوی نتائج کے علاوہ حاصل کرے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝

ترجمہ

اللہ کے نام سے جو بخشنے والا اور مہربان ہے۔

۱۔ اے لوگو! اپنے پالنے والے سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک ہی انسان سے پیدا کیا اور اس کی بیوی کو بھی اس کی جنس سے خلق فرمایا اور ان دونوں سے ان گنت مرد اور عورتیں (روئے زمین پر) پھیلا دیں۔ اس خدا سے ڈرو جس کی عظمت اور بزرگی کا تم سب اعتراف کرتے ہو اور جب کوئی چیز ایک دوسرے سے مانگتے ہو تو اسی کے نام سے لیتے ہو۔ (نیز) اپنے رشتہ داروں کے بارے میں (قطع تعلق کرنے سے) پرہیز کرو۔ کیونکہ خداوند عالم تمہارا نگہبان ہے۔

تفسیر

طبقاتی تقسیم اور گروہ بندی کے خلاف جہاد

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ

اس سورہ کی پہلی آیت میں تمام انسانی افراد سے خطاب ہے کیونکہ یہ سورہ ایسے مسائل پر مشتمل ہے جن کے تمام لوگ اپنی زندگی میں محتاج ہیں۔

اس کے بعد تقویٰ اور پرہیزگاری کی دعوت ہے جو کسی معاشرے کو صحیح و سالم اور صحت مند بنانے کے پروگراموں کی بنیاد ہے۔ ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی، میراث کی عادلانہ تقسیم، یتیموں کی حمایت، گھریلو حقوق کی حفاظت اور اسی طرح کے منصوبے ایسے ہیں جو تقویٰ اور پرہیزگاری کی مدد کے بغیر کامیابی کی بلندی کو نہیں چھو سکتے۔

اسی لیے اس سورت کو جو ایسے تمام مسائل پر محیط ہے تقویٰ کی دعوت سے شروع کیا گیا ہے۔

وہ خدا تعالیٰ جو انسان کے سب اعمال کو دیکھنے والا اور ان کی دیکھ بھال کرنے والا ہے اس سورہ کو تقویٰ کی دعوت کے ساتھ شروع کرتا ہے۔

وہ خدا جو انسان کے تمام اعمال کا ناظر ہے تعارف کے طور پر انسان کی ایک ایسی صفت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو انسانی معاشرے کی وحدت و یگانگی کی جڑ ہے۔

الذی خلقکم من نفس واحدۃ

وہ خدا جس نے تمام انسانوں کو ایک انسان سے پیدا کیا۔ اس بنا پر وہ خیالی اور وہمی امتیاز و افتخار جو ہر ایک جماعت نے اپنے لیے گھڑ رکھے ہیں مثلاً امتیازات نسلی، لسانی، علاقائی، قبائلی اور اس قسم کے دوسرے امتیاز جو آجکل دنیا کی سوسائٹی میں ہزاروں خرابیوں کا سبب بنے ہوئے ہیں، ایک اسلامی معاشرے میں نہیں پائے جانے چاہییں کیونکہ ان سب کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ یہ سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں اور ایک ہی گوہر سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس امر کو پیش نظر رکھا جائے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کا معاشرہ چونکہ سب کا سب قبائلی تھا تو اس بات کی اہمیت خوب ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی تعبیرات قرآن حکیم کے دوسرے مقامات میں بھی ہیں جن کی طرف اپنے اپنے مقام پر اشارہ کیا جائے گا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ "نفس واحدۃ" سے کون مراد ہے؟ اس سے مراد ایک فرد شخص ہے یا ایک فرد نوعی یعنی (مذکر کی جنس)۔ اس میں شک نہیں کہ اس تعبیر کا ظاہری مفہوم تو واحد فرد کے بارے میں ہے اور یہ اس پہلے انسان کی طرف اشارہ ہے جسے قرآن آدم کے نام سے آج کے انسانوں کے باپ کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ بنی آدم کی تعبیر جو متعدد آیات قرآنی میں کی گئی ہے وہ بھی اسی طرف اشارہ ہے اور یہ احتمال کہ اس سے مراد وحدت نوعی ہے بعید معلوم ہوتا ہے۔

وخلق منها زوجها

یہ جملہ بظاہر یہ بتاتا ہے کہ حضرت آدمؑ کی زوجہ محترمہ انہی سے پیدا ہوئی ہیں بعض مفسرین اس سے یہ سمجھے ہیں کہ حضرت آدمؑ کی بیوی حوا حضرت آدمؑ کے بدن سے پیدا ہوئی ہیں۔ کچھ معتبر روایتیں یہ بھی کہتی ہیں کہ حضرت حوا آدمؑ کی پسلیوں سے پیدا ہوئی ہیں اور اس پر اس آیت کو گواہ ٹھہرایا گیا ہے۔ (تورات کے سفر تکوین کی دوسری فصل بھی ان ہی معنوں کی وضاحت کرتی ہے لیکن قرآن کی دوسری آیات کی طرف توجہ کرنے سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں شک و شبہ دور ہو جاتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے حضرت آدمؑ کی بیوی کو انہی کی جنس (جنس بشر) سے پیدا کیا۔

چنانچہ سورۂ روم کی آیت ۲۱ میں ہے:

ومن آیاته ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیها

قدرت خدا کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری بیویاں تمہاری ہی جنس میں سے پیدا کی ہیں تاکہ تمہیں ان کی وجہ سے سکون حاصل ہو۔

سورۂ نحل کی آیت ۷۲ میں فرماتا ہے:

و اللہ جعل لکم من انفسکم ازواجا

خدا نے تمہاری بیویاں تمہاری جنس میں سے بنائی ہیں۔

واضح ہو کہ ان دونوں آیتوں میں تمہاری بیویوں کو تم میں سے قرار دیا کے یہ معنی ہیں کہ انہیں تمہاری جنس سے قرار دیا نہ کہ تمہارے اعضائے بدن میں سے۔

اور اس روایت کے مطابق جو تفسیر عیاشی میں حضرت امام محمد باقرؑ سے منقول ہے حضرت حوا کو حضرت آدمؑ کی پسلیوں میں سے خلقت کو غلط قرار دیا گیا ہے۔ نیز یہ وضاحت کی گئی ہے کہ حضرت حوا حضرت آدمؑ کی بچی ہوئی مٹی سے پیدا ہوئی ہیں۔

حضرت آدمؑ کے بچوں کی شادیاں کس طرح ہوئیں

و بث منہما رجالا کثیرا و نساء

یہ جملہ بتاتا ہے کہ حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا ہوئیں۔ اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم کے بیٹوں کی نسل کی بہتات حضرت آدم اور ان کی بیوی کے طریقہ سے ہی ظاہر ہوئی تھی اور اس میں کسی تیسرے وجود کا عمل دخل نہ تھا۔ اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ آدمؑ کی اولاد (بھائی، بہن) نے ایک دوسرے سے شادی کی۔ کیونکہ اگر انہوں نے کسی اور نسل کی بیویوں سے شادی کی ہو تو لفظ منہما ان دونوں پر صادق نہیں آتا۔

یہ موضوع بہت سی حدیثوں میں بھی آیا ہے اور کوئی زیادہ تعجب خیز بھی نہیں ہے۔

کیونکہ اس استدلال کے مطابق جو بعض حدیثوں میں ائمہ اہل بیتؑ سے مروی ہے یہ شادی بیاہ اس وقت مباح تھا کیونکہ اس زمانے میں بھائی بہن کی شادی کی حرمت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ واضح ہے کہ کسی کام کی ممانعت کا دار و مدار اسی بات پر ہے کہ خدا کی طرف سے اس کی حرمت کا حکم آئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مصلحت اور ضرورت کی وجہ سے ایک کام ایک زمانے میں جائز ہو اور اس کے بعد حرام۔

مگر یہ بھی ہے کہ بعض دوسری حدیثوں میں اس مسئلہ کی وضاحت کی گئی ہے کہ حضرت آدمؑ کے بیٹے بیٹیوں کی ایک دوسرے سے شادیاں نہیں ہوئیں۔ اور جو لوگ ایسے شادی بیاہ کا اعتقاد رکھتے ہیں ان پر سخت تنقید کی گئی ہے۔

اگر یہ بنا ہو کہ حدیثیں آپس میں ٹکراتی ہیں۔ اس لئے جو حدیث قرآن کے مطابق ہو اسے درست سمجھا جائے تو پھر پہلی ہی بات کو ماننا پڑے گا۔ کیونکہ ان حدیثوں کا مفہوم مندرجہ بالا آیت کے عین مطابق ہے۔ یہاں ایک احتمال اور بھی ہے کہ یہ سوچا جائے کہ حضرت آدمؑ کے بیٹوں نے اپنے سے پہلے بچے کھچے انسانوں میں شادیاں کی تھیں۔

کیونکہ بعض روایات کے لحاظ سے حضرت آدمؑ روئے زمین کے پہلے انسان نہیں تھے۔ آج کا علمی مطالعہ بھی بتاتا ہے کہ نوع انسانی تقریباً چند ملین سال پہلے کرۂ زمین پر زندگی بسر کرتی تھی جبکہ حضرت آدمؑ کی تاریخ پیدائش سے لے کر اب تک کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ بنابریں ہمیں یہاں لینا چاہیے کہ حضرت آدمؑ سے پہلے بھی دوسرے انسان زمین پر رہتے تھے جو ان کی پیدائش کے وقت ختم ہو رہے تھے تو اس امر میں کیا رکاوٹ ہے کہ حضرت آدمؑ کے بیٹوں نے اپنے سے پہلے باقی رہنے والے لوگوں میں سے کسی ایک خاندان میں

شادیاں کی ہوں [1]

لیکن ہم تحریر کر چکے ہیں کہ یہ احتمال بھی آیہ مندرجہ بالا کی ظاہری صورت کے ساتھ کوئی خاص مناسبت نہیں رکھتا۔ یہ بہت بحث طلب معاملہ ہے۔ جو تفسیری بحث کی گنجائش سے خارج ہے۔

واتقوا اللہ الذی تساءلون بہ والارحام

وہ اہمیت جو تقویٰ کو کسی صحیح معاشرے کی بنیاد رکھنے کے لیے حاصل ہے۔ وہ اس بات کا سبب بنی ہے کہ لوگوں کو دوبارہ پرہیزگاری اور تقویٰ کی طرف بلایا جائے۔ البتہ یہاں پر ایک جملہ بڑھایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: خدا سے ڈرو، جو تمہاری نگاہ میں عظمت اور بزرگی کا مالک ہے اور تم جب کسی سے کوئی چیز مانگتے ہو تو اس کا نام لیتے ہو [2]

پھر کہتا ہے: والارحام

یہ لفظ اللہ پر عطف ہے۔ اسی لیے مشہور قرأت میں مفتوح و منصوب پڑھا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کے معنی یہ ہوں گے: واتقوا الارحام یعنی رشتہ داروں کی قطع رحمی سے ڈرو اور یہاں موضوع کا ذکر پہلے تو صلہ رحمی کی انتہائی اہمیت کا پتہ دیتا ہے کہ قرآن اس کا اس قدر قائل ہے کہ اس نے ارحام کا نام خداوند عالم کے نام نامی اور اسم گرامی کے ساتھ ساتھ لیا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس مطلب کی طرف اشارہ ہے جس کا آیت کے شروع میں ذکر ہوا ہے۔ وہ یہ کہ تم سب کا باپ اور ماں ایک ہی ہیں۔ درحقیقت سب آدمؑ کی اولاد آپس میں ایک دوسرے کی رشتہ دار ہے۔ یہ رشتہ اور ربط ضبط اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ تم سب انسانوں کے ساتھ چاہے وہ کسی نسل اور قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں اپنے کنبے کے افراد کی طرح محبت کرو۔

ان اللہ کان علیکم رقیبا۔

رقیب اصل میں اس شخص کو کہتے ہیں جو بلند جگہ سے حالات کا جائزہ لے۔ اس کے بعد کسی چیز کے محافظ و نگہبان کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ کیونکہ نگہبانی کے لیے دیکھنا اور دیکھ بھال کرنا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ رقیب کی جگہ کی بلندی ظاہری نگاہ کے لحاظ سے ہو کہ وہ ایک بلند مقام پر بیٹھا ہوا نگرانی کر رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ معنوی لحاظ سے ہو۔ مندرجہ بالا جملہ میں فرماتا ہے: خدا تمہارا رقیب ہے اور وہ تمہارے تمام اعمال اور نیتوں کو دیکھتا اور جانتا ہے۔ اور ضمناً یہ مفہوم بھی ہے کہ حوادث میں وہی تمہارا نگہبان بھی ہے۔

"کان" مندرجہ بالا جملے میں یہ لفظ جو کہ فعل ماضی ہے تاکید کے لیے ہے۔

---

[1] اجمالی طور پر دوسرے یا تیسرے نظریہ کو ترجیح دینا چاہیے خصوصاً جبکہ روایات بھی موجود ہیں۔ مزید برآں بہن بھائی کی شادی کسی معاشرے میں اچھی نہیں سمجھی جاتی۔ یہاں تک کہ وہ معاشرے جو کسی دین کے پیرو بھی نہیں ہیں۔ آیت بھی نص نہیں ظاہر ہی ہے۔ ادھر موافقت اور مخالفت عامہ کا اصول بھی ہے (مترجم)۔

[2] تساءلون تسائل کے مادہ سے ہے۔ جس کے معنی ایک دوسرے سے سوال کرنے کے ہیں۔ تسائل باللہ کے معنی یہ ہیں کہ لوگ جب ایک دوسرے سے کوئی چیز مانگیں تو اسئلك باللہ تجھے خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہتے ہیں اور یہ ان کی نظروں میں خداوند عالم کی عظمت کی نشانی ہے۔

۲- وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ○

ترجمہ

۲ یتیموں کے مال (جب وہ بالغ ہوجائیں) انہیں دے دو اور (اپنے) بُرے مال (یتیموں کے) اچھے مال سے تبدیل نہ کرو اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر یا تبدیل کر کے نہ کھاؤ کیونکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

شانِ نزول

بنی غطفان قبیلے کے ایک شخص کا بھائی بہت دولت مند تھا۔ وہ دنیا سے چل بسا تو اس کے بھائی نے اپنے یتیم بھتیجوں کی سرپرستی کے نام پر اس کے مال میں تصرف کیا۔ جس وقت اس کا بھتیجا بالغ ہوگیا تو اس نے اس یتیم کا حق دینے سے انکار کر دیا۔

جب یہ مقدمہ حضرت رسول اکرمؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس غاصب نے آیت سننے کے بعد توبہ کرلی اور مال اس کے مالک کو واپس کرتے ہوئے کہا:

اعوذ باللہ من الحوب الکبیر

میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ کہیں بڑے گناہ میں آلودہ نہ ہوجاؤں۔

تفسیر

یتیموں کے مال میں خیانت حرام ہے۔ ہر معاشرے میں نت نئے حوادث کی وجہ سے باپ دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچے رہ جاتے ہیں۔

البتہ بُرے معاشرے جو داخلی جنگ میں پھنسے رہتے ہیں۔ جیسے زمانہ جاہلیت کا عرب معاشرہ تھا ان میں یتیم بچوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے، جنہیں حکومتِ اسلامی اور ہر ایک مسلمان کی حمایت اور سرپرستی میں رہنا چاہیے۔

آیت مذکورہ بالا میں یتیموں کے مال کے بارے میں تین اہم حکم دیئے گئے ہیں۔

۱ - واتوا الیتامیٰ اموالھم۔ اس جملے میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب یتیم بالغ ہوجائیں تو ان کے مال ان کے سپرد کر دیئے جائیں۔ یعنی ان کے اموال میں تمہارا تصرف صرف امین، ناظر اور وکیل کی حیثیت سے ہے نہ کہ مالک کے طور پر۔

۲ - ولا تتبدلوا الخبیث بالطیب۔ اور کبھی ان کے اعلیٰ اور پاکیزہ مال کو اپنے گھٹیا اور ناپاک مال سے تبدیل نہ کرو۔ یہ حکم تو اصل میں ظلم و ستم سے بچنے کے لیے ہے کیونکہ بعض اوقات یتیموں کے سرپرست اس بہانے سے کہ مال کی تبدیلی یتیم کے فائدے میں ہے یا اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگر پڑ رہا ہے تو صحیح ہوجائے گا یہ کہہ کر یتیموں کے اچھے

اور خالص مال لے لیتے اور اپنے بُرے اور ناپسندیدہ مال ان کی جگہ رکھ دیتے تھے۔

۳۔ ولا تاکلوا اموالھم الی اموالکم اور ان کے مال اپنے مالوں کے ساتھ نہ کھاؤ۔ یعنی یتیموں کے مال کو اپنے مال کے ساتھ غلط ملط نہ کرو کہیں اس طریقے سے مقصد سب کو اپنی ملک بنانا ہو یا یہ کہ اپنے بُرے مال کو ان کے اچھے مال میں نہ ملاؤ کہ جس کا نتیجہ یتیموں کے حق کی پائمالی ہو۔

جملہ بالا میں "لفظ" الی دراصل مع (ساتھ) کے معنی میں ہے۔

انہ کان حوبا کبیرا۔

آیت کے آخر میں اس امر کی اہمیت ثابت کرنے کے لیے تاکید فرماتا ہے کہ یتیموں کے مال میں اس قسم کی ہیرا پھیری بہت بڑا گناہ ہے۔ راغب کتاب مفردات میں کہتا ہے اور دراصل الحوبۃ ایسی ضرورت کے معنی میں ہے جو انسان کو گناہ کی طرف کھینچتی ہے۔

چونکہ سرپرستوں کے ظلم و ستم یتیموں کے مال پر زیادہ تر ضرورت و احتیاج کی وجہ سے یا اس بہانے سے ہوتے ہیں، اس لیے آیت مذکورہ میں لفظ "اثم" (گناہ) کی بجائے لفظ "حوب" استعمال کیا گیا ہے تاکہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو جائے۔

قرآن مجید کی مختلف آیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اسلام اس امر کی بہت زیادہ اہمیت کا قائل ہے۔ چنانچہ وہ یتیموں کے مال میں خیانت کرنے والوں کو بڑی شدت کے ساتھ سزا کی دھمکیاں دیتا ہے۔ وہ قطعی، واضح اور محکم عبارتوں کے ساتھ سرپرستوں کو یتیموں کے اموال کی کڑی دیکھ بھال کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ جس کی تفصیل چند آیتوں کے بعد اسی سورت میں اور سورۂ انعام کی آیت ۱۵۲ اور سورۂ اسرائی کی آیت ۳۴ کے ذیل میں آئے گی۔

ان آیتوں کے سخت لب و لہجے نے مسلمانوں کے دلوں پر اتنا اثر کیا کہ وہ اس سے بھی ڈرنے لگے کہ اپنے اور یتیموں کے لیے مشترکہ کھانا پکائیں۔ اس وجہ سے ان کا کھانا اپنے اور اپنے بچوں کے کھانے سے الگ پکواتے تھے اور یہ امر دونوں کی تکلیف کا سبب بنتا تھا۔ اس لیے سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۰ میں انہیں یہ اجازت دی گئی کہ اگر ان کا مقصد اپنے مال یا کھانے کے ساتھ یتیموں کے مال اور کھانے کو مخلوط کرنے سے خیر خواہی اور اصلاح ہو تو اس صورت میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مزید توضیح کے لیے سورۂ بقرہ کی اسی آیت کے ذیل میں تفسیر نمونہ کی پہلی جلد ملاحظہ فرمایئے۔

۳۔ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ۚ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝

ترجمہ

۳۔ اور اگر تم کو اس بات کا ڈر ہو (کہ یتیم لڑکیوں سے شادی کی صورت میں) ان سے انصاف نہ کر سکو گے تو (ان سے شادی

کرنے سے صرف نظر کرلو اور) دوسری پاک عورتوں سے نکاح کرو، دو یا تین یا چار بیویاں اور اگر تم کو ڈر ہو (کہ متعدد بیویوں کے بارے میں) عدل ملحوظ نہ رکھ سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر قناعت کرو اور یا جن عورتوں کے تم مالک ہو ان سے استفادہ کرو۔ یہ طریقہ بہتر طور پر ظلم و ستم سے محفوظ رکھتا ہے۔

شانِ نزول

اس آیت کے بارے میں ایک خاص شانِ نزول منقول ہے اور وہ یہ کہ قبل از اسلام اہلِ حجاز کفالت و سرپرستی کے لیے یتیم بچیوں کو اپنے گھر لے جاتے تھے اور پھر ان سے شادی کر کے ان کے مال کو اپنی ملکیت بنا لیتے تھے کیونکہ سب کچھ انہی کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ان کا حق مہر بھی معمول سے کم مقرر کرتے تھے۔ اور اگر ان سے معمولی سی تکلیف بھی پیدا ہوتی تو آسانی سے انہیں چھوڑ دیتے اور وہ اس بات پر تیار نہ ہوتے کہ ایک عام بیوی کی حیثیت سے ہی ان سے تعلق باقی رکھیں۔

ان حالات میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں یتیموں کی سرپرستی کرنے والوں کو حکم دیا گیا کہ اگر وہ یتیم لڑکیوں سے شادی کریں تو ان کے بارے میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھیں اور اگر ایسا نہ کر سکیں تو پھر ان سے شادی نہ کریں اور دوسری عورتوں میں سے شادی کے لیے کسی کو منتخب کریں۔

و ان خفتم الا تقسطوا فی الیتامیٰ فانکحوا ......

گذشتہ آیت میں یتیموں کے مال کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔ اب اس آیت میں ان کے ایک اور حق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اگر تمہیں خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں سے شادی کے وقت تم حقوق زوجیت اور ان کے مال کے بارے میں عدل و انصاف نہ کر سکو گے تو ان سے شادی نہ کرو اور دوسری عورتوں میں سے انتخاب کرو۔

جو کچھ کہا جا چکا ہے اس پر نظر رکھتے ہوئے آیت کی تفسیر مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ اس سے اس اعتراض کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ آیت کے شروع میں یتیموں کا ذکر ہے اور اس کے آخری حصے میں ازدواج کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور یہ دونوں ظاہراً ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت کے ذیل میں شادی بیاہ کا تذکرہ ہے البتہ آیت کی ابتداء میں کہا گیا ہے کہ اگر تم یتیموں سے شادی کے سلسلے میں عدل و انصاف سے کام نہیں لے سکتے تو پھر کیا ہی اچھا ہے کہ اس سے صرف نظر کر لو اور شادی کے لیے ان یتیم لڑکیوں کی بجائے دوسری عورتوں میں سے کسی کو منتخب کرو۔

مفسرین نے اگرچہ اس سلسلے میں بہت سی مختلف باتیں کی ہیں لیکن جو کچھ خود آیت سے سمجھ میں آتا ہے وہ وہی ہے جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں یعنی آیت یتیموں کے سرپرستوں سے مخاطب ہے جنہیں گذشتہ آیت میں یتیموں کے مال کی حفاظت کے بارے میں مختلف احکام دیے جا چکے ہیں اور اس آیت میں ان سے یتیموں سے شادی کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے کہ جیسے انہیں یتیموں کے اموال میں عدل و انصاف سے کام لینا چاہیے اسی طرح یتیم لڑکیوں سے شادی کی صورت میں بھی انتہائی توجہ سے ان کے حقوق کو ملحوظ نظر رکھنا چاہیے ورنہ ان سے شادی نہیں کرنا چاہیے اور دوسری عورتوں کو منتخب کرنا چاہیے۔

اس آیت کی تفسیر کے بارے میں دیگر شواہد کے علاوہ اس سورہ کی آیت ۱۲۷ بھی ہے جس میں صراحت سے یتیم لڑکیوں سے شادی کرنے کے لیے عدل کو ملحوظ خاطر رکھنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت اسی آیت کے ضمن میں آئے گی۔ اس سلسلے میں مذکورہ روایات بھی اسی تفسیر کی تائید کرتی ہیں[1]۔

رہی وہ روایت جو امیرالمومنین حضرت علیؑ کے حوالے سے بیان کی گئی ہے کہ اس آیت کے اول و آخر کے درمیان قرآن کا کافی مقدار میں حصہ تھا جو حذف ہو گیا ہے —— تو اس سلسلے میں واضح رہے کہ یہ روایت سند کے لحاظ سے کسی طرح بھی معتبر نہیں ہے۔

ایسی احادیث جو قرآن کی تحریف یا اس کے بعض حصوں کے غتر بود ہو جانے کے بارے میں ہیں دراصل قرآن کا اعتبار گھٹانے کے لیے اسلام دشمنوں اور منافقوں کی طرف سے گھڑی گئی ہیں یا بعض افراد جو آیت کے آغاز و انجام کو نہیں سمجھ سکے انہوں نے فرض کیا ہے کہ بیچ میں سے کچھ حذف یا ضائع ہو گیا ہے اور آہستہ آہستہ ان کا یہ مفروضہ روایت کی شکل اختیار کر گیا ہے جبکہ ہم جان چکے ہیں کہ آیت کے جملے ایک دوسرے سے مکمل ربط رکھتے ہیں۔

مثنیٰ و ثلاث و رباع

لغت میں مثنیٰ کا معنی ہے دو دو، ثلاث کا تین تین اور رباع کا چار چار۔ آیت میں روئے سخن چونکہ تمام مسلمانوں کی طرف ہے اس لیے اس کا معنی یوں ہوگا: یتیم لڑکیوں پر ظلم و ستم سے بچنے کے لیے تم ان سے شادی کرنے سے اجتناب کرو اور ان کی بجائے ایسی عورتوں سے شادی کرو جن کی معاشرتی اور خاندانی حیثیت ایسی ہو جو تمہیں ان پر ظلم کرنے کی اجازت نہ دے اور تم ان میں سے دو، تین یا چار عورتوں سے شادی کر سکتے ہو۔ البتہ مخاطب چونکہ تمام مسلمان ہیں اس لیے دو دو یا تین تین یا چار چار کہا گیا ہے ورنہ اس میں شک نہیں کہ زیادہ سے زیادہ بیویوں کی تعداد (وہ بھی خاص شرائط کی موجودگی میں) چار ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ مندرجہ بالا جملے میں واؤ دراصل "او" (یا) کے معنی میں ہے اور اس کا مقصد یہ نہیں کہ دو کے بعد مزید تین اور تین کے بعد مزید چار کیونکہ اس طرح تو نو ۹ بن جاتی ہیں اور اگر مقصود یہی ہوتا تو صراحت سے نو کہا جاتا نہ کہ اس طرح سے ایک دوسرے سے الگ اور پیچیدہ طریقے پر ہوتا۔ علاوہ ازیں فقہ اسلامی میں یہ مسئلہ ضروریاتِ دین میں سے ہے کہ چار سے زیادہ بیویاں کرنا مطلقاً ممنوع ہے۔

بہر حال مندرجہ بالا آیت تعددِ ازدواج کے لیے صریح دلیل ہے البتہ ان شرائط کے ساتھ جن کی طرف جلد اشارہ کیا جائے گا۔

فان خفتم الا تعدلوا فواحدة

اس کے بعد فوراً کہا گیا ہے کہ یہ اجازت مکمل عدالت کو ملحوظ رکھنے سے مشروط ہے اور اگر عدالت نہیں کر سکتے تو اسی ایک بیوی پر اکتفا کرو تاکہ دوسروں پر ظلم و ستم کرنے سے بچ سکو۔

---

[1] نور الثقلین، جلد اوّل صفحہ ۴۳۸ اور تفسیر المنار زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

او ما ملکت ایمانکم — یا کسی اور بیوی کے انتخاب کی بجائے جو کنیز تمہاری ملکیت ہے اس سے استفادہ کرو کیونکہ ان کی شرائط آسان سی ہیں (اگرچہ انہیں بھی ان کے حقوق ادا کیے جانا چاہئیں)۔

ذٰلک ادنیٰ الا تعولوا — یہ (بیوی یا کنیز کے چناؤ کا) کام ظلم و ستم اور عدالت سے انحراف سے بہتر بچاؤ کرتا ہے۔ غلامی کے مسئلے کے بارے میں اور اس سلسلے میں اسلام کے نظریے کے متعلق متعلقہ آیات میں تفصیلی بحث کی جائے گی۔

بیویوں سے عدالت کا مفہوم

اس سے قبل کہ ہم اسلام میں بیویوں کی تعداد کے فلسفہ پر بات کریں ضروری ہے کہ اس امر پر بحث کی جائے کہ 'بیویوں سے عدالت' کا کیا مفہوم ہے کیونکہ اسے بیویوں کی تعداد کے سلسلے میں ایک شرط کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

کیا یہ عدالت امورِ زندگی سے مربوط ہے، مثلاً ہم بستری، وسائلِ زندگی کی فراہمی، سہولت اور آسائش و آرام مہیا کرنا یا اس سے مراد حریمِ دل اور جذباتِ انسانی کی عدالت بھی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ محبت و الفت کے معاملے میں عدالت کرنا قدرتِ انسانی سے خارج معاملہ ہے۔ کون ایسا شخص ہے جو جذبۂ محبت پر ہر لحاظ سے دسترس رکھے جب کہ اس کے عوامل اس کی اپنی ذات سے باہر ہیں۔ اس بناء پر خدا تعالیٰ نے اس بارے میں عدالت کو واجب قرار نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ اسی سورہ نساء کی آیہ ۱۲۹ میں فرماتا ہے:

ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم

تم جس قدر بھی کوشش کرو اپنی بیویوں کے درمیان (قلبی میلانات کے لحاظ سے) عدالت و مساوات برقرار نہیں رکھ سکتے۔

لہٰذا اندرونی محبت جب تک عملی پہلوؤں کی بناء پر بعض بیویوں کی ترجیح کا سبب نہ بنے ممنوع نہیں ہے۔ مرد پر جو ذمہ داری ہے وہ عملی اور خارجی پہلوؤں کے بارے میں عدالت سے متعلق ہے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ زیر بحث آیت — وان خفتم الا تعدلوا فواحدة اور آیت ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم کو آپس میں ملا کر اور منسلک قرار دے کر یہ نتیجہ نکالیں کہ تعدد ازدواج اسلام میں مطلقاً ممنوع ہے، وہ بہت ہی بڑے اشتباہ کا شکار ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایک آیت میں عدالت کو اس سلسلے میں شرط قرار دیا گیا ہے اور دوسری میں اس سلسلے میں مردوں کے لیے عدالت کرنا محال قرار دیا گیا ہے اس لیے ایک سے زیادہ شادی ممنوع ہے اور یہی ان کا اشتباہ ہے کیونکہ جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ وہ عدالت جو انسان کے بس میں نہیں ہے وہ قلبی میلانات سے متعلق ہے اور یہ تعدد ازدواج کی شرائط میں شامل نہیں اور جو عدالت شرائط میں سے ہے وہ عملی پہلوؤں سے متعلق ہے۔ اس کی شاہد سورہ نساء کی آیت ۱۲۹ ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

فلا تمیلوا کل المیل فتذروها کالمعلقة

اب جب کہ تم محبت کے سلسلے میں اپنی بیویوں سے مکمل مساوات نہیں کر سکتے تو کم از کم سب میلان ایک

ہی کی طرف نہ رکھو کہ کہیں دوسری کو معلق بنا کر ہی رکھ دو۔
خلاصہ یہ کہ ان لوگوں نے آیت کے کچھ حصے کو تو سامنے رکھا ہے اور کچھ کو فراموش کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ تعددِ ازدواج کے ضمن میں ایسے اشتباہ کا شکار ہو گئے ہیں جو ہر محقق کے لیے باعثِ تعجب ہے۔
علاوہ ازیں فقہِ اسلامی اور اس کے مختلف منابع و مصادر کے لحاظ سے اہلِ تشیع اور اہلِ سنت میں تعددِ ازدواج اور اس کی شرائط کے بارے میں کوئی اختلاف و نزاع نہیں ہے بلکہ اس کا شمار فقہِ اسلامی کی ضروریات اور بدیہات میں ہوتا ہے۔ اب ہم اس اسلامی حکم کی حکمت و فلسفے کی طرف لوٹتے ہیں۔

تعددِ ازدواج ایک اجتماعی ضرورت

مندرجہ بالا آیت میں تعددِ ازدواج کو (سخت شرائط اور معین حدود کے ساتھ) جائز قرار دیا ہے۔ اب ہم ان سوالات اور حملوں کا سامنا کریں گے جو مخالفین نے سطحی مطالعہ اور بے شعور احساسات کے باعث کیے ہیں۔ اہلِ مغرب بالخصوص اس سلسلے میں بہت اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے مردوں کو حرم سرا بنانے اور لا تعداد بیویاں رکھنے کی اجازت دے دی ہے حالانکہ اسلام نے اس طرح سے حرم سرا کی تشکیل کی اجازت نہیں دی جیسے ان کا خیال ہے اور نہ ہی لا تعداد اور غیر مشروط بیویوں کی اجازت دی ہے۔
اس کی وضاحت یہ ہے کہ قبل از اسلام کے مختلف معاشروں کی کیفیت کا مطالعہ کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ غیر محدود طور پر تعددِ ازدواج ان میں ایک عام سی چیز تھی۔ یہاں تک کہ بعض بت پرست جب مسلمان ہوئے تو ان کی دس سے بھی زیادہ بیویاں تھیں لہٰذا تعددِ ازدواج کی بنیاد اسلام نے نہیں رکھی اور نہ یہ کوئی نئی ایجاد ہے۔ بلکہ اسلام نے تو اسے انسانی زندگی کے تقاضوں کی روشنی میں محدود کر دیا ہے اور مزید یہ کہ اس کے لیے سخت قسم کی شرائط اور قیود مقرر کر دی ہیں۔
اسلامی قوانین انسان کی حقیقی ضروریات کے گرد گھومتے ہیں۔ یہ قوانین پراپیگنڈا اور جذبات کی رو میں بہ کر نہیں بنائے گئے۔ تعددِ ازدواج کا معاملہ بھی اسلام نے اپنے اسی مزاج کے مطابق پیش کیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ زندگی کے گوناگوں حوادث میں مرد عورتوں کی نسبت موت کے خطرات سے زیادہ دوچار ہوتے ہیں۔ جنگوں اور دیگر حوادث میں زیادہ تر مرد ہی موت کا شکار ہوتے ہیں۔ نیز اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عورت کی نسبت مرد کی جنسی زندگی کہیں زیادہ طولانی ہوتی ہے۔ کیونکہ عورتیں ایک معین مرحلے کے بعد اپنی جنسی آمادگی کھو بیٹھتی ہیں جبکہ مردوں کا معاملہ مختلف ہے نیز ایامِ ماہواری اور وضعِ حمل کے کچھ دنوں میں عملی طور پر عورتوں کے لیے جنسی ملاپ ممنوع ہے جبکہ مردوں کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں۔
ان تمام باتوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے بعض پہلو اور بھی قابلِ توجہ ہیں۔ بعض عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو مختلف وجوہ کی بنا پر اپنے شوہروں سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اس صورت میں وہ مردوں کے لیے اس پہلو سے قابلِ توجہ نہیں ہوتیں کہ وہ ان کے پہلے شوہر ہوں ۔ اب اگر تعددِ ازدواج کی سہولت نہ ہو تو وہ ساری عمر بغیر شوہر کے بیٹھی رہیں۔ اکثر اخبارات و جرائد میں ایسی خبریں چھپتی ہیں کہ بعض ایسی بیوہ عورتیں ہیں جو تعددِ ازدواج کے محدود ہونے کے باعث اپنی زندگی کی بے سروسامانی پر شکوہ کناں ہیں اور مردوں کی طرف سے ایک سے زیادہ شادیاں نہ کرنے کو اپنے ساتھ ایک ظالمانہ سلوک تصور کرتی ہیں۔

ان حقائق کو ایسے مواقع پر سامنے رکھیں کہ جہاں مرد اور عورت کے درمیان توازن ختم ہو جاتا ہے تو ہم مجبور ہیں کہ ذیل کی تین صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کیا جائے۔

۱۔ ہر صورت میں مرد ایک ہی بیوی پر قناعت کریں اور جو عورتیں بچ جائیں وہ تمام عمر بغیر شوہر کے گزار دیں اور تمام فطری تقاضوں اور اندرونی خواہشات کو دبائے رکھیں۔

۲۔ مرد قانونی طور پر تو ایک ہی بیوی رکھیں لیکن آزاد اور غیر شرعی جنسی روابط بے شوہر عورتوں سے رکھیں اور انہیں داشتہ بنا کر رکھیں۔

۳۔ جو لوگ ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتے ہیں اور جسمانی، مالی اور اخلاقی لحاظ سے انہیں کوئی اور مشکل درپیش نہ ہو نیز وہ اپنی بیویوں اور بچوں کے درمیان کامل عدالت قائم رکھ سکیں انہیں اجازت دی جائے کہ وہ اپنے لیے ایک سے زیادہ بیویوں کا انتخاب کریں۔

یہ مسلم ہے کہ ان تین راستوں کے علاوہ کوئی اور راستہ موجود نہیں۔

پہلے راستے کے انتخاب کا مطلب یہ ہے کہ ہم انسان کی فطرت، سرشت اور روحانی و جسمانی ضروریات کے خلاف جنگ کریں اور ایسی عورتوں کے جذبات و احساسات کی پرواہ نہ کریں اور یہ وہ جنگ ہے جس میں کامیابی کی کوئی امید نہیں اور اگر فرض کر لیا کہ ایسا ہو جائے تو اس طرزِ عمل کے غیر انسانی پہلو کسی سے مخفی نہیں ہیں۔

دوسرے لفظوں میں تعددِ ازدواج کا مسئلہ ضرورت کے مواقع پر صرف پہلی بیوی کی آنکھ کے دریچہ سے نہیں دیکھا جانا چاہیے بلکہ اس کا مطالعہ دوسری بیوی کی آنکھ کے دریچہ سے کیا جانا چاہیے جو لوگ پہلی بیوی کی مشکلات کو دوسری بیوی کے معاملے میں مثال بناتے ہیں وہ دراصل تین زاویوں والے مسئلے کو صرف ایک زاویے سے دیکھتے ہیں کیونکہ تعددِ ازدواج کا مسئلہ مرد کی نگاہ کے زاویے سے، پہلی بیوی کی نگاہ کے زاویے سے اور دوسری بیوی کی نگاہ کے زاویے سے دیکھا جانا چاہیے اور ان تینوں کے مفادات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس بارے میں فیصلہ کیا جانا چاہیے۔

دوسری راہ کے انتخاب کا مطلب ہے کہ فحش اور قبیح کاموں کو قانونی حیثیت دے دی جائے اور عورتوں کو داشتہ کی حیثیت سے جنسی لذتوں کے لیے استعمال کیا جائے، ان کے لیے نہ اطمینان و سکون ہو اور نہ ان کا کوئی مستقبل اور دراصل ان کی شخصیت کو روند ڈالا جائے۔ یہ کوئی ایسا طریقہ نہیں جسے کوئی عقلمند انسان تجویز کرے۔

لہٰذا صرف تیسرا طریقہ باقی رہ جاتا ہے جو عورتوں کی فطری خواہشات اور طبعی ضروریات کا حل بھی ہے اور فحش و قبیح امور کے برے نتائج اور تباہ کن زندگی سے عورتوں کی نجات کا راستہ بھی ہے۔ اس طرح سے عورت معاشرے کو بھی گردابِ گناہ سے نکال دے گی۔

البتہ توجہ رہے کہ تعددِ ازدواج کا جواز اگرچہ معاشرے کی ایک ضرورت ہے اور اسلام کے مسلم احکام میں سے ہے لیکن موجودہ زمانے میں اس کی شرائط کی تکمیل گذشتہ زمانے سے بہت مختلف ہے کیونکہ گذشتہ زمانے میں زندگی سادہ اور بسیط سی تھی لہٰذا عورتوں میں کامل مساوات کا لحاظ رکھنا آسان تھا اور زیادہ تر لوگ اس سے عہدہ برآ ہو لیتے تھے لیکن ہمارے زمانے

میں جو شخص اس قانون سے استفادہ کرنا چاہے اُسے چاہیے کہ ہر لحاظ سے عدالت کو ملحوظِ خاطر رکھے۔ اگر وہ ایسا کر سکے تو یہ اقدام کرے اور بنیادی طور پر یہ قدم ہوا و ہوس کی بناء پر نہیں ہونا چاہیے۔

تعجب کی بات ہے کہ اہل مغرب کی طرح جو لوگ تعددِ ازدواج کے مخالف ہیں اپنی تاریخ میں ایسے حوادث کا شکار رہے ہیں جن سے ان کی یہ ضرورت مکمل طور پر واضح ہو گئی ہے مثلاً دوسری عالمی جنگ کے بعد جنگ زدہ ممالک میں خصوصاً جرمنی میں اس کی سخت ضرورت کا احساس ہوا۔ یہاں تک کہ ان کے بعض مفکرین تعددِ ازدواج کے ممنوع ہونے پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور ہو گئے تاکہ مشکل کا کوئی حل نکل سکے۔ بات یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے "الازہر" سے رجوع کیا اور ان سے تعددِ ازدواج کے بارے میں اسلامی حکم کی تفصیلات منگوائیں اور اس پر تحقیق و مطالعہ شروع کیا لیکن کلیسا نے ان پر سخت حملے اور تنقیدیں کیں جن سے مجبور ہو کر انہیں یہ پروگرام چھوڑنا پڑا اور پھر اس کا نتیجہ وحشتناک فحاشی اور وسیع بے راہ روی کی صورت میں نکلا کہ جس نے تمام جنگ زدہ ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ان تمام باتوں کو چھوڑتے ہوئے، اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض مرد ایک سے زیادہ بیویوں کی طرف میلان و رغبت رکھتے ہیں۔ اگر یہ میلان صرف ہوا و ہوس کی بناء پر ہو تو ٹھیک ہے اعتناء نہیں کرنا چاہیے لیکن بعض اوقات بیوی بانجھ ہوتی ہے اور مرد کو اولاد کی شدید خواہش ہوتی ہے اس صورت میں مرد کی خواہش منطقی ہوتی ہے یا بعض اوقات مرد کی خواہشات جنسی شدید ہوتی ہے جبکہ اس کی پہلی بیوی مرد کی اس فطری خواہش کی تکمیل کی طاقت نہیں رکھتی لہٰذا مرد دوسری شادی کے لیے اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے یہاں تک کہ جائز طریقے سے تکمیلِ خواہش نہ ہونے کی صورت میں وہ غیر شرعی قدم اٹھاتا ہے۔ ان مواقع پر بھی دوسری شادی کے لیے مرد کی خواہش کے منطقی ہونے کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس بناء پر جن ممالک میں قانوناً ایک سے زیادہ شادیاں ممنوع ہیں عملاً مختلف عورتوں سے مختلف صورتوں میں ارتباط بالکل موجود ہے اور ایک ہی مرد ایک ہی وقت میں مختلف عورتوں سے ناجائز تعلقات استوار کیے ہوتا ہے۔

مشہور فرانسیسی مورخ گوستاولوبون تعددِ ازدواج کے بارے میں اسلامی قانون، جو کہ محدود و مشروط ہے کو دین اسلام کی خوبیوں میں سے شمار کرتا ہے۔ وہ یورپ کے مردوں کے متعدد عورتوں سے آزادانہ ناجائز روابط کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> مغرب میں بھی جہاں کی آب و ہوا اور وضع طبیعت اگرچہ اس رسم (تعددِ ازدواج) کو قبول نہیں کرتی پھر بھی ایک بیوی کا ہونا ایک ایسی چیز ہے جو صرف قانون کی کتاب میں دکھائی دیتی ہے ورنہ مجھے یہ گمان نہیں کہ اس بات کا انکار کیا جائے کہ ہمارے معاشرے میں اس رسم کے آثار نہیں ہیں۔ واقعاً میں حیران ہوں اور میں نہیں جان سکا کہ مشرق کے جائز اور محدود تعددِ ازدواج کے نظریے میں مغرب کے مکارانہ اور فریب دھندہ تعددِ ازدواج کے حوالے سے کیا کمی ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ پہلا طریقہ دوسرے کی نسبت ہر لحاظ سے بہتر اور زیادہ شائستہ ہے۔

البتہ اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض مسلمان نما لوگ اس اسلامی قانون کی روح کے منافی اس سے سوءِ استفادہ

کرتے ہیں اور شرمناک طریقے سے اپنے لیے بیویاں مہیا کرتے ہیں اور اپنی بیویوں کے حقوق میں تجاوز کرتے ہیں لیکن یہ قانون کی خرابی نہیں اور ان لوگوں کے کردار کو اسلامی قوانین کے کھاتے میں نہیں ڈالنا چاہیے کون سا ایسا قانون ہے جس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جاتا ہو۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا حالات و کوائف بعض عورتوں کے لیے پیدا ہو جائیں تو کیا اس صورت میں عورت کو بھی دو شوہروں کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

اس سوال کا جواب کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ عوام میں مشہور بات کے برعکس، مردوں میں عورتوں کی نسبت جنسی میلان کہیں زیادہ ہوتا ہے ——— طبی کتابوں میں جنسی مسائل سے مربوط بیماریاں زیادہ تر عورتوں کے بارے میں بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک عورتوں کی سرد مزاجی بھی ہے جبکہ مردوں میں معاملہ اس کے برعکس ہے یہاں تک کہ دوسرے جانداروں میں سے دیکھا گیا ہے کہ جنسی خواہش کا اظہار عموماً پہلے نر کی طرف سے ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تعددِ ازدواج مرد کے بارے میں کوئی اجتماعی اور حقوق سے متعلق مشکل پیدا نہیں کرتا جبکہ عورتوں کے لیے اگر بالفرض دو شوہر ہوں تو بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ ان میں سے ایک سادہ سا مسئلہ یہ ہے کہ بچے کا نسب مجہول ہو جاتا ہے اور اس کے بارے میں علم نہیں ہوتا کہ وہ کس شوہر کا ہے اور یہ مسلم ہے کہ ایسا بچہ ان میں سے کسی مرد کی شفقت کا مرکز نہیں بن سکے گا یہاں تک کہ بعض علماء کا نظریہ یہ ہے کہ جس بچے کا باپ مجہول ہو اسے ماں کی محبت بھی بہت کم میسر آئے گی۔ ایسے بچے محبت و شفقت سے تو بالکل محروم رہیں گے ہی، حقوق کے لحاظ سے بھی ان کی کیفیت بالکل مبہم ہو جائے گی۔

شاید وضاحت کی ضرورت نہ ہو کہ انعقادِ نطفہ سے بچنے کے لیے ہر قسم کنٹرول کے طریقوں سے استفادہ مثلاً گولیاں وغیرہ استعمال کرنا کبھی بھی اطمینان بخش نہیں ہے اور یہ طریقے بچہ نہ ہونے کی یقینی دلیل نہیں بن سکتے کیونکہ بہت سی ایسی عورتیں ہیں جنہوں نے ان طریقوں کو استعمال کیا ہے یا طریقۂ استعمال میں اشتباہ کیا ہے اور اس کے باوجود بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ لہٰذا کوئی عورت بھی اعتماد سے تعددِ ازدواج کے لیے تیار نہیں ہو سکتی۔

ان وجوہات کی بناء پر عورتوں کے لیے مختلف شوہروں کا ہونا منطقی نہیں ہو سکتا جبکہ مردوں کے لیے ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے منطقی بھی ہے اور عملی بھی۔

۴۔ وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً ۚ فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا ○

ترجمہ

۴ اور عورتوں کا حق مہر (اپنے اوپر بالکل) ایک قرض سمجھتے ہوئے (یا ایک عطیہ کے طور پر) انہیں ادا کردو اور اگر وہ راضی خوشی اس میں سے کوئی چیز تمہیں بخش دیں تو اسے حلال اور مناسب سمجھتے ہوئے استعمال کرلو۔

تفسیر

"نحلۃ" لغت میں قرض کے معنی میں بھی آیا ہے اور بخشش و عطیہ کے معنی میں بھی۔

راغب اپنی کتاب مفردات میں کہتا ہے:

میرے نظریہ کے مطابق یہ لفظ نحل (جس کا معنی شہد کی مکھی ہے) کے مادہ سے ہے کیونکہ بخشش و عطیہ شہد کی مکھیوں کے کام یعنی شہد دینے سے شباہت رکھتا ہے۔

"صدقاتھن" "صدقۃ" کی جمع ہے جس کا معنی ہے "مہر"۔

گزشتہ آیت میں بیوی کے انتخاب کے بارے میں گفتگو تھی اب اس آیت میں عورتوں کے ایک مسلم حق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آیت تاکید کرتی ہے کہ عورتوں کا حق مہر بالکل ایک قرض کی طرح ادا کرو یعنی جیسے دوسرے قرضوں کی ادائیگی کا خیال رکھتے ہو کہ ان میں سے کوئی چیز کم نہ ہو، حق مہر ادا کرتے وقت بھی تمہاری یہی حالت ہونا چاہیے (یہ اس صورت میں ہے اگر نحلۃ کا معنی قرض لیا جائے) اور اگر اس کا معنی عطیہ اور بخشش کیا جائے تو پھر آیت کی تفسیر اس طرح ہوگی: حق مہر ایک عطیۂ الٰہی ہے اور خدا نے اس لیے مقرر کیا ہے کہ معاشرے میں عورت کے حقوق زیادہ ہوں اور اس کی جسمانی کمزوری کی اس طرح سے تلافی ہو جائے، اسے مکمل طور پر ادا کرو۔

فان طبن لکم عن شیء منہ نفسا فکلوہ ھنیئا مریئا

آیت کی ابتدا میں حقوق نسواں کی حفاظت کے لیے صراحت سے حکم دیا گیا ہے کہ تمام حق مہر انہیں ادا کرو لیکن آیت کے ذیل میں طرفین کے احساسات کا احترام کرتے ہوئے، قلبی رشتوں کے استحکام اور باہمی محبت کے فروغ کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے: اگر عورتیں پوری رضا و رغبت سے اپنے مہر میں سے کچھ مقدار بخش دیں تو وہ تمہارے لیے حلال اور شائستہ ہے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ باہمی زندگی میں صرف خشک قانون اور ضابطے ہی نہ چلتے رہیں بلکہ متوازی طور پر محبت و الفت کے جذبے کارفرما ہوں۔

حق مہر عورت کے لیے ایک معاشرتی سہارا ہے

زمانۂ جاہلیت میں چونکہ لوگ عورت کی قدر و قیمت کے قائل نہیں تھے اس لیے اکثر اوقات حق مہر جو کہ عورت کا مسلم حق ہے وہ اس کے والیوں کو دے دیتے تھے اور اسے ان کا مسلم حق سمجھتے تھے۔ بعض اوقات ایک عورت کا حق مہر دوسری عورت کی شادی کو قرار دیتے تھے مثلاً ایک بھائی اپنی بہن کی شادی کسی سے کرتا تو اسے بھی مقابلے میں اپنی بہن اسے دینا پڑتی اور

ان دونوں عورتوں کا یہی حق مہر ہوتا۔

اسلام نے ان تمام ظالمانہ رسوم پر خطِ بطلان کھینچ دیا اور حق مہر کو مخصوص طور پر عورت کا مسلم حق قرار دیا اور آیاتِ قرآنی میں بار بار مردوں کو اس حق کی مکمل ادائیگی کی نصیحت کی۔

اسلام میں حق مہر کے لیے کوئی مقدار معین نہیں کی گئی اور اس کا انحصار میاں بیوی کی باہمی رضامندی پر ہے اگرچہ بہت سی روایات میں تاکید کی گئی ہے کہ حق مہر زیادہ نہیں ہونا چاہیے لیکن یہ کوئی لازم و واجب حکم نہیں ہے بلکہ مستحب حکم ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرد اور عورت شادی اور معاشرت سے یکساں طور پر بہرہ مند ہوتے ہیں اور میاں بیوی کا رشتہ طرفین کے باہمی فائدے میں قائم ہوتا ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ مرد کم یا زیادہ مال عورت کو حق مہر کے طور پر دے۔ کیا اس طرح اس حکم سے عورت کے مقام پر زد نہیں پڑتی اور شادی بیاہ میں خرید و فروخت کی صورت نہیں بن جاتی ؟

اسی وجہ سے بعض لوگ حق مہر کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔ مغرب میں چونکہ اس کا معمول نہیں ہے اس لیے مغرب زدہ لوگ خاص طور پر یہ مخالفت کرتے ہیں حالانکہ حق مہر کے نہ ہونے سے عورت کے مقام میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوتا لیکن اس طرح وہ خطرے سے ضرور دوچار ہو جاتی ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ درست ہے کہ عورت اور مرد یکساں طور پر ازدواجی زندگی سے فائدے اٹھاتے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علیحدگی کی صورت میں عورت کو زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مخصوص جسمانی استعداد کی بناء پر مرد عموماً معاشرے میں زیادہ نفوذ اور تسلط کا حامل ہوتا ہے اگرچہ بعض لوگ بات کرتے وقت اس واضح حقیقت کا انکار کر دیتے ہیں لیکن انسان کی اجتماعی زندگی کی کیفیت جو آنکھوں کو نظر آتی ہے یہ ہے کہ زیادہ آمدنی والے کام زیادہ تر مردوں کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں۔ خود یورپ کی بھی یہی حالت ہے جہاں اصطلاحی طور پر عورتیں مکمل آزادی سے ہمکنار ہیں۔

علاوہ ازیں مردوں کے لیے نئی بیوی کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں لیکن بیوہ عورتیں خصوصاً جب ان کی عمر کا کچھ حصہ گزر جائے اور وہ جوانی و زیبائی کا سرمایہ ختم کر بیٹھیں تو نئے شوہر کے لیے ان کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں حقیقت میں حق مہر ایک ایسی چیز ہے جو عورت کے لیے اس کے خسارے کی تلافی کا ذریعہ ہے اور آئندہ زندگی کے محفوظ رکھنے کا وسیلہ ہے۔

علاوہ ازیں حق مہر عموماً مرد کو علیحدگی اختیار کرنے اور اسے طلاق دینے کے میلانات سے روکنے کے لیے ایک بریک (BRAKE) کا کام دیتا ہے۔

یہ درست ہے کہ قوانینِ اسلام کی رو سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتے ہی حق مہر مرد کے ذمے ہو جاتا ہے اور عورت فوراً ہی اس کے مطالبے کا حق رکھتی ہے لیکن چونکہ عموماً وہ قرض کی صورت میں مرد کے ذمہ رہ جاتا ہے لہٰذا یہ عورت کے لیے ایک پس انداز بچت کی حیثیت رکھتا ہے اور رشتۂ تزویج نہ ٹوٹنے کے لیے ایک سہارے کا کام دیتا ہے۔

اس مسئلے کے کچھ استثنائی پہلو بھی ہیں لیکن ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ زیادہ تر مقامات پر صادق آتا ہے۔

اب اگر بعض لوگوں نے حق مہر کی غلط تفسیر کی ہے اور اسے عورت کی ایک طرح سے قیمت خیال کیا ہے، اس کا

قوانین اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اسلام میں کسی طرح بھی حق مہر مال تجارت کی قیمت کا پہلو نہیں رکھتا اور اس کی بہترین دلیل نکاح کے صیغے ہیں جن میں قانونی طور پر مرد اور عورت ہی اس پیمان کے دو بنیادی رکن شمار ہوتے ہیں اور حق مہر ایک اضافی چیز ہے اور کتاب کے حاشیے کے مترادف ہے۔ اسی بناء پر اگر صیغۂ نکاح میں حق مہر کا تذکرہ نہ کیا جائے تو عقد باطل نہیں ہے۔ البتہ اس صورت میں شوہر کی ذمہ داری ہے کہ مباشرت سے قبل اس جیسی عورتوں کا سا حق مہر ادا کرے)۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حق مہر نقصان کی تلافی اور عورت کے حقوق کے احترام کے پیش نظر ہے نہ کہ اس کی قیمت ہے اور شاید نحلۃ (بمعنی عطیہ) اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے۔

۵۔ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا ○

۶۔ وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا ۚ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ○

ترجمہ

۵ اور اپنے اموال کو جنہیں خدا نے تمہاری زندگی کا وسیلہ قرار دیا ہے انہیں بے وقوفوں کے ہاتھ میں نہ دے دو اور انہیں اس میں سے روزی دے دو اور انہیں لباس پہناؤ اور ان سے شائستہ طریقے سے گفتگو کرو۔

۶ اور یتیموں کو آزما کر دیکھو یہاں تک کہ جب (تم دیکھو کہ) وہ بلوغ کو پہنچ گئے ہیں تو اگر ان میں (کافی) رشد و شعور پاؤ تو ان کے اموال ان کے سپرد کر دو اور ان کے بڑے ہونے سے پہلے ان کے اموال اسراف اور فضول خرچی کے طور پر نہ کھاؤ اور (سرپرستوں میں سے) جو شخص بے نیاز ہے وہ (حق زحمت لینے سے) اجتناب کرے اور جو شخص ضرورت مند ہے وہ شائستہ طریقے سے (اور جو زحمت اس نے اٹھائی ہے اس کے مطابق) اس میں سے کھائے اور جب ان کا مال انہیں دے دو تو اس (ادائیگی) پر گواہ بنا لو (اگرچہ) خدا محاسبہ کے لیے کافی ہے۔

تفسیر

مندرجہ بالا آیات یتیموں سے مربوط مباحث کی تکمیل کرتی ہیں۔ کچھ بحث گذشتہ آیات میں ہو چکی ہے۔

ولا تؤتوا السفهاء اموالکم

اپنا مال و دولت بے وقوفوں کے سپرد نہ کرو اور انہیں رہنے دو یہاں تک کہ وہ اقتصادی معاملات میں غور حاصل کریں تاکہ تمہاری دولت خطرے اور نقصان کی زد سے بچ جائے۔

سفیہ کسے کہتے ہیں

راغب نے مفردات میں کہا ہے کہ سفہ (بروزن تب) اصل میں ایک طرح کی کم وزنی اور بدن کا ہلکا ہونا ہے جس میں یہ حالت ہو کہ چلتے وقت اعتدال کو برقرار نہ رکھا جا سکے ۔ اسی لیے اس افسار[1] کو سفیہ کہتے ہیں جو ناموزوں ہو اور ہمیشہ ہلتی جلتی رہے۔ بعد ازاں یہ لفظ اسی مناسبت سے ان افراد کے لیے استعمال ہونے لگا جو سوجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں چاہے ان کا ہلکا پن امور مادی میں ہو یا امور معنوی میں۔

لیکن واضح ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں سفاہت کا تعلق خصوصیت سے مالی امور میں کافی سوجھ بوجھ نہ ہونے سے ہے۔ اور یہاں سفیہ سے مراد وہ شخص ہے جو اموال کی سرپرستی اپنے ذمہ نہ لے سکے اور مال و دولت کے لین دین میں اپنے فائدے کو نہ سمجھ سکے۔ اصطلاح میں کہتے ہیں کلاہ سرش برود (یعنی ___ لوگ اس کا سر مونڈ لیں) اس مفہوم کی شاہد اگلی آیت ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

فان انستم منهم رشدا فادفعوا الیهم اموالهم

اگر انہیں سمجھدار پاؤ تو ان کے اموال ان کے حوالے کر دو۔

اس بناء پر اگرچہ زیر نظر آیت یتیموں کے بارے میں بحث کر رہی ہے لیکن اس کا ایک عمومی مفہوم تمام لوگوں کے لیے ہے اور وہ یہ کہ انسان کو کسی حالت میں اور کسی صورت میں وہ مال جو اس کی سرپرستی میں ہو یا کسی طرح سے اس سے وابستہ ہو نافہم اور ناسمجھ افراد کے سپرد نہیں کرنا چاہیے اور اس سلسلے میں اموالِ عمومی (اموالِ حکومتِ اسلامی) میں بھی کوئی امتیاز نہیں۔ اس مفہوم کا شاہد لفظ "سفیہ" کا وسیع مفہوم بھی ہے اور اس کے علاوہ وہ روایات بھی ہیں جو ہادیانِ اسلام سے اس سلسلے میں منقول ہیں۔ مثلاً امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں ہے ___

ایک شخص ابراہیم بن عبد الحمید کہتا ہے کہ میں نے امام سے آیت ولا تؤتوا السفهاء اموالکم کی تفسیر پوچھی تو آپؑ نے فرمایا:

---

[1] افسار اس رسی کو کہتے ہیں جو گھوڑے یا گدھے کے سر اور گردن پر باندھی جائے (مترجم)۔

شراب خور سفیہ ہیں اپنے اموال ان کے سپرد نہ کرو[1]

ایک اور روایت میں بھی شرابی کو مالی امور میں امین بنانے کی ممانعت کی گئی ہے۔

خلاصہ یہ کہ بارہا روایات میں شرابی کو سفیہ قرار دیا گیا ہے اور یہ تعبیر شاید اس بناء پر ہے کہ شرابی اپنا مادی سرمایہ بھی ہاتھ سے دے بیٹھتا ہے اور معنوی بھی۔ اس سے بڑھ کر بے وقوفی کیا ہوگی کہ انسان پیسے بھی دے اور اس کے ساتھ اپنی عقل و ہوش بھی دے دے اور دیوانگی خریدے، اپنے بدن کے مختلف قوٰی بھی اس کام میں لگا دے اور بہت سے اجتماعی نقصانات بھی کرے۔

ایک اور روایت میں ان سب لوگوں کو جو کسی لحاظ سے بھی بھروسہ کے قابل نہ ہوں سفیہ کہا گیا ہے اور (شخصی اور عمومی) اموال ان کے سپرد کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

یونس بن یعقوب کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیہ ولا تؤتوا السفهاء اموالکم کی تفسیر پوچھی۔ تو آپؑ نے ارشاد فرمایا:

من لا تثق به

سفیہ وہ شخص ہے جو قابلِ اعتماد نہ ہو[2]

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر آیت یتیموں کے بارے میں ہے تو "اموالکم" (تمہارے اموال) کیوں فرمایا ہے۔ "اموالهم" (ان کے مال) کیوں نہیں فرمایا۔

ممکن ہے اس تعبیر کا مقصد اس اجتماعی اور اقتصادی مسئلہ کو بیان کرنا ہو کہ اسلام انسانی معاشرے کے تمام افراد کو ایک سمجھتا ہے۔ اس بناء پر کہ ایک شخص کی بہتری اور بھلائی دوسروں کے نفع سے جدا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ایک شخص کا نقصان پورے معاشرے کا نقصان ہے۔

اسی وجہ سے اس خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے ضمیر غائب کی بجائے "ضمیر مخاطب" استعمال کی گئی ہے یعنی حقیقت میں ان اموال کا تعلق صرف یتیموں سے نہیں بلکہ تمہارے ساتھ بھی ہے۔ اگر انہیں کوئی نقصان پہنچے گا تو وہ کسی نہ کسی صورت میں تمہاری طرف لوٹے گا۔ اس لیے اس کے مال کی پوری طرح نگرانی کرنا چاہیے۔

اس سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ جو کوتاہ نظر لوگ کمزور اور بزدل افراد کو مذہبی اور تبلیغی عہدوں کے لیے ان کی مدد کے بہانے ازراہِ ہمدردی چنتے ہیں، ان کا یہ ایک سراسر غلط اور مجنونانہ فعل ہے۔

التی جعل الله لکم قیاما

اس جملے میں قرآن نے مال و ثروت کے لیے ایک عجیب و غریب تعبیر بیان فرمائی ہے، تمہاری زندگی اور سماجی کا قیام سرمایہ پر ہی منحصر ہے اس کے بغیر تم آزادی سے اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ اسے سفیہ اور فضول خرچ لوگوں

---

1. تفسیر برہان جلد اول زیر بحث آیت کے ذیل میں۔
2. تفسیر برہان، جلد ۱، زیر بحث آیت کے ذیل میں، تفسیر نور الثقلین بھی دیکھ سکتے ہیں۔

کے سپرد نہ کرو۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام اقتصادی اور مالی اہمیت کا قائل ہے۔

اس کے برعکس موجودہ انجیل[1] میں ہے کہ مالدار آدمی جنت میں نہیں جا سکے گا۔ اسلام کہتا ہے کہ جو قوم فقیر و نادار ہو وہ کبھی اپنی کمر سیدھی نہیں کر سکتی۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ عیسائی اپنی غلط تعلیمات کے باوجود دنیا میں اوجِ کمال پر پہنچے ہوئے ہیں اور ہم ان اعلیٰ اسلامی تعلیمات کے باوجود ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

اصل میں انہوں نے خرافات چھوڑ دی ہیں، اس لیے وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہیں اور کیونکہ ہم نے ان اعلیٰ و ارفع تعلیمات سے دوری اختیار کر لی ہے اس لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔

وارزقوھم فیھا واکسوھم و قولوا لھم قولا معروفا

آیت کے آخر میں یتیموں کے بارے میں دو اہم حکم دیے گئے ہیں:

۱۔ ان کی خوراک اور پوشاک انہی کے مال سے مہیا کرو تاکہ وہ عزت و آبرو کے ساتھ پروان چڑھیں اور بالغ ہوں۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں لفظ "فیھا" (ان کے مال میں) آیا ہے "منھا" (ان کے مال سے) نہیں آیا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ یتیموں کی گزر اوقات ان کے مال اور سرمایہ کے نفع سے پوری کرو کیونکہ اگر یہ کہا جاتا کہ ان کے اخراجات ان کے سرمائے سے پورے کرو تو اس کا مفہوم یہ ہوتا کہ اصل سرمایہ سے آہستہ آہستہ اخراجات پورے کیے جائیں اور یہ فطری امر ہے کہ جب وہ سنِ بلوغ کو پہنچیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے سرمائے کا زیادہ تر حصّہ ہاتھ سے کھو بیٹھے ہوں۔ لیکن قرآن الفاظ کی تبدیلی سے سرپرستوں کو یہ نصیحت و وصیت کرتا ہے کہ وہ یتیموں کے مال کے نفع اور آمدنی سے ان کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی کوشش کریں تاکہ ان کا اصل سرمایہ محفوظ رہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ آیت کہتی ہے کہ یتیموں کے ساتھ شائستگی سے گفتگو کرو۔ یعنی دل کو خوش کرنے والی اچھی اچھی باتوں سے ان کی نفسیاتی کمی کو دور کرو اور ان کو نصیحت کرتے رہو تاکہ وہ سنِ بلوغ تک پہنچتے پہنچتے اچھے خاصے سمجھدار ہو جائیں۔ اسی طرح یتیموں کی تشکیل سیرت اور تعمیر کردار بھی سرپرستوں کی ذمہ داری ہے۔

وابتلوا الیتامیٰ حتی اذا بلغوا النکاح۔

یہاں یتیموں اور ان کے مال کے بارے میں ایک اور حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے، یتیموں کی آزمائش کرو، انہیں تجربے میں ڈالو یہاں تک کہ جب وہ بلوغت کو پہنچ جائیں تو اس وقت اگر ان میں معاملہ فہمی اور مال کی حفاظت کی سوجھ بوجھ پاؤ تو ان کا مال انہیں واپس کر دو۔

چند اہم نکات

۱۔ لفظ حتی سے معلوم ہوتا ہے کہ سن رشد تک پہنچنے سے پہلے یتیموں کی لگاتار آزمائش ہونی چاہیے یہاں تک کہ

---

[1] انجیل متی باب ۱۹ آیہ ۲۳

وہ بلوغت کی منزل میں داخل ہو جائیں اور عقلی طور پر مکمل طریقے سے اپنے مال کی دیکھ بھال کر سکیں۔ ضمنی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزمائش سے مراد یتیموں کی تدریجی تربیت ہے۔ یعنی انہیں آزاد نہ چھوڑ دیں یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائیں اور اس کے بعد مال ان کے حوالے کر دیں۔ بلکہ بلوغت سے پہلے پہلے انہیں مستقل زندگی گزارنے کے لیے عملی تربیت دیں۔

باقی رہا یہ کہ یتیموں کی آزمائش کس طرح کی جائے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ کچھ مال ان کو دے دیا جائے تاکہ وہ اس سے تجارت کریں۔ لیکن ان کے اعمال کی نگرانی اس خوبی سے کی جائے کہ ان کے کام میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ جب یہ معلوم ہو جائے کہ وہ یہ کام بخیر وخوبی انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور لین دین میں دھوکا نہیں کھاتے تو ان کے اموال انہیں دے دیے جائیں یا لگاتار تعلیم و تربیت کے ذریعے ان کی اس طرح پرورش کی جائے کہ وہ آئندہ زندگی کی باگ ڈور سنبھال لیں۔

۲۔ " اذا بلغوا النکاح " میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب وہ زندگی کی اس حد میں قدم رکھیں کہ ازدواج کی قدرت رکھتے ہوں اور ظاہر ہے کہ جو شادی بیاہ کی اہلیت رکھتا ہے، گھریلو ذمہ داریوں کو بہتر طور پر انجام دینے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور ایسا شخص سرمایہ کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ بنابریں ازدواجی زندگی مستقل اقتصادی زندگی کے ساتھ ساتھ شروع ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یتیموں کی ثروت و دولت انہیں واپس کر دی جائے۔ تاکہ جب وہ جسمانی طور پر بالغ ہو جائیں اور انہیں مال کی بہت زیادہ ضرورت ہو تو اس کے ساتھ ان کی سوچ میں بھی پختگی آ جائے جس سے وہ اپنے مال کی بخوبی حفاظت کر سکیں۔

۳۔ " انستم منھم رشدا " یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا رشد (سوجھ بوجھ) پوری طرح واضح ہو کیونکہ " انستم " مادۂ " ایناس " سے ہے۔ جس کے معنی مشاہدہ کرنے اور دیکھنے کے ہیں اور یہ مادہ مادۂ انسان سے ہے جس کے ایک معنی آنکھ کی پتلی کے بھی ہیں۔ حقیقت میں مشاہدہ اور دیکھنے کے وقت انسان یعنی آنکھ کی پتلی سے مدد لی جاتی ہے۔ اسی لیے مشاہدہ کرنے کو ایناس سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ولا تاکلوھا اسرافا وبدارا ان یکبروا۔

اس کے بعد پھر سرپرستوں کو تاکید کر رہا ہے کہ کسی طرح سے بھی یتیموں کے مال میں خیانت اور بے ایمانی نہ کریں اور ان کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ان کا سرمایہ ضائع نہ کریں۔

ومن کان غنیا فلیستعفف ومن کان فقیرا فلیاکل بالمعروف

یعنی اگر یتیموں کے سرپرست صاحب حیثیت اور مالدار ہیں تو پھر کسی طریقے سے بھی ان کے مال سے فائدہ نہ اٹھائیں اور اگر فقیر و نادار ہیں تو صرف ان ذمہ داریوں کے بدلے جو انہوں نے یتیم کے مال کی حفاظت کے لیے اٹھائی ہیں عدل و انصاف کرتے ہوئے ان کے مال میں سے اپنی کارکردگی کے مطابق لے سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں کئی روایتیں بھی ہیں جنہوں نے اس آیت کے مضمون کی وضاحت کی ہے۔ جیسا کہ ہم تحریر کر چکے ہیں

ان میں سے ایک روایت حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے :

فذلك رجل يحبس نفسه عن المعيشة فلا بأس ان يأكل بالمعروف اذا كان يصلح لهم فان كان المال قليلا فلا يأكل منه شيئا۔

اس سے تو وہ شخص مراد ہے جس کو یتیم کے مال کی حفاظت اپنا مستقبل سنوارنے سے روک دے تو وہ اس صورت میں یتیم کے مال سے مناسب اندازے کے مطابق لے سکتا ہے اور یہ اسی صورت میں ہے جبکہ یتیم کے لیے اس میں فائدہ ہو اور اگر یتیم کا مال کم ہو (اور اس کی سرپرستی میں زیادہ وقت بھی صرف نہ ہوتا ہو) تو اس حالت میں یتیم کے مال سے ذرہ بھر بھی نہ لے ۔

فاذا دفعتم اليهم اموالهم فاشهدوا عليهم ۔

آخری حکم جو یتیموں کے سرپرستوں کے متعلق اس آیت میں بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جب تم ان کے مال ان کے سپرد کرنا چاہو تو گواہ بنا لو تاکہ اتہام ، نزع اور کسی قسم کے اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہے ۔

وكفى بالله حسيبا ۔

البتہ یہ جان لو کہ حقیقی حساب کرنے والا تو خداوند عالم ہی ہے اور ہر چیز سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ تمہارا حساب کتاب اس (خدا) کے ہاں واضح ہو کیونکہ خدا وہ ہے کہ اگر تم سے کوئی ایسی بے ایمانی ہوئی ہو گی جو گواہوں کی نظروں سے بھی اوجھل ہو تو وہ اس کا حساب کرے گا ۔

۷۔ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ○

ترجمہ

۷۔ مردوں کے لیے اس میں سے جو کچھ ان کے والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں حصّہ ہے اور عورتوں کے لیے بھی جو ان کے والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں حصّہ ہے ۔ چاہے وہ مال کم ہو کہ زیادہ یہ حصّہ مقرر اور لازمی ہے ۔

شانِ نزول

زمانۂ جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ وہ (مشرک) صرف مردوں کو وارث سمجھتے تھے ۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جو شخص سلح ہوکر

لڑنے اور اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے کبھی کبھی ڈاکہ ڈالنے کی طاقت نہیں رکھتا اسے ترکہ نہیں مل سکتا۔ اسی وجہ سے وہ عورتوں اور بچوں کو میراث سے محروم کر دیتے تھے اور میت کا مال بہت دور کے مردوں میں بانٹ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک انصاری جس کا نام اوس بن ثابت تھا فوت ہوگیا اور اپنے بعد چھوٹی چھوٹی بچیاں اور بچے چھوڑ گیا۔ اس کے چچازاد بھائی جن کے نام خالد اور عرفطہ تھے وہ آئے انہوں نے اس کا مال آپس میں بانٹ لیا اور اس کی بیوی اور چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں کو کچھ بھی نہ دیا تو اس کی بیوی نے حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں شکایت کی اس وقت تک اس سلسلے میں اسلام میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ اس موقع پر مذکورہ بالا آیت کا نزول ہوا۔ چنانچہ حضرت رسولِ اکرمؐ نے ان دونوں کو بلایا کہ وہ اس مال میں بالکل چھینا جھپٹی نہ کریں اور اسے پہلے طبقے کے پس ماندگان یعنی اولاد اور اس کی بیوی کے سپرد کر دیں۔ یہاں تک کہ ان کے درمیان اس کی تقسیم کا طریقہ آیاتِ آئندہ میں واضح ہوا۔

تفسیر

عورت کی حفاظت کے لیے ایک اور قدم

حقیقت میں یہ آیت غلط عادتوں اور رسموں کے خلاف ایک اقدام ہے کیونکہ وہ عورتوں اور بچوں کو ان کے جائز حق سے محروم کر دیتے تھے۔ اس لیے یہ آیت ان بحثوں کی تکمیل کرتی ہے جو آیاتِ گذشتہ میں ہوئی ہیں۔ کیونکہ عرب اپنی غلط اور ظالمانہ رسموں کی وجہ سے عورتوں اور چھوٹے بچوں کو میراث کے حق سے محروم کر دیتے تھے۔ آیت نے اس باطل قانون کو غلط قرار دیا اور فرمایا کہ مرد اس مال سے جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جاتے ہیں حصہ رکھتے ہیں اور عورتیں بھی۔ چاہے وہ کم ہو کہ زیادہ۔ اس وجہ سے کوئی شخص حق نہیں رکھتا کہ وہ دوسرے کا حصہ ہڑپ کر جائے۔

(للرجال نصیب مما ترك الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترك الوالدان والاقربون مما قل منه او کثر)

اس کے بعد آیت کے آخر میں اس مقصد کی تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے: یہ تعین شدہ حصہ ہے اور اس کا ادا کرنا واجب ہے تاکہ اس بحث میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہ جائے (نصیبا مفروضا)۔

ضمناً جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ آیت مندرجہ بالا تمام عورتوں کے لیے عام حکم کا ذکر کر رہی ہے۔ لہٰذا اس وجہ سے جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر انبیاء اور مرسلین کوئی مال و دولت وغیرہ چھوڑ جائیں تو وہ میراث کے طور پر ان کے وارثوں کو نہیں ملتی، یہ آیت مذکورہ کے خلاف ہے۔ ہاں اس سے پیغمبر کا ذاتی مال مراد ہے نہ کہ بیت المال جو تمام مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے وہ بیت المال کے قانون کے مطابق اپنے مصارف میں خرچ کیا جائے گا۔ اسی طرح اس آیت کے عمومی پہلو اور دوسری آیتوں سے جو بعد میں میراث کے بارے میں آئیں گی واضح ہوتا ہے کہ "تعصیب" کا قائل ہونا یعنی بعض حالات میں مال کا پدری رشتہ داروں کے ساتھ مخصوص ہونا جیسا کہ علمائے اہل سنت قائل ہیں، وہ بھی تعلیمات قرآن کے خلاف ہے کیونکہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض موقعوں پر عورتیں میراث سے

محروم رہ جاتی ہیں۔ جس کی اسلام آیت مندرجہ بالا اور اسی طرح کی دوسری آیات کی روشنی میں نفی کرتا ہے۔ (غور فرمایئے گا)۔

۸۔ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا○

ترجمہ

۸ اگر میراث کی تقسیم کے وقت رشتہ دار (اور اس طبقہ کے لوگ جن کا میراث سے کوئی تعلق نہیں ہے) اور یتیم اور مسکین موجود ہوں تو اس مال میں سے کچھ تھوڑا بہت انہیں بھی دے دو اور ان سے اچھے طریقے سے بات کرو۔

تفسیر

ایک اخلاقی حکم

و اذا حضر القسمۃ اولوا القربی والیتامٰی والمساکین فارزقوھم منہ۔

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ یہ آیت قانون تقسیم وراثت کے بعد نازل ہوئی ہے کیونکہ یہ بتاتی ہے کہ جب تقسیم میراث کی مجلس میں رشتہ دار، یتیم اور مسکین موجود ہوں تو اس میں سے کچھ نہ کچھ انہیں بھی دے دو۔ بنابریں اس آیت کا مفہوم ایک مستحب اور اخلاقی حکم ہے ان طبقات کے بارے میں جو زیادہ نزدیکی ہوتے ہوئے بھی میراث سے محروم ہیں۔ آیت کہتی ہے اگر تقسیم میراث کی مجلس میں کچھ دوسرے یا تیسرے درجے کے رشتہ دار اور اسی طرح بعض یتیم اور مسکین ہوں تو کچھ نہ کچھ مال انہیں بھی دے دو۔

اس طریقے سے حسد اور کینہ کا احساس جو میراث سے محرومی کی وجہ سے ممکن ہے ان کے دل میں موجزن ہو دور کر دو۔ اور اس ذریعے سے انسانی رشتے کے پیوند کو مستحکم کر دو۔

اگرچہ لفظ "یتامٰی" اور "مسکین" مطلق کے طور پر استعمال کیا گیا ہے لیکن ظاہراً اس سے مراد کنبہ اور خاندان کے یتیم و مسکین ہیں کیونکہ قانونِ میراث کے مطابق قریب ترین طبقات (رشتہ داروں) کے ہوتے ہوئے دور تر طبقات میراث لینے سے محروم رہتے ہیں۔ اس لیے اگر وہ اس طرح کے اجتماع میں موجود ہوں تو مناسب ہے کہ عمدہ ہدیہ (جس کی مقدار کا مقرر کرنا صرف وارثوں کے ارادے سے وابستہ ہے جو بڑے وارثوں کے مال میں سے

ہوگی)، انہیں دیا جائے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ آیت میں یتیموں اور مسکینوں سے مراد ہر قسم کے یتیم اور ضرورت مند ہیں، چاہے وہ میت کے رشتہ دار ہوں یا ان کے علاوہ غیر لیکن یہ احتمال بعید دکھائی دیتا ہے کیونکہ بیگانے اور غیر اس قسم کے خاندانی اجتماع میں نہیں آسکتے۔

بعض مفسرین یہ اعتقاد بھی رکھتے ہیں کہ یہ آیت ایک واجب حکم بیان کر رہی ہے نہ کہ مستحب لیکن یہ بھی بعید ہے کیونکہ اگر واجب حق ہوتا تو ضروری تھا کہ اس کی مقدار اور حد کا تعین کیا جاتا، حالانکہ یہاں یہ اختیار حقیقی وارثوں کو دیا گیا ہے۔

وقولوا لهم قولا معروفا

آیت کے آخر میں یہ حکم ہے کہ ان میراث سے محروم رہنے والوں سے میٹھی زبان اور شائستہ طریقے سے گفتگو کرو۔ یعنی مادی امداد کے علاوہ اپنے اخلاقی سرمائے سے بھی ان کی محبت حاصل کرو تاکہ ان کے دل میں کسی قسم کی تکلیف نہ رہنے پائے۔ اور یہ حکم مندرجہ بالا حکم کے مستحب ہونے کی دوسری دلیل ہے۔

جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس سے یہ مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جائے کہ آیت مندرجہ سہام اور میراث کو معین کرنے والی آیات کی وجہ سے منسوخ ہوگئی ہے کیونکہ ان آیتوں اور اس آیت کے درمیان کسی قسم کا بالکل تضاد نہیں ہے۔

۹۔ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا۝

ترجمہ

۹۔ جو لوگ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اگر وہ اپنے بعد نابالغ اولاد چھوڑ جائیں گے تو اس کا آنے والے دور میں کیا حشر ہوگا انہیں چاہیے کہ وہ یتیموں پر ظلم کرنے سے ڈریں اور خدا کی مخالفت سے بچیں اور یتیموں سے محبت اور نرمی سے گفتگو کریں۔

تفسیر

یتیموں پر لطف و کرم کی بارش

ولیخش الذین لو ترکوا

قرآن یتیموں کی حالت زار کے بارے میں لوگوں کے جذبات کرم ابھارنے کے لیے ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے کبھی کبھی لوگ غافل ہو جاتے ہیں اور وہ یہ کہ تم عام یتیموں کے ساتھ وہی سلوک کرو جو تم چاہتے ہو کہ کل لوگ تمہارے یتیموں کے ساتھ کریں۔

اپنے بے یار و مددگار اور لاوارث بچوں کی بری حالت پیشِ نظر رکھو جبکہ وہ ایک ظالم اور بے ایمان شخص کی سرپرستی میں ہوں، جو نہ ان کے جذبات و احساسات پر نظر کرے اور نہ ان کے مال میں عدالت کا خیال رکھے۔ تو یہ دردناک منظر تمہارے لیے کتنا تکلیف دہ ہوگا اور تم اپنی اولاد کے مستقبل کے لیے کتنے فکرمند ہو گے۔ اسی طرح دوسرے کی اولاد اور یتیموں کے لیے فکر کرو۔ ان کی تکلیف کا احساس کرو۔ اس بنا پر آیت کا مطلب کچھ یوں ہوگا: وہ لوگ جو اپنی اولاد کی آئندہ زندگی کے متعلق حیران و پریشان ہیں انہیں چاہیے کہ وہ یتیموں سے خیانت کرنے اور انہیں ستانے سے پرہیز کریں۔

اجتماعی مسئلے اصولی طور پر ہمیشہ ایک سنت کی شکل میں آج سے کل اور کل سے آئندہ زمانے تک اثر کرتے اور پھیلتے ہیں۔ جو لوگ معاشرے میں کسی ظلم کی بنیاد ڈالتے ہیں، مثلاً یتیموں کو ستانے کی رسم ڈالتے ہیں، دراصل وہ خود اس بات کی دعوت اور عملی نمونہ ہوتے ہیں کہ کل ان کی اولاد کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے۔ اس لیے وہ نہ صرف دوسروں کی اولاد پر ظلم و ستم کرتے ہیں بلکہ اپنی اولاد کے لیے بھی ظلم و ستم کی راہ ہموار کر دیتے ہیں۔

فلیتقوا اللہ و لیقولوا قولا سدیدا

اب جبکہ یہ حال ہے تو یتیموں کے سرپرستوں کو چاہیے کہ وہ خداوند عالم کے احکام کی مخالفت نہ کریں اور یتیموں کے ساتھ میٹھے لہجے میں بات کریں اور ان سے شفقت آمیز سلوک کریں تاکہ ان کے باطنی دکھ دور ہو جائیں اور دل کے زخم بھر جائیں۔

اسلام کا یہ بلند پایہ حکم جو مندرجہ بالا جملے میں موجود ہے ایتام کی پرورش کے سلسلے میں ایک نفسیاتی نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے جو نہایت قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ ایک ننھے منے یتیم کی ضرورت صرف خوراک اور پوشاک تک محدود نہیں بلکہ ہمدردی اور مہربانی سے اس کے احساساتِ قلبی کی تسکین بھی ضروری ہے جو اس کی آئندہ تعمیر و تربیت میں اثر انداز ہوگی کیونکہ یتیم بھی دوسروں کی طرح انسان ہے اور چاہیے کہ اُسے اس مہربانی کے برتاؤ سے ایک روحانی غذا ملے اور اس محبت اور پیار سے اسے وہ راحت ملے جو ایک بچے کو ماں باپ کی گود میں ملتی ہے۔ وہ ایک بھیڑ کے بچے کی مانند نہیں ہے کہ صبح کے وقت ریوڑ کے ساتھ چراگاہ میں چلا جائے اور شام کے وقت واپس آجائے۔ جسمانی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ اس کے نفسیاتی میلانات کی بھی خاطر خواہ تعلیم و تربیت کا خیال رکھا جائے ورنہ وہ ایک ظالم، معاشرے کا باغی، برا اور خطرناک شخص بنے گا۔

ایک ضروری وضاحت

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک صحابی سے منقول ہے کہ ایک دن پہلے امامؑ نے فرمایا: جو شخص کسی پر ظلم کرے خداوند عالم کسی شخص کو اس پر مسلط کر دے گا تاکہ وہ اس پر اور اس کی اولاد پر اسی طرح کا ظلم و ستم کرے۔

صحابی کہتا ہے: میں نے دل ہی دل میں سوچا یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے کہ ظلم تو باپ کرے اور اس کے کیے کی سزا اولاد بھگتے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی (اس بات کو) بیان کروں، امام عالی مقامؑ نے فرمایا:

قرآن فرماتا ہے:

ولیخش الذین لو ترکوا من خلفھم ذریۃ ضعفا خافوا علیھم [1]

حاشیہ اگلے صفحہ

جو سوال حدیث کے راوی کے دل میں پیدا ہوا تھا بہت سے لوگ وہی سوال کرتے ہیں کہ خداوند عالم کا ایک شخص کے جرم کا بدلہ دوسرے سے لینا کس طرح جائز ہے؟ اصولی طور پر ظالم کی اولاد نے کون سا گناہ کیا ہے کہ وہ اس ظلم وستم کا شکار ہو؟ اس سوال کا جواب مندرجہ بالا تحریر سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ معاشرے کے افراد جو کام بھی کرتے ہیں وہ آہستہ آہستہ ایک رسم و رواج کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور آنے والی نسلوں کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں اس وجہ سے جو لوگ معاشرے میں ظلم وستم کی بنیاد رکھتے ہیں آخر ایک دن یہ بدعت ان کی اولاد پر بھی اثر انداز ہو گی۔ اصل میں یہ بات ان کے اعمال کے وضعی اور تکوینی آثار میں سے ہے۔ اگر اسے خدا کی طرف نسبت دی جائے تو وہ صرف اس بنا پر ہے کہ سب کے سب تکوینی اثرات اور علت و معلول کے خواص اسی سے منسوب ہیں۔ غرض کسی طرح بھی خداوند عالم کی طرف سے کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب بھی کسی معاشرے میں ظلم وستم کی بنیاد رکھی گئی وہ ظالم اور اس کی اولاد کے لیے زنجیر پا بن گئی۔

۱۰۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا اِنَّمَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ نَارًا ؕ وَ سَیَصۡلَوۡنَ سَعِیۡرًا ○

ترجمہ

۱۰۔ جو لوگ یتیموں کا مال ظلم وستم سے کھاتے ہیں وہ صرف آگ کھا رہے ہیں اور بہت جلد جلانے والی آگ میں جلیں گے۔

تفسیر

ہمارے اعمال کا باطنی چہرہ

ان الذین یاکلون اموال الیتمٰی ظلما انما یاکلون فی بطونھم نارا

ہم اس سورہ کے شروع میں تحریر کر چکے ہیں کہ اس سورہ کی آیتیں ایک صحیح و سالم معاشرے کی بنیاد قائم کرنے کے لیے نازل ہوئی ہیں۔ اس لیے پہلے پہل جاہلیت کے زمانے کی رسموں اور مجرمانہ غلط کاریوں کو جو بعض نسلوں کے دلوں میں تھیں دور کر کے ایک صحیح و سالم معاشرے کے لیے زمین ہموار کرتی ہیں اور یتیم کا مال کھانے سے زیادہ بدتر عمل کون سا ہو گا۔ اسی لیے اس سورت کے شروع میں یتیموں کے مال میں بے جا تصرف کرنے کے خلاف سخت قسم کے احکام دکھائی دیتے ہیں، جن میں آیت مذکورہ بالا سب سے زیادہ واضح ہے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال ہیرا پھیری کر کے کھاتے ہیں وہ درحقیقت آگ کھاتے ہیں۔ سارے قرآن میں اس قسم

حاشیہ صفحہ سابقہ: ۱۔ تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۳۴۶

کی تعبیر صرف ایک مقام پر نظر آتی ہے اور وہ ایسے لوگوں کے متعلق ہے جو حقائق چھپا کر آیات الٰہی میں رد و بدل کر کے نفع کماتے ہیں ان کے بارے میں خداوند عالم فرماتا ہے:

ان الذین یکتمون ما انزل اللہ من الکتاب و یشترون بہ ثمنا قلیلا اولئک ما یأکلون فی بطونھم الا النار۔

جو لوگ خداوند عالم کی آیتوں کو چھپاتے ہیں اور ان کے ذریعے معمولی سا فائدہ اٹھاتے ہیں وہ آگ کے سوا کچھ نہیں کھاتے۔ (سورۂ بقرہ آیت ۱۷۴)۔

و سیصلون سعیرا

"سیصلون" اصل میں صلی (بروزن ورد) کے مادے سے آگ میں داخل ہونے اور جلنے کے معنی میں ہے اور سعیر کے معنی ہیں بھڑکتی ہوئی آگ۔

قرآن اس آیت میں بتاتا ہے کہ اس دنیا میں آگ کھانے کے علاوہ وہ بہت جلد آخرت میں بھی بھڑکتی ہوئی آگ میں جائیں گے جو انہیں بری طرح جلائے گی۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اعمال کا ظاہری چہرے کے علاوہ ایک حقیقی چہرہ بھی ہے، جو اس دنیا میں ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے لیکن یہ باطنی چہرے آخرت میں ظاہر ہو جائیں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عمل مجسم حالت میں پیش ہوں گے۔

قرآن فرماتا ہے، جو لوگ یتیم کا مال کھاتے ہیں اگرچہ ان کے عمل کا ظاہری چہرہ رنگین و لذیذ غذاؤں سے فائدہ اٹھاتے دکھائی دیتا ہے لیکن ان غذاؤں کا اصلی چہرہ جلانے والی آگ ہے اور یہی وہ چہرہ ہے جو قیامت کے دن ظاہر ہوگا۔ حقیقی چہرہ ہمیشہ اس عمل کی ظاہری حالت کے ساتھ خاص مناسبت رکھتا ہے۔ جس طرح یتیم کا مال کھانا اور اس کے حقوق چھیننا، اس کے دل کو جلاتا اور اس کی روح کو تڑپاتا ہے (اسی طرح) اس عمل کا حقیقی چہرہ جلانے والی آگ ہے۔ اس امر کی طرف (اعمال کے حقیقی چہرے) ان لوگوں کے لیے جو ان حقائق پر ایمان رکھتے ہیں، توجہ دینا غلط کام کرنے سے روکنے کے لیے بہت ہی کارگر ہے۔ کیا کوئی ایسا شخص ہے جو اپنے ہاتھ سے آگ کے انگارے اٹھا کر اپنے منہ میں رکھے اور نگل جائے؟ اسی طرح ایماندار لوگوں کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ یتیم کا مال کھائیں۔ اگر ہم یہ دیکھتے کہ خدا والے گناہ کا تصور تک نہیں کرتے تھے تو اس کی ایک وجہ یہی ہے کہ وہ علم و ایمان کی طاقت اور اخلاقی تعلیم و تربیت کے اثر سے اعمال کے اصلی چہروں کو دیکھتے تھے، اس لیے کبھی برا کام کرنے کا خیال تک نہ کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک نادان اور بے خبر بھولا بھالا بچہ جلانے والی آگ کے انگارے کی دل خوش کرنے والی رکشنی دیکھ کر اس پر ایسا لٹو ہو جائے کہ اسے اچانک ہاتھ میں لے لے لیکن ایک سمجھدار انسان جو آگ کے جلانے کی صفت کو بارہا آزما چکا ہے وہ یہ حماقت نہیں کرتا۔ وہ کبھی اس کا تصور بھی نہ کرے گا۔ یتیموں کے مال میں دست درازی کرنے کے بارے میں بہت زیادہ دل ہلا دینے والی احادیث و روایات ہیں۔ یہاں تک کہ یتیموں کے مال میں تھوڑی سے تھوڑی زیادتی بھی ان احکام کی روشنی میں قابل گرفت ہے۔

ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقرؑ یا حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ کسی نے سوال کیا کہ یہ آگ کی سزا یتیم کا کتنا مال غصب کرنے پر ہے، تو آپؑ نے فرمایا:

دو درہم کے برابر ہے

۱۱۔ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۚ فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ○

۱۲۔ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّةً مِنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ○

حاشیہ اگلے صفحہ پر ہے

ترجمہ

۱۱ خدا تم کو تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے کہ (میراث میں سے) ایک بیٹے کا دو بیٹیوں کے برابر حصہ ہے اگر تمہاری (دو یا) دو سے زیادہ بیٹیاں ہوں تو میراث کی دو تہائی ان کے لیے ہے اور اگر ایک ہو تو اس کے لیے آدھی میراث ہے۔ اور (مرنے والے کے) باپ اور ماں میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے اگر اس کی اولاد ہو۔ (بصورت دیگر) اگر اس کے اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ اس کی میراث لیں تو اس کی ماں کے لیے تیسرا حصہ ہے اور اگر اس کے بھائی موجود ہوں تو اس کی ماں چھٹا حصہ لے گی (اور باقی چھ میں سے پانچ حصے اس کے باپ کے لیے ہیں) یہ سب کچھ اس وصیت پر عمل کر چکنے کے بعد ہے جو مرنے والا کر گیا ہے، قرض ادا کرنے کے بعد۔ تم نہیں جانتے کہ باپ اور ماؤں اور تمہاری اولاد میں سے کون تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے۔ یہ خدائی حکم ہے اور وہ دانا اور حکیم ہے۔

۱۲ اور تمہارے لیے تمہاری بیویوں کی میراث میں سے آدھا ہے اگر ان کے ہاں اولاد نہ ہو اور اگر انکی اولاد ہو تو ان کی وصیت اور قرض کی ادائیگی کے بعد چوتھا حصہ ہے اور تمہاری بیویوں کے لیے تمہاری میراث کا چوتھا حصہ ہے اگر تمہاری کوئی اولاد نہ ہو اور اگر تمہاری اولاد ہو تو ان کا تمہاری وصیت کی تکمیل اور قرض کی ادائیگی کے بعد آٹھواں حصہ ہے اور اگر کوئی ایسا شخص ہو کہ کلالہ (ایک بہن یا ایک بھائی) اس کی میراث لے یا کوئی عورت ہے کہ جس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہے تو ان میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے (اگر بھائی اور بہنیں مادری ہوں) اور ایک سے زیادہ ہوں تو پھر وہ وصیت کو پورا کرنے اور قرض ادا کرنے کے بعد تیسرے حصہ میں برابر برابر شریک ہیں۔ بشرطیکہ (وصیت کے طریقے اور قرض کا اقرار) انہیں نقصان نہ پہنچائے۔ یہ خدا کی سفارش ہے اور وہ جاننے والا اور حلیم ہے۔

شانِ نزول

صدر اسلام کے مشہور شاعر حسان بن ثابت کا بھائی عبدالرحمٰن بن ثابت انصاری فوت ہو گیا۔ اس کی ایک بیوی اور پانچ بھائی تھے عبدالرحمٰن کے بھائیوں نے میراث اپنے درمیان تقسیم کر لی اور اس کی بیوی کو کچھ نہ دیا۔

گزشتہ صفحہ کا حاشیہ
لے تفسیر برہان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

یہ واقعہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کیا گیا اور میراث لینے والوں کی شکایت کی گئی۔ اس پر آیات مندرجہ بالا نازل ہوئیں۔ ان میں شوہر اور بیوی کی میراث کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ نیز حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے منقول ہے وہ کہتے ہیں:

میں بیمار ہو گیا تھا۔ جب حضورؐ میری عیادت کے لیے تشریف لائے تو میں بے ہوش ہو چکا تھا۔ آنحضرتؐ نے پانی منگوایا کچھ پانی سے وضو فرمایا، باقی مجھ پر چھڑک دیا تو میں ہوش میں آگیا۔ میں نے عرض کیا: اے خدا کے رسولؐ! میرے بعد میرے مال کا کیا ہو گا۔ آپ خاموش رہے۔ کچھ دیر بعد یہ آیات نازل ہوئیں اور ان میں وارثوں کے حصے معین ہو گئے۔

میراث ایک فطری حق ہے

اس سے پہلے کہ ہم ان آیات کی تفسیر قلم بند کریں چند ایک نکات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ بہت سے لوگ یہ خیال کریں کہ بہتر ہے کہ کسی کی وفات کے بعد اس کے مال کو عام مال کا حصہ قرار دے کر اسے بیت المال میں جمع کرا دیا جائے۔ لیکن غور و فکر کرنے کے بعد یہ امر کھل کر سامنے آجاتا ہے کہ یہ کام بالکل عدالت کے خلاف ہے۔ کیونکہ میراث کا مسئلہ سو فی صد ایک فطری اور منطقی مسئلہ ہے۔ جب ماں باپ اپنی بعض جسمانی اور روحانی صفات قانونِ وراثت کے مطابق اپنی اولاد میں منتقل کرتے ہیں تو پھر ان کے مال کو اس قانون سے کس طرح مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ چونکہ مال ہر شخص کی محنت، مشقت اور سعی و کوشش کا نتیجہ ہوتا ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر جو کوشش کرتا ہے اور طاقت صرف کرتا ہے وہ مال سے ظاہر ہو جاتی ہے۔

اسی بنا پر ہم ہر شخص کو اس کے ہاتھ کی محنت کا فطری طور پر مالک سمجھتے ہیں اس لیے جب موت کے وقت انسان کا ہاتھ اپنے مال تک نہیں پہنچ سکتا تو عقل کا یہی تقاضا ہے کہ یہ مال ان افراد کے پاس چلا جائے جو مرنے والے کے نزدیک ترین رشتہ دار ہوں حقیقت میں ان اشخاص کا وجود اس کے اپنے وجود کی بقا شمار ہو گا۔

اسی لیے بہت سے لوگ اتنا سرمایہ رکھنے کے باوجود جو ان کی زندگی کے لیے کافی ہو سکتا ہے پھر بھی اپنے کاروبار کو بڑھانے کی لگاتار کوشش کرتے رہتے ہیں، ان کا مقصد اپنی اولاد کے مستقبل کی حفاظت کرنا اور اسے روشن کرنا ہے۔ یعنی قانونِ وراثت ملک کی اقتصادی گاڑی کو زیادہ متحرک اور فعال بنا سکتا ہے۔ اگر ہر شخص کا مال اس کی موت کے بعد اس سے بالکل الگ کر دیا جائے اور اسے عام مال قرار دے دیا جائے تو ممکن ہے کہ اقتصادی سرگرمیاں اور چہل پہل ختم ہو کر رہ جائے۔ اس گفتگو کا شاہد وہ واقعہ ہے جو فرانس میں پیش آیا ہے کہتے ہیں، اب سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ فرانس کی پارلیمینٹ کے نمائندوں نے میراث کے قانون کو لغو قرار دیا۔ اس کی بجائے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جو کوئی چھوڑ جائے اسے پبلک کا مال سمجھ کر ضبط کر لیا جائے اور اسے عوام الناس کی ضروریات میں اس طرح خرچ کیا جائے کہ اس شخص سے تعلق رکھنے والوں میں سے کسی کو کچھ بھی نہ دیا جائے لیکن کچھ مدت گزرنے کے بعد اس قانون کے بُرے اقتصادی اثرات ظاہر ہو گئے اور یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ اس قانون نے ملک کی درآمد اور برآمد پر گہرا اثر ڈالا ہے اور اس سے اقتصادی سرگرمیوں میں بہت کمی واقع ہو گئی ہے۔ چنانچہ ان حالات نے اقتصادیات کے ماہرین کو پریشان کر دیا۔

انہوں نے اس کا بنیادی سبب قانونِ میراث پر غلط عمل قرار دیا۔ اس لیے اس پر نظرِ ثانی کرنا پڑی۔ بنابریں اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قانونِ میراث حکمِ شرعی کے علاوہ ایک فطری اور طبعی امر بھی ہے۔ یہ اقتصادی سرگرمیوں کی فعالیت میں ایک گہرا اثر رکھتا ہے۔

میراث گذشتہ اقوامِ عالم میں

وراثت کا قانون فطری بنیادوں پر قائم ہے اس لیے وہ گزری ہوئی قوموں میں بھی مختلف شکلوں میں دکھائی دیتا ہے اگرچہ بعض لوگ یہودیوں کے متعلق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان میں قانونِ وراثت کا وجود نہیں تھا لیکن موجودہ تورات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قانون بڑی تفصیل کے ساتھ "سفرِ اعداد" میں موجود ہے۔ اس میں ہے:

اور بنی اسرائیل سے کہہ دو کہ اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کے بیٹا نہ ہو تو اس کی میراث بیٹی کو دے دو اگر بیٹی بھی نہ ہو تو اس کا ورثہ اس کے بھائیوں کو دے دو اگر بھائی بھی نہ ہو تو اس کی میراث اس کے باپ کے بھائیوں کو دے دو اگر اس کے باپ کا کوئی بھائی نہیں ہے تو اس کے پس ماندگان میں سے جو بھی اس کا زیادہ نزدیکی رشتہ دار ہے اُسے ترکہ دے دو۔ تاکہ وہ اس کا وارث بن جائے اور یہ امر بنی اسرائیل کے لیے واجب ہے۔ اس لیے کہ خداوند عالم نے موسیٰ کو یہ حکم دیا ہے[1]

مندرجہ بالا فقروں سے پتہ چلتا ہے کہ بنی اسرائیل میں میراث کا تعلق صرف اہلِ نسب ہی سے تھا کیونکہ اس میں شروع سے آخر تک بیوی اور شوہر کا نام نہیں ہے۔

دینِ مسیحی میں اس قانون کو معتبر سمجھا جائے گا کیونکہ موجودہ انجیل میں منقول ہے کہ حضرت مسیحؑ نے فرمایا:

میں اس لیے نہیں آیا کہ تورات کے احکامات میں کوئی رد و بدل کروں۔

اسی لیے ان کی موجودہ کتب و رسائلِ مذہبی میں میراث کی کوئی بحث نہیں پائی جاتی۔ صرف چند مقامات پر لفظ ارث کے مشتقات پر گفتگو کی گئی ہے جو سب کی سب معنوی یا اخروی میراث کے بارے میں ہے۔

اسلام سے پہلے عربوں میں تین طریقوں سے میراث بٹتی تھی:

۱۔ نسب۔ اس سے مراد ان کے ہاں صرف بیٹے اور مرد تھے۔ بچے اور عورتیں ترکہ سے قطعی طور پر محروم تھیں۔

۲۔ متبنیٰ۔ یعنی ایسا بیٹا جسے ایک خاندان نے دھتکار دیا ہو اور دوسرے نے اُسے اپنی طرف منسوب کر لیا ہو یہ دراصل منہ بولا بیٹا ہوتا تھا۔ اس صورت میں اس منہ بولے بیٹے اور اس کے منہ بولے باپ کے درمیان قانونِ وراثت جاری ہو جاتا تھا۔

۳۔ عہد و پیمان۔ دو آدمی آپس میں معاہدہ کر لیتے تھے کہ وہ زندگی بھر ایک دوسرے کا دفاع کریں گے اور مرنے کے بعد ایک دوسرے کے راز دار اور وارث رہیں گے۔

اسلام نے میراث کے فطری اور طبعی قانون کو ان خس و خاشاک سے پاک کر دیا اور ظالمانہ تفریقات جو ایک طرف عورت مرد

---

[1] سفرِ اعداد آیات ۸ - ۱۱

دوسری طرف چھوٹے بڑے کے درمیان تھیں، انہیں دور کردیا۔

اسلام نے تین چیزوں کو میراث کا سرچشمہ قرار دیا۔ اسلام سے پہلے یوں نہ تھا۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں:

۱۔ نسب اپنے وسیع مفہوم کے ساتھ یعنی ہر قسم کا تعلق جو تولد کے ذریعے دو اشخاص کے درمیان مختلف سطحوں میں ظاہر ہو۔ چاہے وہ مرد عورت ہوں چاہے چھوٹے بڑے۔

۲۔ سبب یعنی ایسے روابط جو شادی کے ذریعے مختلف افراد کے درمیان پیدا ہو جائیں۔

۳۔ ولاء اس سے مراد ایسے روابط ہیں جو نسبی یا سببی رشتہ داری کے علاوہ دو اشخاص میں پیدا ہوں مثلاً عتق یعنی اگر کوئی شخص اپنے غلام کو آزاد کر دیتا ہے اور موت کے بعد غلام اپنا کوئی نسبی یا سببی رشتہ دار نہیں چھوڑتا تو اس کا مال آزاد کرنے والے کو مل جائے گا اور یہ خود غلام آزاد کرنے کی ایک جزا اور ترغیب ہے۔

اسی طرح ولاء ضمان جریرہ ہے یہ ایک خاص معاہدہ تھا جو دو افراد کے درمیان ان کی خواہش اور ارادے سے قائم ہو جاتا تھا اور طرفین یہ امر اپنے ذمے لیتے تھے کہ وہ مختلف مواقع پر ایک دوسرے کا دفاع کریں گے اور مرنے کے بعد جبکہ ان کے درمیان کسی قسم کی نسبی یا سببی رشتہ داری بھی نہ ہو) ایک دوسرے کی میراث لیں گے۔

اسی طرح ولاء امامت ہے یعنی اگر کوئی شخص دنیا سے چل بسے اور اپنے بعد کسی قسم کا نسبی اور سببی رشتہ دار نہ چھوڑے تو اس کی میراث امام کو یا دوسرے لفظوں میں مسلمانوں کے بیت المال کو ملے گی۔ البتہ مندرجہ بالا طبقات کے لیے شرطیں اور احکام ہیں جو کتب فقہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

تفسیر

یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین۔

اس آیت میں وارثوں کے پہلے طبقے (اولاد اور ماں باپ) کے بارے میں حکم بیان کیا گیا ہے۔ واضح ہے کہ ربط و تعلق کی رو سے کوئی رشتہ اولاد، ماں اور باپ سے زیادہ قریبی نہیں ہے اسی لیے قرآن نے انہیں میراث کے دیگر طبقات پر مقدم رکھا ہے۔

پہلی آیت میں فرماتا ہے، خدا تم سے تمہاری اولاد کے بارے میں سفارش اور وصیت کرتا ہے کہ بیٹوں کو بیٹیوں کی نسبت دوگنا حصہ دو۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ترتیب آیت اور طرز بیان کے لحاظ سے بیٹیوں کی میراث کو جڑ قرار دیا گیا ہے اور بیٹوں کے ورثے کو شاخ۔ کیونکہ (بیٹیوں کا حصہ مقرر) کر کے بیٹوں کا حصہ مقرر کیا گیا ہے کہ بیٹے بیٹیوں سے دوگنا حصہ لیں گے اور یہ بیٹیوں کو میراث دینے کے لیے ایک طرح کی تاکید ہے اور زمانہ جاہلیت کی بدعتوں کا مقابلہ ہے کیونکہ وہ بیٹی کو بالکل محروم کر دیتے تھے۔ باقی رہا لڑکے لڑکی کی میراث کے تفاوت و فرق کا فلسفہ تو وہ عنقریب بیان کیا جائے گا۔

فان کن نساء فوق اثنتین فلھن ثلثا ما ترک۔

اگر مرنے والے کی اولاد صرف دو لڑکیاں یا ان سے زیادہ ہوں تو انہیں مال کا دو تہائی (۲/۳) ملے گا۔

وان کانت واحدۃ فلھا النصف

لیکن اگر ایک بیٹی ہو تو اُسے مال کا نصف ملے گا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں قرآن فرماتا ہے " فوق اثنتین " یعنی اگر دو بیٹیوں سے زیادہ ہوں تو دو تہائی مال ان کا ہے اس بنا پر یہ آیت دو لڑکیوں کے حکم سے خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے کیونکہ اس نے صرف ایک یا چند بیٹیوں کا حکم بیان کیا ہے۔

اس سوال کا جواب آیت کے پہلے حصے پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے:

للذکر مثل حظ الانثیین

یعنی ــ لڑکا لڑکی سے دوگنا حصہ لے گا۔

اگر کسی مرنے والے کے پس ماندگان میں فقط ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہو تو بیٹی کا حصہ ایک تہائی اور بیٹے کا دو تہائی ہوتا ہے۔ بنابریں اس کے مطابق دو بیٹیوں کا حصہ دو تہائی ہوگا۔ شاید اسی وجہ سے بعد میں آنے والے جملے میں دو بیٹیوں کے حصہ کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ چند بیٹیوں کے حصہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو دو تہائی سے نہیں بڑھتا (غور فرمائیے گا)۔

نیز سورۂ نساء کی آخری آیت پر غور و فکر کرنے سے بھی یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کیونکہ اس آیت میں ایک بہن کا حصہ (ایک بیٹی کی طرح) آدھا قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اگر دو بہنیں ہوں تو انہیں دو تہائی مال ملے گا۔ اس حکم سے ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ دو بیٹیوں کا حصہ بھی دو تہائی ہے۔

اس کے علاوہ یہ تعبیر عربی ادب میں دکھائی دیتی ہے، وہ کبھی کہتے ہیں " فوق اثنتین " جس سے مراد ہوتا ہے (اثنتان وما فوق) یعنی دو یا دو سے زیادہ۔

ان تمام امور کو چھوڑتے ہوئے حکم مذکور فقہ اسلامی اور منابعِ حدیث کے لحاظ سے تسلیم شدہ ہے فرض کیجئے کہ مندرجہ بالا جملے میں شک و شبہ کی گنجائش ہے تو وہ مصادرِ حدیث پر ایک نگاہ ڈالنے سے دور ہو جاتا ہے۔

مرد کی میراث عورت سے دوگنی کیوں ہے؟

بظاہر تو مرد کا ورثہ عورت سے دو چند ہے لیکن غور کرنے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ ایک لحاظ سے عورت کی میراث مرد سے دوگنی ہے اور یہ اس حمایت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہے جو اسلام نے عورت کے حقوق کی فرمائی ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر مردوں کی ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھا جائے تو مرد کی آدھی آمدنی عملی طور پر عورتوں پر خرچ ہوتی ہے۔ جبکہ عورت کے ذمہ ایسی کوئی چیز نہیں۔ مرد کو چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کی زندگی کے لوازمات اس کی ضرورت کے مطابق ہمکان، لباس، خوراک اور دیگر ضروریاتِ زندگی مہیا کرے۔ چھوٹے بچوں کی زندگی کی ضروریات بھی مرد کے ذمہ ہیں۔ جبکہ عورتوں کے ذمہ یہ لازم نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اپنی ضروریاتِ زندگی بھی ان کے ذمہ نہیں ہیں۔ اس وجہ سے ایک عورت یہ کر سکتی ہے کہ وہ اپنی تمام میراث کو اپنی بچت کے طور

پر کیسے جبکہ مرد اپنے اور اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرنے کے لیے مجبور ہے اس کا عملی نتیجہ یہی نکلے گا کہ مرد کی آدھی آمدنی عورت پر اور آدھی اپنے پر خرچ ہوگی جبکہ عورت کا حصّہ جوں کا توں باقی رہ جاتا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل مثال کی طرف توجہ فرمائیے :

فرض کیجئے کہ دنیا کی کل دولت ۳۰ ارب روپے ہے۔ جو میراث کی رو سے عورتوں، مردوں، بیٹیوں اور بیٹوں میں بانٹی جاتا ہے اب دنیا کے تمام مردوں کی آمدنی کا عورتوں کی آمدنی کے ساتھ بلحاظ میراث حساب کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس رقم میں سے ۲۰ ارب مردوں کے ہیں اور دس ارب عورتوں کے۔ جب معمول کے مطابق عورتوں کی شادی ہو جاتی ہے تو ظاہر ہے کہ ان کے لوازمات زندگی کا تمام تر بوجھ مردوں پر ہوگا۔ اس طرح عورتیں اپنے حصّہ کا دس ارب روپیہ بچا سکتی ہیں کیونکہ وہ عملی طور پر مردوں کے ۲۰ ارب روپے میں شریک ہیں وہ ان پر اور ان کی اولاد پر خرچ ہوگا۔

اس طرح مردوں کا آدھا حصّہ (دس ارب روپے) عورتوں پر خرچ ہوگا۔ اب اگر اس کے ساتھ اس دس ارب روپے کو بھی جمع کیا جائے جو انہوں نے بچایا ہے تو یوں یہ رقم مجموعی طور پر ۲۰ ارب روپے بنتی ہے۔ جو پوری دنیا کے سرمایہ کا دو تہائی ہے جبکہ مرد عملی طور پر دس ارب روپے سے زیادہ اپنے پر خرچ نہیں کر سکتے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خرچ اور فائدہ اٹھانے کے لحاظ سے عورتوں کا اصلی حصّہ مردوں کے حقیقی حصّے سے دوگنا ہے یہ فرق اس لیے ہے کہ عموماً عورتوں میں روپیہ کمانے کی صلاحیت کم ہے۔ یہ اسلام کی طرف سے عورتوں کی منطقی اور عادلانہ حمایت ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پر عورتوں کا حصّہ آدھا ہے۔ مگر ان کا حقیقی حصّہ مردوں سے زیادہ مقرر کیا گیا ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ آثارِ اسلامی کی طرف رجوع کرنے سے ہمیں اس نکتے کا سراغ ملتا ہے کہ مندرجہ بالا سوال اسلام کے شروع میں ہی لوگوں کے ذہن میں تھا اور وہ کبھی کبھار اس سلسلے میں رہبرانِ اسلام سے سوالات بھی کر لیا کرتے تھے۔ جو جوابات ان بزرگانِ اسلام (ائمہ اہلِ بیتؑ) نے اس سوال کے دیئے ہیں، غالباً وہ سب ایک ہی مضمون کے ہیں اور وہ یہ کہ :

> خداوندِ عالم نے زندگی کے اخراجات اور حق مہر مردوں کے ذمہ لگایا ہے۔ اس بنا پر ان کا حصّہ بھی زیادہ مقرر کیا گیا ہے۔

کتاب "معانی الاخبار" میں حضرت علیؑ بن موسیٰ رضا سے منقول ہے کہ آپؑ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا :

> یہ جو میراث میں عورتوں کا حصّہ مردوں کی نسبت آدھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب عورت کی شادی ہوتی ہے تو وہ کچھ نہ کچھ لیتی ہے اور مرد مجبور ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ دے۔ اس کے علاوہ عورتوں کے اخراجات مردوں کے کندھے پر ہیں۔ جبکہ عورت مرد کے اخراجات اور اپنے اخراجات سے بے فکر ہے۔

ماں باپ کی میراث

باقی رہا ماں باپ کا ورثہ جو پہلے طبقہ کا حصّہ ہیں اور ورثہ کے لحاظ سے اولاد کے برابر ہیں (یعنی طبقہ اول سے تعلق رکھتے ہیں)۔ ان کی میراث وہی ہے جو مندرجہ بالا آیت میں آچکی ہے۔ اس کی تین حالتیں ہیں :

پہلی یہ کہ مرنے والے کی ایک یا کئی بیٹے اور بیٹیاں ہوں تو اس صورت میں ماں باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصّہ ملے گا
(ولابویہ لکل واحد منھما السدس مما ترک ان کان لہ ولد ـــ)۔

دوسری یہ کہ مرنے والے کی کوئی اولاد نہ ہو اور ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں۔ اس صورت میں ماں کا حصّہ کل مال کا ایک تہائی ہے (فان لم یکن لہ ولد وورثہ ابواہ فلامہ الثلث)۔ یہاں باپ کے حصّہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا حصّہ واضح ہے یعنی دو تہائی (⅔)۔ البتہ اگر مرنے والے کی بیوی ہو یا مرنے والی کا شوہر موجود ہو تو اس صورت میں بیوی یا شوہر کا حصّہ باپ کے حصّہ میں سے منہا ہو جائے گا۔ یعنی اس صورتِ حال میں باپ کا حصّہ دوسری شق میں تبدیل ہو جائے گا۔

تیسری یہ ہے کہ صرف ماں باپ وارث ہوں۔ اولاد نہ ہو۔ لیکن مرنے والے کے پدری مادری (سگے بھائی) یا صرف پدری (سوتیلے) بھائی موجود ہوں تو اس صورت میں ماں کا حصّہ ایک تہائی کی بجائے چھٹا (⅙) ہو جائے گا۔ حقیقت میں اگرچہ بھائی میراث نہیں لیں گے لیکن اس صورت میں ماں اضافی مقدار نہ لے سکے گی۔ اسی بنا پر انہیں "حاجب" کہتے ہیں (فان کان لہ اخوۃ فلامہ السدس)۔

اس حکم کا فلسفہ واضح ہے کئی بھائیوں کا ہونا باپ کے زندگی کے بوجھ کو بڑھاتا ہے کیونکہ باپ ان کے اخراجات کا کفیل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں بلکہ جوان ہونے کے بعد بھی ان کے کئی اخراجات باپ کو اٹھانا پڑتے ہیں۔ اسی لیے وہ بھائی، ماں کے حصّے کی کمی کا سبب بنتے ہیں۔ اگر وہ ماں باپ یا صرف باپ کی طرف سے بھائی ہوں تو وہ بھائی جو صرف ماں کی طرف سے ہیں ان کی کسی قسم کی ذمہ داری باپ پر نہیں، وہ "حاجب" نہیں بنتے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نے اس آیت میں بھائیوں کا ذکر کرتے ہوئے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:
فان کان لہ اخوۃ

اگر اس شخص (متوفی) کے کئی بھائی ہوں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ عربی میں جمع کم از کم تین کے لیے ہے۔ جبکہ تمام فقہائے اسلام کا یہ طے شدہ نظریہ ہے کہ دو بھائی بھی حاجب ہیں اور ان کی وجہ سے ماں کا حصّہ ⅓ کی بجائے ⅙ ہو جاتا ہے۔

اس سوال کا جواب قرآن کی دوسری آیات کی طرف متوجہ ہونے سے واضح ہو جاتا ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام مقامات پر جمع کا لفظ تین یا تین سے زیادہ افراد کے لیے بولا جائے بلکہ کئی مقامات پر یہ لفظ دو افراد کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے مثلاً سورۂ انبیاء کی آیت ۷۸ میں:

وکنا لحکمھم شاھدین

یہ آیت حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے فیصلوں سے تعلق رکھتی ہے اور قرآن نے ان دونوں بزرگوں کے لیے ضمیر جمع (ھم) استعمال کی ہے یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات جمع کا لفظ دو افراد کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ بات شاہد اور قرینہ کی محتاج ہے۔ زیرِ بحث آیت کے اسی مفہوم پر مسلمانوں کا اتفاق اور اجماع ہے اور رہبرانِ اسلام کی طرف سے بھی اس پر دلیل موجود

ہے۔ اس مسئلہ میں (ابن عباس کے سوا) سب علمائے اسلام چاہے وہ شیعہ ہوں یا سنی کا اتفاق ہے کہ دو بھائی بھی اس آیت کے حکم میں شامل ہیں۔

میراث وصیت اور قرض کے بعد ہے

من بعد وصیۃ یوصی بھا او دین

اس کے بعد قرآن فرماتا ہے کہ وارث مال کو اپنے درمیان اس وقت تقسیم کر سکتے ہیں جبکہ مرنے والے نے وصیت نہ کی ہو اور کسی کا قرض اس کے ذمہ ہو۔ اگر وہ وصیت کر گیا ہے یا وہ کسی کا مقروض ہے تو پہلے وصیت کی تعمیل اور قرض کی ادائیگی ضروری ہے (البتہ جیسا کہ باب وصیت میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ وصیت کرنے والا اپنے مال کے تہائی حصہ تک کی وصیت کر سکتا ہے اگر وہ اس سے زیادہ مال کی وصیت کرے تو درست نہیں ہے ہاں البتہ وارث اجازت دے دیں تو صحیح ہے)۔

اٰبائکم و ابناؤکم لا تدرون ایھم اقرب لکم نفعا۔

خداوند عالم اس آیت میں فرماتا ہے تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے باپ دادا اور اولاد میں سے تمہارے لیے کون زیادہ مفید ہے یعنی قانونِ میراث نوع بشر کے حقیقی اور اصلی مصالح اور مفادات کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے اور ان مصلحتوں کی تشخیص خدا ہی کے ہاتھ میں ہے کیونکہ انسان ہر مقام پر اپنی بہتری کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ یہ گمان کریں کہ ماں باپ انسان کی بہت سی ضروریات کے ذمہ دار ہوتے ہیں اس لیے انہیں میراث میں اولاد پر مقدم ہونا چاہیے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض لوگ اس کے برعکس سوچیں۔ ان حالات میں اگر میراث کا قانون لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا تو اس میں طرح طرح کے اختلافات اور جھگڑے پیدا ہوتے لیکن خداوند عالم جو حقائق کو جس طرح کہ وہ ہیں بخوبی جانتا ہے۔ اس نے قانونِ میراث کے مثبت نظام کو جس میں نوع بشر کی بھلائی ہے مقرر فرمایا۔

فریضۃ من اللہ ان اللہ کان علیما حکیما

یہ ایک ایسا قانون ہے جو خدا تعالےٰ کی طرف سے واجب ہے اور وہ دانا و حکیم ہے۔

یہ جملہ گذشتہ مطالب کی تاکید کے لیے آیا ہے تاکہ لوگ میراث سے مربوط قوانین کے بارے میں کوئی اعتراض نہ کر سکیں۔

میراث میں میاں بیوی کا ایک دوسرے سے حصہ

ولکم نصف ما ترک ازواجکم ان لم یکن لھن ولد

گذشتہ آیت میں اولاد اور ماں باپ کے حصہ کی طرف اشارہ ہوا تھا یہاں میاں بیوی کے ایک دوسرے سے میراث لینے کی کیفیت کی وضاحت کی گئی ہے۔ آیت کہتی ہے مرد صاحب اولاد نہ ہو تو اپنی بیوی کے مال میں سے آدھی میراث لے گا لیکن اگر اس کے ایک یا کئی بچے ہوں (چاہے وہ کسی اور شوہر کے کیوں نہ ہوں) تو پھر شوہر مال کا ایک چوتھائی (۱/۴) حصہ لے گا۔

فان کان لھن ولد فلکم الربع مما ترکن

البتہ یہ تقسیم بھی بیوی کا قرض ادا کرنے اور اس کی مالی وصیتوں کو پورا کرنے کے بعد ہے۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے:

من بعد وصیۃ یوصین بہا او دین

رہی بیویوں کی میراث اپنے شوہر کے مال سے جبکہ شوہر کی کوئی اولاد نہ ہو تو وہ مال کا چوتھائی حصہ ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:
ولھن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد لیکن اگر شوہر کی اولاد ہو (چاہے یہ اولاد کسی اور بیوی سے ہو) تو پھر عورتوں کا آٹھواں حصہ ہوگا (فان کان لکم ولد فلھن الثمن مما ترکتم)۔

یہ تقسیم میراث بھی پہلی تقسیم کی طرح شوہر کے قرضوں کی ادائیگی اور مالی وصیت پوری کرنے کے بعد ہوگی (من بعد وصیۃ توصون بہا او دین)۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ شوہر اور بیوی کا حصہ اولاد کی موجودگی میں آدھا ہے۔ یہ اولاد کے حقوق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہے۔

اس بات کا سبب کہ شوہر کا حصہ عورت سے دوگنا قرار دیا گیا ہے، وہی ہے جو گذشتہ بحث میں تفصیل کے ساتھ بیٹے اور بیٹی کی میراث کے بارے تحریر کیا جا چکا ہے۔

اس نکتہ کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ جو حصہ عورتوں کے لیے مقرر ہوا ہے (چاہے وہ چوتھا ہو یا آٹھواں) وہ ایک بیوی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ اگر مرد کی کئی بیویاں ہوں تو بھی مذکورہ حصہ ان سب کے درمیان مساوی تقسیم ہوگا۔ آیہ مذکورہ بالا کا ظہور یہی ہے۔

بھائیوں اور بہنوں کی میراث

و ان کان رجل یورث کلالۃ

اس آیت میں ہمیں ایک نیا لفظ ملا ہے جو قرآن میں صرف دو مقام پر آیا ہے۔ ایک زیر بحث آیت میں اور دوسرے سورۂ نساء ہی کی آخری آیت میں اور وہ ہے لفظ "کلالہ"۔ لغات کی کتابیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ "کلالہ" اصل میں مصدری معنی رکھتا ہے اور "کلال" کے معنی میں ہے۔ جس کا مطلب ہے "قوت و توانائی کا ختم ہونا"۔ [1]

لیکن یہ لفظ بعد میں ان بہن بھائیوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو متوفی کی میراث لیتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ اور مناسبت یہ ہے کہ بھائی اور بہنیں میراث کے دوسرے طبقے کا جزو ہیں اور صرف ماں باپ اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں وارث ہوتے ہیں اور ایسا شخص جس کے ماں باپ اور اولاد نہ ہو یقیناً رنج و مصیبت میں ہوتا ہے اور اپنی طاقت اور توانائی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس لیے انہیں "کلالہ" کہا جاتا ہے۔ راغب مفردات میں لکھتا ہے کہ "کلالہ"، ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو متوفی کی میراث اس صورت میں لے جبکہ اس کے ماں باپ، اولاد اور اولاد در اولاد نہ ہو۔ لیکن ایک اور روایت جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "کلالہ"، عنوان اور نشان ہے ایسے شخص کے لیے جو دنیا سے اس حالت میں چل بسا ہو کہ اس کے ماں باپ ہوں نہ اولاد ہو۔

نیز اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ کلالہ کا لفظ متوفی کے لیے بولا جائے اور اس قسم کے رشتہ داروں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہو۔ جیسا کہ اس نے اپنی کتاب میں اس موضوع کی وضاحت کی ہے۔

---

[1] مصباح اللغۃ میں ہے "الکلالۃ فی الاصل مصدر بمعنی الکلال وھو ذھاب القوۃ"۔

باقی رہا یہ کہ قرآن مجید نے بہن بھائیوں کے الفاظ کی بجائے لفظ "کلالہ" کیوں چنا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ایسے اشخاص جن کے ماں باپ ہوں نہ اولاد، وہ یہ بات مدنظر رکھیں کہ ان کا مال ایسے لوگوں کے ہاتھ آئے گا جو اس کی کمزوری اور ناتوانی کی نشانی ہیں۔ اس لیے قبل ازیں کہ غیر لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں وہ خود اس مال کو ضروری مواقع (ضرورت مند لوگوں کی مدد اور اجتماعی فلاح و بہبود) میں خرچ کریں۔

اب ہم آیت کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں:

وان کان رجل یورث کلالۃ او امراۃ و لہ اخ او اخت فلکل واحد منھما السدس

یہ آیت بتاتی ہے کہ اگر کوئی شخص دنیا سے اٹھ جائے اور بہن بھائی اس کی میراث لے لیں یا کوئی عورت دنیا سے چل بسے اور اس کا ایک بھائی اور ایک بہن زندہ ہو تو ان میں سے ہر ایک اس کے مال کا چھٹا حصہ لے گا۔

یہ اس صورت میں ہے جب کہ متوفی کا ایک بھائی یا بہن باقی رہ گئے ہوں اور اگر وہ ایک سے زیادہ ہوں تو پھر وہ کل مال کی ایک تہائی پائیں گے۔ یعنی ان کو چاہیے کہ ایک تہائی مال آپس میں بانٹ لیں (فان کانوا اکثر من ذٰلک فھم شرکاء فی الثلث)۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: من بعد وصیۃ یوصی بھا او دین۔

یہ اس صورت میں ہے جبکہ وصیت پہلے پوری ہو چکی ہو اور قرض ادا کیا جا چکا ہو (غیر مضار) یعنی اس حالت میں جبکہ وصیت اور قرض میں وارثوں کو نقصان پہنچنے کا کوئی پہلو نہ ہو۔ مقصد یہ ہے کہ ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیت نہ کرے کیونکہ ان روایتوں کے مطابق جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اہل بیتؑ سے مروی ہیں ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیت کرنا گویا وارثوں کو نقصان پہنچانا ہے۔ ایسی وصیت کی تعمیل وارثوں کی اجازت سے ہوگی یا یہ کہ وارثوں کو محروم کرنے اور انہیں نقصان پہنچانے کے لیے مقروض نہ ہوتے ہوئے خواہ مخواہ قرض کی ادائیگی کا ذکر کر دیا جائے۔

آخر میں تاکید کے طور پر فرماتا ہے:

وصیۃ من اللہ و اللہ علیم حلیم

یعنی۔ یہ خدا کی وصیت اور نصیحت ہے اس کا احترام کرنا چاہیے کیونکہ وہ تمہاری بہتری کو خوب جانتا ہے۔ جس نے یہ حکم مقرر کیے ہیں وہ وصیت کرنے والوں کی نیت سے بھی واقف ہے لیکن اس کے باوجود وہ بردبار بھی ہے، چنانچہ ان لوگوں کو جو اس کے حکم کو نہیں مانتے فوراً سزا نہیں دیتا۔

چند اہم نکات

۱۔ جو کچھ مندرجہ بالا آیت میں بہن بھائیوں کی میراث کے بارے میں ہے اگرچہ وہ بظاہر مطلق ہے اور پدری مادری بہن بھائیوں اور صرف پدری یا صرف مادری بھائیوں کے بارے میں ہے۔ لیکن سورۂ نساء ہی کی آخری آیت کی طرف توجہ کرنے سے جس کی تفسیر عنقریب لکھی جائے گی معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے مراد متوفی کے صرف مادری بہن بھائی ہیں (جو ماں کی طرف سے بہن بھائی ہوں)۔

جبکہ سورۂ نساء کی آخری آیت پدری مادری یا صرف پدری بہن بھائیوں کے بارے میں ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہم اس آیت کے ذیل میں اس سلسلے میں شواہد پیش کریں گے۔

اگرچہ اس بنا پر یہ دونوں آیتیں "کلالۃ" بہن بھائیوں کی میراث سے بحث کر رہی ہیں اور بظاہر ایک دوسرے کے خلاف ہیں لیکن دونوں آیات کے مضامین پر غور و فکر کرنے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک بہن بھائیوں کی ایک خاص صورت کے متعلق وضاحت کر رہی ہے۔ بنا بریں ان دونوں آیتوں میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔

۲۔ ظاہر ہے کہ اس طبقے کی وراثت اس صورت میں ہے جب پہلے طبقہ یعنی ماں باپ اور اولاد میں سے کوئی باقی نہ ہو۔ اس امر کی شاہد یہ آیت ہے:

"واولوا الارحام بعضهم اولى ببعض فى كتاب الله"

رشتہ داروں میں سے بعض میراث کے تقرر اور تعین میں دوسروں پر ترجیح رکھتے ہیں یعنی جو مرنے والے کے زیادہ قریب ہیں وہ مقدم ہیں (انفال۔ ۷۵)

اسی طرح وہ بہت سی روایتیں جو اس سلسلے میں منقول ہیں وہ میراث کے طبقات کے تعین اور بعض کی بعض پر ترجیح پر مزید گواہ ہیں۔

۳۔ ھم شرکاء فی الثلث اگر ایک سے زیادہ (مادری بھائی اور بہنیں) ہوں تو وہ مال کے ایک تہائی میں برابر برابر کے شریک ہیں اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک تہائی مال آپس میں مساوی طور پر تقسیم کریں گے اور اس صورت میں مرد اور عورت کا کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ شراکت مطلقہ کا مفہوم حصوں کا برابر برابر ہوتا ہے۔

۴۔ مندرجہ بالا آیت سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے کہ انسان یہ حق نہیں رکھتا کہ وصیت کے ذریعے یا ایسا قرضہ بیان کر کے جو در اصل اس کے ذمہ نہیں ہے وارثوں کے خلاف سازش کرے اور ان کا حق ضائع کرے۔ ہاں اس کی صرف یہ ذمہ داری ہے کہ جو قرضہ سچ مچ اس کے ذمہ ہے آخری موقع پر انہیں بتا دے اور وہ عادلانہ وصیت کا حق رکھتا ہے جس کی حد زیادہ سے زیادہ مال کا ایک تہائی حصہ ہے۔

اس سلسلے میں رہبران اسلام کے ارشادات میں سخت ہدایات دکھائی دیتی ہیں ان میں سے ایک حدیث میں ہے:

ان الضرار فى الوصية من الكبائر.

وارثوں کو نقصان پہنچانا اور انہیں بے جا وصیت کے ذریعے حق شرعی سے محروم کرنا گناہ کبیرہ ہے [1]

اسلام حقیقت میں اس حکم کے ذریعے ایک طرف تو اس شخص کو اس کے مال کے ایک حصہ سے اس کی وفات کے بعد بھی فائدہ و ثواب پہنچانا چاہتا ہے دوسری طرف وارثوں کو بھی فائدہ پہنچانا چاہتا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ کینہ اور دشمنی کی وجہ سے محبت کا رشتہ جسے مرنے کے بعد بھی زندہ رہنا چاہیے کمزور اور سست پڑ جائے۔

۱۳۔ تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ

---

[1] مجمع البیان۔

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○

۱۴۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○

ترجمہ

۱۳ یہ خدا کی (مقرر کی ہوئی) سرحدیں ہیں۔ جو شخص اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرے (اور اس کے قوانین کی سرحدوں کا احترام کرے) وہ اُسے ایسی جنت کے باغوں میں بھیجے گا جس کے درختوں کے نیچے پانی کی نہریں جاری رہتی ہیں اور یہ لوگ ہمیشہ کے لیے اس میں رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

۱۴ اور جو کوئی خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی سرحدوں سے تجاوز کرے گا تو وہ اُسے ایسی آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے ذلت آمیز سزا ہے۔

تفسیر

حدود حد کی جمع ہے۔ اصل میں اس کا معنی ہے منع کرنا اور روکنا۔ بعد ازاں ہر اس چیز کو جو دو چیزوں کے درمیان حد فاصل ہو اور انہیں ایک دوسرے سے ممتاز اور جدا کرے حد کہا جانے لگا۔ مثلاً گھر کی حد، باغ کی حد، شہر کی حد اور ملک کی حد۔ گویا ایسے نقاط کو حد کہا جاتا ہے جو انہیں دوسرے نقاط سے جدا کریں۔

خداوند عالم مندرجہ بالا آیت میں لفظ تلک کے ذریعے میراث کے قوانین کی طرف جو گذشتہ آیات میں آچکے ہیں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے، یہ خدا کی سرحدیں ہیں جنہیں پھاندنا اور عبور کرنا منع ہے۔ جو ان سے آگے بڑھیں گے وہ گناہگار سمجھے جائیں گے۔

تلك حدود الله کا یہ مفہوم کلام مجید کی متعدد آیات میں آیا ہے اور یہ ہر جگہ اجتماعی احکامات اور مقررات بیان کرنے کے بعد آیا ہے مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۷ میں اعتکاف میں جنسی ملاپ کی ممانعت اور روزہ کے احکام کے بعد ہے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۹ اور ۲۳۰، سورۂ طلاق کی آیت ۱ میں طلاق کے کچھ احکام کے بعد اور سورۂ مجادلہ آیت ۴ میں کفارہ کے بیان کے بعد ہے۔ ان سب موقعوں پر احکام و قوانین بیان ہوئے ہیں جن سے آگے بڑھنا ممنوع ہے اور وہ خدائی سرحدوں کے عنوان سے پہچانے جاتے ہیں۔[1]

ومن يطع الله ورسوله يدخله جنات ......

خداوند عالم ان چند خدائی حدود اور سرحدوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے، وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت

---

[1] حدود اللہ کی تفسیر کے سلسلے میں اس تفسیر کی جلد ۱ میں مزید بحث ہو چکی ہے۔ اردو ترجمہ ص ۵۴۱ ملاحظہ کیجیے۔

کرتے ہیں اور ان سرحدوں کا احترام کرتے ہیں، ہمیشہ ہمیشہ جنت کے باغوں میں رہیں گے جن کے درختوں کے نیچے سدا پانی بہتا رہتا ہے۔
آیت کے آخر میں فرماتا ہے: یہ بہت بڑی کامیابی و کامرانی ہے (و ذٰلک الفوز العظیم)۔

من یعص اللہ و رسولہ و یتعد حدودہ یدخلہ نارا خالدًا فیھا

آیت کا یہ حصہ ان لوگوں کے مخالف نقطۂ نظر کو بیان کرتا ہے جن کی طرف گذشتہ آیتوں میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتے ہیں اور ان کے احکامات کی سرحدیں پھاند جاتے ہیں وہ ہمیشہ آگ میں رہیں گے۔

البتہ ہم جانتے ہیں کہ صرف خدا کی حکم عدولی (چاہے وہ گناہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو) ہمیشہ کے عذاب کا سبب نہیں ہے۔ اس وجہ سے آیت مذکورہ بالا میں وہ لوگ مراد لیے گئے ہیں جو دشمنی، سرکشی، بغاوت اور آیاتِ الٰہی کے انکار کی بنا پر خداوند عالم کے احکامات کو اپنے پاؤں کے نیچے روند ڈالتے ہیں۔ حقیقت میں وہ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ اس بات کی طرف غور و فکر کرتے ہوئے کہ لفظ حدود جمع ہے اور تمام قوانین الٰہی پر محیط ہے، یہ معنی بعید دکھائی نہیں دیتا کیونکہ جو شخص خداوند عالم کے سب قانون توڑ دے وہ ہرگز خدا پر ایمان نہیں رکھتا۔ ورنہ ان میں سے کسی کا احترام تو کرتا۔

قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ گذشتہ آیتوں میں اہلِ بہشت کے بارے میں خالدین فیھا (ہمیشہ جنت میں رہیں گے) جمع کی صورت میں آیا ہے اور اس آیت میں جو دوزخیوں کے متعلق ہے "خالدًا فیھا" مفرد کی شکل میں آیا ہے۔ ایسی دو آیات میں جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں، تعبیر کا یہ فرق اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اہلِ بہشت کے لیے اجتماعی زندگی ہے جو جنت کی نعمتوں میں سے ایک نعمت شمار ہوتی ہے جبکہ اہلِ دوزخ عذاب الٰہی میں اس طرح پھنسے ہوئے اور ڈوبے ہوئے ہوں گے کہ انہیں دوسروں کی کوئی سدھ بدھ نہ ہوگی۔ مختصر یہ کہ وہ عملی طور پر اکیلے ہوں گے یہاں تک کہ یہ بات اس دنیا میں اپنی رائے پر چلنے والوں اور الگ تھلگ رہنے والے لوگوں کے بارے میں مل جل کر اور اجتماعی زندگی بسر کرنے والوں کے مقابلہ میں صادق آتی ہے کہ یہ لوگ اس دنیا میں جنتی اور وہ دوزخی ہیں۔

ولہ عذاب مھین

ان کے لیے ذلیل اور رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

اصل میں گذشتہ جملے میں عذاب خداوندی کی جسمانی سزاؤں کا پہلو جھلکتا ہے اور کیونکہ اس جملہ میں ذلت و رسوائی کا تذکرہ بھی ہے اس لیے یہاں روحانی پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اسلامی قانونِ میراث کی خصوصیات

عام طور پر میراث کے قانون میں اور خاص طور پر اسلام کے میراث کے قانون میں کئی ایک خوبیاں ہیں۔ ذیل میں بعض کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

۱۔ اسلامی نظامِ میراث میں یہ خوبی ہے کہ اس میں متوفی سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص بھی سلسلۂ مراتب کو پیش نظر رکھتے ہوئے میراث سے محروم نہیں رہتا اور یہ جو رواج زمانۂ جاہلیت کے عربوں اور بعض دوسرے ملکوں میں تھا کہ وہ عورتوں اور بچوں کو ہتھیار نہ اٹھا سکنے اور جنگ کی طاقت نہ رکھنے کی وجہ سے میراث سے محروم کر دیتے تھے اور متوفی کی دولت دُور کے رشتہ داروں

کو دے دیتے تھے، اسلام میں سرے سے اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی قانونِ میراث ان سب افراد پر محیط ہے جو مرنے والے کے ساتھ کوئی نسبت یا ربط رکھتے ہیں۔

۲۔ یہ قوانین جائز اور فطری ضروریاتِ انسانی کے لیے مثبت پہلو رکھتے ہیں کیونکہ انسان ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ اپنے خون پسینے سے کمائی ہوئی دولت ایسے افراد کے ہاتھوں میں دیکھے جو اس کے جگر کا ٹکڑا ہیں اور ان کی زندگی حقیقت میں ان کی زندگی کی بقا و دوام ہے۔ اس لیے قانونِ میراث میں اولاد کا حصہ سب سے زیادہ ہے جبکہ ماں باپ اور باقی رشتہ دار وغیرہ اپنے اپنے مقام پر مناسب حصے کے حامل ہیں۔

۳۔ یہ قانون انسان کو زیادہ دولت کمانے اور اقتصادی گاڑی کے پہیوں کو حرکت دینے کے سلسلے میں شوق دلاتا اور ابھارتا ہے۔ کیونکہ جب انسان اپنی زندگی کی محنت کے نتیجے کو اپنے مرکزِ محبت و تعلق کے حصہ میں دیکھتا ہے تو پھر وہ چاہے کسی سن اور حالات میں ہو کام کرنے کے لیے اس کا شوق بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کی مصروفیات میں ٹھہراؤ اور وقفہ نہیں آتا۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ جب بعض ممالک میں قانونِ میراث کو لغو قرار دیا گیا اور مرنے والوں کا مال اور جائداد حکومت کو دے دیئے گئے تو جلد ہی اس ملک کے اقتصادی ماحول میں اس قانون کے منفی اثرات جمود کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ اس لیے انہیں مجبوراً یہ قانون ختم کرنا پڑا۔

۴۔ اسلام کا قانونِ میراث دولت کو ایک جگہ جمع کرنے سے روکتا ہے کیونکہ اس نظام میں ہر انتقال کے بعد دولت وسیع عادلانہ طور پر بہت سے افراد میں بانٹی جاتی ہے اس لیے یہ نظام دولت کی عادلانہ تقسیم کے لیے معاون و مددگار ہے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ آج کی دنیا میں تقسیم دولت کی جو مختلف شکلیں ہیں ان سے اکثر معاشرے کو نقصان اور تکلیف پہنچی ہے اسلام کا قانونِ میراث اس طرح کا نہیں ہے بلکہ اس میں مال کی تقسیم اس طرح ہوتی ہے کہ اسے سب ہنسی خوشی قبول کر لیتے ہیں۔

۵۔ اسلامی قانونِ میراث متوفی سے صرف میل جول رکھنے کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ وارثوں کی حقیقی ضرورت کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ بیٹوں کا حصہ بیٹیوں کی نسبت دوگنا ہے۔ یا بعض حالات میں باپ کا حصہ ماں سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قانونِ اسلامی کے مطابق مرد کی زیادہ اقتصادی ذمہ داریاں ہیں عورتوں کی زندگی کا خرچ مردوں کے کندھے پر ہے۔ اسی لیے ان کو عورتوں کی نسبت زیادہ ضرورت ہے۔

عول اور تعصیب کسے کہتے ہیں

ہم اس مقام پر دو اہم علمی مسئلوں کا جائزہ لیتے ہیں اور وہ ہیں عول اور تعصیب۔

یہ بحث اس وجہ سے شروع ہوتی ہے کہ میراث کے حصے جس طرح گذشتہ آیات میں بیان کیے گئے ہیں بعض اوقات مجموعی مال سے کم اور زیادہ ہو جاتے ہیں مثلاً اگر دو پدری مادری بہنیں اور شوہر وارث ہوں تو ان (دو بہنوں) کی میراث دو تہائی (۲/۳) ہے اور شوہر کا ورثہ آدھا ترکہ ہے اور ان کا مجموعہ ۷/۶ ہوگا یعنی کل سے ۱/۶ زیادہ ہو جائے گا۔ یہاں یہ بحث واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ آیا عادلانہ طور پر کل ۱/۶ حصوں کی نسبت سے سب وارثوں کو کم دیا جائے یا یہ کہ مقررہ افراد سے کم کیا جائے۔

علمائے اہلِ سنت کے درمیان تو یہی مشہور ہے کہ سب کے حصوں سے کم کیا جائے۔ فقہی اصطلاح میں اسی کو "عول" کہا جاتا ہے (لغت میں عول کے معنی زیادتی اور بلندی کے ہیں)۔

بہر حال وہ کہتے ہیں کہ اضافی ۱/۶ دونوں گروہوں سے ان کے حصوں کے مطابق کم دیا جائے[1] اسی طرح دیگر مواقع پر بھی وہ ایسا کرتے[2] ہیں۔ حقیقت میں اس موقع پر میراث کے حصہ داروں کو طلبگاروں کی طرح فرض کرتے ہیں اور مقروض تمام کے مطالبات پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اصطلاح کے مطابق وہ دیوالیہ ہو گیا ہے اور کون نہیں جانتا کہ ایسے مواقع پر طلبگاروں کے حصوں کی مناسبت سے کمی کی جاتی ہے۔

لیکن شیعہ فقہا کا نظریہ یہ ہے کہ ہمیشہ نقص خاص افراد کے مال میں ہونا چاہیے ان کے مطابق مندرجہ بالا مثال میں نقص اور کمی دونوں بہنوں کے حصہ میں کی جائے گی وہ کہتے ہیں کہ جس طرح حدیث میں آیا ہے، ممکن نہیں کہ وہ خدا جو سب چیزوں کے حساب کو یہاں تک کہ بیابان کے ریت کے ذرّوں کو بھی جانتا ہے، میراث کے حصوں کو ایسے کیونکر قرار دے سکتا ہے کہ ان میں کمی واقع ہو۔ یقیناً ایسے مواقع پر خدا نے کوئی قانون وضع کیا ہے۔ اگر اس قانون کی طرف توجہ کرلی جائے تو کمی کا تصور نہیں ہو سکتا اور وہ قانون یہ ہے کہ وارثوں میں سے بعض ایسے ہیں جن کے لیے قرآن میں "حد اقل" اور "حد اکثر" مقرر نہیں ہوتی یعنی ان کا حصہ قابلِ تغیر ہے اور اپنی جگہ سے ہٹ سکتا ہے۔ اس لیے مندرجہ بالا مثال میں نقص شوہر کی طرف نہیں جائے گا۔ ۱/۶ اضافی حصہ دو بہنوں کے حصے سے کم کرنا پڑے گا (غور فرمایئے گا)۔

کبھی کبھی اس کے برعکس معاملہ ہوتا ہے اور حصوں کا مجموعہ کل مال سے کم ہوتا ہے اور کچھ مال بچ جاتا ہے مثلاً ایک شخص مر جاتا ہے اور ایک بیٹی اور ماں باقی رہ جاتی ہے۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ اس صورت میں ماں کا حصہ ۱/۶ ہے اور بیٹی کا ۱/۲ ہے۔ جن کا مجموعہ ۴/۶ ہوتا ہے یعنی ۲/۶ بچ جاتا ہے۔ علمائے اہلِ سنت کہتے ہیں کہ باقی "عصبہ" (بر وزن کسبہ یعنی بعد والے طبقے) کو دی جائے گی (مثلاً اس مثال میں متوفی کے بھائیوں کو دی جائے)۔ اسی کو اصطلاح میں تعصیب کہتے ہیں۔

لیکن شیعہ فقہا کا نظریہ یہ ہے کہ وہ سب مال انہی دو کے درمیان ایک اور تین کی نسبت سے بانٹ دیا جائے کیونکہ پہلے طبقے کے ہوتے ہوئے دوسرے طبقہ کی باری نہیں آتی۔ اس کے علاوہ بعد کے طبقہ کے مردوں کو اضافی مقدار دینا زمانۂ جاہلیت کے دور سے ملتا جلتا ہے جو عورتوں کو بلا وجہ میراث سے محروم کر دیتے تھے۔

مندرجہ بالا ایک پیچیدہ علمی بحث ہے جس کا خلاصہ ہم نے تحریر کر دیا ہے اس کی مزید تفصیل کے لیے کتب فقہ ملاحظہ فرمایئے۔

۱۵۔ وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ

---

[1] مطلب کا خلاصہ یہ ہے کہ مسئلہ کل ۶/۶ ہے جو کہ دو بہنوں کا حصہ ہے اور ۳/۶ شوہر کا حصہ ہے۔ ۱/۶ اضافی مقدار ہے جسے ۴ اور ۳ کی نسبت سے ان دونوں گروہوں کے درمیان تقسیم کر دیں۔ ریاضی میں نسبت کی تقسیم کا قاعدہ موجود ہے اس کے مطابق عمل کرتے ہوئے دونوں بہنوں کے حصے میں [illegible] اور شوہر کے حصے میں سے [illegible] منہا کریں گے۔

[2] جو مرد بلا واسطہ یا بالواسطہ متوفی سے ربط رکھتے ہیں۔

الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ○

۱۶۔ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ○

ترجمہ

۱۵ اور تمہاری عورتوں میں سے جو زانی ہوں، ان پر چار مسلمان مردوں کو گواہ کے طور پر طلب کرو اگر وہ گواہی دیں تو ان (عورتوں) کو (اپنے) گھروں میں بند کر دو۔ یہاں تک کہ وہ مر جائیں یا خدا ان کے لیے کوئی راستہ کھول دے۔

۱۶ اور وہ مرد اور عورتیں (جو شادی شدہ نہ ہوں) اور یہ برا کام کر بیٹھیں انہیں تکلیف پہنچاؤ (ان پر حد جاری کرو) اور اگر سچ مچ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں (اور گذشتہ حرکت کی تلافی کریں) تو انہیں معاف کر دو کیونکہ خداوند عالم توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

والتی یاتین الفاحشۃ.....

لفظ فاحشہ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے اصل میں بہت برے کام یا بڑی گنگھور کے معنی میں ہے اگر یہ لفظ زنا اور عفت و پاک دامنی کے خلاف کاموں کے بارے میں استعمال ہو تو وہ بھی اسی مناسبت سے ہے۔ یہ لفظ قرآن مجید میں تیرہ مقامات پر آیا ہے بعض مواقع پر زنا بعض جگہوں پر "لواطت" کے لیے اور بعض مقامات پر نہایت برے اور سنگین کاموں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ اکثر مفسرین نے اس آیہ شریفہ کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ یہ آیت ان شوہر دار عورتوں کی سزا کی طرف اشارہ کرتی ہے جو زنا کی مرتکب ہوں۔ آیت مزید بتاتی ہے کہ اگر تمہاری بیویاں زنا کی تہمت سے آلودہ ہوں تو چار مسلمان مرد اس کام کے گواہوں کے طور پر بلاؤ۔ اگر وہ اس بات کی گواہی دے دیں تو پھر ان عورتوں کو گھر میں بند کر دو یہاں تک کہ ان کو موت آجائے۔

اس امر کی دلیل کہ مندرجہ بالا آیت زنائے محصنہ[1] کی طرف اشارہ کرتی ہے، اس قرینہ کے علاوہ جو آنے والی آیت میں ہے لفظ من نسائکم (تمہاری بیویاں) بھی ہے۔ کیونکہ یہ تعبیر قرآن مجید میں بار بار آئی ہے۔ اسی وجہ سے شوہر دار عورتوں کے عفت و عصمت کے منافی عمل کی سزا اس آیت میں "عمر قید" مقرر ہوئی ہے۔ لیکن اس کے بعد یہ آیت فوراً بلا فاصلہ کہتی ہے: (او یجعل اللّٰہ لھن سبیلا) یا یہ کہ خدا ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔ یعنی ان کے لیے قید کی سزا جاری رہے یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا

---

[1] محصنہ سہاگن یا شوہر دار عورت کو کہتے ہیں۔ (مترجم)

یہ کہ کوئی نیا قانون خدا کی طرف سے ان کے لیے معین ہو۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ ایک وقتی حکم تھا جو شروع شروع میں نازل ہوا اگر آئندہ جب حالات اور افکار ساز گار ہو جائیں تو ان کے بارے میں ایک نیا حکم نازل کیا جائے۔ اس موقع پر جو عورتیں اس قانون کی زد میں آتی ہیں اور ابھی تک زندہ ہیں وہ فطرتاً قید سے آزاد ہو جائیں گی اور دوسری سزا بھی انہیں نہ دی جائے گی۔ ان کی قید خانہ سے آزادی پہلا حکم منسوخ ہو جانے کی وجہ سے ہوگی۔ باقی رہا نئی سزا کا نہ ملنا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سزا کا قانون ان کاموں کے لیے ہوتا ہے جو اس کے آنے کے بعد انجام پائیں اس طرح آئندہ کے لیے جو بھی قانون ہو وہ ان قیدیوں کی رہائی کا راستہ ہے۔ البتہ نیا قانون ان تمام افراد کے لیے ہے جو آئندہ جرم کریں گے (غور فرمایئے گا)۔

باقی رہا وہ احتمال جو بعض نے پیش کیا ہے کہ "او یجعل اللہ لھن سبیلا" سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے سنگساری کے متعلق اپنے آئندہ حکم کے ذریعے ایسے افراد کے لیے آزادی کی راہ کھول دی ہے، تو یہ نظریہ درست نہیں ہے کیونکہ یہ کبھی بھی "لھن سبیلا" (ان کے لیے نفع کی راہ) کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ کسی کو قتل کر دینا نجات کا راستہ نہیں ہے ہم جانتے ہیں کہ وہ قانون جو اسلام نے زنائے محصنہ کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے بعد میں مقرر کیا ہے، "رجم" (سنگسار کرنا) ہے جو احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بطور مسلم موجود ہے اگرچہ قرآن میں اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

جو کچھ ہم رقم کر چکے ہیں اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت ہرگز منسوخ نہیں ہوئی کیونکہ نسخ ان احکامات کے بارے میں صادق آتا ہے جو شروع میں بصورت مطلق بیان ہوں نہ کہ وقتی اور محدود طور پر، جبکہ آیتِ مندرجہ بالا نے عمر قید کا حکم ایک محدود اور وقتی حیثیت سے ذکر کیا ہے اور اگر کچھ روایتوں میں ہے کہ آیات مندرجہ بالا ان احکام کے ذریعے جو عفت و عصمت کے منافی اعمال کی سزا کے بارے میں آئے ہیں، منسوخ ہو گئی ہے تو اس سے مراد اصطلاحی نسخ نہیں ہے کیونکہ نسخ کا لفظ روایات کی زبان میں حکم کے ہر طرح سے خاتمے کے لیے بولا جاتا ہے (غور کیجئے گا)۔

ضمناً اس طرف بھی توجہ کرنا چاہیے کہ اس قسم کی عورتوں کو گھر میں قید رکھنے کا حکم ایک طرف سے تو ان کے فائدے میں ہے کیونکہ یہ ان کو عام قید خانوں میں قید کرنے سے کہیں بہتر ہے۔ دوسری طرف تجربہ یہ بتاتا ہے کہ عام قید خانے معاشرے کو بگاڑنے اور تباہ و برباد کرنے میں گہرا اثر رکھتے ہیں کیونکہ یہ عام طور پر برائیوں کی بہت بڑی درس گاہ سمجھتے ہیں۔ مجرم لوگ وہاں اپنے تجربے ایک دوسرے کو منتقل کرتے ہیں کیونکہ وہ اکٹھے رہتے ہیں اور ان کے پاس وسیع فارغ وقت بھی ہوتا ہے۔

واللذان یأتیانہا منکم

اس کے بعد خداوند عالم اس آیت میں غیر محصنہ (غیر شادی شدہ) سے سرزد ہونے والے زنا اور عفت کے منافی عمل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے، اگر کنوارے مرد، عورت یہ برا کام کریں تو انہیں سزا دو۔ اگرچہ اس آیت میں زنائے غیر محصنہ کی صراحت نہیں ہے۔ لیکن اس لحاظ سے کہ یہ آیت گزشتہ آیت کے بعد آئی ہے اور زنا کی جس سزا کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے وہ اس سزا سے جدا اور الگ ہے جو گزشتہ آیت میں تھی اور اس سے ہلکی ہے۔ بنابریں اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حکم زنا کرنے والوں میں سے ایسے گروہ کے بارے میں ہے جو پہلی آیت میں داخل نہ تھا اور چونکہ گزشتہ آیت اس قرینہ سے جس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں محصنہ کے زنا کے ساتھ مخصوص ہے، تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ آیت غیر محصنہ کے زنا کے بارے میں حکم بیان کر رہی ہے۔

یہ نکتہ بھی واضح ہے کہ اس آیت میں ذکر کی ہوئی سزا ایک کلی سزا ہے اور سورۂ نور کی آیت ۲ میں جو حتماً ناظرین میں سے ہر ایک کے لیے سو کوڑے بیان کی گئی ہے، بہت ممکن ہے کہ وہ اس آیت کی تفسیر و توضیح ہو اسی دلیل کی بنا پر یہ حکم منسوخ نہیں ہوا۔

تفسیر عیاشی میں امام جعفر صادقؑ نے اس آیت کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

البکر اذا اتت الفاحشة التی اتتها هذه الثیب فآذوهما

یعنی اس آیت سے مراد غیر شادی شدہ مرد و عورت ہیں اگر وہ بُرا کام کریں تو انہیں سزا دی جائے۔

لفظ "اللذان" اگرچہ تثنیہ مذکر کا صیغہ ہے، تاہم اس سے مراد مرد اور عورت دونوں ہی ہیں اور یہ اصطلاح کے مطابق باب تغلیب سے ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال تحریر کیا ہے کہ یہ آیت لواطت جیسے بدترین کام کے بارے میں ہے اور گذشتہ آیت کا ربط "مساحقہ" (عورت سے عورت کا مباشرت کرنا) کے ساتھ ہے۔ لیکن "یأتیانها" کی ضمیر "فاحشہ" کی طرف پھیرنے سے جو گذشتہ آیت میں ہے، یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ منافی عفت عمل جس کا اس آیت میں ذکر ہے، اسی نوعیت کا ہے جس نوعیت کا آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ بنا بریں ایک کو لواطت کے بارے میں اور دوسرے کو مساحقت کے بارے میں سمجھنا ظاہر کے خلاف ہے۔ اگرچہ یہ دونوں انواع ہم جنس سے ملاپ کرنے میں شریک ہیں۔

اس بنا پر دونوں آیات کا زنا سے تعلق ہے۔ ان سب کو چھوڑتے ہوئے بھی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں لواطت کی سزا قتل ہے نہ کہ آزار اور تکلیف پہنچانا اور کوڑے مارنا۔ غرض اس امر کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ زیر بحث آیت منسوخ ہو گئی ہے

فان تابا و اصلحا فاعرضوا عنهما ان الله کان توابا رحیما

خداوند عالم آیت کے آخر میں اس قسم کے گناہوں کے لیے توبہ اور بخشش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اگر وہ واقعاً توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر کے گذشتہ گناہوں کی تلافی کر لیں تو ان کی سزا سے صرف نظر و چشم پوشی کر لو کیونکہ خداوند عالم توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔ یہ حکم حقیقت میں اس قسم کے خطاکاروں کے لیے واپس آنے کی راہ کھولتا ہے کہ توبہ اور اصلاح کی صورت میں اسلامی معاشرہ فراخ دلی کے ساتھ دامن پھیلائے ہوئے انہیں قبول کر لیتا ہے اور اب وہ معاشرے کے دھتکارے ہوئے افراد بن کر نہیں رہتے۔

البتہ جیسا کہ فقہی کتب میں ہے توبہ اس صورت میں درست ہے کہ وہ اسلامی عدالت میں ثبوت جرم شہادت گواہان اور عدالت اسلامی کا حکم صادر ہونے سے پہلے کی جائے لیکن وہ توبہ جو حکم صادر ہونے کے بعد ہو، کوئی وزن نہیں رکھتی ہاں اس حکم سے ضمناً یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ توبہ کر چکے ہیں انہیں گذشتہ گناہوں کا ذمہ دار ٹھہرا کر بُرا بھلا نہ کہا جائے۔

تو جہاں سزا کا حکم اور حد شرعی ساقط ہو جائے وہاں بدرجہ اولیٰ لوگ اس کے کیے ہوئے گناہ سے چشم پوشی کریں۔ اس طرح وہ لوگ جن کے بارے میں یہ حد جاری ہو گئی ہو اور اس کے بعد وہ توبہ کر لیں وہ بھی مسلمانوں کی طرف سے چشم پوشی کے مستحق ہیں۔

اسلام کے تعزیری قوانین کا سہل اور ممتنع طریقہ

کبھی کبھی بعض لوگ کئی ایک مناسبتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوال کرتے ہیں کہ اسلام نے تعزیری قوانین کی اتنی سخت اور

ناقابلِ برداشت سزائیں کیوں مقرر کی ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ شادی شدہ عورت سے زنا کرنے کی سزا پہلے مرتبہ مقرر ہوئی اور اس کے بعد قتل۔ کیا بہتر نہیں ہے کہ اس قسم کے گناہوں کی سزا زیادہ نرم اور ہلکی دی جائے تاکہ جرم اور سزا میں اعتدال قائم رہے۔

لیکن ذرا سوچیے اگرچہ اسلام کے تعزیری قوانین اور سزائیں بظاہر سخت اور شدید دکھائی دیتی ہیں لیکن اس کے مقابلے میں جرم کے ثابت ہونے کا طریقہ اتنا آسان نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ایسی شرطیں لگائی گئی ہیں کہ غالباً جب تک گناہ ڈنکے کی چوٹ اور برملا نہ کیا جائے وہ شرائط پوری نہ ہوں گی۔ مثلاً گواہوں کی تعداد چار ہے۔ جس کی طرف ہم گذشتہ آیت میں اشارہ کر چکے ہیں کہ صرف نڈر اور لاپرواہ افراد ہی مجرم ثابت ہو سکتے ہیں۔ واضح ہے کہ اس قسم کے اوباش لوگوں کو سخت سزا ہی دینا چاہیے۔ تاکہ وہ معاشرے کے لیے عبرت بن سکیں اور وہ گناہ کی آلودگی سے پاک ہو جائے۔ اسی طرح گواہوں کی شہادت کے لیے کچھ شرطیں ہیں مثلاً آنکھوں سے دیکھنا اور قرائن پر قناعت نہ کرنا اور شہادت میں یکسانیت وغیرہ جو کہ جرم کو ثابت اور گھناؤنا کر دیتی ہے۔

اس طرح اس قسم کی سخت ترین سزا کا امکان گناہگاروں کے سامنے رکھا ہے اور یہ احتمال چاہے کتنا ہی ضعیف کیوں نہ ہو بہر حال بہت سے لوگوں کی نفسیات پر اثر انداز ہو سکتا ہے لیکن اسلام نے اس کے اثبات کو مشکل کر دیا ہے تاکہ اگر ایسے مواقع آئیں تو عملی طور پر یہ سزا وسیع پیمانے پر نہ دی جا سکے۔ درحقیقت اسلام چاہتا ہے کہ اس قانونِ تعزیر کا اثر تہدید بھی قائم رہے اور زیادہ افراد قتل بھی نہ ہوں۔ غرض نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سزا کے تعین اور اثباتِ جرم کی راہ میں اسلام کا یہ طریقہ ایسی روش ہے جو معاشرے کو گناہ کی آلودگی سے بچانے کے لیے بہت موثر ہے جبکہ جن افراد کو یہ سزا دی جاتی ہے وہ زیادہ تعداد میں بھی نہیں ہیں۔ اسی بنا پر ہم نے اس روش اور طریقے کا عنوان سہل اور ممتنع رکھا ہے۔

۱۷۔ إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ○

۱۸۔ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ○

ترجمہ

۱۷ توبہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو جہالت کی وجہ سے بُرا کام کرتے ہیں اور اس کے بعد جلدی سے توبہ کر لیتے ہیں خدا ایسے لوگوں کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور وہ دانا و حکیم ہے۔

۱۸ اور بُرے کام کرنے والے اُن میں سے جب کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ

اب میں توبہ کرتا ہوں۔ یہ توبہ نہیں ہے اور نہ ان کے لیے جو حالتِ کفر میں دنیا سے اٹھ جاتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تفسیر

قبولیت توبہ کے لیے شرطیں

انما التوبة علی الله للذین یعملون السوء بجهالة

گذشتہ آیت میں عفت اور پاک دامنی کے خلاف عمل کرنے والوں کو توبہ کے سبب سزا نہ ملنے کا مسئلہ تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ اور اسی سلسلے میں اس جملے کے ذریعے پروردگار کی طرف سے ان کی توبہ قبول ہونے کی طرف اشارہ بھی ہوا ہے؛

ان الله کان توابا رحیما

خدا اپنے بندوں کی توبہ بہت قبول کرتا ہے اور ان پر رحم کرنے والا ہے۔

خداوند عالم اس آیت میں وضاحت کے ساتھ مسئلہ توبہ اور اس کی کچھ شرطیں بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ، توبہ تو صرف ان کے لیے ہے جو جہالت کی وجہ سے گناہ کرتے ہیں۔

آیئے اب دیکھیں کہ جہالت کیا چیز ہے کیا یہ جہل و نادانی اور گناہ سے بے خبری ہے یا اس کے منحوس اثرات اور دردناک نتائج سے ناواقفیت کا نام ہے۔ لفظ جہل اور اس کے مشتقات اگرچہ مختلف معانی کے لیے آئے ہیں لیکن قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت میں خواہشاتِ نفسانی کا تلاطم، سرکش ہوا و ہوس کا غلبہ اور عقل و ایمان کی قوتوں پر ان کا تسلط مراد ہے۔ اگرچہ اس حالت میں گناہ کی وجہ سے علم رخصت نہیں ہو جاتا لیکن وہ اغراض نفسانی سے دب کر عملی طور پر بے اثر ہو جاتا ہے اور جب علم اپنا اثر کھو بیٹھے تو وہ درحقیقت عملاً جہل و نادانی کے برابر ہے۔ اگر گناہ اس قسم کی جہالت کی وجہ سے نہ ہو بلکہ حکم پروردگار کے انکار اور دشمنی کی بنا پر ہو تو اس قسم کا گناہ کفر ہے۔ اسی وجہ سے اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی مگر یہ کہ وہ اس روش کو چھوڑ دے اور عناد و انکار سے باز آجائے۔

دراصل یہ آیت اسی حقیقت کو بیان کر رہی ہے جسے حضرت امام زین العابدینؑ نے دعائے ابوحمزہ میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، آپ بارگاہِ خداوندی میں عرض کرتے ہیں؛

الٰهی لم اعصک حین عصیتک وانا بربوبیتک جاحد ولا بامرک مستخف ولا لعقوبتک متعرض ولا لوعیدک متهاون لکن خطیئة عرضت وسولت لی نفسی وغلبنی هوای ......

اے خدا جب میں نے تیری نافرمانی کی اس وقت گناہ کی طرف میری توجہ تیری خدائی سے انکار کی بنا پر نہ تھی اور نہ ہی تیرے حکم کو معمولی سمجھنے کے سبب سے تھی اور نہ ہی تیری سزا کو خفیف سمجھتے ہوئے ... [illegible]

[illegible]

ہوئے تھی بلکہ ایک غلطی اور خطا تھی، جو مجھ سے ہو گئی۔ نفسِ امارہ نے مجھ پر حق کو مشکوک کر دیا اور مجھ پر ہوا و ہوس نے غلبہ کر لیا۔

اس جملے میں توبہ کی ایک اور شرط کی طرف اشارہ ہے، فرماتا ہے:

ثم یتوبون من قریب

یعنی — وہ جلدی سے توبہ کر لیں۔

اس بارے میں کہ "قریب" سے کیا مراد ہے مفسرین میں اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض اس سے مراد آثارِ موت ظاہر ہونے سے پہلے لیتے ہیں اور بعد والی آیت جو یہ بتلاتی ہے کہ موت کی علامتیں ظاہر ہونے کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی، اس پر بطور گواہ پیش کرتے ہیں۔ اس بنا پر لفظ قریب شاید اس وجہ سے ہے کہ اصولی طور پر دنیا کی زندگی چاہے کتنی ہی کیوں نہ ہو مختصر ہے اور اس کا خاتمہ نزدیک ہے۔

لیکن بعض نے گناہ کے قریب کا وقت مراد لیا ہے۔ یعنی اپنے گناہ سے جلد از جلد پشیمان ہو اور خدا کی طرف لوٹ آئے کیونکہ مکمل توبہ وہ ہے جو گناہ کے آثار و نشانات کو روح و جسم سے بالکل دھوڈالے۔ یہاں تک کہ گناہ کا کوئی اثر دل میں باقی نہ رہے اور یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ انسان جلد از جلد اس سے پہلے کہ گناہ اس کے جسم میں جڑ پکڑے اور اس کی طبیعت ثانیہ بنے، اس سے پچھتائے۔ ورنہ بصورت دیگر زیادہ تر گناہوں کے اثرات انسان کے قلب و جان کے گوشوں میں باقی رہ جاتے ہیں۔ پس مکمل توبہ وہ ہے جو گناہ کے فوراً بعد کی جائے۔ قریب کا لفظ لغت اور عرفِ عام کی رو سے ان ہی معنی سے مناسبت رکھتا ہے۔

یہ درست ہے کہ ایک عرصہ گزرنے کے بعد بھی توبہ قبول ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ پوری توبہ نہیں ہے اور شاید علی اللہ (یعنی — وہ توبہ جس کا قبول کرنا اللہ پر لازم ہے) بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کیونکہ یہ تعبیر قرآن کی صرف اسی آیت میں آئی ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس قسم کی توبہ قبول کرنا بندوں کے حقوق میں سے ہے جبکہ عرصہ دراز کی توبہ قبول کرنا تفضلِ الٰہی ہے نہ کہ حق۔

فاولئک یتوب اللہ علیہم وکان اللہ علیما حکیما

خداوند عالم توبہ کی شرطوں کا ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے کہ خدا ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور وہ دانا و حکیم ہے۔

ولیست التوبۃ للذین یعملون السیٔات

اس آیت میں ان افراد کی طرف اشارہ ہے جن کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ فرماتا ہے، وہ لوگ جو موت کی چوکھٹ پر پہنچ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہم گناہ سے توبہ کرتے ہیں، ان کی توبہ قبول نہیں ہو گی۔ اس کی وجہ بھی واضح ہے کہ جان کنی کے عالم میں جبکہ موت بالکل سامنے دکھائی دے رہی ہو، انسانی آنکھ سے پردے اٹھ جاتے ہیں اور اس میں ایک خاص بینائی پیدا ہو جاتی ہے اور کچھ حقائق جن کا تعلق دوسری دنیا کے ساتھ ہے اور اپنے اعمال جو اس زندگی میں کیے تھے، اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے کیونکہ اب مسائل حسی پہلو اختیار کر لیتے ہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہر گناہگار اپنے برے کاموں پر پچھتاتا ہے اور اس شخص کی طرح ہوتا ہے جو اپنے قریب آگ کا شعلہ دیکھ کر اس سے بھاگنا چاہتا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ شرعی ذمہ داری اور آزمائشِ پروردگار کی بنیاد اس طرح

کے مشاہدات پر نہیں ہے بلکہ اس کا دار و مدار غیب کے ایمان اور عقل و خرد کی آنکھ کے مشاہدہ پر ہے۔

اسی بنا پر کلام مجید میں ہے کہ جس وقت دنیا کے عذاب کی پہلی نشانی گزرے ہوئے زمانے کی بعض قوموں پر ظاہر ہو جاتی تھی تو ان پر توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ہم فرعون کی سرگذشت میں پڑھتے ہیں:

حتی اذا ادرکہ الغرق قال امنت انہ لا الہ الا الذی اٰمنت بہ بنوا اسرائیل وانا من المسلمین الان وقد عصیت قبل وکنت من المفسدین۔ (یونس ۹۰، ۹۱)

یہاں تک کہ جب وہ ڈوبنے لگا تو اس نے پکار کر کہا: اب میں ایمان لاتا ہوں کہ بنی اسرائیل کے معبود کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور میں سر تسلیم خم کرتا ہوں لیکن اس سے کہہ دیا گیا کہ تو اب یہ بات کہتا ہے جبکہ اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا ہے اور تو فساد کرنے والوں میں سے تھا۔ اس وجہ سے تیری توبہ قبول نہیں ہوگی۔

بعض قرآنی آیتوں (مثلاً سورہ سجدہ کی آیت ۱۲) سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گنہگار قیامت میں عذاب الٰہی کو دیکھتے ہیں اور اپنے کیے پر پچھتاتے ہیں۔ لیکن ان کی پشیمانی انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی۔ ایسے لوگ بالکل ان مجرموں کی طرح ہیں جن کی نگاہ جب سولی کی لکڑی پر پڑتی ہے اور اس کا پھندا اپنی گردن میں محسوس کرتے ہیں تو اپنے کیے پر پچھتاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ پچھتاوا نہ باعث فضیلت ہے نہ سبب عزت و افتخار اور نہ ہی ترقیٔ درجات کا ذریعہ۔ اسی لیے یہ توبہ بے اثر ہے۔

یقیناً یہ آیت ان روایات کے خلاف نہیں ہے جو یہ کہتی ہیں کہ توبہ آخری سانس تک قبول ہو سکتی ہے کیونکہ روایات میں آخری سانس سے مراد وہ لمحے ہیں جن میں ابھی موت کی نشانیاں نہ دیکھی ہوں اور اصطلاح کے مطابق ابھی برزخی نگاہ پیدا نہ ہوئی ہو۔

دوسرا گروہ ان افراد کا ہے جن کی توبہ قبول نہ ہوگی۔ یہ وہ ہیں جو کفر کی حالت میں مر جائیں خداوند عالم آیت بالا میں ان کے بارے میں فرماتا ہے:

ولا الذین یموتون وھم کفار یعنی "جو حالت کفر میں مر جاتے ہیں ان کے لیے توبہ کا دروازہ بند ہے" یہ حقیقت قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی واضح کی گئی ہے۔[1]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے لوگ جو کفر کی حالت میں دنیا سے چلے جاتے ہیں وہ کس وقت توبہ کریں گے کہ ان کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کی توبہ عالم آخرت میں قبول نہیں ہوگی اور بعض مفسرین کہتے ہیں کہ توبہ سے مراد بندوں کی توبہ نہیں بلکہ خدا کی طرف سے توبہ ہے۔ یعنی خدا ان کے لیے عفو و رحمت کی طرف نہیں آئے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ آیت کی نظر ایک اور مقصد پر ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ وہ افراد جنہوں نے صحت و سلامتی اور ایمان کی حالت میں اپنے گناہوں سے توبہ کی ہے لیکن موت کے وقت دنیا سے بحالت ایمان نہیں گئے۔ ان کی گذشتہ توبہ بے معنی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کے نیک اعمال کی ایک شرط قبولیت "موافات برایمان" یعنی ایمان کے ساتھ دنیا سے جانا ہے۔ اس لیے جو لوگ زندگی

---

[1] آل عمران ۹۱، بقرہ ۱۶۱، بقرہ ۲۱۷ اور محمد ۳۴۔

کے آخری لمحات میں کافر ہوں ان کے پہلے اعمال (یہاں تک کہ وہ نیک عمل جو ایمان کی حالت میں کیے تھے) قرآنی آیتوں کی توضیح کے مطابق رائیگاں ہو جائیں گے۔ اگرچہ انہوں نے ایمان کی حالت میں گناہوں سے توبہ کرلی ہو لیکن اس صورت میں وہ بھی بیکار ہو جائے گی۔ گویا توبہ کے قبول ہونے کی دو شرطیں ہیں۔

۱۔ موت کی نشانیاں ظاہر ہونے سے پہلے ہو۔

۲۔ انسان ایمان کے ساتھ دنیا سے اٹھے۔

اس آیت سے ضمنی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ توبہ میں دیر نہ کرے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اچانک موت آجائے اور اس کے لیے توبہ کے دروازے بند ہو جائیں۔ یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ زیر بحث آیت میں توبہ کی تاخیر جس کو "تسویف" کہتے ہیں لہٰذا حالتِ کفر کی موت" کو ہم پلہ قرار دیا گیا ہے اور یہ اس اہمیت کی علامت ہے جو اس موضوع کو قرآن دے رہا ہے۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے: اولئک اعتدنا لھم عذابا الیما یعنی۔ ہم نے ان دونوں گروہوں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

یاد دہانی کی ضرورت نہیں کہ توبہ کے لیے مذکورہ بالا شرطوں کے علاوہ اور بھی شرطیں ہیں جن کی طرف متعلقہ آیتوں میں اشارہ ہوگا۔

۱۹۔ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا ۖ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ○

ترجمہ

۱۹ اے ایمان والو! تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ عورتوں سے سختی سے (اور انہیں تکلیف پہنچا کر) میراث لو اور جو کچھ (بطور حق مہر) انہیں دیا ہے اُسے اپنی ملک بنانے کے لیے اُن پر سختی نہ کرو۔ مگر یہ کہ وہ کھلے بندوں برائی کریں اور ان سے اچھا سلوک کرو۔ اگرچہ تم ان سے (کئی وجوہات کی وجہ سے) نفرت و حقارت کرتے ہو (تو فوراً علیحدگی کا پختہ ارادہ نہ کرو) کیونکہ اکثر اوقات تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور خدا اس میں بہت زیادہ نیکی قرار دیتا ہے۔

---

۵ بقرہ ۲۱۷۔

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ آیت ایسے افراد کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اپنی بیویوں کو اپنے پاس تو رکھتے تھے مگر ان سے بیویوں کا سا سلوک نہیں کرتے تھے اور اس انتظار میں رہتے تھے کہ کب یہ مریں اور وہ ان کے مال پر قبضہ کریں۔

جیسا کہ ابن عباس کہتے ہیں:

یہ آیت ایسے افراد کے بارے میں نازل ہوئی جن کی بیویوں کا حق مہر بہت زیادہ تھا اس کے باوجود کہ وہ ان سے ازدواجی تعلقات رکھنا نہیں چاہتے تھے لیکن ان کا حق مہر زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کو طلاق بھی نہ دے سکتے تھے۔ اس لیے وہ ان پر سختی کرتے تھے تاکہ وہ حق مہر بخش کر طلاق لے لیں۔

مفسرین کے ایک گروہ نے اس آیت کی ایک اور شان نزول بھی نقل کی ہے جو اس آیت کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی بلکہ آیت ۲۲ کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ جسے انشاء اللہ ہم اسی آیت کی ذیل میں بیان کریں گے۔

تفسیر

حقوق نسواں کا دوبارہ دفاع

یا ایھا الذین اٰمنوا لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھا

ہم اس سورت کے شروع میں لکھ چکے ہیں کہ اس سورت کی آیتیں زمانہ جاہلیت کے بہت سے برے کاموں کے خلاف برسرپیکار ہیں چنانچہ زیر بحث آیت میں اس زمانہ کی چند بری عادتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ ان سے دور رہیں:

۱۔ عورتوں کو ان کے مال کی لالچ میں قیدی نہ بناؤ۔ جیسا کہ شانِ نزول میں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں مردوں کی ایک ظالمانہ روش یہ تھی کہ وہ ان دولت مند عورتوں سے جو بدصورت ہوتی تھیں شادی کر لیتے۔ پھر انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیتے تھے نہ انہیں طلاق دیتے اور نہ ہی ان سے بیوی کا سا برتاؤ کرتے، اس امید پر کہ انہیں موت آجائے تو ان کے مال پر قبضہ کریں۔ آیۂ مذکورہ بالا (۱۹) اعلان کرتی ہے کہ اے ایمان والو! تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ عورتوں کی میراث انہیں تکلیف پہنچا کر زبردستی لے لو۔ اس طرح سے قرآن نے مذکورہ کام کے خلاف فیصلہ دیا ہے۔

۲۔ عورتوں سے مہر کا حق بخشوانے کے لیے سختیاں نہ کرو۔ ان کی ایک بری عادت یہ تھی کہ وہ عورتوں کو طرح طرح سے ستاتے تھے تاکہ وہ حق مہر بخش دیں اور طلاق لے لیں۔ خاص طور پر یہ معاملہ ایسے موقع پر ہوتا تھا جبکہ کسی عورت کا

حق مہر زیادہ ہو۔ اس آیت نے اس کام سے منع فرمایا ہے ولا تعضلوھن لتذھبوا ببعض ما اتیتموھن۔ یعنی ان پر اس لیے سختی نہ کرو کہ اس طریقے سے جو حصّہ تم نے انہیں دیا ہے اسے اپنی ملک بنا سکو لیکن اس کا ایک استثنائی حکم بھی ہے جس کی طرف الا ان یأتین بفاحشۃ مبینۃ کے ذریعے اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اگر وہ بُرے اور شرمناک کام کریں تو پھر شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ ان پر سختی کریں تاکہ وہ اپنا حق مہر تمہارے لیے حلال کر کے طلاق لے لیں۔ درحقیقت یہ ایک قسم کی سزا ہے جو بُری عورتوں سے ان کے کرتوت کے بدلے تاوان لینے کی طرح ہے۔ کیا آیت مذکورہ میں " فاحشۃ مبینۃ " (واضح برائی) سے مراد وہ بُرے کام ہیں جو عفت و پاکدامنی کے منافی ہیں یا دوسری قسم کے سخت ناگوار اعمال ہیں۔ مفسرین کے درمیان اس سلسلے میں ایک طولانی بحث ہے لیکن اس حدیث میں جو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے اس کی تشریح ہو چکی ہے کہ یہ عورت کی ہر طرح کی سخت مخالفت، نافرمانی اور بُرے سلوک پر مشتمل ہے۔[1] البتہ یہاں پر ہر چھوٹی بڑی مخالفت مراد نہیں ہے کیونکہ لفظ فاحشہ میں اہمیت اور اس کا خلاف معمول ہونا مخفی ہے۔ لفظ "مبینۃ" بھی اس کی تاکید کرتا ہے۔

۴۔ ان کے ساتھ شائستہ اور مناسب طریقے کے ساتھ زندگی بسر کرو " وعاشروھن بالمعروف " فرما کر عورتوں کے بارے میں شائستہ معاشرت اور مناسب انسانی سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے بعد مزید کہا گیا ہے:

فان کرھتموھن فعسی ان تکرھوا شیئا و یجعل اللہ فیہ خیرا کثیرا

یعنی۔ یہاں تک کہ اگر تم بعض وجوہات کی بنا پر اپنی بیویوں سے مکمل طور پر خوش نہیں ہو اور انہیں پسند نہیں کرتے ہو اور وہ تمہاری نظر میں کئی باتوں میں اچھی نہیں ہیں تو فوراً ان سے علیٰحدگی کا پختہ ارادہ یا ان سے بُرا سلوک نہ کرو۔ بلکہ جہاں تک ہو سکے ان سے اچھا سلوک کرو۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تمہاری رائے کا دار و مدار شک و شبہ پر ہو اور جسے تم پسند نہیں کرتے خدا نے اسی میں بہت زیادہ خیر و برکت اور نفع رکھا ہو۔ اس بنا پر جب تک پانی سر سے اونچا نہ ہو جائے یہی مناسب ہے کہ حسنِ معاشرت اور خوش گفتاری کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے بلا وجہ اور بلا دلیل خواہ مخواہ کے بغض و حسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان حالات میں ان کے فیصلے ٹھیک نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ اچھائیاں ان کی نظر میں برائیاں اور برائیاں ان کی نگاہ میں اچھائیاں بن جاتی ہیں لیکن وقت گزرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے سے آہستہ آہستہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس لیے ضمناً اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس آیت میں خیرا کثیرا کی تعبیر سے ان میاں بیوی کو جو ایک دوسرے کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں ایک خوشخبری دی گئی ہے جو وسیع مفہوم رکھتی ہے جس کے کئی ایک مصداق ہیں جن میں سے ایک واضح مصداق نیک، صالح، لائق اور عزت دار اولاد بھی ہے۔

۲۰۔ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔـا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ○

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۱ صفحہ ۲۵۰۔

۲۱۔ وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ وَّأَخَذْنَ مِنكُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا ○

ترجمہ

۲۰۔ اگر تمہارا یہ ارادہ ہو کہ اپنی بیوی کی جگہ دوسری بیوی کا انتخاب کرو اور تم اُسے (حق مہر کے طور پر) بہت زیادہ مال دے چکے ہو تو اس میں سے کوئی چیز بھی واپس نہ لو۔ کیا تم عورتوں سے مہر واپس لینے کے لیے تہمت اور کھلے گناہ کا سہارا لیتے ہو۔

۲۱۔ اور تم کس طرح اُسے واپس لے سکتے ہو جبکہ ایک دوسرے کے ساتھ تعلق اور پورا پورا میل ملاپ رکھتے ہو۔ (چھوڑنے کے باوجود) وہ تم سے (شادی کے وقت) مضبوط وعدے لے چکی ہیں۔

شانِ نزول

اسلام سے پہلے یہ رسم تھی کہ اگر مرد چاہتے کہ پہلی بیوی کو طلاق دیں اور نئی شادی کریں تو حق مہر سے بچنے کے لیے اپنی بیوی پر عفت کے منافی تہمت لگاتے اور اس پر سختی کرتے تھے تاکہ وہ اس بات پر تیار ہو جائے کہ اپنا حق مہر جو عام طور پر پہلے ہی وصول ہو جاتا تھا واپس کردے اور طلاق لے لے۔ پھر یہی دوسری بیوی کا حق مہر مقرر کر دیتے تھے۔ مندرجہ بالا آیت اس بُرے فعل سے بچنے کا حکم دیتے ہوئے اسے قابلِ مذمت قرار دیتی ہے [۱]

تفسیر

یہ آیت بھی عورتوں کے بعض حقوق کی حمایت میں نازل ہوئی ہے اور عام مسلمانوں کو حکم دیتی ہے کہ جب وہ پہلی بیوی سے علیحدگی اور نئی بیوی لانے کا ارادہ کریں تو انہیں یہ حق نہیں ہے کہ پہلی بیوی کے حق مہر میں کمی کریں یا اگر اُسے ادا کر چکے ہیں تو اس سے واپس لے لیں۔ قنطار کا معنی ہے بہت زیادہ مال و دولت، چنانچہ راغب مفردات میں لکھتا ہے کہ قنطار کی اصل قنطرہ ہے جس کا معنی "پل" ہے اور چونکہ زیادہ مال بھی پل کی مانند ہے جس سے انسان زندگی بھر فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی بنا پر اُسے قنطار کہا گیا ہے [۲] یہاں گفتگو کی بنیاد یہ ہے کہ طلاق شوہر کے فائدے کے لیے دی جا رہی ہے نہ کہ عورت کے منافیِ عفت کاموں

---

[۱] تفسیر مجمع البیان، آیہ زیر بحث۔

[۲] مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۲ میں سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۴ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیے (اردو ترجمہ صفحہ ۲۶۷)۔

کی وجہ سے، اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورتوں کا تسلیم شدہ حق پامال کیا جائے۔

اتأخذونہ بھتانا و اثما مبینا

اس کے بعد زمانۂ جاہلیت کے اس طرزِ عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ وہ لوگ اپنی بیویوں پر بدکاری کی تہمت لگاتے تھے مزید فرماتا ہے کیا تم عورتوں کا حق مہر واپس لینے سے تہمت اور واضح گناہ کا ارتکاب کرنا چاہتے ہو۔ یعنی ایک تو یہ ظلم ہے اور ایک بزدلانہ اور غلط کام ہے اور دوسرے کھلم کھلا گناہ ہے۔

وکیف تأخذونہ وقد افضٰی بعضکم الی بعض

اس آیت میں مردوں کے جذبۂ محبت کو متحرک کرنے کے لیے نئے سرے سے استفہام انکاری سے کام لیتے ہوئے مزید ارشاد فرمایا گیا ہے، تم اور تمہاری بیویاں مدتوں خلوت میں ایک دوسرے کے ساتھ رہے اور ایک روح دو قالب کی طرح آپس میں بھرپور میل ملاپ رکھتے رہے۔ پھر کس طرح اس نزدیکی کے باوجود بیگانوں اور دشمنوں کی طرح ایک دوسرے سے برتاؤ کرتے ہو اور ان کے مانے ہوئے حقوق کو پامال کررہے ہو۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے آجکل کی فارسی زبان میں اگر دو جگری دوست ایک دوسرے سے لڑیں جھگڑیں تو انہیں کہا جاتا ہے کہ تم نے مدتوں ایک دوسرے کے ساتھ نان و نمک کھایا ہے اب کیوں جھگڑتے ہو۔ دراصل ایسے موقع پر شریک حیات پر ظلم اپنے آپ پر ظلم کے مترادف ہے۔ اس کے بعد فرماتا ہے، اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ تمہاری بیویوں نے شادی کے وقت تم سے پختہ عہد و پیمان لیا ہوا ہے، تم اب کس طرح اس مقدس اور مضبوط عہد کو ٹھکرا سکتے ہو اور واضح عہد شکنی کی طرف قدم بڑھا سکتے ہو۔

واخذن منکم میثاقا غلیظا۔

ضمناً غور کرنا چاہیے کہ یہ آیت اگرچہ پہلی بیوی کو طلاق دینے اور نئی سے شادی کرنے کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے لیکن پھر بھی صرف اسی صورت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی علیحدگی اور طلاق مرد کے ارادے سے ہو اور عورت جدائی نہ چاہے وہاں تمام مہر ادا کیا جائے اور اگر پہلے دیا جا چکا ہے تو اس میں سے کوئی چیز واپس نہ لی جائے چاہے دوسری شادی کا ارادہ ہو یا نہ ہو۔ اس بنا پر ''ان اردتم استبدال زوج'' اگر تم دوسری بیوی انتخاب کرنا چاہتے ہو۔
—— یہ جملہ حقیقت میں زمانۂ جاہلیت کی کیفیت کے بارے میں ہے۔ تاہم اس سے اصل حکم متاثر نہیں ہوتا۔ یہاں اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ''استبدال'' کا معنی ہے ''تبدیلی چاہنا''۔ اسی لیے اس میں طلب اور ارادہ پایا جاتا ہے۔ اب اگر ہم دیکھتے ہیں ''اردتم'' (تم چاہو) اس کے ساتھ متصل ہے، تو یہ اس بنا پر ہے کہ آیت چاہتی ہے کہ یہ نکتہ گوش گذار کرے کہ نئی بیوی سے شادی کرنے کے لیے ناجائز اور بزدلانہ جھگڑے اور مقدمے شروع نہ کرو۔

۲۲۔ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ

لہ افضاء اصل میں مادۂ فضا سے ہے۔ جس کا معنی ہے وسعت و کشادگی۔ جب ایک شخص دوسرے سے مکمل میل جول قائم کر لیتا ہے تو دراصل وہ اپنے محدود جسم کو ایک وسیع تر جسم اور وجود میں تبدیل کر لیتا ہے اس لیے افضا کا معنی ہے ربط و ضبط (میل جول) پیدا کرنا۔

كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝

ترجمہ

۲۲ اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں۔ مگر وہ جو ہو چکا ہے (اس حکم کے نازل ہونے سے پہلے) کیونکہ یہ کام بُرا، باعثِ نفرت اور غلط ہے۔

شانِ نزول

زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی شخص فوت ہو جاتا اور اپنے پیچھے بیوی بچے چھوڑ جاتا تو اگر وہ بیوی اس کے بیٹوں کی سگی ماں نہ ہوتی تو وہ بیٹے اُسے مال کی طرح اپنی میراث بنا لیتے اور اس طرح وہ یہ حق سمجھتے کہ اپنی سوتیلی ماں سے خود شادی کر لیں یا اس کی کسی اور سے شادی کر دیں۔ ظہورِ اسلام کے بعد ایک مسلمان کے بارے میں ایک حادثہ پیش آیا، وہ یہ کہ ابو قیس نامی ایک انصاری فوت ہو گیا اس کے بیٹے نے اپنی سوتیلی ماں سے شادی کرنا چاہی تو اس عورت نے کہا میں تجھے اپنا بیٹا سمجھتی ہوں لہٰذا یہ کام مناسب نہیں سمجھتی اس کے باوجود حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی شرعی ذمہ داری معلوم کرتی ہوں۔ اس کے بعد اس عورت نے یہ بات حضورؐ کی خدمت میں عرض کی۔ اس پر آیتِ مذکورہ بالا نازل ہوئی اور اس کام سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا۔

تفسیر

جیسا کہ ہم شانِ نزول میں اشارہ کر چکے ہیں کہ اس آیت نے زمانۂ جاہلیت کے ایک نہایت مکروہ اور ناپسندیدہ فعل پر خطِ بطلان کھینچ دیا اور فرمایا: ولا تنکحوا ما نکح اٰباؤکم من النساء یعنی ان عورتوں کے ساتھ کہ جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں نکاح نہ کرو۔ لیکن کیونکہ عام طور پر کوئی قانون گذشتہ امور پر حاوی نہیں ہوتا۔ اس لیے مزید فرمایا: الا ما قد سلف یعنی۔ مگر وہ شادیاں جو اس سے پہلے ہو چکی ہیں۔

اس کے بعد تین سخت برائیاں اس قسم کی شادی کے بارے میں بیان فرمائیں۔ پہلی یہ کہ ارشاد ہوتا ہے: یہ بہت بُرا کام ہے (انہ کان فاحشۃ) اس کے بعد مزید فرماتا ہے: یہ عمل ایسا ہے جو لوگوں کی نظروں میں نفرت کا سبب ہے۔ یعنی انسان کی فطرت اسے پسند نہیں کرتی (و مقتا) اور آخر میں فرماتا ہے: یہ غلط طریقہ ہے (وساء سبیلا) یہاں تک کہ تاریخ میں ہے کہ زمانہ جاہلیت کے لوگ بھی اس قسم کی شادی کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے اور جو بچے اس سے پیدا ہوتے تھے انہیں "مقیت" (قابلِ نفرت اولاد) کے نام سے پکارتے تھے۔

واضح ہے کہ یہ حکم کئی ایک مصلحتوں کے پیشِ نظر اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے مقرر ہوا کیونکہ سوتیلی ماں سے نکاح ایک طرف تو سگی ماں سے نکاح کی طرح ہے کیونکہ سوتیلی ماں کے احکام بھی سگی ماں کے سے ہیں۔ دوسری طرف باپ کے حریم میں تصرف اس

کے احترام کی ہتک ہے۔ ان سب سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ عمل اس شخص کی اولاد میں نفاق کا بیج بوتا ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ سوتیلی ماں سے نکاح کرنے کے معاملے میں اولاد کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے، بلکہ باپ اور بیٹے کے درمیان بھی رقابت پیدا ہوسکتی ہے کیونکہ عام طور پر پہلے اور دوسرے شوہر میں رقابت اور دشمنی ہوتی ہے۔

اگر یہ کام (سوتیلی ماں سے شادی) باپ کی زندگی میں (باپ کے طلاق دینے کے بعد) انجام پائے پھر تو حسد اور دشمنی کی واضح دلیل ہے۔ اگر اس کے مرنے کے بعد ہو پھر بھی ہوسکتا ہے کہ بیٹے کو مرے ہوئے باپ سے دل میں ایک قسم کا حسد پیدا ہو۔ تین قسم کی تعبیریں جو اس کام کی برائی اور مذمت میں زیر نظر آیت میں آئی ہیں بعید نہیں کہ ان کا اشارہ انہی تین فلسفوں کی طرف ہو۔

۲۳۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي فِي حُجُورِكُمْ مِنْ نِسَائِكُمُ اللَّاتِي دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَمْ تَكُونُوا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿۲۳﴾

ترجمہ

۲۳۔ تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری خالائیں، تمہاری بھتیجیاں تمہاری بھانجیاں اور وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے، تمہاری رضاعی بہنیں، تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری بیویوں کی وہ بیٹیاں جنہوں نے تمہاری گود میں پرورش پائی ہو اور جو ان بیویوں سے ہیں جن کے ساتھ تمہاری جنسی آمیزش رہی ہے اور اگر ان سے جنسی آمیزش نہیں رہی تو ان کی بیٹیاں تمہارے لیے ممنوع نہیں ہیں (اسی طرح تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری نسل سے ہیں (نہ کہ منہ بولے بیٹے) نیز (تم پر حرام ہے) یہ کہ دو بہنوں کو جمع کرو مگر وہ جو گذشتہ زمانے میں ہو چکا ہے خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

محارم سے نکاح کی حرمت

اس آیت میں محارم (وہ عورتیں جن سے رشتۂ زوجیت منع ہے) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ممکن ہے کہ اس آیت کی بنیاد پر تین طریقوں سے محرمیت پیدا ہو۔

۱ ۔ ولادت ، جسے نسبی تعلق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۲ ۔ طریق ازدواج سے ، جسے سببی ارتباط کہتے ہیں۔

۳ ۔ رضاعت (دودھ پلانے) سے، جسے ارتباط رضاعی بولتے ہیں۔

سب سے پہلے نسبی محارم کی طرف جو سات طرح کے ہیں، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

حرمت علیکم امھاتکم وبناتکم واخواتکم وعماتکم وخالاتکم وبنات الاخ وبنات الاخت۔

تمہاری مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں اور بھانجیاں تم پر حرام کردی گئی ہیں۔

یاد رکھیے کہ ماں سے مراد وہ عورت نہیں ہے جس سے انسان بلاواسطہ پیدا ہوا ہو بلکہ دادی پڑدادی اور باپ کی ماں اور اسی قسم کی دوسری عورتیں مراد ہیں۔ جس طرح بیٹی سے مراد صرف بلاواسطہ بیٹی نہیں ہے بلکہ بیٹی، پوتی، نواسی اور ان کی اولاد بھی ہے اسی طرح دوسرے پانچ مواقع پر بھی ایسا ہی ہے۔ یہ امر واضح ہے کہ تمام لوگ فطری طور پر اس قسم کی شادیوں سے نفرت کرتے ہیں اسی وجہ سے سب قومیں (چند افراد کو چھوڑ کر) محارم سے نکاح حرام سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ مجوسی جو اپنے منابع اور کتب کی بنا پر اس قسم کی شادیوں کو جائز سمجھتے تھے آج اس کا انکار کرتے ہیں۔ اگرچہ بعض لوگ اس بات کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اس امر کو ایک پرانی عادت اور رسم قرار دیں۔ لیکن یہ مسلم امر ہے کہ ایک قانون کی عمومیت تمام لوگوں، زمانوں، سالوں اور شہروں میں عملی طور پر اس کے فطری ہونے کی ترجمانی کرتی ہے۔ کیونکہ ایک عام رسم و عادت میں دائمی اور عالمگیر بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس سے قطع نظر بھی آج یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہم خون افراد کی ایک دوسرے سے شادیاں بے شمار خطرات کی حامل ہوتی ہیں یعنی چھپی ہوئی وراثتی بیماریاں شدت اختیار کر لیتی ہے اور آشکار ہو جاتی ہیں (اس سے یہ مراد نہیں کہ اس طرح بیماری پیدا ہوتی ہے)۔ یہاں تک کہ بعض لوگ تو محارم سے گزر کر قوم و قبیلہ میں بھی جو نسبتاً نزدیکی ہیں مثلاً چچازاد کا ایک دوسرے سے شادی کرنا بھی اچھا نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ بھی وراثتی بیماریوں کے خطرات میں شدت پیدا کرتا ہے لیکن یہ مسئلہ اگر دور کے رشتہ داروں میں کوئی مشکل پیدا نہ بھی کرے (جیسا کہ عام طور پر نہیں کرتا)، تب بھی نزدیک کے رشتہ داروں میں جو کہ زیادہ ہم خون ہیں یقیناً خرابی اور بیماری میں شدت پیدا کر دیتا ہے۔

---

[1] البتہ اسلام میں چچازاد کا ایک دوسرے سے شادی کرنا اور اس قسم کے دوسرے رشتہ دار حرام نہیں ہوئے کیونکہ یہ محارم کی طرح نہیں ہیں اور اس قسم کے رشتوں میں کسی حادثہ کا احتمال بہت کم ہے۔ ہم خود بہت سے مواقع کے عینی شاہد ہیں کہ اس قسم کی شادیاں ہوئیں اور ان کے نتیجہ میں جو بچے پیدا ہوئے وہ صحت مند اور ذہنی طور پر لائق ہیں۔

علاوہ ازیں عام طور پر محارم میں جنسی جذب وکشش کا سرے سے کوئی وجود نہیں ہوتا کیونکہ وہ زیادہ تر ایک دوسرے کے ساتھ رہتے بڑھتے، پھلتے پھولتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے لیے ایک عام اور دائمی وجود ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ استثنائی اور غیر معمولی قوانین کی عمومی اور کلی حالت کے لیے میزان نہیں بن سکتے۔

نیز ہمیں معلوم ہے کہ جنسی کشش ہی ازدواجی زندگی کے رشتے کے استحکام کے لیے شرط اوّل ہے۔ اس بنا پر اگر محارم کے درمیان ازدواج ہو تو وہ ناپائیدار اور گرم جوشی سے عاری ثابت ہوگا۔

اس کے بعد رضائی محارم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: وامھٰتکم الّٰتی ارضعنکم واخوٰتکم من الرضاعۃ۔

یعنی — اور تمہاری وہ مائیں جو تمہیں دودھ پلاتی ہیں اور تمہاری رضاعی بہنیں تم پر حرام ہیں۔

اگرچہ قرآن نے آیت کے اس حصے میں صرف دو گروہوں یعنی رضاعی بہنوں اور ماؤں کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن بے شمار موجود روایات کی بنا پر رضاعی محارم انہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ مشہور حدیث کے مطابق جو حضرت پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے: یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب — یعنی تمام افراد جو نسبی رشتہ کے لحاظ سے حرام ہیں وہ رضاعت (دودھ پلائی) کی رو سے بھی حرام ہیں۔ البتہ دودھ پلانے کی مقدار جو محرمیت پر اثر ڈالتی ہے، یہ اور اس طرح کی دیگر شرائط کی تفصیل فقہی کتب میں موجود ہے۔

محارم رضاعی کی حرمت کا فلسفہ

اس کا فلسفہ یہ ہے کہ کسی خاص فرد کے دودھ سے کسی کے گوشت اور ہڈیوں کی پرورش اس کی اولاد سے اس کی شباہت پیدا کر دیتی ہے۔ مثلاً جو عورت کسی بچے کو ایک مقدار تک دودھ پلاتی ہے تو اس کا جسم اس کے دودھ سے ایک خاص نشو ونما پاتا ہے۔ اس سے ایک خاص قسم کی شباہت اس بچے اور عورت کے اپنے بچوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ حقیقت میں ان میں سے ہر ایک اس ماں کے بدن کا ایک جزو شمار ہوتا ہے اور وہ دو نسبی بھائیوں کے مانند ہوتے ہیں۔

آخر میں محارم کے تیسرے گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں چند عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

۱۔ وامھٰت نسائکم — اور تمہاری بیویوں کی مائیں۔ یعنی صرف اتنی سی بات کہ ایک عورت کسی شخص کے نکاح میں آجائے اور صیغہ نکاح جاری ہو جائے تو اس عورت کی ماں اور اس کی ماں کی ماں اور اس طرح کے سب رشتے اس پر حرام ابدی ہو جائیں گے۔

۲۔ وربآئبکم الّٰتی فی حجورکم من نسآئکم الّٰتی دخلتم بھن — اور تمہاری بیویوں کی وہ بیٹیاں جو تمہاری گود میں ہیں بشرطیکہ اس بیوی کے ساتھ ہم بستری کر چکے ہو یعنی ایک عورت سے صرف عقد شرعی کرنے سے اس کی وہ لڑکیاں جو دوسرے شوہر سے ہیں اس شخص پر حرام نہیں ہوتیں بلکہ ان کی حرمت کے لیے یہ شرط ہے کہ عقد شرعی کے علاوہ اس عورت سے مباشرت بھی کرے۔ اس مقام پر یہ قید بتاتی اور تائید کرتی ہے کہ بیوی کی ماں کا حکم جو کہ ابھی ابھی لکھا گیا ہے وہ اس قسم کی شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے اور اصطلاح کے مطابق حکم کے اطلاق کو تقویت دیتا ہے اگرچہ فی حجورکم (جو تمہاری گود میں ہیں) کی قید کا ظاہر یہ ہے کہ اگر بیوی کی دوسرے شوہر سے بیٹی انسان کی گود میں پرورش نہ پائے تو وہ اس پر حرام نہیں ہے لیکن روایات کے قرینہ اور حکم کے مسلم ہونے کی بنا پر یہ قید اصطلاح کے مطابق احترازی نہیں ہے بلکہ واقعی تحریم کے نکتہ کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ایسی لڑکیاں جن

کی مائیں دوسری شادی کر لیتی ہیں عموماً کم عمر ہوتی ہیں اور اکثر نئے شوہر کی گود میں اس کی اپنی بیٹیوں کی طرح پرورش پاتی ہیں۔ آیت کہتی ہے کہ یہ واقعی تمہاری بیٹیوں کی مانند ہیں تو کیا کوئی شخص اپنی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے۔ ربائب بھی جو کہ ربیبہ کی جمع ہے اسی بنا پر ہے۔

آیت کے اس حصے کے بعد مطلب کی تاکید کے طور پر مزید فرماتا ہے کہ اگر ان سے جنسی آمیزش نہیں رکھتے تو پھر ان کی بیٹیاں تم پر حرام نہیں ہیں (فان لم تکونوا دخلتم بھن فلا جناح علیکم)۔

۳۔ وحلائل[1] ابنائکم الذین من اصلابکم ۔ یعنی۔ اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری صلب و نسل سے ہیں۔ حقیقت میں من اصلابکم یعنی۔ وہ بیٹے جو تمہاری نسل سے ہیں، اس وجہ سے ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی ایک غلط رسم پر خطِ بطلان کھینچا جائے کیونکہ اس زمانے میں معمول تھا کہ کچھ افراد کو اپنا بیٹا بنا لیتے تھے یعنی جو کسی اور کا بیٹا ہوتا اُسے اپنے بیٹے کے نام سے پکارتے تھے اور منہ بولے بیٹے پر حقیقی بیٹے کے تمام احکام و قانون لاگو ہوتے تھے اور اسی وجہ سے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے شادی نہیں کرتے تھے۔ اسلام میں منہ بولا بیٹا اور اس کے سب احکام کی طور پر کوئی بنیاد نہیں رکھتے۔

۴۔ وان تجمعوا بین الاختین ۔ اور تم پر دو بہنوں کو جمع کرنا منع ہے۔ یعنی تم ایک ہی وقت میں دو بہنوں کے ساتھ شادی نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر دو بہنوں یا زیادہ کے ساتھ مختلف زمانوں میں یا پہلی بہن سے علیحدگی کے بعد دوسری سے شادی کی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ چونکہ زمانۂ جاہلیت میں دو بہنوں کو اکٹھا رکھنے کا رواج تھا اور کئی لوگ ایسی شادیاں کر چکے تھے۔ اس لیے قرآن مندرجہ بالا جملے کے بعد کہتا ہے: الا ما قد سلف یعنی اس حکم کا (دوسرے احکام کی طرح) گذشتہ شادیوں پر اثر نہیں پڑے گا۔ یعنی جو لوگ اس قانون سے پہلے اس قسم کی شادیاں کر چکے ہیں ان کے لیے کوئی عذاب اور سزا نہیں ہے۔ اگرچہ اس وقت ان میں سے صرف ایک کو چننا اور دوسری کو چھوڑنا پڑے گا۔

اسلام نے اس قسم کی شادی سے کیوں روکا ہے۔ شاید اس کی رمز یہ ہو کہ دو بہنیں طبعی اور فطری نسبی رشتے کی وجہ سے ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت کرتی ہیں۔ لیکن جب وہ ایک دوسرے کی رقیب بن جائیں گی تو وہ پہلی فطری محبت باقی نہ رہے گی بلکہ ایک قسم کا تضاد ان میں جنم لے گا جو ان کی زندگی کے لیے انتہائی مضر ہے کیونکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جذبۂ محبت اور جذبۂ رقابت ان کے دلوں میں باہم برسرِپیکار رہیں گے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ جملہ الا ما قد سلف ان تمام محارم کے بارے میں ہے جن کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی اگر اس آیت کے نزول سے پہلے ذکر کیے ہوئے محارم میں سے اس زمانے کے مروج قوانین کے مطابق کوئی شخص شادی کر چکا ہے تو یہ تحریم کا حکم اس پر لاگو نہیں ہوگا اور ان کی اولاد جائز اولاد ہوگی لیکن اس آیت کے نزول کے بعد ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ آیت کا آخری جملہ یعنی ان اللہ کان غفوراً رحیماً بھی اس مفہوم سے مطابقت اور مناسبت رکھتا ہے۔

---

[1] "حلائل" حلیلہ کی جمع ہے۔ جو مادہ "حل" سے اس عورت کے معنی میں ہے جو انسان پر حلال ہو یا مادۂ حلول سے ہے جس کے معنی ایسی عورت کے ہیں جو ایک جگہ کسی مرد کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارے۔

۲۴۔ وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ۭ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝

ترجمہ

۲۴۔ اور شوہر دار عورتیں (تم پر حرام ہیں) مگر وہ کہ جن کے تم مالک بن گئے ہو۔ یہ ایسے احکام ہیں جو خدا نے تم پر مقرر کیے ہیں۔ ان (مذکورہ) عورتوں کے علاوہ باقی عورتیں تم پر حلال ہیں اور جنہیں اپنے مال کے ذریعے اپناؤ بشرطیکہ تم پاک دامن رہو اور زنا سے بچو اور جن عورتوں سے متعہ کرو تو ان کا حق مہر جو تم پر واجب ہے ادا کرو اور تم پر اس کی نسبت کوئی گناہ نہیں جس پر ایک دوسرے کے ساتھ مہر مقرر کے موافقت کرو، خدا دانا و حکیم ہے۔

تفسیر

والمحصنات من النساء . . . .

یہ آیت گذشتہ آیت کی بحث کا ضمیمہ ہے جو ان عورتوں کے متعلق ہے جن سے شادی کرنا حرام ہے، یہ آیت مزید خبردار کرتی ہے کہ سہاگنوں کے ساتھ شادی اور مباشرت حرام ہے۔

"محصنات" "محصنہ" کی جمع ہے اور "حصن" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے "قلعہ"۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ شوہر دار یا عفیف و پاکدامن عورتوں کے لیے جو غیر مردوں سے جنسی تعلق سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتی ہیں یا کسی مرد کی سرپرستی میں ہوں کے لیے بولا جاتا ہے بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ آزاد عورتوں کو کنیزوں کے مقابلے میں (محصنات) کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی آزادی حقیقت میں ایک چاردیواری کے مانند ہے جو ان کے گرد موجود ہے اور کوئی دوسرا ان کی اجازت کے بغیر اس میں داخل ہونے کا حق نہیں رکھتا۔ لیکن واضح ہے کہ آیت مذکورہ بالا میں شوہر دار عورتیں ہی مراد ہیں۔ یہ حکم صرف مسلمان عورتوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر مذہب و ملت کی عورتوں کے بارے میں ہے یعنی ان سے شادی نہیں کر سکتے۔

اس حکم میں جو استثناء ہے وہ صرف ان غیر مسلم عورتوں کے بارے میں ہے جو جنگ میں مسلمانوں کی قیدی ہو جائیں جو اسلام کی نظر

میں قید ہوتے ہی ان کا اپنے شوہروں سے کوئی تعلق نہیں رہتا اور وہ ایک طرح سے طلاق یافتہ ہو جاتی ہیں اسلام اجازت دیتا ہے کہ مدت عدت[1] ختم ہو جانے کے بعد ان سے شادی کر لی جائے یا ان سے ایک کنیز کا سا سلوک کیا جائے (الا ما ملکت ایمانکم) لیکن یہ استثناء ہے جسے اصطلاح میں استثنائے منقطع کہتے ہیں یعنی ایسی شوہر دار عورتیں جو مسلمانوں کی قید میں آجائیں۔ قید ہوتے ہی ان کا رابطہ ان کے شوہروں سے منقطع ہو جاتا ہے۔ بالکل اس غیر مسلم عورت کی طرح جس کا اسلام لانے کے بعد اپنے پہلے شوہر سے (اگر وہ اسلام نہ لائے تو) کوئی تعلق باقی نہیں رہتا اور وہ بے شوہر عورتوں کی صف میں آجاتی ہے۔

اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کسی مسلمان کو شوہر دار عورت سے چاہے وہ کسی مذہب وملت سے ہو ازدواج کی اجازت نہیں دیتا۔ اسی لیے ان کے لیے عدت مقرر کی گئی ہے اور عدت کے دوران میاں بیوی والے تعلق سے منع کیا گیا ہے۔ اس حکم کا فلسفہ جاننے کے لیے ان تین صورتوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔ پہلی یہ کہ اس قسم کی عورتیں کافروں کے علاقے میں واپس کر دی جائیں۔ دوسری یہ کہ شوہر کے بغیر ہی مسلمانوں میں رہ جائیں تیسری یہ کہ ان کا تعلق پہلے شوہروں سے منقطع ہو جائے اور وہ نئے سرے سے دوسری شادی کریں۔ پہلی صورت تو اسلامی اصولِ تربیت کے خلاف ہے اور دوسری صورت ظالمانہ ہے۔ اس لیے صرف تیسری صورت ہی باقی رہ جاتی ہے۔ بعض روایات سے کہ جن کی سند ابوسعید خدری مشہور صحابی رسولؐ تک پہنچتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت غزوۂ اوطاس[2] کے قیدیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ وہ قیدی عورتیں حاملہ نہیں ہیں، انہیں اجازت دی کہ وہ مسلمانوں سے شادیاں کریں یا کنیزوں کی طرح ان کے قبضہ میں رہیں۔ یہ حدیث مندرجہ بالا تفسیر کی تائید بھی کرتی ہے۔

کتاب اللہ علیکم۔ خدا تعالیٰ اس جملے میں ان گذشتہ احکامات کی تاکید کے طور پر جو محارم اور ان کی سی عورتوں کے بارے میں آئے ہیں، فرماتا ہے، یہ ایسے امور ہیں جنہیں خدا نے تمہارے لیے لکھا ہے اور مقرر کر دیا ہے۔ اس لیے کسی صورت میں بھی ان میں کوئی تبدیلی اور کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔

واحل لکم ما وراء ذلکم ان تبتغوا باموالکم محصنین غیر مسافحین

اس کے بعد فرماتا ہے کہ ان چند قسموں کی عورتوں کے علاوہ جو اس آیت اور گذشتہ آیتوں میں بیان کی گئی ہیں باقی عورتوں سے اس شرط پر شادی بیاہ کر سکتے ہو کہ وہ ازدواج اسلامی قانون کے مطابق عفت وپاکدامنی سے وابستہ ہو اور بدچلنی اور بے حیائی سے دور ہو۔ اسی بنا پر مندرجہ بالا آیت میں محصنین کا لفظ مردوں کی حالت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جس کے معنی ہیں عفیف وپاکدامن "غیر مسافحین" اس کی تاکید ہے۔ کیونکہ مادۂ سفاح (بروزن کتاب) کا معنی ہے "زنا" اور اصل میں یہ لفظ سفح سے (جس کے معنی پانی انڈیلنا یا بے ہودہ اور بغیر سوچے سمجھے کام کرنا ہیں) لیا گیا ہے۔ قرآن ایسے امور میں ہمیشہ کنایہ کے الفاظ استعمال کرتا ہے گویا یہ لفظ اس موقع پر ناجائز جنسی تعلقات کے لیے بطور کنایہ استعمال ہوا ہے۔

ان تبتغوا باموالکم۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات یا تو حق مہر ادا کر کے ازدواجی شکل میں ہوں یا کنیز

---

[1] ان کی عدت کی مقدار ایک بار ماہواری دیکھنا ہے اور اگر وہ حاملہ ہوں تو وضع حمل ہے۔

[2] اوطاس ایک جگہ ہے جہاں ایک اسلامی جنگ ہوئی تھی۔

کا مالک ہونے کی صورت میں اس کی قیمت ادا کرنے کے بعد[1] شاید ضمنی طور پر غیر مسافحین کی تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہو کہ مسئلہ ازدواج میں تمہارا نصب العین اور مقصد صرف جنسی پیاس کی تسکین نہ ہو بلکہ شادی پیاہ اس بلند ترین مقصد کو زندہ کرنے کے لیے ہو جس کے لیے جنسی پیاس انسان میں رکھی گئی ہے اور وہ ہے بقائے نسل انسانی اور برائیوں سے اس کی حفاظت۔

اسلام میں وقتی شادی

فما استمتعتم به منهن فآتوهن اجورهن فریضة

آیت کے اس حصے میں وقتی شادی کی طرف اشارہ ہے جسے اصطلاح میں "متعہ" کہتے ہیں۔ ارشاد رب العزت ہے ام جن عورتوں کے ساتھ متعہ کرتے ہو ان کا حق مہر ایک حق واجب کے طور پر ادا کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ازدواج موقت کی اصل تشریع اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے ہی مسلمانوں میں تسلیم شدہ تھی۔ اس لیے تو خداوند عالم اس آیت میں حق مہر ادا کرنے کی وصیت فرما رہا ہے اور کیونکہ یہ ایک اہم تفسیری، فقہی اور اجتماعی بحث ہے اس لیے ضروری ہے کہ کئی گوشوں اور پہلوؤں سے اس کا مطالعہ کیا جائے۔

۱ - جو قرائن آیت مندرجہ بالا میں موجود ہیں وہ اس آیت کے وقتی شادی پر دلالت کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔
۲ - اس قسم کی شادیاں حضرت رسول اکرمؐ کے عہد میں ہوتی تھیں اور رسول اللہ کے دور میں اسے منسوخ نہیں کیا گیا۔
۳ - اس قسم کی ازدواج معاشرتی اور اجتماعی ضرورت بھی ہے۔
۴ - متعہ بہت سے مسائل کا حل بھی ہے۔

اب پہلی جہت کو لیتے ہیں اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ لفظ متعہ جس سے استمتعتم لیا گیا ہے۔ اسلام میں وقتی نکاح کے لیے ہے اور اصطلاح کے مطابق اس بارے میں حقیقت شرعیہ موجود ہے۔ اس امر کا گواہ یہ ہے کہ متعہ کا لفظ اسی معنی میں احادیث پیغمبرؐ اور کلمات صحابہ میں بارہا استعمال ہوا ہے[2]

دوسرے یہ کہ اگر اس لفظ کے مذکورہ معنی نہ لیے جائیں تو پھر اس کے لغوی معنی (نفع اٹھانا) مراد لیے جائیں گے تو اس صورت میں آیت کے معنی کا خلاصہ یہ ہوگا کہ اگر عقد دائمی والی عورتوں سے فائدہ اٹھاؤ تو ان کا حق مہر انہیں ادا کرو۔ جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ حق مہر کی ادائیگی کی شرط عورتوں سے تمتع اور نفع حاصل کرنا نہیں ہے۔ بلکہ تمام مہر بنا بر مشہور[3] یا کم از کم نصف حق مہر نکاح ہوتے ہی واجب ہو جاتا ہے۔

---

[1] غلاموں کی آزادی کے سلسلے میں اسلام نے جو زبردست لائحہ عمل اختیار کیا اس کے بارے میں متعلقہ آیات کے ذیل میں تفصیلی بحث کی جائے گی۔

[2] کنز العرفان، مجمع البیان، نور الثقلین، برہان اور الغدیر کی جلد ۶ ملاحظہ فرمائیے۔

[3] مشہور یا زیادہ مشہور یہ ہے کہ دائمی عقد کے بعد پورا مہر مرد پر واجب ہو جاتا ہے، اگرچہ دخول سے پہلے طلاق سے حق مہر آدھا واجب رہ جاتا ہے۔

نیز پیرو کر بزرگ اصحاب اور تابعینؓ مثلاً عبداللہ ابن عباس اسلام کے مشہور عالم و مفسر، ابی بن کعب، جابر بن عبداللہ، عمران بن حصین سعید بن جبیر، مجاہد، قتادہ، سدی اور دیگر بہت سے مفسرین اہل سنت اور تمام مفسرین اہل بیتؑ مندرجہ بالا آیت سے نکاح موقت کے معنی سمجھے ہیں۔ یہاں تک امام فخرالدین رازی جن کی شہرت یہ ہے کہ وہ شیعوں کے مسائل میں اشکال تراشی کرتے ہیں، اس آیت کے بارے میں تفصیلی بحث کے بعد کہتے ہیں کہ حکم مذکور ایک مدت کے بعد منسوخ ہو گیا تھا۔ چونکہ یہ ائمہ اہل بیتؑ نے جو اسرار وحی کو تمام لوگوں سے زیادہ جانتے تھے بالاتفاق آیت کے یہی معنی لیے ہیں ان سے اس سلسلے میں بہت سی روایتیں منقول ہیں۔ ان میں سے ایک روایت حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے، آپؑ نے فرمایا:

المتعة نزل به القرآن وجرت بها السنة من رسول الله

متعہ کا حکم قرآن میں نازل ہوا ہے۔ اور سنتِ رسولؐ اس کے مطابق جاری ہوئی [2]

علاوہ ازیں حضرت امام باقرؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے ابو بصیر سے متعہ کے بارے میں سوال کے جواب میں فرمایا:

نزلت فی القرآن فما استمتعتم به منهن فآتوهن اجورهن فريضة۔

قرآن مجید نے اس سلسلے میں گفتگو کی ہے چنانچہ فرماتا ہے، فما استمتعتم [3]

نیز امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے متعہ کے بارے میں عبداللہ بن عمیر لیثی کے جواب میں فرمایا:

احلها الله فی کتابه وعلى لسان نبيه فهو حلال الى يوم القيمة۔

خداوند عالم نے اسے قرآن میں اپنے پیغمبرؐ کی زبان پر حلال کیا اور وہ قیامت تک حلال ہے [4]

کیا یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے

تمام علمائے اسلام کا اتفاق ہے بلکہ ضرورت دین اس پر دلالت کرتی ہے کہ نکاح موقت آغاز اسلام میں جائز تھا اور مشروع تھا (یہ آیت کی متعہ کے جواز پر دلالت اصل حکم کے مسلم ہونے پر کسی قسم کی نفی نہیں کرتی۔ کیونکہ مخالفین کا خیال ہے کہ اس حکم کا شرعی ہونا سنت سے ثابت ہے۔ یہاں تک کہ مسلمان آغاز اسلام میں اس پر عمل کرتے تھے اور وہ مشہور جملہ جو حضرت عمر سے منقول ہے،

متعتان كانتا على عهد رسول الله وانا محرمهما و معاقب عليهما متعة النساء و متعة الحج [5]

دو متعہ پیغمبرؐ کے عہد مبارک میں تھے۔ جنہیں میں (عمر) حرام کرتا ہوں اور ان پر سزا بھی دوں گا عورتوں سے متعہ اور حج تمتع (جو ایک خاص قسم کا حج ہے)۔

---

[1] وہ لوگ جو پیغمبرؐ کے زمانے کے بعد آئے اور آنحضرتؐ کے زمانے کو نہ پا سکے۔

[2] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۴۶۷، تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۳۶۰۔

[3] گذشتہ حوالہ۔

[4] تفسیر برہان، زیر بحث آیت کے ذیل میں (توجہ رہے کہ یہ حدیث اور گذشتہ دونوں احادیث کافی میں ہیں)۔

[5] کنز العرفان جلد ۲ صفحہ ۱۵۸، تفسیر قرطبی و طبری، سنن کبریٰ بیہقی کتاب نکاح۔

یہ جملہ عہدِ رسالت میں اس حکم کے موجود ہونے کی واضح دلیل ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اس حکم کے مخالفین کہتے ہیں کہ یہ حکم بعد میں منسوخ اور حرام کر دیا گیا ہے۔ لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ جن روایات سے حکم متعہ منسوخ ہونے کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے وہ بہت اختلافی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ حضورؐ نے بہ نفسِ نفیس اس حکم کو منسوخ فرمایا تھا لہٰذا اس کی ناسخ سنت و حدیث پیغمبرؐ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ناسخ آیت طلاق ہے :

اذا طلقتم النساء فطلقوهن لعدتهن

جب تم عورتوں کو طلاق دو تو طلاق عدت کے مناسب زمانہ میں ہو۔

جبکہ یہ آیت زیرِ بحث مسئلے سے کوئی ربط نہیں رکھتی۔ کیونکہ یہ آیت طلاق کے بارے میں بحث کرتی ہے اور نکاح موقت (متعہ) میں سرے سے طلاق ہوتی ہی نہیں۔ بلکہ اس میں مدت متعہ ختم ہونے کے بعد خود بخود علیٰحدگی ہو جاتی ہے۔ قدرِ مشترک و مسلم یہ ہے کہ اس قسم کے نکاح کا مشروع اور جائز ہونا عہدِ پیغمبرؐ میں قطعی ہے اور کسی قسم کی قابلِ اعتماد دلیل اس کے منسوخ ہونے پر نہیں ملتی۔

بنا بریں علم اصول کے مسلم قانون کے مطابق جو حدِ ثبوت تک پہنچا ہوا ہے، قانون متعہ کی بقا ثابت ہوتی ہے خود حضرت عمر کا مشہور جملہ جو نقل کیا جا چکا ہے، وہ بھی اس حقیقت پر واضح گواہ ہے کہ یہ حکم عہدِ پیغمبرؐ میں بالکل منسوخ نہیں ہوا۔ یہ بدیہی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے علاوہ کوئی شخص بھی احکام منسوخ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ صرف آپ ہی کی ذات قدسی صفات خدا کے حکم سے کچھ احکام کو منسوخ کر سکتی ہے اور پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد نسخ کا دروازہ کلی طور پر بند ہو جاتا ہے ورنہ ہر شخص اپنے اجتہاد سے احکام کو منسوخ کر سکتا ہے اور پھر کوئی چیز بھی شریعت ابدی اور جاودانی کے نام سے باقی نہیں رہ سکتی۔ اور اصولی طور پر پیغمبر اکرمؐ کے ارشادات کے مقابلے میں اجتہاد دراصل نص کے مقابلے میں اجتہاد ہے جو قابلِ اعتبار نہیں۔

بڑی عجیب بات ہے کہ صحیح ترمذی میں جو اہلِ سنت کی مشہور صحاح میں سے ہے اسی طرح دارقطنی[1] میں ہے کہ :

اہلِ شام میں سے ایک شخص نے عبد اللہ بن عمر سے حج تمتع کے بارے میں سوال کیا تو اس نے وضاحت کے ساتھ جواب دیا کہ یہ کام حلال اور اچھا ہے۔ شامی نے کہا : تیرے باپ نے تو اس عمل سے منع کیا ہے۔ عبد اللہ ابن عمر غصے میں آ کر کہنے لگے : اگر میرا باپ اس قسم کے کام سے منع کرے اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس کی اجازت دیں تو کیا میں سنت مقدس پیغمبرؐ کو چھوڑ دوں اور اپنے باپ کی پیروی کروں۔ اٹھ جا اور مجھ سے دور ہو جا۔[2]

نکاح موقت کے بارے میں اس روایت کی نظیر عبد اللہ ابن عمر سے صحیح ترمذی میں اسی طرح منقول ہے[3]

۱۔ تفسیر قرطبی جلد ۲ صفحہ ۷۶۲، سورۂ بقرہ ذیل آیت ۱۹۵۔

۲۔ حج تمتع جس سے حضرت عمر نے روک دیا سے مراد یہ ہے کہ پہلے احرام باندھا جائے اور عمرہ کے مراسم کے بعد احرام سے نکل آئے اور محل ہو جائے اور یوں تمام چیزیں یہاں تک عورتوں سے ہم بستری تک حلال ہو جائیں گی پھر دوبارہ احرام باندھا جائے اور ۹ ذی الحجہ سے مراسم حج انجام دی جائیں۔ زمانۂ جاہلیت میں اسے درست نہیں سمجھا جاتا تھا اور لوگ اس پر تعجب کرتے تھے کہ ایک شخص ایام حج میں مکہ معظمہ میں داخل ہو اور اس نے ابھی حج نہ کیا ہو اور وہ عمرہ بجا لائے اور احرام باندھنا چھوڑ دے۔ لیکن اسلام نے صراحت کے ساتھ اس کی اجازت دی اور سورہ بقرہ کی آیت ۱۹۶ میں اس کی توضیح کر دی گئی ہے۔

۳۔ شرح لمعہ جلد ۲ کتاب النکاح۔

نیز کتاب محاضرات راغب سے منقول ہے کہ ایک مسلمان نے چاہا کہ متعہ کرے تو لوگوں نے اس سے پوچھا کہ تو نے یہ کام کیسے حلال سمجھا ہے تو اس نے کہا عمر سے۔ انہوں نے تعجب سے کہا، یہ کیسے ممکن ہے جبکہ انہوں نے اس سے منع کیا ہے اور اس پر سزا کی دھمکی بھی دی ہے۔ وہ شخص کہنے لگا بہت اچھا میں بھی اسی بنا پر کہتا ہوں۔ کیونکہ حضرت عمر کہتے تھے کہ پیغمبر اکرم نے اسے حلال کیا ہے اور میں اسے حرام کرتا ہوں۔ میں پیغمبر اکرم سے اس کی مشروعیت اور جواز کو قبول کرتا ہوں لیکن اسے کوئی اور حرام کر دے تو اسے قبول نہیں کروں گا۔[1]

میرا مقصد جس کی یاد دہانی اس موقع پر ضروری ہے یہ ہے کہ جو اس حکم کے منسوخ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ بڑی مشکلات سے دوچار ہیں۔

پہلی یہ کہ اہل سنت کی متعدد روایتوں میں یہ وضاحت موجود ہے کہ یہ حکم حضرت رسالت مآب کے زمانے میں بالکل منسوخ نہیں ہوا بلکہ حضرت عمر کے زمانۂ خلافت میں اسے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اس بنا پر منسوخی کے طرفدار ان سب روایتوں کا جواب دیں۔ یہ روایات چوبیس ۲۴ ہیں جنہیں علامہ امینی نے الغدیر کی جلد ششم میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ذیل میں صرف دو نمونوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

۱۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے منقول ہے، وہ کہتے ہیں:

ہم پیغمبر کے زمانے میں بڑی آسانی سے نکاح موقت کر لیتے تھے اور یہ کیفیت جاری رہی یہاں تک کہ حضرت عمر نے عمرو بن حریث کے واقعے میں اس کام سے بالکل منع کر دیا۔[2]

دوسری حدیث کتاب مؤطا مالک اور بیہقی کی سنن کبریٰ میں عروہ بن زبیر سے منقول ہے:

ایک عورت خولہ بنت حکیم حضرت عمر کے زمانے میں ان کے پاس گئی اس نے بتایا کہ ایک مسلمان ربیعہ بن امیہ نے متعہ کیا ہے۔ حضرت عمر نے کہا: اگر میں نے اس کام سے پہلے ممانعت کر دی ہوتی تو اسے سنگسار کرتا۔ لیکن اب فوراً اس سے منع کرتا ہوں۔[3]

کتاب بدایۃ المجتہد تالیف ابن رشد اندلسی میں ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری کہتے تھے:

نکاح موقت ہم زمانۂ پیغمبر، خلافت ابوبکر اور خلافت عمر کے نصف تک کرتے تھے اس کے بعد عمر نے منع کر دیا۔[4]

ان کے لیے دوسری کٹھن مشکل یہ ہے کہ وہ روایات جو زمانۂ پیغمبر میں اس حکم کے منسوخ ہونے پر دلالت کرتی ہیں وہ بہت ہی مختلف بلکہ متضاد اور نقیض ہیں۔ بعض کے مطابق یہ حکم جنگ خیبر میں منسوخ ہوا۔ بعض ثابت کرتی ہیں کہ یہ حکم روز فتح مکہ

۱۔ کنزالعرفان جلد ۲ صفحہ ۱۵۹ (پاورقی)۔

۲۔ الغدیر جلد ۶ صفحہ ۲۰۶۔

۳۔ الغدیر جلد ۶ صفحہ ۲۱۰۔

۴۔ بدایۃ المجتہد کتاب النکاح۔

منسوخ ہوا بعض جنگ تبوک میں اور بعض جنگ اوطاس کے موقع پر اس کے منسوخ ہونے کی خبر دیتی ہیں۔ غرض اس حالت کو دیکھ کر نتیجہ نکلتا ہے کہ نسخ کی سب روایتیں جعلی ہیں اسی لیے وہ ایک دوسرے کے خلاف اور متضاد ہیں۔

تفسیر المنار کا مؤلف کہتا ہے:

> ہم نے پہلے مجلۂ المنار کی تیسری اور چوتھی جلد میں تصریح کی تھی کہ حضرت عمر نے متعہ کی مخالفت کی تھی لیکن بعد میں کچھ اخبار و روایات ہمارے ہاتھ لگی ہیں جو ظاہر کرتی ہیں کہ یہ حکم حضورؐ کے زمانے میں منسوخ ہو چکا تھا نہ کہ عمر کے زمانہ میں لہٰذا ہم اپنی پہلی گفتگو کی اصلاح کرتے ہیں اور اس سے توبہ کرتے ہیں۔[1]

صاحب المنار کی یہ تمام گفتگو تعصب آمیز ہے کیونکہ اس سلسلے میں رسول اللہ سے مروی روایات متضاد ہیں جن میں اس حکم کے منسوخ ہونے کا ذکر ہے۔ جبکہ دوسری طرف ہمارے پاس ایسی روایتیں ہیں جو زمانۂ حضرت عمر تک اس حکم کے جاری رہنے کی تصریح کرتی ہیں۔ اس لیے نہ یہ معذرت کا موقع ہے اور نہ استغفار کا۔

جن شواہد کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس کی پہلی گفتگو حقیقت اور صداقت پر مبنی تھی نہ کہ دوسری۔ یہ امر واضح ہے کہ حضرت عمر یا کوئی اور شخص یہاں تک کہ ائمہ اہل بیتؑ بھی جو حضرت پیغمبر اکرمؐ کے حقیقی نائب ہیں ان احکام کو جو حضورؐ کے زمانے میں تھے منسوخ نہیں کر سکتے۔ اصولی طور پر رحلت پیغمبرؐ سے باب وحی بند ہو جانے کے بعد منسوخی کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔ بعض لوگوں کا حضرت عمر کے کلام کو اجتہاد پر محمول کرنا بھی باعث تعجب ہے۔ کیونکہ نص کے مقابلے میں اجتہاد ممکن ہی نہیں۔ زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اہل سنت کے بعض فقہا نے ان آیات کو جو احکام نکاح سے متعلق ہیں (مثلاً سورۂ مومنون کی آیت ۶ اور آیت متعہ جو بالا جو متعہ کے بارے میں ہے) کو منسوخ سمجھا ہے۔ گویا ان کے خیال میں نکاح موقت نکاح ہی نہیں ہے۔ حالانکہ یہ مسلم ہے کہ یہ نکاح کی ایک قسم ہے۔

نکاح موقت ایک اجتماعی ضرورت ہے

یہ ایک کلی اور عمومی قانون ہے کہ اگر انسان کی نفسانی خواہشات کی تسکین کا صحیح طور پر خیال نہ رکھا جائے تو وہ اپنی پیاس بجھانے کے لیے غلط راستے اختیار کرے گا کیونکہ یہ حقیقت مسلم ہے کہ خواہشات نفسانی کو کسی صورت میں ختم نہیں کیا جا سکتا اور بالفرض اگر ختم بھی کر دیا جائے تو یہ اقدام نامناسب ہوگا۔ کیونکہ یہ کارروائی قانون فطرت کے خلاف جنگ ہے۔ اس بنا پر صحیح راستہ یہی ہے کہ اس کی تشنگی دور کرنے کا معقول انتظام کیا جائے اور اس کے لیے اصلاحی طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس بات کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جنسی خواہش انسان کی زبردست خواہشات اور طبائع میں سے ہے۔ یہاں تک کہ بعض ماہرین نفسیات اسی کو فطرت سرشت انسانی سمجھتے ہیں اور باقی تمام خواہشات کو اس کے ماتحت قرار دیتے ہیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بہت سے مقامات اور معاشروں میں ایسے لوگ بے شمار ہیں جو نکاح دائمی کی استطاعت و قدرت

---

[1] تفسیر المنار جلد ۵ صفحہ ۱۶۔

نہیں رکھتے یا کبھی شادی شدہ افراد طویل سفر یا ایسے فرائض پر مامور ہوتے ہیں جہاں وہ اپنی جنسی خواہشات کی تسکین کا کوئی بندوبست نہیں کر سکتے خصوصاً اس زمانے میں جبکہ شادی حصولِ علم اور معاشرے کے پیچیدہ مسائل کی وجہ سے بہت دیر میں ہوتی ہے اور بہت کم نوجوان ایسے ہوتے ہیں جو سن بلوغت کو پہنچتے ہی جو جنسی خواہشات کے شباب کا زمانہ ہے، شادی کر سکتے ہوں۔ یہ امر ان دنوں خطرناک ترین صورت اختیار کر چکا ہے۔ تو ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیے۔

کیا اس صورت میں لوگوں کو (راہبوں اور راہباؤں کی طرح) خواہشاتِ نفسانی کچلنے کی طرف مائل کیا جائے یا انہیں جنسی بے راہروی کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے اور موجودہ تباہ کن اور بے شرمی، بے حیائی کی عام اجازت دے دی جائے یا یہ کہ تیسرا راستہ اختیار کیا جائے جس میں نہ نکاحِ دائمی کا سا بوجھ ہو اور نہ وہ جنسی بے راہروی ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ نکاحِ دائمی گذشتہ زمانے میں نہ موجودہ زمانے میں بھی تمام طبقات کی جنسی ضروریات کا کفیل اور متحمل نہیں ہو سکتا۔ اب ہم دوراہے پر کھڑے ہیں۔ یا تو فحشا و منکر کو جائز قرار دیں (جیسا کہ آج کی مادی دنیا عملی طور پر اسے درست سمجھتی ہے اور اسے قانونی طور قبول کرتی ہے) اور یا یہ کہ نکاحِ موقت کو قبول کریں۔

معلوم نہیں کہ جو لوگ متعہ کے بھی فحشا و منکر کی طرح مخالف ہیں، انہوں نے اس سوال کا کیا جواب سوچا ہے۔ نکاحِ موقت کے نصب العین میں نہ تو نکاحِ دائمی کی سی سخت شرطیں ہیں اور نہ ہی یہ خطرناک جنسی برائیوں اور نقصانات کا حامل ہے۔ اسی لیے یہ معقول مالی استطاعت نہ رکھنے والوں، تعلیمی اور دیگر مشاغل میں مصروف افراد کے لیے مناسب ہو سکتا ہے۔

نکاحِ موقت پر کیے گئے اعتراضات کا جواب

اس موقع پر چند اشکالات ہیں جن کا مکمل جواب دینا چاہیے۔

بعض کہتے ہیں کہ نکاحِ موقت اور زنا کاری و بدکاری میں کیا فرق ہے۔ دونوں میں کچھ رقم کے بدلے میں تن فروشی و خود فروشی کی جاتی ہے۔ ان کے خیال میں اس قسم کا نکاح دراصل ایک پردہ ہے جو بدکاری اور جنسی بے راہروی کے چہرے پر ڈالا جاتا ہے۔ فرق بس یہ ہے کہ متعہ میں دو آسان سے جملے (صیغے) پڑھ لیے جاتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ بالکل نکاحِ موقت کے مفہوم سے ناواقف ہیں کیونکہ نکاحِ موقت صرف دو جملے کہنے سے مکمل نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے لیے بھی نکاحِ دائمی کی طرح قاعدے، دستور اور احکامات ہیں یعنی ایسی عورت نکاحِ موقت کے زمانے میں صرف اسی مرد کے اختیار میں رہے گی اور جب مدت ختم ہو گی تو عدت میں بیٹھے گی۔ یعنی کم از کم پینتالیس ۴۵ دن تک کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے گی۔ تاکہ اگر وہ پہلے مرد سے حاملہ ہے تو واضح ہو جائے۔ یہاں تک کہ اگر اس نے کسی طریقے سے حمل سے بچنے کی تدبیر کی ہے تب بھی اسے ایامِ عدت پورا کرنے پڑیں گے اور اگر اس سے کوئی بچہ پیدا ہو جائے تو نکاحِ دائمی سے پیدا ہونے والے بچے کی طرح مرد اس کا وارث و سرپرست قرار پائے گا اور اس پر تمام احکامِ اولاد جاری ہوں گے۔ جبکہ بدکاری اور زنا میں اس قسم کی کوئی شرط نہیں ہوتی۔ تو کیا اب بھی ان دونوں کا ایک دوسرے پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ البتہ نکاحِ موقت مسئلاً میراث (جو میاں بیوی کے درمیان ہے)، نان و نفقہ اور بعض دیگر احکام میں نکاحِ دائمی سے مختلف ہے۔ پھر بھی اس اختلاف اور فرق کو بدکاری اور

ل البتہ نکاحِ دائمی اور نکاحِ موقت کی اولاد میں کوئی فرق نہیں ہے۔

زناکاری کے برابر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بہرحال وہ نکاح کے اصول و قواعد کی رو سے نکاح کی ایک شکل ہے۔

اعتراض کی دوسری بات یہ ہے کہ متعہ اس امر کا سبب ہے کہ بعض ہوس پرست افراد اس قانون سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس کی آڑ میں طرح طرح کی برائیاں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ نیک اور عزت والے افراد کبھی اس کے لیے تیار نہیں ہوتے اور صاحب حیثیت اور عزت دار عورتیں کبھی اس کے قریب نہیں آتیں۔

وہ کونسا قانون ہے جس سے لوگ غلط فائدہ حاصل نہیں کرتے تو پھر کیا ضروری ہے کہ کسی فطری قانون اور اجتماعی ضرورت کو اس لیے روک دیا جائے کہ اس سے غلط فائدہ اٹھایا جاتا ہے یا غلط فائدہ اٹھانے والوں کی روک تھام کی جائے۔

فرض کیجئے کہ ایک جماعت حج بیت اللہ سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے اس مقدس سفر میں منشیات کا کاروبار کرتی ہے تو کیا اس صورت میں لوگوں کو اس عظیم اسلامی کانفرنس میں شرکت سے منع کر دیا جائے گا یا غلط کاروبار کرنے والوں کو قرار واقعی سزا دی جائے گی۔

اگر آپ یہ دیکھتے ہیں کہ آج کے محترم افراد اس قانون اسلامی سے نفرت کرتے ہیں تو دراصل اس میں قانون کا عیب نہیں بلکہ قانون پر غلط عمل کرنے والوں کا قصور ہے یا اس سے بھی زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس میں غلط فائدہ اٹھانے والوں کا قصور ہے۔ اگر آجکل کے معاشرے میں نکاح موقت پر صحیح خطوط اور درست صورت میں عمل کیا جائے اور اسلامی حکومت مخصوص قوانین و ضوابط کے تحت اسے درست طور پر عمل میں لائے تو غلط فائدہ اٹھانے والوں کی بھی روک تھام ہو سکے گی یوں محترم افراد بھی (ضرورت اجتماعی کے اجرا میں) نظر حقارت نہیں کریں گے۔

کہتے ہیں کہ متعہ کی وجہ سے لاوارث بچے، ناجائز اولاد کی طرح معاشرے میں رہتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم جو کچھ اس سے پہلے تحریر کر چکے ہیں اس سے اس سوال کا جواب بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ناجائز اولاد قانون کی نظر میں ماں باپ میں سے کسی سے بھی وابستہ نہیں ہے۔ جبکہ متعہ کی اولاد اور عقد دائمی کی اولاد میں میراث اور دیگر حقوق اجتماعی کی رو سے ذرہ برابر بھی فرق نہیں ہے۔ گویا حقیقت حال سے بے خبری اشکال اور شک و شبہ کا سرچشمہ ہے۔

رسل اور نکاح موقت

اس گفتگو کے آخر میں ایک مفید بات کی یاد دہانی ضروری معلوم ہوتی ہے جسے مشہور انگریز دانشور برٹرنڈ رسل نے اپنی کتاب "زناشوئی اور اخلاق"[1] میں آزمائشی شادی کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔ وہ نوجوانوں کا محاکمہ کرنے والے جج "بن بی لینڈسی" کی تجویز دوستانہ شادی یا آزمائشی شادی کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے:

جج صاحب موصوف کی تجویز کے مطابق نوجوانوں کو یہ اختیار ملنا چاہیے کہ وہ ایک نئی قسم کی شادی کر سکیں۔ جو عام شادی (نکاح دائمی) سے تین امور میں مختلف ہو۔

---

[1] یہ برٹرنڈ رسل کی کتاب کے فارسی ترجمے کا نام ہے۔ (مترجم)

۱ - طرفین کا مقصد صاحب اولاد ہونا نہ ہو اس سلسلے میں ضروری ہے کہ انہیں حمل روکنے کے طریقے سکھائے جائیں۔
۲ - ان کی علیحدگی بآسانی ہو سکے۔
۳ - طلاق کے بعد عورت کسی قسم کے نان و نفقہ کا حق نہ رکھتی ہو۔

رسل بچ لینڈ سی کا مقصد بیان کرنے کے بعد کہتا ہے:

میرا خیال ہے کہ اگر اس قسم کی شادی کو قانونی طور پر درست مان لیا جائے تو بہت سے نوجوان خصوصاً کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علم وقتی نکاح پر تیار ہو جائیں گے اور ایک وقتی مشترک زندگی میں قدم رکھیں گے۔ ایسی زندگی جو اپنی جلو میں آزادی لیے ہوتے ہے۔ اس طرح بہت سی معاشرے کی خرابیوں، لڑائی جھگڑوں، خصوصاً جنسی بے راہ روی سے نجات مل جائے گی۔[1]

جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ نکاح موقت کے بارے میں مندرجہ بالا تجویز کئی لحاظ سے اسلامی حکم کی طرح ہے لیکن جو شرطیں اور خصوصیتیں اسلام نے نکاح موقت کے لیے تجویز کی ہیں وہ کئی لحاظ سے زیادہ واضح اور مکمل ہیں۔ اسلامی نکاح موقت میں اولاد نہ ہونے دینا ممنوع نہیں ہے اور فریقین کا ایک دوسرے سے جدا ہونا بھی آسان ہے۔ جدائی کے بعد نان و نفقہ بھی واجب نہیں ہے۔

ولا جناح علیکم فیما تراضیتم بہ من بعد الفریضۃ

آیت کے آخر میں یہ ذکر کرنے کے بعد کہ حق مہر کی ادائیگی ضروری ہے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اگر طرفین عقد ایک دوسرے کی رضامندی کے ساتھ حق مہر کی مقدار میں کمی بیشی کریں تو کوئی ہرج نہیں ہے اس لیے کہ مہر ایک ایسا قرض ہے جو طرفین کی مرضی سے تبدیل ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں عقدِ موقت و دائمی میں کوئی فرق نہیں ہے اگرچہ ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ یہ آیت نکاح موقت کے بارے میں ہے۔

مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں ایک اور بھی احتمال ہے اور وہ یہ کہ اس میں کوئی مانع نہیں کہ نکاح موقت کے ختم ہونے پر طرفین مدتِ نکاح اور اسی طرح حق مہر کے اضافے کے متعلق آپس میں موافقت کر لیں۔ نکاح موقت مدت مقررہ ختم ہونے سے پہلے بھی قابلِ تجدید ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ طے کر لیتے ہیں کہ معین شدہ مدت نکاح اور مقررہ حق مہر دونوں میں بقدر ضرورت اضافہ کر دیا جائے۔ روایات اہلِ بیتؑ میں بھی اس تفسیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ان اللہ کان علیماً حکیماً

جن احکام کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے وہ ایسے ہیں جو نوعِ بشر کے لیے خیر و سعادت کے حامل ہیں کیونکہ پروردگارِ عالم بندوں کے مصالح سے آگاہ اور اجرائے قانون میں حکیم ہے۔

۲۵- وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

---

[1] کتاب زناشوئی و اخلاق صفحہ ۱۸۹ و ۱۹۰۔

بِاِیْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

ترجمہ

۲۵۔ اور جو لوگ (آزاد) پاک دامن عورتوں سے نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ کنیزوں میں سے پاک دامن ایماندار عورتوں سے جو ان کی ملکیت میں ہیں نکاح کریں خدا تمہارے ایمان سے آگاہ ہے اور تم سب ایک ہی پیکر کے مختلف اجزا ہو۔ اور ان (کنیزوں) سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کرو۔ لیکن ان کا حق مہر ان ہی کو اس شرط کے ساتھ دو کہ وہ پاک دامن رہیں۔ نہ یہ کہ وہ کھلے بندوں زنا کرتی پھریں اور نہ ڈھکے چھپے یار بنائیں اور جب وہ سہاگن ہوں اور پھر عفت کے منافی کام کریں تو ان کے لیے آزاد عورتوں سے آدھی سزا ہوگی۔ (کنیزوں سے نکاح کرنے کی) یہ اجازت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو (جنسی تقاضوں کے حوالے سے) سخت تنگ ہوں۔ اگر صبر و تحمل سے کام لو تو تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

کنیزوں سے نکاح

ومن لم یستطع منکم طولا ان ینکح ......

گزشتہ آیات میں نکاح کے متعلق مباحث کے بعد یہ آیت کنیزوں سے نکاح کرنے کی شرطیں بیان کرتی ہے۔ سب سے پہلے کہتی ہے: جو لوگ آزاد عورتوں سے نکاح کرنے کے لیے مالی قدرت نہیں رکھتے وہ کنیزوں سے نکاح کرسکتے ہیں۔ جن کا حق مہر اور عام طور پر باقی مصارف ان کی نسبت زیادہ سہل اور آسان ہوتے ہیں [1] البتہ کنیزوں سے نکاح سے مراد یہ نہیں ہے کہ کنیز کا مالک اپنی کنیز

---

[1] لفظ طول (بروزن نوح) اصل میں مادہ طول (بروزن نور) سے ہے اور یہ توانائی، رسائی، مالی وسائل وغیرہ کے معنی میں آیا ہے۔

سے نکاح کرے کیونکہ وہ توان شرطوں کے مطابق جو فقہ کی کتابوں میں ہیں اپنی کنیز کو ایک بیوی کی طرح رکھ سکتا ہے۔ بنابریں اس سے مراد مالک کے علاوہ دیگر افراد کا کسی کنیز سے نکاح کرنا ہے۔

ضمنی طور پر لفظ "مومنات" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کنیز کا یقینی طور پر مسلمان ہونا ضروری ہے تاکہ اس سے نکاح کر سکے۔ اس بناپر اہل کتاب کنیزوں سے نکاح نہیں کر سکتا۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن ان کنیزوں کے لیے "فتیات" کا لفظ استعمال کرتا ہے فتیات جمع ہے اور عام طور پر یہ لفظ قابلِ احترام عورتوں اور زیادہ تر نوجوان لڑکیوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

واللہ اعلم بایمانکم

یہ جملہ بتاتا ہے کہ تم ان کے ایمان کی تشخیص کے لیے ان کی ظاہری حالات اور اعتقاد کے پابند رہو باقی رہا ان کا باطن اور ان کے دل کے بھید تو خدا تمہارے ایمان وعقیدہ سے زیادہ آگاہ ہے۔

بعضکم من بعض

چونکہ بعض لوگ کنیزوں سے نکاح کرنا پسند نہیں کرتے تھے اس لیے قرآن فرماتا ہے کہ تم سب ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہو اور تم ایک دوسرے سے ہو۔ اس بنا پر تمہیں کنیزوں سے نکاح کرنے میں کراہت نہیں کرنا چاہیے جو انسانی نقطۂ نظر سے مختلف نہیں ہیں اور معنوی قدر وقیمت کی رو سے بھی دوسروں کی طرح ان کی قدر ومنزلت تقویٰ و پرہیزگاری سے وابستہ ہے اور تم ایک ہی جسم کے مختلف اعضا ہو۔

فانکحوھن باذن اھلھن

لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ نکاح مالک کی اجازت سے ہو۔ کیونکہ یہ اس کی اجازت کے بغیر باطل ہے اور مالک کو اہل سے تعبیر کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مالکوں کو چاہیے کہ وہ کنیزوں کے ساتھ جنس تجارت اور مال ودولت کا سا سلوک نہ کریں بلکہ ایک خاندان کے سرپرست کی طرح ان کے ساتھ اولاد اور اہل وعیال جیسا مکمل انسانی برتاؤ کریں۔

واٰتوھن اجورھن بالمعروف

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیے مناسب حق مہر مقرر کیا جائے اور وہ خود ان ہی کو دیا جائے یعنی مہر کی مالک خود لونڈیاں ہوں گی۔ اگرچہ مفسرین کی ایک جماعت کا یہ نظریہ ہے کہ اس آیت میں ایک لفظ محذوف ہے۔ ان کے خیال میں اصل میں یوں ہے: اٰتوا مالکھن اجورھن (ان کا مہران کے آقاؤں کو دو) لیکن یہ تفسیر ظاہر آیت کے مطابق نہیں ہے۔ اگرچہ بعض روایات اس کی تائید کرتی ہیں۔ ضمناً آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غلام بھی ان اموال کے مالک ہو سکتے ہیں جو جائز طریقوں سے ان کے ہاتھ آئے۔

اور "بالمعروف" "یعنی اچھائی کے ساتھ" سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حق مہر مقرر کرنے میں ان پر کوئی ظلم وستم نہ کیا جائے بلکہ ان کا واقعی حق یا معمول کے مطابق ادا کیا جائے۔

محصنات غیر مسافحات ولا متخذات اخدان

اس نکاح کی ایک اور شرط یہ ہے کہ ایسی کنیزوں کا انتخاب کیا جائے جو منافی عفت و پاک دامنی کوئی حرکت ظاہر بظاہر یا

ڈھکے چھپے یار بنا کر زنا کریں (ولا متخذات اخدان)۔ [1]

ممکن ہے اس موقع پر یہ سوال پیدا ہو کہ "غیر مسافحات" کی تعبیر کے ذریعے زنا سے منع کرنے کے بعد پوشیدہ دوست بنانے (اخدان) سے منع کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس امر کے پیش نظر کہ زمانہ جاہلیت میں بعض لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ صرف کھلے بندوں زنا برا فعل ہے لیکن ڈھکے چھپے یاری لگا کر یہ کارروائی بری نہیں ہے۔ اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن نے ہر دو قسم کی وضاحت کیوں فرمائی ہے۔

فاذا احصن فان اتین بفاحشة فعلیهن نصف ما علی المحصنات من العذاب

اس جملے میں ان احکام کی مناسبت سے جو کنیزوں کے ساتھ شادی کرنے اور ان کے حقوق کی حمایت کے بارے میں بیان ہوئے ہیں ان کی سزا کے بارے میں بھی بحث آگئی ہے اور وہ یہ کہ جب وہ پاکدامنی اور عفت کی راہ سے ہٹیں اور بدکاری کریں تو آزاد عورتوں کی نسبت انہیں آدھی سزا دی جائے یعنی انہیں پچاس کوڑے مارے جائیں۔

دوسرا نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ قرآن فرماتا ہے "اذا احصن" یعنی اگر وہ محصنہ ہوں تو ان کے لیے یہ سزا ہوگی۔

"محصنہ" سے یہاں کیا مراد ہے

مفسرین نے اس کے بارے میں کئی احتمال لکھے ہیں۔ بعض نے مشہور فقہی اصطلاح اور سابقہ آیت کے مطابق شوہر دار عورت کے معنی میں اور بعض نے اسے مسلمان کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ لفظ صرف اس جملے میں دو مرتبہ آیا ہے اس لیے دونوں جگہ ایک ہی معنی میں ہونا چاہیے۔ دوسری طرف سہاگنوں کی سزا سنگساری ہے نہ کہ تازیانے۔ غرض اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ پہلی تفسیر جس میں محصنہ کے معنی شوہر والی عورت بیان کیا گیا ہے قابل قبول نہیں ہے۔ اسی طرح دوسری تفسیر یعنی مسلمان ہونا اس پر بھی کوئی شاہد نہیں ہے۔ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ لفظ محصنات چونکہ قرآن مجید میں زیادہ تر پاک دامن عورتوں کے معنی میں آیا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حق یہ ہے کہ زیر نظر آیت اسی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ یعنی وہ لونڈیاں جو مالکوں کی سختی کے ڈر سے جسم فروشی کرتی تھیں انہیں تو سزا معاف ہے لیکن وہ کنیزیں جو اس جان لیوا سختی سے دوچار نہیں ہیں اور پاکدامنی کی زندگی بسر کر سکتی ہیں اگر وہ منافی عفت کام کریں تو انہیں آزاد عورتوں کی طرح سزا دی جائے گی۔ لیکن ان کی سزا آزاد عورتوں کی نسبت آدھی ہوگی۔

ذلک لمن خشی العنت منکم

عنت (بروزن سند) اصل میں ہڈی کے دوبارہ ٹوٹنے کو کہتے ہیں یعنی ہڈی کا درست ہو کر زخم ملنے کے بعد نئے سرے سے کسی حادثے کی وجہ سے ٹوٹ جانا۔ واضح ہے کہ اس قسم کا ٹوٹنا انتہائی دردناک اور تکلیف دہ ہوتا ہے اسی لیے "عنت" کا لفظ ہر زحمت

---

[1] اخدان خدن کی جمع ہے۔ یہ اصل میں دوست اور ساتھی کے معنی میں ہے۔ لیکن عام طور پر ایسے افراد کے لیے بولا جاتا ہے جو مخالف جنس کے ساتھ پوشیدہ اور ناجائز تعلق رکھتے ہوں۔ یاد رکھیے کہ لفظ خدن قرآن میں مرد اور عورت دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

مشکلوں اور دکھ تکلیف پہنچانے والے کاموں کے لیے استعمال ہوتا ہے قرآن مجید مندرجہ بالا جملے میں فرماتا ہے: کنیزوں کے ساتھ شادی ان لوگوں کے لیے ہے جو جنسی خواہش کی وجہ سے بہت تنگ ہوں اور آزاد عورتوں سے شادی کرنے کی استطاعت بھی نہ رکھتے ہوں لہٰذا اس بنا پر اس قسم کی شادی دوسرے افراد کے لیے جائز نہیں ہے ممکن ہے کہ اس حکم کا فلسفہ یہ ہو کہ اس زمانے میں خصوصاً لونڈیوں کی تربیت بہت اور گئے گزرے حالات میں ایسی ہوتی تھی کہ وہ طبعاً اخلاقی، روحانی اور معاشرتی نقائص میں مبتلا تھیں اور مسلم ہے کہ جو بچے اس شادی سے پیدا ہوتے ان پر ماں کا کچھ نہ کچھ اثر پڑتا۔ اسی بنا پر اسلام نے غلاموں کی آزادی کے لیے ایک زبردست، تدریجی اور عمدہ پروگرام پیش کیا تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے غلام بن کر نہ رہ جائیں نیز ضمنی طور پر غلاموں اور کنیزوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ شادی کر سکیں۔ یقیناً یہ بات اس امر کے منافی نہیں ہے کہ بعض کنیزیں اخلاقی اور تربیتی لحاظ سے مخصوص استثنائی کیفیت رکھتی تھیں۔ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے وہ کنیزوں کی اکثریت کے بارے میں تھا۔ اب اگر ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ بعض بزرگانِ دین کی مائیں کنیزیں تھیں تو استثنائی لحاظ ہی سے متعلق تھیں۔ البتہ یہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ جو کچھ کنیزوں کے بارے میں ہے، ضرورت کے بغیر ممنوع ہے وہ ان سے شادی اور نکاح ہے نہ کہ ملکیت کے اعتبار سے جنسی میل ملاپ۔

وان تصبروا خیر لکم

جہاں تک تمہاری طاقت میں ہو کہ تمہارا دامن گناہ سے آلودہ نہ ہو، اپنے آپ کو کنیزوں کے ساتھ شادی بیاہ سے بچانا فائدہ مند ہے۔

واللہ غفور رحیم

اور خدا ان برے کاموں کو جو تم گزرے ہوئے زمانے میں جہالت اور بے خبری کی وجہ سے کرتے رہے ہو بخشنے والا اور مہربان ہے۔

۲۶۔ يُرِيدُ اللَّهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ○

۲۷۔ وَاللَّهُ يُرِيدُ أَن يَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ أَن تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا ○

۲۸۔ يُرِيدُ اللَّهُ أَن يُخَفِّفَ عَنكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْإِنسَانُ ضَعِيفًا ○

ترجمہ

۲۶ خدا چاہتا ہے (کہ ان احکام کے ذریعے نیکی اور خوش قسمتی کی راہیں) تمہارے لیے واضح کرے اور گزرے ہوئے لوگوں

کے (صحیح) طریقوں اور سنتوں کی طرف تمہاری ہدایت و رہبری کرے اور تمہیں گناہوں سے پاک کرے اور خدا دانا و حکیم ہے۔

۲۷ اور خدا چاہتا ہے کہ تمہیں بخش دے (اور گناہوں سے پاک کر دے) لیکن جو لوگ شہوت کے غلام ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم بالکل منحرف ہو جاؤ۔

۲۸ خدا چاہتا ہے (کنیزوں سے نکاح اور اسی قسم کے دوسرے احکامات کے ذریعے) تمہارے لیے کام کو آسان کر دے اور انسان کمزور پیدا ہوا ہے (اور اپنی فطرت و سرشت کے پیش نظر مثبت جواب دہی کا محتاج ہے)۔

تفسیر

یہ پابندیاں کس بنا پر ہیں

یرید اللہ لیبین لکم و یھدیکم سنن الذین من قبلکم و یتوب علیکم

ان شروط و قیود اور مختلف احکام کے بعد جو گذشتہ آیتوں میں نکاح کے متعلق اشارۃً بیان ہوئے ہیں ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ ان تمام قانونی قید و بند اور حدود کا کیا مقصد ہے کیا یہ بہتر نہ تھا کہ ان امور میں انسان کو کھلی آزادی دے دی جاتی تاکہ جس طرح بعض دنیا پرست ہر ذریعے اور ہر طریقے سے لذت اور فائدہ اٹھاتے ہیں دوسرے لوگ بھی اس سے بہرہ ور ہوتے۔ مندرجہ بالا آیت حقیقت میں ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے بتاتی ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ ان مقررات اور احکام کے ذریعے تمہارے لیے حقائق واضح کرے اور تمہاری رہبری ایسے راستوں کی طرف کرے جن میں تمہارے لیے فائدہ ہی فائدہ ہے اور دیکھو تمہارے لیے ہی یہ پروگرام نہیں ہے بلکہ گذشتہ پاکیزہ قومیں بھی اس قسم کی سنتیں (قواعد و ضوابط) رکھتی تھیں۔ علاوہ ازیں خدا چاہتا ہے کہ تمہیں بخش دے اور اس کی وہ نعمتیں جو تمہاری غلطیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے تم پر بند ہو گئی ہیں دوبارہ تمہیں عنایت فرمائے اور یہ اس صورت میں ہے کہ قبل از اسلام زمانۂ جاہلیت میں نافرمانی کے جو راستے تم نے اختیار کر رکھے تھے ان سے پلٹ آؤ۔

و اللہ علیم حکیم

خدا اپنے احکام کے اسرار و رموز کو جانتا ہے اس نے اپنی حکمت سے تمہارے لیے احکام کو نافذ کیا ہے۔

واللہ یرید ان یتوب علیکم و یرید الذین یتبعون الشھوات ان تمیلوا میلا عظیما

از سر نو تاکید کرتا ہے کہ خداوند عالم ان احکام کے ذریعے یہ چاہتا ہے کہ وہ نعمتیں اور برکتیں جو تمہارے شہوتوں میں آلودہ

ہونے کی وجہ سے تم سے چھن گئی تھیں، ان سے دوبارہ تمہیں نوازے لیکن وہ شہوت پرست جو گناہوں کی موجوں میں غرق ہیں یہ چاہتے ہیں کہ تم نیکی کے راستے سے بالکل منہ موڑ لو اور ان کی طرح سر سے لے کر پاؤں تک گناہوں میں ڈوب جاؤ۔ اب تم خود فیصلہ کرلو کہ وہ پابندیاں جو تمہاری نیکی اور بلندیٔ درجات کے لیے ہیں تمہارے لیے بہتر ہیں یا یہ آزادی اور شتر بے مہار ہونا جس میں شکست تنزل اور بدبختی ہے۔

یہ آیات حقیقت میں ان افراد کو جو ہمارے زمانے میں بھی دینی قوانین خصوصاً جنسی مسائل کے سلسلے میں اعتراضات کرتے ہیں جواب دیتی ہیں کہ ان بے قید و بند آزادیوں کی حقیقت سراب کی سی ہے اور ان کا نتیجہ انسانیت کی تکمیل و ترقی، کامیابی اور خوش بختی کی راہ سے روگردانی، بے راہروی میں گرفتاری اور ہلاکت کے گڑھوں میں گرنے کے مترادف ہے۔ جن کے بہت سے نمونے ہم اپنی آنکھوں سے خاندانوں کی تباہی، مختلف قسم کے جنسی جرائم، ناجائز اولاد، جنسی بیماریوں اور نفسیاتی پریشانیوں کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔

یرید اللّٰہ ان یخفف عنکم وخلق الانسان ضعیفًا

یہ آیت اس نکتے کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ پہلا حکم مقررہ شرطوں کے ماتحت کنیزوں سے نکاح کی آزادی کے بارے میں ایک قسم کی آسانی اور کشادگی کے لیے تھا کیونکہ انسان اصولی طور پر ایک کمزور مخلوق ہے جس پر خواہشات نفسانی شہوانی کے طوفان ہر طرف سے حملہ کرتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ انسان کو ان کے مقابلے کے لیے ایسے جائز شرعی طریقے بتائے جن سے انسان ان خواہشات کی تسکین کا سامان فراہم کر سکے اور اپنے آپ کو غلط راستوں پر چلنے سے محفوظ رکھ سکے۔

۲۹۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ○

۳۰۔ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا ○

ترجمہ

۲۹ اے ایمان والو! ایک دوسرے کے مال باطل (اور ناجائز طریقے) سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ ایسی تجارت ہو جو تمہاری رضامندی سے کی جائے اور خودکشی نہ کرو۔ خدا تم پر مہربان ہے۔

۳۰ اور جو شخص اس کام کو از روئے ظلم کرے تو اُسے ہم بہت جلد آگ میں ڈالیں گے اور یہ کام خداوند عالم کے لیے آسان ہے۔

تفسیر

معاشرے کی سلامتی کا دارومدار اقتصادی سلامتی پر ہے

یا ایھا الذین اٰمنوا لا تأکلوا اموالکم بینکم بالباطل

درحقیقت یہ آیت قوانینِ اسلام کی بنیاد کو مالی معاملات اور مبادلات سے تعلق رکھنے والے مسائل سے مربوط کرتی ہے۔ اسی وجہ سے فقہائے اسلام لین دین اور معاملات کے تمام ابواب میں اسی سے استدلال کرتے ہیں۔ آیت ایماندار لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے: ایک دوسرے کے اموال غلط اور باطل طریقوں سے نہ کھاؤ۔ یعنی دوسروں کے مال میں ہر قسم کا تصرف جو منطقی اور عقلی جواز کے بغیر ہو ممنوع قرار دیا گیا ہے اور ان سب کو ایک لفظ "باطل" کے تحت بیان کر دیا گیا ہے۔ جو ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے ہم جانتے ہیں کہ باطل حق کے مقابلے میں ہے اور وہ ہر اس چیز کو جو بری، بے مقصد اور بے بنیاد ہو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی مندرجہ بالا عبارت کے مشابہ عبارتوں کے ذریعے اس امر کی تاکید کی گئی ہے مثلاً تو یہود کی مذمت اور ان کی بدکرداری کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

واکلھم اموال الناس بالباطل (نساء ۱۶۱)

وہ لوگوں کے مال میں جواز کے بغیر غلط تصرف کرتے تھے۔

اور سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۸ میں ہے:

لا تأکلوا اموالکم بینکم بالباطل

اس میں بھی لوگوں کو بلا وجہ اور بے بنیاد دعووں کے ذریعے مال ہڑپ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

اس بنا پر ہر قسم کی زیادتی، دھوکا، فریب، سودی لین دین اور ایسے معاملے جن کی حدیں مکمل طور سے معین و مقرر نہیں ہیں، ایسی اجناس کی خرید و فروخت جن میں منطقی اور عقلی طور پر فائدہ نہیں ہے اور فساد و گناہ کے وسائل کی خرید و فروخت سب کے سب اسی کلی قانون کے تحت ہیں۔ اگرچہ بہت سی روایتوں میں لفظ باطل کی تفسیر قمار بازی اور سود وغیرہ کی گئی ہے لیکن یہ دراصل ان چیزوں کا تعارف کرایا گیا ہے جو واضح طور پر اس لفظ میں شامل ہیں نہ یہ کہ باطل انہی تک محدود ہے۔ شاید یاد دہانی کی ضرورت رہے کہ "اکل" (کھانا) سے تعبیر کرنا ہر قسم کے تصرف کی طرف اشارہ ہے۔ چاہے وہ معمول کے مطابق کھانے سے ہو یا پہننے اور رہائش وغیرہ سے اور یہی معنی عربی زبان کے علاوہ آجکل کی فارسی میں بھی مکمل طور پر رائج ہے[1]

الا ان تکون تجارۃ عن تراض

یہ جملہ گذشتہ قانونِ کلی کی استثنائی صورت بیان کر رہا ہے لیکن اصطلاحی طور پر استثنائے منقطع ہے[2] یعنی جو کچھ اس جملے

---

[1] اردو میں بھی "کھانا" اسی وسیع معنی میں مستعمل ہے۔ (مترجم)

بقیہ حاشیہ بر صفحۂ آئندہ

میں آیا ہے وہ پہلے قانون میں شروع ہی سے داخل نہ تھا اور صرف ایک تاکید اور یاد دہانی کے طور پر ذکر ہوا ہے اور یہ اپنے مقام پر خود ایک کلی قانون ہے کیونکہ خدا تعالےٰ فرماتا ہے، مگر یہ کہ تمہارا دوسروں کے مالوں میں تصرف عدل و انصاف کے مطابق ہو جو طرفین کی باہمی رضا اور رغبت سے ہو اس لیے اس بیان کے مطابق تمام مالی مبادلات اور لوگوں میں مروج مختلف طرح کی تجارت۔ اگر طرفین کی رضامندی سے ہو اور عقل و منطق کے مطابق ہو تو وہ اسلام میں جائز ہے۔ مگر وہ امور اس میں داخل نہیں ہیں جن سے بربنائے مصلحت صریحاً ممانعت کی گئی ہو۔

ولا تقتلوا انفسکم ان اللہ کان بکم رحیمًا

اس کے بعد آیت کے ذیل میں لوگوں کو قتل نفس سے منع کیا گیا ہے۔ اگر قرآن کا یہ جملہ سامنے رکھا جائے، ان اللہ کان بکم رحیمًا یعنی خداوند عالم تمہاری نسبت زیادہ مہربان ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا جملہ خودکشی سے نہی کے بارے میں ہے۔ یعنی مہربان خدا نہ صرف اس پر راضی نہیں کہ کوئی دوسرا تمہیں قتل کرے بلکہ خود تمہیں بھی یہ اجازت نہیں دیتا کہ تم خود سے اپنے آپ کو موت کے گھاٹ اتار دو۔ روایات اہل بیتؑ میں بھی زیر نظر آیت کا مفہوم خودکشی سے امتناع ہی بیان کیا گیا ہے[1]

اب یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ قتل نفس اور لوگوں کے مال میں باطل و ناحق تصرف میں کیا تعلق ہے؟ اس سوال کا جواب واضح ہے اور حقیقت میں قرآن نے ان دونوں احکام کا ایک دوسرے کے ساتھ ذکر کر کے ایک اہم اجتماعی نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر لوگوں کے مالی مسائل صحیح بنیادوں پر استوار نہ ہوں اور معاشرے کے اقتصادی معاملات خوشگوار طریقے سے آگے نہ بڑھیں اور ایک دوسرے کے اموال میں ناحق تصرف کریں تو سماج ایک قسم کی خودکشی میں گرفتار ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ کہ شخصی خودکشی میں اضافہ ہوگا اجتماعی اور معاشرتی خودکشی بھی اس کے ضمنی اثرات میں سے ہوگی۔ اس سے دور حاضر کے مختلف معاشروں میں آنے والے حوادث و انقلاب اس حقیقت کے شاہد عادل ہیں۔ چونکہ خداوند عالم اپنے بندوں پر مہربان ہے لہٰذا انہیں خطرے سے خبردار کرتا ہے تاکہ وہ ہوشیار اور چوکنے رہیں۔ کہیں غلط قسم کے مبادلاتِ مال اور غیر صحیح اقتصادی نظام ان کے معاشرے کو نیست و نابود کر کے نہ رکھ دے۔

ومن یفعل ذٰلک عدوانًا وظلمًا فسوف نصلیہ نارًا

اور جو شخص اس حکم کو نہ مانے اور لوگوں کا ناحق مال کھا کر گناہگار ہو یا خودکشی کی طرف بڑھے تو نہ صرف یہ کہ وہ اس جہان کی آگ میں جلے گا بلکہ وہ قہر و غضب پروردگار کی آگ میں بھی جلے گا اور یہ کام خدا کے لیے آسان ہے (وکان ذٰلک علی اللہ یسیرا)[2]

بقیہ حاشیہ از صفحہ سابقہ

استثناء منقطع اکثر و بیشتر حکم عام کی حرمت کی تاکید کے لیے آتا ہے اور یہی معنی آیت مندرجہ بالا پر صادق آتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس حقیقت کا بھی پتہ دیتا ہے کہ تصرفاتِ باطل کی حرمت کے باوجود زندگی کی راہیں تمہارے لیے بند نہیں ہیں اور تم جائز تجارت کے ذریعے اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہو۔

[1] تفسیر مجمع البیان آیۂ مذکور کے ذیل میں، اور نور الثقلین جلد اول صفحہ ۴۷۲ پر ملاحظہ فرمایئے۔

[2] صلی (بر وزن سرو) اصل میں آگ کے قریب جانے کے معنی میں ہے۔ تاہم آگ سے گرم ہونے، جھلسنے اور جلنے کو بھی صلی کہتے ہیں زیر بحث آیت میں یہ لفظ آگ میں داخل ہونے اور جلنے کے معنی میں ہے۔

۳۱۔ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا۝

ترجمہ

۳۱۔ اگر تم ان گناہانِ کبیرہ سے جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے بچو گے تو ہم تمہارے چھوٹے موٹے گناہوں کی پردہ پوشی کریں گے اور تمہیں نہایت عمدہ اور اچھی جگہ عنایت فرمائیں گے۔

تفسیر

گناہانِ کبیرہ وصغیرہ

ان تجتنبوا کبائر ماتنھون عنہ نکفر عنکم سیاتکم۔

یہ آیت صراحت کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ اگر تم گناہانِ کبیرہ کو جن کی ممانعت کی جا چکی ہے چھوڑ دو، تو ہم تمہارے "سیئات" کی پردہ پوشی کریں گے اور تمہیں بخش دیں گے اور تمہیں جنت عطا کریں گے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گناہ دو قسم کے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام قرآن نے کبیرہ رکھا ہے اور دوسری قسم کا "سیئۃ" اور سورۂ نجم کی آیت ۳۲ میں سیئۃ کی بجائے "لمم"[1] فرمایا ہے اور سورۂ کہف کی آیت ۴۹ میں کبیرہ کے مقابلے میں صغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ جہاں ارشاد ہوتا ہے:

لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا

یہ اعمال نامہ کسی چھوٹے بڑے گناہ کو نہ بھولے گا اور اسے ضرور شمار کرے گا۔

اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ گناہ کی جانی پہچانی دو قسمیں ہیں کہ جن کو کبھی کبیرہ اور صغیرہ سے اور کبھی کبیرہ اور سیئہ سے اور کبھی کبیرہ اور لمم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ گناہ صغیرہ وکبیرہ کے تعین کے لیے کیا ضابطہ اور میزان ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ دونوں نسبتی امور ہیں یعنی جب دو گناہوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا جائے تو جس کی اہمیت زیادہ ہے وہ کبیرہ ہے اور جس کی کم حیثیت ہے وہ صغیرہ ہے اس لیے ہر گناہ اپنے سے زیادہ بڑے گناہ کی نسبت سے گناہ صغیرہ ہوگا اور اپنے سے چھوٹے گناہ کی نسبت کبیرہ ہوگا[2] لیکن ظاہر ہے کہ یہ معنی کسی طرح بھی زیرِ نظر آیت کے مطابق نہیں، کیونکہ آیت نے

---

[1] لمم (بر وزن قسم) چھوٹے اور کم اہمیت والے کام کو کہتے ہیں۔

[2] طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں اس عقیدے کی نسبت شیعہ علماء کی طرف دی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ ہمارے بہت سے علماء دوسرا نظریہ رکھتے ہیں جس کی ہم آخر تک بحث کریں گے۔

دو گروہوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے اور انہیں ایک دوسرے کے مد مقابل قرار دیا ہے اور ایک سے پرہیز کو دوسرے کی بخشش کا ذریعہ قرار دیا ہے (غور فرمایئے گا)۔

لیکن اگر کبیرہ کے لغوی معنی کو دیکھیں تو ہر وہ گناہ کبیرہ ہوگا جو اسلام کی نظر میں بڑا اور زیادہ اہم ہے اور اس کی اہمیت کی نشانی یہ ہو سکتی ہے کہ قرآن مجید نے صرف اس کی ممانعت پر قناعت نہ کی ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عذاب جہنم کی دھمکی بھی ہو مثلاً قتل زنا، سود خوری وغیرہ۔ اسی لیے روایاتِ اہل بیتؑ میں ہے:

الکبائر التی اوجب اللہ عز وجل علیہا النار

گناہانِ کبیرہ وہ ہیں جن پر خداوند عالم نے آگ کی سزا مقرر فرمائی ہے[1]

اس حدیث کا مضمون حضرت امام باقرؑ حضرت امام جعفر صادقؑ اور امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے منقول ہے۔ گناہان کبیرہ کو سمجھنے اور مذکورہ ضابطے کی روشنی میں انہیں پہچاننے کے بعد کام آسان ہو جاتا ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ روایات میں کبائر کی تعداد سات اور بعض میں بیس؟ اور بعض میں ستر ہے جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں وہ اس کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ اصل میں ان روایات میں سے بعض پہلے درجہ کے گناہانِ کبیرہ کی طرف بعض دوسرے درجہ کے کبائر کی طرف اور بعض سب گناہان کبیرہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

ایک اشکال اور اس کی وضاحت

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ آیت تو گناہانِ صغیرہ کی تشویق دلاتی ہے کیونکہ وہ کہتی ہے: گناہان کبیرہ کو ترک کرنے کے بعد گناہان صغیرہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

اس آیت میں جس تعبیر کا ذکر کیا گیا ہے اس سے اعتراض کا جواب بخوبی واضح ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن فرماتا ہے: نکفر عنکم سیاٰتکم (ہم تمہارے چھوٹے گناہوں کو چھپا دیں گے) یعنی گناہان کبیرہ سے پرہیز کرنا خصوصاً بنیادی مضبوط ہونے کی صورت میں انسان میں تقویٰ ایک ایسی حالت پیدا کر دیتا ہے جو ممکن ہے چھوٹے گناہوں کے اثرات کو اس کے وجود سے دھو ڈالے۔ اصل میں یہ آیت اس آیت کی طرح ہے:

ان الحسنات یذھبن السیئات (ھود، ۱۱۴)

حسنات، سیئات کو ختم کر دیتے ہیں۔

زیرِ نظر آیت میں حقیقی نیک اعمال کے حقیقی آثار کی طرف اشارہ ہے اور یہ بالکل اس طرح سے ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ اگر انسان خطرناک زہریلے مواد سے پرہیز کرے اور اس کی صحت بھی صحیح و سالم ہو تو صحت کی سلامتی کی وجہ سے بعض غیر مناسب غذاؤں کے ناپسندیدہ اثرات ختم ہو سکتے ہیں۔

---

[1] نور الثقلین، جلد ۱، صفحہ ۴۷۲۔

گناہ صغیرہ کس طرح گناہ کبیرہ میں تبدیل ہو جاتا ہے

اس موقع پر ہمیں ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دینی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ گناہ صغیرہ اس صورت میں صغیرہ رہتا ہے جب اس میں تکرار نہ ہو علاوہ ازیں اسے معمولی سمجھتے ہوئے، غرور اور سرکشی کے طور پر نہ کیا جائے کیونکہ قرآن اور اسلامی روایات کے مطابق یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اکثر مواقع پر گناہان صغیرہ، گناہان کبیرہ میں بدل جاتے ہیں مثلاً

۱۔ جب انہیں بار بار کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

لاصغیرۃ مع الاصرار

کوئی گناہ بار بار کرنے سے گناہ صغیرہ نہیں رہتا[1]

۲۔ جب کسی گناہ کو چھوٹا اور معمولی سمجھا جائے۔ چنانچہ نہج البلاغہ میں ہے:

اشد الذنوب ما استهان به صاحبه

سخت ترین گناہ وہ ہے جس کا کرنے والا اُسے چھوٹا سمجھے[2]

۳۔ جب گناہ طغیان، تکبر اور حکم پروردگار کے سامنے سرکشی کے ارادے سے کیا جائے۔ یہ بات مختلف آیتوں سے اجمالی طور پر معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سورۂ النزعت کی آیت ۳۷ میں ہے:

رہے وہ لوگ جو سرکشی اور طغیان کریں، دنیاوی زندگی کو آخرت پر مقدم سمجھیں تو ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

۴۔ وہ گناہ جو ایسے افراد سے سرزد ہوں جو معاشرے میں ایک خاص مقام رکھتے ہوں اور ان کی لغزش دوسروں کے برابر نہ سمجھی جاتی ہو جیسے قرآن سورۂ احزاب میں ازواج پیغمبرؐ کے بارے میں فرماتا ہے:

اگر تم کوئی بُرا کام کرو گی تو اس کی سزا دگنی پاؤ گی۔

اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

من سن سنة سيئة فعليه وزرها ووزر من عمل بها لا ينقص من اوزارهم شيئا

اگر کوئی شخص بری سنت اور طریقے کی بنیاد رکھے تو اس کا گناہ اس پر ہوگا۔ اسی طرح ان تمام لوگوں کا گناہ بھی جو اس پر عمل کریں گے اس کے بغیر کہ ان کے گناہ میں کچھ کمی ہو[3]

۵۔ جب اس گناہ کے کرنے پر خوش ہو اور اس پر فخر کرے۔ جیسا کہ حضرت پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے:

من اذنب ذنبا وهو ضاحك دخل النار وهو باك

---

[1] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۲۸۸۔

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار۔

[3] محجۃ البیضاء جلد ۷، صفحہ ۶۱۔

جو شخص گناہ کرے اور پھر اس پر ہنسے تو وہ روتے ہوئے جہنم کی آگ میں داخل ہوگا۔

۶۔ گناہ کے بعد فوراً سزا نہ ملنے کو رضائے الٰہی کی دلیل سمجھے اور اپنے آپ کو سزا سے محفوظ اور بارگاہ الٰہی میں محبوب قرار دے جیسا کہ قرآن مجید کی سورۂ مجادلہ آیت ۸ میں ہے:

(مغرور گناہگار) اپنی طرف سے کہیں گے کہ خدا ہمیں کیوں سزا نہیں دیتا۔

اس کے بعد قرآن مزید فرماتا ہے:

ان کے لیے دوزخ کی آگ کافی ہے۔

۳۲۔ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝

ترجمہ

۳۲۔ جو فضیلت خدا نے تم میں سے بعض کو بعض پر دی ہے اس کی تمنا اور آرزو نہ کرو۔ (یہ طبعی فرق تمہارے معاشرے کے نظام کی حفاظت کے لیے، حقوق اور عدالت کے عین مطابق ہے۔ لیکن اس کے باوجود مرد اس سے جو کسب و کوشش کرتے ہیں حصہ پا لیتے ہیں اور عورتیں جو کسب اور کوشش کرتی ہیں اس میں سے حصہ حاصل کرتی ہیں۔ کسی کے حقوق پامال نہیں ہونے چاہئیں) اور خدا سے اس کے فضل (اور رحمت و برکت) کا سوال کرتے رہو اور وہ خدا ہر چیز کو جانتا ہے۔

شانِ نزول

مشہور مفسر "طبرسی" مجمع البیان میں نقل کرتے ہیں کہ حضرت ام سلمہ (زوجہ پیغمبرؐ) نے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں عرض کیا:

جب مرد جہاد کے لیے جاتے ہیں تو عورتیں کیوں جہاد نہیں کر سکتیں اور ہمارے لیے آدھی میراث کیوں ہے؟

کاش ہم بھی مرد ہوتیں اور ان کی طرح جہاد پر جاتیں اور معاشرے میں ان کی سی حیثیت رکھتیں۔

اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس کے ذریعے اس سوال اور ایسے ہی دوسرے سوالات کا جواب دیا گیا۔ تفسیر المنار میں ہے کہ جب میراث کی آیت نازل ہوئی اور اس نے مردوں کا حصہ عورتوں سے دوگنا بتایا تو بعض مسلمان مرد کہنے لگے، کاش ہمارا معنوی اجر و ثواب ان کی طرح ہوتا اور بعض عورتوں نے کہا کہ کاش ہماری سزا اور عذاب بھی مردوں کی سزا سے آدھی ہوتی جس طرح ہماری میراث ان کی نسبت آدھی ہے۔

اس پر آیتِ مندرجہ بالا نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا گیا۔ یہی شانِ نزول تفسیر فی ظلال اور روح المعانی میں معمولی سے

فرق کے ساتھ تحریر ہے۔

تفسیر

ولا تتمنوا ما فضل اللہ بعضکم علی بعض .....

جیسا کہ ہم شانِ نزول میں لکھ چکے ہیں مردوں اور عورتوں کی میراث کا فرق کچھ مسلمانوں کے لیے ایک مشکل سوال بن گیا تھا۔ گویا وہ اس بات کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے کہ یہ فرق اس بنا پر ہے کہ امورِ زندگی کا بوجھ زیادہ تر مردوں کے کندھوں پر ہوتا ہے اور عورتوں کو اس سے مستثنیٰ سمجھا جاتا ہے۔ مزید براں عورتوں کے اخراجات بھی مردوں کو اٹھانے پڑتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ عملی طور پر عورتوں کا حصہ مردوں سے دوگنا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے آیت مندرجہ بالا کہتی ہے کہ خداوند عالم نے جو فرق تم میں سے بعض کے لیے دوسروں کی نسبت مقرر کر دیا ہے اس کی آرزو نہ کرو۔ کیونکہ اس فرق میں بہت سے اسرار و رموز چھپے ہوئے ہیں جو تمہاری سمجھ سے بالا ہیں خلقت، آفرینش، جنسیت اور صنفیت کے اعتبار سے اور جسمانی و روحانی صفات کے حوالے سے تم آپس میں اختلافات رکھتے ہو اور یہی تمہارے نظام کی بنیاد ہے۔ تم میں حقوق اور مختلف حیثیتوں کی وجہ سے احکام کا فرق (مثلاً میراث میں) رکھا گیا ہے۔ یہ سب اختلافات اور فرق عدالت و قانونِ الٰہی کے مطابق ہیں۔ اگر اس کے علاوہ کسی اور بات میں مصلحت ہوتی تو خدا ویسا ہی کرتا۔ بنا بریں ان کی تبدیلی کی خواہش واضح سے مشیت ایزدی کی مخالفت ہے جو سراسر حق و عدالت ہے البتہ یہ شک نہیں کرنا چاہیے کہ آیت حقیقی اور طبعی فرق کی طرف اشارہ کرتی ہے نہ کہ اس خود ساختہ تفاوت کی جانب جو طبقاتی استعمار اور استثمار کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ وہ نہ خدا کی مشیت کے مطابق ہے اور نہ کوئی ایسی چیز ہے جس کے بدلنے کے آرزو درست نہ ہو بلکہ وہ ظالمانہ اور غیر منطقی فرق ہے جسے دور کرنے کی کوشش کرنا چاہیے مثلاً عورتیں یہ تمنا اور آرزو نہیں کر سکتیں کہ کاش وہ مرد ہوتیں اور مردوں کو بھی یہ تمنا نہیں کرنا چاہیے کہ کاش وہ عورتیں ہوتے کیونکہ یہ دونوں جنسیں انسانی سوسائٹی کی بنیاد ہیں۔ اس کے باوجود یہ جنسی تفاوت اس بات کا سبب نہیں ہونا چاہیے کہ ان میں سے ایک دوسرے کے حقوق کو پامال کرے۔ وہ لوگ جو اس آیت کو اجتماعی دھڑے بندیوں اور تفرقہ بندی کو جاری رکھنے کے لیے دستاویز سمجھتے ہیں وہ سخت اشتباہ میں ہیں۔

للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن

اس لیے بلا فاصلہ فرماتا ہے، مرد اور عورتوں میں سے ہر ایک اپنی اپنی سعی و کوشش اور حیثیت کے لحاظ سے بہرہ ور ہوتے ہیں چاہے طبعی حیثیت سے ہو (مثلاً مرد اور عورت کی جنس کا ایک دوسرے سے فرق) یا جستجو اور اختیاری کوشش سے ہو۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ لفظ اکتساب جس کے معنی حاصل کرنا ہیں اس کا مفہوم وسیع ہے اور اختیاری کوششوں اور ان چیزوں پر بھی حاوی ہے جنہیں انسان طبعی ساخت کی بنا پر حاصل کرتا ہے۔

واسئلوا اللہ من فضلہ۔

اس کے بعد ارشاد فرماتا ہے۔ کہ اس قسم کے فرق کی تمنا کرنے کی بجائے خداوند عالم کے لطف و کرم کی آرزو کرو۔ تاکہ وہ تمہیں طرح طرح کی نعمتوں بلند توفیقات اور نیک جزاؤں سے نوازے اور ان کے نتیجہ میں تم خوش قسمت اور سعادت مند بن جاؤ۔ تم مرد ہو یا عورت اس خاندان سے ہو یا اس خاندان سے بہر حال وہ چاہو جس میں تمہاری حقیقی بھلائی اور نیک بختی ہو وہ نہ چاہو جس کا تم تصور کرتے ہو۔ شاید من فضلہ کی تعبیر کا اسی طرف اشارہ ہو۔ البتہ واضح ہے کہ خداوند عالم کے فضل و کرم کی خواہش کا یہ مفہوم نہیں کہ انسان ہر چیز کے اسباب و عوامل کے پیچھے پڑ جائے بلکہ اُسے چاہیے کہ وہ خدا تعالےٰ کی رحمت کو ان اسباب کے اندر تلاش کرے جنہیں اس نے مقرر فرمایا ہے۔

ان اللہ کان بکل شیءٍ علیما۔

چونکہ پروردگار ہر چیز کو جانتا ہے کہ اجتماعی نظام کے لیے اختلاف طبی اور حقوق کے پیش نظر کونسا فرق ضروری ہے اور اسی بنا پر اس کے کاموں میں کسی قسم کی بے انصافی، فرقہ بندی اور نامناسب فرق نہیں ہے۔ نیز وہ لوگوں کے باطنی بھیدوں کو بھی جانتا ہے کہ کون سے لوگ اپنے دلوں میں غلط امیدوں کو پروان چڑھاتے رہتے ہیں اور کونسے افراد مثبت اور اصلاحی چیزوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔

یہ تفاوت و اختلاف کیوں ہے؟

بہت سے لوگ دل ہی دل میں سوچتے ہیں کہ بعض افراد کی استعداد زیادہ اور بعض کی کم ہے بعض خوبصورت ہیں اور بعض بدصورت بعض جسمانی طور پر قوی ہیں اور بعض کمزور، تو کیا یہ طبعی فرق و اختلاف پروردگار عالم کی عدالت سے موافقت رکھتے ہیں۔

ہمیں جواب کے سلسلے میں چند نکات کی طرف توجہ دینا چاہیے:

۱۔ بعض فرق جو جسمانی و روحانی طور پر لوگوں کے درمیان ہیں وہ طبقاتی مظالم، اور اجتماعی یا انفرادی آرام طلبی کی وجہ سے ہیں جن کا کارخانہ قدرت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً بہت سے اہل ثروت کی اولاد غریب لوگوں کی اولاد سے جسمانی طور پر قوی اور خوبصورت ہوتی ہے اور وہ استعداد کے لحاظ سے بھی ان سے آگے ہوتی ہے کیونکہ وہ بہتر غذا اور صحت مندانہ ماحول سے بہرہ مند ہوتی ہے۔ جب کہ دوسرے ان سے محروم ہیں یا بعض لوگ ایسے ہیں جو سستی اور آرام طلبی کی وجہ سے جسمانی اور روحانی قویٰ ضائع کر دیتے ہیں۔ غرض اس قسم کے خود ساختہ اختلافات کو بلا دلیل اور بے سبب سمجھنا چاہیے جو طبقاتی نظام کے خاتمے اور اجتماعی عدالت کے عام ہونے پر ختم ہو جائیں گے اور کبھی بھی اسلام اور قرآن نے ایسے تفاوت کو صحیح قرار نہیں دیا۔

۲۔ لیکن بعض طبعی اور پیدائشی فرق انسان کے لیے ضروری ہیں۔ یعنی اگر ایک معاشرہ مکمل طور پر عدالت اجتماعی سے فائدہ اٹھائے اس صورت میں بھی معاشرے کے تمام افراد ایک کارخانہ کی مصنوعات کی طرح ہم شکل، ہم وزن اور ہم کیفیات نہ ہوں گے اور فطری طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے لیکن یہ جاننا چاہیے کہ عام طور پر خداوند عالم کی طرف سے جسمانی اور روحانی نعمتیں اور انسانی صلاحیتیں اس طرح تقسیم ہوتی ہیں کہ ہر شخص کو ان میں سے کچھ حصہ

دیا گیا ہے یعنی ایسے اشخاص بہت کم ملتے ہیں کہ جن میں سب کی سب خوبیاں جمع ہوں۔ ایک شخص جسمانی طاقت رکھتا ہے تو دوسرا علم ریاضی میں ماہر ہے۔ ایک ذوق شاعری رکھتا ہے تو دوسرا تجارت میں مہارت۔ ایک زراعت کی دھن میں ہے تو دوسرا کوئی اور استعداد رکھتا ہے۔ اہم یہ ہے کہ معاشرہ یا لوگ خود اپنی مختلف قابلیتوں اور صلاحیتوں کا ادراک کریں اور انہیں ایک صحت مند اور ماحول میں پروان چڑھائیں تاکہ ہر شخص اپنی قوت و استعداد کو آشکار کر سکے اور اس سے فائدہ اٹھا سکے۔

۴۔ اس امر کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ معاشرہ بھی انسان کے جسم کی طرح مختلف بناوٹوں اعضاء اور مختلف طرح کے خلیوں کا محتاج ہے اگر ایک جسم سارے کا سارا نازک اور باریک رگوں مثلاً آنکھ اور دماغ کی رگوں سے بنا ہوا ہو تو اس کے لیے بقا نہیں ہے اور اگر بدن کی تمام رگیں سخت اور مڑنے کے قابل نہ ہوں بلکہ ہڈیوں کی طرح ہوں تو وہ مختلف فرائض اور ذمہ داریوں کو انجام نہ دے سکیں گی بلکہ طرح طرح کی رگوں کا ہونا ضروری ہے تاکہ کوئی سوچنے کی، کوئی دیکھنے کی، کوئی سننے کی اور کوئی بات کرنے کی ذمہ داری بجا لا سکے۔ اسی طرح ایک مکمل معاشرے کے لیے مختلف قابلیتوں اور مختلف بدنی و فکری صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ لیکن اس طرح نہیں کہ معاشرے کے جسم کے بعض حصے محرومی کی زندگی گزاریں یا ان کی کارکردگی کو معمولی سمجھا جائے اور ان کی تحقیر کی جائے۔ جس طرح بدن کی سب رگیں طرح طرح کے اختلافات کے باوجود غذا، ہوا غرضیکہ تمام ضروریات زندگی سے پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہیں۔ اسی طرح سب انسانوں کو یکساں ہونا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں جہاں کہیں ان میں جسمانی اور باطنی ساخت کا فطری فرق ہے (نہ کہ ظالمانہ و جابرانہ) وہ خداوند عالم کی حکمت کا تقاضا ہے اور عدالت کبھی حکمت سے جدا نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر انسانی جسم کے تمام خلیے (CELLS) ایک ہی قسم کے پیدا کیے جاتے تو یہ حکمت و مصلحت کے خلاف ہوتا اور عدالت بھی اس میں موجود نہ ہوتی کیونکہ عدالت کا مطلب ہے ہر چیز کو اس کے مناسب مقام پر رکھنا۔ اسی طرح اگر معاشرے کے تمام لوگ کسی دن ایک ہی قسم کی سوچ رکھتے ہوں اور سب کی قابلیت و استعداد بھی برابر کی ہو تو اسی ایک دن میں معاشرہ کلی طور پر درہم برہم ہو جائے گا۔ اس لیے مندرجہ بالا آیت میں جو کچھ عورت مرد کی ساخت کے اختلاف اور فرق کے بارے میں آیا ہے وہ حقیقت میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ واضح ہے کہ اگر تمام افراد بشر مرد یا عورت ہوتے تو نسل انسانی جلد ہی ختم ہو جاتی۔ علاوہ ازیں نوع بشر کی جائز لذتوں کا اہم حصہ بھی نیست و نابود ہو جاتا۔ اب اگر کچھ لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بعض کو مرد اور بعض کو عورت کیوں پیدا کیا گیا ہے اور یہ پروردگار عالم کی کونسی عدالت ہے تو ظاہر ہے کہ یہ اعتراض منطقی اور عقلی نہ ہوگا۔ کیونکہ اعتراض کرنے والوں نے اس کی حکمت و مصلحت کے بارے میں غور و فکر نہیں کیا۔

۳۳۔ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۚ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ﴿٣٣﴾

ترجمہ

۳۳ ہم نے ہر شخص کے لیے وارث قرار دیئے ہیں جو ماں باپ اور نزدیکیوں سے ورثہ پاتے ہیں۔ نیز جن لوگوں نے تم سے عہد و پیمان باندھا ہے ان کا حصہ بھی انہیں دے دو خدا ہر چیز پر شاہد و ناظر ہے۔

تفسیر

ولکل جعلنا موالیؑ مما ترك الوالدان والاقربون

یہاں قرآن مسائلِ میراث کی طرف لوٹتا ہے اور فرماتا ہے: ہم نے مرد اور عورت میں سے ہر ایک کے لیے وارث بنائے ہیں جو کچھ ماں باپ اور نزدیکی رشتہ دار چھوڑ جائیں تو وہ خاص طریقے کے مطابق ان میں تقسیم ہوگا۔ حقیقت میں یہ جملہ ان احکام میراث کا خلاصہ ہے جو گذشتہ آیات میں رشتہ داروں اور نزدیکیوں کے بارے میں بیان ہوئے ہیں اور یہ مقدمہ اور تمہید ہے اس حکم کے لیے جس کا بعد میں بیان ہوگا۔

والذین عقدت ایمانکم فاتوهم نصیبهم۔

اس کے بعد مزید ارشاد فرماتا ہے: اور جن لوگوں سے تم نے عہد و پیمان باندھا ہے میراث میں سے ان کا حصہ دے دو۔ یہ جو آیت میں پیمان کو "عقدِ یمین" (دائیں ہاتھ سے گرہ باندھنا) کہا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان عام طور پر کام دائیں ہاتھ سے کرتا ہے اور پیمان بھی ایک قسم کی گرہ لگانا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ ہم عہد و پیمان لوگ جنہیں میراث میں سے حصہ دینا ہے کون ہیں۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد میاں بیوی ہیں کیونکہ انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ ازدواجی تعلقات کا عہد باندھ رکھا ہے لیکن یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ شادی کو عقدِ یمین یا اس طرح کے الفاظ سے قرآن میں بہت کم یاد کیا گیا ہے علاوہ ازیں اس طرح گذشتہ مطالب کا تکرار بھی ہوگا۔ جو کچھ مفہوم آیت سے زیادہ قریب ہے وہ یہ ہے کہ اس سے مراد ضمان جریرہ کا پیمان ہے جو اسلام سے پہلے مروج تھا اور اسلام نے اگر اس کی اصلاح کی ہے چونکہ اس میں اصلاحی پہلو تھا، اس لیے اسے صحیح قرار دیا گیا اور وہ یہ تھا کہ دو شخص ایک دوسرے سے یہ وعدہ کرتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کی برادرانہ طور پر مدد کریں گے مشکلات میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے اور جب ان میں سے کوئی دنیا سے اٹھ گیا تو جو شخص باقی رہ جائے گا وہ اس کی میراث لے گا اسلام نے اس دوستی کے عہد و پیمان کی رسم کو قبول کر لیا لیکن یہ تاکید کی کہ اس قسم کے عہد و پیمان کی میراث اس حالت میں ملے گی جب کہ مرنے والے کے نزدیکی رشتہ داروں کے طبقات میں سے کوئی بھی زندہ نہ ہو۔ اس بات کی مزید تفصیل فقہی کتب کی کتاب

ل موالی مولیٰ کی جمع ہے جو اصل میں ولایت کے مادہ سے ارتباط و اتصال کے معنی میں ہے اور تمام ان افراد پر جو ایک دوسرے سے کسی قسم کا ربط رکھتے ہیں بولا جاتا ہے۔ البتہ بعض مقامات پر سرپرست کے پیروکاروں سے ربط کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس آیت میں وارثوں کے معنی میں ہے۔

میراث میں موجود ہے [1]

ان اللہ کان علی کل شیء شھیدا

اگر تم صاحبانِ میراث کا حصّہ دینے میں کوتاہی کرو گے یا ان کا حق انہیں پورا دے دو گے تو خدا ہر حالت سے آگاہ ہے کیونکہ وہ ہر کام اور ہر چیز کا شاہد و ناظر ہے۔

۳۴۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ○

ترجمہ

۳۴۔ مرد عورتوں کے سرپرست اور خدمت گزار ہیں ان برتریوں کی وجہ سے (جو نظام اجتماعی کے لحاظ سے) خدا تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر دی ہیں ا ور ان اخراجات کی بنا پر جو وہ اپنے مال سے (عورتوں کے لیے) کرتے ہیں اور نیک اور صالح عورتیں وہ ہیں جو متواضع اور منکسر المزاج ہیں اور جو (اپنے شوہر کی) عدم موجودگی میں اس کے اسرار اور حقوق کی حفاظت کرتی ہیں ان حقوق کی وجہ سے جو خدا نے ان کو دیئے ہیں اور باقی رہیں وہ عورتیں جن کی مخالفت اور سرکشی کا تمہیں خوف ہے انہیں وعظ و نصیحت کرو اگر یہ اثر نہ کرے تو ان کے بستر سے دور رہو اور اگر یہ بھی کارگر نہ ہو اور انہیں کوئی راستہ اور طریقہ سختی کے سوا اپنی ذمہ داریوں پر آمادہ نہ کرے تو پھر انہیں خبردار کرو۔ اب اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو ان پر سختی اور زیادتی نہ کرو (اور جان لو) کہ خدا بلند مرتبہ اور بزرگ ہے (اور اس کی قدرت بالاترین ہے)۔

---

[1] ضمانِ جریرہ یہ ہے عاقدتک علی ان تنصرنی وانصرک وتعقل عنی واعقل عنک وترثنی وارثک فیقول الآخر قبلت میں تجھ سے عہد و پیمان باندھتا ہوں کہ تم میری مدد کرنا میں تمہاری مدد کروں گا تاوان اور دیت ادا کرنے میں تمہاری مدد کروں گا تم میری امداد کرنا اور تم میری میراث لینا اور میں تمہاری میراث لوں گا اس کے بعد دوسرا کہتا ہے میں نے قبول کیا۔

تفسیر

گھریلو نظام میں سرپرستی

الرجال قوامون علی النساء۔

"مرد عورتوں کے سرپرست اور خدمت گزار ہیں"۔ اس جملے کی وضاحت کے لیے توجہ رہے کہ گھر ایک چھوٹا سا معاشرہ ہے اور بڑے معاشرے کی طرح اس کا بھی کوئی رہبر اور سرپرست ہونا چاہیے۔ کیونکہ اگر مرد اور عورت دونوں مل کر سرپرستی اور رہبری کریں تو یہ بے معنی ہے۔ اس لیے مرد یا عورت میں سے کوئی ایک گھر کا رئیس اور سردار ہونا چاہیے اور دوسرا اس کا مددگار اور اس کی نگرانی میں ہو۔ قرآن یہاں وضاحت کرتا ہے کہ سرپرستی کا مقام مرد کو دیا جائے۔ اس کا مقصد ظلم و ستم نہیں ہے بلکہ ایک منظم رہبری ہے جس میں ذمہ داریوں اور مشوروں کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔ آج کی دنیا میں یہ مسئلہ ہر زمانے سے واضح تر ہے کہ اگر ایک جماعت چاہے وہ دو افراد کی ہو کسی کام پر لگا دی جائے تو ضروری ہے کہ ان میں سے ایک شخص سربراہ ہو اور دوسرا مددگار ورنہ وہ کام مکمل نہ ہوگا۔

گھر میں مرد کی سرپرستی بھی اسی قسم کی ہے۔ یہ حیثیت ان خصوصیات کی وجہ سے ہے جو مرد میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً اس کا قوت فکر کو جذبات و احساسات پر ترجیح دینا، بخلاف عورت کے جو زیادہ تر محبت اور خواہش کی قوت سے سرشار اور بہرہ مند ہوتی ہے۔ دوسرے مرد جسمانی طور پر زیادہ قوی اور مضبوط ہوتا ہے اس لیے وہ قوت فکر سے زیادہ کام لیتا ہے اور منصوبہ بندی کرتا ہے اور قوت جسمانی کے ذریعے اپنے گھر کا دفاع کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اپنی بیوی اور اولاد کے لیے اسباب زندگی کی ذمہ داری، حق مہر کی ادائیگی، بیوی اور اولاد کی ناموس کی حفاظت اسے یہ حق دیتی ہیں کہ سرپرستی کا مرتبہ بھی اسی کو ملے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ کچھ عورتیں مندرجہ بالا صفات میں اپنے شوہروں سے بڑھ چڑھ کر ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قانون کی نظر ایک یا چند افراد پر نہیں ہوتی بلکہ وہ نوع اور عمومیت کو دیکھتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کلی طور پر مرد عورتوں کی نسبت ان کاموں کے لیے زیادہ اہل ہیں۔ اگر عورتیں بھی کچھ ذمہ داریاں سنبھال لیں تو اس سے مرد کی اہمیت کی نفی نہیں ہو سکتی۔

بما فضل اللہ بعضھم علی بعض وبما انفقوا من اموالھم۔

یہ جملہ بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ پہلے حصہ میں فرماتا ہے، یہ سرپرستی اس تفاوت اور اختلاف کی وجہ سے ہے جو خداوند عالم نے مقصد تخلیق اور نوع بشر کی مصلحت کے لحاظ سے ان میں رکھا ہے اور آخری حصہ میں فرماتا ہے، نیز یہ سرپرستی ان فرائض کی وجہ سے ہے جو افراد خانہ کی مالی ضرورت کی انجام دہی کے لیے مرد کے ذمہ ہیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ ان ذمہ داریوں کا مردوں کے سپرد ہونا نہ ان کی شخصیت کی بلندی کی دلیل ہے اور نہ ہی آخرت کے امتیاز کی کیونکہ وہ تو تقویٰ اور پرہیزگاری پر منحصر ہے۔ جیسے ممکن ہے کہ کسی معاون کی شخصیت مختلف پہلوؤں سے اپنے سربراہ کی نسبت زیادہ ہو لیکن سربراہ اس کام کی سرپرستی کے لیے زیادہ موزوں ہو۔

فالصالحات قانتات حافظات للغیب

یہاں مزید فرماتا ہے کہ عورتیں ان ذمہ داریوں کے لحاظ سے جو ایک خاندان کی ان کے سپرد ہیں دو قسم کی ہیں پہلی قسم صالح اور نیک عورتوں کی ہے اور وہ ایسی ہیں جو گھریلو نظام میں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے والی ہیں۔ وہ نہ صرف شوہر کے ہوتے ہوئے بلکہ اس کی عدم موجودگی میں بھی عزت و ناموس کے حوالے سے اور مال کے لحاظ سے خیانت نہیں کرتیں اور شوہر کی غیر حاضری میں بھی اس کی شخصیت اور خاندانی اسرار و رموز کی حفاظت کرتی ہیں اور ان حقوق کے بدلے میں جو خدا نے ان کے لیے مقرر کیے ہیں وہ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دیتی ہیں۔ خداوند عالم نے بما حفظ اللہ فرما کر اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ واضح ہے کہ مردوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس قسم کی عورتوں کے ساتھ انتہائی احترام اور حق شناسی سے پیش آئیں۔

نافرمان عورتیں

دوسری قسم کی عورتیں وہ ہیں جو اپنے فرائض سے روگردانی کرتی ہیں اور ان میں ناموافقت کا مظاہرہ کرتی ہیں ایسی عورتوں کے بارے میں مردوں کے کچھ فرض اور ذمہ داریاں ہیں کہ جنہیں مرحلہ بر مرحلہ یکے بعد دیگرے انجام دینا چاہیے اور ہر صورت میں یہ توجہ رکھیں کہ وہ کسی صورت میں عدالت کی حدود سے باہر نہ نکلنے پائیں۔ یہ ذمہ داریاں مندرجہ ذیل آیت میں ترتیب سے بیان کی گئی ہیں۔

واللاتی تخافون نشوزھن[1] فعظوھن

پہلا مرحلہ ان عورتوں کے بارے میں ہے کہ جو سرکشی اور دشمنی کا مظاہرہ کریں، قرآن مندرجہ بالا آیت میں ارشاد فرماتا ہے: وہ عورتیں جن کی بغاوت اور سرکشی کا تمہیں خوف ہے، انہیں وعظ و نصیحت کرو۔ جو گھریلو نظام کی چاردیواری سے پاؤں باہر نکالتی ہیں پہلے انہیں مشفقانہ نصیحتیں کی جانا چاہئیں اور ایسے کاموں کے بُرے نتائج بیان کر کے راہ راست پر لانے کی کوشش کی جانا چاہیے اور انہیں ان کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی جانا چاہیے۔

واھجروھن فی المضاجع

اگر تمہاری نصیحتیں اور ہدایتیں ان پر کوئی اثر نہ کریں تو ان کے بستر سے دور رہو۔ اس بے توجہی اور لاپرواہی سے جسے اصطلاح میں بائیکاٹ کہتے ہیں ان کے برتاؤ کے خلاف اپنی ناراضگی ظاہر کرو۔ شاید یہی ہلکی سی تنبیہ ان پر اثر کرے۔

واضربوھن

اب اگر ان کی سرکشی اور فرائض سے بے توجہی حد سے بڑھ جائے اور اس طرح قانون شکنی پر تُلی رہیں اور سختی سے قدم آگے بڑھاتی رہیں، نہ ان پر پند و نصائح اثر کریں اور نہ بستر سے دوری اور بے توجہی۔ سوائے عملی سختی کے کوئی راستہ باقی نہ رہے اور انہیں ذمہ داریوں کی ادائیگی پر آمادہ کرنے کے لیے عملی شدت کے سوا کوئی چارہ نہ رہے، تو یہاں اجازت دی گئی ہے کہ بدنی سرزنش کے ذریعے انہیں ان کے فرائض انجام دینے پر آمادہ کیا جائے۔

---

[1] "نشوز" "نشز" (بروزن نذر) اونچی زمین کے معنی میں ہے۔ یہاں سرکشی اور طغیان کی طرف اشارہ ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

ممکن ہے اس موقع پر یہ اعتراض کیا جائے کہ اسلام نے مردوں کو کیسے اجازت دی کہ وہ عورتوں کو بدنی سزا دیں۔ اس اعتراض
کا جواب آیت کے معنی اور ان روایات کو جو اس سلسلے میں ہیں اور وہ وضاحت جو کتب فقہ میں آئی ہے نیز اسی طرح ان توضیحات
کو جو آجکل کے ماہرین نفسیات بیان کرتے ہیں، مدنظر رکھتے ہوئے کچھ مشکل نہیں ہے۔
پہلی بات تو یہ ہے کہ آیت نے بدنی سزا کا مسئلہ ان کے بارے میں جائز قرار دیا ہے جو اپنی ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتے
لیکن یہ اس وقت ہے جب کوئی اور ذریعہ کارگر نہ ہو۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہ کوئی ایسی نئی بات نہیں جو صرف اسلام ہی میں
ہو۔ دنیا کے تمام قوانین میں جب صلح کے ذریعے افراد کو ان کی ذمہ داری محسوس نہ کرائی جاسکے تو سختی اور شدت اختیار کرنا پڑتی
ہے نہ صرف مار پیٹ کے ذریعے بلکہ بعض موقعوں پر تو اس سے بھی زیادہ سخت سزا دی جاتی ہے جو قتل کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔
دوسرے یہ کہ بدنی سزا جیسا کہ کتب فقہ میں ہے خفیف ہونا چاہیے۔ جس سے ہڈی ٹوٹنے، بدن کے زخمی ہونے اور ورم
آنے کا اندیشہ نہ ہو۔
تیسرے یہ کہ آجکل کے ماہرین نفسیات کا نظریہ ہے کہ کچھ عورتیں آزار طلب ہوتی ہیں جب کبھی ان کی یہ حالت شدت
اختیار کرے تو انہیں سکون و آرام پہنچانے کا واحد علاج مختصر سی بدنی سزا ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ ایسے افراد کو پیش نظر رکھا
گیا ہو جن کے لیے خفیف سی بدنی سزا باعث تسکین ہے یہ ایک نفسیاتی علاج ہے۔
یہ مسلم ہے کہ اگر گذشتہ مراحل میں سے کوئی اثر کرے اور عورت اپنی ذمہ داری انجام دینے لگے تو مرد کو کوئی حق نہیں پہنچتا
کہ وہ بہانہ بازی کرکے عورت کو تکلیف پہنچائے۔ اس لیے اس جملے کے بعد فرماتا ہے:

فان اطعنکم فلا تبغوا علیھن سبیلا

یعنی۔ اگر وہ اطاعت کریں تو پھر ان پر ظلم و ستم نہ کرو۔
اب اگر یہ کہا جائے کہ اس قسم کی سرکشی طغیان اور زیادتی مرد بھی تو کر سکتے ہیں تو کیا مردوں کو بھی اسی قسم کی سزا دی جائے
گی تو ہم کہیں گے کہ جی ہاں مرد بھی بالکل عورتوں کی طرح اپنے فرائض ادا نہ کرنے کی صورت میں اسی قسم کی سزا کے مستحق ہوں گے
یہاں تک کہ انہیں بدنی سزا بھی دی جائے گی۔ البتہ کیونکہ یہ کام عورتوں کی ذمہ داری سے خارج ہے اس لیے حاکم شرع پر فرض
ہے کہ وہ خلاف ورزی کرنے والے مردوں کو مختلف طریقوں سے یہاں تک کہ بدنی سزا کے ذریعے انہیں ان کی ذمہ داری بتائے
اس شخص کی داستان مشہور ہے جس نے اپنی بے قصور بیوی پر زیادتی کی تھی اور کسی طرح اپنی غلطی ماننے کے لیے تیار نہ
ہوتا تھا۔ حضرت علیؑ نے اسے عملاً تنبیہ کی بلکہ تلوار سے ڈرا دھمکا کر اسے اپنی زیادتی ماننے پر آمادہ کر لیا۔

ان اللہ کان علیا کبیرا

آیت کے آخر میں مردوں کو دوبارہ خبردار کیا گیا ہے کہ وہ خاندان کے سرپرست ہونے کی حیثیت سے غلط فائدہ نہ
اٹھائیں اور خدا کی قدرت کو جو تمام قدرتوں سے بالاتر ہے اپنے تصور میں رکھیں (کیونکہ خدا بلند مرتبہ اور بہت ہی بڑا ہے)۔

۳۵۔ وَاِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَیۡنِهِمَا فَابۡعَثُوۡا حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا ۚ اِنۡ يُّرِيۡدَاۤ اِصۡلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيۡنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا خَبِيۡرًا ○

ترجمہ

۳۵ اور اگر تمہیں ان کے درمیان علیٰحدگی کا خوف ہو تو ایک نمائندہ شوہر کے خاندان سے اور ایک نمائندہ بیوی کے خاندان سے چن لو (تاکہ وہ یہ معاملہ حل کریں)۔ اب اگر یہ دونوں فیصلہ کرنے والے اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں تو خداوند عالم ان کی توفیق میں اضافہ فرمائے گا۔ کیونکہ وہ دانا اور خبردار ہے اور سب کی نیتوں کو بخوبی جانتا ہے۔

تفسیر

خاندان کی مصالحتی عدالت

وان خفتم شقاق بینهما......

خداوند عالم اس آیت میں میاں بیوی کے درمیان اختلاف و نزع ہونے کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے اگر میاں بیوی میں ناچاقی اور جدائی کی نشانیاں پیدا ہو جائیں تو ناچاقی کی وجوہات کو سمجھنے اور صلح و آشتی کے لیے ایک فیصلہ کرنے والا مرد کے خاندان سے اور دوسرا عورت کے خاندان سے چنو۔ اس کے بعد فرماتا ہے ان یریدا اصلاحا یوفق اللہ بینهما۔ اب اگر یہ دونوں فیصلہ کرنے والے نیک نیتی اور ہمدردی کے ساتھ یہ معاملے کریں گے اور ان کا مقصد دونوں میاں بیوی میں صلح کرانا ہو گا تو خدا مدد کرے گا، ان کے ذریعے میاں بیوی کے درمیان الفت پیدا کر دے گا اور حکمین کو تنبیہ کرنے کے لیے تاکہ وہ نیک نیتی سے کام کریں اس آیت کے آخر میں فرماتا ہے: خدا ان کی نیت سے خوب آگاہ ہے (ان اللہ کان علیما خبیرا)۔

خاندان کی مصالحتی عدالت جس کی طرف آیت میں اشارہ ہوا ہے اسلام کا ایک شاہکار ہے۔ اس عدالت کی کچھ ایسی خصوصیات ہیں جن سے باقی محکمے عاری ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

۱ خاندان کا ماحول احساس و محبت کا مرکز ہوتا ہے۔ فطری طور پر جو طریق کار اس ماحول میں اختیار کیا جائے وہ دوسری فضاؤں سے مختلف ہونا چاہیے یعنی جس طرح عام جرائم کی عدالتوں میں محبت، ہمدردی اور مہربانی کے ساتھ کام نہیں چل سکتا، اسی طرح خاندانی ماحول میں خشک قانون بے روح رواج اور دستور سے گزارہ نہیں ہوتا۔ یہاں جہاں تک ہو سکے اختلافات کو محبت اور مہربانی کے طریقے سے حل کرنا چاہیے۔ اس لیے خداوند عالم حکم دیتا ہے کہ اس محکمہ

کے بیچ ایسے لوگ ہوں جو دونوں میاں بیوی کے رشتہ دار ہوں تاکہ وہ میاں بیوی کے احساسات محبت و مہربانی کو متحرک کر سکیں۔ واضح ہے کہ یہ خصوصیت صرف ایسی عدالت میں ہی ہو سکتی ہے باقی عدالتیں اس سے عاری ہیں۔

۲۔ عام عدالتوں میں طرفین دعویٰ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے دفاع کے لیے ہر قسم کے اسرار و رموز جو وہ جانتے ہیں فاش کریں۔ یہ بات مانی ہوئی ہے کہ اگر میاں بیوی بیگانوں کے سامنے اپنے ازدواجی راز فاش کریں تو ایک دوسرے کے جذبات ایسے مجروح کریں گے کہ اگر عدالت کے مجبور کرنے پر اپنے گھر واپس بھی آجائیں پھر بھی پہلا سا خلوص و محبت ان میں باقی نہ رہے گا اور ایک طرح کی ایسی بیگانگت پیدا ہو جائے گی جس میں مجبوراً اپنے فرائض اور ذمہ داریاں نبھانی پڑیں۔ اصولی طور پر تجربہ یہ بتاتا ہے کہ جو میاں بیوی ایک مرتبہ اس قسم کی عدالتوں میں چلے جاتے ہیں وہ پھر پہلے جیسے میاں بیوی نہیں رہتے۔ لیکن خاندان کی مصالحتی عدالت میں اول تو اس قسم کی شرمناک باتیں شرماحضوری نہیں کہی جاتیں۔ ان کا ذکر آبھی جائے تو کیونکہ رشتہ دار اور محرم افراد سامنے ہوتے ہیں اس لیے اتنے برے اثرات کا اندیشہ نہیں ہوتا۔

۳۔ عام عدالتوں کے جج اختلافات کے بڑھنے کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ معاملہ چاہے کوئی صورت کیوں نہ اختیار کرے ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان کی بلا سے میاں بیوی گھر لوٹ جائیں یا ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں لیکن خاندانی مصالحتی عدالت میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ اس عدالت کے جج میاں بیوی کے نزدیکی رشتہ دار ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میاں بیوی کی مصالحت اور جدائی کا ان ججوں کی زندگی پر دلی رجحانات اور ان سے پیدا ہونے والے سوالات کی جواب دہی کے لحاظ سے گہرا اثر پڑتا ہے۔ اسی لیے وہ پوری پوری کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح ان دونوں میں مصالحت اور خلوص و محبت برقرار رہے اور وہ شیر و شکر ہو جائیں۔

۴۔ ان سب سے قطع نظر یہ مصالحتی عدالت کسی قسم کی مشکلات، کم تو ڑ اور کثیر اخراجات اور عام عدالتوں کی سی پریشانیوں اور الجھنوں میں نہیں ڈالتی اور فریقین کو چکر پر چکر لگوائے بغیر تھوڑی سی مدت میں مقصد تک پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔ واضح ہے کہ دونوں خاندانوں میں حکمین تجربہ کار، مدبر اور باخبر چننے چاہئیں۔ جو خصوصیات ہم نے گنوائی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عدالت میں میاں بیوی کی مصالحت کا موقع دوسری عدالتوں کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔

اور فقہ اسلامی میں مسئلہ حکمین کی شرطیں ان کے حکم اور فیصلہ کا اجرا اور دائرہ کار وغیرہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے یہ بھی ہے کہ دونوں فیصلہ کرنے والے بالغ، عاقل، عادل اور اپنے کام میں دانا و بینا ہوں۔ باقی رہا ان کے فیصلہ کا میاں بیوی کے حق میں اجرا، تو بعض فقہا ان کا حکم جو بھی ہو اس کی تعمیل لازمی قرار دیتے ہیں اور اس آیت میں "حکم" کا ظاہری مفہوم بھی اس کی تصدیق کرتا ہے کیونکہ حکمیت اور داوری کا مفہوم حکم کا اجرا ہے۔ لیکن بہت سے فقہا نے حکمین کے نظریہ کو صرف میاں بیوی میں صلح صفائی اور رفع اختلافات کی صورت میں قابل قبول قرار دیا ہے۔ بلکہ ان کا نظریہ یہ ہے کہ اگر حکمین بیوی یا شوہر پر کچھ شرطیں لگا دیں تو ان کی پابندی بھی ضروری ہے۔ البتہ جدائی اور علیحدگی کی صورت میں ان کا حکم نافذ نہ ہوگا اور آیت کا ظاہری مفہوم جو اصلاح کے مسئلے کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ اس نظریہ کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے کتب فقہ ملاحظہ فرمائیے۔

۳۶۔ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ

ترجمہ

۳۶۔ اور خدا کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور ماں باپ سے نیکی کرو۔ (اسی طرح) رشتہ داروں، یتیموں مسکینوں، نزدیکی اور دور کے پڑوسیوں، ساتھیوں اور خرچ نہ رکھنے والے مسافروں کے ساتھ اور ان غلاموں سے جن کے تم مالک ہو نیکی کرو۔ کیونکہ خداوند عالم اس شخص کو جو متکبر اور گھمنڈ کرنے والا ہو (اور دوسروں کا حق ادا نہ کرے) دوست نہیں رکھتا۔

تفسیر

خداوند عالم مندرجہ بالا آیت میں حقوق اسلامی کے ایک اور سلسلے کو بیان کرتا ہے ان میں خدا کے حقوق، بندوں کے حقوق یا لوگوں سے معاشرت کے آداب شامل ہیں۔ مجموعی طور پر اس آیت سے دس احکامات اور قاعدوں کا پتہ چلتا ہے۔

۱۔ واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا

قرآن سب سے پہلے لوگوں کو خدا کی عبادت کرنے اور شرک و بت پرستی ترک کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ جو تمام اسلامی احکامات کی جڑ ہے۔ توحید باری کی دعوت روح کو پاک، نیت کو خالص، ارادہ کو قوی اور ہر مفید منصوبہ انجام دینے کا ارادہ مضبوط کرتی ہے۔ چونکہ یہ آیت اسلامی حقوق کا ایک سلسلہ بیان کر رہی ہے تو سب سے پہلے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے تاکید کرتی ہے کہ خدا کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔

۲۔ وبالوالدین احسانا

اس کے بعد ماں باپ کے حق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نصیحت کرتی ہے کہ ان کے ساتھ نیکی کرو۔ ماں باپ کا حق ایسے مسائل میں سے ہے جن کا قرآن میں اکثر ذکر کیا گیا ہے۔ شاید ہی کوئی امر ایسا ہو جس کی اس قدر تاکید کی گئی ہو۔ یہ بات قرآن میں چار مقامات پر توحید کے ذکر کے فوراً بعد آئی ہے[1]

---

[1] بقرہ ۸۳، انعام ۱۵۱، اسرا ۲۳ اور زیر نظر آیت۔

اس بار بار کے تذکرہ سے یہ اہم نکتہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی رابطہ اور واسطہ ہے درحقیقت ایسا ہی ہے۔ کیونکہ سب سے بڑی نعمت تو زندگی کی نعمت ہے جو اللہ کی طرف سے پہلے درجہ میں ہے اور بعد کی منازل میں ماں باپ سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ اولاد ماں باپ کے وجود کا ایک حصہ ہے۔ اسی لیے ماں باپ کے حقوق کو چھوڑ دینا خدا وند عالم کے شرک کے برابر ہے۔ ماں باپ کے حقوق کے بارے میں مفصل بحث ہے جو انشاء اللہ تعالیٰ سورۂ اسراء اور سورۂ لقمان کی متعلقہ آیات کے ذیل میں آئے گی۔

۳۔ وبذی القربیٰ

اس کے بعد تمام رشتہ داروں سے نیکی کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہ بھی ایسے مسائل میں سے ہے جن کے متعلق بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ کبھی صلہ رحم کے عنوان سے اور کبھی ان سے نیکی اور احسان کے ذیل میں۔ حقیقت میں اسلام یہ چاہتا ہے کہ نوع انسانی کے وسیع رشتے میں کچھ زیادہ مضبوط رشتے استوار کرے یہ رشتے چھوٹی چھوٹی اکائیوں اور زیادہ ترہم شکل اکائیوں میں موجود ہیں جنہیں عرف عام میں کنبہ اور خاندان کہتے ہیں یہ اس لیے ہے تاکہ مشکلات اور حادثات میں وہ ایک دوسرے کی مدد کریں اور اپنے حقوق کی حفاظت کریں۔

۴۔ والیتامیٰ

اس کے بعد اہل ایمان کو یتیموں کے حقوق کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ان کے حق میں نیکی کرنے کی وصیت کی گئی ہے کیونکہ ہر معاشرے میں طرح طرح کے حادثات کے نتیجے میں ہمیشہ بچے یتیم ہوتے رہتے ہیں۔ جنہیں نظر انداز کر دینا صرف انہیں خطرے میں ڈالنا نہیں ہے بلکہ معاشرے کو بھی خطرے سے دوچار کرتا ہے۔ کیونکہ اگر یتیم بچوں کی سرپرستی نہ کی جائے اور ان سے خاطر خواہ ہمدردی اور محبت کا سلوک نہ کیا جائے تو وہ بے ہودہ خطرناک اور چور ڈاکو بن سکتے ہیں۔ بنابریں یتیموں کے ساتھ نیکی معاشرے کے اپنے حق میں ہے۔

۵۔ والمساکین

اس کے بعد ضرورت مندوں کے حقوق کی یاد دہانی کروائی گئی ہے۔ کیونکہ ایک صحت مند عادلانہ معاشرہ میں بھی لاچار محتاج لوگ ہو سکتے ہیں جنہیں نظر انداز کر دینا تمام انسانی اصولوں کے خلاف ہے اور اگر اجتماعی اصول عدالت سے انحراف کی وجہ سے صحیح سالم لوگ فقر و فاقہ اور محرومیت میں مبتلا ہو جائیں، پھر بھی ایسے معاشرے کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔

۶۔ والجار ذی القربیٰ

اس کے بعد نزدیک کے ہمسایوں کے ساتھ نیکی کرنے کی وصیت کی گئی ہے۔ اس کے متعلق کہ نزدیک کے ہمسائے کون ہیں مفسرین نے مختلف احتمالات پیش کیے ہیں۔ بعض نے اس کے یہ معنی لیے ہیں کہ جو ہمسائے رشتہ دار بھی ہوں۔ لیکن یہ تفسیر اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ آیت میں رشتہ داروں کے حقوق کی طرف الگ سے اشارہ ہو چکا ہے، بعید دکھائی دیتی ہے۔ بلکہ مراد وہی مکان کی نزدیکی ہے کیونکہ جو ہمسائے زیادہ قریب ہیں ان کے حقوق اور احترام زیادہ ہے یا وہ ہمسائے مراد ہیں جو دین و مذہب کے لحاظ سے زیادہ قریب ہوں۔

۷۔ والجار الجنب

اس کے بعد دور کے پڑوسیوں کی سفارش کی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم تحریر کر چکے ہیں اس سے مکان کی دوری مراد ہے کیونکہ کئی ایک روایتوں کے مطابق چاروں طرف کے چالیس گھر پڑوسی گنے اور سمجھے جاتے ہیں[1] اس طرح تمام شہر چھوٹے چھوٹے شہروں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر ایک شخص کے گھر کو دائرے کا ایسا مرکز فرض کریں جس کا نصف قطر ہر طرف سے چالیس گھروں پر محیط ہو تو ایسے دائرے کی پیمائش ایک معمولی سے حساب سے واضح ہو جاتی ہے تقریباً پانچ ہزار مکانات اس حصے میں آئیں گے، یہ ظاہر ہے اور تسلیم شدہ ہے کہ ایک چھوٹے شہر میں اس سے زیادہ گھر نہیں ہوتے۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت قرآنی میں نزدیک کے ہمسایوں کے ذکر کے علاوہ دور کے ہمسایوں کے حق کی بھی تاکید اور وضاحت کی گئی ہے کیونکہ لفظ ہمسایہ کا ایک تو محدود مفہوم ہے جو صرف نزدیک کے پڑوسیوں کے لیے بولا جاتا ہے سب اسلامی نظریہ کے مطابق اس مفہوم کو پھیلانے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ دور کے ہمسایوں کا نام بھی صراحت کے ساتھ لیا جائے یہ بھی ممکن ہے کہ دور کے ہمسایوں سے مراد غیر مسلم ہوں۔ کیونکہ ہمسائیگی اسلام میں مسلمان پڑوسیوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس مفہوم میں غیر مسلم بھی شامل ہیں مگر وہ جو مسلمانوں سے برسر پیکار نہ ہوں وہی اس میں آتے ہیں۔

اسلام میں حق ہمسائیگی اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ حضرت امیرالمومنین علیؑ کی مشہور وصیتوں میں ہے:

ما زال رسول اللہ یوصی بھم حتی ظننا انہ سیورثھم؛

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے بارے میں اس قدر سفارش فرمائی کہ ہمیں یہ گمان ہونے لگا کہ شاید آپ یہ حکم فرمائیں کہ ہمسائے ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔

یہ حدیث اہل سنت کی مشہور کتب میں بھی ہے چنانچہ تفسیر المنار اور تفسیر قرطبی میں بخاری سے یہی مضمون نقل کیا گیا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے ایک دن تین مرتبہ فرمایا:

واللہ لا یؤمن ۔۔۔۔

ایسا شخص ایماندار نہیں ہے۔

کسی نے پوچھا کونسا شخص تو حضورؐ نے فرمایا:

الذی لا یأمن جارہ بوائقہ

جس کا ہمسایہ اس سے تکلیف میں ہو[2]

ایک اور حدیث میں حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

من کان یؤمن باللہ والیوم الاٰخر فلیحسن الی جارہ۔

جو شخص خدا اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اُسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی کے ساتھ نیکی کرے[3]

---

[1] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۴۸۰۔

[2] تفسیر قرطبی جلد سوم صفحہ ۱۷۵۴۔

[3] المنار جلد پنجم صفحہ ۹۲ طبع بیروت۔

اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

حسن الجوار یعمر الدیار و یزید فی الاعمار۔

ہمسائیوں کا ایک دوسرے سے نیکی کرنا گھروں کو آباد کرتا ہے اور عمریں بڑھاتا ہے۔[1]

اس سائنسی اور مشینی دور میں پڑوسی ایک دوسرے کے عام حالات بھی نہیں جانتے بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو ہمسائے ایک دوسرے کے ساتھ بیس بیس سال رہنے کے باوجود ایک دوسرے کا نام بھی نہیں جانتے۔ یہ عظیم اسلامی حکم ایک خاص روشنی کا حامل ہے۔ اسلام انسانی معاشرے میں بہت زیادہ تعاون اور ہمدردی کا قائل ہے جب کہ مادی ترقی کے اس دور میں ہمدردی اور تعاون کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے اور بے اعتنائی و بے رحمی بڑھتی جارہی ہے۔

۸۔ والصاحب بالجنب

اس کے بعد ان لوگوں کو جو انصاف کا دم بھرتے ہیں، وصیت کرتا ہے۔ لیکن غور کرنا چاہیے کہ صاحب بالجنب کے معنی دوست اور رفیق سے زیادہ وسیع ہیں اور حقیقت میں یہ ہر اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی طرح ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہو چاہے پرانا دوست ہو یا تھوڑی دیر کا رفیق مثلاً وہ شخص جو سفر کرتے ہوئے انسان کا دوست بن جائے۔ بعض روایات میں ہے کہ "صاحب بالجنب" سے مراد رفیق سفر (رفیقک فی السفر) ہے یا وہ شخص ہے جو نفع کی امید میں کسی کے ساتھ ہو (المنقطع الیک یرجو نفعک) اس سے مراد ان کی تخصیص نہیں ہے بلکہ یہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور ایسے تمام لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ بنا بریں یہ آیت ایک جامع اور کلی حکم کی حامل ہے اور یہ ایسے سب افراد سے حسن سلوک کرنے کے لیے ہے جن سے انسان کا سابقہ پڑتا ہے۔ چاہے وہ سچ مچ دوست ہوں، رفیق کار ہوں، ہم سفر ہوں، اس کے پاس آنے جانے والے ہوں، شاگرد ہوں، مشورہ لینے والے ہوں یا خدمت گزار ہوں۔ کچھ روایات میں صاحب بالجنب کی تفسیر بیوی سے کی گئی ہے چنانچہ المنار، روح المعانی اور قرطبی کے مؤلفین آیت کے ذیل میں حضرت علیؑ سے یہی معنی نقل کرتے ہیں لیکن کچھ بعید نہیں ہے کہ اس کا مقصد آیت کے ایک مصداق کا تذکرہ ہو۔

۹۔ وابن السبیل

یہاں ایک اور گروہ کے بارے میں سفارش کی گئی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو باوجودیکہ اپنے وطن اور شہر میں صاحب حیثیت اور کھاتے پیتے ہوں لیکن عالم سفر میں، اجنبی شہر میں کسی وجہ سے محتاج ہو جائیں اور "ابن سبیل" کی عمدہ تفسیر (راستے کا بیٹا) بھی اسی وجہ سے ہے کہ ہم ان سے کسی قسم کی جان پہچان نہیں رکھتے کہ انہیں کسی قبیلے، کنبے یا شخص سے نسبت دے سکیں صرف اس حکم کی بنا پر کہ وہ حاجت مند مسافر ہیں انہیں مدد کا مستحق قرار دیں۔

۱۰۔ وما ملکت ایمانکم

آخری مرحلے میں غلاموں سے نیکی کرنے کی وصیت کی گئی ہے اور حقیقت میں آیت خدا کے حق سے شروع ہوتی ہے اور

---

[1] تفسیر صافی صفحہ ۱۲۰

غلاموں کے حقوق پر ختم ہوتی ہے کیونکہ یہ حقوق ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ صرف یہی آیت نہیں ہے جس میں غلاموں کے متعلق وصیت کی گئی ہے بلکہ دوسری آیتوں میں بھی اس سلسلے میں بحث کی گئی ہے۔ اسلام نے ضمنی طور پر غلاموں کی تدریجی آزادی کے لیے ایک اچھا پروگرام مرتب کیا ہے جو ان کی مطلق آزادی پر جاکر ختم ہوتا ہے۔ انشاء اللہ ہم اس سلسلے میں متعلقہ آیتوں کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے۔

ان الله لا یحب من کان مختالا فخورًا

خداوندعالم آیت کے آخر میں اس جملے کے ساتھ "خدا تکبر کرنے والے اور گھمنڈ کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا" خبردار کر رہا ہے کہ جو شخص خدا کے حکم سے روگردانی کرے اور تکبر کی وجہ سے رشتہ داروں، ماں باپ، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور دوستوں کے حقوق کا خیال نہ رکھے۔ وہ محبوب خدا اور بندۂ خدا نہیں ہو سکتا اور جو لطف و کرم الٰہی کا مستحق نہ ہو وہ ہر خیر و برکت خوش قسمتی اور نیکی سے محروم ہے۔ اس معنی کی گواہی وہ روایت دیتی ہے جو اس آیت کے ذیل میں بیان کی گئی ہے جو یہ ہے:

ایک صحابی رسولؐ کہتے ہیں میں نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اسی آیت کی تلاوت کی تو حضورؐ نے تکبر کی برائیاں اور اس کے نتائج اتنے بیان فرمائے کہ میں رونے لگا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: کیوں رو رہے ہو؟ میں نے عرض کیا: میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میرا لباس عمدہ اور خوبصورت ہو تو اب مجھے ڈر ہے کہ اس عمل کی وجہ سے میں تکبر کرنے والوں کی صف میں شامل نہ ہو جاؤں۔ فرمایا: نہیں تو اہل جنت میں سے ہے اور یہ تکبر کی علامت نہیں ہے، تکبر یہ ہے کہ انسان حق کے مقابلے میں عاجزی اور انکساری سے کام نہ لے، اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے بلند تر سمجھے اور ان کی تحقیر کرے (اور ان کے حقوق کی ادائیگی سے روگردانی کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت کے آخری جملے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شرک اور لوگوں کے حقوق کی پامالی غرور و تکبر کا سرچشمہ ہیں۔ مندرجہ بالا حقوق اور خصوصاً غلاموں، یتیموں اور محتاجوں کے حقوق کی ادائیگی کے لیے انتہائی تواضع اور عاجزی کی ضرورت ہے۔

۳۷۔ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۗ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا ۝

---

[1] یاد رکھیے کہ مختال مادۂ خیال سے اس معنی میں ہے کہ کوئی شخص بعض خیالات کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھے۔ گھوڑے کو اس وجہ سے "خیل" کہا جاتا ہے کہ وہ دوڑتے ہوئے متکبروں کی طرح قدم اٹھاتا ہے اور "فخور" "فخر" کے مادے سے اس شخص کے معنی میں ہے جو فخر اور گھمنڈ کرتا ہو۔ اسی بنا پر یہاں ان دونوں لفظوں میں یہ فرق ہے کہ ایک کے معنی ایسے تکبر کے ہیں جن میں ذہن گھمنڈ سے بھرا ہوا ہو اور دوسرے کے معنی خارجی تکبر کے ہیں، یعنی اعمال و کردار سے تکبر کا اظہار۔

۳۸۔ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ○

۳۹۔ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ○

ترجمہ

۳۷ وہ ایسے لوگ ہیں جو بخل کرتے ہیں۔ اور لوگوں کو بھی بخل کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور جو کچھ خداوند عالم نے اپنے فضل و کرم سے انہیں دیا ہے اُسے چھپاتے ہیں (حقیقت میں ان کے اس عمل کا سرچشمہ کفر ہے) اور ہم نے کافروں کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

۳۸ وہ ایسے لوگ ہیں۔ جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور خدا اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے (کیونکہ شیطان ان کا دوست اور ساتھی ہے) اور جس کا ساتھی شیطان ہو اس نے برا ساتھی چنا ہوا ہے۔

۳۹ کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لے آتے اور خداوند عالم نے جو روزی انہیں عطا فرمائی ہے (اس میں سے اس کی راہ میں) خرچ کرتے اور خدا تعالیٰ ان سے آگاہ ہے (اور انہیں پوری سزا دے گا)۔

تفسیر

دکھلاوا اور رضائے الٰہی

یہ آیت حقیقت میں گذشتہ آیتوں کا ضمیمہ ہے جو متکبر اور بندۂ ہوا و ہوس افراد کی طرف اشارہ کر رہی ہے وہ ایسے گھٹیا لوگ ہیں جو نہ صرف لوگوں سے نیکی میں بخل کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی بخل پر ابھارتے ہیں (الذین یبخلون و یأمرون الناس بالبخل) علاوہ ازیں وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ خداوند عالم نے جو کچھ انہیں مرحمت فرمایا ہے اسے چھپا کر رکھیں (ویکتمون ما اٰتاھم اللہ من فضلہ) اس کے بعد ان کے انجام اور نتیجہ کو اس طرح بیان فرماتا ہے کہ ہم نے کافروں کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے (واعتدنا للکٰفرین عذابًا مھینًا)۔

شاید اس تعبیر کا راز یہ ہو کہ بخل کا سرچشمہ زیادہ تر کفر ہی ہوتا ہے کیونکہ بخیل لوگ حقیقت میں خداوندعالم کی لامحدود نعمتوں
اور اس کے نیک لوگوں سے کیے ہوئے وعدوں پر ایمانِ کامل نہیں رکھتے اور وہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر وہ دوسروں کی مدد کریں گے تو
فقیر بن جائیں گے اور یہ جو فرمایا ہے کہ ان کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب ہے، تو یہ اس لیے ہے تاکہ وہ تکبر اور گھمنڈ کی سزا
کو اپنے کیے کا سبب سمجھیں۔

ضمنی طور پر سوچنا چاہیے کہ بخل صرف مالی امور تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ خداوندعالم کی ہر قسم کی نعمت کو روکنے کے معنی بھی
اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو مالی لحاظ سے بخل نہیں کرتے لیکن علم و دانش اور اسی قسم کے دوسرے
مسائل میں بخیل ہیں۔ دوسری آیت میں ریا کاری کرنے والے متکبروں کی ایک اور صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

والذین ینفقون اموالھم رئاء الناس ولا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الاخر ۔۔۔۔۔۔

وہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر خرچ کرتے بھی ہیں تو لوگوں کو دکھانے اور شہرت کے لیے اور ان کا مقصد خدمت خلق اور رضائے
خالق نہیں ہے اسی لیے تو خرچ کے وقت لینے والے کے مستحق ہونے کی پابندی نہیں ہے۔ بلکہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ کس
طرح خرچ کریں جس سے خود انہیں زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے اور وہ اپنی حیثیت کو ثابت کر سکیں۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ اور
قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اس لیے ان کی سخاوت میں روحانی جذبہ نہیں ہے بلکہ ان کا جذبہ نام و نمود اور جھوٹا وقار ہے جو تکبر
اور خودغرضی کی نشانیوں میں سے ہے۔

ومن یکن الشیطان لہ قرینا فساء قرینا۔

انہوں نے شیطان کو اپنا ساتھی بنایا ہے اور جو ایسا کرے اس نے اپنے لیے بہت برا ساتھی چنا ہے اور اس کی تقدیر
اس سے بہتر نہیں ہوگی کیونکہ ان کی منطق اور پروگرام شیطان کی منطق اور پروگرام ہی ہے۔ وہی ہے جو ان سے کہتا ہے کہ خلوص کے
ساتھ خرچ کرنا فقر و فاقہ کا سبب ہے جیسا کہ قرآن میں ہے:

الشیطان یعدکم الفقر (بقرہ - ۲۶۸)

اب اس وجہ سے یا تو وہ خرچ ہی نہیں کرتے اور بخل سے کام لیتے ہیں (جیسا کہ گذشتہ آیت میں اشارہ کیا گیا ہے) اور یا اگر
خرچ کریں تو ایسی جگہوں پر کرتے ہیں جہاں سے انہیں ذاتی فائدہ پہنچے (جیسا کہ اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے) اس آیت سے ضمنی
طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک برا ساتھی انسان کی تقدیر کو تباہ و برباد کر سکتا ہے یہاں تک کہ وہ اسے پستی کے آخری درجے تک
پہنچا دیتا ہے۔ نیز اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ تکبر کرنے والوں کا شیطان سے مستقل تعلق ہے نہ کہ وقتی۔ کیونکہ انہوں نے شیطان
کو دوست اور ساتھی بنا رکھا ہے۔

وما ذا علیھم لو امنوا باللہ والیوم الاخر وانفقوا مما رزقھم اللہ ۔۔۔۔۔

یہاں اس گروہ کی حالت پر اظہار افسوس کے طور پر فرماتا ہے کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ اس بے راہروی سے باز آ جاتے اور
خدا اور روز جزا پر ایمان لے آتے اور ان نعمتوں میں سے جو خدا تعالیٰ نے ان کے اختیار میں دی ہیں نیک نیتی کے ساتھ اس کے

بندوں کو دیتے اور اس طرح اپنے لیے دنیا اور آخرت کی سعادت حاصل کرتے۔ اب وہ کیوں اپنے طریق کار پر نظر ثانی نہیں کرتے باوجود اس کے کہ یہ راستہ زیادہ صاف، روشن تر اور مفید ترین ہے اور جو راستہ انہوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ سوائے نقصان اور بدبختی کے کسی نتیجہ پر نہیں پہنچاتا۔

وکان اللہ بھم علیمًا

ہر حالت میں خداوند عالم ان کی نیتوں اور اعمال سے باخبر ہے اور اس کے مطابق انہیں جزا یا سزا دیتا ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ گذشتہ آیت جس میں ریاکارانہ مصارف کے متعلق گفتگو تھی وہاں مال کی نسبت خرچ کرنے والا کی طرف دی گئی تھی اور آیت میں مما رزقھم اللہ کی نسبت ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تعبیر کا فرق تین نکات کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔

پہلا یہ کہ دکھلاوے کے اخراجات میں مال کے حلال و حرام ہونے کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ حالانکہ جو مال خدا تعالےٰ کی راہ میں خرچ کیا جاتا ہے۔ اس کا حلال ہونا اور "مما رزقھم اللہ" کا مصداق ہونا ضروری ہے۔

دوسرا یہ کہ جو کچھ دکھلاوے کے لیے خرچ ہوتا ہے وہاں خرچ کرنے والے افراد چونکہ مال کا تعلق اپنی ذات سے سمجھتے ہیں تو وہ تکبر کرنے اور احسان جتانے سے گریز نہیں کرتے حالانکہ جو مال خدا کے لیے خرچ ہو وہاں چونکہ توجہ اس بات کی طرف ہوتی ہے کہ یہ مال خدا نے انہیں دیا ہے۔ اب اگر اس کا کچھ حصہ اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو احسان جتانے کا مقام نہیں۔ اس لیے ہر قسم کے تکبر اور احسان سے پرہیز کرتے ہیں۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ دکھلاوے کے خرچ کا تعلق زیادہ تر مال سے ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسے لوگ روحانی اور معنوی سرمایہ سے بے بہرہ ہوتے ہیں پھر اس میں سے خرچ کیسے کریں۔ لیکن جو خدا تعالےٰ کے لیے خرچ کیا جاتا ہے اس کا دامن وسیع ہے۔ وہ تمام مادی، روحانی اور باطنی نعمات کو چاہے ان کا تعلق مال، علم، اجتماعی وجاہت اور حیثیت ہی سے کیوں نہ ہو محیط ہے۔

۴۰۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

ترجمہ

۴۰۔ خداوند عالم کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور اگر نیک کام ہو تو اُسے کئی گنا کر دیتا ہے (اور اس کے بدلے) اجر عظیم دیتا ہے۔

تفسیر

ذرّہ کیا چیز ہے

ذرّہ اصل میں بہت ہی چھوٹی چیونٹی کو کہتے ہیں جو بڑی مشکل سے دکھائی دیتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں غبار

کے بہت چھوٹے چھوٹے اجزا (کے معنی میں ہے) جو فضا میں معلق ہیں اور تاریک جگہوں کے اندر سورج کی روشنی میں چھوٹے چھوٹے سوراخوں اور روشن دانوں سے ظاہر ہوتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر انسان اپنا ہاتھ مٹی یا اسی قسم کی چیز پر رکھ دے اور پھر اپنے ہاتھ پر پھونک مارے تو جو مٹی کے اجزا فضا میں بکھر جائیں گے ان میں سے ہر ایک کو ذرہ کہتے ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ ہر چھوٹی چیز کو ذرہ کہنے لگے اور آجکل ایٹم کو بھی جو جسم کا کم سے کم جزو ہے ذرہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر گذشتہ زمانے میں انہیں غبار کے ذرے کہتے تھے تو اس کی بھی یہی وجہ تھی کہ وہ جسم کے بہت ہی چھوٹے چھوٹے اجزا سمجھے جاتے تھے۔ لیکن آج کی دنیا میں ثابت ہو چکا ہے کہ ایک "جسم مرکب" کے چھوٹے سے چھوٹے اجزا سالمے (MOLECULES) اور جسم بسیط کے سب سے چھوٹے اجزا ایٹم (ATOMS) ہیں۔ جو سالموں سے بہت ہی چھوٹے ہیں علمی اصطلاح میں ایٹم اسے کہتے ہیں جو نہ صرف آنکھوں سے نہ دیکھا جا سکتا ہو بلکہ قوی ترین برقی مائیکروسکوپ سے بھی قابل دید نہیں ہے یہ صرف علمی فارمولوں اور مخصوص فوٹوگرافیوں کے ذریعے دیکھے جاتے ہیں جو بہت ہی چھوٹی چیزوں کو دیکھنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔

مثقال کے معنی وزن اور بھاری پن کے ہیں۔ تو "مثقال ذرہ" سے مراد جسم کا ایک چھوٹے سے چھوٹا سلم اور محسوس ذرہ ہے اور بوجھ کے معنی میں ہے۔ آیت مندرجہ بالا کہتی ہے کہ خدا ذرہ بھر وزن کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اور نہ صرف یہ کہ ظلم نہیں کرتا بلکہ اگر نیک کام انجام پائے تو اُسے کئی گنا کر دیتا ہے۔ اور اپنی طرف سے اس کے بدلے میں اجر عظیم بھی دیتا ہے۔ یہ آیت حقیقت میں بے ایمان اور بخیل افراد سے جن کی حالت گذشتہ آیات میں بیان ہو چکی ہے کہتی ہے کہ یہ سزائیں جو تمہیں مل رہی ہیں یہ تو تمہارے اعمال کا نتیجہ ہیں لیکن خدا کی طرف سے تم پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہو گا اور اس کے برعکس اگر تم بخل و کفر کی بجائے خدا کی راہ اختیار کر لیتے تو کئی گنا اجر عظیم کے مستحق قرار پاتے۔

ضمناً توجہ رہے کہ "ضعف" "یضاعف" کے معنی لغت عرب میں اس چیز کے ہیں جس کے برابر یا اس سے چند گنا بڑھا یا جائے۔ اس لیے زیر نظر آیت اور دوسری آیتوں میں جو یہ ہے کہ خدا کے راستے میں خرچ کرنے والوں کی جزا کبھی دس گنی ہوتی ہے کبھی سات سو گنی یا اس سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے اس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں بلکہ ہر صورت میں بندوں پر خدا کا لطف و کرم ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ان کے گناہوں کی سزا گناہوں کی مقدار سے زیادہ نہیں دیتا لیکن ان کی نیکیوں کی جزا نیکیوں کی مقدار سے کئی گنا زیادہ دیتا ہے۔

باقی رہی اس بات کی دلیل کہ خدا ظلم کیوں نہیں کرتا تو وہ واضح ہے کیونکہ ظلم و ستم یا تو جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے یا ضرورت نفسانی کمزوریوں اور نقائص کے سبب سے اب جو ذات تمام چیزوں اور سب لوگوں کے متعلق علم رکھتی ہے اور سب سے بے نیاز ہے اور کسی قسم کی کمی اور نقص اس کی ذات اقدس میں نہیں ہے، اس کے لیے ظلم کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے یہ نہیں کہ وہ ظلم نہیں کر سکتا اور نہ یہ کہ اس کے بارے میں ظلم و ستم کا تصور نہیں کیا جا سکتا (جیسا کہ گروہ اشاعرہ کا خیال ہے) بلکہ وہ باوجود قدرت کے، علیم و حکیم ہونے کی بنا پر ظلم نہیں کرتا، ہر چیز کو اس وسیع و عریض دنیا میں اپنی جگہ برقرار رکھتا ہے اور ہر شخص کے ساتھ اس کی لیاقت اور اس کے اعمال و کردار کے مطابق سلوک کرتا ہے۔

۴۱۔ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ

شَهِيدًا ۝

۴۲۔ يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا ۝

ترجمہ

۴۱۔ اس دن ان کی کیا حالت ہوگی۔ جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ ان کے اعمال پر لائیں گے اور تجھے ان کا گواہ بنا کر لائیں گے۔

۴۲۔ اس دن وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے اور پیغمبر کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے یہ تمنا کریں گے کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ (وہ مٹی ہوتے اور) ان کی خاک زمین کی سطح سے مل ہوتی (اور وہ بالکل محو اور خاموش ہو جاتے اور اس دن (سب گواہوں کے ہوتے ہوئے) خدا سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔

تفسیر

فكيف اذا جئنا من كل امة بشهيد

گذشتہ آیتوں کے بعد جو بُروں اور نیکوں کی سزا و جزا کے بارے میں تھیں یہ آیات روز قیامت کے گواہوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں پہلی آیت میں ہے: اس دن ان لوگوں کی کیا حالت ہوگی جب ہم ہر امت کے لیے ان کے اعمال کا گواہ لے آئیں گے اور تمہیں ان کا گواہ مقرر کریں گے۔ اسی طرح جسم انسانی کے اعضاء کی گواہی کا اس زمین کی گواہی جس پر وہ رہتے تھے اور اس کے اعمال پر خدا کے فرشتوں کی گواہی کے علاوہ ہر پیغمبر بھی اپنی امت کے اعمال پر گواہ ہوگا۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو سب سے آخری اور سب سے عظیم پیغمبر خدا ہیں اپنی امت کے اعمال پر گواہ ہوں گے۔ بُرے لوگ ان سب گواہوں کے ہوتے ہوئے کس طرح حقیقت کا انکار کر سکیں گے اور کیسے اپنے تئیں اپنے اعمال کی سزا سے بچا سکیں گے۔ اسی قسم کا مضمون کلام مجید کی چند دوسری آیتوں میں بھی ہے مثلاً بقرہ ۱۴۳، نحل ۸۹ اور حج ۷۸۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اپنی امت کے اعمال کے متعلق پیغمبروں کی گواہی کس قسم کی ہوگی۔ اگر لفظ هؤلاء کا اشارہ مسلمانوں کی طرف ہو جیسا کہ تفسیر مجمع البیان میں تحریر ہے تو اس سوال کا جواب واضح ہو جائے گا۔ چونکہ ہر نبی جب تک اپنی امت کے درمیان رہے تو ان کے اعمال دیکھتا ہے اور اس کے بعد اس کے معصوم جانشین ان کے اعمال پر گواہ و ناظر ہوتے ہیں۔ اسی لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ قیامت کے دن خداوند عالم کے سوال کے جواب

میں عرض کریں گے۔

ماقلت لهم الا ما امرتنى به ان اعبدوا الله ربى وربكم وكنت عليهم شهيداً مادمت فيهم فلما توفيتنى كنت انت الرقيب عليهم وانت على كل شئ شهيد (المائدہ، ۱۱۷)

اے پالنے والے! تونے مجھے جو حکم دیا ہے میں نے انہیں اس کے سوا کچھ نہیں کہا، میں نے ان سے کہا کہ اس خدا کی جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے عبادت کرو اور جب تک میں ان کے درمیان تھا ان کے اعمال کا گواہ تھا لیکن جب سے تونے مجھے ان کے درمیان سے اٹھا لیا تو توہی ان پر نگران تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔

لیکن مفسرین کی ایک جماعت نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ لفظ "هؤلاء" گذشتہ امتوں کے گواہوں کی طرف اشارہ ہے یعنی اے رسول (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) ہم تجھے تمام گواہوں اور گذشتہ انبیاء پر گواہ قرار دیں گے اور کئی ایک روایات میں بھی اس تفسیر کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے[1]

اس بنا پر آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا کہ ہر پیغمبر حیات و وفات ہر صورت میں باطنی اور روحانی مشاہدے کے ذریعے اپنی تمام امت کے حالات کا شاہد ہوگا اور حضورؐ کی روح اقدس بھی اسی طریقے سے تمام گذشتہ امتوں اور اپنی امت کے حالات کو دیکھنے والی اور ان کے اعمال پر گواہ ہے یہاں تک کہ ممکن ہے امت کے صلحاء اور پرہیزگاری میں اعلیٰ مقام کے حامل افراد بھی اس قسم کی استعداد رکھتے ہوں۔ اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ حضرت پیغمبر اسلام کی روح اقدس خلقت حضرت آدمؑ سے پہلے موجود تھی کیونکہ شہود کے معنی آگاہی اور موجود ہونے کے ہیں لیکن یہ تفسیر اس آیت کے ساتھ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نقل کی گئی ہے کوئی زیادہ مناسبت نہیں رکھتی کیونکہ وہ اپنی امت پر تاحیات گواہ تھے (غور فرمائیے گا)[2]

اگر شہادت کو عملی شہادت کے معنی میں لیں یعنی نمونہ کے ایک فرد کے اعمال جو باقی لوگوں کے اعمال جانچنے کی میزان اور پیمانہ ہیں تو اس صورت میں مندرجہ بالا تفسیر میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا یعنی ہر پیغمبر اپنی مخصوص صفتوں کی بنا پر اپنی امت کے اعمال کی جانچ کے لیے میزان و مقیاس ہے اور امت کے اچھے برے لوگوں کو ان کے ساتھ مشابہت رکھنے یا نہ رکھنے سے پہچانا جا سکتا ہے اور چونکہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے نبیوں میں سے بزرگ ترین ہستی ہیں اس لیے حضورؐ کے اعمال و صفات تمام نبیوں کے درجات جانچنے کے لیے معیار ہوں گے۔ اب صرف یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا شہادت اسی معنی میں آئی ہے کہ نہیں لیکن اس طرف توجہ کرنے سے کہ نمونے کے انسانوں کے افکار و اعمال بھی عملی طور پر گواہی دیتے ہیں کہ ایک انسان کے لیے ممکن ہے کہ وہ اس حد تک روحانی اور باطنی درجات حاصل کرے تو یہ معنی بعید دکھائی نہیں دیتے۔ (غور فرمائیے گا)۔

يومئذ يود الذين كفروا وعصوا الرسول ۔۔۔۔۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین، تفسیر برہان آیہ مذکورہ کے ذیل میں۔

[2] اس آیت سے حضرت عیسیٰؑ کا کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک الگ مفہوم رکھتی ہے۔ (مترجم)

جس وقت کافر اور خداوند عالم کے بھیجے ہوئے نبیوں کے مقابلے میں کھڑے ہونے والے لوگ اس عدالت الٰہی میں ناقابل انکار شہود اور گواہ دیکھیں گے تو وہ اپنے کیے پر اتنے پشیمان ہوں گے کہ وہ تمنا کریں گے کہ کاش وہ خاک ہوتے اور زمین کی مٹی کے برابر ہو جاتے۔ قرآن مجید فرماتا ہے لو تسوی بھم الارض۔ سورہ نباء کے آخر میں بھی اس طرح ہے:

ویقول الکافر یالیتنی کنت ترابا

اس وقت کافر کہے گا اے کاش میں خاک ہوتا۔

لیکن " تسوی " کی تعبیر ایک اور مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ یہ کہ اس کے علاوہ کہ کافر یہ آرزو کریں گے کہ وہ خاک ہو جائیں، یہ بھی چاہیں گے کہ ان کی خاک اور قبریں بھی زمین میں دب جائیں اور اس پاس کی زمینوں کے برابر ہو جائیں تاکہ وہ بالکل محو ہو جائیں۔[1] گروہ اس موقع پر کسی حقیقت کو نہ چھپا سکیں گے (ولا یکتمون اللہ حدیثا)۔ کیونکہ اس شہود اور گواہوں کی موجودگی میں حقائق کو چھپا نہ سکیں گے۔ البتہ یہ گفتگو ان دوسری آیات کے منافی نہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ بعض کافر قیامت کے دن بھی حقائق چھپائیں گے اور جھوٹ بولیں گے[1] کیونکہ ان کا جھوٹ شہود اور گواہوں سے پہلے ہوگا لیکن اس کے بعد جب انکار کی کوئی گنجائش نہ رہے گی تو وہ تمام حقائق کا اقرار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

حضرت امیر المومنینؑ نے ایک خطبہ میں فرمایا:

خدا قیامت کے دن کچھ لوگوں کے لبوں پر مہر خاموشی ثبت کر دے گا تاکہ وہ بات نہ کر سکیں۔ تو ایسے میں ان کے ہاتھ بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے اور جسم کی کھال اپنے اعمال بیان کرے گی۔ غرض اس وقت کوئی شخص حقیقت کا انکار نہ کر سکے گا۔[2]

بعض مفسرین نے اس کے یہ معنی بھی لکھے ہیں کہ لا یکتمون اللہ حدیثا سے مراد یہ ہے کہ وہ تمنا کریں گے کہ اے کاش جب وہ دنیا میں تھے تو پیغمبر اسلام کے بارے میں حقائق کو نہ چھپاتے۔ اس بنا پر یہ مذکورہ جملہ " لو تسوی بھم الارض " پر عطف ہوگا۔ لیکن یہ تفسیر لا یکتمون کے ظہور کے ساتھ جو فعل مضارع ہے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ اگر یہ معنی مراد ہوتے تو پھر یوں کہا جاتا: " ولم یکتموا "۔

۴۳۔ یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ

---

[1] سورۂ انعام کی آیت ۲۳ اور ۲۴ اور سورۂ مجادلہ کی آیت ۱۸۔

[2] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۴۸۲ منقول از تفسیر عیاشی۔

الْغَآئِطِ اَوْلٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ○

ترجمہ

۴۳۔ اے ایمان والو جب تم نشے میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ جب تک تم یہ نہ سمجھ سکو کہ تم کیا کہہ رہے ہو اور اسی طرح جب تم جنابت کی حالت میں ہو جب تک غسل نہ کرو مگر یہ کہ عالم مسافرت میں ہو، اب اگر تم بیمار یا مسافر ہو یا قضائے حاجت کی ہے اور یا عورتوں سے مباشرت کی ہے اور اس حالت میں تمہیں (وضو یا غسل کے لیے) پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کرو۔ اس طرح سے کہ اپنے چہروں اور ہاتھوں کا اس سے مسح کرو خدا بخشنے والا اور مغفرت کرنے والا ہے۔

تفسیر

چند فقہی احکام

مذکورہ بالا آیت سے چند اسلامی احکام معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ نشے کی حالت میں نماز کی حرمت یعنی جو لوگ مست ہوں وہ نماز ادا نہیں کر سکتے اور ان کی نماز اس حالت میں باطل ہے۔ اس کا فلسفہ بھی واضح ہے کیونکہ نماز بندے کی خدا کے ساتھ گفتگو اور راز و نیاز ہے۔ اسے انتہائی توجہ اور ہوش مندی کے ساتھ انجام پانا چاہیے اور مست لوگ اس منزل سے دور اور بے خبر ہوتے ہیں (یا ایها الذین اٰمنوا لا تقربوا الصلوٰة و انتم سکاریٰ حتیٰ تعلموا ما تقولون)۔

ممکن ہے اس موقع پر کچھ لوگ یہ سوال کریں کہ کیا آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ مشروبات الکحل کا پینا صرف اس صورت میں حرام ہے جبکہ اس کی مستی نماز کی حالت تک باقی رہے اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ باقی حالات میں ان کا پینا جائز ہے۔ اس سوال کا مفصل جواب تو انشاء اللہ سورۂ مائدہ کی آیت ۹۰ کی تفسیر میں آئے گا۔ البتہ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اسلام اپنے بہت سے احکامات کو عملی صورت دینے میں تدریجی طریقہ اختیار کرتا ہے مثلاً یہی مشروبات الکحل کا مسئلہ چند مرحلوں میں آیا ہے۔ پہلے پہل اس کا پینا ناپسندیدہ اور رزقاً حسناً (نحل ۶۷) کے برعکس قرار دیا گیا بعد ازیں نشہ کی حالت میں نماز سے منع فرمایا۔ اس کے بعد اس کے نفع اور نقصان کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا ہے اور یہ ثابت کیا کہ اس کے نقصانات فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں پھر آخری مرحلے میں اس سے قطعی اور صریح ممانعت کی گئی ہے (مائدہ ۹۰)۔

اصولی طور پر ایک اجتماعی اور اخلاقی فساد کی جڑ کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے جس سے ماحول بری طرح سے متاثر ہو رہا ہو، اس سے بہتر راہ حل قرار دور کوئی راستہ نہیں ہے کہ افراد کو آہستہ آہستہ اسے چھوڑنے پر آمادہ کیا جائے اور پھر آخری حکم دیا جائے۔

ضمنی طور پر توجہ رہے کہ یہ آیت کسی طرح بھی شراب نوشی کے جواز پر دلالت نہیں کرتی بلکہ وہ صرف حالت نماز میں مستی کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے۔ نماز کی حالت کے علاوہ کے لیے خاموش ہے، یہاں تک کہ آخری حکم آجائے۔ اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ نماز پنجگانہ کے اوقات خصوصاً اس زمانے میں جب کہ نماز عام طور پر پانچ وقتوں میں پڑھی جاتی تھی کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا تھا۔ اب نماز بحالت ہوش و حواس پڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے اوقات کے درمیانی فاصلے میں ایسی مشروبات سے جو نشہ آور ہیں کلی طور پر پرہیز کیا جائے۔ کیونکہ اکثر اوقات شراب کا نشہ نماز کے وقت تک باقی رہتا ہے اور ہوش و حواس برقرار نہیں رہتے۔ اس بنا پر زیر بحث آیت ایک طرح سے دائمی اور مسلسل تحریم کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ بہت سی روایتیں جو شیعہ سنی کتب میں آئی ہیں ان میں مندرجہ بالا آیت کے معنی نیند کی مستی کے لیے گئے ہیں یعنی جب تک اچھی طرح نہ جاگ جاؤ نماز شروع نہ کرو جب تک تمہیں یہ معلوم نہ ہو سکے کہ کیا کہہ رہے ہو[1] لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس تفسیر کے لیے "حتی تعلموا ما تقولون" کے مفہوم سے فائدہ اٹھایا گیا ہے "سکاریٰ" سے نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہاں تک کہ تمہیں یہ معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر اس حالت میں نماز پڑھنا جس میں انسان کے ہوش و حواس پورے طور پر بجا نہ ہوں ممنوع ہے، چاہے وہ مستی کی حالت ہو یا اونگھ اور نیند کے خمار کے عالم میں۔ اس جملے سے ضمنی طور پر یہ استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ بہتر ہے کہ انسان سستی اور کم توجہ کی حالت میں بھی نماز نہ پڑھے کیونکہ اس حالت میں کمزوری سی پائی جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حضرت امام محمد باقرؑ سے منقول ہے:

جب تم کسالت و سستی میں ہو یا اونگھ رہے ہو اور یا طبیعت بوجھل ہو تو ایسی حالت میں نماز نہ پڑھو کیونکہ خداوند عالم نے مومنین کو سستی کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا ہے[2]

۲۔ حالتِ جنابت میں نماز کا باطل ہونا۔ جس کی طرف "ولا جنباً" سے اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس حکم سے استثناء کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: الا عابری سبیل (مگر یہ کہ مسافرت میں ہوں، اگر مسافرت میں پانی نہ ملے تو پھر تیمم سے نماز پڑھو (اس کی تفصیل آگے آئے گی)، لیکن اخبار و روایات میں اس آیت کی ایک دوسری تفسیر بھی درج ہے[3] اور وہ یہ ہے کہ آیت میں لفظ صلوٰۃ سے مراد نماز پڑھنے کی جگہ اور مسجد ہے۔ یعنی حالت جنابت میں مساجد میں داخل نہ ہوں۔ اس کے بعد ان لوگوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے جو حالت جنابت میں مسجد سے گزریں۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور اصحاب نبیؐ کی ایک جماعت نے مسجد نبوی کے اطراف میں ایسے گھر بنائے

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۴۸۳ و تفسیر قرطبی جلد سوم صفحہ ۱۷۷۱۔

[2] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۴۸۲ اس مضمون کے مشابہ صحیح بخاری میں بھی ایک روایت ہے۔

[3] وسائل جلد اول صفحہ ۴۸۶۔

ہوئے تھے جن کے دروازے مسجد نبوی میں کھلتے تھے اور انہیں اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ جنابت کی حالت میں مسجد سے بلا توقف گذر جائیں۔

لیکن یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس تفسیر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آیت میں لفظ صلوٰۃ دو معنی میں استعمال ہوا ہے ایک نماز اور دوسرا "محل نماز" کیونکہ زیرِ نظر آیت میں دو حکم بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ حالت نشہ میں نماز نہ پڑھی جائے اور دوسرا حالت جنابت میں مساجد میں داخل نہ ہوں۔

جیسا کہ اصول میں ہم کہہ چکے ہیں ایک لفظ کا دو معنی میں استعمال شک وشبہ سے بالاتر ہے لیکن خلافِ ظاہر ضرور ہے اور قرینہ کے بغیر جائز بھی نہیں ہے۔ البتہ روایات مندرجہ بالا اس کا قرینہ قرار دی جاسکتی ہیں۔

۳۔ غسل کر چکنے کے بعد نماز پڑھنے یا مسجد سے گزرنے کے جواز کا "حتیٰ تغتسلوا" سے بیان کیا گیا ہے۔

۴۔ اس کے بعد جو پانی نہ ملنے یا کسی اور وجہ سے معذور ہوں ان کے لیے تیمم کا حکم بیان کیا گیا ہے: وان کنتم مرضی او علی سفر یعنی اگر بیمار ہو جاؤ یا سفر میں ہو۔ درحقیقت اس مختصر سی عبارت میں تشریع تیمم کے تمام مواقع جمع ہیں۔ پہلا مقام وہ ہے جہاں پانی جسم کے لیے ضرر رساں ہو اور دوسرا مقام وہ ہے جہاں انسان کو پانی نہ ملے یا اس کے استعمال کی طاقت نہ ہو۔

پھر فرمایا: او جاء احد منکم من الغائط او لامستم النساء اس جملے سے تیمم کی ضرورت کے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب تقاضائے حاجت سے فارغ ہوئے ہو یا عورتوں سے ہم بستری کرو۔ فلم تجدوا ماء۔ اور تمہیں پانی نہ ملے۔ فتیمموا صعیداً طیباً تو اس موقع پر پاکیزہ مٹی سے تیمم کرو۔ اس کے بعد تیمم کا طریقہ بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: فامسحوا بوجوھکم وایدیکم اس کے بعد اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرو۔ آیت کے آخر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ مذکورہ حکم تمہارے لیے ایک قسم کی سہولت اور آسانی ہے۔ چونکہ خدا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ فلم تجدوا ماءً کا جملہ جو اصطلاح کے مطابق فاء تفریع سے شروع ہوتا ہے "او علی سفر" سے مربوط ہے یعنی جس وقت تم سفر میں ہو تو ممکن ہے کہ پانی نہ مل سکے اور تمہیں تیمم کی ضرورت پڑے۔ کیونکہ انسان جب بستی میں ہو پھر تو ایسا بہت کم اتفاق ہوتا ہے۔ یہاں سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ جو بات صاحب المنار جیسے مفسرین نے لکھی ہے کہ "فقط مسافرت ہی وضو کی بجائے تیمم کرنے کے لیے کافی ہے" بالکل بے بنیاد ہے۔ کیونکہ فاء تفریع "فلم تجدوا" میں اس بات کو باطل کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ سفر میں کبھی پانی نہیں ملتا تو ایسے موقع پر تیمم کرنا چاہیے نہ یہ کہ حالت سفر ہی میں تیمم جائز ہے۔ تعجب ہے کہ مولف مذکور اس سلسلے میں فقہا پر تنقید کرتا ہے جبکہ مذکورہ تنقید کا یہاں کوئی مقام نہیں ہے۔

۲۔ لفظ "او" "او جاء احد منکم من الغائط" کے جملہ میں "واؤ" کے معنی میں ہے کیونکہ بیماری یا مسافرت تیمم کا سبب نہیں ہیں بلکہ ایسی حالت میں اگر اسباب وضو یا غسل حاصل نہ ہوں تو اس وقت تیمم واجب ہے۔

۳۔ اس آیت میں قرآن کے بیان کی نفاست و پاکیزگی دوسری بہت سی آیتوں کی طرح مکمل طور پر دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ جب

چاہتا ہے کہ قضائے حاجت کے متعلق گفتگو کرے تو ایسی تعبیر کرنا چاہتا ہے جو مطلب سمجھا دے اور نامناسب لفظ بھی استعمال نہ ہونے پائے اس لیے فرماتا ہے:

او جاء احد منکم من الغائط اس کی وضاحت یوں ہے کہ "غائط" بخلاف اس مفہوم کے جو آجکل اس سے سمجھا جاتا ہے[1] اصل میں ایسی نشیبی زمین کے لیے بولا جاتا ہے جو انسان کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپا لے اور اس زمانے میں بیابانوں میں پھرنے والے اور مسافر لوگ قضائے حاجت کے لیے ایسی جگہوں پر جاتے تھے تاکہ وہ لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہیں۔ بنا بریں اس جملے کے معنی یہ ہوں گے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص نشیبی جگہ سے آیا ہو جو عام طور پر قضائے حاجت کی طرف کنایہ ہے اور قابل توجہ بات ہے کہ "تم" کی بجائے "تم میں سے کوئی" کا لفظ استعمال ہوا ہے تاکہ بیان کی نفاست بڑھ جائے (غور فرمایئے گا)۔

اسی طرح مباشرت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تو "او لامستم النساء" یا عورتوں سے لمس کیا ہو کی تعبیر سے سمجھایا گیا ہے اور لفظ "لمس" ہم بستری کے لیے عمدہ کنایہ ہے۔

۴۔ تیمم کی باقی خصوصیات کے بارے میں بجملہ "صعیدا طیبا" انشاء اللہ سورۂ مائدہ کی آیت ۶ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

تیمم کا فلسفہ

بہت سے لوگ پوچھتے ہیں کہ زمین پر ہاتھ مارنے اور پھر انہیں پیشانی اور ہاتھوں کی پشت پر پھیرنے میں کیا فائدہ ہے خصوصاً جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ بہت سی مٹی گندی بھی ہوتی ہے اور اس سے جراثیم بھی منتقل ہوتے ہیں۔

اس اعتراض کے جواب کے لیے دو نکتوں کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔

الف۔ اخلاقی فائدہ۔ تیمم ایک عبادت ہے۔ اور عبادت کی روح اس میں اپنے حقیقی معنی میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان اپنی پیشانی کو جو بدن کا محترم ترین عضو ہے اس ہاتھ سے جو مٹی پر مارا گیا ہے مس کرتا ہے۔ تاکہ اس کی بارگاہ میں اپنی عاجزی و انکساری ظاہر کرے یعنی میری پیشانی اور ہاتھ تیرے سامنے انتہائی خشوع و خضوع کے لیے حاضر ہیں۔ اس کے بعد انسان نماز یا دوسری عبادتوں کو انتہائی خلوص اور عاجزی سے ادا کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے جن میں وضو یا غسل کی شرط ہے۔ اس طرح انکساری، عبدیت اور شکرگزاری کے جذبے کو پروان چڑھانے کے لیے یہ عمل بہت مؤثر اور کارگر ہے۔

ب۔ حفظانِ صحت کا فائدہ۔ آج کی دنیا میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مٹی اپنے بہت سے جرثوموں (BACTERIAS) کی وجہ سے گندگیوں کو دور کر سکتی ہے یہ جرثومے جن کا کام آلودہ کرنے والے مواد کا تجزیہ اور طرح طرح کی بدبو کو دور کرنا ہے زیادہ تر زمین کی سطح پر معمولی سی گہرائی میں جہاں سے ہوا اور سورج کی روشنی سے بخوبی فائدہ اٹھا سکیں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے جب مردہ جانور یا لاشیں زمین میں دفن کر دی جائیں اور اسی طرح سے دوسری چیزیں جو گندگی سے بھری ہوئی زمین پر پڑی ہوں، تھوڑے ہی

---

[1] غائط کا لفظ آجکل عموماً انسانی فضلہ کے لیے بولا جاتا ہے۔

عرصے میں ان کے اجزا بکھر جاتے ہیں اور جراثیموں کی وجہ سے وہ بدبو کا مرکز نیست و نابود ہو کر رہ جاتا ہے۔

یہ مسلّم ہے کہ اگر زمین میں یہ خاصیت نہ ہوتی تو کرۂ زمین مدت قلیل میں بدبو کے ڈھیروں میں بدل جاتا۔ اصولی طور پر مٹی اینٹی بائیوٹک (ANTIBIOTIC) اثر رکھتی ہے جو بہترین جراثیم کش ہے۔ اس بنا پر نہ صرف یہ کہ پاکیزہ مٹی گندی چیز نہیں بلکہ وہ گندگی کو دور کرنے والی ہے اور اس لحاظ سے ہو سکتا ہے کہ وہ کسی حد تک پانی کی جانشینی کرے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ پانی طول ہے یعنی وہ جراثیم کو حل کر کے بہالے جاتا ہے۔ لیکن مٹی انہیں موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔

البتہ توجہ رہے کہ تیمم کی مٹی مکمل طور پر پاک و پاکیزہ ہو۔ جیسا کہ قرآن اس کی عجیب و غریب تعبیر لفظ "طیبا" سے کرتا ہے۔

یہ بھی قابل توجہ ہے کہ اس سے وہ "صعید" مراد ہے جو مادہ "صعود" سے لیا گیا ہے۔ یعنی بہتر یہ ہے کہ اس کام کے لیے وہ مٹی چنی جائے جو سطح زمین پر سورج کی تپش اور اس کی روشنی کی زد میں ہو اور ہوا اور جراثیم مارنے والے جرثوموں سے بھری ہوئی ہو۔ اگر اس قسم کی مٹی پاک و پاکیزہ بھی ہو تو اس سے تیمم مندرجہ بالا اثرات رکھتا ہے (سورۂ مائدہ کی آیت ۶ کی ذیل میں اس سلسلہ میں مزید بحث کی جائے گی)۔

۴۴۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ۝

۴۵۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۡ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ۝

ترجمہ

۴۴۔ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں (خدا کی) کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا تھا (اس کی بجائے کہ وہ اس سے اپنی اور دوسروں کی ہدایت کریں) اس سے اپنے لیے گمراہی خریدتے ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ۔

۴۵۔ خدا تمہارے دشمنوں سے آگاہ ہے (وہ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے) کافی ہے کہ خدا تمہارا ولی ہو اور کافی ہے کہ وہ تمہارا ناصر و مددگار ہو۔

تفسیر

الم تر الی الذین اوتوا نصیبا من الکتاب یشترون الضلالۃ ویریدون ان تضلوا السبیل۔

خداوند عالم اس آیت میں تعجب آمیز عبارت سے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب فرماتا ہے: اس

گروہ کی حالت حیران کن ہے جو کتاب آسمانی کا کچھ حصہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس کے ذریعے اپنے اور دوسروں کے لیے ہدایت وسعادت حاصل کرتے، گمراہی کا راستہ اپناتے ہیں اور تمہارے لیے بھی چاہتے ہیں کہ گمراہ ہو جاؤ۔ اس طریقے سے وہ چیز جو خود ان کے لیے اور دوسروں کے لیے ہدایت کا ذریعہ تھی، ان کی بُری نیتوں کی وجہ سے گمراہی اور کسیلہ گمراہی میں بدل گئی ہے کیونکہ وہ کبھی حقیقت کی تلاش میں کوشاں نہیں تھے۔ بلکہ ہر چیز کو نفاق، حسد اور مادیت کی سیاہ عینک سے دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد فرماتا ہے، یہ لوگ اگرچہ دوستی کے لباس میں جلوہ گر ہوتے ہیں لیکن یہ دراصل تمہارے جانی دشمن ہیں اور خدا ان سے آگاہ ہے (واللہ اعلم باعدائکم)۔ اس سے بڑھ کر اور کیا دشمنی ہوگی کہ وہ کبھی خیر خواہی کے لہجے میں اور کبھی بدگوئی کی زبان میں تمہاری ہدایت اور سعادت کی مخالفت کرتے ہیں اور ہر وقت اپنے بُرے مقاصد کی تکمیل کے درپے ہیں لیکن تم ان کی دشمنی سے نہ گھبراؤ۔ تم اکیلے نہیں ہو۔ یہی کافی ہے کہ خدا تمہارا رہبر، ولی اور مددگار ہے (وکفیٰ باللہ ولیا وکفیٰ باللہ نصیرا) یہ لوگ تمہارا کچھ نہ کر سکیں گے۔ اگر تم ان کی باتوں کو پاؤں تلے روند ڈالو تو کسی قسم کا ڈر نہیں ہے۔

ضمناً اوتوا نصیبا من الکتاب" (کتاب کا کچھ حصہ انہیں دیا گیا ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ مکمل آسمانی کتاب "تورات" نہ تھی بلکہ اس کا کچھ حصہ تھا اور یہ بات تسلیم شدہ تاریخی حقائق کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے کیونکہ تورات کے بہت سے اصلی حصے یا تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدلتے گئے یا وہ بالکل نیست ونابود کر دیئے گئے تھے۔

۴۶۔ مِنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّينِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ وَأَقْوَمَ وَلَٰكِنْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ○

ترجمہ

۴۶۔ بعض یہودی تورات کے کچھ فقروں کو ان کے مقام سے بدل دیتے تھے اور (بجائے اس کے یہ کہتے کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی) یہ کہتے کہ ہم نے سنا اور مخالفت کی اور نیز کہتے کہ سنو کہ ہرگز نہ سنو اور (بطور طنز کہتے "راعنا" یعنی) ہمیں بے وقوف بنا دیں یہ اس لیے ہے تاکہ وہ اپنی زبان سے حقائق کو بدل ڈالیں اور دین خدا پر طعن وتشنیع کریں لیکن اگر وہ (اس ہٹ دھرمی اور اصرار کی بجائے) یہ کہتے کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی اور ہماری بات کو سنو اور ہمیں مہلت دو (تاکہ ہم حقائق کی تہ کو پہنچ سکیں) تو یہ بات ان کے نفع میں تھی اور حقیقت کے ساتھ سازگار تھی۔ لیکن خدا نے انہیں ان

کے کفر کی وجہ سے اپنی رحمت سے محروم کر دیا۔ اس لیے ان میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا ایمان نہیں لائیں گے۔

تفسیر

یہودیوں کے کردار کا ایک اور رُخ

یہ آیت گذشتہ آیتوں کے بعد بعض دشمنانِ اسلام کی کچھ اور صفتوں کی تشریح کرتی ہے اور ان کے بعض اعمال کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پہلے یہ بتاتی ہے کہ ان کا کام حقائق کی تحریف اور احکام خدا کے چہرے کو مسخ کرنا تھا (من الذین ھادوا یحرفون الکلم عن مواضعہ)۔ یہودیوں کا ایک گروہ کلماتِ خدا کو ان کی جگہ سے تبدیل کر دیتا تھا۔ یہ تحریف نہ معلوم لفظی تھی کہ معنوی لیکن بعد کے جملے بتاتے ہیں کہ یہاں تحریف سے مراد تحریف لفظی اور تغییر عبارت ہے کیونکہ اس جملہ کے بعد فرماتا ہے (ویقولون سمعنا وعصینا) ہم نے سُنا اور نافرمانی کی یعنی بجائے اس کے کہ سمعنا واطعنا یعنی ہم نے سنا اور اطاعت کی کہیں کہتے ہیں ہم نے سُن کر مخالفت کی اور یہ بالکل ان لوگوں کی طرح ہے جو بعض اوقات بطور استہزا کہتے ہیں "آپ کا کہنا اور ہمارا بات پر کان نہ دھرنا" آیت کے دوسرے جملے بھی اسی مطلب کی گواہی دیتے ہیں۔

اس کے بعد ان کی عداوت آمیز جسارت اور بے ادبی کی گفتگو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ وہ کہتے ہیں (واسمع غیر مسمع) "سنو کہ کبھی نہ سنو" اور اس طرح وہ ایک نادان اور جاہل گروہ بن کر حقائق کو بدلنے اور کتب آسمانی میں خیانت کرنے میں مصروف ہیں حالانکہ یہ کتاب آسمانی فرعون جیسے ظالم و جابر کے چنگل سے ان کی نجات کا ماحصل ہے۔ انہوں نے استہزا اور مسخرہ پن جیسے نامرداد حربے اختیار کر رکھے ہیں یہ حربے ہٹ دھرم اور مغرور کرنے والوں کا ہتھیار ہیں وہ کبھی ان باتوں کے علاوہ پاک دل مسلمانوں کے بعض جملوں سے جو وہ حضرت رسالت مآب کی خدمت اقدس میں عرض کرتے تھے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے ان جملوں کو دوسرے مطالب و معانی کا لباس پہنا کر استہزا اور تمسخر کے طور پر استعمال کرتے تھے مثلاً "راعنا" جس کے معنی ہیں ہم سب سے رعایت کیجئے اور ہمیں مہلت دیجئے۔ سچے مسلمان دعوتِ اسلام کی ابتدا میں اس بنا پر کہ زیادہ اچھے اور بہتر طریقے سے آپ کی باتوں کو سنیں اور دل میں جگہ دیں حضرت رسولِ اکرمؐ کے سامنے ایسے جملے عرض کرتے لیکن یہودیوں کا یہ گروہ اسے بگاڑ کر حضورؐ کے سامنے اسے دھراتا تھا۔ اس لفظ سے ان کی مراد اس کا عبرانی معنی تھا اور وہ یہ کہ "سنو کہ کبھی نہ سنو" یا پھر دوسرے عربی معنی یعنی ہمیں بے وقوف بناؤ [1]۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ ظاہر کریں کہ خاکم بدہن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام لوگوں کو اُلّو بنانا اور بے خبر رکھنا ہے۔ وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتے تھے تاکہ اپنی زبان سے حقائق کو اصلی محور سے ہٹا دیں اور دینِ حق پر زبان اعتراض دراز کریں

---

[1] "راعنا" اگر "رعی" کے مادہ سے ہو تو اس کا معنی ہے "ہم سے مراعات کیجئے اور ہمیں مہلت دیجئے" اور اگر "رعونت" کے مادہ سے ہو تو اس کا معنی ہے "ہمیں بے وقوف بنا دیجئے"۔ یاد رہے کہ پہلی صورت میں "راعنا" میں نون شد کے بغیر ہوگا اور دوسری صورت میں شد کے ساتھ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی خاص طور پر نون پر شد دیتے تھے اور آخر پر اسے کھینچ کر پڑھتے تھے۔

(لیّا بالسنتھم وطعنًا فی الدین)۔ لی (بروزن حی) کے معنی طناب وغیرہ کو لپیٹنا ہیں اور یہاں ادل بدل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ولو انھم قالوا سمعنا واطعنا واسمع وانظرنا لکان خیرًا لھم واقوم

لیکن اگر وہ اس ہٹ دھرمی، اصرار، حق دشمنی اور بے ادبی کی بجائے سیدھی راہ اپناتے اور یہ کہتے کہ ہم نے خدا کا کلام سنا اور ہم نے اطاعت کی آپ ہماری گذارشات سنیئے اور ہم سے رعایت کیجئے اور ہمیں مہلت دیجئے کہ ہم حقائق کو سمجھ سکیں تو یہ ان کے فائدے میں ہوتا اور عدل منطق اور ادب کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا۔

ولکن لعنھم اللہ بکفرھم فلا یؤمنون الا قلیلا۔

لیکن وہ کفر، سرکشی اور بغاوت کی وجہ سے رحمت خدا سے دور ہو گئے ہیں اور ان کے دل اس قدر مردہ ہو چکے ہیں کہ وہ جلدی زندہ اور بیدار نہیں ہو سکتے۔ ان میں صرف تھوڑے سے لوگ پاک دل ہیں جو حقائق قبول کرنے کے لیے تیار ہیں اور حق کی باتوں کو سنتے ہیں اور ان پر ایمان لاتے ہیں۔

بعض لوگ اس جملے کو قرآن کی غیبی خبروں میں سے قرار دیتے ہیں کیونکہ جس طرح قرآن اس جملے میں خبر دیتا ہے اسلام کی طویل تاریخ میں یہودیوں میں سے بہت ہی کم لوگ ایمان لائے اور اسلام سے وابستہ ہوئے باقی اس دن سے آج تک اسلام سے برسرپیکار رہیں۔

۴۷۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ○

ترجمہ

۴۷۔ اے وہ لوگو کہ جنہیں اللہ کی کتاب دی گئی ہے، جو کچھ ہم نے (اپنے رسول پر) نازل کیا ہے اور جو ان نشانیوں سے ہم آہنگ بھی ہے جو تمہارے پاس ہیں ایمان لے آؤ، اس سے پہلے کہ چہروں کو مسخ کر دیں اور پھر انہیں پشت کی طرف پھیر دیں یا انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیں جیسا کہ ہم نے اصحاب سبت کو دور کر دیا تھا اور خدا کا فرمان ہر حالت میں روبہ عمل ہو کے رہتا ہے۔

تفسیر

ہٹ دھرم افراد کی سرنوشت

یا ایھا الذین اوتوا الکتاب امنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم

اس بحث کے بعد جو گذشتہ آیات میں اہل کتاب کے بارے میں تھی یہاں انہی کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے وہ لوگو جنہیں آسمانی کتاب دی جا چکی ہے، قرآن مجید کی آیتوں پر ایمان لے آؤ جو کہ ان نشانیوں سے ہم آہنگ ہیں جو اس کے بارے میں تمہاری کتابوں میں موجود ہیں اور مسلم ہے کہ ان نشانیوں کی موجودگی میں تم دوسرے لوگوں کی نسبت اس بات کا زیادہ حق رکھتے ہو کہ اس پاک دین کے ماننے والے بن جاؤ۔

اس کے بعد انہیں دھمکی دیتا ہے کہ اس سے پہلے کہ تم دو سزاؤں میں سے کسی ایک میں گرفتار ہو جاؤ حق کے سامنے تسلیم خم کر دو۔ پہلی سزا یہ کہ تمہارے چہروں کو کلی طور پر نیست و نابود کر دیا جائے اور ان تمام اعضاء کو جن کے ذریعے تم حقائق کو دیکھتے، سنتے اور سمجھتے ہو مٹا دیں اور اس کے بعد تمہارے چہروں کو پیٹھ کی طرف پھیر دیں (من قبل ان نطمس وجوھا فنردھا علی ادبارھا)[1]

شاید یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس جملے سے مراد عقل و ہوش، آنکھ اور کان کا حقائق و واقعات زندگی کو نہ سمجھنا اور صراط مستقیم سے روگردانی کے لحاظ سے بیکار ہو جانا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

> اس سے مراد ان کے چہروں کا راہ راست و ہدایت سے محو کرنا ہے اور ان کو پشت کی طرف پھیرنے سے مراد گمراہی ہے[2]

اس کی وضاحت یوں ہے کہ اہل کتاب خصوصاً یہودیوں نے ان تمام واضح نشانیوں کے باوجود حق کے سامنے سر نہ جھکایا اور جان بوجھ کر ضد اور دشمنی کے لیے آمادہ ہو گئے اور مختلف مقامات پر دانستہ طور پر خلاف بیانی اور مخالفت کی تکرار کی اور آہستہ آہستہ یہ ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی، گویا ان کے افکار کلی طور پر مسخ اور ان کی آنکھیں اور کان اندھے بہرے ہو گئے اس قسم کے لوگ زندگی کی راہ میں ترقی کرنے کی بجائے پچھلے پاؤں پلٹ جاتے ہیں اور جو جان بوجھ کر حق کا انکار کرتے ہیں ان کی یہی سزا ہے۔

حقیقت میں یہ سورۂ بقرہ کی آیت ۷ کے مشابہ ہے۔ اس بنا پر "طمس" اور پشت کی طرف لوٹنے سے مراد فکری اور روحانی اور معنوی طور پر پشت کی طرف پلٹنا ہے۔

باقی رہی دوسری سزا جس کی انہیں دھمکی دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انہیں اصحاب سبت[3] کی طرح اپنی رحمت سے دور کرے (او نلعنھم کما لعنا اصحب السبت)۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ ان دونوں دھمکیوں میں کیا فرق ہے لفظ "او" کے ساتھ جس کے معنی "یا" ہیں یعنی ان میں سے ایک یا پھر یہ دوسرے پر عطف ہے۔

---

[1] "طمس" کے اصل معنی ہیں کسی چیز کے آثار کو مٹا دینا مثلاً اگر کسی عمارت کو ویران کر دیں اور اس کی جگہ بالکل صاف کر دیں اور سابقہ عمارت کے آثار کو ختم کر دیں۔ لیکن کنایہ کے طور پر اس چیز کو بھی کہا جاتا ہے جس کا اثر اور خاصیت ختم ہو جائے۔

[2] مجمع البیان جلد ۳ صفحہ ۵۵ آیۂ مذکورہ کے ذیل میں۔ [3] اصحاب سبت کے بارے میں تفصیل سورۂ اعراف آیت ۱۶۳ تا ۱۶۶ کے ذیل میں آئے گی۔ یہ یہودیوں کا ایک گروہ تھا جسے حکم دیا گیا تھا کہ ہفتہ کے روز کام کاج نہ کرے لیکن ان لوگوں نے اپنے پیغمبر کے فرمان کی مخالفت کی اور ماہی گیری کرتے رہے اور طغیان و سرکشی میں آخری حد تک جا پہنچے اور آخر کار دردناک انجام سے دوچار ہوئے۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ پہلی دھمکی معنوی پہلو رکھتی ہے اور دوسری دھمکی ظاہری اور مسخ جسمانی کا پہلو رکھتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا اس آیت میں فرماتا ہے جس طرح ہم نے اصحاب سبت کو اپنی رحمت سے دور کیا تھا ان کو بھی اپنی رحمت سے دور کریں گے۔ ہم جانتے ہیں جیسا کہ انشاء اللہ تعالیٰ سورۂ اعراف میں آئے گا کہ اصحاب سبت ظاہری طور پر مسخ ہوگئے تھے۔

بعض دوسرے لوگوں کا یہ نظریہ ہے کہ یہ لعنت اور خدا کی رحمت سے دوری بھی اس فرق کے ساتھ معنوی پہلو رکھتی ہے کہ پہلی دھمکی انحراف، گمراہی اور پشت کی طرف پلٹنے کی طرف اشارہ ہے جب کہ دوسری دھمکی کے معنی ہلاکت اور نیست و نابود ہونا ہیں کیونکہ لعنت کے ایک معنی ہلاکت بھی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اہل کتاب اصرار اور مخالفت حق پر ڈٹے رہنے کی وجہ سے شکست کھائیں گے یا نیست و نابود ہو جائیں گے۔

ایک اور سوال بھی سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا ان کے بارے میں یہ دھمکی عمل میں لائی گئی کہ نہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلی دھمکی ان میں سے بہت سوں کے بارے میں اور دوسری بعض کے بارے میں عمل میں آچکی ہے۔ اسلامی جنگوں میں ان کی بہت بڑی جماعت تباہ و برباد ہوگئی اور ان کی طاقت ختم ہوگئی۔ دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ اس کے بعد بھی مختلف ملکوں میں بہت تنگی اور مشکلات سے دوچار ہوئے اور ان کے بہت سے لوگ مارے گئے اور وہ اس وقت بھی بہت ہی بُرے اور خطرناک حالات میں زندگی گزار رہے ہیں۔

آیت کے آخر میں ان دھمکیوں کی تاکید کے طور پر فرماتا ہے اور فرمانِ خدا ہر حال میں روبہ عمل ہو گا اور اسے کوئی طاقت بھی نہ روک سکے گی (وکان امر اللہ مفعولا)۔

۴۸۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ۝

ترجمہ

۴۸۔ خدا کبھی مشرک کو نہیں بخشے گا اور اس سے نیچے جو کچھ ہے وہ جسے چاہے (بشرطیکہ وہ اہلیت رکھتا ہو) بخش دے گا اور جو کسی کو اللہ کا شریک بنائے وہ عظیم گناہ کا مرتکب ہوا ہے۔

تفسیر

اُمید سے معمور آیت

مندرجہ بالا آیت صراحت سے بتاتی ہے کہ سب گناہ بخشے جا سکتے ہیں لیکن شرک کسی صورت میں نہ بخشا جائے گا مگر یہ کہ اسے چھوڑ دیں توبہ کر لیں اور موحد بن جائیں۔ دوسرے لفظوں میں کوئی گناہ بھی ایمان کو ختم نہیں کر سکتا جس طرح کہ کوئی نیک عمل بھی شرک

کی موجودگی میں انسان کو نجات نہیں دلا سکتا۔ (ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذلک لمن یشاء)۔

اس آیت کا ربط گذشتہ آیات کے ساتھ اس لحاظ سے ہے کہ یہود و نصاریٰ میں سے ہر ایک، ایک طرح سے مشرک تھے۔ قرآن اس آیت کے ذریعے خطرے سے خبردار کرتا ہے کہ وہ اس عقیدے کو ترک کر دیں کیونکہ یہ ایسا گناہ ہے جو بخشا نہیں جا سکتا۔ اس کے بعد آیت کے آخر میں اس کی دلیل بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: جو شخص خداوند عالم کے لیے شریک قرار دے اس نے بہت بڑا گناہ کیا ہے (و من یشرک باللہ فقد افتری اثما عظیما)[1]

یہ آیت ان آیتوں میں سے ہے جو موحدین کو پروردگار عالم کے لطف و کرم سے اطمینان اور امید دلاتی ہیں کیونکہ اس آیت میں خدا نے شرک کے علاوہ باقی گناہوں کی بخشش کا امکان بیان کیا ہے۔ اس روایت کے مطابق جو طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے نقل کی ہے یہ آیت آیاتِ قرآن میں سب سے زیادہ امید افزا ہے:

ما فی القرآن آیۃ ارجی عندی من ھذہ الآیۃ

اور ابن عباس کے بقول یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو اہل ایمان کے لیے ہر اس چیز سے عزیز تر ہے جس پر سورج کی روشنی پڑتی ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو بڑے بڑے گناہ کر بیٹھتے ہیں اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدا تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو جاتے ہیں اور وہ اسی بنا پر اپنی بقایا زندگی میں بخشش سے ناامید ہو کر گناہوں کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔ حالانکہ خدا کی بخشش اور عفو و درگزر کی امید ہی وہ موثر ذریعہ ہے جو انہیں گناہ اور سرکشی سے باز رکھ سکتا ہے۔ اس لیے یہ آیت حقیقت میں ہماری راہنمائی ایک تربیتی مسئلے کی طرف کرتی ہے۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مفسرین اور متعدد روایات کے مطابق جو اس آیت کی ذیل میں نقل کی گئی ہیں، جرائم پیشہ اور وحشی افراد شلاً اسلام کے رشید سپہ سالار حضرت حمزہ بن حضرت عبد المطلب، حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے چچا کا قاتل تک اس آیت کے نازل ہونے پر ایمان لے آتا ہے اور جرائم سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے، تو دوسرے گنہگاروں کے لیے بھی یہ امید پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہوں اور جو گناہ وہ کر چکے ہیں اپنے آپ کو اس سے زیادہ آلودہ گناہ نہ کریں۔

اس موقع پر شاید یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ آیت گناہوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کیونکہ اس میں شرک کے علاوہ باقی سب گناہوں کی بخشش کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ اس بخشش کے وعدے کا مقصد ایسا وعدہ نہیں ہے جس میں کوئی شرط اور پابندی نہ ہو بلکہ یہ ان افراد کے لیے ہے جو بخشش کی قابلیت اور اہلیت ظاہر کریں جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے مشیت اور خدا کی منشا جس کا ذکر اس آیت میں اور دوسری آیتوں میں ہوا ہے حکمتِ الٰہی کے معنی میں ہے۔ کیونکہ خدا کی مشیت اور منشا کبھی حکمت سے جدا نہیں ہوتی اور یہ مسلم ہے کہ اس کی حکمت کا ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے کہ وہ لیاقت اور استعداد کے بغیر کسی کو عفو و بخشش کا مستحق قرار دے۔ اس بنا پر اس آیت کا تربیتی اور اصلاحی پہلو اس سے غلط فائدہ اٹھانے کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔

---

[1] افترا مادہ فری سے ہے (بروزن فرد) قطع کرنے کے معنی میں ہے۔ اب اگر کسی سالم چیز کا کچھ حصہ کاٹ دیں تو وہ خراب ہو جاتی ہے۔ اس لیے برے کام مثلاً شرک اور جھوٹ کو بھی افترا کہتے ہیں۔

گناہوں کی بخشش کے اسباب

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت مسئلہ توبہ سے ربط نہیں رکھتی۔ کیونکہ توبہ اور ترک گناہ تو شرک سمیت تمام گناہوں کو دھوڈالتا ہے، بلکہ اس سے مراد ایسے لوگوں کے لیے امکانِ عفوالہٰی ہے جنہیں توبہ کی توفیق نہیں ہوئی۔ یعنی اس سے پہلے کردہ اپنے کیے ہوئے گناہوں پر پشیمان ہوں یا پشیمانی کے بعد اپنے بُرے اعمال کی تلافی سے پہلے دنیا سے اٹھ جائیں۔

اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ قرآن کی بہت سی آیتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کی بخشش کے کئی ایک ذریعے ہیں جن کا خلاصہ پانچ موضوعات میں کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ توبہ، گذشتہ گناہوں پر پشیمانی اور آئندہ گناہوں سے اجتناب کے پختہ ارادے کے ساتھ صراطِ مستقیم پر گامزن ہونا اور بُرے اعمال کی نیک اعمال کے ذریعے عملی طور پر تلافی کرنا۔ جو آیات اس معنی پر دلالت کرتی ہیں بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے ایک آیت یہ ہے:

وھو الذی یقبل التوبۃ عن عبادہ و یعفوا عن السیّاٰت

وہ خدا وہ ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ (شوریٰ - ۲۵)

۲۔ بہت زیادہ نیک کام کرنا۔ یہ بھی بُرے اعمال کی بخشش کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

ان الحسنات یذھبن السیئات

نیک کام کچھ گناہوں کو ختم کردیتے ہیں۔ (ہود - ۱۱۴)

۳۔ شفاعت: اس کی تفصیل تفسیر نمونہ کی جلد اوّل میں آچکی ہے۔

۴۔ گناہانِ کبیرہ سے پرہیز کرنا: یہ بھی گناہانِ صغیرہ کی بخشش کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کی تشریح اسی سورہ کی آیت ۳۱ اور ۴۸ کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

۵۔ عفوِ خداوندی۔ یہ بھی بعض صاحب استعداد افراد کو میسر آتی ہے جیسا کہ ہم اسی آیت کے ذیل میں بیان کرچکے ہیں۔

اب ہم دوبارہ یاد دلاتے ہیں کہ عفوِ الٰہی اس کی مشیت کے ساتھ مشروط ہے۔ یہ کوئی عمومی اور بلا قید و شرط مسئلہ نہیں ہے۔ اس کی مشیت اور ارادہ صرف ایسے افراد کے بارے میں ہے جو عملی طور پر کسی نہ کسی طریقے سے اپنی قابلیت اور اہلیت ظاہر کرتے ہیں۔

یہاں سے واضح ہوجاتا ہے کہ شرک کیوں قابلِ عفو و بخشش نہیں ہے۔ کیونکہ مشرک اپنا رابطہ خداوندِ عالم سے بالکل توڑ لیتا ہے اور ایسے بُرے فعل کا مرتکب ہوتا ہے جو تمام ادیان اور فطرت کے قوانین کی بنیاد کے خلاف ہے۔

۴۹۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَھُمْ ؕ بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ○

۵۰۔ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَكَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۟

ترجمہ

۴۹ کیا تو نے انہیں نہیں دیکھا جو اپنی تعریفیں کرتے ہیں (ان خودستائیوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے) لیکن خدا جس کی چاہتا ہے تعریف کرتا ہے اور ان پر تھوڑا سا بھی ظلم نہیں ہوگا۔

۵۰ دیکھئے وہ کس طرح خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ یہی واضح گناہ (ان کی سزا کے لیے) کافی ہے۔

شان نزول

بہت سی اسلامی تفاسیر میں اس آیت کے بارے میں لکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنے لیے کچھ خصوصیات اور امتیازات کے قائل تھے۔ چنانچہ آیات قرآنی میں ہے کبھی وہ کہتے ہم خدا کے بیٹے ہیں، کبھی کہتے ہمارے لیے بہشت مخصوص ہے اور ہمارے سوا کوئی وہاں نہیں جا سکتا (مائدہ ۱۸، بقرہ ۱۱۱) یہ آیتیں نازل ہوئیں اور ان کے باطل خیالات کا جواب دیا گیا۔

تفسیر

خودستائی

الم تر الی الذین یزکون انفسھم[1]

اس آیت میں ایک مذموم صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں بہت سے لوگ اور قومیں مبتلا ہیں اور وہ ہے خودستائی اپنے آپ کو نیک پاک ظاہر کرنا اور اپنے لیے فضیلتیں گھڑنا۔ آیت میں ہے، کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنی تعریفیں کرتے ہیں۔ اس کے بعد فرماتا ہے: خدا جس کی چاہتا ہے تعریف کرتا ہے (بل اللہ یزکی من یشاء) صرف وہی ذات اقدس ہے جو حکمت و مشیت بالغہ کی رو سے کسی کمی اور زیادتی کے بغیر بعض افراد کی ان کی قابلیت، لیاقت اور استعداد کے مطابق مدح کرتی ہے اور کبھی کسی شخص پر سوئی کی نوک کے برابر بھی ظلم نہیں کرتی (ولا یظلمون فتیلا)[2]۔ حقیقت میں فضیلت وہی ہے جسے خداوند عالم

---

[1] یزکون مادہ تزکیہ سے ہے۔ جس کے معنی ہیں پاک سمجھنا اور پاکیزگی سے پہچانا بعض اوقات پاک کرنے، تربیت دینے اور رشد و ہدایت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اصل میں یہ پاک کرنے کے معنی میں ہے۔ اگر یہ کام عملی پہلو رکھتا ہو تو پسندیدہ ہے اور اگر صرف زبانی جمع خرچ ہو تو مذموم ہے۔

[2] فتیل لغت میں اس بہت ہی باریک دھاگے کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے شگاف میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ بہت ہی چھوٹی چیزوں کے لیے کنایہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور دراصل یہ مادہ "فتل" سے ہے جس کے معنی ہیں "بٹا ہوا"۔

فضیلت قرار دے رکھی ہو ان کے لیے خودستائی کرنے والے خود غرضی کی وجہ سے اپنے ساتھ چسپاں کر لیں اور یوں اپنے پر اور دوسروں پر ظلم کریں۔

اگرچہ روئے سخن قوم یہود و نصاریٰ کی طرف ہے جو بغیر کسی دلیل کے غلط طور پر اپنے حق میں بعض امتیازات و خصوصیات کے قائل تھے اور اپنا تعارف معزز قوم و ملت کی حیثیت سے کراتے تھے کبھی کہتے:

لن تمسنا النار الا ایاما معدودة

یعنی چند دنوں کے سوا جہنم کی آگ ہمیں ہرگز نہیں چھو سکتی (بقرہ - ۸۰)

کبھی کہتے:

نحن ابناء الله و احباءه

ہم خدا کے بیٹے اور محبوب ہیں (مائدہ - ۱۸)

لیکن یہ بات کسی قوم اور گروہ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ تمام افراد اور قومیں اس میں شامل ہیں جن میں یہ بُری عادت پائی جاتی ہے۔

قرآن مجید سورۂ نجم آیہ ۳۲ میں صراحت کے ساتھ سب مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:

فلا تزکوا انفسکم هو اعلم بمن اتقیٰ

خودستائی نہ کرو، خدا پرہیزگاروں کو خوب پہچانتا ہے۔

اس کا سرچشمہ وہی خود بینی، غرور اور گھمنڈ ہے جو آہستہ آہستہ خودستائی کا روپ دھار لیتا ہے۔

افسوس ہے کہ یہ بری عادت بہت سی قوموں، طبقوں اور افراد میں پائی جاتی ہے اور بہت سی معاشرتی بدحالیوں، لڑائی جھگڑوں اور تفوق طلبیوں کا سرچشمہ یہی بیماری ہے۔ گذشتہ تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی بعض قومیں اسی جھوٹے احساس برتری کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسری قوموں سے بالاتر سمجھتی تھیں اور اسی سبب سے خود کو اس امر کا حقدار جانتی تھیں کہ انہیں اپنا غلام بنا لیں۔ زمانہ جاہلیت کے عرب ہر قسم کی پس ماندگی اور فقر و فاقہ کے باوجود اپنے کو اعلیٰ نسل شمار کرتے تھے اور ان کے قبیلوں میں سے ہر ایک قبیلہ اپنے کو سب سے بڑھ چڑھ کر سمجھتا تھا موجودہ دور میں جرمن قوم یا نسل اسرائیل کی تفوق طلبی اور اپنی بڑائی کا احساس علاقائی اور عالمگیر جنگوں کا سرچشمہ بنی ہے۔ یہود و نصاریٰ صدر اسلام میں بھی دوسروں کی نسبت اسی قسم کے وہم میں گرفتار تھے۔ اسی لیے وہ حقائق اسلام کے سامنے بڑی مشکل سے سر جھکانے کے لیے تیار ہوتے تھے۔ اسی بنا پر زیر نظر آیت میں قرآن شدت سے اس قسم کے توہمات اور برتری کی خواہشات کی سرکوبی کرتا ہے اور اسے افترا، خدا پر جھوٹ باندھنا اور بڑا گناہ شمار کرتا ہے، اور فرماتا ہے: انظر کیف یفترون علی الله الکذب وکفی به اثما مبینا یعنی دیکھیے یہ گروہ کس طرح جھوٹے فضائل بنانے اور ان کو خدا کی طرف منسوب کرنے کے ذریعے خدا پر جھوٹ باندھتا ہے۔ اگر انہوں نے اس گناہ کے علاوہ اور کوئی گناہ نہ بھی کیا ہو تو بھی ان کی سزا کے لیے کافی ہے۔

حضرت امیر المومنین علیؑ اپنے مشہور خطبہ ہمام میں پرہیزگاروں کی ممتاز اور مخصوص صفتوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

لا یرضون من اعمالهم القلیل ولا یستکثرون الکثیر فهم لانفسهم متهمون و من اعمالهم

مشفقون اذا زکی احد منھم خاف مما یقال لہ فیقول انا اعلم بنفسی من غیری و ربی اعلم بی من نفسی اللھم لا تؤاخذنی بما یقولون واجعلنی افضل مما یظنون واغفرلی ما لا یعلمون۔

وہ کبھی اپنے تھوڑے عمل پر راضی نہیں ہوتے اور کبھی اپنے زیادہ عمل کو بڑا نہیں سمجھتے۔ وہ اپنے آپ کو ہر حالت میں فرائض کے انجام دہی میں کوتاہ گردانتے ہیں اور اپنے اعمال سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ جب کوئی ان کی تعریف کرتا ہے تو جو کچھ وہ ان کے بارے میں کہتا ہے اسے سن کر انہیں وحشت ہونے لگتی ہے کہ میں اپنی حالت کو دوسروں کی نسبت بہتر جانتا ہوں اور خدا مجھ سے بہتر جانتا ہے۔ پالنے والے اس تعریف کے بدلے میں جو تعریف کرنے والے میرے بارے میں کرتے ہیں میری جواب طلبی نہ کرنا اور مجھے اس سے بھی زیادہ جو یہ گمان کرتے ہیں بلند و بالا اور برتر قرار دے اور میری وہ خطائیں جو ان کے علم میں نہیں ہیں بخش دے۔

۵۱۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝

۵۲۔ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ۝

ترجمہ

۵۱ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں خدا کی کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا ہے کہ وہ (اس کے باوجود) جبت و طاغوت (بت اور بت پرستوں) پر ایمان رکھتے ہیں اور مشرکین سے کہتے ہیں کہ ہم ان لوگوں سے جو ایمان لا چکے ہیں زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔

۵۲ وہ ایسے لوگ ہیں خداوند عالم نے جنہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور جسے خدا اپنی رحمت سے دور کر دے اس کا تجھے کوئی بھی مددگار نہیں ملے گا۔

شان نزول

اکثر مفسرین مندرجہ بالا آیتوں کی شانِ نزول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جنگ احد کے واقعہ کے بعد یہودیوں کے بزرگوں میں سے ایک شخص جس کا نام کعب بن اشرف تھا ستر آدمیوں کے ہمراہ مکہ مکرمہ آیا تاکہ رسول اکرمؐ کے خلاف بت پرستوں سے عہد و پیمان کرے اور جو معاہدہ حضورؐ کے ساتھ تھا اسے توڑ دے۔ کعب ابو سفیان کے گھر گیا۔ ابو سفیان نے اس کا بڑا احترام کیا۔

باقی یہودی قریش کے مختلف گھروں میں الگ الگ مہمان رہے اہل مکہ میں سے کسی نے کعب سے کہا کہ تم بھی اہل کتاب ہو اور محمدؐ بھی صاحب کتاب ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہمیں یہ شک ہے کہ یہ ایک سازش ہے جو ہمیں ختم کرنے کے لیے کی جا رہی ہے اگر تم یہ چاہتے ہو کہ ہم آپس میں عہد و پیمان کریں تو پہلی شرط یہ ہے کہ ان دو بتوں (دو بڑے بتوں کی طرف اشارہ کیا) کو سجدہ کرو اور ان پر ایمان لے آؤ تو انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد کعب نے اہل مکہ سے یہ پیش کش کی کہ تیس افراد تم میں سے اور تیس افراد ہم میں سے خانہ کعبہ کے پاس جاتے ہیں اور اپنے شکم خانہ کعبہ کی دیوار سے لگا کر کعبہ کے پروردگار سے عہد کریں کہ ہم محمدؐ سے جنگ کرنے میں کوتاہی نہیں کریں گے۔ غرض یہ پروگرام طے پا گیا۔ آخر میں ابوسفیان نے کعب کی طرف رخ کرکے کہا، تو ایک پڑھا لکھا آدمی ہے اور ہم جاہل اور ان پڑھ ہیں، تیرے خیال میں "ہم" اور "محمدؐ" میں سے کون حق سے زیادہ نزدیک ہے۔

کعب نے کہا: اپنا دین میرے سامنے تفصیل سے بیان کرو۔

ابوسفیان نے کہا: ہم حاجیوں کے لیے بڑے بڑے اونٹوں کی قربانی کرتے ہیں انہیں پانی پلاتے ہیں۔ مہمان نوازی کرتے ہیں، قیدیوں کو آزاد کرتے ہیں۔ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ اپنے پروردگار کے گھر کو آباد کرتے ہیں۔ اس کے گرد طواف کرتے ہیں اور ہم سرزمین مکہ میں اللہ کے اہل ہیں۔ لیکن محمدؐ اپنے بزرگوں کے دین سے دست بردار ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے رشتہ داروں سے قطع رحمی کی ہے۔ اور قدیمی دین سے نکل گیا ہے اور محمدؐ کا دین نیا اور نوخیز ہے۔

اس پر کعب نے کہا: خدا کی قسم تمہارا دین محمدؐ کے دین سے بہتر ہے۔

اس وقت مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور ان باتوں کا جواب دیا گیا۔

تفسیر

سازشی لوگ

پہلی آیت اس شان نزول کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے یہودیوں کی ایک اور ناپسندیدہ صفت کی تصویر کشی کرتی ہے کہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ہر گروہ کے ساتھ سازشیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے بت پرستوں کو خوش کرنے کے لیے بتوں کے سامنے سجدہ بھی کر لیا اور جو کچھ انہوں نے عظمت اسلام اور صفات پیغمبرؐ دیکھی اور پڑھی تھیں انہیں نظر انداز کر دیا۔ یہاں تک کہ بت پرستوں کو خوش کرنے کے لیے ان کے بے ہودہ اور برائیوں سے معمور مذہب کو اسلام سے بہتر قرار دے دیا باوجودیکہ وہ اہل کتاب تھے اور بت پرستوں کی نسبت اسلام سے ان کے مشترک مسائل کہیں زیادہ تھے۔ اسی لیے آیت بطور تعجب بیان کرتی ہے، کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو کتاب خدا کا کچھ حصہ رکھنے کے باوجود بتوں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں اور باغیوں اور سرکشوں کے ساتھ اظہار ایمان کرتے ہیں (الم تر الی الذین اوتوا نصیبا من الکتاب یؤمنون بالجبت والطاغوت)۔

اس پر بھی قناعت نہیں کی بلکہ انہوں نے کافروں سے کہا کہ تمہارا راستہ مسلمانوں کی نسبت ہدایت سے زیادہ قریب ہے (ویقولون للذین کفروا ھؤلاء اھدیٰ من الذین اٰمنوا سبیلا)۔

جبت و طاغوت

لفظ "جبت" قرآن مجید میں صرف اسی آیت میں استعمال ہوا ہے۔ یہ اسم جامد ہے اس کے مشتقات نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ دراصل یہ حبشی زبان کا ایک لفظ ہے جو "جادو" جادو گر، یا شیطان کے معنی میں ہے۔ پھر یہ عربی زبان میں اگر اس معنی میں یا بت غیر "خدا" کے علاوہ ہر معبود کے لیے استعمال ہونے لگا کہا جاتا ہے کہ یہ اصل میں "جبس" تھا اس کے بعد اس کی "س" "ت" سے بدل گئی۔
لفظ "طاغوت" قرآن میں آٹھ مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ اس کی تفسیر پہلی جلد میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۶ کی ذیل میں آ چکی ہے کہ یہ طغیان کے مادہ سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور سرحد سے تجاوز کرنے کے معنی میں آتا ہے[1] اور اس کے مفہوم میں ہر ایسی چیز شامل ہے جو حد سے تجاوز کرنے کا سبب بنے جن میں سے بت بھی ہیں۔ اس لیے بتوں کے لیے[2] یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اس بنا پر شیطان، بت، جابر و متکبر حاکم، خدا کے علاوہ ہر معبود اور ہر وہ راستہ جو غیر حق تک پہنچائے طاغوت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

باقی رہا یہ کہ زیر بحث آیت میں ان دونوں لفظوں سے کیا مراد ہے تو اس بارے میں مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں بعض کہتے ہیں کہ دو بتوں کے نام ہیں جن کے سامنے مذکورہ داستان میں یہودیوں کے ایک گروہ نے سجدہ کیا تھا اور بعض کہتے ہیں کہ جبت کے معنی بت کے ہیں اور طاغوت کے معنی ہیں بت پرست یا بت کا مددگار جو بتوں سے باتیں کرنے کے نام پر کچھ چیزیں اور باتیں بتوں کی طرف سے نقل کرتے اور جھوٹ موٹ ان کی طرف نسبت دیتے تھے تاکہ لوگوں کو دھوکا دے سکیں یہ جو کچھ فی ظلال اور تفسیر میں لکھا گیا ہے یہی مفہوم اس سے مناسبت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہودیوں نے بتوں کے سامنے سجدہ کیا اور بت پرستوں کے آگے بھی سر تسلیم خم کیا۔

اس کے بعد کی آیت میں اس قسم کی سازشیں کرنے والوں کا انجام بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں خداوند عالم نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور جسے خدا تعالیٰ اپنی رحمت سے دور کر دے اس کا تمہیں یار و مددگار کہیں نہیں ملے گا (اولئک الذین لعنہم اللہ ومن یلعن اللہ فلن تجد لہ نصیرا)۔ آیت کے اعلان کے مطابق یہودی اپنی سنگین سازشوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے، آخرکار ناکام ہو کر شکست کھائی اور ان کے بارے میں قرآن کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔

مندرجہ بالا آیتیں اگرچہ ایک خاص گروہ کے بارے میں نازل ہوئی تھیں۔ لیکن یہ مسلم ہے کہ وہ انہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ وہ ایسے تمام لوگوں کے لیے ہیں جو اپنے گھٹیا مقاصد حاصل کرنے کے لیے اپنی حیثیت و شخصیت بلکہ ایمان و اعتقاد کی بازی لگا دیتے ہیں۔ اس قسم کی سازشیں کرنے والے دنیا اور آخرت میں رحمت خدا سے دور ہیں اور اکثر و بیشتر انہیں شکست سے دو[illegible]

---

1. تفسیر المنار جلد سوم صفحہ ۲۰ اور بعض کے نزدیک یہ مصدر ہے، لیکن صفت اور صیغہ مبالغہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔
2. تفسیر تبیان اور تفسیر روح المعانی۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ مذکورہ بالا ناپسندیدہ جذبہ اس قوم میں ابھی تک شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے جس حالت میں بھی ہوں مکاری، فریب کاری اور دھوکا بازی سے منہ نہیں موڑتے۔ اسی وجہ سے وہ گزشتہ طویل تاریخ میں اور آج بھی شکست پر شکست کھا رہے ہیں۔

۵۳۔ اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ۝

۵۴۔ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۝

۵۵۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ۝

ترجمہ

۵۳۔ کیا ان یہودیوں کا حکومت میں کوئی حصہ ہے (جو وہ چاہتے ہیں کہ اس کا فیصلہ کریں) حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ لوگوں کو ان کا کوئی حق نہ دیتے (اور تمام چیزیں اپنے ہی دائرہ اختیار میں رکھتے)۔

۵۴۔ یا یہ کہ وہ لوگوں کے ساتھ (پیغمبرؐ اور ان کے اہلِ بیتؑ سے) اس کے بدلے میں جو خداوند عالم نے اپنے فضل و کرم سے انہیں مرحمت فرمایا ہے حسد کرتے ہیں۔ (وہ کیوں حسد کرتے ہیں) حالانکہ ہم نے آلِ ابراہیم کو (کہ یہودی بھی اسی خاندان سے ہیں) کتاب و حکمت عطا کی اور انہیں ایک عظیم حکومت عطا کی۔

۵۵۔ ان میں سے ایک جماعت تو اس پر ایمان لے آئی لیکن ایک گروہ نے اس کے راستے میں رکاوٹ پیدا کر دی اور جہنم کی آگ کا بھڑکتا شعلہ ان کے لیے کافی ہے۔

تفسیر

گزشتہ دو آیتوں کی تفسیر میں لکھا جا چکا ہے کہ یہودیوں نے مکہ کے بت پرستوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے یہاں تک کہ قریش کی بت پرستی مسلمانوں کی خدا پرستی سے بہتر ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے خود بتوں کے آگے ماتھا رگڑا۔ اس آیت میں اس نکتہ کی یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ دو دلیلوں کی وجہ سے ان کا فیصلہ کوئی حیثیت اور قیمت نہیں رکھتا۔

۱۔ وہ معاشرے میں ایسی حیثیت، مرتبہ اور قدر و قیمت نہیں رکھتے کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کر سکیں۔ لوگوں نے کبھی حکومت یا

انصاف کی خدمت انہیں نہیں سونپی کہ وہ اس کام کی طرف قدم بڑھا سکیں (ام لهم نصيب من الملك)۔ اس کے علاوہ وہ کوئی مادی، روحانی، معنوی اور باطنی طور پر لوگوں پر حکومت کرنے کی لیاقت و قابلیت نہیں رکھتے۔ کیونکہ ان میں دوسروں پر بھروسہ کرنے کی روح ہی نہیں۔ اگر انہیں یہ حیثیت مل بھی جائے تو وہ کسی شخص کو کوئی حق دینے کے لیے تیار نہ ہوں گے بلکہ تمام اختیارات اور خصائص اپنے ساتھ مخصوص کریں گے (فاذا لایؤتون الناس نقیرا)[1] اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ یہودیوں کا جذبہ انصاف ایسا ہے کہ وہ ہمیشہ یا تو اپنے حق میں فیصلہ دیتے ہیں یا پھر ان کے حق میں جو ان کی راہ پر گامزن ہوں، اس لیے مسلمان کبھی اس قسم کی باتوں سے پریشان نہ ہوں۔

۲ ۔ اس قسم کے غلط فیصلے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان سے حسد کی بنا پر ہیں، اس وجہ سے ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ وہ کفرانِ نعمت اور ظلم و ستم کی وجہ سے مقام نبوت و حکومت اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھے ہیں۔ اس لیے وہ نہیں چاہتے کہ یہ الٰہی منصب کسی کے سپرد کیا جائے۔ اس لیے وہ پیغمبر اسلام اور ان کے خاندان سے جنہیں اس نعمت الٰہی سے نوازا گیا ہے حسد کرتے ہیں اور اس قسم کے بے بنیاد فیصلوں سے اپنی حسد کی آگ پر پانی چھڑکتے ہیں (ام یحسدون الناس علی ما اٰتٰھم اللہ من فضلہ)۔ اس کے بعد فرماتا ہے کہ پیغمبر اسلام اور خاندان بنی ہاشم کو یہ منصب ملنے پر کیوں تعجب کرتے ہیں، پریشان ہوتے ہیں اور حسد کرتے ہیں جبکہ خداوند عالم نے آلِ ابراہیم کو آسمانی کتاب، حکمت و دانش اور وسیع حکومت (حضرت موسیٰ، سلیمانؑ اور داؤدؑ کی) دی۔ لیکن افسوس کہ تم نافہم لوگوں نے وہ قیمتی معنوی اور مادی سرمائے شرارت اور قساوت و بے رحمی کے ہاتھوں ضائع کر دیئے (فقد اٰتینا اٰل ابراھیم الکتاب والحکمۃ واٰتینٰھم ملکا عظیما)۔

جو کچھ ہم تحریر کر چکے ہیں اس سے واضح ہو گیا ہے کہ "ام یحسدون الناس" میں "ناس" سے مراد پیغمبر اکرمؐ اور ان کا خاندان ہے۔ کیونکہ "ناس" کے معنی ہیں "لوگوں کی ایک جماعت" اور اس کا اطلاق صرف ایک شخص (پیغمبر اسلام) پر جب تک کوئی قرینہ موجود نہ ہو جائز نہیں ہے۔ کیونکہ لفظ "ناس" اسم جمع ہے اور جمع کی ضمیر جو اس آیت میں اس لفظ کی طرف پلٹ رہی ہے وہ بھی اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔ علاوہ ازیں لفظ آلِ ابراہیم (ابراہیم کا خاندان) دوسرا قرینہ ہے کہ "ناس" سے مراد حضرت رسول اکرمؐ اور آپ کے اہل بیتؑ ہیں۔ کیونکہ قرینہ مقابلہ سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ہم نے خاندان بنی ہاشم کو اس قسم کی عظمت و برتری دی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ ہم حضرت ابراہیمؑ کے خاندان کو اس کی لیاقت کی بنا پر معنوی اور مادی مرتبہ اور حیثیت بخش چکے ہیں۔ بہت سی روایتیں جو اہلِ سنت اور شیعہ کتب میں آئی ہیں ان میں یہ وضاحت موجود ہے کہ "ناس" سے مراد خاندانِ پیغمبرؐ ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے اس آیت کے ذیل میں منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان میں رسول، انبیاء اور پیشوا بنائے ہیں (اس کے بعد خداوند عالم یہودیوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے) تم اس کا تو اعتراف کرتے ہو لیکن آلِ محمدؐ کے بارے میں انکار

---

[1] نقیر مادہ "نقر" (بروزن فقر) سے ہے اس کا مطلب ہے کسی چیز کو اس قدر کوٹنا کہ اس کا اس میں گڑھا اور سوراخ ہو جائے۔ اور منقار (چونچ) کو بھی اسی لیے منقار کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ نقیر بہت چھوٹا سا گڑھا ہوتا ہے جو کھجور کی پشت پر دکھائی دیتا ہے اور زیادہ تر بہت ہی چھوٹی چیزوں کے لیے کنایہ ہے۔

کرتے ہوئے[1]

دوسری حدیث میں ہے کہ اس آیت کے بارے میں حضرت امام جعفر صادق ؑ سے سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

نحن المحسودون

ہم ہیں کہ جن پر دشمنوں نے حسد کیا۔[2]

تفسیر در منثور نے ابن منذر سے اور طبرانی نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ وہ اس آیت کے بارے میں کہتے تھے:

اس آیت میں "ناس" سے مراد ہم ہیں نہ کہ اور لوگ۔

اس کے بعد قرآن اگلی آیت میں فرماتا ہے کہ اس زمانے کے لوگوں کا ایک گروہ اس آسمانی کتاب پر ایمان لایا جو حضرت ابراہیم پر نازل ہوئی تھی اور کچھ لوگ نہ صرف یہ کہ وہ ایمان نہیں لائے بلکہ وہ اس کی تبلیغ اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ ان کے لیے جہنم کی آگ کا بھڑکتا ہوا شعلہ کافی ہے (فمنهم من آمن به ومنهم من صد عنه وكفى بجهنم سعيرا) اسی طرح اس کتاب آسمانی سے جو پیغمبر اسلام پر نازل ہوئی جو لوگ کفر کرتے ہیں وہ بھی اسی عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

حاسدانہ جرائم

حسد جسے فارسی زبان میں رشک کہتے ہیں اس کے معنی دوسروں کی نعمت کا زوال ہے چاہے وہ نعمت حسد کرنے والے کو ملے نہ ملے۔ اس بنا پر حاسد کی آرزو اور خواہش کا مرکز ویران کرنا اور ویران ہونا ہی ہے نہ یہ کہ وہ سرمایہ یا نعمت کسے مل جائے۔

۱ - حاسد اپنی تمام یا زیادہ تر بدنی و فکری طاقتوں کو جنہیں اجتماعی اور معاشرتی مقاصد اور اغراض میں صرف ہونا چاہیے جو کچھ موجود ہے اسے نابود اور ویران کرنے کے لیے خرچ کر دیتا ہے۔ اس طرح اپنے وجود اور معاشرے کو تباہ و برباد کرتا ہے۔

۲ - حسد دنیا کے بہت سے فسادات کی جڑ ہے۔ اگر قتل، چوری، ظلم و ستم اور زیادتیوں کے اصل اسباب و وجوہات کا مطالعہ اور تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے ایک بڑے حصے کی علت اور بنیاد حسد ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اسے آگ کی چنگاری سے تشبیہ دی گئی ہے جو حسد کرنے والے کے وجود یا اس معاشرے کو جس میں وہ زندگی گذار رہا ہے خطرے میں ڈال دے۔ ایک مشہور قول ہے کہ حسد اور بدخواہی سب سے زیادہ خطرناک چیز ہے اسے سعادت اور نیک بختی کا بدترین دشمن سمجھنا چاہیے اور اسے دور کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ایسے درس اور ادارے جن کی بنیاد حاسد اور متعصب لوگ رکھتے ہیں وہ پس ماندہ ہیں۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ حاسد کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو پیچھے دھکیل دے اور یہ چیز روح ترقی و کمال کے خلاف ہے۔

۳ - ان سب باتوں کے علاوہ حسد جسم انسانی پر مضر اثرات ڈالتا ہے۔ عام طور پر حسد کرنے والے رنجیدہ دل اور اعصاب اور دوسرے مختلف اعضائے رئیسہ کے لحاظ سے زیادہ تر دکھ درد اور بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کیونکہ آج یہ حقیقت مسلم شدہ ہے کہ جسمانی بیماریوں کے اکثر نفسیاتی اسباب و عوامل ہوتے ہیں اور دور حاضر کی ڈاکٹری میں تفصیلی مباحث روح جسمانی کی بیماریاں

---

[1] و [2] تفسیر برہان جلد اوّل صفحہ ۳۷۶ اور تفسیر روح المعانی میں بھی اسی مضمون کی ایک حدیث منقول ہے۔ (روح المعانی جلد پنجم صفحہ ۵۴)۔

کے عنوان سے نظر آتی ہیں جو اس قسم کی بیماریوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ رہبرانِ اسلام سے مروی روایات میں یہی بات بیان کی گئی ہے۔ ایک روایت میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

صحة الجسد من قلة الحسد

تندرستی حسد کی کمی کی وجہ سے ہے۔

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

العجب لغفلة الحساد عن سلامة الاجساد۔

تعجب ہے کہ حسد کرنے والے اپنے جسم کی سلامتی سے بالکل غافل ہیں۔

یہاں تک کہ بعض احادیث میں ہے کہ حسد محسود کو نقصان پہنچانے سے پہلے حاسد کو نقصان پہنچاتا ہے اور آہستہ آہستہ اسے مار ڈالتا ہے۔

۴۔ حسد باطنی اور روحانی طور پر وسعت قلب و نظر کی کمی، نادانی، ایمان کی کمزوری، کوتاہ فکری اور نقص کی نشانی ہے۔ کیونکہ حاسد دراصل اپنے آپ کو محسود کے مرتبہ تک پہنچنے سے عاجز پاتا ہے۔ اس لیے وہ محسود کو پیچھے دھکیلنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ عملی طور پر خداوند عالم کی حکمت پر جو ان نعمتوں کا اصل سرچشمہ ہے، اعتراض کرتا ہے اور خداوند عالم کی طرف سے نعمتیں پانے والوں پر انگلیاں اٹھاتا ہے۔ اسی لیے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

الحسد اصله من عمى القلب والجحود لفضل الله تعالى وهما جناحان للكفر و بالحسد وقع ابن آدم في حسرة الابد وهلك مهلكا لا ينجو منه ابدا

حسد اور بدخواہی دل کی تاریکی اور اندھا پن ہے اور اس کا سرچشمہ خدا کی نعمتوں کا انکار ہے اور یہ دونوں دل کا اندھا پن اور خدا کی بخشش پر اعتراض، کفر کے دو پر ہیں۔ حسد کے سبب سے فرزند آدم ہمیشہ کی حسرت میں ڈوب گیا اور ایسی ہلاکت میں گرا ہے جس سے ہرگز رہائی حاصل نہیں کر سکتا[1]

خداوند عالم قرآن میں فرماتا ہے:

سب سے پہلا قتل جو روئے زمین پر ہوا اس کا سبب حسد تھا[2]

حضرت امیرالمومنین علیؑ سے نہج البلاغہ میں منقول ہے:

ان الحسد يأكل الايمان كما تأكل النار الحطب

حسد ایمان کو آہستہ آہستہ اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ دھیرے دھیرے لکڑیوں کو کھا جاتی ہے[3]

---

[1] مستدرک الوسائل جلد ۲ صفحہ ۳۲۷۔

[2] مائدہ ۔ ۲۷۔

[3] نہج البلاغہ خطبہ ۸۶۔

کیونکہ حسد کرنے والے کی خدا کی حکمت اور عدالت سے بدگمانی آہستہ آہستہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور یہی بدگمانی ہے جو اُسے ایمان کی وادی سے نکال کر جہنم کے گڑھے میں ڈال دیتی ہے۔ حسد کے بہت سے روحانی، مادی، انفرادی اور اجتماعی نقصانات ہیں۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے یہ دراصل ان کی ایک فہرست ہے۔

۵۶۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝

۵۷۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۡ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ۝

ترجمہ

۵۶۔ وہ لوگ جو ہماری آیتوں کا انکار کرتے ہیں عنقریب ہم انہیں آگ میں ڈال دیں گے۔ جب ان کی جلد جل جائے گی ہم انہیں دوسری جلد دیں گے تاکہ وہ سزا کا مزہ چکھتے رہیں۔ خدا توانا، قادر اور حکیم ہے (وہ گناہوں کے مطابق سزا دے گا)۔

۵۷۔ اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہ عنقریب باغاتِ بہشت میں داخل ہوں گے، جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور انہیں ایسے گھنے سایوں میں لے جائیں گے جو منقطع نہ ہوں گے۔

تفسیر

گذشتہ آیتوں کے بعد ان دو آیتوں میں ایماندار اور بے ایمان کے انجام کی وضاحت کی گئی ہے۔ پہلی آیت اعلان کرتی ہے کہ ہم کافروں کو آگ میں ڈالیں گے اور جس وقت ان کے بدن کی کھال جل جائے گی تو دوسری کھال لگا دیں گے تاکہ وہ خداوندِ عالم کی سزا کا دیر تک مزا چکھیں (ان الذین کفروا بایاتنا سوف نصلیهم نارًا کلما نضجت جلودهم بدلنٰهم جلودًا غیرها لیذوقوا العذاب)۔[1]

[1] نصلیهم "صلی" کے مادہ سے آگ میں ڈالنے اور آگ میں جلنے یا آگ سے گرم ہونے کے معنی میں ہے۔ نضجت "نضج" کے مادہ سے پک جانے کے معنی میں ہے۔

کمال کے تبدیل ہونے کا سبب بظاہر یہ ہے کہ ممکن ہے جلد کے جل جانے کے بعد درد کم محسوس ہو۔ مگر اس وجہ سے تاکہ سزا میں تخفیف نہ ہو بلکہ وہ پورے زور پر ہے اس کے جسم پر نئی جلد چڑھا دی جائے گی۔ یہ حق وعدالت کو پاؤں تلے روندنے اور خدا کے حکم سے منہ موڑنے پر اصرار کا نتیجہ ہے۔ آیت کے آخر میں فرماتا ہے، خدا اس قسم کی سزا دینے پر قادر و توانا ہے اور صاحبِ حکمت بھی ہے وہ حساب کے مطابق سزا دیتا ہے (ان اللّٰہ کان عزیزاً حکیماً)۔

اس کے بعد میں آنے والی آیت میں ان افراد کو جو ایمان اور عمل صالح رکھنے والے ہیں وعدہ کرتا ہے کہ وہ انہیں بہت جلد جنت کے ان باغوں میں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں داخل کرے گا جہاں ایک ابدی اور جاودانی زندگی ہوگی۔ اس کے علاوہ انہیں پاک بیویاں دی جائیں گی جو ان کی روح اور جسم کی تسکین اور آرام کا سبب ہوں گی اور وہ ایسے درختوں کے سائے میں زندگی بسر کریں گے جو اس دنیا کی عارضی چھاؤں کے خلاف ہمیشہ رہنے والے سائے ہوں گے۔ وہاں کبھی گرمی کی لو اور سردی کی ہوا کا گزر نہ ہوگا (والذین اٰمنوا و عملوا الصّٰلحٰت سندخلھم جنات تجری من تحتھا الانھٰر خالدین فیھا ابدا لھم فیھا ازواج مطھرۃ وندخلھم ظلاً ظلیلاً)[1]

یہ نکتہ لائق توجہ ہے کہ ان دونوں آیتوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ اور موازنہ کرنے سے رحمتِ الٰہی کی وسعت اور اس کی رحمت کا اس کے غضب سے بڑھ چڑھ کر ہونا معلوم ہوتا ہے کیونکہ پہلی آیت میں کفار کو سزا دینے کا وعدہ کرنے کے لیے لفظ "سوف" کا ذکر فرمایا ہے جبکہ دوسری آیت میں ایماندار افراد کے لیے "س" کے لفظ سے (سندخلھم) جزا کا وعدہ کیا ہے۔ عربی ادب میں ہے کہ "سوف" عام طور پر مستقبل بعید کے لیے اور "س" مستقبل قریب کے لیے استعمال ہوتا ہے حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ دونوں آیتیں قیامت کے دن سے متعلق ہیں اور اس دنیا میں بدکاروں کی سزا اور نیکوں کی جزا ہماری نسبت فاصلۂ زمانی کے لحاظ سے یکساں ہے۔ یہ فرق اس لیے ہے تاکہ خدا کی رحمت کی سرعت و وسعت اور غضب کی دوری اور اس کی حد بندی کی طرف اشارہ ہو جائے اور یہ اس کی مانند ہے جیسے ہم دعاؤں میں پڑھتے ہیں:

یامن سبقت رحمتہ غضبہ

اے وہ ذاتِ اقدس جس کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے کہ کچھ لوگ یہ اعتراض کریں کہ آیاتِ مندرجہ بالا کہتی ہیں کہ جس وقت بدکاروں کی جلد جلے گی تو ہم اس کی جگہ دوسری جلد دے دیں گے تاکہ وہ سزائے الٰہی میں گرفتار رہیں۔ گناہگار جلد کی بجائے بے گناہ نئی جلد کو سزا دینا عدالت خداوندی کے مطابق نہیں ہے۔

مشہور و معروف مادہ پرست ابن ابی العوجاء نے جو حضرت امام جعفر صادقؑ کا ہم عصر تھا بالکل یہی سوال آپؑ سے کیا تھا اور

---

[1] ظلیل مادہ "ظل" سے سایہ کے معنی میں ہے اور یہاں تاکید کے لیے استعمال ہوا ہے کیونکہ ظل ظلیل گھنے سائے کے معنی دیتا ہے اور یہ کنایہ ہے ہمیشہ رہنے والے خوشگوار گھنے سائے کے لیے۔

آیت مندرجہ بالا پڑھ کر کہا تھا:

ما ذنب الغیر

نئی جلد اور کھال کا کیا قصور ہے۔

حضرت امام صادقؑ نے اسے مختصر لیکن پر معانی جواب دیا فرمایا:

هی هی وهی غیرها

یعنی نئی جلد وہی پرانی جلد ہے باوجود اس کے کہ اس کی بجائے ہے۔

ابن ابی العوجا رجانتا تھا کہ اس مختصر سی عبارت میں کوئی راز پوشیدہ ہے۔ اس لیے کہنے لگا۔

مثل لی فی ذٰلک شیئا من امر الدنیا

اس سلسلے میں میرے لیے کوئی مثال دیجیے۔

امام نے فرمایا:

ارءیت لو ان رجلا اخذ لبنة فکسرها ثم ردها فی ملبنها فهی هی وهی غیرها

یہ اس طرح ہے کہ ایک شخص اینٹ کو توڑتا ہے اور ریزہ ریزہ کر کے دوبارہ سانچے میں ڈال دیتا ہے اور نئی اینٹ بناتا ہے۔ تو یہ دوسری اینٹ وہی پہلی اینٹ ہے باوجود اس کے کہ نئی اینٹ بھی ہے (اس کا اصلی مادہ محفوظ ہے صرف اس کی شکل بدل گئی ہے)[۱]۔

اس روایت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نئی جلد اسی پرانی جلد سے تیار ہو گی۔ ضمناً یاد رکھیے کہ حقیقت میں سزا و جزا انسان کی روح اور قوت ادراک سے تعلق رکھتی ہے۔ جسم تو صرف سزا و جزا کو روح کی طرف منتقل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

۵۸۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝

ترجمہ

۵۸ خداوند عالم تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو پہنچا دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو عدل کے مطابق فیصلہ کرو۔ خدا تمہیں اچھی نصیحت اور وعظ کرتا ہے۔ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

---

[۱] مجالس شیخ و احتجاج طبرسی۔

تفسیر مجمع البیان اور دوسری اسلامی تفسیروں میں ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب حضرت پیغمبر اکرمؐ فتح مبین کے ساتھ شہر مکہ میں داخل ہوئے اور عثمان بن طلحہ کو جو خانۂ کعبہ کا کلید بردار تھا طلب فرمایا اور اس سے چابی لی تاکہ خانۂ خدا کو بتوں سے پاک وصاف کریں۔ حضرت عباس نے جو حضرت رسول اکرمؐ کے چچا تھے، اس کام سے فراغت پانے کے بعد تقاضا کیا کہ خدا کے گھر کی چابی انہیں دے کر بیت اللہ کی کلید برداری کا منصب ان کے سپرد کر دیں۔ یہ منصب عربوں میں ایک بلند و بالا مرتبہ تھا گویا عباس چاہتے تھے کہ اپنے بھتیجے کے اجتماعی اور سیاسی اثر و رسوخ سے ذاتی نفع حاصل کریں لیکن پیغمبر اکرمؐ نے اس تقاضا کے خلاف خانۂ کعبہ کو بتوں کی نجاست سے پاک کرنے کے بعد کعبہ کا دروازہ بند کرکے یہ آیت تلاوت فرماتے ہوئے: ان اللہ یأمرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا [1] چابی عثمان بن طلحہ ہی کو دے دی۔

تفسیر

دو اہم اسلامی قانون

زیر نظر آیت اگرچہ بہت سی دوسری آیتوں کی طرح خاص موقع اور محل پر نازل ہوئی ہے لیکن واضح ہے کہ اس سے ایک عام حکم کا پتہ چلتا ہے آیت تفصیل سے بتاتی ہے کہ خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حقداروں کو دے دو۔ واضح ہے کہ یہاں امانت کا لفظ ایک وسیع معنی میں ہے اور وہ ہر قسم کی مادی اور روحانی چیزوں اور امور پر محیط ہے ہر مسلمان اس آیت کے مطابق ذمہ دار ہے کہ کسی کی امانت میں (کسی استثناء کے بغیر) خیانت نہ کرے۔ صاحب امانت مسلمان ہو کہ غیر مسلم اور یہ حقیقت میں اسلام میں حقوق انسانی کا اعلان ہے جس میں تمام انسان برابر ہیں۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا شانِ نزول میں امانت صرف ایک مادی امانت نہیں تھی اور دوسرا فریق مشرک تھا۔

آیت کے دوسرے حصے میں ایک اور اہم قانون کی طرف اشارہ ہے اور وہ ہے حکومت اور قضاوت میں عدالت یہ خبردار کرتی ہے کہ خدا نے تمہیں یہ بھی حکم دیا ہے کہ جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدالت کے مطابق حکم دو (واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل)۔ اس کے بعد ان دونوں احکام کی تاکید کے طور پر فرماتا ہے: خدا تمہیں بہترین وعظ و نصیحت کرتا ہے (ان اللہ نعما یعظکم بہ)۔ پھر تاکید کرتے ہوئے فرمایا ہے: ہر حالت میں خدا تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے۔ وہ تمہاری باتوں کو بھی سنتا ہے اور تمہارے کاموں کو بھی دیکھتا ہے (ان اللہ کان سمیعا بصیرا)۔ یہ قانون بھی کلی اور عمومی ہے اور

---

[1] بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی اس لیے وہ مندرجہ بالا شانِ نزول کو صحیح نہیں مانتے تاہم چاہے یہ شانِ نزول درست ہو یا نہ ہو، اس اہم قانون پر جو آیت سے نکلتا ہے کسی قسم کا اثر نہیں پڑتا۔

ہر قسم کی قضاوت اور فیصلہ پر حاوی ہے۔ چاہے وہ بڑے امور سے تعلق رکھتا ہو یا چھوٹوں سے۔ یہاں تک اسلامی احادیث میں مرقوم ہے کہ ایک دن دو چھوٹے چھوٹے بچوں نے تحریر لکھی تھی اور وہ دونوں اپنا فیصلہ کرانے حضرت امام حسنؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت علیؑ نے جو اس معاملے کو دیکھ رہے تھے اپنے فرزند ارجمند سے فرمایا:

یا بنی انظر کیف تحکم فان هذا حکم والله سائلك عنه یوم القیٰمة

میرے نورِ نظر خوب غور کرو کہ کیا فیصلہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کی قضاوت ہے اور خدا قیامت کے دن تجھ سے اس کے بارے میں سوال کرے گا۔[1]

یہ دونوں اہم اسلامی قانون یعنی حفظِ امانت اور قضاوت میں عدالت ایک پاکیزہ انسانی معاشرے کا سنگ میل ہیں۔ کوئی معاشرہ چاہے وہ مادی ہو کر روحانی ان ہر دو اصولوں پر عمل پیرا ہوئے بغیر منظم نہیں ہوسکتا۔ پہلا اصول یہ ہے کہ اموال، ثروت، ذخائر کی ذمہ داریاں، انسانی سرمائے، ثقافتی اور تاریخی دستاویزات، میراث اور تبرکات سب خدائی امانتیں ہیں، جو معاشرے کے مختلف افراد کے سپرد ہوتی ہیں اور سب کی ذمہ داری ہے کہ اپنی اپنی امانتوں کی حفاظت کریں۔ انہیں ان کے اصلی مالکوں کو دینے کی کوشش کریں اور ان میں کسی طرح خیانت نہ کریں۔

دوسرا یہ کہ ہمیشہ معاشروں میں اختلاف، تضاد اور خواہشات کا ٹکراؤ پایا جاتا ہے اور قضاوت کے ذریعے اس کا حل اور فیصلہ کرنا چاہیے تاکہ سوسائٹی اور سماج سے گروہ بندی، بے جا امتیازات اور ظلم و ستم ختم ہو جائے۔

جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں امانت صرف ان اموال تک محدود نہیں جن کو لوگ ایک دوسرے کے سپرد کرتے ہیں۔ بلکہ علماء اور دانشمند بھی معاشرے کے امانتدار ہیں۔ جن کا یہ فریضہ ہے کہ وہ حقائق کو نہ چھپائیں۔ یہاں تک کہ اولاد بھی انسان کے پاس خدا کی امانت ہے اگر ان کی تعلیم و تربیت میں کوتاہی کی جائے تو یہ بھی امانت میں خیانت ہے اس سے بڑھ کر یہ کہ انسان کا اپنا وجود اور ہستی مادی و معنوی اور قابلیتیں جو خدا نے اُسے مرحمت فرمائی ہیں سب خداوند عالم کی امانتیں ہیں، جن کے بارے میں انسان ذمہ دار ہے کہ ان کی حفاظت کی کوشش کرے۔ جسم و روح کی استعداد، جوانی کی طاقت اور فکری صلاحیت کی حفاظت میں بھی کوتاہی نہیں کرنا چاہیے اس لیے تو انسان خودکشی تو کیا اپنے آپ کو کسی قسم کا ضرر بھی نہیں پہنچا سکتا۔ یہاں تک کہ بعض اسلامی احادیث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسرار و علوم اور امامت کی امانتیں جنہیں ہر امام آنے والے امام کے سپرد کرتا ہے، وہ بھی اس آیت کے مفہوم میں داخل ہیں۔[2]

یہ بات لائق توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں امانت کی ادائیگی کو عدالت پر مقدم رکھا گیا ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ مسئلہ عدالت ہمیشہ فیصلہ میں خیانت کے موقع پر ضروری ہوتا ہے کیونکہ اصل اور بنیاد یہ ہے کہ سب لوگ امین ہوں لیکن اگر ایک فرد یا کئی افراد اس سے روگردانی کریں تو عدالت کی نوبت آتی ہے کہ انہیں ان کے فریضہ سے آشنا کیا جائے۔

---

[1] مجمع البیان جلد سوم صفحہ ۶۴۔

[2] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۴۹۶۔

اسلام میں امانت اور عدالت کی اہمیت

اسلامی کتب اور مصادر میں امانت اور عدالت کے بارے میں اتنی تاکید کی گئی ہے جو باقی احکام میں بہت کم نظر آتی ہے ذیل کی چند حدیثیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں۔

۱۔ حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

لا تنظروا الی طول رکوع الرجل و سجوده فان ذٰلك شیء اعتاده فلو ترکه استوحش ولکن انظروا الی صدق حدیثه و اداء امانته

کسی شخص کے صرف طویل رکوع و سجود کو نہ دیکھو۔ کیونکہ ہوسکتا ہے وہ اس کا عادی ہو چکا ہو اور اب اُسے چھوڑنے سے اُسے وحشت ہوتی ہو البتہ بات میں اس کی سچائی اور اس کی امانت کی ادائیگی کی طرف دیکھو[1]

۲۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادقؑ ہی سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام نے جو مرتبہ اور مقام پیغمبر اسلامؐ کے ہاں پایا وہ بات میں سچائی اور امانت کی ادائیگی کی وجہ سے تھا[2]

۳۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادقؑ نے اپنے ایک ماننے والے سے فرمایا:

ان ضارب علی بالسیف و قاتله لو ائتمنی و استنصحنی و استشارنی ثم قبلت ذٰلك منه لادیت الیه الامانة۔[3]

اگر حضرت امیرالمومنین علیؑ کا قاتل میرے پاس کوئی امانت رکھتا یا مجھ سے نصیحت طلب کرتا یا مجھ سے مشورہ لیتا اور میں ان امور کے لیے تیار ہو جاتا، تو میں یقیناً حقِ امانت ادا کرتا۔

۴۔ جو روایات شیعہ و سنی کتب میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہیں ان میں آپؐ کا یہ روشن اور عظیم فرمان بھی ہے:

آیة المنافق ثلاث اذا حدث کذب و اذا وعد اخلف و اذا ائتمن خان

منافق کی تین نشانیاں ہیں ۱۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے ۲۔ جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اور ۳۔ جب امانت اس کے سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کرے[4]

۵۔ پیغمبر اسلامؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

جب لڑائی جھگڑے کے طرفین تمہارے پاس آئیں تو ان کی طرف دیکھنے اور ان سے گفتگو کی مقدار اور کیفیت میں مساوات اور عدالت کو پیش نظر رکھو۔

حدیث کی عربی عبارت یوں ہے: اسو بین الخصمین فی لحظك و لفظك[5]

---

[1] ، [2] ، [3] نورالثقلین جلد اوّل صفحہ ۴۹۶۔

[4] صحیح ترمذی و نسائی بحوالہ المنار۔ یہی مضمون سفینۃ البحار میں ہے۔

[5] مجمع البیان جلد سوم صفحہ ۶۴۔

۵۹۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۖ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝

ترجمہ

۵۹۔ اے ایمان والو! خدا کی اطاعت کرو اور رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو اور جب کسی چیز میں جھگڑو تو اگر خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اسے خدا اور پیغمبر کی طرف لوٹا دو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا انجام و اختتام بہت اچھا ہے۔

تفسیر

یہ آیت اور بعد کی چند آیتیں ایک اہم ترین اسلامی مسئلے یعنی مسئلہ رہبری کے بارے میں بحث کر رہی ہیں اور مسلمانوں کے مختلف دینی اور اجتماعی مسائل میں حقیقی مراجع (جن کی طرف رجوع کیا جائے) کو مشخص اور معین کرتی ہیں سب سے پہلے ایمانداروں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ خداوند عالم کی اطاعت کریں اور یہ بات روشن ہے کہ ایک ایماندار شخص پر واجب ہے کہ اس کی تمام اطاعتوں کی انتہا خداوند عالم کی اطاعت پر ہو اور اس کے حکم کے مطابق ہر قسم کی رہبری کا سرچشمہ اس کی ذات گرامی ہو۔ کیونکہ جہانِ ہستی کا مالک تکوینی اور حاکم اعلیٰ وہی ہے۔ اس لیے ہر قسم کی حاکمیت، مالکیت اسی کے فرمان کے مطابق ہونا چاہیے

(یا ایها الذین آمنوا اطیعوا اللّٰہ)۔

دوسرے مرحلے میں پیغمبر اکرمؐ کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ وہ رسولؐ جو معصوم ہے اور کبھی ہوا و ہوس سے بات نہیں کرتا۔ پیغمبرؐ جو لوگوں میں خدائی نمائندہ ہے جس کی بات خدا کی بات ہے، اسے یہ مرتبہ یہ بلند مقام خداوند عالم نے مرحمت فرمایا ہے اس وجہ سے کہ خدا کی اطاعت تو اس کی ذات کی خالقیت و مالکیت کی بنا پر ہے لیکن حضورؐ کی اطاعت فرمانِ پروردگار کی وجہ سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں خدا بالذات واجب الاطاعت ہے اور پیغمبرؐ بالغیر واجب الاطاعت ہیں۔ شاید آیت میں اطیعوا کا تکرار اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی دونوں اطاعتوں میں یہ فرق ہے (واطیعوا الرسول)۔

تیسرے مرحلے میں اولوا الامر کی اطاعت کا حکم ہے جو اسلامی معاشرے میں سے ہو اور لوگوں کے دین و دنیا کی حفاظت کرے

اولوا الامر کون ہیں؟

اس بارے میں مفسرین اسلام میں بہت اختلاف ہے جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے:

۱۔ اہل سنت کے کچھ مفسرین کا نظریہ ہے کہ اولوالامر سے مراد ہر زمانے اور ہر ماحول سے تعلق رکھنے والے بادشاہ اور صاحبان اقتدار ہیں۔ وہ اس میں کسی استثناء کے قائل نہیں ہیں۔ اس نظریے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ہر حکومت کی چاہے وہ کسی شکل میں کیوں نہ ہو پیروی کریں۔ چاہے وہ تاتاریوں کی حکومت کیوں نہ ہو۔

۲۔ بعض دوسرے مفسرین مثلاً صاحب تفسیر المنار و صاحب تفسیر ظلال القرآن وغیرہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اولوالامر سے مراد عام طبقات کے نمائندے، سربراہ، حکام، علماء اور کوائف زندگی کے تمام عہدہ دار ہیں لیکن مطلق طور پر نہیں اور کسی شرط، قید اور پابندی کے بغیر نہیں بلکہ ان کی اطاعت کے لیے یہ پابندی اور شرط ہے کہ ان کے احکام اسلام کے مقرر کردہ احکام کے خلاف نہ ہوں۔

۳۔ بعض دوسرے مفسرین کا اعتقاد ہے کہ اولوالامر سے مراد وہ معنوی اور فکری رہنما یعنی علماء ہیں جو عادل ہوں اور کتاب و سنت سے مکمل آگاہی رکھتے ہوں۔

۴۔ بعض اہل سنت کے مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ اس لفظ سے مراد پہلے چار خلفاء ہیں اور یہ لفظ انہی تک محدود ہے اس وجہ سے دوسرے زمانوں میں اولوالامر نہ ہوگا۔

۵۔ بعض مفسرین اولوالامر سے مراد اصحاب پیغمبر لیتے ہیں۔

۶۔ اولوالامر کی تفسیر میں ایک اور احتمال یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ اس سے مراد اسلامی لشکروں کے سپہ سالار ہیں۔

۷۔ تمام شیعہ مفسرین اس سلسلے میں ایک متفق نظریہ رکھتے ہیں کہ اولوالامر سے مراد ائمہ معصومین ہیں۔ جن کو تمام امور زندگی میں اسلامی معاشرے کی مادی اور روحانی رہنمائی خدا اور پیغمبر کی طرف سے سپرد کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ یہ لفظ کسی پر صادق نہیں آتا۔ البتہ ایسے لوگ جو ان کی طرف سے کسی مرتبے یا عہدے کے لیے مقرر کیے جائیں اور اسلامی معاشرے کے کسی عہدہ پر فائز ہوں تو معینہ شرائط کے ساتھ ان کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ لیکن یہ اس لحاظ سے نہیں کہ وہ اولوالامر ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اولوالامر کے نمائندے ہیں۔ اب مندرجہ بالا تفسیر کی تحقیق اور مطالعہ کے لیے پوری تن دہی سے توجہ دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ پہلی تفسیر کسی طرح بھی مفہوم آیت اور تعلیمات اسلام [illegible] سے مطابقت نہیں رکھتی ممکن نہیں ہے ہر حکومت کی اطاعت و پیروی کسی قید و شرط کے بغیر خدا و رسول کی اطاعت کے ساتھ ملا دی جائے۔ اسی بنا پر شیعہ مفسرین کے علاوہ اہل سنت کے بڑے بڑے مفسرین نے بھی اس کی نفی کی ہے۔

دوسری تفسیر بھی آیت کے معانی و مفہوم کے ساتھ سازگار نہیں کیونکہ آیت اولوالامر کی اطاعت کو بغیر کسی قید و شرط کے لازم اور واجب قرار دیتی ہے۔

تیسری تفسیر یعنی اولوالامر کی تفسیر کتاب و سنت سے آگاہ علماء و عادل کے ساتھ کرنا بھی آیت کے مطابق نہیں ہے کیونکہ علماء کی اطاعت بھی کچھ شرائط سے مشروط ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی بات کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو۔ اس وجہ سے اگر وہ اشتباہ میں پڑ جائیں (چونکہ وہ معصوم نہیں ہیں اس لیے انہیں اشتباہ ہو سکتا ہے) یا اور کسی وجہ سے حق سے منہ موڑ لیں تو

اس صورت میں ان کی اطاعت ضروری نہیں ہوگی جبکہ آیت اولوالامر کی اطاعت مطلق اطاعتِ پیغمبر کی طرح لازم قرار دے رہی ہے علاوہ ازیں علماء کی اطاعت تو ان احکام میں ہے جن کا وہ کتاب وسنت سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس بنا پر ان کی اطاعت خدا تعالیٰ اور پیغمبر کی اطاعت کے علاوہ اور کچھ نہیں اس لیے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

چوتھی تفسیر اولوالامر (کو پہلے چار خلفاء تک محدود کر دینا) تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ آج دنیائے اسلام میں لفظ اولوالامر کا کوئی مصداق نہیں ہے علاوہ ازیں اس تخصیص کے بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

پانچویں اور چھٹی تفسیر میں اس کو صحابہ یا افسران لشکر کے ساتھ مخصوص کرنا، اس پر بھی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

اہلِ سنت کے بعض مفسرین جیسے مصر کے مشہور عالم محمد عبدہ اور معروف مفسر فخرالدین کی بعض باتوں کے مطابق اولوالامر کے معنی ہیں جنہیں دوسرے نمبر پر بیان کیا گیا ہے۔ ان کی نظر میں اس کے مجموعی مفہوم میں اسلامی معاشرے کے مختلف طبقوں کے نمائندے وہ عالم ہوں یا حاکم اور دوسرے طبقوں کے نمائندے شامل ہیں۔ وہ انہیں کچھ شرطوں اور پابندیوں کے ساتھ اولوالامر مانتے ہیں اور ان شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ وہ مسلمان ہوں۔ جیسا کہ منکم سے معلوم ہوتا ہے، ان کا حکم کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو، وہ اپنے اختیار سے حکم دیں نہ کہ مجبوری سے، وہ مسلمانوں کے مصالح کے مطابق حکم دیں اور صرف انہی مسائل کا حکم دے سکتے ہیں جن میں دخالت کا انہیں حق ہے نہ کہ عبادات اور ان چیزوں کا جو کہ اسلام نے مقرر اور معین کر دی ہیں۔ وہ اس مسئلہ کا حکم دینے کا حق رکھتے ہیں جس کے بارے میں نص شرعی نہ ہو ان سب چیزوں کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سب متفقہ طور پر اپنا نظریہ پیش کریں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ تمام امت یا ان کے سب نمائندے مل کر غلطی نہیں کر سکتے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ امت اجتماعی طور پر معصوم ہے۔ ان شرطوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قسم کے حکم کی اطاعت مطلق طور پر ہر قسم کی پابندی کے بغیر رسول اکرمؐ کی اطاعت کی طرح واجب ہوگی (اس گفتگو کا نچوڑ یہ ہے کہ اجماعِ امت حجت ہے)۔ لیکن غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس تفسیر میں بھی کئی اشکالات موجود ہیں کیونکہ اوّل تو اجتماعی مسائل میں فکر و نظر کا اتفاق بہت ہی کم مواقع پر ہوتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے زیادہ تر حالات و واقعات میں ہمیشہ بے چینی اور بے اطمینانی رہے گی۔ اگر وہ اکثریت کے نظریہ کو قبول بھی کرنا چاہیں تو پھر یہ اشکال سامنے آئے گا کہ اکثریت کبھی معصوم نہیں ہوتی۔ اس لیے ان کی اطاعت مطلق ہونے کی حیثیت سے لازمی نہ ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ علم اصول میں یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ امام معصوم کو نکال کر تمام امت کے معصوم ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ اس تفسیر کے طرفداروں نے ایک شرط کا ذکر کیا ہے جو یہ ہے کہ ان کا حکم کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو تو اب دیکھنا یہ ہے کہ اس بات کی تشخیص کہ یہ حکم کتاب وسنت کے مطابق ہے کہ مخالف کون کرے گا یقیناً مجتہدین اور کتاب و سنت سے آگاہ علماء ہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ تو اس تحریر کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مجتہدین اور علماء کی اجازت کے بغیر اولوالامر کی اطاعت جائز نہیں کیونکہ اہلِ علم کی اطاعت تو اولوالامر کی اطاعت سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہے اور یہ مفہوم تو ظاہر بظاہر آیت شریفہ کے مطابق نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ انہوں نے علماء کو بھی اولوالامر کا جزو قرار دیا ہے لیکن حقیقت میں اس تفسیر کے مطابق اہلِ علم باقی طبقاتی نمائندوں کی نسبت مرجع عالی تر اور ناظر کی حیثیت رکھتے ہیں نہ کہ دوسرے کیونکہ علماء اور دانشمند دوسروں کی نسبت یہ بہتر جانتے ہیں کہ کوئی چیز

کتاب و سنت کی نظر سے درست ہے یا نہیں۔ اس بنا پر وہ مرجع اعلیٰ ہوں گے۔ اور یہ مندرجہ بالا تفسیر کے ساتھ موافق نہیں ہے اس بنا پر مذکورہ تفسیر کئی پہلوؤں سے اشکالات کا سامنا ہے واحد تفسیر جو مذکورہ اعتراضات کی زد میں نہیں آسکتی وہ ساتویں تفسیر ہی ہے (یعنی اولوالامر سے مراد معصوم رہبر اور ائمہ ہیں) کیونکہ یہ تفسیر اس وجوب اطاعت کے اطلاق کے ساتھ ہے جس کا مندرجہ بالا آیت سے پتہ چلتا ہے۔ اور یہ اس کے ساتھ سو فی صد موافقت رکھتی ہے کیونکہ مقام "عصمت" ایسے امام کے ہر خطا، گناہ اور اشتباہ سے محفوظ ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ اس لیے اس کا ہر حکم فرمان پیغمبرؐ کی طرح کسی قید و شرط کے بغیر واجب الاطاعت ہے اور یہ اس امر کی استعداد رکھتا ہے کہ رسولؐ کی اطاعت کا ہم ردیف اور ہم پلہ قرار پائے۔ یہاں تک کہ "اطیعوا" کی تکرار کے بغیر اس کا عطف رسولؐ پر ہو۔

ایک قابلِ توجہ بات

بعض مشہور علمائے اہلِ سنت نے بھی جن میں سے مشہور و معروف مفسر فخرالدین رازی بھی ہیں اس آیت کے بارے میں اپنی تحریر کے شروع میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں خداوندعالم جس شخص کی اطاعت کو قطعی طور پر بے چون و چرا لازم قرار دے یقیناً اسے معصوم ہونا چاہیے کیونکہ اگر وہ معصوم عن الخطا نہ ہوگا تو وہ خطا کرے گا اور خدا تعالیٰ نے اس کی اطاعت لازم قرار دی ہے اور اس کی پیروی خطا کے باوجود ضروری بھی ہے تو اس سے خود حکم خداوندعالم میں تضاد پیدا ہوتا ہے کیونکہ ایک طرف تو اس عمل کا کرنا حرام ہے اور دوسری طرف اولوالامر کی اطاعت واجب ہے۔ اس طرح یہ حکم خدا امر و نہی کے اجتماع کا سبب بن جاتا ہے اس لیے کہ ایک طرف تو خداوندعالم نے اولوالامر کے حکم کی اطاعت کسی شرط اور پابندی کے بغیر واجب قرار دی ہے۔ دوسری طرف اگر اولوالامر معصوم نہ ہو تو اس قسم کا حکم از روئے عقل سلیم صحیح نہیں ہے۔ اس مقدمہ اور تمہید سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت میں جن اولوالامر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے انہیں یقیناً معصوم ہونا چاہیے[1]

فخرالدین رازی اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ معصوم یا تو تمام امت ہے یا اس میں سے چند لوگ۔ یہ دوسرے معنی بھی قابلِ قبول نہیں ہیں کیونکہ ضروری ہے کہ ہم ان چند لوگوں کو پہچانیں اور ان تک پہنچ سکتے ہوں جب کہ ایسا نہیں ہے۔ جب یہ احتمال یا شک دور ہو جاتا ہے تو پہلا احتمال باقی رہ جاتا ہے کہ تمام امت معصوم ہے اور یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اجماع و اتفاقِ امت حجت اور قابلِ قبول ہے اور یہ معتبر اور قابلِ اعتماد دلائل میں شمار کیا جاتا ہے[2]

ہم دیکھ رہے ہیں کہ باوجود اس کے کہ فخر رازی علمی مسائل میں اشکال تراشی کے لیے مشہور ہیں لیکن انہوں نے اس آیت کی اس دلالت کو کہ امام معصوم ہونا چاہیے بسر و چشم قبول کیا ہے۔ اس موقع پر زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ وہ مکتب اہلِ بیتؑ اور اس کے معصوم اماموں اور رہبروں سے ناواقف تھے اس لیے انہوں نے اس بات کو قبول نہیں کیا کہ اولوالامر خدا کے مقرر کیے ہوئے افراد ہونے چاہییں بلکہ وہ مجبور ہو گئے کہ اولوالامر تمام امت یا مسلمانوں کے تمام طبقات کے نمائندوں کو قرار دیں حالانکہ یہ معنی کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں۔ جیسا کہ ہم تحریر کر چکے ہیں کہ اولوالامر تو وہ ہوگا جو اسلامی معاشرے کا رہبر ہو

---

[1] و [2] تفسیر کبیر از فخرالدین رازی، جلد ۱۰، صفحہ ۱۴۴، طبع مصر، ۱۳۵۷ھ

تاکہ اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی گوناگوں مشکلات اس کے ناخن تدبیر سے حل ہوتی رہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تمام امت کا حکومت یہاں تک کہ اس کے نمائندوں کا بھی عملی طور پر اتفاق نہیں ہو سکتا کیونکہ مختلف اجتماعی، سیاسی، ثقافتی، اخلاقی اور اقتصادی مسائل جن سے مسلمانوں کو سابقہ پڑتا ہے ان میں اکثر اوقات تمام امت کا یا ان کے نمائندوں کے اتفاق رائے کا حصول ممکن نہیں ہے اور اکثریت کی پیروی اولوالامر کی پیروی نہیں سمجھی جا سکتی۔ اس بنا پر فخر رازی اور ہمارے معاصر علماء جو اس کے عقیدے کے پیرو ہیں ان کی گفتگو کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ اولوالامر کی اطاعت عملاً معطل رہے یا ایک استثنائی حیثیت سے باقی رہے۔ ہم مندرجہ بالا تمام بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ آیت شریفہ صرف اور صرف معصوم پیشواؤں کی رہبری ثابت کرتی ہے جو امت کی چند خاص ہستیوں پر مشتمل ہیں (غور فرمایئے گا)۔

چند سوالات کا جواب

اس موقع پر مندرجہ بالا تفسیر پر کچھ اعتراض ہوتے ہیں۔ بحث میں غیر جانبداری کا خیال رکھتے ہوئے انہیں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ اگر اولوالامر سے مراد معصوم امام ہیں تو یہ مفہوم لفظ "اولی" کے ساتھ جو جمع ہے، کوئی مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ اس مفہوم کی صورت میں ہر زمانے میں ایک سے زیادہ معصوم امام نہ ہوگا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ ہر زمانے میں ایک سے زیادہ معصوم امام نہیں ہوتا لیکن وہ تمام زمانوں میں بہت سے افراد کی تشکیل سیرت اور تعمیر کردار کرتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ یہ آیت ایک زمانے کی ذمہ داری کا تعین نہیں کر رہی ہے۔

۲۔ اولوالامر اس معنی کے مطابق تو پیغمبرؐ کے زمانے میں موجود نہیں تھا تو اس صورت میں اس کی اطاعت کا حکم کس طرح دیا گیا ہے۔ اس کا جواب بھی گذشتہ جواب سے واضح ہو جاتا ہے کیونکہ آیت کسی معین زمانے کے لیے محدود نہیں ہے بلکہ وہ تمام مسلمانوں کے فرائض کو ہر زمانے کے لیے واضح کر رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ عہد رسالت میں حضورؐ خود اولوالامر تھے کیونکہ حضرت رسولِ اکرمؐ دو منصب رکھتے تھے ایک منصب رسالت اور تبلیغ احکام جو آیت میں اطیعوا الرسول کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے اور دوسرا منصب امت اسلامی کی رہبری اور سربراہی جس کا ذکر قرآن نے اولوالامر کے نام سے کیا ہے۔ اس لیے پیغمبرؐ کے زمانے میں خود پیغمبر معصوم رہبر و پیشوا تھے اور شاید لفظ "اطیعوا" کا عدم تکرار رسول اور اولوالامر کے درمیان اسی معنی کی طرف اشارے سے خالی نہ ہو۔

دوسرے لفظوں میں منصب رسالت اور منصب اولوالامر مختلف منصب ہیں۔ جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود میں ایک جگہ جمع ہیں لیکن یہ امام میں جا کر الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اور امام صرف دوسرا (اولوالامر کا) منصب رکھتے ہیں۔

۳۔ اگر واقعی اولوالامر سے مراد معصوم امام اور رہبر ہیں تو پھر کیوں مسلمانوں کے اختلاف اور جھگڑے کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

فان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الاخر ذلک خیر واحسن تأویلا

اگر کسی چیز میں اختلاف پڑ جائے تو اُسے خدا اور رسولؐ کی طرف پلٹا دو۔ اگر تم خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا انجام بھی بہت ہی اچھا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں اولوالامر کا ذکر نہیں ہے اور اختلاف کو دور کرنے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے وہ خدا کی کتاب اور حضرت رسولِ اکرمؐ کی سنت ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض صرف شیعہ علماء کی تفسیر پر نہیں ہے بلکہ ادنےٰ تامل کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ دوسری تفاسیر پر بھی اس کی زد پڑتی ہے یعنی یہ اعتراض اہلِ سنت کی تفاسیر پر بھی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں شک نہیں کہ مندرجہ بالا جملے میں اختلاف و تنازع سے مراد احکام میں اختلاف ہے نہ کہ ان مسائل سے جن کا تعلق حکومت و رہبری کی جزئیات سے ہے کیونکہ ان مسائل میں تو لازماً اولوالامر کی اطاعت کرنا ہوگی جیسا کہ آیت کے پہلے جملے میں وضاحت ہو چکی ہے۔ اس بناء پر اختلاف سے مراد اسلام کے احکام اور قوانین کلی کا اختلاف ہے جن کی تشریع خدا اور پیغمبر سے متعلق ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ امام تو احکام جاری کرنے والے ہیں نہ کہ قانون وضع کرنے اور منسوخ کرنے والے۔ امام تو ہمیشہ خدا کے احکام اور سنتِ رسولؐ کے اجرا کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ اسی لیے احادیث اہلِ بیتؑ میں ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی شخص کوئی بات کتاب خدا اور حدیث پیغمبرؐ کے خلاف نقل کرے تو اسے ہرگز قبول نہ کرو کیونکہ یہ ناممکن اور محال ہے کہ ہم کتاب خدا اور سنتِ پیغمبرؐ کے خلاف کچھ کہیں۔ اسی لیے احکام و قوانینِ اسلامی میں لوگوں کے اختلافات دور کرنے کا پہلا مرجع خدا اور حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جن پر وحی خدا نازل ہوتی ہے۔ اب اگر ائمہ معصومین احکام بیان کرتے ہیں تو وہ خود ان کی طرف سے نہیں ہیں بلکہ وہ کتاب خدا یا اس علم سے ہیں جو حضرت رسالت مآبؐ کی طرف سے ان تک پہنچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولوالامر کا لفظ اختلافی احکام و مسائل کے حل کرنے والوں میں شامل نہیں ہے [1]

احادیث کی گواہی

اسلامی کتب اور مصادر میں کچھ احادیث موجود ہیں جو اس تفسیر کی تائید کرتی ہے کہ لفظ اولوالامر سے مراد ائمہ اہلبیتؑ ہی ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ مشہور اسلامی مفسر ابوحیان اندلسی مغربی (متوفی ۷۵۶ھ) تفسیر بحرالمحیط میں لکھتا ہے کہ یہ آیت حضرت علیؑ اور ائمہ اہلبیتؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے [2]

۲۔ عالم اہلِ سنت ابوبکر بن مومن شیرازی رسالہ اعتقاد میں (مناقب کاشی کے مطابق) ابن عباس سے نقل کرتا ہے کہ آیتِ مندرجہ بالا

---

[1] اگر اس سورہ کی آیت ۸۳ میں بعض مشکلات کو حل کرنے کے لیے اولوالامر کو مرجع قرار دیا گیا ہے تو اس سے مراد شریعت کے کلی احکام و قوانین کا اختلاف نہیں ہے بلکہ جیسا کہ آیت مذکورہ کی تفسیر میں آئے گا یہ ان مسائل کے بارے میں ہے جو احکام جاری کرنے کے طریقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

[2] بحرالمحیط جلد سوم طبع مصر صفحہ ۲۷۸

حضرت علیؑ کی شان میں اس وقت نازل ہوئی جب پیغمبر اسلامؐ نے انہیں جنگِ تبوک کے موقع پر اپنی جگہ مدینہ منورہ میں چھوڑا تھا اور حضرت علیؑ نے عرض کیا تھا کہ آپ مجھے عورتوں اور بچوں کی طرح شہر میں چھوڑے جاتے ہیں تو پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا تھا:

"اما ترضی ان تکون منی بمنزلة هارون من موسی حين قال اخلفنی فی قومی واصلح فقال عزوجل واولی الامر منکم"

"کیا تم پسند نہیں کرتے کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارونؑ (برادرِ موسیٰؑ) کو موسیٰؑ سے تھی جبکہ موسیٰؑ نے ان سے کہا تھا کہ تم بنی اسرائیل میں میرے جانشین بن جاؤ اور ان کی اصلاح کرو۔ اس کے بعد خداوند عالم نے فرمایا: واولی الامر منکم[1]

شیخ سلیمان حنفی قندوزی جو اہلِ سنت کے مشہور عالم ہیں ینابیع المودة میں کتاب مناقب میں سلیم بن قیس ہلالی سے نقل کرتے ہیں:

ایک دن ایک شخص حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے پوچھا: کم از کم وہ کونسی چیز ہے جس کے باعث انسان مومنین کی صف میں شامل ہو سکتا ہے اور کم از کم وہ کونسی چیز ہے جس سے انسان کافروں یا گمراہ لوگوں میں شمار ہو جاتا ہے۔ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا: کم از کم وہ چیز جس کی وجہ سے انسان گمراہوں میں شامل ہو جاتا ہے یہ ہے کہ وہ خدا کی حجت اور نمائندے اور اس کے شاہد و گواہ کو جس کی اطاعت و ولایت ضروری ہے نہ پہچانے۔ اس شخص نے کہا: اے امیرالمومنینؑ! مجھے ان کا تعارف کرائیے۔ حضرت علیؑ نے فرمایا: وہ وہی ہیں جنہیں خدا نے اپنے پیغمبرؐ کے برابر قرار دیا ہے۔ اور فرمایا ہے:

یاایها الذین آمنوا اطیعوا الله واطیعوا الرسول واولی الامر منکم

اس شخص نے عرض کیا: میں آپ کے قربان جاؤں مزید وضاحت فرمائیے۔ امیرالمومنینؑ نے ارشاد فرمایا: جن کا رسول اللہؐ نے مختلف موقعوں پر اور اپنی زندگی کے آخری دن کے خطبہ میں تذکرہ کیا اور فرمایا:

انی ترکت فیکم امرین لن تضلوا بعدی ان تمسکتم بهما کتاب الله وعترتی اهل بیتی

میں تمہارے درمیان دو چیزیں بطور یادگار چھوڑ رہا ہوں اگر تم ان سے تمسک کرو گے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہوگے خدا کی کتاب اور میری عترت جو میرے اہلِ بیت ہیں[2]

۴۔ نیز یہی عالم کتاب ینابیع المودة میں لکھتے ہیں کہ صاحب کتاب مناقب نے تفسیر مجاہد سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی[3]

۵۔ شیعہ کتب کی متعدد روایات جو کافی، تفسیر عیاشی، کتب صدوق وغیرہ میں منقول ہیں، سب کی سب یک زبان ہو کر گواہی دیتی ہیں کہ اولوا

---

[1] احقاق الحق جلد سوم صفحہ ۴۲۴۔

[2] ینابیع المودة طبع استنبول صفحہ ۱۱۶۔

[3] ینابیع المودة طبع استنبول صفحہ ۱۱۴۔

سے مراد ائمہ معصومین ہیں۔ یہاں تک کہ بعض میں تو ہر ایک امام کا نام صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔[1]

۶۰۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۝

ترجمہ

۶۰۔ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا۔ جو یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ ان (کتب آسمانی) پر جو تم پر اور تم سے پہلے نازل ہوئی ایمان لے آئے ہیں لیکن وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت اور حکام باطل سے فیصلہ کرائیں جبکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ طاغوت کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں بری طرح گمراہ کردے اور (انہیں گمراہی کے دور دراز راستوں میں پھینک دے)۔

شانِ نزول

مدینہ منورہ کے ایک یہودی کو ایک منافق سے کسی چیز میں اختلاف تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک شخص کو قاضی کے طور پر چن لیں۔ یہودی چونکہ پیغمبر اسلام کی عدالت اور غیر جانبداری پر مطمئن تھا اس لیے اس نے کہا کہ میں تمہارے پیغمبر کے فیصلہ پر رضامند ہوں لیکن منافق نے یہودیوں کے ایک بڑے آدمی کعب بن اشرف کو چنا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ رشوت دے کر اس کی رائے کو اپنی طرف پھیرے گا۔ غرض اس نے اس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلہ کرنے کی مخالفت کی اس پر یہ آیہ شریفہ نازل ہوئی جس میں ایسے افراد کی شدید مذمت کی گئی ہے۔[2]

بعض مفسرین نے اس آیت کی دوسری شان نزول بھی نقل کی ہے اور وہ یہ کہ بعض نومسلم زمانۂ جاہلیت کی عادت کے مطابق اسلام کی ابتدا میں اپنے مقدمے یہودی علماء یا کاہنوں کے پاس لے جاتے تھے۔ اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں سختی سے منع کیا گیا۔[3]

---

[1] تفسیر برہان جلد اول آیۂ مذکورہ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

[2] تفسیر مجمع البیان اور اکثر مفسرین نے بھی یہی شانِ نزول نقل کی ہے۔

[3] المنار جلد ۵ صفحہ ۲۲۲۔

تفسیر

طاغوت کا فیصلہ

زیر نظر آیت درحقیقت گذشتہ آیت کی تکمیل کرتی ہے۔ کیونکہ گذشتہ آیت مومنین کو خدا تعالیٰ، پیغمبرؐ اور اولوا الامر کی اطاعت اور کتاب و سنت سے فیصلہ کرانے کی دعوت دیتی ہے اور یہ آیت طاغوت کی اطاعت، پیروی اور اس سے فیصلہ کروانے سے منع کرتی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ طاغوت "طغیان" کے مادہ سے ہے اور یہ لفظ اپنے تمام مشتقات کے ساتھ سرکشی حدود و قیود توڑنے یا ہر اس چیز کے معنی میں جو بغاوت اور سرکشی کا سبب بنے استعمال ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جو باطل کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں وہ طاغوت ہیں، کیونکہ انہوں نے حق و عدالت کی خدائی حدود کو توڑ ڈالا ہے۔

ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

الطاغوت کل من یتحاکم الیہ ممن یحکم بغیر الحق

یعنی جو شخص حق کے خلاف فیصلہ کرے اور لوگ اس کے پاس فیصلہ کرانے کے لیے جائیں وہ طاغوت ہے۔

مندرجہ بالا آیت ان مسلمانوں کو جو اپنے فیصلے کروانے کے لیے ایسے حکام کے پاس جاتے تھے ملامت کرتے ہوئے کہتی ہے، اے رسول: کیا آپ ان لوگوں کو نہیں دیکھتے جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تمام کتابوں پر جو آپ پر اور آپ سے پہلے نبیوں پر نازل ہوئی ہیں ایمان لے آئے ہیں لیکن اس کے باوجود اپنے جھگڑوں کا فیصلہ طاغوت سے کرواتے ہیں جبکہ انہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ ہرگز طاغوت کا حکم نہ مانیں (الم تر الی الذین یزعمون انھم اٰمنوا بما انزل الیک وما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ) اس کے بعد قرآن مزید اعلان کرتا ہے کہ طاغوت کی طرف توجہ ایک ایسا شیطانی جال ہے جو چاہتا ہے کہ لوگوں کو سیدھی راہ سے ہٹا کر دور دراز کے گمراہی کے راستوں میں پھینک دے (ویرید الشیطان ان یضلھم ضلالا بعیدا)۔

واضح ہے کہ مندرجہ بالا آیت دوسری قرآنی آیتوں کی طرح تمام مسلمانوں کو سب زمانوں کے لیے خبردار کرتی ہے کہ حکام باطل کی طرف نہ جاؤ اور طاغوت سے فیصلہ کروانا خدا اور کتب آسمانی پر ایمان لانے کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ یہ کام سیدھی راہ سے ہٹا کر ٹیڑھے راستوں پر ڈال دیتا ہے جو حق کے راستے سے بہت دور ہیں۔ ایسے فیصلوں کی برائیاں اور خرابیاں انسانوں کے اجتماعی معاملات کو تباہ و برباد کرنے کے لحاظ سے کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ معاشروں کی پسماندگی کے اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے۔

۶۱۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۝

۶۲۔ فَكَيْفَ إِذَآ أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَآءُوكَ يَحْلِفُونَ بِٱللَّهِ إِنْ أَرَدْنَآ إِلَّآ إِحْسَٰنًا وَتَوْفِيقًا ○

۶۳۔ أُو۟لَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ يَعْلَمُ ٱللَّهُ مَا فِى قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِىٓ أَنفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيغًا ○

ترجمہ

۶۱۔ جب ان سے کہا جائے کہ جو خدا نے نازل کیا ہے اس کی طرف آؤ اور پیغمبر کی جانب آؤ تو تم دیکھو گے کہ منافق تمہاری دعوت قبول کرنے سے روگردانی کرتے ہیں۔

۶۲۔ جب وہ اپنے اعمال کی وجہ سے کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں تو پھر کیوں تمہارے پاس آکر قسم کھاتے ہیں کہ ہمارا مقصد (دوسروں کے پاس فیصلے جانے سے) نیکی کرنے (اور طرفین نزاع میں) موافقت کروانے کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

۶۳۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو کچھ ان کے دل میں ہے خدا اسے جانتا ہے۔ انہیں (سزا دینے سے) نظر انداز کرو اور انہیں وعظ و نصیحت کرو اور عمدہ بیان کے ساتھ ان کے اعمال ان کے گوش گزار کرو۔

تفسیر

طاغوت کے فیصلے کا نتیجہ

طاغوت اور ظالم و جابر فیصلہ کرنے والوں کی طرف جانے سے منع کرنے کے بعد جس کا ذکر گذشتہ آیت میں آچکا ہے اب ان تین آیتوں میں اسی طرح کے فیصلوں کے نتیجے اور وہ حیلے جن سے منافق سہارا لیتے تھے، ان پر تحقیق اور بحث کی گئی ہے چنانچہ خداوند عالم پہلی آیت میں فرماتا ہے: اس قسم کے مسلمان نما لوگ نہ صرف یہ کہ اپنا فیصلہ کروانے کے لیے طاغوت کے پاس جاتے ہیں بلکہ جب انہیں یاد دہانی کروائی جاتی ہے کہ حکم خدا کی طرف پلٹ آؤ اور پیغمبر کا فیصلہ قبول کرو تو وہ پیغمبر کی دعوت سے منہ موڑ کر روگردانی کرتے ہیں اور اس کام کو کرنے کے لیے اصرار کرتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ حقیقت میں ان کا طاغوت کی طرف لوٹنا وقتی اور ہنگامی نہیں تھا کہ اس کی یاد دہانی سے اصلاح ہو جاتی بلکہ

کا مخالفت کرنا اور اس کام میں ڈٹ جانا ان میں روحِ نفاق کی کارفرمائی اور ایمان کی کمزوری پر روشنی ڈالتا ہے ورنہ وہ پیغمبر کی دعوت سے بیدار ہو جاتے اور اپنی غلطی مان لیتے (واذا قیل لھم تعالوا الیٰ ما انزل اللہ والی الرسول رأیت المنافقین یصدون عنک صدوداً)۔

اس کے بعد کی آیت میں اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ یہی منافق افراد جب اپنے اعمال کے نتیجے میں کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور بچاؤ کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تو پھر بادل ناخواستہ آپ کے پاس آتے ہیں (فکیف اذا اصابتھم مصیبۃ بما قدمت ایدیھم ثم جاؤک)۔

پھر اس موقع پر قسمیں کھاتے ہیں کہ ہمارا دوسروں کے پاس مقدمے لے جانے سے مقصد نیکی کے سوا اور دعویٰ کرنے والوں کے درمیان موافقت اور صلح کروانے کے کچھ نہیں تھا (یحلفون باللہ ان اردنا الا احسانا و توفیقا)۔

یہاں دو نکتوں کی طرف توجہ رکھنا چاہیے۔

پہلا یہ کہ اس مصیبت سے کیا مراد ہے جو انہیں دامن گیر تھی۔ کچھ بعید نہیں کہ اس سے مراد پریشانیاں، بدبختیاں اور عام مصیبتیں ہوں جو طاغوت سے فیصلہ کروانے کے نتیجے میں انہیں پیش آتی تھیں کیونکہ اس میں شک نہیں کہ اگر بُرے اور ظالم لوگوں کے فیصلے سے کوئی وقتی فائدہ طرفین میں سے کسی کو ہو جائے تو زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ اس قسم کے فیصلوں کی بنا ظلم اور فساد پھیلنے کا سبب بن جاتی ہے اور اس وجہ سے معاشرے کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ غرض اس سے لوگ بہت جلد اپنے کاموں کے نتیجوں کو دیکھ لیتے ہیں اور اپنے کیے پر پچھتاتے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ مصیبت سے مراد لوگوں میں منافقوں کی رسوائی اور ذلت ہے یا وہ مصائب ہیں جو خدا کے حکم سے آتے ہیں (مثلاً رنج و غم اور غیر متوقع نقصانات)۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ کیا احسان اور نیکی کرنے سے منافقین کا مقصد طرفین دعویٰ کے ساتھ نیکی اور احسان ہے یا پیغمبر اکرم کے ساتھ حسنِ سلوک ممکن ہے کہ ان کی مراد یہ دونوں باتیں ہوں۔

• انہوں نے غیروں کے پاس مقدمے لے جانے کے مضحکہ خیز بہانے بنا رکھے تھے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ پیغمبر کے پاس مقدمہ لے جانا آنحضرتؐ کی شان کے خلاف ہے کیونکہ اکثر طرفین دعویٰ شور و غل مچاتے ہیں اور یہ چیز مقام پیغمبر کے سراسر خلاف ہے علاوہ ازیں فیصلہ ہمیشہ ایک طرف کے نقصان پر ہوتا ہے اور یہ فطری طور پر لوگوں کو دشمن بنانے کے مترادف ہے گویا وہ یہ حیلے بہانے کر کے اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہتے تھے کہ ہمارا مقصد تو صرف اور صرف پیغمبر اکرمؐ کی اور طرفین دعویٰ کی خدمت تھی یا یہ کہ اصولی طور پر ہمارا نظریہ تضادات نہ تھا بلکہ ہماری تو غرض تو طرفین نزاع میں صلح و صفائی پر تھی۔

لیکن خدا تیسری آیت میں ان کے چہروں سے نقاب اٹھا دیتا ہے اور اس قسم کے جھوٹے بہانوں کو باطل قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جن کے دل کے بھیدوں کو خدا خوب جانتا ہے (اولٰئک الذین یعلم اللہ ما فی قلوبھم) فعلاً عام اس کے باوجود پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیتا ہے کہ انہیں سزا دینے سے چشم پوشی فرمایئے (فاعرض عنھم) اسی لیے حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منافقین کے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے پر جہاں تک ممکن تھا نرمی فرماتے تھے کیونکہ آپ ظاہر پر مامور تھے اور انہیں غیر معمولی جرم کے سوا سزا نہیں دیتے تھے کیونکہ وہ ظاہری طور پر مسلمانوں کی صفوں میں دکھائی دیتے تھے اور ممکن تھا

کہ ان کو سزا ایک قسم کا انتقام بھی جائے۔ اس کے بعد حکم دیتا ہے کہ انہیں وعظ و نصیحت کیجئے اور عمدہ بیان سے ان کے دل پر اثر ڈالیے اور ان کے برے اعمال کے خوشگوار نتائج ان کو بتائیے (وعظهم وقل لهم فی انفسهم قولا بلیغا)۔

۶۴۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَلَوْ اَنَّھُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ جَاۗءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَھُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝

ترجمہ

۶۴۔ ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ حکمِ خدا سے اس کی اطاعت کی جائے اگر یہ مخالفت کرنے والے جو اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں (خدا کے حکم کو پاؤں تلے روندتے ہیں) آپ کے پاس آتے اور خدا سے مغفرت مانگتے اور پیغمبر بھی ان کے لیے استغفار کرتے تو وہ خداوند عالم کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔

تفسیر

قرآن نے گذشتہ آیات میں ظالم حکام اور قاضیوں کی طرف جانے کی مذمت کی ہے۔ اس آیت میں تاکید کے طور پر فرمایا ہے کہ جن پیغمبروں کو ہم بھیجتے ہیں وہ سب کے سب اس لیے ہیں تاکہ حکمِ خدا سے ان کی اطاعت کی جائے اور ان کی کسی قسم کی مخالفت نہ ہونے پائے (وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ) کیونکہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے تھے اور حکومت الٰہیہ کے رئیس بھی تھے اس لیے لوگوں کا فرض تھا کہ وہ خدا کے احکام کے بیان اور ان کی تعمیل میں ان کی پیروی کریں اور صرف ایمان کا دعویٰ کرنے پر قناعت نہ کریں۔ اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کو بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ سب لوگ ان کی طاعت اور فرمانبرداری کریں۔ اگر بعض لوگوں نے اپنی آزادی سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے اطاعت نہیں کی تو یہ ان کی اپنی کوتاہی ہے۔

بنابریں مندرجہ بالا آیت جبریوں کے اس عقیدے کی نفی کرتی ہے کہ کچھ لوگ شروع سے ہی اطاعت پر اور بعض عصیان و نافرمانی پر مامور تھے۔

ضمنی طور پر باذن اللہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جو کچھ خدا کے پیغمبروں کے پاس تھا وہ خداوند عالم کی طرف سے تھا یعنی ان کی اطاعت کا وجوب بالذات نہیں ہے بلکہ وہ خداوند عالم کے فرمان سے اور اسی کی طرف سے ہے۔ اس کے بعد آیت کے آخر میں ان گناہگاروں اور ان لوگوں کے لیے جو طاغوت کی طرف آتے جاتے ہیں یا اور کسی صورت میں گناہ کر چکے ہیں، واپسی کی راہ کھولتے ہوئے فرماتا ہے: جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا اگر وہ آپ کے پاس آجاتے اور خدا سے بخشش طلب کرتے اور پیغمبر بھی ان

کے لیے طلبِ مغفرت کرتے تو خداوند عالم کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے ولو انهم اذ ظلموا انفسهم جاءوك فاستغفروا الله واستغفر لهم الرسول لوجدوا الله توابا رحيما۔

یہ امر توجہ طلب ہے کہ بجائے اس کے کہ قرآن کہتا کہ انہوں نے خدا کی نافرمانی کی ہے اور ظالم حاکموں کی طرف گئے ہیں فرماتا ہے: اذ ظلموا انفسهم۔ یعنی جب انہوں نے اپنے پر ظلم کیا۔ مقصد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے حکم اور پیغمبر کی اطاعت میں تمہارا اپنا ہی فائدہ ہے اور ان کی مخالفت اپنے آپ پر ہی ظلم ہے کیونکہ یہ تمہاری مادی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے اور حقیقت میں معنوی لحاظ پر تمہاری پس ماندگی کا سبب ہے۔

یہ آیت ان لوگوں کے لیے بھی واضح جواب ہے جو پیغمبرؐ اور امامؑ کے وسیلے کو ایک قسم کا شرک جانتے ہیں کیونکہ یہ آیت صراحت کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ بارگاہ پیغمبرؐ میں آنا اور انہیں بارگاہ رب العزت میں شفیع قرار دینا اور ان کے وسیلہ اور ان کی جانب سے دعائے مغفرت توبہ کی قبولیت اور رحمت الٰہی کا ذریعہ ہیں۔ اگر پیغمبرؐ کا واسطہ، دعا، استغفار اور شفاعت شرک ہوتے تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ خدا گنہگاروں کو اس طرح کا حکم دیتا۔ البتہ گنہگاروں کو چاہیے کہ وہ پہلے توبہ کریں اور گناہوں کو ترک کر دیں اس کے بعد اپنی توبہ کی قبولیت کے لیے رسول اکرمؐ سے فیض حاصل کریں۔

واضح ہے کہ پیغمبرؐ خود گناہ معاف نہیں کرتے بلکہ وہ صرف خدا سے مغفرت طلب فرماتے ہیں اور یہ آیت ان لوگوں کے اعتراض کا دنداں شکن جواب ہے جو اس قسم کی وساطت اور وسیلے کا انکار کرتے ہیں (غور فرمایئے گا) یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن یہ نہیں فرماتا کہ تم ان کے لیے طلبِ مغفرت کرو بلکہ کہتا ہے کہ رسولؐ ان کے لیے استغفار کریں۔ گویا یہ اس طرف اشارہ ہے کہ رسول اکرمؐ اپنے مقام اور مرتبے سے انہیں فائدہ پہنچائیں اور توبہ کرنے والے گنہگاروں کے لیے طلبِ مغفرت فرمائیں۔ (یہ معنی یعنی پیغمبرؐ کی طلبِ مغفرت کا مومنین کے لیے کارگر ہونا) قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی آیا ہے مثلاً سورۂ محمدؐ کی آیت ۱۹، سورۂ منافقون کی آیت ۵ اور سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۳۔

حضرت ابراہیمؑ کے اپنے چچا کے لیے استغفار کرنے کے متعلق اور دیگر آیات جو مشرکوں کے لیے استغفار سے منع کرتی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ مومنین کے لیے استغفار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

نیز بعض آیتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض گنہگار مومنین کے لیے فرشتے بھی بارگاہ رب العزت میں طلبِ مغفرت کرتے ہیں مثلاً سورۂ غافر آیت ۷ اور سورۂ شوریٰ آیت ۵۔

غرضیکہ قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اس مفہوم و معانی کا تذکرہ کرتی ہیں کہ پیغمبرؐ، فرشتے یا پاک دل مومن بعض گنہگاروں کے لیے استغفار کرتے ہیں اور ان کی دعا بارگاہ خدا میں اثر رکھتی ہے۔ یہ بات پیغمبرؐ، ملائکہ اور پاک دل مومنین کی طرف سے گنہگاروں کی شفاعت کا معنی بھی دیتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ایسی شفاعت کے لیے خطاکاروں میں خود بھی قابلیت اور استعداد ہونا چاہیے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ کچھ مفسرین کے بعض اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ آیت مندرجہ بالا میں پیغمبر اکرمؐ کے استغفار کو آپ کی ذات تک محدود رکھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ انہوں نے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ظلم و ستم کیا تھا اس لیے ضروری تھا کہ ان کی رضامندی حاصل کریں۔ تاکہ خدا تعالیٰ ان کے گناہ معاف کر دے۔ لیکن واضح ہے کہ پیغمبرؐ کے غیر سے فیصلہ کروانا

صرف پیغمبر پر ظلم نہیں ہے بلکہ اس کے خاص منصب کی مخالفت بھی ہے یا دوسرے لفظوں میں خدا کے فرمان کی مخالفت ہے اگر یہ فرض کریں کہ یہ ذات پیغمبر پر ظلم تھا تب بھی قرآن نے اس کا سہارا نہیں لیا بلکہ قرآن نے تو یہ کہا ہے کہ ان کا طرز عمل فرمانِ خدا کے خلاف تھا۔

علاوہ ازیں اگر ہم کسی پر ظلم کریں تو اس کا رضامند ہو جانا کافی ہے اور بارگاہ خداوندی میں استغفار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ان سب باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بالفرض اگر آیت کی یہ تفسیر کریں تو باقی ان سب آیتوں کے بارے میں جو پیغمبر، فرشتوں اور مومنین کے استغفار کو گنہگاروں کے حق میں مؤثر قرار دیتی ہیں کیا کہیں گے۔ کیا وہاں بھی شخصی حق تھے۔

۶۵۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝

ترجمہ

۶۵ تیرے پروردگار کی قسم وہ مومن نہیں ہو سکتے مگر یہ کہ وہ اپنے اختلافات میں آپ کو حکم اور فیصلہ کرنے والا مانیں اور پھر آپ کے فیصلہ پر اپنے دل میں کوئی ناراضگی محسوس نہ کریں بلکہ اسے مکمل طور پر تسلیم کریں۔

شانِ نزول

زبیر بن عوام جو مہاجرین میں سے تھے ان کا ایک انصاری کے ساتھ (جو مدینہ کے مسلمانوں میں سے تھا) ان باغوں کے سیلاب کرنے کے متعلق جو ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے اختلاف ہو گیا۔ دونوں حضرات اپنے جھگڑے کا فیصلہ کرانے کے لیے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے کیونکہ زبیر کا باغ نہر کے بلند حصہ کی طرف تھا اور انصاری کا باغ نشیب میں تھا۔ اس لیے حضرت رسول اکرمؐ نے زبیر کو حکم دیا کہ پہلے تم اپنے باغ کو پانی دے لو اور اس کے بعد یہ انصاری مسلمان پانی دے (یہاں رواج کے مطابق تھا۔ جو ایک دوسرے کے قریب باغوں کے بارے میں تھا) لیکن وہ انصاری جو بظاہر مسلمان تھا پیغمبر اکرمؐ کے عادلانہ فیصلے سے ناراض ہو کر کہنے لگا کیا آپ نے یہ فیصلہ اس لیے کیا ہے کہ زبیر آپ کی پھوپھی کا بیٹا ہے؟ حضورؐ کو اس کی اس گفتگو سے تکلیف پہنچی یہاں تک کہ آپ کے چہرے کا رنگ دگرگوں ہو گیا۔ اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس میں ایسے مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی

بعض دوسری اسلامی تفسیروں میں اس کے علاوہ اور شانِ نزول کا بھی ذکر ہے۔ جو بیان کی گئی شانِ نزول سے تھوڑے بہت ملتے جلتے ہیں [۱]

---

[۱] تفسیر تبیان، طبری اور المنار۔

تفسیر

حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا

اگرچہ آیت مندرجہ بالا کے ابتدائی حصے کے بارے میں شانِ نزول بیان کی جا چکی ہے تاہم جیسا کہ ہم بارہا لکھ چکے ہیں کہ آیت کی مخصوص شانِ نزول کبھی اس کے عام مفہوم کے خلاف نہیں ہوتی۔ اس بنا پر ہو سکتا ہے کہ یہ آیت گذشتہ آیات کی بحث کی تکمیل کرتی ہو۔ غرض خداوند عالم اس آیت میں قسم کھا کر فرماتا ہے کہ انسانوں کا ایمان حقیقی اور واقعی اس وقت ہوگا جب وہ اپنے اختلافات میں پیغمبر کو فیصل اور حاکم مانیں اور دوسروں کی طرف رجوع نہ کریں (فلا وربك لا یؤمنون حتی یحکموك فیما شجر بینهم)[1]

اس کے بعد فرماتا ہے کہ نہ صرف فیصلہ آپ کے پاس لے کر آئیں بلکہ جب آپؐ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو چاہے وہ ان کے نفع میں ہو یا نقصان میں، نہ صرف یہ کہ وہ زبانِ اعتراض نہ کھولیں بلکہ ان کا دل بھی مطمئن ہونا چاہیے (ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما)۔

اگرچہ فیصلوں کے سلسلے میں جو نقصان انسان کو اٹھانا پڑتا ہے اس سے ایسی پریشانی اور بے چینی ہوتی ہے جو اکثر انسان کے اختیار میں نہیں ہوتی لیکن اخلاقی تربیت اور حق عدالت کے سامنے روحِ تسلیم کی پرورش اور پیغمبر اکرمؐ کے حقیقی مقام کا تصور کرنے سے انسان کے دل میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ پھر کبھی نہ صرف حضورؐ کے فیصلے سے بلکہ وہ علماء جو ان کے جانشین ہیں ان کے فیصلے سے بھی کسی قسم کی معمولی سی تکلیف بھی محسوس نہیں کرتا۔ بہرحال سچے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ حق کے سامنے تسلیم کا خوگر بنے۔

مندرجہ بالا آیت میں راسخ اور حقیقی ایمان کی نشانیاں تین مرحلوں میں بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ تمام اختلافات میں چاہے وہ بڑے ہوں یا چھوٹے قضاوت و فیصلہ کے لیے پیغمبر اکرمؐ کی طرف رجوع کریں جس کا سرچشمہ حکم الٰہی ہے اور طاغوت اور باطل فیصلہ کرنے والوں کی طرف رجوع نہ کیا جائے۔

۲۔ پیغمبر اکرمؐ کے فیصلوں اور احکام کو جو یقیناً حکم الٰہی ہیں جابرانہ نہ سمجھیں اور دل میں بھی ان پر رنج محسوس نہ کریں۔

۳۔ حکمِ رسولؐ پر سختی سے عمل کریں اور کامل طور پر حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں۔

واضح ہے کہ ایک مکتب کے احکامات کو ان مواقع میں تسلیم کرنا جو انسان کے فائدے میں ہوں اس مکتب پر ایمان کی دلیل نہیں ہے بلکہ ایسے مواقع پر احکامات کی تعمیل ایمان کی مظہر ہے جہاں بظاہر وہ حکم انسان کے نقصان میں دکھائی دیتے ہوں لیکن حقیقت میں حق و صداقت پر مبنی ہوں۔

اس آیت کی تفسیر میں جو حدیث حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے وہ یہ ہے:

---

[1] شجر اصل میں مادہ "شجر" (بر وزن فجر) سے درخت کے معنی میں ہے۔ کیونکہ مشاجرہ اور نزاع میں ایک قسم کی پریشانی اور پیچیدگی ہوتی ہے جیسے درخت کی شاخیں ایک دوسرے سے پیوست ہوتی ہیں اس لیے نزاع اور کشمکش کے معنی میں بھی آتا ہے زیرِ نظر آیت میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اگر ایک گروہ خدا کی عبادت کرے نماز پڑھے، زکوٰۃ ادا کرے، رمضان کے روزے رکھے اور حج کرے لیکن ان کاموں کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیے ہیں برا سمجھے یا یوں کہے کہ اگر فلاں کام نہ کیا ہوتا تو بہتر تھا وہ دراصل حقیقی مومن نہیں ہے۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

تم پر لازم ہے کہ خدا اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرو۔

آیت مندرجہ بالا سے ضمنی طور پر دو اہم مطلب معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ یہ آیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معصوم ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام احکامات کی گفتار و کردار میں مطلق اور کامل طور پر پذیرائی یہاں تک کہ دلی طور پر ان کے آگے جھکنا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ آپ کو احکام خداوندی اور اپنے فیصلوں میں نہ کوئی اشتباہ ہوتا ہے اور نہ آپ جان بوجھ کر خلاف حق کہتے یا کرتے ہیں۔ لہٰذا آپ خطا سے بھی محفوظ ہیں اور گناہ سے بھی۔

۲۔ آیت مندرجہ بالا نص پیغمبر کے مقابلہ میں اجتہاد اور ایسے مسائل میں جن کے بارے میں خدا و رسول کی طرف سے حکم صریح ہو اظہار رائے اور اظہار عقیدہ کی نفی کرتی ہے۔ لہٰذا اگر تاریخ اسلام ہمیں یہ بتاتی ہے کہ بعض لوگ خدا و پیغمبر کے حکم کے مقابلے میں اجتہاد، اظہار رائے اور اظہار عقیدہ کیا کرتے تھے مثلاً یہ کہتے تھے کہ پیغمبر نے اس طرح کہا ہے اور میں یہ کہتا ہوں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ ان کا عمل مندرجہ بالا آیت کی صراحت کے بالکل خلاف ہے۔

۶۶۔ وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۝

۶۷۔ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

۶۸۔ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝

ترجمہ

۶۶۔ (ہم نے کوئی مشکل فرض ان کے کاندھوں پر نہیں ڈالا) اگر (بعض گذشتہ امتوں کی طرح) انہیں بھی ہم حکم دیتے کہ ایک دوسرے کو قتل کریں یا اپنے وطن سے نکل جائیں تو بہت تھوڑے لوگ اس پر عمل کرتے اور اگر وہ ان نصیحتوں پر چلتے تو ان کے فائدہ میں تھا کیونکہ ایسا کرنا ان کے ایمان کی تقویت کا سبب بنتا۔

۶۷ اور اس صورت میں ہم انہیں اپنی طرف سے بہت بڑی جزا اور ثواب عطا فرماتے۔

۶۸ اور انہیں صراط مستقیم کی ہدایت کرتے۔

تفسیر

یہاں گذشتہ بحث کی تکمیل کی گئی ہے جو ان لوگوں کے متعلق تھی جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عادلانہ فیصلوں پر چیں بہ جبیں ہوتے تھے۔ گذشتہ امتوں کے تکلیف دہ اور سخت احکام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے کوئی مشکل فرض ان کے کندھوں پر نہیں رکھا۔ اگر ہم گذشتہ امتوں کی طرح (مثلاً یہودی جنہیں ان کی بت پرستی اور گوسالہ پرستی کے بعد یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس عظیم گناہ کے کفارہ میں ایک دوسرے کو قتل کریں یا اپنے عزیز وطن کو چھوڑ کر کہیں باہر چلے جائیں) انہیں بھی اس قسم کا سخت حکم دیتے تو اس کو کس طرح بجا لاتے یہ تو ایک باغ کی آبیاری کے بارے میں بھی پیغمبرؐ کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے تو پھر یہ دوسری آزمائشوں پر کس طرح پورا اتر سکتے ہیں سچ ہے کہ اگر انہیں اس قسم کا حکم دیتے کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کریں یا وطن چھوڑ دیں تو بہت کم لوگ اس پر عمل کرتے (ولو کتبنا علیھم ان اقتلوا انفسکم او اخرجوا من دیارکم ما فعلوہ الا قلیل منھم)۔

بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ قتل کے لیے آمادگی اور وطن سے نکلنے کی تیاری کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں کیونکہ بدن انسانی روح کا وطن ہے اور ایک اہمیت کا حامل ہے۔ اس طرح وہ ملک جس میں ہم رہتے ہیں جسم انسانی کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے جسم کے وطن کو چھوڑنا انسان کے لیے بہت مشکل ہے کیونکہ وہ انسان کی پیدائش اور رہنے کی جگہ ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے: اگر وہ خدا و رسولؐ کے پند و نصائح قبول کریں تو اس میں خود ان کا بھی فائدہ ہے اور ان کے ایمان کی تقویت کا سبب بھی ہے (ولو انھم فعلوا ما یوعظون بہ لکان خیرا واشد تثبیتا)۔

یہ بات قابل غور ہے کہ یہاں خداوند عالم کے احکام کو وعظ و نصیحت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ احکام ایسے نہیں ہیں جن سے حکم دینے والے (خداوند عالم) کو ذرہ بھر فائدہ پہنچے۔ بلکہ حقیقت میں وہ ایسی نصیحتیں ہیں جو خود تمہارے نفع میں ہیں اس لیے بلا فاصلہ فرماتا ہے: ان کی اطاعت بھی تمہارے لیے منفعت بخش ہے اور تمہارے ایمان کی تقویت کا موجب بھی ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ رہے کہ آیت کا آخری حصہ بتاتا ہے کہ جس قدر انسان خدا کے حکم کی اطاعت کی راہ میں قدم بڑھائے اس قدر اس میں ثبات اور استقامت پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت میں خدا کے فرمان کی اطاعت ایک روحانی ورزش ہے جس کا لگاتار عمل جسمانی ورزش کی طرح روز بروز قوت، قدرت، ثبات اور استحکام میں اضافہ کرتا رہتا ہے اس طرح آہستہ آہستہ انسان ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ کوئی طاقت اس کے ایمان کی قوت پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتی اور نہ اُسے دھوکا دے سکتی ہے۔

اس کے بعد والی آیت میں خدا کے سامنے تسلیم و اطاعت کا تیسرا فائدہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: اس وقت (علاوہ اس کے جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے) انہیں عظیم اجر و ثواب بھی دیں گے (و اذا لاتیناھم من لدنا اجرا عظیما)۔

زیر نظر آیات میں سے آخری آیت میں چوتھے فائدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ ہم انہیں سیدھی راہ کی ہدایت

کریں گے (لهدیناهم صراطا مستقیما)۔

واضح ہے کہ اس ہدایت سے مراد اصل دین وآئین کی ہدایت نہیں ہے بلکہ یہ نئے الطافِ الٰہی ہیں جو خداوند عالم کی طرف سے ہدایت ثانوی کی صورت میں اور اجر وثواب کے طور پر ایسے اہل افراد کو دیئے جائیں گے یہ اس طرح ہے جیسے سورۂ محمد کی آیت ۱۷ میں اشارہ کیا گیا ہے:

"والذین اهتدوا زادهم هدی"

جو ہدایت کی راہ میں قدم بڑھاتے ہیں خداوند عالم ان کی زیادہ ہدایت کرتا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب آیت ولوانا کتبنا علیهم ان اقتلوا انفسکم نازل ہوئی تو ایک مومن نے کہا: خدا کی قسم اگر اس قسم کے سخت حکم ہمیں دیئے جاتے تو ہم یقیناً ان کی تعمیل کرتے لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس قسم کے احکام سے اس نے معاف رکھا۔ جب یہ گفتگو پیغمبر اکرم تک پہنچی تو حضرت نے فرمایا:

"ان من امتی لرجالا الایمان اثبت فی قلوبهم من الجبال الرواسی"

میری امت کے بعض لوگ ایسے ہیں کہ جن کے دلوں میں ایمان مستحکم ومضبوط پہاڑوں سے زیادہ راسخ ہے[1]

۶۹۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ○

۷۰۔ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ○

ترجمہ

۶۹۔ جو شخص خدا اور رسول کی اطاعت کرے تو وہ (قیامت کے دن) ایسے لوگوں کا ساتھی ہوگا جن پر خدا نے اپنی نعمت تمام کردی ہے اور وہ انبیاء، صدیقین، شہدا اور صلحاء میں سے ہیں اور وہ بہترین رفیق ہیں۔

۷۰۔ یہ خداوند عالم کا فضل وکرم ہے اور یہ بات کافی ہے کہ وہ (بندوں کے حالات، نیتوں اور اعمال سے) آگاہ ہے۔

شانِ نزول

ثوبان رسول اللہ کا ایک صحابی تھا وہ حضورؐ سے بہت الفت ومحبت رکھتا تھا۔ ایک دن نہایت پریشانی کے عالم میں آپ

---

[1] تفسیر فی ظلال جلد ۲ صفحہ ۴۴۸۔

کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ آپ نے اس سے پریشانی کا سبب دریافت فرمایا تو اس نے عرض کیا کہ جب میں آپ سے جدا ہوتا ہوں اور آپ کو نہیں دیکھتا تو پریشان ہوجاتا ہوں۔ آج میں اس فکر میں غوطہ زن تھا کہ کل قیامت کے دن اگر میں اہلِ بہشت میں سے ہوا تو یہ مسلم ہے کہ میں آپ کے درجے میں تو نہیں ہوں گا اس وجہ سے آپ کو تو کبھی نہ دیکھ سکوں گا اور اگر اہلِ جنت میں سے نہ ہوا تو پھر بھی زیارت سے محروم رہوں گا بنابریں ہر دو صورت میں آپ کی حضوری کے شرف سے مشرف نہ ہو سکوں گا۔ پھر ان حالات میں کیسے پریشان نہ ہوں۔ اس وقت مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور ایسے لوگوں کو بشارت دی گئی کہ مطیع اور فرمانبردار افراد جنت میں بھی انبیاء اور بزرگانِ دین کے ساتھی ہوں گے۔ اس کے بعد حضرت رسولِ اکرمؐ نے فرمایا کہ خدا کی قسم کسی مسلمان کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک وہ مجھے اپنی ذات، ماں باپ، اور تمام رشتہ داروں سے زیادہ دوست نہ رکھے اور میری بات کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرے۔

تفسیر

جنت کے ساتھی

اس آیت میں ان لوگوں کا ایک اور افتخار و اعزاز بیان کیا گیا ہے جو خداوند عالم اور اس کے رسول کے مطیع و فرمانبردار ہیں اور حقیقت میں ان خصوصیات و امتیازات کی تکمیل کرتا ہے جن کا ذکر گذشتہ آیتوں میں ہوچکا ہے۔

(ومن یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم ......)

جیسا کہ سورۂ الحمد کی تفسیر میں بیان ہوچکا ہے کہ جو لوگ اس نعمت کے حامل ہیں وہ ہمیشہ صراطِ مستقیم پر گامزن رہتے ہیں اور کبھی گمراہی اور روگردانی بھی نہیں کرتے۔ اس کے بعد خداوند عالم نے اس جملہ کی وضاحت اور ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جن پر اس نے اپنی نعمت کی تکمیل فرمائی ہے چار قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو حقیقتاً اس موضوع کے چار رکن ہیں۔

۱۔ خدا کے مخصوص بھیجے ہوئے انبیاء جو لوگوں کی ہدایت اور رہبری کے لیے صراطِ مستقیم کی طرف سب سے پہلے اپنا قدم بڑھاتے ہیں (من النبیین)۔

۲۔ "سچ بولنے والے" وہ لوگ جو بات کے سچے ہوتے ہیں اور اپنے عمل اور کردار سے اپنی بات کی سچائی کو ثابت بھی کرتے ہیں اور اس امر کا ثبوت دیتے ہیں کہ وہ ایمان کے دعویٰ دار ہی نہیں ہیں بلکہ واقعی خدا کے احکام پر ایمان بھی رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس تعبیر سے واضح ہوتا ہے کہ مقامِ نبوت کے بعد صدق و راست گوئی سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں ہے صرف گفتار کی سچائی نہیں بلکہ عمل و کردار کی پاکبازی بھی جس میں امانت و اخلاص بھی شامل ہیں کیونکہ امانت دراصل عمل میں صداقت کا دوسرا نام ہے جیسا کہ راست گوئی گفتار میں امانت ہے اسی طرح کوئی برائی کفر کے بعد جھوٹ، نفاق اور گفتگو و عمل میں خیانت سے بدتر نہیں ہے (یاد رکھیے کہ صدیق مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں سراپا راستی اور درستی)۔ بعض روایتوں میں صدیق سے حضرت امیرالمومنین اور ائمہ اہلِ بیتؑ مراد لیے گئے ہیں جیسا کہ ہم بارہا لکھ چکے ہیں کہ اس قسم کی تفسیر آیات کے روشن اور عالی مصادیق

بیان کرتی ہے نہ کہ آیت کا مفہوم اس میں منحصر ہے۔

۳۔ "شہدا" پاکیزہ الٰہی عقیدہ اور مقصد کی راہ میں قتل ہونے والے یا منتخب نیک لوگ جو قیامت کے دن انسانوں کے اعمال پر گواہ ہوں گے (والشہداء)[1]

۴۔ "صالحین" علم و عمل کے لحاظ سے لائق اور شائستہ افراد جو مثبت اصلاحی اور مفید کام کرنے کی وجہ سے اور انبیاء کے احکام کی پیروی کرکے بلند مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں (والصالحین)۔

اسی بنا پر شیعہ روایات میں لفظ صالحین کی تفسیر ائمہ معصومین کے برگزیدہ اصحاب کے ساتھ کی گئی ہے اور یہ بھی جیسا کہ صدیق کے بارے میں گزر چکا ہے نیک اور لائق افراد کی ایک مثال ہیں۔ جس نکتے کو اس مقام پر یاد دلانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ان چاروں گروہوں کا ذکر اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ ایک صحیح و سالم اور شائستہ انسانی معاشرے کی تشکیل کے لیے سب سے پہلے مبلغانِ حق اور انبیاء میدانِ عمل میں آئیں اور ان کے پیچھے پیچھے مبلغ جن کا قول و عمل ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور اپنے مقاصد کی ہر جگہ نشر و اشاعت کریں۔ اس فکری اصلاح کے دور کے بعد ایک گروہ ہے لوگوں خصوصاً ان لوگوں کے مقابلے کے لیے نکلے جو خدا کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے رہتے ہیں۔ یہ گروہ راہِ حق میں قربانی دے اور شہادت پیش کرے۔ انہی کی کوششوں اور جدوجہد کے نتیجہ میں صالحین اور پاک و شائستہ افراد پر مشتمل معاشرہ پیدا ہوتا ہے۔ واضح ہے کہ صالحین بھی آئندہ نسلوں کے لیے مشعلِ حق روشن رکھنے کے لیے یہ تینوں فرائض انجام دیں گے رہبری اور تبلیغ کریں گے نیز قربانی دیں گے۔

ان آیتوں سے ضمنی طور پر یہ حقیقت بھی خوب واضح ہوتی ہے کہ اچھی معاشرت رکھنے والے بے مثل ساتھی اس قدر اہم ہیں کہ عالمِ آخرت میں بھی جنت کی نعمتوں کی تکمیل کے لیے اطاعت گزاروں کو اس عظیم نعمت سے نوازا جائے گا دوسرے افتخارات اور اعزازات کے علاوہ وہ انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کی رفاقت بھی حاصل کریں گے۔

اطاعت گزاروں کے ان چاروں گروہوں سے میل جول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مقام و مرتبہ میں ان کے برابر ہوں گے بلکہ ایک دوسرے سے معاشرت رکھنے کے باوجود ان میں سے ہر ایک اپنے مرتبے کے مطابق خداوندِ عالم کے فضل و کرم کا مستحق ہوگا جیسے درخت، پھول اور سبزہ اگرچہ ایک دوسرے کے آس پاس ہوتے ہیں اور سورج کی روشنی اور بارش سے فیض یاب ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا مستفید ہونا ان کی قدر و قیمت اور استعداد کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتا۔

آیت میں اس امتیازِ عظیم (منتخب افراد کی ہم نشینی) کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: یہ خداوندِ عالم کا خاص فضل و کرم ہے اور وہ بندوں کی حالتوں، نیتوں، اعمال اور قابلیتوں سے خوب آگاہ ہے (ذٰلک الفضل من اللّٰہ وکفیٰ باللّٰہ علیما)۔ البتہ "ذٰلک" عموماً بعید کا اسم اشارہ ہے اس قسم کے مقامات پر اہمیت اور مرتبہ کی بلندی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ہم آیت مندرجہ بالا سے نیک فال سمجھتے ہوئے کہتے ہیں کہ سپاس بے قیاس اس پروردگار کے لیے ہے کہ باوجود ان تمام

---

[1] شہید اصل میں گواہ کے معنی میں ہے۔ البتہ کبھی انسان صرف زبان سے حق کی گواہی دیتا ہے اور کبھی عملی طور پر بلند اور پاکیزہ مقاصد کی راہ میں جان دے کر گواہی دیتا ہے۔

رکاوٹوں کے جو نیک کام کرنے والوں کے راستہ میں حائل ہوا کرتی ہیں، خاص لطفِ الٰہی سے تفسیر نمونہ کی تیسری جلد بأحسن اس مقام اختتام کو پہنچ گئی ہے۔

ذلك الفضل من الله وكفى بالله عليما.

خدایا بطفیل محمد و آلِ محمد ہماری نیتوں کو پاک اور ہمارے اعمال کو پر خلوص بنا دے۔

تیسری جلد کا ترجمہ حقیر پر تقصیر سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور نقوی مرحوم کے قلم سے بوقت پانچ بجے شام بر مکان سیٹھ نوازش علی سیٹھ برادرز ۱۸۱ ای ماڈل ٹاؤن لاہور بتاریخ ۲۴ ذوالحجہ ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۸۲ء بروز منگل اختتام پذیر ہوا۔

"الحمد لله اولاً و آخراً وصلى الله على محمد وآله"

۷۱۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ۝

ترجمہ

۷۱۔ اے ایمان والو (دشمن کے مقابلے میں) اپنی آمادگی کی حفاظت کرو اور متعدد دستوں میں یا اجتماعی دستہ کی صورت میں (موجود حالات کے مطابق) دشمن کی طرف پیش قدمی کرو۔

تفسیر

"حذر" بروزن "خضر" بیداری تیار رہنے اور خطرے کے مقابلے میں چوکس اور مستعد رہنے کے معنی میں ہے۔ بعض اوقات یہ لفظ اس وسیلہ اور ذریعہ کے معنی میں بھی آتا ہے جس کی مدد سے خطرے کا مقابلہ کیا جا سکے۔ "ثبات" "ثبۃ" بروزن "کرۃ" کی جمع ہے۔ غیر منظم اور منتشر دستوں کے معنی میں لیا گیا ہے۔ قرآن مجید مندرجہ بالا آیت میں تمام مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے انھیں اپنے اجتماع اور وجود کے تحفظ کے لیے دو احکام اور ہدایات دیتا ہے۔ پہلے کہتا ہے اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو، بڑی باریک بینی سے دشمنوں اور ان کے جاسوسوں پر نظر رکھے رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان کی طرف سے غافل ہو کر کسی خطرے سے دوچار ہو جاؤ (یا ایھا الذین اٰمنوا خذوا حذرکم) اس کے بعد حکم دیتا ہے کہ دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے مختلف طریقوں اور تکنیکوں (TECHNIQUES) سے استفادہ کرو اور متعدد دستوں کی صورت میں یا اکٹھے ہو کر دشمن کو زیر کرنے نکل پڑو (فانفروا ثبات او انفروا جمیعًا) جہاں مختلف دستوں اور بکھری ہوئی ٹولیوں کی صورت میں حرکت کرنا ضروری ہو وہاں اسی طریقے سے آگے بڑھو اور جہاں یہ امر لازمی ہو کہ سب ایک متحد لشکر کی صورت میں دشمن کے مقابلے پر نکلیں، وہاں اجتماعیت سے غفلت نہ برتو —— بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیت میں "حذر" کی تفسیر صرف اسلحہ کے معنی میں کی ہے حالانکہ حذر کے وسیع معنی ہیں اور اس کا مفہوم اسلحہ تک محدود نہیں ہے۔ علاوہ ازیں خود اسی سورہ کی آیہ ۱۰۲ میں واضح دلیل موجود ہے جہاں حذر اسلحہ سے مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے جہاں خدا فرماتا ہے

ان تضعوا اسلحتکم وخذوا حذرکم

کوئی حرج نہیں کہ ضرورت کے وقت نماز کے موقع پر میدان جنگ میں اپنے ہتھیار زمین پر رکھ دو۔ لیکن حذر یعنی نگرانی اور آمادگی پر مستعد رہو۔

یہ آیت جامع ہے اور اپنے اندر تمام پہلو لیے ہوئے ہے۔ تمام مسلمانوں کے لیے اس میں ہر عہد اور ہر دور کے مطابق حکم موجود ہے

کہ اپنی امنیت کی حفاظت اور اپنی سرحدوں کے دفاع کے لیے ہمیشہ مستعد رہو۔ اور ایک قسم کی مادی و معنوی آمادگی ہمیشہ تمہاری جمعیت پر غالب و حاکم رہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ "حذر" کا معنی اس قدر وسیع ہے کہ جو ہر قسم کے مادی روحانی اور معنوی وسیلہ اور ذریعہ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہر وقت اور ہر زمانے میں دشمن کی حیثیت، اس کے ہتھیاروں کی نوعیت اور جنگی طور طریقوں سے باخبر ہوں اور اپنی تیاری کے معیار کے ساتھ ساتھ دشمن کے اسلحہ کی تعداد اور کارکردگی کو جانتے ہوں۔ کیونکہ یہ تمام مذکورہ باتیں دشمن کی طرف سے خطرہ کی پیش بندی اور "حذر" کے مفہوم کو سمجھتے میں مؤثر ہیں۔

دوسری طرف اپنے دفاع کے لیے ہر طرح کی مادی و روحانی تیاری ناگزیر ہے۔ یہ تیاری تعلیمی، اقتصادی اور افرادی قوت کی فراہمی کے حوالے سے بھی مکمل ہونا چاہیے۔ اسی طرح جدید اسلحہ کی فراہمی اور اس کے استعمال کے طور طریقوں سے آگاہی بھی ضروری ہے۔

یہ امر مسلم ہے کہ مسلمانوں نے اگر صرف اسی ایک آیت کو اپنی زندگی پر منطبق کر لیا ہوتا تو اپنی تمام تاریخ میں کبھی شکست اور ناکامی کا منہ نہ دیکھتے۔ جیسا کہ اوپر والی آیت میں اشارہ ہے کہ جنگ کے مختلف طور طریقوں سے استفادہ کرتے ہوئے کبھی جمود اور دقیانوسیت کا شکار نہ ہونا، بلکہ وقت اور مقام کے تقاضوں اور دشمن کی حیثیت دیکھتے ہوئے قدم اٹھانا چاہیے۔ جہاں دشمن کی حالت اس قسم کی ہے کہ وہاں مختلف دستوں کی صورت میں اس کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے تو اس طریقے سے استفادہ کرو اور دشمن کے مقابلہ میں ہر دستہ کی مخصوص حکمت عملی ہو اور جہاں ضرورت ہو کہ سب منظم ہو کر ایک حکمت عملی کے مطابق حملہ کریں تو وہاں ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں۔ یہاں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بعض افراد جو اصرار کرتے ہیں کہ اپنی اجتماعی جنگوں میں سب مسلمان ایک ہی طریقہ کو اپنائیں اور ان کی تکنیکوں میں کسی قسم کا فرق نہیں ہونا چاہیے، ان کا مؤقف درست نہیں۔ ویسے بھی یہ بات منطق اور تجربے کے خلاف ہے اور اسلامی تعلیمات کی روح کے منافی ہے اور شاید اوپر والی آیت اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کرتی ہو جو حقیقی مقاصد و اہداف کے حصول کے لیے ایک اہم کلیہ ہے۔

ضمنی طور پر "جمیعا" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کے مقابلہ کے لیے تمام مسلمان بغیر کسی استثناء کے شرکت کریں اور یہ حکم کسی معین دستے سے مخصوص نہیں ہے۔

۷۲۔ وَإِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَيُبَطِّئَنَّ ۚ فَإِنْ أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَالَ قَدْ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيَّ إِذْ لَمْ أَكُنْ مَعَهُمْ شَهِيدًا ۝

۷۳۔ وَلَئِنْ أَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِنَ اللَّهِ لَيَقُولَنَّ كَأَنْ لَمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُ مَوَدَّةٌ يَا لَيْتَنِي كُنْتُ مَعَهُمْ فَأَفُوزَ فَوْزًا عَظِيمًا ۝

ترجمہ

۷۲۔ تمھارے درمیان کچھ (منافق) لوگ ہیں کہ وہ خود بھی کاہل ہیں اور دوسروں کو بھی سست بناتے ہیں اگر کوئی مصیبت آپہنچے تو وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ہم پر احسان کیا کہ ہم مجاہدین کے ساتھ نہیں تھے کہ ہم (اس مصیبت) کو دیکھتے۔

۷۳۔ اگر کوئی مالِ غنیمت تمھیں مل جائے تو ٹھیک، حالانکہ تم میں اور ان میں کوئی مودت و دوستی نہیں، پھر بھی وہ بالکل اس طرح سے کہتے ہیں، کاش! ہم بھی ان کے ساتھ ہوتے اور نجات اور عظیم کامیابی سے ہمکنار ہوتے۔

تفسیر

دشمن کے مقابلہ میں جہاد اور تیاری کے عمومی حکم کے بعد کہ جو گذشتہ آیت میں بیان ہوا ہے اس آیت میں منافقین کی ایک جماعت کی حالت بتاتے ہوئے اللہ فرماتا ہے: یہ دو چہروں والے افراد جو تمھارے درمیان ہیں پوری کوشش کرتے ہیں کہ حق کی راہ میں لڑنے والوں کی صفوں میں شریک ہونے سے بچ جائیں۔

(و ان منکم لمن لیبطئن)[1][2]

لیکن جب مجاہدین میدان جنگ سے واپس آتے ہیں یا میدان جنگ کی خبریں انھیں ملتی ہیں، اگر مسلمانوں کو شکست یا شہادت نصیب ہوئی ہو تو وہ مسرت و انبساط سے کہتے ہیں کہ خدا نے ہمیں کتنی بڑی نعمت دی ہے۔ ہم یہ دلخراش منظر دیکھنے کے لیے ان کے ساتھ نہیں تھے۔

فان اصابتکم مصیبة قال قد انعم الله علی اذ لم اکن معھم شھیداً۔

لیکن اگر انھیں یہ خبر ملے کہ حقیقی مومنین کامیاب ہو گئے ہیں اور نتیجے میں مالِ غنیمت ان کے ہاتھ لگا ہے تو یہ پرلے بیگانوں کی طرح حسرت و یاس سے کہتے ہیں کہ کاش ہم بھی مجاہدین کے ساتھ ہوتے اور ہمیں بھی بڑا حصہ (مالِ غنیمت کا) ملتا۔ جیسے مومنین سے تو ان کا کوئی ربط ہی نہ ہو۔

---

[1] یہ بات توجہ طلب ہے کہ اوپر والی آیت میں خطاب مومنین سے ہے لیکن بات منافقین سے کہی جا رہی ہے۔ باوجود اس کے کہ "منکم" کی تعبیر کے ساتھ انھیں مومنین کا جزو شمار کیا ہے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ منافقین ہمیشہ مومنین کے درمیان ہی رہتے تھے اور ظاہراً انہی میں شمار ہوتے تھے۔

[2] لیبطئن مادہ بطئو (بروزن قطب) چلنے میں کاہلی اور سستی کے معنی میں ہے اور اہل لغت اور مفسرین کی ایک جماعت کے بقول لازم اور متعدی دونوں معنی رکھتا ہے یعنی چلنے میں بھی کاہل اور سست ہیں اور دوسروں کو بھی اس کام میں شریک کرتے ہیں شاید اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ باب تفعیل میں ہے لہٰذا صرف متعدی والا معنی رکھتا ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کبھی اپنے آپ کو اور کبھی دوسروں کو کاہلی اور سستی پر ابھارتا ہے۔

ولئن اصابکم فضل من اللہ لیقولن کان لم تکن بینکم وبینہ مودۃ یالیتنی کنت معھم فافوز فوزاً عظیماً۔

اگرچہ اوپر والی آیت میں مالِ غنیمت کا ذکر نہیں ہوا لیکن واضح ہے کہ جو راہ خدا میں شہادت کو ایک بلا اور مصیبت تصور کرتا ہے اور شہادت کا شعور نہ رکھنے کو خدا کی نعمت تصور کرتا ہے، اس کے نزدیک صرف مادی اور جنگی غنائم کا حصول عظیم کامیابی اور فتح ہے۔ یہ دو رُخے افراد جن کے متعلق افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہر معاشرے میں ملتے رہے ہیں، وہ حقیقی مومنین کی کامیابیوں اور شکستوں سے اپنے قیافے فوراً بدل لیتے ہیں۔ غم و آلام میں کبھی ان کا ساتھ نہیں دیتے، مصیبت اور مشکل میں ان کے ہم قدم نہیں ہوتے لیکن اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کامیابیوں اور کامرانیوں کی صورت میں انھیں (مالِ غنیمت) ملے اور حقیقی مومنین جیسے امتیازات انھیں حاصل ہوں۔

۷۴۔ فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۚ وَمَن يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ۝

ترجمہ

۷۴۔ وہ لوگ جنھوں نے دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے بیچ دی ہے انھیں چاہیے کہ خدا کی راہ میں جنگ کریں اور جو شخص راہِ خدا میں جنگ کرے اور قتل ہو جائے یا غالب آجائے تو ہم اسے اجرِ عظیم دیں گے۔

تفسیر

مومنین کو جہاد کے لیے آمادہ کرنا

گزشتہ آیات میں منافقین کو مومنین کی صفوں سے جدا کر کے دکھایا گیا ہے اس آیت میں اور اس کے بعد آنے والی چند آیات میں صاحبِ ایمان افراد کو اثر انگیز دلائل کے ساتھ راہِ خدا میں جہاد کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس طرف بھی توجہ کرنی چاہیے کہ یہ آیات ایک ایسے زمانے میں نازل ہوئی ہیں جب طرح طرح کے اندرونی اور بیرونی دشمن اہلِ اسلام کو ڈرا دھمکا رہے تھے ایسے میں ان آیات کی اہمیت زیادہ واضح ہو جاتی ہے جن میں مسلمانوں کی روحِ جہاد کو ابھارا گیا ہے۔ آیت کی ابتدا میں خدا فرماتا ہے: راہِ خدا میں وہ افراد جنگ کریں جو دنیا کی پست مادی زندگی کا دوسرے جہان کی ابدی اور جاوداں زندگی سے تبادلہ کرنے کو تیار ہیں۔

(فلیقاتل فی سبیل اللہ الذین یشرون الحیٰوۃ الدنیا بالاٰخرۃ)

یعنی صرف وہ لوگ حقیقی مجاہدین کہلا سکتے ہیں جو اس بات کے لیے آمادہ ہوں اور انھوں نے بجا طور پر یہ جان لیا ہو کہ مادی دنیا کی

زندگی جیسا کہ لفظ دنیا (یعنی پست تر) سے ظاہر ہوتا ہے ہمیشہ رہنے والی زندگی کے لیے باعزت موت کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن جو لوگ مادی زندگی کو گراں بہا اور خدائی وانسانی مقدس اہداف ومقاصد سے بالاتر سمجھتے ہیں وہ کبھی اچھے مجاہد نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد آیت کے ذیل میں فرماتا ہے "ایسے مجاہدین کا انجام واضح ہے کیونکہ وہ شہید ہوجائیں گے یا دشمن کو تباہ کر دیں گے اور ان پر غالب آجائیں گے اور دونوں صورتوں میں ہم انھیں اجر عظیم دیں گے۔"

(ومن یقاتل فی سبیل اللہ فیقتل او یغلب فسوف نؤتیہ اجرا عظیما)

یہ مسلم ہے کہ ایسے جانبازوں کی لغت میں شکست کا وجود نہیں ہے وہ دونوں صورتوں میں اپنے آپ کو کامیاب سمجھتے ہیں یہی ایک جذبہ اس امر کے لیے کافی ہے کہ دشمن ان کے لیے کامیابی کے وسائل فراہم کرے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مسلمانوں کو ایسے دشمنوں پر تیزی سے غلبہ حاصل ہوا جو تعداد، ساز وسامان اور جنگی تیاریوں کے لحاظ سے ان کے مقابلے میں کئی گنا بالادستی رکھتے تھے۔ اس کا محرک یہی ناقابل شکست جذبہ تھا۔ یہاں تک کہ غیر مسلم علماء جنھوں نے رسول اللہؐ کے زمانے اور آپؐ کے بعد اسلام اور مسلمانوں کی تیز رفتار کامیابیوں پر بحث کی ہے انھوں نے بھی اس جذبے کو ان کی پیش رفت کا محرک قرار دیا ہے۔

مغرب کا ایک مشہور مورخ رقمطراز ہے[1]

"نئے مذہب کی برکت اور جن انعامات کا آخرت میں وعدہ کیا گیا تھا، ان کی وجہ سے وہ موت سے بالکل نہیں ڈرتے تھے اور دوسرے جہان کو چھوڑ کر اس زندگی کی ان کی نظر میں کوئی حقیقت نہ تھی، لہٰذا وہ اس زندگی سے محبت کرنے سے اجتناب کرتے تھے۔"

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیت میں قرآن کی دوسری بہت سی آیات کی طرح اس جہاد کو مقدس قرار دیا گیا ہے جو "فی سبیل اللہ" یعنی خدا کی راہ میں ہو، بندگان خدا کی نجات کا ذریعہ ہو، اصول حق وانصاف کی خاطر ہو اور پاکیزگی وتقویٰ کے لیے ہو، نہ کہ وہ جنگیں جو توسیع پسندی، تعصب اور استعماری وسامراجی مقاصد کے لیے لڑی جائیں۔

۷۵۔ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ○

ترجمہ

۷۵۔ کیوں تم خدا کی راہ میں ان مردوں عورتوں اور بچوں کے لیے کہ (جو ستمگروں کے ہاتھوں) کمزور کر دیئے گئے

---

[1] تاریخ تمدن اسلام وعرب ـــــ گوستا ولبون صفحہ ۱۵۵

ہیں جنگ نہیں کرتے وہ (ستم زدہ) افراد جو کہتے ہیں کہ خدایا ہمیں اس شہر (مکہ) سے نکال لے جہاں کے رہنے والے ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنی طرف سے ایک سرپرست بھیج اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی یار و مددگار بھیج۔

تفسیر

انسانی جذبوں کو مظلوموں کی مدد کے لیے ابھارا گیا ہے

گذشتہ آیت میں مومنین کو جہاد کی دعوت دی گئی ہے لیکن معاد و قیامت پر ایمان اور سود و زیاں کے استدلال کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس آیت میں انسانی جذبات و احساسات کی بنیاد پر جہاد کی طرف دعوت دیتے ہوئے کہتا ہے، کیوں تم راہِ خدا میں اور مظلوم و بیکس مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے جو ستمگروں کے چنگل میں گرفتار ہیں جنگ نہیں کرتے کیا تمھارے انسانی جذبات اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ خاموش بیٹھے رہو اور ان رقت انگیز مناظر کو دیکھتے رہو۔

(ومالکم لا تقاتلون فی سبیل اللّٰہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان)

اس کے بعد مومنین کے احساسات کو ولولہ انگیز بنانے کے لیے کہتا ہے، یہ مستضعفین[1] وہی لوگ ہیں جو گھٹے ہوئے ماحول میں گرفتار ہو چکے ہیں اور ہر جگہ سے ناامید ہو گئے ہیں لہٰذا دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے خدا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس ظلم و ستم کے ماحول سے انھیں نجات دے۔

(الذین یقولون ربنا اخرجنا من هذه القریة الظالم اهلها)

نیز اپنے خدا سے یہ تقاضا بھی کرتے ہیں کہ وہ ایک ولی و سرپرست ان کی حمایت کے لیے بھیج دے (واجعل لنا من لدنک ولیا) اور کہتے ہیں، ہمارے لیے کوئی یار و مددگار بھیج (واجعل لنا من لدنک نصیرا)

حقیقت میں اوپر والی آیت اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ خدا نے ان کی دعا کو قبول کر لیا ہے اور اس عظیم انسانی پیغام رسالت کو تمھارے ذمہ قرار دیا ہے اور تم خدا کی طرف سے "ولی و نصیر" ہو جو ان کی حمایت اور نجات کے لیے متعین کیے گئے ہو۔ لہٰذا ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ تم اس حساس موقع اور اعلیٰ حیثیت کو اپنے ہاتھ سے گنوا بیٹھو۔

چند اہم نکات

۱۔ اسلامی جہاد کے دو ہدف

جہاد اسلامی جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہوا ہے، مال و منال، مقام و مرتبہ، طبعی وسائل اور دوسرے ممالک کے خام مال پر قبضہ کے لیے نہیں ہے اور نہ ہی منڈیاں تلاش کرنے یا عقیدہ اور سیاست ٹھونسنے کے لیے ہے بلکہ صرف اصولِ فضیلت و ایمان کی نشر و اشاعت اور محکوم، ستم رسیدہ مردوں، عورتوں اور محروم و مظلوم بچوں کے دفاع کے لیے ہے۔ اس طرح جہاد کے دو جامع ہدف

---

[1] مستضعف اور ضعیف میں واضح فرق ہے ضعیف وہ ہے جو ناتمام ہو اور مستضعف وہ ہے جو دوسروں کے ظلم و ستم کے باعث کمزور ہو گیا ہو چاہے یہ کمزوری فکری اور ثقافتی اعتبار سے ہو یا اخلاقی نقطۂ نظر سے یا اقتصادی حوالے سے اور یا سیاسی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے اس طرح یہ ایک جامع تعبیر ہے کہ جو ہر طرح کے استعمار زدہ اور ستم رسیدہ کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

اور مقاصد ہیں جن کی طرف مندرجہ بالا آیت میں اشارہ ہوا ہے ایک "خدائی ہدف" اور دوسرا "انسانی ہدف" اور یہ دونوں حقیقت میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں اور ان کی بازگشت ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

۲۔ معاشرے میں آزادیٔ فکر و نظر

اسلام کی نگاہ میں وہ معاشرہ اور ماحول زندگی بسر کرنے کے قابل ہے جس میں آزادانہ اپنے صحیح عقیدے کے مطابق عمل کیا جاسکے۔ باقی رہا وہ ماحول یا معاشرہ جس میں گلا گھونٹ دیا جائے اور یہاں تک کہ انسان اتنا آزاد بھی نہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہہ سکے اس میں زندگی نہیں گذاری جاسکتی۔ جہاں صاحب ایمان افراد یہ آرزو کرتے ہوں کہ وہ ایسے ماحول سے باہر چلے جائیں کیونکہ ایسے ماحول میں صرف ستمگروں کی بالادستی ہوتی ہے۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ "مکہ" نہایت مقدس شہر اور مہاجرین کا اصل وطن تھا اس کے باوجود اس کی پر آشوب اور گھٹن زدہ کیفیت اس بات کا سبب بنی کہ وہ خدا سے درخواست کریں کہ وہ وہاں سے باہر نکل جائیں۔

۳۔ یاور سے پہلے رہبر

مندرجہ بالا آیت میں ہے کہ وہ مسلمان جو دشمن کے چنگل میں گرفتار تھے انھوں نے پہلے تو اپنی نجات کے لیے خدا کی طرف سے ولی بھیجے جانے کا تقاضا کیا اور پھر ظالموں کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے نصیر اور مددگار کی آرزو کی۔ کیونکہ ہر چیز سے پہلے قابل اور مدبر رہبر" اور سرپرست کا وجود ضروری ہے اور اس کے بعد یاور و مددگار کی اور کافی تعداد میں افراد کی ضرورت ہے لہٰذا یہ یاور و مددگار جتنے بھی ہوں ایک صحیح رہبر کے بغیر بے سود ہیں۔

۴۔ بارگاہِ الٰہی میں دستِ نیاز

صاحب ایمان افراد ہر چیز خدا سے چاہتے ہیں اور وہ دستِ نیاز اس کے علاوہ کسی کے آگے دراز نہیں کرتے، یہاں تک کہ اگر وہ ولی و مددگار کا تقاضا کریں تب بھی اسی سے (مدد) چاہتے ہیں۔

۷۶۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَاۗءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝

ترجمہ

۷۶۔ جو صاحبِ ایمان ہیں وہ راہِ خدا میں جنگ کرتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ طاغوت (اور فسادی لوگوں) کی راہ میں

لڑتے ہیں لہٰذا تم ان شیطان کے دوستوں سے جنگ کرو (اور ان سے ڈرو نہیں) کیونکہ شیطان کا مکر و فریب (اس کی طاقت کی طرح) ضعیف و کمزور ہے۔

تفسیر

پھر اس آیت میں مجاہدین کو شجاعت پر ابھارا گیا ہے اور انھیں دشمن کے ساتھ مبارزہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مجاہدین کی صفوں اور اہداف و مقاصد کو مشخص و ممتاز کرنے کے لیے اس طرح فرمایا ہے:

"صاحب ایمان افراد خدا کی راہ میں اور اس کے لیے جو خدا کے بندوں کے لیے سود مند ہے جنگ کرتے ہیں، لیکن بے ایمان افراد طاغوت یعنی تباہ کرنے والی طاقتوں کی راہ میں (جنگ کرتے ہیں)"

(الذین اٰمنوا یقاتلون فی سبیل اللّٰہ و الذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت)

یعنی بہرحال ان کی زندگی کے دن مبارزہ اور مقابلہ سے خالی نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک گروہ حق کی راہ میں اور دوسرا باطل اور شیطان کی راہ میں برسرپیکار ہے۔ اس کے بعد کہتا ہے: شیطان کے ساتھیوں سے جنگ کرو اور ان سے ڈرو نہیں (فقاتلوا اولیاء الشیطٰن)۔

طاغوت، فسادی قوتیں اور ظالم طاقتیں ظاہراً جتنی بھی بڑی اور قوی نظر آئیں لیکن باطن میں زبوں حال اور ناتواں ہیں۔ ان کے ظاہری ساز و سامان، تیاری اور آراستہ و پیراستہ ہونے سے نہ ڈرو۔ کیونکہ ان کا باطن کھوکھلا ہے اور ان کے منصوبے اور سازشیں ان کی طاقت اور توانائی کی طرح ناقص و کمزور ہیں، کیونکہ خدائے لایزال کی قدرت پہ ان کا تکیہ نہیں ہے بلکہ وہ شیطانی طاقتوں پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں (ان کید الشیطٰن کان ضعیفاً) اس کمزوری اور ناتوانی کی دلیل واضح ہے کیونکہ ایک طرف سے صاحب ایمان افراد اہداف اور حقائق کی راہ میں قدم آگے بڑھاتے ہیں کہ جو قانونِ آفرینش سے ہم آہنگ اور ہم صدا ہیں اور ابدی و جاودانی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں وہ انسانوں کو آزاد کرنے اور ظلم و ستم کے مظاہر کو ختم کرنے کے لیے برسرپیکار ہیں جبکہ طاغوت کے طرفدار استعماری اور لوٹ مار کرنے والی قوتیں ناپائیدار شہوات کی راہ میں چلنے والے جن کا اثر معاشرے کی تباہی اور قانونِ آفرینش کے برخلاف ہے، سعی و کوشش کرتے ہیں۔ دوسری طرف سے صاحب ایمان افراد روحانی قوتوں پر بھروسہ کرکے مطمئن ہیں کہ وہ ان کی کامیابی کے ضامن ہیں اور وہ انھیں قوت بخشیں گے۔ جبکہ بے ایمان لوگوں کا کوئی مستحکم سہارا نہیں ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں طاغوت کا شیطان سے مکمل رابطہ بیان ہوا ہے کہ کس طرح طاغوت شیطان صفت مختلف طاقتوں سے مدد حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ خدا کہتا ہے کہ طاغوت کے ساتھی وہی شیطان کے دوست ہیں۔ سورۂ اعراف آیہ ۲۷ میں بھی یہی مضمون آیا ہے:

انا جعلنا الشیاطین اولیاء للذین لا یؤمنون

ہم نے شیاطین کو بے ایمان افراد کا سرپرست بنا دیا ہے۔

۷۷۔ اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ قِيۡلَ لَهُمۡ كُفُّوۡۤا اَيۡدِيَكُمۡ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ‌ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيۡهِمُ الۡقِتَالُ اِذَا فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ يَخۡشَوۡنَ النَّاسَ كَخَشۡيَةِ اللّٰهِ اَوۡ اَشَدَّ خَشۡيَةً‌ ۚ وَقَالُوۡا رَبَّنَا لِمَ كَتَبۡتَ عَلَيۡنَا الۡقِتَالَ‌ ۚ لَوۡلَاۤ اَخَّرۡتَنَاۤ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيۡبٍ‌ ؕ قُلۡ مَتَاعُ الدُّنۡيَا قَلِيۡلٌ‌ ۚ وَالۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا ○

ترجمہ

۷۷۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں (مکہ میں) کہا گیا کہ (وقتی طور پر) جہاد سے دستبردار ہوجاؤ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو (مگر وہ اس حکم سے رنجیدہ اور غیر مطمئن تھے) لیکن جس وقت (مدینہ میں) انھیں جہاد کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے ایسے ڈرتا تھا جس طرح خدا سے ڈرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ وہ کہنے لگے پروردگار! تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض کیا ہے کیوں یہ حکم دینے میں تاخیر نہیں کی۔ ان سے کہہ دو زندگانی دنیا کا سرمایہ ناچیز اور کم تر ہے اور جو پرہیزگار ہو اس کی آخرت بہتر ہے اور تم پر چھوٹے سے چھوٹا ظلم بھی نہیں ہوگا۔

شانِ نزول

مفسرین کی ایک جماعت مثلاً عظیم مفسر طوسی مؤلف "تبیان" اور مؤلفین "تفسیر قرطبی" اور "المنار" ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی ایک جماعت جب کہ مکہ میں مقیم تھی اور مشرکین کی طرف سے اس پر ظلم و ستم توڑے جا رہے تھے اس جماعت کے افراد پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم قبولِ اسلام سے پہلے محترم اور معزز تھے لیکن قبولِ اسلام کے بعد ہماری حالت دگرگوں ہوگئی ہے اور ہم وہ عزت اور احترام کھو بیٹھے ہیں ہمیں دشمن نے اذیت اور مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم دشمنوں سے جنگ کریں تاکہ اپنا وقار اور مرتبہ دوبارہ بحال کر سکیں۔ اس وقت پیغمبرؐ نے فرمایا ابھی مجھے جنگ کرنے کا حکم نہیں ہے۔ لیکن جب مسلمان مدینہ میں جا بسے اور مقابلے کے لیے زمین ہموار ہوگئی، جہاد کا حکم نازل ہوا تو ان میں سے بعض جو پہلے لڑنے کے لیے تلے بیٹھے تھے اب میدان جہاد میں جانے سے کترانے لگے اور اس دن کا جوش و ولولہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں میں جذبۂ شجاعت بیدار کرنے کیلئے اور جہاد سے گریز کرنے والے افراد کو ملامت کرتے ہوئے حقائق بیان کیے۔

تفسیر

وہ جو صرف باتیں کرنا جانتے ہیں

قرآن یہاں کہتا ہے، اس گروہ کی حالت واقعاً تعجب خیز ہے جو ایک نامناسب موقع پر بڑی گرم جوشی اور شور و غوغا سے تقاضا کرتا تھا کہ انھیں جہاد کی اجازت دی جائے انھیں حکم دیا گیا کہ ابھی اپنی حفاظت اور تعمیر کا کام کریں، نماز پڑھیں اپنی تعداد بڑھائیں اور زکوٰۃ دیتے رہیں لیکن جب ہر لحاظ سے فضا ہموار ہوگئی اور جہاد کا حکم نازل ہوا تو ان پر خوف و ہراس طاری ہوگیا اور وہ اس حکم کے سامنے زبان اعتراض دراز کرنے لگے۔

(الم تر الی الذین قیل لھم کفوا ایدیکم و اقیموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ فلما کتب علیھم القتال اذا فریق منھم یخشون الناس کخشیۃ اللہ او اشد خشیۃ)

وہ اپنے اعتراض میں صراحت کے ساتھ کہتے تھے خدایا تو نے اتنا جلدی جہاد کا حکم نازل کر دیا کیا اچھا ہوتا اگر تو اس حکم کو تاخیر میں ڈال دیتا یا یہ پیغام رسالت آئندہ کی نسلوں کے ذمہ ڈال دیا جاتا۔[1]

(وقالوا ربنا لم کتبت علینا القتال لولا اخرتنا الی اجل قریب)

قرآن اس قسم کے افراد کو دو طرح کے جواب دیتا ہے، پہلا جواب یہ ہے کہ جو یخشون الناس کخشیۃ اللہ او اشد خشیۃ کی جملت کے دوران دیا جا چکا ہے۔ یعنی وہ لوگ بجائے اس کے کہ خدائے قادر و قاہر سے ڈریں کمزور اور ناتواں انسانوں سے خوف زدہ ہیں بلکہ وہ ان ضعیف و ناتواں لوگوں سے خدا کی نسبت زیادہ ڈرتے ہیں دوسرا یہ کہ ایسے افراد سے کہا جائے کہ فرض کرو چند دن جہاد نہ کرنے کی وجہ سے آرام و سکون حاصل کر لوگے، پھر بھی یہ زندگی فانی اور بے قیمت ہے لیکن ابدی اور دائمی جہان تو پرہیزگار لوگوں کے لیے زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔ خصوصاً جب انھیں مکمل طور پر عوض اور اجر مل جائے گا اور معمولی سے معمولی ظلم بھی ان پر نہیں ہوگا۔ . . . .

(قل متاع الدنیا قلیل و الاخرۃ خیر لمن اتقی ولا تظلمون فتیلا)[2]

---

[1] بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حضرت مہدیؑ کے قیام کے بارے میں کچھ باتیں سن رکھی تھیں۔ لہٰذا ان میں سے بعض اس انتظار میں تھے کہ جہاد کا معاملہ قیام مہدیؑ کے زمانے سے مخصوص ہو جائے۔

(نور الثقلین جلد اول ص ۵۱۸)

[2] فتیل ایک باریک دھاگہ ہے جو کھجور کے دانے کے درمیان شگاف میں ہوتا ہے جس طرح کہ اس کی تفصیل تیسری جلد میں گزر چکی ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ صرف نماز اور زکوٰۃ کا تذکرہ کیوں ؟

سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمام احکام اسلام میں سے صرف نماز اور زکوٰۃ کا ذکر کیوں ہوا ہے حالانکہ احکام اسلامی انہی دو میں تو منحصر نہیں ہیں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ نماز خدا سے وابستہ ہونے اور زکوٰۃ مخلوق خدا سے رشتہ استوار کرنے کی رمز ہے۔ لہٰذا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو حکم دیا جائے کہ خدا سے محکم وابستگی اور بندگانِ خدا سے مضبوط رشتہ استوار کر کے اپنے جسم و جان اور اجتماع و معاشرے کو جہاد کے لیے آمادہ کریں۔ اصطلاح کے مطابق اپنی تربیت کریں۔ یہ بات مسلّم ہے کہ کسی قسم کا جہاد افراد کی روحانی اور جسمانی آمادگی اور اجتماعی مستحکم رشتوں کے بغیر شکست سے ہم کنار ہو جائے گا۔ مسلمان نماز اور عبادت خدا کے سایے میں اپنے ایمان کو محکم اور اپنے روحانی جذبہ کی پرورش کرتا ہے اور ہر قسم کے ایثار اور قربانی کے لیے آمادہ ہوتا ہے اور زکوٰۃ کے ذریعے اجتماعی فاصلوں کو مٹاتا ہے۔ زکوٰۃ ہی کے ذریعے آزمودہ کار افراد اور جنگی ساز و سامان مہیا کرنے کے لیے ایک اقتصادی معاونت کرتا ہے اور حکم جہاد کے صادر ہونے پر دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح سے تیار ہو جاتا ہے۔

۲۔ مکہ میں حکم زکوٰۃ

ہم جانتے ہیں کہ زکوٰۃ کا قانون مدینہ میں نازل ہوا اور مکہ میں مسلمانوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی تھی اس کے باوجود یہ کیسے ممکن ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں مکہ کے مسلمانوں کی حالت و کیفیت بیان کی جارہی ہو۔ شیخ طوسی مرحوم نے اس سوال کا جواب تفسیر "تبیان" میں دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت میں زکوٰۃ سے مراد مستحب زکوٰۃ تھی۔ جو کہ مکہ میں نافذ تھی۔ یعنی قرآن مسلمانوں کو (حتیٰ کہ مکہ میں بھی) حاجت مندوں کی مالی امداد اور نو مسلم افراد کے لیے ضروریات مہیا کرنے کی طرف راغب کرتا ہے۔

۳۔ مکہ اور مدینہ میں مختلف لائحہ عمل

مندرجہ بالا آیت ضمنی طور پر ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مکہ میں تو مسلمانوں کا ایک لائحہ عمل تھا اور مدینہ میں دوسرا۔ مکہ کا تیرہ سالہ قیام مسلمانوں کے لیے انسان سازی کا تھا۔ پیغمبر اکرمؐ نے شب و روز مسلسل کوشش کی کہ انھیں بت پرستی اور زمانہ جاہلیت کے بیہودہ عناصر سے نجات دلا کر اس قسم کے انسان بنائیں جو زندگی کے بڑے حادثات کا مقابلہ کرتے ہوئے استقامت، پامردی اور ایثار کا مظاہرہ کریں اگر مکہ کے قیام کے زمانے میں یہ چیز موجود نہ ہوتی تو مدینہ کے مسلمانوں کو اتنی حیران کن اور پے در پے کامیابیاں نصیب نہ ہوتیں۔ مکہ کے قیام کا دور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور تجربہ حاصل کرنے کا

دور ہے۔ اس بنیاد پر قرآن کی ایک سو چودہ سورتوں میں سے تقریباً نوّے سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں۔ ان میں سے زیادہ تر سورتیں عقیدہ، مکتب اور نظریات کا منبع تھیں لیکن مدینہ کا زمانہ تشکیل حکومت اور ایک مکمل معاشرے کی بنیادیں استوار کرنے کا دور تھا۔ اسی لیے نہ تو مکہ میں جہاد واجب تھا اور نہ ہی زکوٰۃ۔ کیونکہ جہاد اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے جیسا کہ بیت المال کی تشکیل بھی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

۷۸۔ اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ ؕ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰۤؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ حَدِیْثًا ○

۷۹۔ مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَ مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ○

ترجمہ

۷۸۔ تم جہاں کہیں بھی رہو، موت تمھیں پالے گی اگرچہ محکم برجوں میں جا رہو اور اگر انھیں (منافقین کو) حسنہ (اور کامیابی) حاصل ہو تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور سیئہ (اور شکست) سے دوچار ہوں تو کہتے ہیں یہ تمھاری طرف سے ہے کہہ دو کہ سب اللہ کی طرف سے ہیں پس یہ گروہ کیوں تیار نہیں ہوتا کہ حقائق کا ادراک کرے۔

۷۹۔ جو نیکیاں تجھ پر پہنچتی ہیں وہ خدا کی طرف سے ہیں اور جو برائی تجھے پہنچتی ہے وہ خود تیری طرف سے ہے اور ہم نے تجھے لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس بارے میں خدا کی گواہی کافی ہے۔

تفسیر

گذشتہ اور بعد کی آیات پر غور کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں آیات بھی منافقین سے متعلق ہیں جو مسلمانوں کی صفوں میں رہتے تھے جیسا کہ گذشتہ آیات میں ہے کہ وہ میدانِ جہاد میں شرکت کرنے سے ڈرتے تھے اور جب جہاد کا حکم صادر ہوا

تو انھیں تکلیف ہوئی۔ قرآن ان کے اس طرز فکر کا دو طرح سے جواب دے رہا ہے پہلا جواب تو وہی مقام ہو گذشتہ آیت کے آخر میں گزر چکا ہے۔

قل متاع الدنیا قلیل و الاخرۃ خیر لمن اتقی

"کہہ دو کہ دنیاوی زندگی بہت کم ہے لیکن پرہیزگاروں کے لیے دوسرے جہان میں اس کا صلہ موجود ہے"۔

دوسرا جواب جو زیر بحث ہے کہ موت سے فرار اختیار کرنا تمھارے لیے مفید نہیں "حالانکہ تم جہاں کہیں بھی ہو موت سے تم کو مفر نہیں آخر ایک دن تمھیں اس کا نوالہ بننا ہے یہاں تک کہ تم مضبوط گنبدوں میں کیوں نہ چھپ جاؤ"۔ پس وہ موت جسے ضرور آنا ہے اور جس سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے کیوں نہ اسے اصلاح اور سچائی کے لیے قبول کیا جائے جیسے جہاد کی صورت میں کہا جائے اس کے کہ بے کار اور لاحاصل موت قبول کی جائے۔

(اینما تکونوا یدرککم الموت ولو کنتم فی بروج مشیدۃ)

یہ امر قابل توجہ ہے کہ قرآن کی متعدد آیات مثلاً سورہ حجر کی آیہ ۹۹ اور مدثر کی آیت ۴۷ میں موت کو "یقین" سے تعبیر کیا گیا ہے یہ اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ ہر قوم اور گروہ جو بھی عقیدہ رکھتا ہو وہ ہر چیز کا انکار کر سکتا ہے مگر اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ زندگی ایک دن ختم ہونے والی ہے وہ افراد جو زندگی سے عشق کرتے ہیں اور وہ جو سمجھتے ہیں کہ موت ہمیشہ کیلیے نیست و نابود ہونے کا نام ہے اور اس کا نام لیتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں یہ آیات انھیں تنبیہ کرتی ہیں اور زیر بحث آیت میں یدرککم کے مفہوم سے انھیں متوجہ کیا گیا ہے کہ عالم ہستی کی اس حقیقت سے فرار اختیار کرنا ایک نامناسب فعل ہے کیونکہ "یدرککم" کے مادہ کا معنی یہ ہے کہ کوئی کسی چیز سے فرار حاصل کرے اور وہ اس کے پیچھے دوڑے۔ سورہ جمعہ کی آیت ۸ میں بھی یہ حقیقت زیادہ کھل کر بیان کی گئی ہے:

قل ان الموت الذی تفرون منہ فانہ ملاقیکم کہہ دو کہ موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ تمھیں آ ملے گی

جب یہ حقیقت مد نظر ہو تو کیا یہ عقل مندی ہے کہ انسان میدان جہاد میں جانے اور قابل فخر مرتبے پر فائز ہونے کی بجائے اس سے کنارہ کش ہو کر گھر میں آرام کرتا رہے فرض کریں کہ جہاد سے کنارہ کش ہو کر وہ زندگی کے چند دن اور گزار لے اور وہی کام دہراتا رہے جو پہلے کرتا رہا ہے۔

راہ خدا میں جہاد کرنے والوں کے اجر و ثواب سے بے بہرہ ہو جائے تو کیا یہ عقل اور منطق کے مطابق صحیح ہے اصولی طور پر موت ایک عظیم حقیقت ہے۔ موت کے استقبال کے لیے افتخار کے ساتھ آمادہ ہونا چاہیے۔

دوسرا نکتہ جس پر توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ درج بالا آیت میں کہا گیا ہے کہ کوئی چیز یہاں تک کہ محکم برج (بروج مشیدہ)[1] بھی موت سے

---

[1] مشیدہ۔ در اصل مادہ شید (بروزن شہر) سے ہے اور گچ اور دوسرے محکم مواد کے معنی میں ہے کہ جنھیں کسی بنیاد کے استحکام کے لیے استعمال کرتے تھے چونکہ اس زمانہ میں عام طور پر مضبوط بنیاد کے لیے محکم ترین مادہ گچ اور چونا تھا لہٰذا زیادہ تر اس مفہوم میں بولا جاتا تھا۔ لہٰذا بروج مشیدہ محکم قلعوں کے معنی میں ہے اور دیکھتے ہیں مشید مرتفع اور بلند کے معنی میں آتا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ چونا سے استفادہ کیے بغیر کسی طرح بھی بلند و بالا عمارت کی بنیادیں استوار نہیں ہو سکتیں۔

چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا اور اس کی وجہ واضح ہے اور وہ یہ کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ موت وجود انسانی سے باہر نفوذ کرتی ہے۔ عملی طور پہ موت کا سرچشمہ انسان کے اندر ہے، کیونکہ بدن کے مختلف کل پرزوں (اعضاء) کی استعداد یقیناً محدود ہے ایک دن وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ البتہ غیر طبعی موت انسان کی تلاش میں باہر سے آتی ہے لیکن طبعی موت اس کے اندر سے آتی ہے۔ مضبوط گنبد اور بھاری قلعے بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتے۔

یہ بجا ہے کہ مضبوط قلعے بعض اوقات غیر طبعی موت سے بچا لیتے ہیں۔ مگر پھر بھی موت سے مکمل نجات نہیں دلا سکتے اور چند دنوں بعد طبعی موت انسان کو آلیتی ہے۔

کامرانیوں اور شکستوں کا سرچشمہ

قرآن اس آیت کے ذیل میں منافقین کی کچھ اور بے بنیاد باتوں اور باطل خیالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

وہ جب بھی کامیابی سے ہم کنار ہوتے ہیں اور نیکیاں اور حسنات ان کے ہاتھ آتی ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے گویا ہم اس قابل تھے کہ خدا نے ہمیں یہ شفقتیں اور نعمتیں عطا کی ہیں۔

(و ان تصبهم حسنة یقولوا هذه من عند الله)

لیکن جب انہیں شکست کا سامنا ہو یا میدان جنگ میں کوئی مشکل لاحق ہو تو کہتے ہیں کہ پیغمبر کی غلط تدبیر اور ان کی جنگی حکمت عملی کے خام ہونے کی وجہ سے مثلاً اس ضمن میں وہ جنگ احد کی شکست کا حوالہ دیتے ہیں۔

(و ان تصبهم سیئة یقولوا هذه من عندك)

بعض مفسرین کا احتمال ہے کہ درج بالا آیت یہودیوں کے بارے میں ہے اور "حسنة" اور "سیئة" سے مراد سارے اچھے اور برے حوادث و واقعات ہیں کیونکہ یہودی پیغمبر کے ظہور کے وقت اپنی زندگی کے اچھے حوادث کی نسبت خدا کی طرف دیتے تھے اور برے حوادث کو پیغمبر سے منسوب کر دیتے تھے لیکن اس آیت کا ربط پہلی اور بعد کی ان آیات سے ہے جو منافقین کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں یہ آیت بھی زیادہ تر انہی سے مربوط ہے بہر حال قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ ایک موحد اور بالغ نظر خدا پرست کی نگاہ میں یہ تمام حوادث، کامیابیاں اور شکستیں خدا کی طرف سے ہیں جو لوگوں کی قابلیت اور اہلیت کے مطابق انہیں دی جاتی ہے۔

(قل كل من عند الله)

اور آیت کے آخر میں اعتراض کے طور پر ان منافقین کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ لوگ فکر اور غور نہیں کرتے "پس کیوں یہ لوگ حقائق کا ادراک کرنے کو تیار نہیں ہوتے"۔

(فمال هؤلاء القوم لا یکادون یفقهون حدیثا)

اس کے بعد اگلی آیت میں اس طرح ارشاد ہوتا ہے کہ تمام نیکیاں، کامیابیاں اور حسنات جو تمہیں ملتی ہیں وہ خدا کی طرف سے ہیں اور جو برائیاں اور شکستیں تمہیں درپیش ہوتی ہیں اور وہ خود تمہاری طرف سے ہیں۔

(ما اصابك من حسنة فمن الله وما اصابك من سیئة فمن نفسك)

اور آیت کے آخر میں ان لوگوں کو جو اپنی شکستوں اور ناکامیوں کی نسبت پیغمبر سے دیتے ہیں اور اصطلاحاً پیغمبر کی وجہ سے سمجھتے تھے انھیں جواب دیا گیا۔ پیغمبر سے ارشاد ہوتا ہے: "اور ہم نے تجھے لوگوں کے لیے اپنا پیامبر قرار دیا ہے اور خدا اس پر گواہ ہے اور اس کی گواہی کافی ہے۔"

تو کیا یہ ممکن ہے کہ خدا کا بھیجا ہوا لوگوں کی شکست، ناکامی اور برائی کا سبب ہو؟

(وارسلنٰک للناس رسولا وکفیٰ باللہ شہیدًا)

ایک اہم سوال کا جواب

ان دو آیات کا مطالعہ کہ جو قرآن میں آگے پیچھے مربوط ہیں ذہن میں ایک سوال پیدا کرتا ہے کہ کیوں پہلی آیت میں تمام نیکیوں اور برائیوں (حسنات وسیئات) کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے جب کہ دوسری آیت میں صرف نیکیوں کو خدا کی طرف اور برائیوں اور سیئات کو لوگوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ یقیناً یہاں کوئی نکتہ پوشیدہ ہے ورنہ کیسے ممکن ہے کہ دو آیات جو کہ یکے بعد دیگرے آئی ہیں ان میں ایسا واضح اختلاف ہے ان دونوں آیات پر غور و فکر کرنے سے چند نکات واضح ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک اس سوال کا علیحدہ جواب بن سکتا ہے۔

۱۔ اگر سیئات اور برائیوں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ دو پہلو رکھتی ہیں۔ ایک مثبت پہلو اور ایک منفی پہلو۔ یہی منفی پہلو ہے جو انھیں برائی کی شکل وصورت دیتا ہے اور انھیں نسبتی زیان یا مقابلتاً نقصان کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

جو شخص گرم یا سرد ہتھیار کے ذریعہ کسی مسلمان کو قتل کر دے، مسلّم ہے کہ وہ ایک برائی کا مرتکب ہوا ہے اب ہم اس بُرے کام کے عوامل پر غور و فکر کرتے ہیں۔ ان عوامل میں انسان کی طاقت، اس کی فکر، سرد یا گرم ہتھیار کی طاقت، صحیح نشانہ، مناسب وقت سے استفادہ کرنا اور گولی کی تاثیر اور طاقت وغیرہ نظر آتے ہیں جو تمام واقعہ کے مثبت پہلو ہیں۔ کیونکہ یہ سب مفید اور سودمند ہو سکتے ہیں اور اگر انھیں برمحل استعمال کیا جائے تو بڑی بڑی مشکلات کے موقع پر کام آتے ہیں صرف ایک منفی پہلو اس واقعہ کا ہے کہ یہ تمام صلاحیتیں اور توانائیاں بے محل استعمال ہوئی ہیں، مثلاً بجائے اس کے کہ ان کے ذریعے ایک خطرناک درندے کو مارا جاتا یا ایک جفاکار اور ظالم قاتل پر انھیں استعمال کیا جاتا، ایک بے گناہ انسان کو نشانہ بنایا گیا بس یہی منفی پہلو ہے کہ ان صلاحیتوں کو برائی کے طور پر کام لایا گیا۔ ورنہ نہ تو اچھے نشانے کی صلاحیت انسان کے لیے بُری چیز ہے اور نہ ہی گولی اور بارود کا استعمال بُرا ہے، یہ سب صلاحیت کو استعمال کرنے کے ذرائع ہیں اور اپنی جگہ بہت سے فوائد کے حامل ہیں۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی آیت میں تمام حسنات اور سیئات کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ قدرت کے تمام ذرائع، یہاں تک کہ وہ صلاحیتیں کہ جن سے غلط فوائد حاصل کیے گئے، خدا کی طرف سے ہیں اور اصلاحی اور مثبت اجزاء کا سرچشمہ وہی ہیں اور اگر دوسری آیت میں سیئات کی نسبت لوگوں کی طرف دی گئی ہے تو واقعہ کے انھی منفی پہلوؤں اور خدا کی عنایات اور صلاحیتوں سے غلط فائدہ اٹھانے والوں کی طرف اشارہ ہے یہ بالکل اسی مثال کی طرح ہے کہ ایک شخص اپنے بیٹے کو ایک اچھا گھر بنانے کے لیے سرمایہ دے لیکن وہ اسے منشیات، فساد، تباہ کاری میں صرف کرے اس میں شک نہیں ہے کہ سرمایہ کے لیے وہ اپنے باپ کا مقروض ہے لیکن

سرمایے کے غلط استعمال کے لیے وہ خود ذمہ دار ہے۔

۲۔ ممکن ہے کہ ایت مبارکہ " الامر بین الامرین " کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتی ہو جس کی طرف جبر اور تفویض کی بحث میں اشارہ ہوا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام حوادث دنیا، یہاں تک ہمارے اعمال وافعال چاہے اچھے ہوں یا بُرے، نیک ہوں یا بد ایک طرح سے خدا سے مربوط ہیں کیونکہ وہی ہے جس نے ہمیں طاقت دی ہے اور اختیار وارادہ کی آزادی ہمیں بخشی ہے لہٰذا ہم جو کچھ اختیار کرتے ہیں اور ارادہ کی آزادی کے ساتھ انتخاب کرتے ہیں وہ مشیت الٰہی کے برخلاف نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے اعمال ہم سے نسبت رکھتے ہیں اور ان کا سرچشمہ ہمارا وجود ہے کیونکہ عمل کے تعین کرنے کا عامل وسبب ہمارا ارادہ واختیار ہے اور اسی بنا پر ہم اپنے اعمال کے بارے میں جوابدہ ہیں ا[illegible] کی طرف ہمارے اعمال کی اسناد ونسبت، جیسا کہ اشارہ ہوا ہے ہماری ذمہ داری اور جوابدہی کو سلب نہیں کرتی اور عقیدہ جبر کا موجب اور سبب نہیں بنتی۔ لہٰذا خدا جہاں فرماتا ہے کہ "حسنات وسیئات" میری طرف سے ہیں تو وہاں اشارہ کرتا ہے کہ تمام چیزوں کی نسبت خدا کی اس فاعلیت (اختیار) کی طرف ہے اور جہاں فرماتا ہے سیئات تمہاری طرف سے ہیں تو وہاں ہماری فاعلیت اور ہمارے ار[illegible]دہ اختیار کی طرف اشارہ ہے۔ اور حقیقت میں ان دو آیات کا مجموعہ " امر بین الامرین " کے مسئلہ کو ثابت کرتا ہے (یہ نکتہ غور طلب ہے)۔

۳۔ ایک اور تفسیر [illegible] دو آیات کے لیے موجود ہے اور اہلبیتؑ کی روایت میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ وہ یہ ہے کہ " سیئات " سے مراد اعمال کی سزا ومجازات اور گ[illegible] کے عقوبات ونتائج ہیں [illegible] اس میں شک نہیں کہ یہ سزائیں خدا کی طرف سے ہیں لیکن چونکہ یہ بندوں کے اعمال وافعال کا نتیجہ ہیں۔ اس بنا پر بعض اوقات ان کی نسبت بندوں کی طرف دی جاتی ہے اور بعض اوقات خدا کی طرف، اور دونوں صحیح ہیں۔ مثلاً یہ دونوں طرح سے صحیح و درست ہے کہ کہا جائے کہ قاضی چور کا ہاتھ کاٹتا ہے یا یہ کہ چور خود اپنے ہاتھ کو کاٹتا ہے۔

۸۰۔ مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۖ وَمَنْ تَوَلَّىٰ فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۝

۸۱۔ وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ۖ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ ۖ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ۝

ترجمہ

۸۰۔ جس شخص نے پیغمبر کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جو روگردانی کرے تو تم اس کے جواب دہ نہیں ہو۔

۸۱۔ وہ تیرے سامنے کہتے ہیں کہ ہم فرمانبردار ہیں لیکن جب وہ تمہاری بزم سے باہر جاتے ہیں تو ان میں ایک گروہ تمہاری گفتگو کے برخلاف رات کو خفیہ میٹنگیں تشکیل دیتا ہے جو کچھ وہ ان میٹنگوں میں کہتے ہیں خدا اسے لکھتا ہے

ان کی پرواہ نہ کرو (اور ان کے منصوبوں اور سازشوں سے نہ ڈرو) اور خدا پر توکل کرو اور کافی ہے کہ وہ تمھارا مددگار اور حفاظت کرنے والا ہو۔

تفسیر

اس آیت میں لوگوں اور ان کے "حسنات" اور "سیئات" کے مقابلہ میں رسولؐ کی حیثیت بیان کی گئی ہے۔ خدا پہلے فرماتا ہے کہ جو شخص پیغمبر کی اطاعت کرے اس نے خدا کی اطاعت کی۔

(من یطع الرسول فقد اطاع الله)

لہذا خدا کی اطاعت پیغمبر کی اطاعت سے جدا نہیں ہو سکتی کیونکہ پیغمبر کوئی قدم خدا کی مشیت کے خلاف نہیں اٹھاتا اس کی گفتار، کردار، اعمال سب خدا کے فرمان کے مطابق ہیں۔

اس کے بعد فرماتا ہے، اگر کچھ لوگ اعراض اور روگردانی کرتے ہیں اور وہ تمھارے احکام کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں تو تم ان کے اعمال کے جواب دہ نہیں ہو اور یہ تمھارا کام نہیں کہ ان سے تکرار کرو یا نافرمانی کرنے سے انھیں جبراً روکو۔ تمھارا فرض تبلیغ رسالت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور گمراہ و بے خبر لوگوں کی رہنمائی کرنا ہے (ومن تولی فما ارسلناک علیھم حفیظا) توجہ کرنا چاہیے کہ لفظ "حفیظ" اس لحاظ سے کہ صفت مشبہ ہے اور ثبات و دوام کے معنی دیتا ہے "حافظ" سے مختلف ہے جو کہ اسم فاعل ہے اس لیے حفیظ کا معنی وہ شخص ہے کہ جو ہمیشہ کسی چیز کی نگرانی پر مامور ہو۔ لہذا آیت کا معنی و مفہوم یہ ہوگا کہ پیغمبر کی ذمہ داری رہبری کرنا، ہدایت کرنا، دعوت دینا، فتنہ اور مفاسد کا مقابلہ کرنا ہے لیکن اگر کچھ لوگ مخالفت پر کمربستہ ہوں تو پیغمبر ان کی کجروی کے لیے جواب دہ نہیں ہیں) ہر جگہ موجود ہوں اور ہر گناہ و معصیت کا طاقت اور جبر سے مقابلہ کریں اور مروجہ طریقوں سے بھی وہ اس طرح کی قدرت نہیں رکھتے۔ اس بنا پر احد جیسی جنگ کے حوادث بھی شاید آیت کے پیش نظر ہوں کہ پیغمبر کا فرض تھا کہ فنون حرب کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ گہرائی اور غور و خوض سے جنگی حکمت عملی تیار کرتا اور دشمن کے شر سے مسلمانوں کو محفوظ رکھتا، اور یہ بات مسلم ہے کہ ان احکام و ضوابط میں پیغمبر کی اطاعت، خدا کی اطاعت ہے۔ لیکن اگر کچھ لوگوں نے پیغمبر کے احکام کی حکم عدولی کی اور اس سبب سے وہ شکست سے دوچار ہوئے تو اس کی جواب دہی ان کی طرف منسوب ہوگی نہ کہ پیغمبر سے۔ غور کرنا چاہیے کہ یہ آیت قرآن کی واضح ترین آیات میں سے ہے جو سنت پیغمبر کے حجت ہونے اور آپ کی احادیث کو قبول کرنے کے لیے دلیل ہے، لہذا کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں قرآن کو قبول کرتا ہوں لیکن پیغمبر کی حدیث اور سنت کو قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ مندرجہ بالا آیت صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ پیغمبر کی حدیث اور سنت کی اطاعت فرمان خدا کی اطاعت ہے۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے حدیث ثقلین کے مطابق جو کہ مشہور ماخذ اور کتب اسلامی میں مذکور ہے چاہے وہ کتب شیعہ ہوں یا کتب اہل سنت، وضاحت کے ساتھ اہل بیت علیہم السلام کو سند اور حجت قرار دیا ہے، اس سے ہمیں معلوم ہوتا

ہے کہ اہلِ بیتؑ کے فرمان کی اطاعت بھی فرمانِ خدا کی اطاعت سے الگ نہیں ہے اور کوئی شخص یوں نہیں کہہ سکتا کہ میں قرآن کو تو قبول کرتا ہوں لیکن اہلِ بیتؑ کے فرامین کو نہیں مانتا کیونکہ یہ بات مذکورہ بالا آیت اور اس کی مثل آیات کے برخلاف ہے۔

اسی لیے بہت سی روایات جو تفسیر برہان میں اس آیت کے ضمن میں آئی ہیں ہم پڑھتے ہیں کہ خدا نے مذکورہ بالا آیت کے مطابق امر و نہی کا حق اپنے پیغمبرؐ کو دیا ہے اور پیغمبرؐ نے یہ حق حضرت علیؑ اور ائمہ اہل بیتؑ کو دیا ہے لہٰذا لوگوں کا فرض ہے کہ وہ ان کے امر و نہی سے روگردانی نہ کریں کیونکہ ان کا امر و نہی ہمیشہ خدا کی طرف سے ہے نہ کہ خود ان کی طرف سے[1]۔ اس کے بعد دوسری آیت میں منافقین کے ایک گروہ یا کمزور ایمان والے کچھ لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ لوگ جس وقت مسلمانوں کی صفوں میں پیغمبرؐ کے پاس کھڑے ہوتے ہیں تو اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے یا کسی خوف سے اپنے آپ کو مخفی رکھنے کے لیے دوسروں کے ہم آواز ہوتے۔ وہ فرمانِ پیغمبرؐ کی اطاعت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم جان و دل سے پیغمبرؐ کی پیروی کرتے ہیں (و یقولون طاعۃ)۔

لیکن جب لوگ بزمِ رسالت سے نکلتے ہیں تو منافقین اور کمزور ایمان والے افراد اپنے عہد و پیمان کے بالکل خلاف رکھ دیتے ہیں اور خفیہ اجتماعات میں پیغمبرؐ کے ارشادات کے خلاف پروگرام بناتے ہیں (فاذا برزوا من عندک بیت طائفۃ منہم غیر الذی تقول)۔ ان جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین پیغمبرؐ کے زمانے میں پہلے ہی بیٹھتے تھے، بلکہ وہ رات کو خفیہ اجتماعات میں ایک دوسرے سے مشورہ کرتے تھے کہ پیغمبر اکرمؐ کے طرزِ عمل میں رخنہ اندازیاں کرتے تھے، لیکن خدا اپنے رسولؐ کو حکم دیتا ہے کہ وہ ان سے منہ پھیر لیں اور ان کی سازشوں سے گھبرائیں نہیں اور اپنے طرزِ عمل کے سلسلے میں ان پر انحصار نہ کریں، بلکہ فقط خدا پر بھروسہ رکھیں خدا جو سب سے زیادہ مددگار و حفاظت کرنے والا ہے (فاعرض عنہم و توکل علی اللہ و کفیٰ باللہ وکیلا)۔

۸۲۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا ۝

ترجمہ

۸۲۔ کیا قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے کہ اگر وہ غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو اس میں وہ بہت سے اختلافات پاتے۔

---

[1] تفسیر برہان جلد اوّل صفحہ ۳۹۶

تفسیر

اعجازِ قرآن کی زندہ مثال

ان سرزنشوں کے بعد جو گزشتہ آیات میں منافقین کو کی گئی تھیں یہاں انھیں اور دوسرے تمام ان لوگوں کی طرف جو قرآن کی حقانیت میں شک و تردد کرتے ہیں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کیا یہ لوگ قرآن کی مخصوص وضع و کیفیت پر غور و فکر نہیں کرتے اور اس کے نتائج کو نہیں دیکھتے، قرآن اگر خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے نازل ہوتا تو یقیناً اس میں انھیں بہت سے تفاوت اور اختلافات ملتے اب جب کہ اس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف اور تناقض نہیں ہے تو انھیں جان لینا چاہیے کہ وہ خدا ہی کی طرف سے نازل ہوا ہے (افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافًا کثیرًا)۔

"تدبر" اصل میں مادہ دبر (بروزن ابر) پشت سر اور کسی چیز کی عاقبت و انجام کے معنی میں ہے اس بنا پر تدبر سے مراد نتائج، عواقب اور کسی چیز کے آگے پیچھے دیکھنا ہے۔ تفکر سے اس کا فرق یہ ہے کہ تفکر کا ربط کسی موجود کے علل اور خصوصیات کے مطالعہ سے ہے لیکن تدبر اس کے عواقب و نتائج کے مطالعے اور جائزے سے مربوط ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اصولِ دین اور ایسے مسائل مثلاً پیغمبر کے دعوے کی سچائی اور قرآن کی حقانیت کے بارے میں تحقیق و مطالعہ کریں اور اندھی تقلید اور بغیر سوچے سمجھے فیصلوں۔ سے اجتناب کریں۔

۲۔ بعض لوگوں کے خیال کے برعکس قرآن سب لوگوں کے لیے قابل فہم و ادراک ہے کیونکہ اگر وہ قابل فہم و ادراک نہ ہوتا تو اس میں تدبر اور غور و فکر کرنے کا حکم نہ دیا جاتا۔

۳۔ قرآن کی حقانیت کی ایک اور دلیل اور یہ کہ وہ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے یہ ہے کہ سارے قرآن میں تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔ اس حقیقت کے ادراک کے لیے حسب ذیل وضاحت کی طرف توجہ کریں۔

"ہر شخص کی کیفیات اور نظریات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں بعض استثنائی حالتیں چھوڑ کر عام حالات میں قانون تکامل و ارتقاء انسان اور اس کے افکار و نظریات پر بھی موثر و حاوی ہے ہمیشہ دن مہینے اور سال بدلنے سے لوگوں کی زبان، فکر اور گفتار بھی بدلتی رہتی ہے اگر غور سے دیکھیں تو ایک لکھنے والے شخص کی تحریریں کبھی بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں بلکہ ایک ہی کتاب کی ابتدا اور انتہا میں فرق ہوتا ہے خصوصاً اگر کوئی شخص عظیم حوادث سے گزرے اور حوادث بھی ایسے جو ایک فکری، اجتماعی، نظریاتی، اعتقادی انقلاب کی بنیاد بن جائیں تو وہ جتنا بھی کوشش کرے کہ اپنی گفتار کو ایک جیسا اور ایک طرز پر

رکھے اور اسے اپنی گذشتہ باتوں سے مربوط کرلے وہ ایسا نہیں کرسکتا خصوصاً اگر وہاں پڑھا اور پس ماندہ ماحول میں پروان چڑھا ہو۔"

لیکن قرآن جو ۲۳ سال کی مدت میں لوگوں کے تربیتی تقاضوں اور ضروریات کے مطابق بالکل مختلف حالات اور مواقع پر نازل ہوا، ایسی کتاب ہے جو مکمل طور پر مختلف موضوعات کو محیط ہے اور عام کتب کی طرح اس میں صرف ایک اجتماعی، سیاسی، فلسفیانہ، حقوقِ انسانی یا تاریخی موضوع سے بحث نہیں ہے بلکہ قرآن کبھی توحید اور اسرار آفرینش کے بارے میں اور کبھی احکام و قوانین اور آداب و سنن کے متعلق اور کسی وقت گذشتہ عبادت اور بندوں کے خدا سے رابطے کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ ڈاکٹر گوستاولبون کے بقول قرآن جو کہ مسلمانوں کی آسمانی کتاب ہے صرف تعلیمات اور احکام مذہبی پر منحصر نہیں بلکہ مسلمانوں کے لیے سیاسی، اجتماعی اور معاشرتی احکام بھی بیان کرتی ہے ایسی خصوصیات کی حامل کتاب کے لیے عام طور پر یہ ممکن نہیں کہ وہ تضاد، تناقض اور تضاد بیانی سے مبرا ہو۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان تمام جہات کے باوجود اس کی تمام آیات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں اور ہر قسم کے تضاد، اختلافات، ناموزونیت سے خالی ہے تو ہم بہت بہتر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کتاب افکار انسانی کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔ بلکہ خدا کی طرف سے ہے۔ جیسا کہ قرآن خود اس حقیقت کو درج بالا آیت میں بیان کرتا ہے[1]

۸۳۔ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۭ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ○

ترجمہ

۸۳۔ اور جب کامیابی یا شکست کی خبر انھیں ملے تو وہ (تحقیق کیے بغیر) اسے مشہور کر دیتے ہیں لیکن اگر وہ پیغمبر اور صاحبان امر کی طرف (جو تشخیص کی کافی اہلیت و قدرت رکھتے ہیں) پلٹا دیں تو وہ مسائل کی تہ سے آگاہ ہو جائیں اور خدا کا فضل اور رحمت شاملِ حال ہوتی تو سوائے قلیل گروہ کے سب کے سب شیطان کی پیروی کرنے لگتے۔

تفسیر

افواہیں پھیلانا

اس آیت میں منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کے ایک اور منفی عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب انھیں مسلمانوں کی فتح یا شکست کے متعلق خبریں پہنچتی ہیں تو وہ تحقیق کیے بغیر انھیں لوگوں میں پھیلاتے ہیں

---

[1] کتاب قرآن و آخرین پیغمبر ص ۲۰۹ تالیف ناصر مکارم

جب کہ بیشتر یہ خبریں بے بنیاد ہوتی ہیں اور دشمنوں کی جانب سے خاص مقاصد کے لیے گھڑی جاتی ہیں ان کا شہرت پانا مسلمانوں کے لیے ضرر رساں ہوتا ہے (واذا جاءهم امر من الامن او الخوف اذاعوا به) حالانکہ ان کی ذمّہ داری ہے کہ اس قسم کی خبریں سب سے پہلے اپنے رہبروں اور پیشواؤں کے سامنے رکھیں اور ان کی وسیع اطلاعات اور گہری فکر سے استفادہ کریں اور بلاوجہ نہ تو مسلمانوں کو اچھے نتائج کے غرور میں مبتلا کریں جو خیالی کامیابیوں سے پیدا ہوتے ہیں اور نہ شکست کی جھوٹی خبروں سے ان کی ہمتوں کو پست کریں (ولو ردوه الى الرسول والى اولى الامر منهم لعلمه الذين يستنبطونه منهم)

"یستنبطونہ" اصل میں نبط (بروزن فقط) کے مادہ سے ہے اس سے مراد وہ پہلا پانی ہے جو کنوئیں سے نکالتے اور زمین کی تہہ سے حاصل کرتے ہیں اسی بنا پر ہر حقیقت کے مختلف دلائل و شواہد سے استفادہ کرنے اور موجود مدارک سے استخراج کرنے کو "استنباط" کہا جاتا ہے چاہے یہ کام فقہی مسائل میں ہو یا فلسفیانہ، سیاسی اور علمی مسائل میں جو شخص کی قدرت رکھتے ہوں، اور مختلف مسائل پر کافی دسترس رکھتے ہوں اور جو حقائق کو بے بنیاد افواہوں سے اور صحیح مطالب کو غلط امور سے الگ کر کے لوگوں تک پہنچائیں۔ اس طرح کے لوگوں میں بلا وجہ پیغمبر اکرمؐ اور آپؐ کے جانشین آئمہ اہل بیتؑ کا ہے اور دوسرے درجے میں ایسے علماء ہیں جو ان مسائل میں صاحبِ نظر ہیں۔ جیسا کہ تفسیر نور الثقلین میں اس آیت کے ضمن میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے فرمایا:

"هم الائمه" یعنی اس آیت سے مراد آئمہ اہل بیت ہیں۔

اور اس مضمون کی دوسری روایات بھی نقل ہوئی ہیں ممکن ہے اس طرح کی روایات پر لوگ اعتراض کریں کہ رسول اللہؐ تو آیت کے نزول کے وقت موجود تھے لیکن آئمہ اہل بیتؑ کو منصب امامت نہیں ملا تھا اس اعتراض کا جواب واضح ہے کیونکہ یہ آیت پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کے ساتھ تو مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ آیت تو ایک مکمل قانون، تمام ادوار اور زمانوں کے لیے ہے جو دشمنوں اور نادان مسلمانوں کی طرف سے مسلمانوں کے درمیان غلط خبروں کی اشاعت کے لیے بیان کیا گیا ہے۔

غلط خبریں اور افواہیں پھیلانے کے نقصانات

مختلف معاشروں کو جو بڑے مسائل درپیش ہوتے ہیں اور جو معاشروں سے اجتماعی فکر، افہام و تفہیم اور ہم آہنگی کو ختم کر دیتے ہیں ان کا سبب جھوٹی خبریں گھڑنا اور ان کی نشر و اشاعت ہے اس طرح سے کہ بعض اوقات ایک منافق ایک غلط خبر گھڑ لیتا ہے وہ چند افراد تک پہنچاتا ہے اور وہ بلا تحقیق اس کی نشر و اشاعت کرنے لگتے ہیں اور شاید کچھ اس میں اپنی طرف سے اضافے بھی کرتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ کافی حد تک لوگوں کی فکری توانائی ضائع کر دیتے ہیں اور لوگوں کو اس طرف مشغول کر کے انہیں اضطراب اور پریشانی میں مبتلا کر دیتے ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس طرح کی خبریں لوگوں کے اعتماد کو متزلزل کر دیتی ہیں اور معاشرے کو اہم فرائض کی انجام دہی سے سست اور متردد کر دیتی ہیں۔ اگرچہ وہ گروہ اور معاشرے جن میں جبر ہے اور ان کے گلے گھونٹ دیئے گئے ہیں ان میں بھی جھوٹی خبریں گھڑنا اور ان کی نشر و اشاعت کرنا ایک قسم کے مقابلے یا انتقام جوئی کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن صحیح معاشروں میں غلط خبروں کی نشر و اشاعت بہت زیادہ نقصان دہ ہے۔ اگر اس قسم کی خبریں قابل مثبت

اور مفید افراد کے متعلق ہوں تو وہ انھیں خدمات اور کارنامے انجام دینے کے معاملے میں دل سرد اور سست کر دیتی ہیں اور بعض اوقات ان کی برس ہا برس کی حیثیت کو برباد کر دیتی ہیں۔ لوگوں کو ان کے وجود کے فوائد سے محروم کر دیتی ہیں۔ اسی بناء پر اسلام صراحت کے ساتھ جھوٹی خبریں گھڑنے کے عمل سے جنگ کرتا ہے اور جلبازی، جھوٹ اور تہمت گوئی اور اس کی نشر و اشاعت بھی ممنوع قرار دیتا ہے۔ درج بالا آیت اس کا ایک نمونہ ہے۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر فضل و رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی اور پروردگار کے مقرر شدہ رہنماؤں کے ذریعے اس قسم کی جھوٹی خبروں اور ان کے بُرے نتائج سے چھٹکارا حاصل نہ کرتے تو تم میں سے بہت سے لوگ شیطانی راستوں پر چل پڑتے اور قلیل افراد ایسے رہ جاتے جو شیطان کی پیروی سے اجتناب کرتے (ولو لا فضل الله علیکم و رحمته لاتبعتم الشیطان) یعنی پیغمبرؐ اور صاحب نظر و اہل بصیرت علماء ہی ہیں جو غلط مشتہر ہونے والی خبروں کے وسوسوں سے بچ سکتے ہیں لیکن معاشرے کی اکثریت اگر صحیح رہبری سے محروم رہ جائے تو من گھڑت خبروں اور ان کے ضرر رساں اثرات سے نہیں بچ سکتی۔[1]

۸۴۔ فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ ۖ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَكُفَّ بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَاللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنْكِيلًا ○

ترجمہ

۸۴۔ راہ خدا میں جنگ کرو۔ تم صرف اپنی ذمہ داری کے جواب دہ ہو اور مومنین کو (اس کام کا) شوق دلاؤ۔ امید ہے کہ خدا کافروں کی قوت کو روک دے (چاہے تم اکیلے ہی میدان میں چلے جاؤ) خدا کی قدرت بہت زیادہ ہے اور اس کی سزا دردناک ہے۔

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان، قرطبی اور روح المعانی میں اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں اس طرح منقول ہے:

---

[1] جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ " الا قلیلا " " اتبعتم " کی ضمیر سے مستثنیٰ ہے اور آیت میں کسی قسم کی تقدیم و تاخیر نہیں ہے (غور کیجئے گا)۔

جس وقت ابوسفیان اور قریش کا لشکر فتح و کامیابی کے ساتھ میدانِ اُحد سے پلٹا تو ابوسفیان نے پیغمبرؐ سے معاہدہ کیا کہ بدر صغریٰ کے موقع پر (یعنی ماہِ ذی القعدہ میں جو بازار بدر کی زمین پر لگتا تھا) دوبارہ ایک دوسرے سے مقابلہ کریں گے۔ جب مقررہ وقت آیا تو پیغمبر اکرمؐ نے مسلمانوں کو مذکورہ مقام کی طرف جانے کی دعوت دی لیکن مسلمانوں کی ایک جماعت جو جنگ احد کی شکست کی تلخی کو ابھی تک نہیں بھولی تھی اس نے شدت کے ساتھ جانے کی مخالفت کی اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور رسول اللہؐ نے مسلمانوں کو دوبارہ چلنے کی دعوت دی تو اس موقع پر صرف ستر آدمی پیغمبرؐ کے ہم رکاب ہو کر اس مقام پر پہنچے۔ لیکن ابوسفیان (جو مسلمانوں کا سامنا کرنے سے خوف زدہ تھا) مقابلہ کرنے نہ آیا اور پیغمبر اکرمؐ اپنے اصحاب کے ساتھ صحیح و سلامت مدینہ لوٹ آئے۔

تفسیر

ہر شخص اپنے فرائض کا جوابدہ ہے

جہاد سے متعلق آیات کے بعد اس آیت میں ایک بہت بڑا حکم پیغمبرؐ کو دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ ان کی ذمہ داری ہے کہ اکیلے دشمن کے مقابلہ میں کھڑے ہو جائیں۔ چاہے ایک شخص بھی میدان میں ان کا ہم قدم نہ ہو۔ کیونکہ وہ صرف اپنی ذمہ داری کے لیے جوابدہ ہیں اور وہ دوسرے لوگوں کے بارے میں شوق دلانے اور دعوتِ جہاد دینے کے علاوہ ان کی کوئی مسئولیت نہیں ہے (فقاتل فی سبیل اللہ لا تکلف الا نفسک وحرض المؤمنین) حقیقت میں یہ آیت ایک اہم اجتماعی حکم خصوصاً رہبروں کے متعلق اپنے اندر سموئے ہوئے ہے وہ یہ ہے کہ انھیں اپنے کام میں اس قدر پختہ عزم، ثابت قدم اور اٹل ہونا چاہیے کہ اگر کوئی شخص بھی ان کی دعوت پر "لبیک" نہ کہے تب بھی وہ اپنے مقدس مقصد اور منزل کے حصول کی جدوجہد سے دستبردار نہ ہوں۔ دوسروں کو اپنے فرائض کی انجام دہی کی دعوت دینے کے باوجود اپنے لائحۂ عمل کو دوسروں کی مرضی پر نہ چھوڑیں۔ کوئی رہبر بھی جب تک ایسے عزمِ صمیم کا حامل نہ ہو وہ رہبری کے اہل نہیں اور نہ ہی وہ اپنے مقاصد کے حصول کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خصوصاً خدا کے مقرر شدہ رہبر و رہنما بلند عزم و حوصلہ اور کردار کے مالک ہوتے ہیں کیونکہ انھیں خدا کی ذات پر تکیہ ہوتا ہے وہ خدا کہ جو تمام توانائیوں اور طاقتوں کا سرچشمہ ہے۔

لہٰذا اس حکم کے بعد خدا فرماتا ہے: امید ہے کہ خدا تیری سعی و کوشش کے ذریعہ دشمنوں کی قدرت و طاقت کو ختم کر دے گا چاہے ان کے مدمقابل تو اکیلا ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اس کی قدرت تمام قدرتوں سے مافوق اور اس کی سزا تمام عذابوں سے بڑھ کر ہے (عسی اللہ ان یکف بأس الذین کفروا و اللہ اشد بأسا و اشد تنکیلا)[۱]

---

[۱] بأس کے معنی لغت میں قوت، استحکام اور شجاعت ہے اور تنکیل مادہ نکول سے خوف کے مارے رک جانے کے معنی میں ہے اور اصل میں نکل (بروزن اکل) کو جانور کی لگام کے معنی میں لیا گیا ہے اسی بنا پر تنکیل جو کہ باب تفعیل کا مصدر ہے ایسے کام کی انجام دہی کے مقصد میں آتا ہے کہ مقابل کی طرف جسے مشاہدہ کرنے کے بعد خلاف ورزی سے لوٹ آئے اور یہ وہی سزا و عذاب ہے کہ جو ستمگروں سے دوسرے لوگوں کی عبرت کا باعث بنتا ہے۔

کلام خدا میں "عسیٰ" اور "لعل" کے معنی

لفظ "عسیٰ" عربی لغت میں شائد کے معنی میں تردد کا مفہوم بھی دیتا ہے اور "لعل" پر امید ہونے، انتظار اور ایسے امور کی توقع کے معنی میں آتا ہے آئندہ جن کے وجود کا یقین نہ ہو بلکہ احتمال ہو۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے الفاظ انسانوں کی گفتگو میں آنا تو فطری اور عین طبعی ہے کیونکہ انسان تمام مسائل سے آگاہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس کی صلاحیت و قدرت بھی محدود ہے اور وہ جو کچھ کرے اس کے انجام کو اپنی مرضی کے تابع نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ خدا جو ماضی، حال اور مستقبل سے مکمل طور پر باخبر ہے اور جو کرنا چاہے اس کا اختیار رکھتا ہے اس کے لیے "جہالت" یا "بے اختیار" ہونے کے الفاظ استعمال کرنے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا اس لیے بہت سے علماء یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس قسم کے الفاظ جہاں کے کلام میں استعمال ہوں وہ اپنے اصل معنی میں استعمال نہیں ہوتے بلکہ ان کے کچھ اور معنی نکلتے ہیں مثلاً "عسیٰ" وعدہ کے معنی اور "لعل" طلب کے معنی میں ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ الفاظ کلام خدا میں بھی اپنے وہی اصلی معانی رکھتے ہیں اور ان کا لازمہ جہالت اور عدم اختیار نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ ایسے مواقع پر استعمال ہوتے ہیں کہ جہاں مقصد تک پہنچنے کے لیے کئی ایک مقدمات کی ضرورت ہوتی ہے تو جس وقت ان میں سے ایک یا کئی ایک مقدمات حاصل ہو جائیں تو پھر بھی اس مقصد کے موجود ہونے کا قطعی اور یقینی حکم نہیں لگایا جا سکتا بلکہ چاہیے کہ اسے احتمالی حکم کے طور پر بیان کیا جائے۔

مثلاً قرآن کہتا ہے:۔

واذا قرئ القراٰن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون

جب قرآن پڑھا جائے تو کان دھر کے سنو اور خاموش رہو، اُمید ہے کہ خدا کی رحمت تمہارے شامل حال ہو۔ (اعراف، ۲۰۴)

واضح ہے کہ صرف قرآن کی آیات کو کان دھر کے سننے سے خدا کی رحمت انسان کے شامل حال نہیں ہوتی بلکہ یہ تو ایک مقدمہ ہے اس کے علاوہ بھی دیگر لوازم ہیں جن میں ان آیات کا فہم و ادراک اور اس کے بعد ان احکام پر عمل در آمد جو ان آیات میں موجود ہیں بھی شامل ہیں۔ لہٰذا اس قسم کے مواقع پر ایک مقدمہ کے موجود ہونے سے نتیجہ کے حصول کا قطعی اور یقینی حکم نہیں لگایا جا سکتا بلکہ اسے ایک احتمالی حکم کے طور پر بیان کرنا ہو گا دوسرے لفظوں میں کلام خدا میں اس قسم کی تعبیرات تو بیدار کرنے اور سننے والے کو اس طرف متوجہ کرنے کے لیے ہیں کہ اس کام کے علاوہ کچھ اور شرائط و مقدمات بھی مقصد تک پہنچنے کے لیے ضروری ہیں مثلاً اسی مثال میں خدا کی رحمت کا شعور حاصل کرنے کے لیے قرآن کو غور سے سننے کے ساتھ اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔

زیر بحث آیت پر بھی یہ گفتگو مکمل طور پر صادق آتی ہے کیونکہ کفار کی طاقت صرف مومنین کو دعوت جہاد دینے اور انھیں شوق جہاد دینے سے ختم نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے ساتھ جہاد کے باقی لائحہ عمل پر عمل درآمد بھی ضروری ہے تاکہ اصل مقصد حاصل ہو سکے اس بنا پر ضروری نہیں کہ یہ الفاظ جب خدا کے کلام میں آئیں تو ان کے حقیقی معنی سے صرف نظر کر لیا جائے۔[۱]

---

[۱] راغب نے کتاب مفردات میں اس قسم کے الفاظ (عسیٰ وغیرہ) کی تفسیر میں ایک دوسرا احتمال بھی بیان کیا ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

۸۵۔ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ○

ترجمہ

۸۵۔ جو شخص نیک کام کی تحریک دے اس میں سے اس کا حصہ ہوگا اور جو بُرے کام کے لیے اُبھارے گا تو اس میں سے (بھی) اسے حصہ ملے گا۔ اور خدا ہر چیز کا حساب کرتا اور اسے محفوظ رکھتا ہے۔

تفسیر

اچھے یا بُرے کام کی تحریک دلانے کا نتیجہ

جیسا کہ گذشتہ آیت کی تفسیر میں اشارہ ہو چکا ہے قرآن کہتا ہے کہ ہر شخص پہلے مرحلہ میں اپنے کام کا جوابدہ ہے نہ کہ دوسروں کا۔ لیکن اس بنا پر کہ اس سے غلط فائدہ نہ اٹھایا جائے اس آیت میں کہتا ہے: یہ درست ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کا جوابدہ ہے لیکن جو شخص دوسرے کو نیک کام پر ابھارے تو اس کا حصہ ملے گا اور جو شخص دوسرے کو کسی بُرے کام پر اکسائے تو اس کا حصہ (بھی) اس میں ہوگا (من یشفع شفاعة حسنة یکن له نصیب منها و من یشفع شفاعة سیئة یکن له کفل منها) اس بنا پر ہر شخص کا اپنے اعمال کا جواب دہ ہونے کے معنی یہ نہیں کہ وہ دوسروں کو دعوتِ حق دینے اور فساد کا مقابلہ کرنے سے آنکھیں بند کر لے اور اسلام کی روحِ اجتماعیت کو مجروح کرتے ہوئے تجرد و انفرادیت کے ذریعے معاشرے سے بیگانگی کا راستہ اختیار کرے۔ شفاعت اصل میں مادہ شفع (بر وزن نفع) سے جفت کے معنی میں ہے اس بنا پر ایک چیز کا دوسری میں منضم و مدغم ہو جانا شفاعت کہلاتا ہے البتہ کبھی کبھار یہ راہنمائی اور ارشاد و ہدایت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے (جس طرح درج بالا آیت میں ہے) تو اس وقت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا معنی دیتا ہے (اور شفاعت سیئہ اس کے برعکس یعنی امر بالمنکر و نہی عن المعروف ہے) لیکن اگر گنہ گاروں کو ان کے انجام سے نجات دینے کا موقع ہو تو پھر یہ ایسے گنہ گار افراد کی مدد کرنے کے معنی میں آتا ہے جو شفاعت کے لیے اہلیت اور لیاقت رکھتے ہوں۔ دوسرے الفاظ میں شفاعت کبھی تو عمل کی انجام دہی سے پہلے ہوتی ہے جو راہنمائی کے معنی میں ہے۔ اور کبھی عمل کی انجام دہی کے بعد ہوتی ہے

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) اور وہ یہ کہ ان سے مخاطب اور سننے والے کو امید دلانا مقصود ہے۔ نہ کہ کہنے والے کی امید بیان کرنا اور واضح تر الفاظ میں جب خدا کہتا ہے "عسیٰ و لعل" تو اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ میں امید رکھتا ہوں بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ تم امید رکھو۔

جہاں عمل کے نتائج سے نجات دینے کے معنی میں ہے بہرحال دونوں طرح سے ایک چیز دوسری کے لیے ضمیمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔
ضمناً توجہ رہے کہ آیت اگرچہ ایک کلی مفہوم کی حامل ہے، نیک اور بد ہر طرح کی دعوت کا مفہوم اس میں شامل ہے لیکن چونکہ یہ جہاد کی آیات کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے لہٰذا شفاعت حسنہ سے پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے تشویق جہاد مراد ہے اور شفاعت سیئہ سے منافقین کی طرف شوق جہاد نہ دلانا مراد ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے کام کا نتیجہ بھگتے گا یا امر بھی لائق توجہ ہے کہ لفظ شفاعت کی تعبیر اس موقع پر جہاں (نیکیوں اور برائیوں کی طرف) رہبری کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ ممکن ہے اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو کہ رہبر کی گفتگو (چاہے خیر کا راستہ بتلانے والا رہبر ہو یا شر کا سبق دینے والا) دوسروں پر اسی صورت میں اثر کرے گی جب وہ اپنے لیے دوسروں کی طرح امتیاز نہ برتے بلکہ اپنے آپ کو دوسروں کا ہم دوش اور ساتھی قرار دے۔ یہ ایسا طریقہ ہے، جو اجتماعی اور معاشرتی مقاصد میں بڑا موثر ہوتا ہے۔ اگر قرآن میں بعض مواقع پر مثلاً سورۂ شعراء، اعراف، ہود، نمل اور عنکبوت میں ہم دیکھتے ہیں کہ خدا نے انبیاء و مرسلین کو جو امتوں کی ہدایت اور رہبری کے لیے بھیجے گئے ہیں "اخوہم" یا "اخاہم" یعنی ان کا بھائی کہا ہے، تو وہ بھی اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔
دوسرا نکتہ یہ ہے کہ قرآن شفاعت حسنہ یعنی اچھے کام کی طرف راغب کرنے والوں کے بارے میں کہتا ہے کہ ترغیب دینے والوں کو "نصیب" ملے گا۔ جب کہ "شفاعت سیئہ" کے ضمن میں کہتا ہے کہ اسے "کفل" میسر آئے گا۔ یہ تعبیر کا اختلاف اس وجہ سے ہے کہ "نصیب" کے معنی ہیں مفید اور زیادہ سودمند اور "کفل" کے معنی ہیں پست اور بُری چیز[1]
یہ آیت اسلام کے بنیادی اجتماعی مسائل کی ایک منطق کو واضح کرتی ہے۔ آیت صراحت سے کہتی ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے اعمال کے معاملے میں ترغیب دینے اور رہنمائی کے عمل میں شریک ہیں اس بنا پر جب بھی کوئی بات یا عمل بلکہ انسان کی خاموشی بھی اگر کسی گروہ کے نیک یا بُرے عمل کی ترغیب کا باعث بنے تو ترغیب دینے والا اس کام کے نتائج کے قابل ذکر حصّہ کا ذمہ دار ہوگا۔ لیکن اس سے اصل کام کرنے والے کا حصّہ کم نہیں ہو جائے گا۔
ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

من امر بمعروف او نهی عن منکر او دل علی خیر او اشار به فهو شریك ومن امر بسوء او دل علیه او اشار به فهو شریك۔

جو شخص کسی اچھے کام کا حکم دے یا بُرے کام سے روکے یا لوگوں کے لیے عمل خیر کی رہنمائی کرے یا ترغیب دلانے کے لیے کوئی ایسے اسباب فراہم کرے وہ اس عمل میں شریک اور حصّہ دار ہے اور اسی طرح جو شخص کسی بُرے کام کی دعوت دے یا اس کی رہنمائی کرے اور ترغیب دے وہ بھی اس کام میں شریک ہوگا۔
اس حدیث میں تین مرحلوں میں لوگوں کو نیک یا بد کام کی دعوت دینے کا ذکر ہوا ہے۔

---

[1] کفل (بروزن طفل) اصل میں جانور کی پشت کا عقبی اور آخری حصّہ ہے جس پر سوار ہونا تکلیف اور سختی کا باعث ہے اس لیے ہر قسم کے گناہ اور بُرے حصّہ کو کفل کہتے ہیں اور ایسے کام کو بھی جس میں بوجھ اور زحمت ہو کفالت کہتے ہیں۔

۱۔ مرحلہ حکم

۲۔ مرحلہ دلالت

۳۔ مرحلہ اشارہ

یہ تینوں ترتیب وار قوی، متوسط اور کمزور مرحلے ہیں اسی طرح ہر قسم کی دخل اندازی کسی نیک یا بُرے کام پر ابھارنے کا سبب بنتی ہے اور دخل اندازی کرنے والا اسی نسبت سے اس کے نتائج اور فوائد میں شریک ہوگا۔

اس اسلامی منطق کے مطابق صرف گناہ کرنے والے ہی گنہگار نہیں ہیں بلکہ وہ اشخاص جو کسی کام کی تبلیغ کے مختلف ذرائع استعمال کرکے حالات پیدا کریں۔ یہاں تک کہ ذرا سی ترغیب دلانے والے کا ایک لفظ بھی اسے گناہ کرنے والوں میں شامل کر لیتا ہے اسی طرح وہ لوگ جو خیرات اور نیکی اور بھلائیوں کے راستے میں اس قسم کا کام کرتے ہیں وہ بھی اس کا اجر حاصل کرتے ہیں۔

چند ایک روایات جو اس آیت کی تفسیر میں آئی ہیں سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ شفاعت حسنہ یا سیئہ کے معنی میں سے ایک کسی کے حق میں اچھی یا بُری دعا کرنا بھی ہے جو کہ بارگاہ خداوندی میں ایک قسم کی شفاعت ہے۔ امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا۔

من دعا لاخیه المسلم بظهر الغیب استجیب له وقال له الملك فلك مثلاه فذلك النصیب۔

جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے لیے اس کے پس پشت دعا کرے تو وہ قبول ہوگی اور خدا کا فرشتہ اس سے کہے گا اس سے دوگنا تمہارے لیے بھی ہے اور آیت میں نصیب سے مراد یہی ہے۔[1]

یہ تفسیر گذشتہ تفسیر سے اختلاف نہیں رکھتی بلکہ شفاعت کے معنی میں وسعت ہے یعنی جو مسلمان کسی دوسرے کی کسی طرح کی مدد کرے چاہے نیکی کی ترغیب کی صورت میں ہو یا بارگاہ خداوندی میں دعا کی شکل میں ہو یا کسی اور طرح سے اس کے نتیجہ میں شریک ہوگا۔ یہ بات اسلامی پروگراموں کی روح اجتماعیت کو اجاگر کرتی ہے اور مسلمانوں کو شخصی اور فقط ذاتی حیثیت سے زندگی گزارنے سے منع کرتی ہے۔

یہ امر اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ انسان دوسروں کی طرف توجہ اور ان کی بہتری کی کوششوں سے لاتعلق نہیں رہ سکتا اور اس سے اس کا ذاتی مفاد خطرے میں نہیں پڑتا۔ بلکہ وہ اس کے نتائج میں شریک ہوتا ہے آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: خدا توانا اور صاحب قدرت ہے اور تمہارے اعمال کی حفاظت کرتا اور حساب رکھتا ہے اور حسنات و سیئات کے نتیجے میں مناسب جزا و سزا دے گا (وکان اللہ علی کل شیء مقیتا) خیال رہے کہ "مقیت" اصل میں قوت کے مادہ سے ہے جس کے معنی اس غذا کے ہیں جو انسان کی جان کی حفاظت کرتی ہے اس بنا پر "مقیت" جو باب افعال کا

---

[1] تفسیر صافی آیہ مذکور کے ذیل میں۔

اسم فاعل ہے اس شخص کے معنی میں ہے جو دوسروں کو روزی دیتا ہے، چونکہ ایسا شخص اس کی زندگی کا محافظ ہوتا ہے اس لیے لفظ "مقیت" محافظ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ نیز وہ شخص جو روزی دیتا ہو یقیناً اس پر قدرت اور طاقت بھی رکھتا ہے اسی بناء پر یہ لفظ مقتدر کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ایسا شخص یقیناً اپنے زیر کفالت لوگوں کا حساب بھی رکھتا ہے اسی وجہ سے یہ لفظ حسیب کے معنی میں بھی آیا ہے۔ اوپر والی آیت میں ممکن ہے کہ لفظ "مقیت" سے یہ تمام مفاہیم مراد لیے گئے ہوں۔

۸۶۔ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ○

ترجمہ

۸۶۔ جس وقت کوئی شخص تمہیں تحیہ (اور سلام) کہے تو اس کا جواب بہتر انداز سے دو یا (کم از کم) اسی طرح کا جواب دو، خدا ہر چیز کا حساب رکھتا ہے۔

تفسیر

احترامِ محبت

اگرچہ بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ اس آیت کا تعلق گذشتہ آیات کے ساتھ اس لحاظ سے ہے کہ گذشتہ آیات کے مباحث جہاد سے متعلق تھیں اور اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ اگر دشمن دوستی اور مصالحت چاہیں تو تم بھی مناسب جواب دو لیکن واضح ہے کہ یہ تعلق اس سے مانع نہیں کہ ایک کلی اور عمومی حکم تمام تحیات اور نوازشات کے اظہار سے متعلق ہو جو مختلف افراد کی طرف سے ہو۔ آیت کی ابتداء میں آیا ہے جب کوئی شخص تمہیں تحیہ کہے تو اس کا جواب بہتر طریقہ سے دو یا کم از کم اس کے مساوی جواب دو۔ (واذا حییتم بتحیة فحیوا باحسن منها او ردوها) تحیت لغت میں حیات کے مادہ سے دوسرے کے لیے حیات وزندگی کی دعا کرنے کے معنی میں ہے چاہے یہ دعا "سلام علیک" کی صورت میں ہو (خدا تجھے سلامت رکھے) یا حیاک اللہ (خدا تجھے زندہ رکھے) یا اس قسم کے اور الفاظ سے ہو لیکن عام طور پر ہر قسم کے اظہار محبت کے لیے ہے جو لوگ الفاظ کے ذریعے ایک دوسرے سے کرتے ہیں جس کا واضح ترین اظہار سلام کرنا ہے لیکن کچھ روایات اور تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ عملی اظہار محبت بھی مفہوم تحیت میں شامل ہے تفسیر علی بن ابراہیم میں امام محمد باقرؑ اور امام صادقؑ سے منقول ہے:

المراد بالتحیة فی الآیة السلام وغیره من البر

آیت میں محبت سے مراد سلام اور ہر قسم کی نیکی کرنا ہے۔

کتاب مناقب کی ایک روایت میں ہے:

ایک کنیز نے پھول کی ایک شاخ امام حسن علیہ السلام کی خدمت میں پیش کی تو اس کے جواب میں امامؑ نے اسے آزاد کردیا۔ جب آپؑ سے اس کا سبب پوچھا گیا تو فرمایا کہ خدا نے ہمیں یوں حسن سلوک سکھاتے ہوئے فرمایا ہے و اذا حییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منہا۔

اس کے بعد مزید فرمایا: بہتر تحیہ وہی اس کا آزاد کرنا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت ایک کلی حکم اور ہر قسم کے اظہار محبت کا جواب دینے کے سلسلہ میں ہے چاہے وہ زبانی ہو یا عملی۔ آیت کے آخر میں اس لیے کہ لوگ جان لیں کہ تحیات ان کے جوابات اور ان کی برتری و مساوات، جس قدر اور جیسے ہوں، خدا سے پوشیدہ پنہاں نہیں ہیں۔ فرمایا ہے: خدا تمام چیزوں کے حساب سے آگاہ ہے (ان اللہ کان علی کل شیء حسیبا)

سلام عظیم اسلامی تحیہ ہے

جہاں تک ہمیں معلوم ہے دنیا کی تمام ملل و اقوام کے افراد جب ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں تو ایک دوسرے سے اظہارِ محبت کے لیے کچھ تحیہ پیش کرتے ہیں جو بعض اوقات لفظی ہوتا ہے اور کبھی عملی بھی۔ عمل عموماً تحیت کی علامت ہوتا ہے۔ اسلام میں بھی "سلام" ایک واضح ترین تحیت ہے اور اوپر والی آیت جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے تحیہ اگرچہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے۔ تاہم اس کا ایک واضح اظہار سلام کرنا ہے۔ لہٰذا اس آیت کے مطابق تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ سلام کا عالی تر یا کم از کم مساوی جواب دیں۔

آیاتِ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ سلام تحیت کی ایک قسم ہے سورۂ نور کی آیہ ۶۱ میں ہے:

فاذا دخلتم بیوتا فسلموا علی انفسکم تحیۃ من عند اللہ مبارکۃ طیبۃ

جب تم کہیں داخل ہو تو ایک دوسرے پر تحیت الٰہی بھیجو، وہ تحیہ جو مبارک اور پاکیزہ ہے۔

اس آیت میں سلام کو مبارک اور پاکیزہ خدائی تحیہ کہہ کر پکارا گیا ہے اور ضمنی طور پر اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ سلام علیکم کا معنی اصل میں سلام اللہ علیکم ہے "یعنی پروردگار کا تم پر سلام ہو" یا خدا تمھیں سلامت رکھے۔ اسی سبب سے سلام کرنا ایک قسم کا دوستی، صلح اور جنگ نہ کرنے کا اعلان ہے۔ قرآن کی کچھ آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل بہشت کا تحیہ بھی سلام ہے۔

اولئک یجزون الغرفۃ بما صبروا ویلقون فیہا تحیۃ وسلاما

"اہل بہشت اپنی استقامت اور صبر کی وجہ سے بہشت کے انعامات اور بلند مقامات سے بہرہ یاب ہوں گے اور انھیں تحیہ و سلام سے نوازا جائے گا۔"

(فرقان - ۷۵)

سورہ ابراہیم کی آیہ ۲۳ اور سورۂ یونس کی آیہ ۱۰ میں بھی اہل بہشت کے بارے میں ہے،

تحیتھم فیھا سلام

"ان کا تحیہ بہشت میں سلام ہے۔"

آیاتِ قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تحیت بمعنی سلام (یا اس کے مفہوم کا کچھ متبادل) گذشتہ اقوام میں بھی مروج تھا جیسا کہ سورۂ ذاریات کی آیہ ۲۵ میں حضرتِ ابراہیمؑ کے واقعہ میں آیا ہے کہ جب قوم لوطؑ کو سزا و عذاب دینے والے فرشتے بھیس بدل کر ابراہیمؑ کے پاس آئے تو آپؑ پر سلام کہا اور آپؑ نے بھی ان کے سلام کا جواب دیا۔

اذ دخلوا علیہ فقالوا سلاماً قال سلام قوم منکرون

زمانہ جاہلیت کے عربی اشعار سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تحیت سلام کے ذریعہ اس زمانہ میں بھی تھی۔[1]

جب ہم غیر جانبدارانہ طور پر اس اسلامی تحیت کا مختلف اقوام کی تحیت کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں تو اس کی قدر و قیمت ہم پر زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ اسلامی تحیت خدا کی طرف توجہ بھی ہے مخاطب کے لیے سلامتی کی دعا بھی اور صلح و امن کا اعلان بھی ہے۔ اسلامی روایات میں سلام کے متعلق بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے یہاں تک کہ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

من بدء بالکلام قبل السلام فلا تجیبوہ

جو شخص سلام سے پہلے گفتگو شروع کر دے اس کا جواب نہ دو۔[2]

امام صادق علیہ السلام سے بھی منقول ہے کہ خدا فرماتا ہے:

البخیل من بخیل بالسلام

بخیل وہ ہے جو سلام کرنے میں بخل سے کام لے۔[3]

دوسری حدیث میں امام باقرؑ سے منقول ہے:

ان اللہ عزوجل یحب افشاء السلام

افشاءِ سلام سلام عام کرنے والے کو خدا دوست رکھتا ہے۔[4]

افشاءِ سلام سے مراد مختلف افراد کو سلام کرنا ہے۔ احادیث میں سلام کے بارے میں بہت سے آداب بیان ہوئے ہیں ان میں سے یہ بھی ہے کہ ــــــــــــــــــــــــ سلام صرف ان افراد سے مخصوص نہیں ہے جن سے انسان خصوصی شناسائی رکھتا ہو جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ سے سوال ہوا:

"کون سا عمل بہتر ہے؟" تو آپؐ نے فرمایا:

"تطعم الطعام وتقرء السلام علی من عرفت ومن لم تعرف،

کھانا کھلاؤ اور سلام کرو اس شخص کو جسے تم جانتے ہو یا نہیں جانتے۔[5]

---

[1] وادوان لیلی الاخیلیۃ سلمت علی ودونی جندل وصفائح مسلمت تسلیم البشاشۃ او زقا الیہا صدی من جانب القبر صائح
یہ شعر زمانہ جاہلیت کے نوحہ خوانی شاعر کے ہیں۔ [2] اصول کافی جلد ۲ باب تسلیم [3]، [4] اصول کافی۔ جلد ۲۔ باب تسلیم

[5] تفسیر فی ظلال ذیل آیہ مذکورہ۔

احادیث میں بھی آیا ہے کہ سوار پیادہ کو اور بیش قیمت سواری والا کم قیمت سواری والوں کو سلام کریں گویا یہ حکم ایسے تکبر کا مقابلہ کرنے کے لیے ہے جو دولت، ثروت اور مخصوص مادی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ بات آج کل دیکھنے میں آتی ہے کہ لوگ آداب وسلام کو نچلے طبقہ کی ذمہ داری سمجھتے ہیں اور انھوں نے اسے استعمار، استبداد اور بت پرستی کی شکل دے رکھی ہے اگر ہم پیغمبر اکرمؐ کی سیرت کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ آپؐ تمام لوگوں کو یہاں تک کہ بچوں کو بھی سلام کرتے تھے۔ البتہ یہ بحث اس حکم سے اختلاف نہیں رکھتی جو بعض روایات میں آیا ہے کہ بچے جو عمر کے لحاظ سے چھوٹے ہوتے ہیں وہ اپنے سے بڑوں کو سلام کریں کیونکہ ادب اور احترام کا تقاضا یہی ہے اس بات کا طبقاتی تفاوت اور مادی حیثیت کے اختلاف سے کوئی تعلق نہیں۔

چند روایات میں حکم دیا گیا ہے کہ سود خور، فاسق، بجرو اور مغرف وغیرہ پر سلام نہ کرو۔ یہ بھی فساد اور برائی کے خلاف ایک طرح کا اقدام ہے ہاں البتہ ایسے لوگوں سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے یا رابطے کے لیے تاکہ انھیں خدائی نافرمانی سے بچنے کی دعوت دی جا سکے سلام کرنے کی اجازت ہے "تحیت باحسن" سے مراد یہ ہے کہ سلام کی دوسری جملات مثلاً ورحمۃ اللہ یا ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کو ساتھ ملانا۔

تفسیر در المنثور میں ہے:

> ایک شخص نے پیغمبر اکرمؐ سے عرض کیا، السلام علیک۔ تو آپؐ نے فرمایا" وعلیک السلام ورحمۃ اللہ" دوسرے نے عرض کیا" السلام علیک ورحمۃ اللہ" تو آپؐ نے فرمایا" وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"، تیسرے شخص نے کہا" السلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"، تو پیغمبرؐ نے فرمایا" وعلیک" جب اس نے سوال کیا کہ آپؐ نے مجھے مختصر جواب کیوں دیا ہے تو فرمایا" قرآن کہتا ہے تحیہ کا جواب زیادہ بہتر طریقہ سے دو لیکن تو نے کوئی چیز باقی نہیں رکھی۔"[1]

حقیقت میں پیغمبرؐ نے پہلے اور دوسرے شخص کے جواب میں احسن طریقہ پر تحیہ کیا ہے لیکن تیسرے شخص کے بارے میں مساوی طریقہ اختیار کیا ہے کیونکہ " وعلیک" کا مفہوم ہے کہ جو کچھ تو نے کہا وہ تیرے لیے بھی ہو۔

۸۷۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ۟

ترجمہ

۸۷۔ وہ خدا جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، تم سب کو یقینی طور پر قیامت کے دن کہ جس میں کوئی شک نہیں

---

[1] در المنثور جلد ۲ صفحہ ۸

جمع کرے گا اور کون ہے جو خدا سے زیادہ سچا ہو۔

تفسیر

درج بالا آیت گذشتہ آیات کی تکمیل اور بعد میں آنے والی آیات کا مقدمہ ہے کیونکہ گذشتہ آیت میں "تحیت" کے حکم کے بعد فرمایا ہے کہ خدا تمھارے اعمال کا حساب رکھتا ہے اس آیت میں مسئلہ قیامت اور روز قیامت ہونے والی عام عدالت کا ذکر ہے اور اسے مسئلہ توحید اور خدا کی یکتائی کے مسئلہ کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے جو کہ ایمان کا ایک اور رکن ہے۔ فرماتا ہے، کوئی معبود اس کے علاوہ نہیں ہے اور لازمی طور پر تمھیں قیامت کے دن اکٹھا مبعوث کرے گا وہی قیامت کا دن کہ جس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے (اللہ لا الٰہ الا ھو لیجمعنکم الی یوم القیٰمۃ لا ریب فیہ) "یجمعنکم" کا لفظ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ تمام افراد کے لیے روز محشر ایک ہی ہوگا۔ جیسا کہ سورۂ مریم کے آخر میں آیۃ ۹۳ سے لے کر ۹۵ تک اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ خدا کے تمام بندے چاہے وہ اہل زمین ہوں یا دوسرے کرات کے رہنے والے، سب ایک ہی دن مبعوث ہوں گے۔

لا ریب فیہ (اس میں کوئی شک و شبہ نہیں) قیامت کے آنے کے بارے میں اس آیت میں اور قرآن کی دوسری آیات میں یہ تعبیر ان قطعی اور مسلم دلائل کی طرف اشارہ ہے جو اس دن قیامت کی خبر دیتے ہیں مثلاً قانون تکامل، تحقیق کا حکمت و فلسفہ اور قانون عدالت پروردگار معاد کی بحث میں ان کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے آخر میں اس مطلب کی تاکید کے لیے فرماتا ہے کون ہے جو خدا سے زیادہ سچا ہے (و من اصدق من اللہ حدیثا)۔

لہٰذا وہ جس قسم کا وعدہ روز قیامت یا اس کے علاوہ کسی چیز کے بارے میں کرتا ہے اس پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ جھوٹ کا سرچشمہ جہالت ہے یا کمزوری اور ضرورت مندی ہے لیکن وہ خدا جو سب سے زیادہ جاننے والا ہے اور سب سے بے نیاز ہے، وہ سب سے زیادہ سچا ہے اور اصولی طور پر جھوٹ اس کے لیے کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔

۸۸۔ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ○

ترجمہ

۸۸۔ منافقین کے بارے میں تم دو گروہ کیوں ہو گئے ہو، کچھ ان سے جنگ کرنے کو ممنوع اور کچھ جائز سمجھتے ہو حالانکہ خدا نے ان کے اعمال کی بنا پر ان کے افکار پلٹ کر رکھ دیئے ہیں کیا تم چاہتے ہو ایسے اشخاص کو جنھیں خدا نے

(ان کے بُرے اعمال کی وجہ سے) گمراہ رکھا ہے ہدایت کرو، حالانکہ جسے خدا گمراہ رکھے اس کے لیے تمھیں کوئی راستہ نہیں ملے گا۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ مکہ کے کچھ لوگ بظاہر مسلمان تھے لیکن حقیقت میں منافقین کی صف میں سے تھے اسی لیے وہ مدینہ کی طرف ہجرت کرنا نہیں چاہتے تھے اور عملی طور پر بُت پرستوں کے خیر خواہ اور مددگار تھے، لیکن آخرکار مکہ کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے (تاکہ وہ مدینہ کے قریب آجائیں اور شاید اپنی خصوصی حیثیت کی وجہ سے جاسوسی کے مقصد کے لیے انھوں نے ہجرت کی ہو) اور وہ خوش تھے کہ انھیں مسلمان اپنے میں سے سمجھتے ہیں لہٰذا ان کا خیال تھا کہ مدینہ میں داخل ہونا ان کے لیے قدرتی طور پر کوئی مشکل پیدا نہیں کرے گا۔ مسلمانوں کو اس بات کا پتہ چل گیا لیکن بہت جلد منافقین سے سلوک کے بارے میں مسلمانوں میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا ایک گروہ کا نظریہ تھا کہ ان کو دھتکار دیا جائے کیونکہ حقیقت میں یہ دشمنانِ اسلام کے مددگار ہیں لیکن کچھ مسلمان ظاہر بین اور سادہ لوح تھے وہ اس کے مخالف تھے اور کہتے تھے کہ ہم کس طرح ایسے لوگوں سے محاذ آرائی کریں جو توحید اور رسالت کی گواہی دیتے ہیں اور صرف ہجرت نہ کرنے کے جرم میں اُن کے خون کو مباح اور حلال قرار دیں۔ اس پر درج بالا آیت نازل ہوئی جس میں دوسرے گروہ کو اس غلط فہمی پر ملامت کی گئی اور پھر ان کی رہنمائی بھی کی گئی[1]

تفسیر

مندرجہ بالا شانِ نزول کی طرف توجہ کرنے سے اس آیت اور بعد والی آیت کا منافقین سے متعلق گذشتہ آیات سے ربط مکمل طور پر واضح ہوتا ہے آیت کی ابتدا میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے، منافقین کے بارے میں کیوں بٹ گئے ہو اور تم میں سے ہر ایک جدا فیصلہ کرتا ہے (فما لکم فی المنافقین فئتین[2])۔

یعنی یہ افراد جو ہجرت نہ کرنے اور مشرکین کے شریک کار رہنے اور مجاہدین اسلام کی صف میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے اپنے نفاق کو ظاہر کر چکے ہیں ان کے اعمال اور انجام کے بارے میں کسی کو شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بات مسلّم ہے کہ یہ لوگ اوّل درجے کے منافقین ہیں تو پھر بعض لوگ کیوں ان کے اظہار توحید اور خدا پر ایمان لانے کے دعویٰ سے دھوکا کھاتے ہیں اور ان کی شفاعت و سفارش کرتے ہیں جبکہ گذشتہ آیات میں بتایا جا چکا ہے کہ من یشفع شفاعۃ سیئۃ یکن لہ کفل منھا اور

---

[1] اس آیت اور بعد والی آیات کی اور بھی شانِ نزول بیان کی گئی ہے انھی میں سے بعض میں اس کو جنگ احد کے واقعہ سے مربوط سمجھا گیا ہے حالانکہ بعد والی آیات جو ہجرت کی طرف اشارہ کرتی ہیں اس سے مربوط نہیں بلکہ اسی شانِ نزول کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

[2] اوپر والے جملے میں حقیقتاً اور لفظاً نفی ہے جو بقیہ جملہ پر توجہ کرنے سے واضح ہوتا ہے اور اصل جملہ یوں بنتا ہے فما لکم تفرقتم فی المنافقین فئتین۔

اس طرح وہ اپنے آپ کو ان کے بُرے انجام میں کیوں شریک کرتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے۔ منافقین کے اس گروہ سے ان کے بُرے اور شرمناک اعمال کی وجہ سے خدا نے اپنی حمایت اور توفیق منقطع کرلی ہے اور منصوبے مکمل طور پر ناکام کردیئے ہیں اور ان کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی شخص پاؤں پر کھڑا ہونے کی بجائے سر کے بل کھڑا ہو (واللّٰه ارکسهم بما کسبوا)[1] ضمنی طور پر "بما کسبوا" سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت، سعادت، اور نجات کے راستے سے ہٹ جانا انسان کے خود اپنے اعمال کا نتیجہ ہے اور اگر اس عمل کو خدا سے نسبت دی جائے تو وہ اس وجہ سے ہے کہ خدا حکیم ہے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق سزا دیتا ہے اور لیاقت و اہلیت کی مناسبت سے اسے جزا بھی دے گا۔ آیت کے آخر میں سادہ لوح افراد کو، جو منافقین کے اس گروہ کی حمایت کرتے ہیں خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے، کیا تم چاہتے ہو کہ ان لوگوں کو جنھیں خدا نے ان کے بُرے اعمال کی وجہ سے ہدایت سے محروم کردیا ہے ہدایت کرو حالانکہ یہ لوگ ہدایت کے قابل نہیں ہیں (اتریدون ان تهدوا من اضل اللّٰه ومن يضلل اللّٰه فلن تجد له سبيلا) کیونکہ یہ تو خدا کی اٹل سنت ہے کہ کسی شخص کے اعمال کے اثرات اس سے جدا نہیں ہوں گے تو تم یہ توقع کیوں رکھتے ہو کہ وہ افراد جن کی نیت صحیح نہیں اور جن کے دلوں میں نفاق بھرا ہوا ہے اور جو عملاً خدا کے دشمنوں کی حمایت کرتے ہیں انھیں ہدایت نصیب ہوگی یہ تو بے جا اور غیر منطقی توقع ہے[2]

۸۹۔ وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝

ترجمہ

۸۹۔ یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح کافر ہو جاؤ اور پھر وہ اور تم ایک دوسرے کے برابر ہو جاؤ۔ پس ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ مگر یہ کہ (وہ توبہ کریں اور) خدا کی راہ میں ہجرت کریں۔ لیکن وہ لوگ جو کام سے منہ موڑ لیں (اور تمھارے خلاف اقدامات جاری رکھیں) انھیں جہاں پاؤ قید کرلو اور (اگر ضروری ہو تو) انھیں قتل کردو اور ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ۔

تفسیر

گزشتہ آیت ان منافقین کے بارے میں تھی جن کی حمایت میں کچھ سادہ لوح مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور انکی

---

[1] ارکسهم رکس (بروزن مکث) کے مادہ سے کسی چیز کو اوندھا کرنے کے معنی میں ہے اور بعض پھیرنے کے بھی معنی لیتے ہیں۔

[2] اس تفسیر کی پہلی جلد میں ہدایت وضلالت کے بارے میں مفصل بحث آچکی ہے۔

سفارش کرتے تھے جبکہ قرآن نے انھیں اسلام سے بیگانہ قرار دے دیا اور اب اس آیت میں فرماتا ہے: ان کے اندر اس قدر جہالت اور تاریکی ہے کہ نہ صرف وہ خود کافر ہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح کافر ہو جاؤ تاکہ ایک دوسرے کے مساوی ہو جاؤ (ودوا لو تکفرون کما کفروا فتکونون سواء) اس وجہ سے وہ تو عام کفار سے بھی بدتر ہیں۔ کیونکہ عام کافر دوسروں کے عقائد باطل کرنے کے درپے نہیں رہتے ہیں کیونکہ وہ ایسے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ ان میں سے کسی کو دوست نہ بنائیں (فلا تتخذوا منهم اولیاء) مگر یہ کہ وہ اپنے اعمال سے باز آجائیں اور نفاق اور تخریب کاری سے دستبردار ہو جائیں اور اس کا ثبوت اور نشانی یہ ہے کہ وہ کفر اور نفاق کے مرکز سے اسلام کے مرکز (مکہ سے مدینہ) کی طرف ہجرت کریں (حتیٰ یهاجروا فی سبیل الله)۔

لیکن اگر وہ ہجرت کے لیے تیار نہ ہوں تو پھر سمجھ لو کہ وہ کفر و نفاق سے دستبردار نہیں ہوئے اور ان کا مسلمان کہلانا صرف جاسوسی اور تخریب کاری کی غرض سے ہے اور اس صورت میں وہ تمہیں جہاں کہیں بھی مل جائیں انھیں قید کر لو یا اگر ضروری ہو تو انھیں قتل کر دو (فان تولوا فخذوهم واقتلوهم حیث وجدتموهم)۔

آیت کے آخر میں دوبارہ تاکید کی گئی ہے کہ کبھی ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ (ولا تتخذوا منهم ولیا ولا نصیرا)۔

درج بالا آیت میں منافقین کے اس گروہ کے بارے میں جو سخت احکام آئے ہیں اس وجہ سے ہیں کہ ایک زندہ معاشرے کی تشکیل کے لیے جو اصلاح کے راستے پر چلتا ہے ایسے دوست نما خطرناک دشمن سے چھٹکارا حاصل کرنے کا اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ اسلام غیر مسلم افراد (مثلاً یہود و نصاریٰ) سے چند شرائط کے ساتھ صلح کی اجازت دے دیتا ہے اور ان سے کوئی تعرض نہ کرنے کے لیے تیار ہے مگر منافقین کے اس گروہ کے بارے میں اس قدر شدت سے کام لیتا ہے، بظاہر وہ مسلمان ہیں پھر بھی انھیں قید کرنے بلکہ بوقت ضرورت ان کے قتل کا حکم دیتا ہے۔ اس امر کی اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایسے افراد اسلام کے پردے میں اسلام کو ایسی گزند پہنچا سکتے ہیں جیسی کوئی دشمن نہیں پہنچا سکتا۔

ایک سوال

ممکن ہے کہا جائے کہ پیغمبر اکرمؐ کا منافقین کے بارے میں یہ رویہ تھا کہ آپ کبھی ان کے قتل کا حکم نہیں دیتے تھے کہ دشمن کہیں آپ کو اپنے اصحاب کے قتل میں ملوث نہ کریں یا کچھ لوگ اس سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ذاتی دشمنوں کو منافق کہہ کر ان سے نہ الجھیں اور انھیں قتل نہ کر دیں۔

جواب

توجہ رہے کہ پیغمبر اکرمؐ کا یہ رویہ صرف مدینہ کے منافقین اور ان جیسے لوگوں کے بارے میں تھا جو بظاہر مسلمان تھے، لیکن

وہ لوگ جو مکہ کے منافقین کی طرح واضح طور پر اسلام دشمنوں سے ملے ہوئے تھے وہ اس حکم میں شامل نہیں تھے۔

۹۰۔ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ○

ترجمہ

۹۰۔ مگر وہ لوگ جنھوں نے تمھارے ہم پیمان لوگوں سے عہد و پیمان باندھا ہے یا وہ جو تمھاری طرف آتے ہیں اور تم سے جنگ کرنے یا اپنی قوم سے جنگ کرنے سے عاجز ہیں (نہ تم سے جنگ کرنا چاہتے ہیں اور نہ اپنی قوم سے لڑنے کی طاقت رکھتے ہیں) اور اگر خدا چاہے تو انھیں تم پر مسلط کر دے تاکہ وہ تم سے جنگ کریں (اب جبکہ) انھوں نے صلح کی پیشکش کی ہے تو خدا تمھیں اجازت نہیں دیتا کہ ان سے تعرض کرو۔

شانِ نزول

مختلف روایات سے جو آیت کی شان نزول کے بارے میں آئی ہیں اور مفسرین نے ہر قسم کی تفاسیر میں انھیں نقل کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قبائل عرب میں دو قبیلے "بنی حمزہ" اور "اشجع" نام کے تھے ان میں سے پہلے قبیلے نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا عہد کیا تھا اور قبیلہ اشجع نے بھی بنی حمزہ سے ایسا معاہدہ کر رکھا تھا۔ بعض مسلمان بنی حمزہ کی طاقت اور عہد شکنی سے خوفزدہ تھے لہٰذا انھوں نے پیغمبر اکرمؐ کو تجویز پیش کی کہ اس سے پہلے کہ وہ عہد توڑیں مسلمان ان پر حملہ کر دیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

"کلا فانھم ابر العرب بالوالدین و اوصلھم للرحم و اوفاھم بالعھد"

نہیں کبھی یہ کام نہ کریں کیونکہ وہ تمام قبائل عرب میں اپنے ماں باپ کے ساتھ بہتر سلوک کرنیوالے ہیں اور اپنے عزیز و اقارب پر سب سے زیادہ مہربان ہیں اور بہتر ایفائے عہد کرنے والے ہیں۔

کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کو اطلاع ملی کہ اشجع قبیلہ کے سات سو افراد مسعود بن رخیلہ کی سرکردگی میں مدینہ کے قریب پہنچ چکے ہیں پیغمبر اکرمؐ نے اپنے نمائندے ان کے پاس بھیجے کہ وہ کس مقصد کے لیے آئے ہیں انھوں نے جواب دیا کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کے لیے آئے ہیں جب پیغمبر اکرمؐ کو یہ معلوم ہوا تو حکم دیا کہ بہت سی مقدار میں کھجوریں تحفہ کے طور پر ان کے پاس لے جاؤ اس کے بعد حضورؐ نے ان سے ملاقات کی تو انھوں نے کہا کہ ایک طرف ہم آپ کے دشمنوں سے مقابلے کی

سکت نہیں رکھتے کیونکہ ہماری تعداد کم ہے اور دوسری طرف آپ سے مقابلے کی ہم طاقت رکھتے ہیں نہ آپ سے ہم لڑنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ہماری سکونت آپ کے قریب نہیں ہے لہٰذا ہم اس لیے آئے ہیں کہ آپ سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کریں۔ اس موقع پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں جن میں اس ضمن میں مسلمانوں کو ضروری احکام جاری کیے گئے۔ چند ایک روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا ایک حصہ قبیلہ "بنی مدلج" کے بارے میں نازل ہوا ہے وہ لوگ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے کہا کہ ہم نہ تو آپ کے ہم نوا ہیں اور نہ ہی آپ کے خلاف کوئی قدم اٹھائیں گے۔

پیغمبر اکرمؐ نے ان سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر لیا۔

تفسیر

صلح کی پیش کش کا استقبال

ان منافقین کے لیے جو دشمنان اسلام کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اس سخت حکم کے بعد زیر نظر آیت میں حکم دیتا ہے کہ اس قانون سے دو گروہ مستثنیٰ ہیں:

۱۔ جو تمھارے کسی ہم پیمان کے ساتھ مربوط ہیں اور انھوں نے اس سے معاہدہ کر رکھا ہے (الا الذین یصلون الیٰ قوم بینکم و بینھم میثاق)۔

۲۔ وہ جو اپنی مخصوص حالت کی وجہ سے ایسے حالات سے دوچار ہیں کہ نہ تو وہ تمھارے ساتھ مقابلے کی طاقت رکھتے ہیں نہ تمھارا ساتھ دے سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے قبیلے سے ٹکرانے کی حوصلہ رکھتے ہیں (او جاءوکم حصرت صدورھم ان یقاتلوکم او یقاتلوا قومھم)۔

ظاہر ہے کہ پہلے گروہ کو معاہدے کے احترام کی وجہ سے اس قانون سے مستثنیٰ ہونا چاہیے اور دوسرا گروہ بھی اگرچہ متعہد نہیں ہے لیکن چاہیے کہ حق کی تلاش کے بعد اس سے اپنا رشتہ جوڑ لے۔ لیکن چونکہ وہ غیر جانبدار رہنے کا اعلان کرتا ہے لہٰذا اس پر اعتراض کرنا عدل اور مردانگی کے اصولوں کے خلاف ہے اس کے بعد اس بنا پر کہ مسلمان اپنی شاندار کامیابیوں پر مغرور نہ ہو جائیں اور انھیں اپنی لشکری قوت اور مہارت کا مرہونِ منت سمجھیں اس غیر جانبدار گروہ کے مقابلہ میں ان کے انسانی جذبات کو تحریک دیتے ہوئے فرماتا ہے: اگر خدا چاہے تو ان (کمزور) لوگوں کو تم پر مسلط کر سکتا ہے تا کہ وہ تم سے برسرِ پیکار ہوں (ولو شاء اللّٰہ لسلطھم علیکم فلقاتلوکم) لہٰذا ہمیشہ کامیابیوں پر اپنے خدا کو نہ بھولو اور کسی جہت بھی اپنی طاقت پر مغرور نہ کرو۔ نیز کمزور لوگوں کو معاف کرنے کو اپنے نقصان میں نہ سمجھو۔ آیت کے آخر میں دوبارہ آخری گروہ کے لیے تاکید زیادہ واضح انداز میں کرتے ہوئے کہتا ہے: اگر وہ تم سے جنگ نہ کریں اور صلح و مصالحت کی پیش کش کریں تو خدا تمھیں ان سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ تمھارا فرض ہے کہ جو ہاتھ صلح کے لیے تمھاری طرف بڑھے اسے مضبوطی سے تھام لو (فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل اللّٰہ لکم علیھم سبیلا)

قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ قرآن اس آیت میں اور چند دوسری آیات میں صلح کی پیش کش کو "القاء سلام" "صلح پھینکنا" قرار دیتا ہے۔ ممکن ہے یہ اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ طرفین نزاع، صلح سے پہلے عموماً ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے جاتے ہیں یہاں تک صلح کی پیش کش کو بھی بڑے محتاط ہو کر دیکھتے ہیں گویا ایک دوسرے سے فاصلہ پر رہتے ہوئے اس پیش کش کو ایک دوسرے کی طرف پھینکتے ہیں۔

۹۱۔ سَتَجِدُونَ آخَرِينَ يُرِيدُونَ أَنْ يَأْمَنُوكُمْ وَيَأْمَنُوا قَوْمَهُمْ كُلَّمَا رُدُّوا إِلَى الْفِتْنَةِ أُرْكِسُوا فِيهَا فَإِنْ لَمْ يَعْتَزِلُوكُمْ وَيُلْقُوا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوا أَيْدِيَهُمْ فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأُولَٰئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُبِينًا ۝

ترجمہ

۹۱۔ بہت جلد تم کچھ ایسے لوگوں سے ملو گے جو چاہتے ہیں کہ تمھاری طرف سے بھی امان میں ہوں اور اپنی قوم کی طرف سے بھی مامون ہوں (یہ مشرک ہیں لہٰذا تمھارے سامنے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں) لیکن جس وقت وہ فتنہ (اور بت پرستی) کی طرف پلٹ جاتے ہیں تو وہ سر کے بل اس میں ڈوب جاتے ہیں اگر وہ تم سے الجھنے سے کنارہ کش نہ ہوئے اور انھوں نے صلح کی پیش کش نہ کی اور تم سے دستبردار نہ ہوئے تو انھیں جہاں کہیں پاؤ (قید کر لو یا) انھیں قتل کر دو اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جن پر ہم نے تمھارا واضح تسلط قرار دیا ہے۔

شانِ نزول

درج بالا آیت کے لیے مختلف شانِ نزول منقول ہوئے ہیں زیادہ مشہور ان میں سے یہ ہے کہ اہلِ مکہ میں سے کچھ لوگ پیغمبر اکرم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دھوکے بازی اور چالبازی کے طور پر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا۔ لیکن جب بھی وہ قریش اور ان کے بتوں کے سامنے جاتے تو ان کے بتوں کی عبادت اور پرستش شروع کر دیتے۔ اس طرح وہ چاہتے تھے کہ وہ اسلام اور قریش دونوں سے محفوظ رہیں، دونوں طرف سے فائدہ اٹھائیں اور کسی سے انھیں نقصان نہ پہنچے۔ اصطلاح کے مطابق دونوں گروہوں سے دو طرفہ تعلقات استوار رکھیں۔ اس پر زیرِ نظر آیت نازل ہوئی جس میں اس گروہ کے خلاف سخت کارروائی کا حکم دیا گیا۔

تفسیر

طرفین سے ساز باز رکھنے والوں کی سزا

یہاں ایک اور گروہ سے تعارف ہوتا ہے جو سراسر اس گروہ کے مخالف ہے جس کے بارے میں گذشتہ آیات میں صلح کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان آزادی سے کام کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے دھوکے اور خیانت کی راہ اختیار کر رکھی ہے وہ دونوں گروہوں سے ہم قدم اور ہم فکر ہونے کا اظہار کرتے ہیں (ستجدون اخرین یریدون ان یأمنوکم و یأمنوا قومھم) اسی وجہ سے جب فتنہ سازی اور بت پرستی کا موقع ان کے ہاتھ آتا ہے تو ان کے سارے پروگرام الٹے ہو جاتے ہیں اور سر کے بل بت پرستی میں غرق ہو جاتے ہیں (کلما ردوا الی الفتنۃ ارکسوا فیھا)۔ یہ پہلے گروہ کے بالکل برعکس ہیں کیونکہ ان کی کوشش یہ تھی کہ یہ مسلمانوں سے برسرپیکار نہ ہوں۔ جب کہ ان کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں سے الجھتے رہیں وہ صلح کی پیش کش کرتے تھے جبکہ یہ مسلمانوں سے برسرپیکار تھے وہ مسلمان کو تکلیف نہیں پہنچاتے تھے لیکن یہ ظلم و جور سے اجتناب نہیں کرتے تھے۔ یہ تینوں فرق جن کی طرف (فان لم یعتزلوکم و یلقوا الیکم السلم و یکفوا ایدیھم) میں اشارہ ہوا ہے اس امر کا سبب ہیں کہ ان کے بارے میں حکم پچھلے گروہ سے مکمل طور پر مختلف حکم ہو۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ انہیں جہاں کہیں پائیں اسیر کرلیں اور مقابلہ کرنے کی صورت میں قتل کر دیں (فخذوھم واقتلوھم حیث ثقفتموھم) لہٰذا جہاں ان کے لیے کافی اتمام حجت کیا گیا ہے وہاں آیت کے آخر میں یہ بھی فرمایا گیا ہے، وہ ایسے لوگ ہیں کہ ہم نے واضح طور پر ان پر تمہارا تسلط قائم کیا ہے۔ (واولئکم جعلنا لکم علیھم سلطانا مبینا)۔

زیر بحث آیت میں جس تسلط کی طرف اشارہ ہے ہو سکتا ہے یہ تسلط منطقی لحاظ سے ہو۔ کیونکہ مسلمانوں کی منطق مشرکین کی منطق پر غالب تھی یا یہ بھی ہو سکتا ہے ظاہری اور خارجی لحاظ سے ہو کیونکہ جس وقت یہ آیات نازل ہوئیں اس وقت مسلمان بہت حد تک طاقت ور ہو چکے تھے۔

ضمناً بالا آیت میں "ثقفتموھم" کی تعبیر ممکن ہے ایک دقیق نکتے کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ یہ لفظ ثقافت کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے کسی چیز کا مشکل سے اور مہارت سے ہاتھ آنا اور "وجدتموھم" وجدان کے مادہ سے صرف ہاتھ آنے کے معنی میں ہے ان دونوں کا مفہوم مختلف ہے گویا منافقین کا یہ گروہ (جو دو غلا ہے) دونوں سے تعلقات رکھتا ہے یہ منافقین کا خطرناک ترین گروہ ہے ممکن نہیں کہ انہیں آسانی سے پہچان لیا جائے اور وہ کسی جال میں پھنس جائے لہٰذا فرماتا ہے اگر مہارت اور مشکل سے ان پر قبضہ کر لو تو انہیں خدا کا حکم سناؤ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ انہیں گرفتار کرنا کٹھن اور مشکل کام ہے۔

۹۲۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً

فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○

ترجمہ

۹۲۔ کسی صاحب ایمان فرد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی صاحب ایمان کو قتل کرے مگر یہ کہ یہ کام غلطی اور اشتباہ میں اس سے سرزد ہو جائے اور پھر جس نے کسی مومن کو غلطی سے قتل کیا ہے اسے چاہیے کہ وہ ایک غلام آزاد کرے اور خون بہا مقتول کے گھر والوں کو دے۔ مگر یہ کہ وہ خون بہا بخش دیں اور اگر مقتول ایسے گروہ سے ہے جو تمھارے دشمن ہیں (اور کافر ہیں) لیکن قاتل خود مومن تھا تو چاہیے (کہ صرف) ایک غلام آزاد کرے (اور خونبہا ادا کرنا ضروری نہیں ہے) اور اگر ایسے گروہ میں سے ہے جن کے ساتھ تمھارا معاہدہ ہو چکا ہے تو چاہیے کہ اس کا خون بہا اس کے اہل خانہ کو دے اور ایک غلام (بھی) آزاد کرے اور جو شخص (غلام کے آزاد کرنے پر) دسترس نہیں رکھتا، وہ دو ماہ مسلسل روزے رکھے یہ (ایک قسم کی تخفیف اور) اللہ کے حضور توبہ ہے اور خدا دانا و حکیم ہے۔

شانِ نزول

مکہ کے ایک بت پرست حارث بن یزید نے "ابوجہل" کی مدد سے ایک مسلمان "عیاش بن ابی ربیعہ" کو اسلام کی طرف مائل ہونے کی پاداش میں ایک عرصہ تک شکنجۂ ظلم میں جکڑے رکھا۔ مسلمانوں کی مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد "عیاش" نے بھی مدینہ کی طرف ہجرت کی اور مسلمانوں میں شامل ہو گیا۔ اتفاقاً ایک دن مدینہ کے قریب ایک محلہ میں اس کا سامنا اسے آزار دینے والے حارث بن یزید سے ہو گیا عیاش نے موقع غنیمت جان کر حارث کو قتل کر دیا اس کا خیال تھا کہ اس نے ایک دشمن کو قتل کیا ہے حالانکہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ حارث توبہ کر کے مسلمان ہو چکا تھا اور پیغمبر اکرم کی خدمت میں حاضر ہونے جا رہا تھا یہ واقعہ آنحضرت سے عرض کیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی اور اس قتل کے بارے میں جو خطا سے اور اشتباہ میں ہو گیا

حکم بیان کیا گیا۔

تفسیر

قتلِ اشتباہ کے احکام

چونکہ گذشتہ آیات میں مسلمانوں کو عملی طور پر اپنے اندرونی خطرناک دشمنوں (منافقین) کی سرکوبی کی اجازت دی گئی ہے تو اب اس بنا پر کہ کہیں کچھ لوگ اس قانون سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں اور اپنے ذاتی دشمنوں کو منافقین کہہ کر قتل نہ کر دیں یا لاپرواہی سے کسی بے گناہ کا خون نہ بہا دیں۔ اس آیت میں اور بعد والی آیت میں قتل اشتباہ اور قتل عمد کے احکام بیان ہوئے تاکہ قتل جو اسلام کے نزدیک نہایت سنگین معاملہ ہے اس کے بارے میں تمام لازمی پہلوؤں کو ملحوظ نظر رکھا جائے۔

اس آیت کی ابتدا میں کہ جس میں قتل اشتباہ کا ذکر ہے فرماتا ہے: کسی مومن کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی صاحب ایمان شخص کو قتل کرے مگر یہ کہ اشتباہ میں ایسا ہو جائے (وما کان لمومن ان یقتل مؤمنا الا خطأ) حقیقت میں یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اصولی طور پر کوئی مومن یہ نہیں چاہتا کہ اپنے ہاتھ کسی بے گناہ کے خون سے رنگین کرے، کیونکہ حریم ایمان میں تمام افراد ایک جسم کے اعضاء کی طرح ہیں کیا یہ ہو سکتا ہے کہ بدن انسانی کا ایک عضو دوسرے عضو کو سوائے اشتباہ کے کاٹ دے یا اسے کوئی آزار دی جائے۔ اس سبب سے جو اس قسم کے کام میں مشغول ہیں ان کا ایمان صحیح نہیں ہے اور حقیقت میں وہ ایمان سے بے بہرہ ہیں۔ (الا خطأ) (مگر غلطی سے) کے الفاظ اس معنی میں نہیں کہ انھیں اجازت ہے کہ شک کی بنا پر قتل جیسا عمل کریں کیونکہ شک و شبہ میں انسان دور تک نہیں دیکھ سکتا اور کوئی شخص شک کی حالت میں اپنے اشتباہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ مقصد یہ ہے کہ مومنین شک و شبہ کی حالت کے علاوہ ایسا گناہ کبیرہ نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد قتل اشتباہ کا جرمانہ اور کفارہ تین مراحل میں بیان کیا گیا ہے:۔

پہلی صورت یہ ہے کہ بے گناہ شخص جو شک اور شبہ میں قتل ہو گیا ہو، اگر وہ مسلمان خاندان سے تعلق رکھتا ہو تو اس صورت میں قاتل کے لیے دو حکم ہیں۔ ایک یہ کہ غلام کو آزاد کرے اور دوسرا یہ کہ مقتول کا خون بہا مقتول کے وارثوں کو ادا کرے (ومن قتل مؤمنا خطأ فتحریر رقبة مؤمنة و دیة مسلمة الی اھلہ)۔

مگر یہ کہ مقتول کے وارث دیت کو اپنی رضا اور رغبت سے چھوڑ دیں (الا ان یصدقوا)۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مقتول ایسے خاندان سے وابستہ ہو جو مسلمانوں سے دشمنی رکھتا ہو، تو اس صورت میں قتل اشتباہ کا کفارہ صرف غلام آزاد کرنا ہے اور ایسے گروہ کو دیت دینا ضروری نہیں کہ جو مالی طور پر مسلمانوں کے خلاف مضبوط ہو جائے۔ اس کے علاوہ اسلام ایسے شخص کو اپنے خاندان سے ربط رکھنے سے منع کرتا ہے جس کے خاندان میں سب کے سب اسلام کے دشمن ہوں اسی بنا پر یہ نقصان کی تلافی کا مقام نہیں ہے (فان کان من قوم عدو لکم وھو مؤمن فتحریر رقبة مؤمنة)۔

تیسری صورت یہ ہے کہ مقتول کا خاندان ایسے کفار میں سے ہو جنھوں نے مسلمانوں سے معاہدہ کر رکھا ہو۔ اس صورت میں معاہدہ کے احترام میں ایک غلام آزاد کرنے کے علاوہ مسلمان اس کا خون بہا اس کے پس ماندگان کو دیں (وان کان من قوم بینکم و بینھم میثاق فدیۃ مسلمۃ الی اھلہ و تحریر رقبۃ مؤمنۃ)۔

اس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ کیا مقتول اس صورت میں پہلی دونوں صورتوں کی طرح مرد مومن ہوگا یا یہ حکم کافر اور ذمی کے لیے بھی ہے لیکن بظاہر آیات اور روایات جو اس آیت کی تفسیر میں آئی ہیں ان کے مطابق اس سے مراد بھی "مقتول مومن" ہی ہے اور کیا اس قسم کے مسلمان مقتول کی دیت کافر وارث کو دی جا سکتی ہے جبکہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا۔ آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ دیت اس کے ورثہ کو دی جائے گی چاہے وہ کافر کیوں نہ ہوں یہ مسلمانوں کے ساتھ ان کے معاہدے کی بنیاد پر ہے۔ لیکن چونکہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا لہذا بعض مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ اوپر والے جملے سے مراد یہ ہے کہ اس کی دیت و خون بہا صرف اس کے مسلمان وارثوں کو دیا جائے نہ کہ کفار وارثوں کو۔ بعض روایات میں بھی اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن من قوم بینکم و بینھم میثاق (ایسے گروہ سے جو تمہارے ساتھ معاہدہ رکھتے ہیں) کے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ مقتول کے وارث مسلمان نہ ہوں، کیونکہ مسلمان ایک دوسرے سے معاہدہ نہیں کرتے (غور کیجیے گا)۔

آیت کے آخر میں ان لوگوں کے بارے میں جو غلام آزاد کرنے کے بارے میں دسترس نہیں رکھتے (یعنی مالی طور پر استطاعت نہیں رکھتے یا آزاد کرنے کے لیے غلام ملتا ہی نہ ہو موجودہ زمانے کی طرح۔ فرماتا ہے ایسے افراد کو چاہیے کہ وہ مسلسل دو ماہ روزے رکھے (فمن لم یجد فصیام شھرین متتابعین) آخر میں کہتا ہے: یہ غلام آزاد کرنے کی بجائے دو ماہ روزہ رکھنے کا حکم ایک قسم کی تخفیف اور خدا کے حضور توبہ ہے یا یہ کہ جو کچھ قتل اشتباہ کے کفارہ کے طور پر کہا گیا ہے اس سب کو خدا سے توبہ قرار دیا گیا ہے اور خدا ہمیشہ ہر چیز سے باخبر ہے اور اس کے تمام احکام حکمت کے مطابق ہیں (توبۃ من اللہ و کان اللہ علیما حکیما)۔

چند اہم نکات

خسارے کی تلافی کے لیے احکام

۱۔ یہاں قتل اشتباہ کی تلافی کے لیے تین موضوع بیان کیے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک، ایک طرح سے خسارے اور نقصان کی تلافی ہے جو اس عمل کی وجہ سے ہوتی ہے۔ پہلا غلام آزاد کرنا ہے اصل میں ایک اجتماعی خسارے (ایک اہل ایمان کا قتل) کی تلافی ہے دوسرا دیت کا ادا کرنا ہے جو اصل میں ایک طرح سے اقتصادی خسارے کی تلافی ہے جو کہ ایک شخص کے قتل ہونے سے ایک خاندان کو ہوتا ہے۔ جیسے پہلے بھی ہم کہہ چکے ہیں کہ دیت (خون بہا) کبھی بھی ایک انسان کے خون کی حقیقی قیمت نہیں ہو سکتی کیونکہ ایک بے گناہ انسان کا خون ہر طرح سے زیادہ قیمتی ہے بلکہ خاندان کے اقتصادی خسارے کی ایک طرح سے تلافی ہے۔ اور تیسرا دو ماہ مسلسل روزے رکھنے کا مسئلہ ہے جو کہ اخلاقی اور روحانی خسارے کی تلافی ہے، جو غلطی سے قتل کرنے والے کو کرنا

ہوتی ہے۔ البتہ خیال رکھنا چاہیے کہ مسلسل دو ماہ روزے رکھنا ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جو ایک باایمان غلام کو آزاد کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ یعنی پہلے درجے میں صرف ایک غلام آزاد کرنا کافی ہے اور دوسرے درجے میں اگر ایسا غلام آزاد نہیں کر سکتے تو روزے رکھنا ہوں گے لیکن غور کرنا چاہیے کہ غلام آزاد کرنا ایک طرح کی عبادت شمار ہوتا ہے لہٰذا اس عبادت کا اثر آزاد کرنے والے کی روح پر ضرور ہوگا۔

۲۔ مسلمانوں میں دیت سے صرف نظر

جس مقام پر مقتول کے پس ماندگان مسلمان ہوں وہاں " الا ان یصدقوا " (مگر یہ کہ وہ دیت سے صرف نظر کریں) کا ذکر آیا ہے لیکن جس مقام پر وہ مسلمان نہ ہوں وہاں یہ بات نہیں۔ اس کی وجہ بھی واضح ہے کیونکہ پہلے موقع پر اس کام کی کوئی بنیاد ہے لیکن دوسری جگہ اس قسم کی بنیاد نہیں ہے اس کے علاوہ جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کو ایسے مواقع پر غیر مسلموں کے احسان کا زیر بار نہیں ہونا چاہیے۔

۳۔ غیر مسلموں کے لیے دیت کا پہلے تذکرہ

قابل توجہ امر یہ ہے کہ پہلی صورت میں جبکہ پس ماندگان مسلمان ہوں پہلے " ایک غلام آزاد کرے " اور پھر " دیت " کا ذکر ہے۔ جبکہ تیسری صورت میں جبکہ وہ مسلمان نہیں ہیں پہلے دیت کا تذکرہ ہے شاید تعبیر کا یہ اختلاف اس طرف اشارہ کرتا ہو کہ مسلمانوں کے معاملے میں دیت کی تاخیر کا زیادہ تر منفی ردعمل نہیں ہوتا۔ جبکہ غیر مسلموں کے معاملے میں ہر چیز سے پہلے دیت ادا ہونا چاہیے تاکہ نزاع اور جھگڑے کی آگ ٹھنڈی ہو سکے اور دشمن اسے معاہدے کی خلاف ورزی پر محمول نہ کریں۔

۴۔ اسلامی پیمانوں کی طبعی بنیاد

آیت میں دیت کی مقدار نہیں بتائی گئی اور اس کی تفصیل سُنت کے مطابق مقرر ہوتی ہے۔ جس کی رُو سے پوری دیت ہزار مثقال سونا یا ایک سو اونٹ، یا دو سو گائیں، اور اگر وارث راضی ہوں تو ان جانوروں کی قیمت ہے (البتہ سونے یا بعض جانوروں کا دیت کے طور پر تعین اسلامی اصول کے مطابق ہے اور اسلام نے اپنے پیمانے اور میزان طبعی امور میں سے منتخب کیے ہیں نہ کہ بناوٹی، مصنوعی اور وقتی طریقوں سے جو کہ زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہو جاتے ہیں۔

۵۔ غلطی کی سزا؟

ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ یہ اعتراض کریں کہ " غلطی " کی سزا نہیں ہوتی، تو اسلام اس کو اتنی اہمیت کیوں دیتا ہے۔ حالانکہ اس غلطی کا مرتکب کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوا۔ اس کا جواب واضح ہے کیونکہ خون کا مسئلہ کوئی معمولی نہیں ہوتا۔ لہٰذا اسلام اس سخت حکم کے ذریعے چاہتا ہے کہ لوگ نہایت محتاط رہیں تاکہ کسی قسم کا قتل یہاں تک کہ اشتباہ اور غلطی سے بھی ان سے سرزد

نہ ہو۔ کیونکہ بہت سی غلطیاں بھی قابلِ گرفت ہیں۔ علاوہ ازیں اس لیے بھی کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ قتل اشتباہ کے دعویٰ سے اپنے آپ کو بری الذمہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ آیت کا آخری جملہ (توبۃ من اللہ) ممکن ہے اسی امر کی طرف اشارہ ہو کہ عام طور پر اشتباہات کا مرکز پوری کوشش اور غور نہ کرنا ہوتا ہے لہٰذا اہم معاملات میں (مثلاً قتل نفس) کے سلسلے میں اس طرح سے توافی ہونا چاہیے کہ خدا سے توبہ ان کے مرتکب ہونے والوں کے شامل حال ہو جائے۔

۹۳۔ وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ۝

ترجمہ

۹۳۔ اور جو شخص کسی صاحبِ ایمان کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے کہ جس میں وہ ہمیشہ کے لیے رہے گا اور خدا اس پر غضب نازل کرتا ہے اور اسے اپنی رحمت سے محروم کر دیتا ہے اور اس کے لیے اس نے عذاب عظیم مہیا کر رکھا ہے۔

شانِ نزول

مقیس بن صبابہ کنانی ایک مسلمان تھا اس نے اپنے مقتول بھائی کی لاش محلہ "بنی نجار" میں دیکھی۔ اس نے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں آکر یہ واقعہ بیان کیا رسولِ اکرمؐ نے اسے قیس بن ہلال فہری کے ساتھ بنی نجار کے سرداروں کے پاس بھیجا اور حکم دیا کہ اگر وہ ہشام کے قاتل کو پہچانتے ہیں تو اسے اس کے بھائی مقیس کے حوالے کر دیں اور اگر نہیں پہچانتے تو اس کا خون بہا اور دیت ادا کر دیں وہ چونکہ ہشام کے قاتل کو نہیں پہچانتے تھے لہٰذا انھوں نے مقتول کی دیت اسے ادا کر دی اور اس نے بھی قبول کر لی اور قیس بن ہلال کی معیت میں مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔

اثنائے راہ میں زمانہ جاہلیت کے باقی رہنے والے افکار نے مقیس کے جذبات کو ابھارا اور وہ اپنے آپ سے کہنے لگا کہ دیت قبول کرنا شکست اور ذلت کا باعث ہے لہٰذا اپنے ہم سفر کو جو قبیلہ بنی نجار میں سے تھا اپنے بھائی کے خون کے بدلے قتل کر دیا اور مکہ کی طرف بھاگ گیا۔ اور اسلام سے بھی کنارہ کش ہو گیا۔ پیغمبر اکرمؐ نے بھی اس خیانت کے بدلے اس کا خون مباح قرار دیا اور اوپر والی آیت اسی مناسبت سے نازل ہوئی جس میں قتل عمد (جان بوجھ کر قتل) کی سزا بیان ہوئی ہے۔

تفسیر

قتل عمد کی سزا

قتل اشتباہ کی سزا بیان کرنے کے بعد اس آیت میں اس شخص کی سزا بیان ہوئی ہے جو جان بوجھ کر کسی باایمان شخص کو قتل کردے۔ چونکہ انسان کشی ایک بہت بڑا جرم اور گناہ کبیرہ ہے اور اگر اسے روکا نہ جائے اور اس کا مقابلہ نہ کیا جائے تو امن و امان جو ایک صحیح معاشرے کی اہم ترین شرائط میں سے ہے بالکل ختم ہو جائے گا۔ قرآن نے مختلف آیات میں اسے اہمیت دی ہے یہاں تک کہ ایک انسان کا قتل روئے زمین کے تمام لوگوں کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے:

من قتل نفسًا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعًا

جو شخص کسی نفس کو (اگر وہ قاتل نہ ہو یا زمین پر فساد نہ پھیلائے) قتل کرے گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا ہے۔ (مائدہ - ۳۲)

اسی لیے زیر بحث آیت میں ان لوگوں کے لیے جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دیں۔ چار سزائیں اور آخرت کے شدید عذاب کا (علاوہ قصاص کے جو دنیاوی سزا ہے) ذکر ہوا ہے۔

۱ خلود یعنی ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا (ومن یقتل مومنا متعمدًا فجزاءہ جھنم خالدًا فیھا)۔

۲ خشم و غضب الٰہی (وغضب اللہ علیہ)۔

۳ رحمت خداوندی سے محرومی (ولعنہ)۔

۴ عذاب عظیم میں مبتلا کیا جانا (واعدلہ عذابا عظیمًا)۔

اس طرح قتل عمد کے لیے اس قدر سخت ترین سزا کا ذکر ہوا ہے جس قدر سخت سزا قرآن میں کسی اور چیز کے متعلق بیان نہیں ہوئی اس کے علاوہ قتل عمد کی دنیاوی سزا وہی قصاص ہے جس کی تفصیل جلد اول میں سورۂ بقرہ آیت ۱۷۹ کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے۔

کیا انسانی قتل ابدی سزا کا موجب ہے

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ "خلود" یعنی ہمیشہ کے لیے سزا تو ان لوگوں کو ملے گی جو ایمان لائے بغیر دنیا سے رخصت ہو جائیں جبکہ قتل عمد کرنے والوں کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایمان رکھتے ہوں اور یہاں تک امکان ہے کہ وہ پشیمان ہو کر اس گناہ عظیم سے (جو ان سے سرزد ہو چکا ہے) حقیقی توبہ کرلیں اور گذشتہ گناہ کی جس قدر ممکن ہو تلافی کریں۔

۱۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ آیت میں مومن کے قتل سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کو ایمان لانے کی وجہ سے قتل کرے یا اس کے قتل کو جائز اور مباح قرار دے۔ جان لینا چاہیے کہ اس طرح کا قتل، قاتل کے کفر کا ثبوت ہے اور اس کا لازمہ ابدی اور

ہمیشہ کا عذاب ہے۔

اسی مفہوم کی ایک حدیث بھی حضرت امام صادقؑ سے منقول ہے۔[1]

۲- یہ احتمال بھی ہے کہ صاحب ایمان اور بے گناہ افراد کو قتل کرنے کی وجہ سے انسان بے ایمان ہو کر دنیا سے رخصت ہو اور اسے توبہ کی بھی توفیق نصیب نہ ہو اور اسی وجہ سے وہ ابدی اور ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا ہو جائے۔

۳- یہ بھی ممکن ہے کہ خلود سے مراد اس آیت میں بہت طویل عذاب ہو نہ کہ ہمیشہ کا عذاب۔

یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ اصولی طور پر کیا قتل عمد قابلِ توبہ ہے؟ بعض مفسرین اس سوال کا جواب نفی میں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قتل عمد مندرجہ بالا آیت کے مطابق بنیادی طور پر قابلِ توبہ نہیں ہے اور چند ایک روایات میں بھی جو اس آیت کے ذیل میں آئی ہیں اس معنی کی طرف اشارہ موجود ہے کہ "لاتوبۃ لہ" (اس کی کوئی توبہ نہیں) لیکن تعلیماتِ اسلام کی روح اور عظیم ادیانِ حق کی روایات اور توبہ کے فلسفہ (جو تربیت کی بنیاد اور آئندہ کی زندگی میں گناہ سے محفوظ رہنا ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گناہ ایسا نہیں جو قابلِ توبہ نہ ہو۔ اگرچہ کچھ گناہوں سے توبہ کی بہت سخت اور سنگین شرائط ہیں۔

قرآن مجید کہتا ہے:

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذٰلک لمن یشاء (نساء: ۴۸)

خدا صرف شرک کے گناہ کو نہیں بخشتا لیکن اس کے علاوہ جس کے لیے چاہتا اور مصلحت سمجھتا ہے، اسے بخش دیتا ہے۔

یہاں تک کہ اس آیت کے ذیل میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ آیت شفاعت اور گناہوں سے بخشش کے متعلق ہے ورنہ تو شرک کا گناہ بھی توبہ کرنے اور توحید و اسلام کی طرف پلٹ آنے سے قابلِ بخشش ہے جیسا کہ صدرِ اسلام کے اکثر مسلمان ابتدا میں مشرک تھے اور پھر انھوں نے توبہ کی اور خدا نے ان کے گناہ کو بخش دیا۔ اس وجہ سے صرف شرک ایسا گناہ ہے کہ جو توبہ کیے بغیر بخشا نہیں جا سکتا۔ لیکن توبہ کرنے سے تمام گناہ یہاں تک کہ شرک بھی قابلِ بخشش ہے جیسا کہ سورہ زمر کی آیہ ۵۳ اور ۵۴ میں ہے:

ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا انہ ھو الغفور الرحیم و انیبوا الی ربکم و اسلموا لہ

خدا تمام گناہوں کو بخش دیتا ہے کیونکہ وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ خدا کی طرف پلٹ آؤ اور توبہ کرو اور اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر لو۔

بعض مفسرین نے جو یہ کہا ہے کہ توبہ کے سایہ میں تمام گناہوں کی بخشش سے متعلق آیات، اصطلاح کے مطابق جو آیات عام تخصیص کے زمرے میں آتی ہیں یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ان آیات کی زبان جو کہ گناہ گاروں کو جہاں منادی کرتی ہیں اور مختلف تاکیدات

---

[1] کافی تفسیر عیاشی میں اس آیت کے ذیل میں امام صادق سے اس طرح منقول ہے کہ آپ نے فرمایا من قتل مومنا علی دینہ فذٰلک المتعمد الذی قال اللہ تعالیٰ عز و جل فی کتابہ واعد لہ عذابا عظیما

کے ساتھ ہیں، قابل تخصیص نہیں ہے اور اصلاح کے مطابق تخصیص سے انکار کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں اگر واقعتاً وہ شخص جس سے قتل عمد سرزد ہوا ہے مکمل طور پر ہمیشہ کے لیے خدا کی بخشش سے مایوس ہو جائے (یہاں تک کہ اپنے برے عمل کی بار بار معافی مانگے اور بہت سے نیک اعمال سے برائی کی تلافی بھی کرے) پھر بھی ہمیشہ کی لعنت اور عذاب میں مبتلا رہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنی باقی ماندہ عمر میں خدا کی عبادت زیادہ کرے، برے اعمال سے توبہ کرے اور یہاں تک کہ انسانوں کے بار بار قتل سے توبہ کرے۔ یہ امر جو تعلیمات انبیاء کی روح کے منافی ہے کیونکہ وہ تو نوع بشر کی ہر مرحلہ میں تربیت کے لیے آئے ہیں تاریخ اسلام میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے خطرناک قسم کے گناہ گاروں مثلاً حمزہ بن عبدالمطلب کے وحشی قاتل تک کو معاف کر دیا اور اس کی توبہ قبول کر لی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شرک اور ایمان کی مختلف حالتوں میں قتل اتنا مختلف سمجھا جائے کہ ایک حالت میں تو بخشا جائے اور دوسری حالت میں قابل بخشش نہ ہو۔ اصولی طور پر جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ ہم کسی گناہ کو شرک سے بڑھ کر نہیں سمجھتے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ گناہ بھی توبہ اور قبول اسلام سے بخشا جا سکتا ہے۔ اب ہم کس طرح باور کر سکتے ہیں کہ قتل کا گناہ حقیقی توبہ کے ذریعے بھی قابل بخشش نہ ہو۔

ہم نے جو اوپر کہا ہے اس سے کوئی اشتباہ نہ ہو اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ قتل عمد معمولی اور کم اہمیت کا حامل ہے یا اس سے توبہ بہت آسان ہے بلکہ اس کے برعکس اس گناہ سے حقیقی توبہ بہت ہی مشکل ہے اور یہ اس عمل کی تلافی کی محتاج ہے اور یہ تلافی کوئی آسان کام نہیں ہے۔[1]

قتل کی اقسام

فقہی کتب میں فقہاء نے قصاص و دیت کے باب میں اسلامی روایات سے استفادہ کرتے ہوئے قتل کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ "قتل عمد"۔ "قتل شبیہ عمد" اور "قتل اشتباہ"۔

قتل عمد

یہ قتل وہ ہوتا ہے جس میں پہلے سے پختہ ارادہ اور ذرائع قتل کو بروئے کار لایا جاتا ہے (مثلاً کوئی شخص کسی کو قتل کرنے کے ارادہ سے کسی ہتھیار، لکڑی، پتھر یا ہاتھ سے کام لے)۔

---

[1] روایات میں بے گناہ صاحب ایمان افراد کے قتل کی اہمیت کے بارے میں ایسی تعبیرات بیان ہوئی ہیں جو انسان کو جھنجھوڑ دیتی ہیں ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"لزوال الدنیا اھون علی اللہ من قتل امرء مسلم"۔

"دنیا کا زوال اور ختم ہو جانا خدا کے ہاں ایک مرد مسلمان کے قتل ہونے سے کمتر ہے" نیز فرماتے ہیں:

"لو ان رجلا قتل بالمشرق و آخر رضی بالمغرب لاشرك فی دمه"۔

"اگر ایک شخص مشرق میں قتل ہو جائے اور دوسرا مغرب میں ہو اور اس پر راضی ہو تو وہ اس کے خون میں شریک ہے" (المنارج ۵ ص ۳۴۱)

قتل شبیہ عمد

یہ وہ قتل ہے جس میں قتل کا ارادہ نہ ہو لیکن مقتول کے خلاف ایسے اقدام کیے جائیں کہ بے خبری میں نوبت اس کے قتل تک پہنچ جائے۔ مثلاً کسی کو قتل کے ارادہ سے مارا پیٹا نہ جائے مگر یہ مار پیٹ اتفاقاً اس کے قتل کا سبب بن جائے۔

قتل اشتباہ

یہ وہ قتل ہے جس میں قتل کا ارادہ شامل ہو نہ مقتول کے خلاف کوئی اقدام کرنے کا ارادہ ہو بلکہ یہ ایسا قتل ہے جیسے ارادہ کسی جانور کو شکار کرنے کا ہو مگر غلطی سے تیر کسی انسان کو جا لگے اور وہ قتل ہو جائے۔

ان میں سے ہر قسم کے تفصیلی احکام ہیں جو کتب فقہ میں موجود ہیں۔

۹۴۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ ۚ كَذَٰلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ○

ترجمہ

۹۴۔ اے ایمان لانے والو! جس وقت تم راہ خدا میں قدم اٹھاتے ہو (اور جہاد کے لیے آمادۂ سفر ہوتے ہو) تو تحقیق کرو اور اس شخص کو جو صلح اور اسلام کا اظہار کرتا ہے اسے فقط اس بنا پر) یہ نہ کہو کہ تو مسلمان (مومن) نہیں کہ دنیائے ناپائیدار کا سرمایہ (اور مال غنیمت) حاصل کرسکو۔ کیونکہ خدا کے ہاں (تمہارے لیے) بڑی بڑی غنیمتیں (موجود) ہیں تم پہلے ایسے ہی تھے اور خدا نے تم پر احسان کیا (اور تمہاری ہدایت کی) اس بنا پر (اس عظیم شکرانے کے طور پر) تحقیق کرو، جو کچھ تم عمل کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

شان نزول

درج بالا آیت کے بارے میں کئی ایک شان نزول اسلامی روایات اور تفاسیر میں آئی ہیں جو کم و بیش ایک دوسرے

سے مماثلت رکھتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے جنگ خیبر سے واپسی کے بعد اسامہ بن زید کو مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ ان یہودیوں کی طرف بھیجا جو فدک کی ایک بستی میں رہتے تھے تاکہ انھیں اسلام یا شرائط ذمہ قبول کرنے کی دعوت دی جائے۔ ایک یہودی مرداس جسے لشکر اسلام کے آنے کی خبر ہوئی تو اس نے اپنے مال اور اولاد کے ساتھ ایک پہاڑ کے دامن میں پناہ لی۔ پھر خود مسلمانوں کے استقبال کے لیے دوڑ آیا۔ اسامہ بن زید نے سوچا کہ یہ یہودی جان اور مال کے خوف سے قبول اسلام کر رہا ہے اور دلی طور پر مسلمان نہیں اس پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا اور اس کا مال اسباب (جو بھیڑ بکریوں) پر مشتمل تھا بطور غنیمت قبضہ کر لیا۔ جب یہ خبر پیغمبر کو ملی تو آپؐ اس واقعہ پر نہایت برہم اور رنجیدہ ہوئے اور فرمایا تو نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا۔ اسامہ پریشان ہو کر کہنے لگا اس شخص نے جان و مال کی حفاظت کے لیے قبول اسلام کیا تھا پیغمبرؐ نے کہا تم اس کے باطن سے آگاہ نہیں تھے تمھیں کیا معلوم شاید وہ حقیقی طور پر مسلمان ہوا ہو تو اس موقع پر او پر والی آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو تنبیہ کی کہ جنگی غنائم کی وجہ سے کبھی ایسے لوگوں کو مت جھٹلاؤ جو قبول اسلام کرتے ہیں بلکہ جو شخص بھی قبول اسلام کرے اس کی بات کو مان لینا چاہیے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں بے گناہ افراد کی جان کی حفاظت کے سلسلہ میں ضروری تاکیدات ہو چکیں اب اس آیت میں ان بے گناہ افراد کی جان کی حفاظت کے لیے ایک احتیاطی حکم جو ممکن ہے تہمت کی زد میں آجائیں بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے ایمان لانے والو! جس وقت جہاد کی راہ میں قدم اٹھاؤ تو تحقیق اور جستجو کر لو اور ایسے لوگوں کو جو قبول اسلام کریں نہ کہو کہ تم مسلمان نہیں ہو (یا ایھا الذین اٰمنوا اذا ضربتم فی سبیل اللّٰہ فتبینوا ولا تقولوا لمن القی الیکم السلام لست مؤمنا)۔

اور حکم دیتا ہے کہ جو لوگ ایمان کا اقرار کرتے ہیں انھیں خندہ پیشانی سے قبول کر لو اور ان کے قبول اسلام کے بارے میں ہر قسم کی بدگمانی اور سوءِ ظن سے صرف نظر کر لو اس کے بعد مزید کہتا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ جہانِ ناپائیدار کی ان نعمتوں کے لیے قبول اسلام کرنے والوں کو تہمت دو اور انھیں ایک دشمن سمجھ کر قتل کر دو اور ان کا مال و اسباب بطور غنیمت لے لو (تبتغون عرض الحیوٰۃ الدنیا)[1] جبکہ ہمیشہ رہنے والی گراں بہا غنیمتیں تو خدا کے پاس ہیں (فعند اللّٰہ مغانم کثیرۃ) اگرچہ پہلے تم ایسے ہی تھے اور زمانہ جاہلیت میں تمھاری جنگیں غارت گری کی بنا پر ہوتی تھیں (کذٰلک کنتم من قبل)[2] لیکن اب

---

[1] "عرض" (بر وزن مرض) کا معنی ہے ایسی چیز جو ثبات اور پائیداری نہ رکھتی ہو۔ اس بنا پر عرض الحیوٰۃ الدنیا کا معنی ہے دنیاوی زندگی کا سرمایہ جو بغیر استثناء کے سب ناپائیدار ہے۔

[2] اس جملہ کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی بتایا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تم خود بھی اسلام لانے کی ابتداء میں یہی کیفیت رکھتے تھے یعنی زبان سے اسلام کی حقانیت کی گواہی دیتے تھے اور وہ تم سے قبول کر لی گئی جبکہ تمھارے دل میں چھپی ہوئی بات کسی پر واضح نہیں تھی۔

اسلام کے سایے میں اور اس احسان کی وجہ سے جو خدا نے تم پر کیا ہے اس کیفیت سے نجات پاچکے ہو اس بنا پر اس عظیم نعمت کے شکرانے کے طور پر تمہارے لیے لازم ہے کہ تمام امور میں تحقیق کرو (فمن اللہ علیکم فتبینوا) اور یہ بات جان لو کہ خدا تمہارے اعمال اور نیتوں سے آگاہ ہے (ان اللہ کان بما تعملون خبیرا)۔

اسلامی جہاد مادی پہلو نہیں رکھتا

مندرجہ بالا آیت میں بڑے واضح طور پر یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ کسی مسلمان کو نہیں چاہیے کہ وہ مادی مفاد حاصل کرنے کے لیے میدانِ جہاد میں قدم رکھے اس لیے لئے کہا گیا ہے کہ دشمن کی طرف سے پہلی مرتبہ ہی اظہار ایمان کو مان لے اور اس کی صلح کی پیشکش رفت کا جواب دے، چاہے کتنی ہی مادی نعمتوں سے محروم ہونا پڑے۔ کیونکہ اسلامی جہاد کا مقصد توسیع پسندی اور مال غنیمت جمع کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد صرف نوع انسانی کو انسانوں کی غلامی اور زر کے خداؤں کی بندگی سے نجات دلانا ہے اور جس وقت امید کی پیدا ہو نظر آئے تو فوراً اپنا لینی چاہیے مندرجہ بالا آیت میں آیا ہے، تم بھی ایک دن اسی طرح کے پست افکار رکھتے تھے اور مادی فوائد کے لیے لوگوں کا خون بہاتے تھے لیکن آج وہ صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔

علاوہ ازیں تم خود داخلہ اسلام میں داخل ہوتے وقت سوائے اظہار ایمان کے کیا کرتے تھے اس قانون سے دوسروں کے بارے میں کیوں اجتناب کرتے ہو جس سے تم خود مستفید ہوتے رہے ہو۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اس آیت کے مضمون پر توجہ کرتے ہوئے ہو سکتا ہے یہ اعتراض پیدا ہو کہ اسلام لوگوں کو اس دین سے وابستہ ہونے کے ظاہری دعووں کو قبول کر کے اسلامی ماحول میں "منافقین" کے داخل ہونے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اس لائحہ عمل سے ممکن ہے بہت سے لوگ غلط فائدہ اٹھائیں اور اسلام کی آڑ میں جاسوسی اور غیر اسلامی اعمال و افعال کے مرتکب ہوں۔

شاید دنیا میں کوئی ایسا قانون نہ ہو جس میں غلط فائدہ اٹھانے والوں کے لیے گنجائش نہ ہو۔ اہم بات یہ ہے کہ قانون کو واضح مصلحتوں کا حامل ہونا چاہیے اب اگر اس بنا پر کہا جائے کہ قبولِ اسلام کرنے والے کی جب تک دلی کیفیت کا پتہ نہ لگایا جائے اس کے دعوے کو قبول نہ کیا جائے تو اس سے بہت سے مفاسد پیدا ہو جائیں گے جن کا نقصان کہیں زیادہ ہے اور انسانی فطرت و عواطف کے اصول نیست و نابود ہو جائیں گے کیونکہ جو شخص کسی دوسرے سے کوئی گلہ اور شکایت، کینہ اور حسد رکھتا ہو وہ اسے تہمت لگا سکتا ہے کہ اس کا اسلام دکھاوے کا ہے اور اس کے دل کی گہرائیوں سے ہم آہنگ نہیں اس طرح بہت سے بے گناہ قتل کر دیے جائیں گے اس کے علاوہ ہر دین اور مذہب کی طرف مائل اور راغب ہونے کی ابتدا میں ایسے افراد بھی موجود ہوتے ہیں جو بھول پن میں، رکھ رکھاؤ کے لیے اور ظاہری طور پر مائل ہوتے ہیں لیکن وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ اور اس دین سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کے ایمان محکم اور مضبوط ہو جاتے ہیں اور ایمان کی جڑیں ان کے دلوں میں راسخ ہو جاتی ہیں اس وجہ سے ایسے لوگوں کو دھتکارا نہیں جا سکتا۔

۹۵۔ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ

۹۶۔ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۧ

ترجمہ

۹۵۔ وہ صاحبِ ایمان جو بغیر بیماری اور تکلیف کے جہاد سے دستبردار ہو گئے اور وہ مجاہد جنھوں نے اپنے مال اور جان کے ذریعے جہاد میں حصہ لیا برابر نہیں ہیں۔ خدا نے ان مجاہدین کو جنھوں نے اپنی جان اور مال سے جہاد کیا ہے بیٹھ رہنے والوں پر فضیلت اور برتری دی ہے ان دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کو (ان کے نیک اعمال پر) خدا نیک جزا کا وعدہ کرتا ہے اور مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں پر فضیلت اور اجر عظیم بخشتا ہے۔

۹۶۔ خدا کی طرف سے (اہم) درجات اور بخشش و رحمت (انھیں نصیب ہوگی) اور (اگر ان سے کچھ لغزشیں ہوئی ہیں) تو خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں جہاد کے متعلق گفتگو ہوئی تھی یہ دو آیات مجاہدین اور غیر مجاہدین کا تقابل اور موازنہ کرتی ہیں۔ خدا کہتا ہے: وہ باایمان کہ جو میدان جہاد میں شرکت کرنے سے اجتناب کرتے ہیں جبکہ انھیں ایسی کوئی خاص بیماری بھی لاحق نہیں کہ جو انھیں میدانِ جہاد میں شرکت کرنے سے مانع ہو کبھی ان مجاہدین کے ہم پلہ اور برابر نہیں ہو سکتے جو راہِ خدا میں اور اعلائے کلمہ حق کے لیے اپنی جان و مال سے جہاد کرتے ہیں (لا يستوي القاعدون من المؤمنين غير اولى الضرر والمجاهدون في سبيل الله باموالهم و انفسهم)۔

واضح ہے کہ "قاعدون" سے مراد یہاں وہ افراد ہیں جنھوں نے اصولِ ایمان پر ایمان رکھنے کے باوجود ہمت اور جوانمردی نہ دکھانے کی وجہ سے جہاد میں شرکت نہیں کی۔ اگرچہ ان کے لیے یہ جہاد واجب عینی نہیں تھا کیونکہ اگر ان کے لیے واجب ہوتا تو قرآن ان کے بارے میں ایسے نرم اور ملائم لہجے میں بات نہ کرتا اور آیت کے آخر میں ان سے بھلے اور جزا کا وعدہ نہ کرتا اس

وجہ سے جب یہ صورتحال ہو کہ جہاد واجب عینی نہ ہو" مجاہدین" "قاعدین" سے بلند ہیں واضح طور پر برتر ہیں بہرحال اس آیت میں وہ لوگ شامل نہیں ہیں جو نفاق یا دشمنی کی وجہ سے جہاد میں شریک نہیں ہوئے۔

ضمنی طور پر یہ خیال رکھنا چاہیے کہ "غیر اولی الضرر" کی تعبیر ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے، جو ان تمام افراد کو (جہاد سے) مستثنیٰ قرار دیتی ہے جو کسی عضو کے نقص، بیماری یا بہت زیادہ کمزوری اور ضعف وغیرہ کے سبب جہاد میں شرکت کی سکت نہیں رکھتے اس کے بعد پھر مجاہدین کی برتری اور فضیلت کو صراحت اور فصاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

خدا ان مجاہدین کو جو اپنے جان و مال سے اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، ان لوگوں پر عظیم فضیلت بخشتا ہے جو میدان جہاد میں شرکت سے اجتناب اور کنارہ کشی کرتے ہیں (فضل الله المجاهدين باموالهم وانفسهم على القاعدين درجة)۔[1]

لیکن باوجود اس کے جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ مجاہدین کے گروہ کے مدمقابل وہ افراد ہیں جن پر جہاد "واجب عینی" نہیں تھا یا وہ بیماری، ناتوانی یا دیگر علل کی وجہ سے میدان جہاد میں شرکت کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا اس وجہ سے کہ ان کی صالح نیت، ایمان اور نیک اعمال نظر انداز نہ ہوں انھیں بھی خوشخبری دیتے ہوئے فرماتا ہے: دونوں گروہوں (مجاہدین و غیر مجاہدین) سے اچھائی کا وعدہ کیا گیا ہے (وكلا وعد الله الحسنى) لیکن واضح ہے کہ وہ اچھائی جس کا وعدہ دونوں سے کیا گیا ہے اس میں بہت زیادہ فرق ہے حقیقت میں قرآن اس بیان کے ذریعے نشاندہی کرتا ہے کہ ہر نیک کام کا حصہ اپنی جگہ پر محفوظ ہے اور بھولنے والا نہیں خصوصاً جبکہ بحث جہاد سے کنارہ کش ہونے والے ایسے افراد کے متعلق ہے جو جہاد میں شرکت کرنا چاہتے ہیں اور اسے ایک بہت بڑی سعادت اور مقصد سمجھتے تھے لیکن چونکہ یہ واجب عینی نہ تھا اس بنا پر وہ ایک بڑی سعادت سے محروم رہ گئے اس کے باوجود وہ جتنا لگاؤ اس کام (جہاد) سے رکھتے ہیں اس قدر جزا پائیں گے اسی طرح "اولی الضرر" افراد بھی جو بیماری یا کسی عضو کے ناقص ہونے کی وجہ سے میدان جہاد میں شریک نہیں ہوئے) مکمل طور پر اس سے لگاؤ رکھتے تھے وہ بھی مجاہدین کی جزا اور بدلے میں سے قابل ذکر حصہ پائیں گے۔ جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ آپؐ نے لشکر اسلام سے فرمایا:

لقد خلفتم في المدينة اقواما ما سرتم مسيرا ولا قطعتم واديا الا كانوا معكم وهم الذين صحت نياتهم ونصحت جيوبهم وهوت افئدتهم الى الجهاد وقد منعهم عن المسير ضرر او غيره

مدینہ میں تم کچھ لوگوں کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو کہ جو اس راہ میں قدم قدم پر تمہارے ساتھ تھے (اور خدائی اجر اور صلے میں شریک تھے) وہ ایسے لوگ ہیں جن کی نیت پاک ہے اور وہ بہت زیادہ خیر خواہی کرنے والے ہیں اور ان کے دل جہاد کے مشتاق تھے مگر کچھ مجبوریوں مثلاً بیماری اور نقص وغیرہ نے انھیں اس کام سے روک دیا ہے۔[2]

---

[1] درجہ کا لفظ بطور نکرہ آیا ہے جیسا کہ کتب ادب میں ہے کہ ایسے موقع پر نکرہ عظمت و اہمیت ظاہر کرنے کے لیے ہوتا ہے گویا اس قدر اعلیٰ و بلند ہے جو مکمل طور پر پہچانا نہیں جاتا اور یہ اس طرح ہے کہ جب کسی چیز کی بہت زیادہ قدر و قیمت بیان کرنی ہو تو کہا جاتا ہے کہ اس کی قیمت کوئی نہیں جانتا۔

[2] تفسیر صافی، زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

لیکن چونکہ اسلام میں جہاد کی اہمیت اس سے بھی کہیں زیادہ ہے لہٰذا دوبارہ مجاہدین کا ذکر کرتے ہوئے تاکید کرتا ہے، خدا نے مجاہدین کو قاعدین پر اجر عظیم بخشا ہے (وفضل اللہ المجاھدین علی القاعدین اجرا عظیما)۔ بعد والی آیت میں "اجر عظیم" کی وضاحت کی گئی ہے کہ جو خدا کی طرف سے اہم درجات اور اس کی بخشش و رحمت ہے (درجات منہ ومغفرۃ و رحمۃ) اور اگر اس دوران میں کچھ افراد اپنے فرائض کی انجام دہی کرتے ہوئے کچھ لغزشوں کے مرتکب ہوئے ہیں اور اپنے کیے پر پشیمان ہیں تو خدا نے ان سے بھی بخشش و نجات کا وعدہ کیا ہے۔ لہٰذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے (وکان اللہ غفورا رحیما)

چند اہم نکات

بلاغت کا ایک پہلو

۱۔ اوپر والی آیت میں تین مرتبہ مجاہدین کا نام آیا ہے پہلی دفعہ مجاہدین کا ذکر ہدف و مقصد اور وسیلہ و ذریعہ کے ساتھ ہوا ہے (المجاھدون فی سبیل اللہ باموالھم وانفسھم) اور دوسری دفعہ صرف وسیلہ جہاد کا ذکر ہوا ہے لیکن ہدف و مقصد کا تذکرہ نہیں ہے (المجاھدین باموالھم وانفسھم) اور تیسرے مرحلے میں صرف مجاہدین کا نام آیا ہے (المجاھدین) اور یہ بلاغت کلام کا ایک واضح نکتہ ہے کہ جب سننے والا مرحلہ بہ مرحلہ موضوع سے زیادہ آشنا ہوتا چلا جاتا ہے تو اس کی قیود اور اضافات کم کرتے چلے جاتے ہیں اور آشنائی و شناسائی کا معاملہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ صرف ایک اشارے ہی سے تمام چیزیں معلوم ہو جاتی ہیں۔

"درجۃ" اور "درجات"

۲۔ آیت میں پہلے تو مجاہدین کی قاعدین پر فضیلت و برتری کے لیے لفظ "درجۃ" استعمال کیا گیا ہے جبکہ دوسری آیت میں جمع کی صورت میں لفظ "درجات" استعمال ہوا ہے ظاہراً ان دو تعبیروں میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ پہلی تعبیر میں مجاہدین کے مقصد کی اپنے غیر پر اصل فضیلت کا تذکرہ ہے لیکن دوسری تعبیر میں اس برتری کی تفصیل بیان کی گئی ہے اس لیے رحمت و مغفرت کا ذکر بھی ساتھ ہے دوسرے الفاظ میں ان دونوں میں اجمال اور تفصیل والا فرق ہے ضمنی طور پر "درجات" کی تعبیر سے یہ معنی بھی لیا جا سکتا ہے کہ سب مجاہدین ایک درجہ اور پایہ کے نہیں ہیں اور ان کے خلوص، جانثاری اور تکالیف برداشت کرنے کے لحاظ سے ان کے معنوی اور دنیاوی مقامات بھی مختلف ہیں کیونکہ یہ بات تو طے ہے کہ تمام مجاہدین جو ایک ہی صف میں دشمن کے مقابل کھڑے ہوتے ہیں نہ وہ ایک جتنا جہاد کرتے ہیں اور نہ ہی ایک جیسا خلوص رکھتے ہیں، اسی بنا پر ہر ایک اپنے عمل اور نیت کی مناسبت سے جزا اور صلہ پائے گا۔

جہاد کی انتہائی تاکید

جہاد عالم آب و گل کا ایک عمومی قانون ہے اور دنیا میں جو بھی چیز ہے چاہے وہ نباتات میں سے ہو یا حیوانات میں سے۔

جہاد کے ذریعے اپنا راستہ صاف کرتی ہے تاکہ اپنے مطلوبہ کمالات تک پہنچ جائے مثلاً ہم درخت کی جڑیں دیکھیں تو وہ قوت اور غذا حاصل کرنے کے لیے ہر وقت فعال اور متحرک رہتی ہیں اگرچہ یہ فعالیت اور سعی چھوڑ دیں تو ان کے لیے زندہ رہنا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمین میں اگر انھیں رکاوٹیں درپیش ہوں تو اگر ان میں اتنی طاقت ہو تو وہ ان میں سوراخ کرکے آگے بڑھ جاتی ہیں تعجب اس بات پر ہے کہ یہ لطیف اور نازک جڑیں بعض اوقات فولادی اوزاروں کی طرح اپنے راستے میں آنے والی رکاوٹوں سے ٹکرا جاتی ہیں اور اگر یہ جڑیں کمزور ہوں تو بھی راستہ بدل کر رکاوٹ عبور کرلیتی ہیں۔

اگر ہم اپنے جسم کو دیکھیں تو اس کے اندر بھی رات دن بلکہ سوتے جاگتے ایک عجیب و غریب قسم کی جنگ جاری رہتی ہے یہ جنگ ہمارے خون کے سفید جرثوموں اور حملہ آور دشمن کے درمیان جاری رہتی ہے اگر ایک لمحے کے لیے بھی یہ جنگ رک جائے اور جسم کی حفاظت کرنے والے یہ محافظ جنگ سے دستبردار ہوجائیں تو طرح طرح کے موذی امراض ہمارے جسم کو گھیر لیں اور ہماری سلامتی کو خطرہ لاحق ہوجائے۔

بالکل یہی صورت انسانی معاشروں، قوموں اور ملتوں کی ہے وہ لوگ جو ہمیشہ جہاد اور نگہبانی کی حالت میں رہتے ہیں ہمیشہ زندہ اور کامران رہتے ہیں اور وہ لوگ جو سوچتے ہیں کہ عیش و عشرت میں وقت گذارا جائے اور جو انفرادی سطح پر زندہ رہنا چاہتے ہیں وہ جلد یا بدیر مٹ جاتے ہیں اور ان کی جگہ زندہ اور مجاہد قوم لے لیتی ہے یہی وجہ ہے کہ رسول خدا فرماتے ہیں:

فمن ترک الجہاد البسہ ذلا و فقرا فی معیشتہ و محقا فی دینہ ان اللہ اعز امتی بسنابک خیلہا و مراکز رماحہا۔[1]

"جو شخص جہاد کو ترک کردیتا ہے خدا اسے ذلت کا لباس پہنا دیتا ہے اور فقر و فاقہ اس کی زندگی پر اور تاریکی و سیاہی اس کے دین پر منحوس سایے کی طرح چھا جاتی ہے۔ خداوند عالم میری امت کو گھوڑوں کے سموں کے ذریعے جو جہاد میں آگے جاتے ہیں اور نیزوں کی انیوں کے وسیلے سے عزت بخشتا ہے۔"

رسول خدا ایک اور موقع پر فرماتے ہیں:

اغزوا تورثوا ابناءکم مجدا۔[2]

"جہاد کرو تاکہ عظمت اپنی اولاد کو ورثے میں دے جاؤ۔"

حضرت علی امیرالمومنین خطبہ جہاد میں اس طرح فرماتے ہیں:

فان الجہاد باب من ابواب الجنۃ فتحہ اللہ لخاصۃ اولیائہ وھو لباس التقوی و درع اللہ الحصینۃ وجنتہ الوثیقۃ فمن ترکہ رغبۃ عنہ البسہ اللہ ثوب الذل وشملہ البلاء ودیث بالصغار والقماءۃ۔۔۔۔۔[3]

"جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جسے خدا نے اپنے مخصوص دوستوں کے لیے کھول رکھا ہے، جہاد تقویٰ کا پرفضیلت لباس ہے، جہاد خدا کی ناقابل شکست زرہ ہے، جہاد پروردگار عالم کی سپر اور ڈھال ہے، جو شخص جہاد کو ترک کردیتا ہے خدا اس کے جسم پر ذلت اور مصیبت کا لباس پہنا دیتا ہے اور سارے لوگوں کی نگاہ میں ذلیل و

---

[1]، [2] وسائل کتاب جہاد ابواب جہاد العدو و مناسبہ باب یکم حدیث ۲، ۱۲

[3] نہج البلاغہ خطبہ ۲۷

ہموار کر دیتا ہے۔"

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جہاد صرف مسلح جنگ و جدال کا نام نہیں بلکہ جہاد میں ہر وہ کوشش اور شامل ہے جو خدائی مقدس اہداف و مقاصد کے حصول میں مددگار ثابت ہو۔ جہاد کا مفہوم دفاعی اور مسلح جنگوں کے علاوہ علمی، منطقی، اقتصادی اور سیاسی مقابلوں پر بھی محیط ہے۔

۹۷۔ إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝

۹۸۔ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ۝

۹۹۔ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ۝

ترجمہ

۹۷۔ وہ لوگ کہ جنکی روح (قابضِ ارواح) فرشتوں نے قبض کی جب کہ وہ اپنے اوپر ظلم کر چکے تھے اور ان سے کہا کہ تم کس حالت میں تھے (اور مسلمان ہونے کے باوجود کفار کی صف میں کیوں جا کھڑے ہوئے) تو انھوں نے کہا کہ ہم اپنی سرزمین پر انتشار اور دباؤ میں تھے تو ان (فرشتوں) نے کہا تو کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم ہجرت کر جاتے پس ان (کے پاس کوئی عذر و معذرت نہیں تھی اور ان) کے رہنے کی جگہ جہنم ہے اور ان کا انجام بُرا ہے۔

۹۸۔ مگر ایسے مرد، عورتیں اور بچے جو واقعا دباؤ اور جبر کا شکار تھے کہ جن کے پاس (اس آلودہ ماحول سے نجات پانے کیلیے) نہ کوئی چارہ تھا اور نہ کوئی راہ۔

۹۹۔ ممکن ہے خدا انھیں عفو کے قابل قرار دے اور خدا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

شانِ نزول

جنگ بدر کی ابتدا سے قبل سردارانِ قریش نے یہ خطرناک اعلان کیا تھا کہ مکہ کے تمام رہنے والے جو میدان جنگ میں شرکت کرنا چاہتے ہیں، مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوں اور جو اس کام کی مخالفت کرے گا اس کا گھر ویران کر دیا

جائے گا اور اس کا مال ضبط کر لیا جائے گا اس دھمکی کے بعد کچھ ایسے افراد جو بظاہر ایمان لا چکے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھیں گھر اور مال و متاع انتہائی عزیز تھا وہ ہجرت کے لیے تیار نہ ہوئے اور بت پرستوں کے ساتھ میدان جنگ کی طرف چل پڑے میدان جنگ میں انھوں نے مشرکین کا ساتھ دیا وہ مسلمانوں کی کم تعداد کو دیکھ کر شک و شبے میں مبتلا ہو گئے اور آخرکار میدان جنگ میں قتل ہو گئے مذکورہ بالا آیت اسی ضمن میں نازل ہوئی جس میں ان کا عبرت ناک انجام بیان کیا گیا ہے۔

تفسیر

جہاد سے متعلق مباحث کے بعد ان آیات میں ایسے لوگوں کے عبرت ناک انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اسلام کا دم بھرتے تھے لیکن انھوں نے اسلام کے اہم لائحہ عمل یعنی "ہجرت" کو عملاً نظر انداز کیے رکھا جس کے نتیجے میں وہ خطرناک وادیوں میں پہنچ گئے اور مشرکین کی صفوں میں شامل ہو کر انھوں نے جانیں گنوا دیں قرآن کہتا ہے: وہ لوگ کہ (قبض روح کرنے والے) فرشتوں نے جن کی روح اس حالت میں قبض کی کہ جب انھوں نے اپنے آپ پر ظلم کر رکھا تھا انھوں نے ان سے پوچھا کہ اگر تم لوگ مسلمان تھے تو پھر کفار کی صفوں میں شامل ہو کر تم نے مسلمانوں سے کیوں جنگ کی (ان الذین توفاهم الملئكة ظالمی انفسهم قالوا فیم كنتم)۔

وہ جواب میں معذرت خواہی سے کہتے ہیں: ہم اپنے ماحول میں جبر اور دباؤ میں تھے اس لیے ہم فرمان الٰہی پر عمل کی طاقت نہیں رکھتے تھے (قالوا كنا مستضعفین فی الارض) لیکن ان کی یہ معذرت قابل قبول نہ ہوگی اور فوراً وہ خدا کے فرشتوں سے یہ جواب سنیں گے کہ کیا پروردگار کی زمین وسیع و عریض نہ تھی کہ تم ہجرت کرتے اور اپنے آپ کو اس آلودہ اور گھٹے ہوئے ماحول سے نکال کر لے جاتے (قالوا الم تكن ارض الله واسعة فتهاجروا فیها)۔

آخر میں ان کے انجام کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: اس قسم کے لوگ جنھوں نے بیکار عذر داری اور ذاتی مصلحت اندیشیوں کے سبب ہجرت نہیں کی اور انھوں نے اس گھٹے ہوئے ماحول میں زندگی گزارنے کو ترجیح دی ہے ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت بُرا انجام ہے (فاولئك مأواهم جهنم وساءت مصیرا)۔

بعد والی آیت میں مستضعفین، حقیقی کمزور اور عاجز افراد (نہ کہ جھوٹے مستضعفین) کے استثناء کے ساتھ فرماتا ہے: وہ مرد عورتیں اور بچے جو اس گھٹن زدہ ماحول سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں پاتے وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ یہ لوگ حقیقتاً معذور ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ خدا ناقابل عمل ذمہ داری لاگو کرے (الا المستضعفین من الرجال والنساء والولدان لا یستطیعون حیلة ولا یهتدون سبیلا)۔

آخری آیت میں فرماتا ہے: ہو سکتا ہے عفو خداوندی ان کے شامل حال ہو اور خدا ہمیشہ سے معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے (فاولئك عسى الله ان یعفو عنهم وكان الله عفوا غفورا)

یہاں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر یہ افراد حقیقتاً معذور ہیں تو پھر کیوں نہیں فرمایا کہ خدا حتماً اور یقیناً انھیں بخش دے گا وہ تو کہتا ہے "عسیٰ" (شاید) اس سوال کا جواب وہی ہے جو اس سورہ کی آیہ ۴۸ کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے کہ اس طرح کی تعبیروں سے مراد کیا ہے۔ اس آیت میں مذکور حکم چند شرائط کے ساتھ آیا ہے جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

خدا اس قسم کے افراد سے عفو کرتا ہے جنھوں نے موقع ملنے پر ہجرت کے عمل سے تھوڑی سی کوتاہی بھی نہ کی ہو، اصطلاح کے مطابق اس کام کے ضمن میں کوئی کسر نہ چھوڑی ہو اور اب بھی موقع ملتے ہی ہجرت کرنے پر آمادہ اور تیار ہوں۔

چند اہم نکات

۱۔ روح کی استقامت

اس آیت میں موت کی بجائے " توفی" کا لفظ حقیقت میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ موت کا معنی نابود اور فنا ہونا نہیں ہے بلکہ ایک قسم کی " فرشتوں کی جماعت اور روح انسانی کو پالینا" ہے۔ یعنی وہ اس کی روح کو جو کہ اس کے وجود کا سب سے بنیادی حصہ ہے نکال کر ایک دوسرے جہان میں لے جاتے ہیں ایسی تعبیر خود قرآن میں بارہا آئی ہے دراصل قرآن مجید کا اس امر کی طرف ایک واضح ترین اشارہ ہے کہ موت کے بعد روح باقی رہتی ہے اس کی تفصیل مختلف آیات میں مناسب موقع پر آتی رہے گی یہ جواب ان لوگوں کے لیے ہے جو کہتے ہیں کہ قرآن نے روح کا کہیں ذکر نہیں کیا۔

۲۔ روح قبض کرنے والے، ایک یا ایک سے زائد فرشتے

قرآن میں کئی ایک مقامات (۱۲ مقامات) ہیں جن میں توفی[1] اور موت کا تذکرہ ہے اس کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روح قبض کرنے کے لیے ایک ہی فرشتہ متعین نہیں کیا گیا بلکہ بہت سے فرشتوں کے ذمہ یہ کام ہے جو لوگوں کی ارواح کو اس جہان سے دوسرے جہان میں لیجانے پر مامور ہیں۔ درج بالا آیت میں فرشتوں کا ذکر جمع کے صیغے (الملائکہ) کے ساتھ آیا ہے۔ یہ بھی اس امر کا گواہ ہے سورہ انعام کی آیت ۶۱ میں ہے:

حتی اذا جاء احدکم الموت توفته رسلنا

"جب تم میں سے کسی ایک کی موت کا وقت آتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اس کی روح قبض کرتے ہیں"۔

اب اگر ہم دیکھیں کہ بعض آیات میں یہ امر ملک الموت (موت کا فرشتہ) سے منسوب کیا گیا ہے[2] تو وہ اس مفہوم میں ہے کہ وہ ان تمام فرشتوں کا سردار ہے جو ارواح قبض کرنے پر مامور ہیں اور اسی فرشتے کو احادیث میں "عزرائیل" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس بناء پر جب لوگ سوال کرتے ہیں کہ ایک فرشتہ کس طرح ایک ہی وقت میں تمام مقامات پر حاضر ہو کر انسانوں کی روح قبض کرتا ہے تو اس کا جواب اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے۔

---

[1] "توفی" کے معنی کے سلسلہ میں تفسیر نمونہ جلد دوم صفحہ ۱۳۳ کی طرف مراجعہ فرمائیں۔ اردو ترجمہ

[2] سورہ سجدہ آیت ۱۱۔

اس کے علاوہ اگر فرض کریں کہ اور فرشتے نہیں ہیں اور صرف ایک فرشتہ ہے پھر بھی کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی کیونکہ اس کا اکیلا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہے کیونکہ ایک ایسا وجود جو مادے سے نہ بنا ہو اس میں مادی اشیاء کی نسبت وسیع احاطہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ملک الموت کے بارے میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ نے ملک الموت سے اس جہان پر احاطہ رکھنے کے بارے میں سوال کیا تو اس نے کہا:

ما الدنیا کلها عندی فیما سخرها الله لی ومکننی علیها الا کالدرهم فی کف الرجل یقلبه کیف یشاء

یہ جہان اور جو کچھ اس میں ہے اس تسلط اور احاطہ کے لحاظ سے جو خدا نے مجھے بخشا ہے میرے نزدیک اس درہم (روپیہ) کی مانند ہے جو کسی شخص کے ہاتھ میں ہو کہ جس طرح چاہے الٹ پھیر کرے[1]

[illegible] روح قبض کرنے کا تعلق خدا سے وابستہ کیا گیا ہے مثلاً

[illegible] الا نفس حین موتها"

"خدا موت کے وقت جانوں کو قبض کرتا ہے۔" (سورۂ زمر ۴۲)

یہ گذشتہ آیات سے متضاد نہیں کیونکہ جن معاملات میں کام واسطوں کے ذریعے ہوتے ہیں وہاں بعض اوقات کام کی نسبت وسیلوں کی طرف دی جاتی ہے اور کبھی اس طرف کہ جو اسباب اور وسیلے پیدا کرتا ہے دونوں نسبتیں صحیح ہیں بہتر نظریہ یہ ہے کہ دنیا کے بہت سے حوادث کی نسبت قرآن مجید میں فرشتوں کی طرف دی گئی ہے جو خدا کی جانب سے عالم ہستی میں مامور ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں فرشتہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور اس مفہوم میں عاقل مجرد موجودات سے لے کر طبعی توانائیاں تک شامل ہیں۔

۲۔ مستضعف کون ہے؟

آیات قرآن اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو افراد فکری، جسمانی یا اقتصادی طور پر اتنے ضعیف اور کمزور ہوں کہ حق و باطل میں تمیز نہ کر سکیں یا جو باوجود صحیح عقیدہ رکھنے کے جسمانی یا مالی طور پر کمزوری کے باعث یا معاشرے کی ناروا پابندیوں کے سبب اپنے فرائض ادا نہ کر سکتے ہوں اور نہ ہی ہجرت کے قابل ہوں انہیں مستضعف کہتے ہیں۔ حضرت علیؑ سے منقول ہے آپؑ نے فرمایا:

ولا یقع اسم الاستضعاف علی من بلغته الحجة فسمعتها اذنه ووعاها قلبه۔

"وہ شخص مستضعف نہیں ہے جس پر حجت تمام ہو چکی ہو اس نے حق کو سنا ہو اور اس کے ذہن نے اس کا ادراک کیا ہو۔"[2]

امام موسیٰ ابن جعفرؑ سے پوچھا گیا، مستضعف کون ہے؟ امام نے اس سوال کے جواب میں تحریر فرمایا:

الضعیف من لم ترفع له حجة ولم یعرف الاختلاف فاذا عرف الاختلاف فلیس بضعیف۔

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۳۹۱ آیت ۱ سورہ اسراء کے ذیل میں [2] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۵۳۲

"مستضعف وہ شخص ہے جس تک حجت اور دلیل نہ پہنچی ہو اور وہ (مذاہب اور عقائد کے بارے میں) موجود اختلاف کو نہ سمجھ سکا ہو (جو کہ محرکِ تحریک ہے) اور جو اس چیز کو سمجھ چکا ہو وہ مستضعف نہیں ہے"[1]

واضح ہے کہ اوپر والی دونوں احادیث میں مستضعف فکری اور عقیدہ کے لحاظ سے ہے لیکن زیرِ بحث آیت میں اور اسی سورہ کی آیہ ۷۵ میں جو بیان ہو چکی ہے مستضعف سے مراد عملی مستضعف ہے یعنی وہ شخص جس نے حق کی تشخیص کر لی ہو لیکن ماحول کا جبر اور گھٹن اسے عمل کی اجازت نہ دیتا ہو۔

۱۰۰۔ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۟

ترجمہ

۱۰۰۔ اور جو شخص راہِ خدا میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت سے اور وسیع امن کے خطے پا لے گا اور جو شخص اپنے شہر سے خدا اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرے پھر اسے موت آ جائے تو اس کا اجر و ثواب خدا پر ہے اور خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

ہجرت ــــ اسلام کا ایک اصلاحی حکم

جو لوگ ہجرت کے فریضہ سے کوتاہی کر کے طرح طرح کی ذلتوں اور بدبختیوں کا شکار ہو جاتے ہیں ان کے تذکرے کے بعد اس آیت میں قطعی طور پر ہجرت کی اہمیت کے سلسلہ میں دو حصوں میں بحث ہوئی ہے۔

سب سے پہلے دنیاوی زندگی میں ہجرت کے ثمرات اور برکات بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے، جو لوگ خدا کی راہ میں اور خدا کے لیے ہجرت کرتے ہیں انہیں خدا کے اس وسیع جہان میں امن کی بہت سی اور وسیع جگہیں میسر آئیں گی جن میں رہ کر وہ حق کو فروغ دیں گے اور مخالفین کو زیر کر سکیں گے (ومن یھاجر فی سبیل اللّٰہ یجد فی الارض مراغما کثیرا وسعۃ) غور کرنا چاہیے کہ "مراغم" رغام (بروزن کلام) کے مادہ سے بمعنی "خاک اور مٹی" لیا گیا ہے۔ ارغام کا معنی ہے کسی کو مٹی میں رگیدنا اور ذلیل کرنا اور مراغم اسم مفعول بھی ہے اور اسم مکان بھی۔ لیکن زیرِ نظر آیت میں یہ اسم مکان کے معنی میں

---

[1] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۵۳۹۔

آیا ہے یعنی وہ مکان جہاں حق کا اجرا کر سکتے ہیں اور اگر کوئی شخص عناد کی وجہ سے حق کی مخالفت کرے تو اسے مغلوب کرکے اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہجرت کے معنوی اور اخروی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: اگر کچھ لوگ ہجرت کے ارادے سے اپنے گھر اور وطن سے خدا اور پیغمبر کی طرف ہجرت کریں اور ہجرت کے مقام تک پہنچنے سے پہلے انھیں موت آجائے تو ان کا اجر اور ثواب خدا کے ذمہ ہے اور خدا ان کے گناہوں کو بخش دے گا (ومن یخرج من بیتہ مھاجرًا الی اللہ ورسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ وکان اللہ غفورًا رحیمًا) اس وجہ سے ہجرت کرنے والے ہر صورت میں ایک عظیم کامیابی حاصل کریں گے چاہے وہ اپنی منزل پر پہنچ جائیں اور حریت و آزادی کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی سے بہرہ ور ہوں اور منزل مقصود تک پہنچ جائیں اور چاہے وہ ایسا نہ کر سکیں اور اپنی جان اس راہ میں قربان کر دیں۔ اس کے باوجود ہر قسم کا اجر و ثواب خدا ہی کے ذمہ ہے۔ لیکن یہاں خصوصیت کے ساتھ اس بات کا تذکرہ ہے "فقد وقع اجرہ علی اللہ یعنی اس کا اجر خدا پر لازم ہو چکا ہے" یہ امر ہجرت کرنے والوں کے اجر و ثواب کی انتہائی عظمت و اہمیت کا مظہر ہے۔

اسلام اور ہجرت

اس آیت اور قرآن کی بہت سی دوسری آیات کے مطابق اسلام صراحت کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ انسان اگر کسی ماحول میں کچھ عوامل و اسباب کی بنا پر اپنی ذمہ داری نبھا نہ سکے تو دوسرے ماحول اور مقام امن کی طرف ہجرت کرے کیونکہ جہاں ہستی کے باوجود

نتواں مرد بہ ذلت کہ در اینجا زادم

(یعنی اس وجہ سے ذلت کے ساتھ کسی جگہ نہیں مرنا چاہیے کہ یہ میری جائے پیدائش ہے)

اور اس حکم کی علت اور سبب واضح ہے کیونکہ انسان کسی خاص مقام کا پابند نہیں ہے وہ کسی معین مقام اور ماحول سے وابستہ اور اس میں محدود نہیں ہے اس طرح انسان کا اپنی جائے پیدائش اور اس کے ماحول اور علاقے سے انتہائی لگاؤ اسلام کے نقطہ نظر سے مسلمانوں کی ہجرت سے مانع نہیں ہو سکتے یہی وجہ ہے کہ صدر اسلام میں یہ تمام وابستگیاں اسلام کی حفاظت اور ترقی کے لیے منقطع کر دی گئیں: ایک مغربی مورخ کے بقول:

> قبیلہ اور خاندان وہ اکیلا درخت ہے جو صحرا میں اگتا ہے اور کوئی شخص اس کی پناہ اور سایہ کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتا لیکن محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ہجرت کے ذریعے اس درخت کو جس نے ان کے خاندان کے لیے گوشت اور لہو سے پرورش پائی تھی اپنے پروردگار کے لیے کاٹ دیا (اور قریش سے اپنا رابطہ ختم کر دیا)[۱]

علاوہ ازیں تمام زندہ موجودات میں یہ بات مشترک ہے کہ جب وہ اپنے وجود کو خطرے میں دیکھتے ہیں تو ہجرت کا راستہ اختیار کرتے ہیں اس سے پہلے بہت سے لوگوں نے کسی علاقے کے جغرافیائی حالات کے متغیر ہونے کے بعد اپنی زندگی کی بقا کے لیے

---

[۱] محمد خاتم پیامبران جلد اول۔

اپنے وطن اور جائے پیدائش سے دوسرے علاقوں کی طرف کوچ کیا ہے نہ صرف انسان بلکہ دوسرے جانداروں میں بہت سی ایسی انواع ہیں جو مہاجر کے طور پر پہچانی گئی ہیں۔ مثلاً بعض ہجرت کرنے والے پرندے ایسے بھی ہیں جو اپنی زندگی کی بقا کے لیے بعض اوقات پورے کرۂ ارض کی سیر کرتے ہیں اور ان میں سے بعض تو قطب شمالی سے قطب جنوبی تک کا سفر طے کرتے ہیں اور اس طرح اپنی زندگی کی بقا کے لیے تقریباً ۱۸ ہزار کلو میٹر تک پرواز کرتے ہیں اور یہ چیز اس بات کا ثبوت ہے کہ ہجرت حیات و زیست کو رواں دواں رکھنے کے قوانین میں سے ہے تو کیا ممکن ہے کہ انسان ایک پرندے سے بھی کم تر ہے؟ یا یہ ہوسکتا ہے کہ جب مقدس مقاصد و اہداف اور حیات معنوی جن کی قدر و قیمت مادی زندگی سے کہیں زیادہ ہے، خطرے میں پڑ جائیں تو انسان اس عذر کی بنا پر کہ یہ میری جائے پیدائش ہے اپنے اہداف و مقاصد کو چھوڑ دے اپنے آپ کو طرح طرح کی ذلت و خواری، محرومی اور غلامی کے سپرد کر دے، یا یہ کہ وہ اس عمومی قانونِ حیات کے مطابق اس علاقے سے، ہجرت کر جائے اور کسی ایسی جگہ منتقل ہو جائے جو اس کی مادی و روحانی نشوونما اور رُشد کے لیے مناسب ہو۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ وہ ہجرت جو اپنی حفاظت کی بجائے دینِ اسلام کے تحفظ کے لیے ہوئی مسلمانوں کی تاریخ کی ابتدا ہے اور یہ ہجرت ہمارے تمام سیاسی، تبلیغی اور معاشرتی معاملات کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے باقی رہا یہ سوال کہ ہجرتِ پیغمبر اکرمؐ کا سال اسلام کی تاریخ کے ابتدا کے طور پر کیوں منتخب ہوا ہے۔

تو یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے ہم جانتے ہیں کہ ہر قوم و ملت کی اپنی ایک تاریخی ابتدا ہوتی ہے، عیسائیوں نے اپنی تاریخ کی ابتدا حضرت مسیحؑ کے سال پیدائش سے شمار کی ہے اسلام میں باوجودیکہ بہت سے اہم واقعات تھے، مثلاً ولادت پیغمبر اسلامؐ، آپؐ کی بعثت، فتح مکہ اور رحلت پیغمبر اکرمؐ، پھر بھی ان میں سے کوئی واقعہ منتخب نہیں ہوا اور صرف ہجرت رسولِ خداؐ تاریخ کی ابتدا کا عنوان ٹھہری، تاریخ بتاتی ہے کہ خلیفہ دوم کے وقت جب اسلام طبعی طور پر وسعت حاصل کر چکا تھا مسلمانوں کو ایسی ابتدائے تاریخ کے تعین کی فکر لاحق ہوئی جو عمومی لحاظ سے سب کے لیے یکساں ہو۔ بہت رد و قدح کے بعد حضرت علیؑ کے نظریہ کو قبول کر لیا گیا، حضرت علیؑ نے ابتدائے تاریخ کے لیے ہجرت کا انتخاب کیا۔[1]

حقیقت میں بھی ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کیونکہ ہجرت وہ روشن ترین قدم تھا جسے اسلام میں عملی جامہ پہنایا گیا اور جو تاریخ اسلام کی فصلِ نو کا آغاز بنا، مسلمان جب تک مکہ میں تھے اپنی تعلیم و تربیت، کے ابتدائی دور میں سے گزر رہے تھے، بظاہر وہاں وہ کسی قسم کی اجتماعی اور سیاسی طاقت نہ تھے لیکن ہجرت کے فوراً بعد اسلامی حکومت کی تشکیل ہوئی اور بڑی تیزی کے ساتھ ہر شعبہ زندگی میں ترقی ہوئی اور اگر مسلمان فرمان رسالت کے مطابق اس طرح ہجرت نہ کرتے تو نہ صرف یہ کہ اسلام مکہ کے دائرے سے باہر نہ نکلتا بلکہ ممکن تھا کہ وہیں خاموش اور دفن ہو جاتا۔

واضح ہے کہ ہجرت کوئی ایسا حکم نہیں کہ جو زمانِ پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ مخصوص ہو بلکہ ہر عہد اور زمانہ میں کسی جگہ بھی ایسے حالات ہوں تو مسلمانوں کی ذمہ داری اور فریضہ ہے کہ وہ ہجرت کریں۔

---

[1] تاریخ طبری جلد دوم ص ۱۱۲

بنیادی طور پر قرآن ہجرت کو آزادی اور سکون کے حصول کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ جیسا کہ زیر بحث آیت میں صراحت کے ساتھ آیا ہے۔
سورہ نحل آیۃ ۴۱ میں بھی یہ حقیقت ایک اور طریقے سے بیان ہوئی ہے۔

والذین هاجروا فی الله من بعد ما ظلموا لنبوئنهم فی الدنیا حسنة

اور وہ لوگ جن پر ظلم کیے گئے اور اس کے بعد انھوں نے راہِ خدا میں ہجرت اختیار کی وہ دنیا میں پاکیزہ مقام حاصل کریں گے۔

اس نکتہ کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ ہجرت اسلام کی نگاہ میں صرف مکانی اور خارجی ہجرت نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ اس ہجرت سے پہلے اندر اور باطن سے ہجرت کا آغاز ہو اور اس ہجرت سے مراد ہجرت اور دوری ہے ان چیزوں سے کہ جو انسان کی اساس اس کے مرتبے اور اعزاز سے ٹکراتی ہوں یہ ہجرت اس لیے ہے تاکہ اس کے زیر اثر انسان خارجی اور مکانی ہجرت کے لیے آمادہ ہو سکے اور یہ ہجرت ضروری ہے تاکہ اگر ہجرت مکانی کی ضرورت پڑے تو اس باطنی ہجرت کے زیر اثر انسان راہِ خدا میں ہجرت کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو سکے اصولی طور پر روح ہجرت وہی ظلمت سے نور، کفر سے ایمان اور گناہ و نافرمانی سے اطاعت خداوندی کے لیے دیوانہ وار نکل پڑنا ہے اسی لیے ہم احادیث میں پڑھتے ہیں کہ وہ مہاجرین جنھوں نے جسمانی طور پر ہجرت کی مگر روحانی ہجرت نہیں کی وہ مہاجرین کی صفوں میں شمار نہیں ہوتے ان کے مقابلے میں وہ لوگ جنھیں مکانی ہجرت کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ باطنی طور پر ہجرت میں شامل تھے وہ مہاجرین کے زمرے میں داخل ہو گئے۔ امیرالمومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں۔

ویقول الرجل هاجرت ولم یهاجر انما المهاجرون الذین یهجرون السیئات ولم یأتوا بها۔

بعض کہتے ہیں کہ ہم نے ہجرت کی ہے حالانکہ حقیقت میں انھوں نے ہجرت نہیں کی حقیقی ہجرت کرنے والے وہ ہیں جو گناہوں سے ہجرت اختیار کرتے ہیں اور ان کے مرتکب نہیں ہوتے[1]

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا۔

من فر بدینه من ارض الی ارض و ان کان شبرا من الارض استوجب الجنة وکان رفیق محمد و ابراهیم علیهما السلام

جو شخص اپنے دین کی حفاظت کے لیے ایک سرزمین سے دوسری سرزمین کی طرف ایک بالشت برابر ہجرت کرے تو وہ جنت کا مستحق ہو جاتا ہے اور محمد و حضرت ابراہیم علیہم السلام کی رفاقت اور ہم نشینی اسے نصیب ہو گی (کیونکہ یہ دونوں عظیم پیغمبر عالم ہستی میں) ہجرت کرنے والوں کے پیشوا اور رہنما تھے[2]

۱۰۱۔ وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ○

---

[1] سفینۃ البحار (ہجر) [2] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۵۴۲

ترجمہ

۱۰۱۔ اور جس وقت سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز میں قصر کرو۔ اگر تمھیں کافروں کے فتنے کا ڈر ہو، کیونکہ کافر تمھارے واضح دشمن ہیں۔

تفسیر

نمازِ مسافر

گذشتہ آیات "جہاد" اور "ہجرت" کے بارے میں بحث کر رہی تھیں۔ اب اس آیت میں "نمازِ مسافر" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب سفر کرو تو کوئی حرج نہیں کہ نماز کو کم اور قصر کر لو، اگر کفار کی طرف سے تمھیں خدشہ ہو کیونکہ کافر تمھارے واضح دشمن ہیں (واذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلٰوۃ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا ان الکافرین کانوا لکم عدوا مبینا) اس آیت میں سفر کو "ضرب فی الارض" سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ مسافر سفر کرتے وقت زمین کو اپنے پاؤں تلے روندتا ہے[1]۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں نماز قصر کا مسئلہ دشمن کے خطرے کے ساتھ مشروط ہے جبکہ ہم فقہی مباحث میں پڑھتے ہیں کہ نماز قصر ایک عمومی حکم ہے اور اس میں پرخطر اور پُر امن سفروں میں کوئی فرق نہیں ہے شیعہ اور اہل سنت کی طرف سے کئی ایک روایات جو نماز قصر کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں وہ بھی اس عمومیت کی تائید کرتی ہیں[2]۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے قصر والے حکم کو خوف سے مربوط کرنا مندرجہ ذیل چند وجوہ میں سے کسی ایک کی بنا پر ہو۔

الف:۔ یہ پابندی اور شرط اسلام کے ابتدائی دنوں کی صورتِ حال سے متعلق ہے اور اصطلاح کے مطابق قید غالبی ہے یعنی غالباً ان کے سفر خوف و خطر سے بھرپور ہوتے تھے اور جیسا کہ علمِ اصول میں کہا جا چکا ہے کہ قیودِ غالبی کا مفہوم نہیں ہوتا جیسا کہ:۔

وربائبکم اللاتی فی حجورکم

تمھاری بیوی کی وہ لڑکیاں جو تمھاری گود میں پلی بڑھی ہیں تم پر حرام ہیں۔ (نساء۔ ۲۳)

اس آیت میں بھی یہی مسئلہ درپیش ہے کیونکہ بیوی کی بیٹیاں محارم میں داخل ہیں چاہے وہ اس کی گود میں رہی ہوں یا نہ رہی ہوں غالباً جو طلاق یافتہ عورتیں دوسرا شوہر کرتی ہیں وہ جوان ہوتی ہیں اور چھوٹے بچے ان کے ساتھ ہوتے ہیں جو دوسرے شوہر کی گود میں پلتے ہیں اس لیے فی حجورکم (تمھاری گود میں) کی قید اس آیت میں آئی ہے۔

---

[1] مفردات راغب مادہ "ضرب"

[2] مزید اطلاع کے لیے وسائل الشیعہ جلد پنجم اور سنن بیہقی جلد ۳ ص ۱۳۴ وغیرہ کی طرف رجوع کریں۔

ب: بعض مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ نماز قصر کا مسئلہ پہلے تو خوف کے وقت سے متعلق تھا (اوپر والی آیت کے مطابق) پھر اس حکم نے وسعت پیدا کی اور یہ تمام مواقع کے لیے عمومیت اختیار کر گیا۔

ج: ممکن ہے یہ پابندی تاکیدی پہلو رکھتی ہو یعنی نماز قصر مسافر کے لیے ہر جگہ لازم اور واجب ہے لیکن جب دشمن کا خدشہ ہو تو پھر اس کی زیادہ تاکید ہے۔ بہرحال اس میں شک و شبہ نہیں کہ آیت کی تفسیر میں آنے والی بہت سی اسلامی روایات کی طرف دھیان دیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نماز مسافر حالتِ خوف سے مخصوص نہیں ہے اسی لیے تو پیغمبر اکرمؐ بھی سفر کی حالت میں یہاں تک کہ مراسم حج میں (منیٰ کی سرزمین میں) نماز قصر پڑھتے تھے۔

ایک دوسرا سوال جو پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں بیان ہوا ہے "لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ" (تم پر کوئی گناہ نہیں ہے) اور قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا گیا کہ بس نماز قصر ہی پڑھو تو ایسے میں کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ نماز قصر واجب عینی ہے، واجب تخییری نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بالکل یہی سوال رہبرانِ اسلام سے ہوا اور انھوں نے دو نکات کی طرف اشارہ کیا ہے:

پہلا یہ کہ "لَا جُنَاحَ" (تم پر کوئی گناہ نہیں) کی تعبیر خود قرآن مجید میں بعض مواقع پر وجوب کے معنی میں استعمال ہوئی ہے، مثلاً:

ان الصفا و المروة من شعائر الله فمن حج البيت او اعتمر فلا جناح عليه ان يطوف بهما (البقرة: ۱۵۸)

صفا اور مروہ خدا کے شعائر اور نشانیوں میں سے ہیں لہٰذا جو شخص حج و عمرہ ادا کرے اس کے لیے کوئی حرج نہیں کہ ان دونوں کا طواف کرے (صفا اور مروہ کے درمیان سعی بجالائے)۔

حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا حج و عمرہ دونوں میں واجب ہے اسی لیے تو پیغمبر اکرمؐ اور تمام مسلمان یہ عمل کرتے تھے۔ بالکل یہی مضمون ایک روایت میں امام باقر علیہ السلام سے نقل ہوا ہے۔[1]

دوسرے الفاظ میں "لاجناح" کی تعبیر زیر بحث آیت میں اور نیز آیت حج میں حرمت کے وہم کی نفی کے لیے آئی ہے، کیونکہ اسلام کی ابتداء میں صفا اور مروہ (پہاڑیوں) کے اوپر بت رکھے ہوئے تھے بعض مسلمانوں کا یہ خیال تھا صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا بت پرستوں کے آداب میں سے ہے حالانکہ ایسا نہیں تھا لہٰذا خدا اس غلط فہمی کی نفی کے لیے فرماتا ہے "کہ کوئی حرج نہیں کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرو"۔ اسی طرح مسافر کے ذکر میں احتمال ہے کہ بعض لوگ یہ خیال کریں کہ سفر میں نماز کو قصر کرنا ایک گناہ ہے لہٰذا لاجناح کی تعبیر کے ساتھ اس غلط فہمی کو دور کیا گیا ہے۔

دوسرا نکتہ کہ جس کی طرف بعض روایات میں بھی اشارہ ہوا ہے یہ ہے کہ سفر میں نماز کو قصر کرنا ایک قسم کی خدا کی طرف سے رعایت ہے لہٰذا ادب اور احترام کا تقاضا ہے کہ انسان اس تخفیف کو رد نہ کرے اور اس کی طرف سے بے اعتنائی نہ برتے۔ اہل سنت کی

---

[1] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۵۴۲

روایات میں پیغمبر اسلام سے منقول ہوا ہے کہ آپ نے نماز قصر کے بارے میں فرمایا:

صدقة تصدق الله بها عليكم فاقبلوا صدقته[1]

یہ ہدیہ ہے جو خدا نے تمہیں دیا ہے اسے قبول کرو۔

اس حدیث کی مثالیں کتب شیعہ میں بھی ملتی ہیں۔ امام صادق علیہ السلام پیغمبر اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:

"سفر میں افطار اور نماز کا قصر ہونا خدا کا ہدیہ ہے جو شخص اس عمل سے صرف نظر کرے اس نے گویا خدائی ہدیہ کو رد کیا ہے۔"[2]

ایک اور نکتہ جس کی طرف توجہ کرنی چاہیے یہ ہے کہ بعض لوگوں کا گمان ہے کہ زیر بحث آیت نماز خوف (میدان جنگ میں ادا کی جانے والی نماز) کو بیان کرتی ہے اور " اِنْ خِفْتُمْ " (اگر تمہیں ڈر ہے) کو اس کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں لیکن اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ (جب تم سفر کرو) کا جملہ ایک عام مفہوم رکھتا ہے جس میں ہر طرح کا سفر شامل ہے چاہے عام سفر ہو یا جہاد کے لیے سفر ہو۔ علاوہ ازیں خوف کا حکم بعد والی آیت میں علیحدہ اور مستقل طور پر آیا ہے اور ان خفتم کی تعبیر جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ایک غالبی قید ہے جو اس زمانہ میں مسلمانوں کے سفروں کے لیے زیادہ پائی جاتی تھی۔ لہٰذا یہ نماز خوف پر دلالت نہیں کرتی۔

اس کے علاوہ میدان جنگ میں ہمیشہ دشمن کے حملہ کا خوف رہتا ہے لہٰذا وہ ایسی جگہ نہیں کہ یہ کہا جائے " اگر تمہیں خوف ہو کہ دشمن حملہ کرے گا " یہ خود ایک ثبوت ہے کہ آیت تمام قسم کے سفروں کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جن میں ممکن ہے خطرات موجود ہوں۔

ضمناً غور کرنا چاہیے کہ نماز قصر کی شرائط باقی تمام احکام اسلامی کی شرائط اور خصوصیات کی مانند قرآن میں نہیں آئیں بلکہ سنت میں ان کی طرف اشارہ ہوا ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ ہے کہ نماز قصر آٹھ فرسخ (تقریباً ۲۸ میل) سے کم فاصلے کے سفر کے لیے نہیں ہے کیونکہ اس زمانہ میں مسافر عام طور پر ایک دن میں آٹھ فرسخ کی راہ طے کر لیتا تھا۔

نیز وہ لوگ جو ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں یا سفر ان کی زندگی کا جزو ہے وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ سفر ایسے لوگوں کے لیے معمول کا درجہ رکھتا ہے نہ کہ غیر معمولی (اور زیادہ مشقت آور) اس طرح وہ لوگ کہ جن کا سفر معصیت کا سفر ہے، یہ قانون انھیں شامل نہیں کرتا کیونکہ یہ حکم ایک طرح سے خدا کی طرف سے رعایت ہے لہٰذا وہ افراد جو گناہ کی راہ میں سفر کرتے ہیں یہ تخفیف ان کے لیے نہیں ہے اس طرح مسافر جب تک حد ترخص تک نہ پہنچے (وہ مقام جہاں شہر کی اذان کی آواز نہ سن سکے یا شہر کی دیواریں اسے نظر نہ آئیں) وہ نماز قصر نہیں کر سکتا کیونکہ وہ ابھی تک اپنے شہر کی حدود سے خارج ہی نہیں ہوا اس لیے مسافر کے زمرے میں وہ نہیں آتا۔ کتب فقہ میں تفصیل سے بیان ہونے والے احکام اسی طرح ہیں اور ان سے مربوط احادیث کو محدثین نے کتب حدیث

---

[1] یہ حدیث سنن بیہقی جلد ۳ صفحہ ۱۳۴ پر صحیح مسلم سے نقل ہوئی ہے اور تفاسیر و کتب فقہ میں بھی آئی ہیں۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۵ صفحہ ۵۴۰

میں ذکر کیا ہے۔

۱۰۲۔ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۪ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ○

ترجمہ

۱۰۲۔ اور جس وقت تم ان کے درمیان ہو (اور میدان جنگ میں) ان کے لیے نماز قائم کرو ان میں سے ایک دستہ تمہارے ساتھ (نماز کے لیے) کھڑا ہو جائے گا۔ ایسے لوگ اپنے ہتھیار اپنے پاس رکھیں اور جب سجدہ کریں (اور نماز کو ختم کریں) تو تمہارے پیچھے سے ہٹ کر (میدانِ جنگ) کی طرف پلٹ جائیں اور دوسرا گروہ جس نے نماز نہیں پڑھی (اور وہ جنگ میں مشغول تھا) اگر تمہارے ساتھ نماز پڑھے اور یہ لوگ (بھی) وسائلِ دفاع اور اپنے ہتھیار اپنے ساتھ (حالتِ نماز میں) اٹھائے رکھیں (کیونکہ) کفار یہی چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور مال و متاع سے غافل ہو جاؤ اور وہ اچانک تم پر حملہ کر دیں اور اگر بارش کی وجہ سے تم تکلیف میں ہو یا بیمار (اور مجروح) ہو تو کوئی حرج نہیں کہ تم اپنے ہتھیار زمین پر رکھ دو۔ لیکن دفاعی وسائل (مثلاً زرہ اور خود) پہنے رکھو۔ خدا نے کافروں کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

شانِ نزول

جب پیغمبر اکرمؐ کچھ مسلمانوں کے ساتھ مکہ جانے کے ارادہ سے سرزمین حدیبیہ میں پہنچے تو اس بات کا قریش کو پتہ چلا۔ خالد بن ولید کی سرکردگی میں دو سو افراد مکہ کی طرف مسلمانوں کی پیش رفت روکنے کے لیے مکہ کے قریبی پہاڑوں میں مورچہ زن ہو گئے۔ ظہر کے وقت حضرت بلال نے اذان دی اور پیغمبر اکرمؐ نے مسلمانوں کے ساتھ نماز ظہر با جماعت ادا کی۔ خالد بن ولید یہ منظر دیکھ کر

سوچ میں پڑ گیا اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مسلمانوں کے نزدیک نماز عصر بڑی قدر و منزلت رکھتی ہے یہاں تک کہ وہ اسے اپنی آنکھوں کی بینائی سے زیادہ محترم سمجھتے ہیں جب مسلمان حالت نماز میں ہوں ان کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بجلی کی سی تیزی سے ان کا کام تمام کر دو۔ اس موقع پر درج بالا آیت اتری اور مسلمانوں کو نماز خوف کا حکم دیا گیا یہ آیت ہر قسم کی غفلت کے دوران ہونے والے اچانک حملے سے متعلق ہے۔ اعجاز قرآن کا یہ ایک نکتہ ہے کہ دشمن کے کسی قدم اٹھانے سے پہلے اس کے منصوبے کو نقش بر آب کر دیا جائے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ خالد بن ولید یہ منظر دیکھ کر ایمان لے آیا اور مسلمان ہو گیا [1]

تفسیر

جہاد سے متعلق آیات کے بعد یہ آیت مسلمانوں کو نماز خوف کی تعلیم دے رہی ہے جسے دوران جنگ پڑھا جاتا ہے۔ آیت پیغمبر اکرم کو خطاب کرتے ہوئے کہتی ہے، جب آپ ان کے درمیان ہوں انھیں نماز پڑھائیں تو چاہیے کہ مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں پہلا حصہ مسلح ہو کر آپ کے ساتھ نماز کے لیے کھڑا ہو جائے (واذا کنت فیھم فاقمت لھم الصلوٰۃ فلتقم طائفۃ منھم معک ولیأخذوا اسلحتھم) پھر جب یہ گروہ سجدہ کرے (اور ان کی نماز کی پہلی رکعت مکمل ہو جائے تو آپ اپنی جگہ توقف کریں) اور وہ تیزی کے ساتھ دوسری رکعت مکمل کر کے میدان جہاد کی طرف پلٹ جائیں اور دشمن کا مقابلہ کریں) اور دوسرا گروہ جس نے نماز نہیں پڑھی وہ پہلے گروہ کی جگہ لے اور آپ کے ساتھ نماز پڑھے (فاذا سجدوا فلیکونوا من ورائکم ولتأت طائفۃ اخری لم یصلوا فلیصلوا معک) دوسرے گروہ کو بھی چاہیے کہ وہ دفاعی وسائل اور ہتھیار سنبھالے رکھے اور انھیں زمین پر نہ رکھ دے (ولیأخذوا حذرھم واسلحتھم) اس طرح نماز اس لیے پڑھی جاتی ہے تاکہ دشمن تمھیں غفلت میں زیر نہ کر سکے کیونکہ دشمن تو ہمیشہ اسی انتظار میں رہتا ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھائے اور وہ (دشمن) چاہتا ہے کہ تم اپنے ہتھیاروں اور سامان جنگ سے غافل ہو جاؤ اور وہ تم پر اچانک حملہ کر دے (ود الذین کفروا لو تغفلون عن اسلحتکم وامتعتکم فیمیلون علیکم میلۃ واحدۃ) لیکن چونکہ ہو سکتا ہے کہ کبھی ایسی صورت پیش آ پڑے کہ ہتھیار اور دفاعی وسائل کا اٹھائے رکھنا حالت نماز میں مشکل ہو یا کمزوری، بیماری اور زخموں کی وجہ سے (جو کہ جنگ میں لڑنے والوں کو آتے ہیں) ہتھیاروں اور دفاعی ساز و سامان کا اٹھائے رکھنا زحمت اور تکلیف کا باعث ہو لہٰذا آیت کے آخر میں یہ حکم دیتا ہے اور تمھارے لیے کوئی گناہ اور حرج نہیں کہ اگر بارش سے تمھیں تکلیف ہو یا بیمار ہو جاؤ تو اس حالت میں اپنے ہتھیار زمین پر رکھ دو (ولا جناح علیکم ان کان بکم اذی من مطر او کنتم مرضی ان تضعوا اسلحتکم) مگر پھر بھی ہر صورت میں تحفظ اور احتیاط کے وسائل (زرہ اور خود وغیرہ) اپنے پاس رکھنے سے غفلت نہ برتو یہاں تک کہ مجبوری کی حالت میں بھی انھیں اپنے پاس ضرور رکھو۔ اگر کبھی دشمن حملہ کرے تو تم مدد پہنچنے تک اپنی حفاظت کر سکو (وخذوا حذرکم) تم ان احکامات اور قوانین کو پلے باندھ لو اور مطمئن رہو کہ کامیابی تمھارے لیے ہے کیونکہ خدا نے کافروں کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب

---

[1] تفسیر تبیان جلد ۲ ص ۳۱۱ اور دیگر تفاسیر

مہیا کر رکھا ہے (ان اللہ اعد للکافرین عذابا مھینا)۔

چند اہم نکات

۱۔ نماز خوف ہر دور میں ہو سکتی ہے

واضح ہے کہ یہاں پیغمبر اکرمؐ کے مسلمانوں کے درمیان نماز خوف کے موقع پر موجود ہونے سے یہ مراد نہیں کہ یہ نماز ذات پیغمبر اکرمؐ کے وجود سے مشروط ہے بلکہ مراد سرفروشوں اور مجاہدین کے درمیان نماز با جماعت ادا کرنے کے لیے امام، پیشوا اور رہنما کا وجود ہے۔ اسی لیے تو حضرت علیؑ اور حضرت امام حسینؑ نے بھی نماز خوف ادا کی حتیٰ یہاں تک بعض اسلامی لشکروں کے کمانڈروں (مثلاً حضرت حذیفہ یمانی) نے اسی اسلامی عمل کو ضرورت کے وقت انجام دیا[1]

۲۔ دوران نماز خوف مسلح رہنے کے حکم میں فرق

آیت میں پہلے گروہ کو حکم ہوتا ہے کہ نماز خوف کے وقت ان کے پاس ہتھیار ہونے چاہئیں۔ لیکن دوسرے گروہ سے کہتا ہے کہ دفاعی ساز و سامان (مثلاً زرہ) اور ہتھیاروں کو زمین پر بالکل نہ رکھیں ممکن ہے کہ ان دونوں دستوں کا فرق اس وجہ سے ہو کہ پہلے گروہ کے نماز کو ادا کرتے وقت دشمن ابھی تک اس لائحہ عمل سے بے خبر ہو لہٰذا اس میں حملے کا احتمال بہت کم ہے لیکن دوسرے دستہ کے وقت جبکہ دشمن ادائیگی نماز پر متوجہ ہو جاتا ہے تو حملے کا احتمال بہت زیادہ ہے۔

۳۔ مال و متاع کی حفاظت

مال و متاع کی حفاظت سے مراد یہ ہے کہ اپنی حفاظت کے علاوہ دوسرے جنگی وسائل اور سفر کے ساز و سامان، غذائی ذخیرے اور جو حیوانات تمھارے ساتھ ہیں ان کی نگرانی بھی تمھیں کرنا ہے۔

۴۔ نماز با جماعت کی اہمیت

ہم جانتے ہیں کہ نماز با جماعت اسلام میں واجب نہیں ہے لیکن بہت زیادہ تاکیدی مستحبات میں ہے اور اوپر والی آیت اس کی ایک زندہ نشانی ہے اس اسلامی لائحہ عمل کی تاکید یہاں تک ہے کہ میدان جنگ میں بھی اس طریقے کی انجام دہی کیلیے نماز خوف سے استفادہ کیا جاتا ہے یہ امر اصل نماز اور جماعت دونوں کی اہمیت ظاہر کرتا ہے نیز اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آسمانی مجاہدین اپنے ہدف اور مقصد سے کس قدر وابستہ ہوتے ہیں نیز اس کام سے دشمنوں پر بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان میدانِ جنگ میں بھی اپنی ذمہ داریاں

---

[1] کنز العرفان جلد اول صفحہ ۱۹۱

ادا کرنے کا کس قدر اہتمام کرتے ہیں یہ عمل دشمنوں پر ایک خاص نفسیاتی اثر بھی مرتب کرتا ہے۔

نمازِ خوف کی کیفیت

اس آیت میں نمازِ خوف کے بارے میں کوئی زیادہ وضاحت موجود نہیں ہے اور یہی قرآن کا طریقہ ہے کہ وہ کلیات کو بیان کر کے ان کی تفصیل و تشریح سنت پر چھوڑ دیتا ہے نمازِ خوف کا جو طریقہ سنت سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ چار رکعتی نماز دو رکعتی نماز میں تبدیل ہو جاتی ہے پہلا گروہ پیش نماز کے ساتھ ایک رکعت پڑھ لیتا ہے اور پیش نماز ایک رکعت کے بعد توقف کرتا ہے اور وہ گروہ دوسری رکعت علیحدگی میں انجام دیتا ہے اور محاذِ جنگ کی طرف پلٹ جاتا ہے پھر دوسرا گروہ اس کی جگہ لے لیتا ہے اور وہ اپنی ایک رکعت پیش نماز کے ساتھ اور دوسری رکعت فرادیٰ انجام دیتا ہے (نمازِ خوف کی کیفیت کے بارے میں اور نظریے بھی ہیں لیکن ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے یہ مشہور ترین نظریہ ہے)۔

۱۰۳۔ فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ ۚ إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتٰبًا مَّوْقُوتًا ○

ترجمہ

۱۰۳۔ اور جب نماز ختم کر لو تو خدا کو کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور پہلو پر لیٹے ہوئے یاد کرو اور جس وقت میں اطمینان ہو جائے (اور خوف کی کیفیت ختم ہو جائے) تو نماز کو (معمول کے مطابق) انجام دو کیونکہ نماز مومنین کے لیے ثابت اور معین فریضہ ہے۔

تفسیر

فریضۂ نماز کی اہمیت

گذشتہ آیت میں نمازِ خوف کا حکم دیا گیا اور یہ بتایا گیا ہے کہ حالتِ جنگ میں بھی نماز قائم کرنا لازم ہے اس کے بعد اب اس آیت میں فرماتا ہے نماز کی ادائیگی کے بعد خدا کو بھول نہ جاؤ بلکہ کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور پہلو پر لیٹے ہوئے (بھی)

---

[1] "قیام" یعنی کھڑا ہونا) یہاں مصدری معنی رکھتا ہے اور قائم کی جمع بھی ہے (یعنی کھڑے ہونے والے) اور "قعود" بھی اسی طرح مصدر اور جمع دونوں معانی کے لیے ہے اور پر والی آیت میں دونوں معانی کا احتمال ہے۔

یاد خدا میں رہو اور اس سے مدد طلب کرو (فاذا قضيتم الصلوٰة فاذكروا الله قياما و قعودا و على جنوبكم) حالت قیام و قعود اور پہلو پر لیٹنے کے وقت یاد خدا سے مراد ممکن ہے کہ وہی استراحت کے اوقات ہوں جو میدانِ جنگ میں وقفوں میں ہوتے ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنگ کے مختلف حالات کے معنی میں ہو۔ جبکہ مجاہدین کبھی کھڑے ہو کر کبھی بیٹھ کر اور کبھی پہلو کے بل لیٹ کر مختلف جنگی ہتھیاروں کے ساتھ تیر اندازی کرتے ہیں۔

حقیقت میں اوپر والی آیت ایک اہم اسلامی حکم کی طرف اشارہ ہے کہ اوقات معینہ میں نماز پڑھنے کا یہ معنی نہیں ہے کہ باقی حالات میں انسان خدا سے غافل رہے نماز ایک انضباطی حکم ہے جو پروردگار کی طرف متوجہ ہونے کی روح انسان میں زندہ کرتا ہے اور ہو سکتا ہے اس سے نمازوں کے درمیانی فاصلوں میں دل میں یاد خدا باقی رہنے کی طرف اشارہ ہو چاہے میدان جنگ میں ہو اور چاہے میدانِ جنگ کے علاوہ کہیں ہو۔ متعدد روایات میں اس آیت کو بیماروں کے نماز پڑھنے کی کیفیت کے بارے میں قرار دیا گیا ہے۔

اگر ان میں توانائی ہو تو کھڑے ہو کر ورنہ بیٹھ کر اور اگر ایسا بھی نہیں کر سکتے تو پہلو کے بل لیٹ کر نماز ادا کریں۔ یہ تفسیر حقیقت میں آیت کے معنی کا ایک مفہوم کی نشاندہی اور وسعتِ معنی کی مظہر ہے اور آیت اس موقع کے لیے مخصوص نہیں ہے [1]

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ نماز خوف کا حکم ایک استثنائی حکم ہے اور جب حالت خوف ختم ہو جائے تو پھر نماز عمومی صورت میں ادا کی جائے (فاذا اطمأننتم فاقيموا الصلوٰة) اور آخر میں نماز کے بارے میں تاکید وقت کی گئی ہے اور وہ اس طرح ہے، کیونکہ نماز مومنین کے لیے ایک ثابت رہنے والا اور تغیر نہ ہونے والا فریضہ ہے (ان الصلوٰة كانت على المؤمنين كتابا موقوتا) لفظ "موقوت" "وقت" کے مادہ سے ہے اس بنا پر آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر تم دیکھتے ہو کہ میدانِ جنگ جیسی جگہ پر بھی مسلمانوں کو چاہیے کہ اس فریضہ (نماز) کو انجام دیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز کے اوقات معین ہیں کہ جن سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا [2]

لیکن متعدد روایات میں جو اس آیت کے ذیل میں وارد ہوئی ہیں موقوت کی ثابت اور واجب کے معنی میں تفسیر ہوئی ہے جو کہ آیت کے مفہوم کے ساتھ بھی مطابقت رکھتی ہے اور اس کا نتیجہ تقریباً پہلے معنی جیسا ہی ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ہم نماز کے فلسفہ، اہمیت اور اس کے تربیتی اثرات کے منکر نہیں ہیں لیکن کیا ضروری ہے کہ معین اوقات ہی میں اسے ادا کیا جائے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔ ہر شخص فرصت اور روحانی آمادگی کے وقت

---

۱ ان روایات پر مطلع ہونے کے لیے نور الثقلین جلد اول صفحہ ۵۴۵ کی طرف رجوع کریں۔

۲ کنز العرفان جلد اول ص ۹۵ میں اس معنی کی تائید کی گئی ہے اور تبیان اور مجمع البیان میں ایک قول کے عنوان سے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ ذمہ داری ادا کرے۔

تجربہ شاہد ہے کہ تربیتی مسائل اگر انضباط اور معین شرائط کے ماتحت نہ رکھے جائیں تو کچھ لوگ انھیں فراموش کر دیتے ہیں اور ان کی بنیاد اور اساس متزلزل ہوجاتی ہے لہذا اس قسم کے مسائل میں یقیناً معین اوقات اور سخت انضباط رکھا جانا چاہیے تاکہ کوئی شخص بھی انھیں ترک کرنے میں کوئی عذر اور بہانہ نہ کر سکے خصوصی طور پر ان عبادات کا معین اوقات میں سرانجام پانا اور خاص طور پر اجتماعی شکل میں ایک شکوہ اور عظمت کا حامل ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور حقیقت میں یہ چیز انسان سازی کے لیے ایک اہم درس اور تکنیک ہے۔

۱۰۴۔ وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ ۖ إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ ۖ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝

ترجمہ

۱۰۴۔ اور دشمن کا تعاقب کرنے میں سستی نہ کرو (کیونکہ) اگر تمھیں درد و رنج پہنچتا ہے تو انھیں بھی تمھاری طرح رنج و تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن تم (پھر بھی) خدا سے امید رکھتے ہو اور وہ نہیں رکھتے اور خدا دانا اور حکیم ہے۔

شان نزول

ہر ہتھیار کے مقابلے میں اس جیسا ہتھیار

ابن عباس اور کچھ دوسرے مفسرین نے نقل کیا ہے کہ جنگ اُحد کے دردناک حوادث کے بعد پیغمبر اکرمؐ کوہ احد کی چوٹی پر تشریف لے گئے اور ابوسفیان بھی پہاڑ پر چڑھ گیا اور فاتحانہ لہجے میں پکار کر کہنے لگا "اے محمد! ایک دن ہم کامیاب ہوئے اور دوسرے دن تم۔ یعنی ہماری یہ کامیابی اس شکست کے مقابلہ میں ہے جو ہمیں جنگ بدر میں ہوئی تھی۔ پیغمبر اکرمؐ نے مسلمانوں سے فرمایا: فوراً اسے جواب دو (گویا ابوسفیان پر آپ ثابت کر رہے تھے کہ میرے مکتب میں تربیت پانے والے بہت باخبر و آگاہ ہیں) مسلمانوں نے کہا ہماری اور تمھاری کیفیت ہرگز ایک جیسی نہیں ہے ہمارے شہید بہشت میں ہیں جبکہ تمھارے مقتول جہنم میں ہیں۔ ابوسفیان نے پکار کر یہ جملہ فخریہ نعرے کے طور پر کہا۔

"لنا العزیٰ و لا عزیٰ لکم"

"ہم بہت بڑا "عزیٰ" بت رکھتے ہیں اور تمھارے پاس وہ بھی نہیں"۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا تم بھی اس کے جواب میں کہو۔

"اللہ مولٰنا و لا مولیٰ لکم"

"ہمارا ولی و سرپرست خدا ہے اور ہمارا تکیہ خدا پر ہے اور تمہاری کوئی سرپرست نہیں، تمہاری کوئی تکیہ گاہ نہیں"

ابوسفیان نے جب اپنے آپ کو اس زندہ اسلامی شعار کے مقابلے میں بے بس اور کمزور پایا تو بُت "عزیٰ" کو چھوڑ کر بُت "ہبل" کے دامن کو جا پکڑا اور پکارا۔

"اعل ھبل"
"ہبل سربلند ہو"

پیغمبرؐ نے حکم دیا کہ اس جاہلانہ شعار کو مضبوط اور پختہ شعار کے ساتھ شکست دو اور کہو۔

"اللہ اعلیٰ و اجل"
"خدا برتر و بالا تر ہے"

ابوسفیان کو جب اپنے ان مختلف شعار سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو اس نے پکار کر کہا ہماری وعدہ گاہ "بدر صغریٰ" ہے۔ مسلمان میدان جنگ سے بہت سے زخم لے کر پلٹے وہ اُحد کے دردناک حوادث پر بہت دکھی تھے اسی وقت اوپر والی آیت نازل ہوئی جس میں انھیں بیدار کیا گیا کہ وہ مشرکین کا تعاقب کرنے میں کوتاہی نہ کریں اور اس دردناک واقعہ سے پریشان نہ ہوں۔ مسلمان اسی حالت میں دشمن کا پیچھا کرنے اٹھ کھڑے ہوئے اور جب اس کی اطلاع مشرکین کو پہنچی تو وہ بڑی تیزی کے ساتھ مدینہ سے دور نکل گئے اور مکہ کی طرف پلٹ گئے[1]

یہ شان نزول ہمیں تعلیم دیتی ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ دشمن کی کسی تکنیک سے بے خبر نہ ہوں اور ان کی جنگ کے ہر ذریعہ کے مقابل چاہے وہ جسمانی جنگ ہو یا نفسیاتی اس سے زیادہ مضبوط اور غلبہ پانے والا ذریعہ اپنائیں۔ دشمنوں کی منطق کے مقابلے میں زیادہ ٹھوس منطق اور ان کے ہتھیار کے مقابلے میں بہتر ہتھیار استعمال کریں۔ یہاں تک کہ ان کے نعرے کے مقابلے میں زیادہ نعرہ اپنائیں ورنہ واقعات دشمن کے فائدہ میں چلے جائیں گے۔

لہٰذا ہمارے زمانے میں بھی مسلمانوں کو جن دردناک حوادث اور وحشت ناک مفاسد نے گھیر رکھا ہے بجائے اس کے کہ افسوس کرتے رہیں فعالیت سے کام لیں غلط کتابوں اور مطبوعات کے مقابلے میں صحیح کتب اور مطبوعات فراہم کریں۔ دشمنوں کے پراپیگنڈہ کے جدید ذرائع کے مقابلے میں آج کے جدید ترین تبلیغاتی وسائل کو کام میں لائیں اور غلط مراکز کے مقابلے میں تفریح کے صحیح ذرائع اپنے نوجوانوں کے لیے فراہم کریں اور ان کے منصوبوں، سازشوں اور حیلوں کے مقابلے میں موجودہ زمانے کی مناسبت سے جامع اسلامی منصوبے پیش کریں جو مختلف سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی نظریات رکھنے والوں کا مقابلہ کر سکیں۔ صرف انھی طریقوں سے ہم اپنے وجود کا تحفظ کر سکتے ہیں اور ہمیں چاہیے کہ ہم قیادت کرنے والے طبقہ کی حیثیت سے آج کی دنیا میں آگے بڑھیں۔

---

[1] تبیان جلد سوم صفحہ ۳۱۴، مجمع البیان جلد سوم صفحہ ۱۰۵

تفسیر

جہاد اور ہجرت سے متعلق آیات کے بعد زیر نظر آیت میں مسلمانوں میں وفاداری کی روح بیدار کرنے کے لیے کہا گیا ہے، دشمن کا تعاقب کرنے میں سستی نہ کرو (ولا تهنوا فی ابتغاء القوم) یہ اس طرف اشارہ ہے کہ کبھی بھی سخت ترین دشمن کے مقابلے میں دفاعی حالت کو نہ اپناؤ بلکہ ہمیشہ اس قسم کے افراد کے مقابلے میں یورش کرکے اور بڑھ کر حملہ کرکے اپنی حفاظت کرو کیونکہ نفسیاتی طور پر یہ حربہ دشمن کے حوصلے پست کرنے کے لیے بہت مؤثر ہے جس طرح اُحد کے واقعہ میں شدید شکست کے بعد اس روش پر چل کر فائدہ اٹھایا گیا وہ دشمنانِ اسلام جنہوں نے جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد میدان جنگ چھوڑ دیا اور راستے میں میدان جنگ کی طرف پلٹنے کی جو فکر ان میں پیدا ہوئی وہ ان کے دماغ سے نکل گئی اور وہ بڑی تیزی کے ساتھ مدینہ سے دور ہٹ گئے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک زندہ اور واضح استدلال اس حکم کے سبب بیان کرتے ہوئے فرمایا، تم کیوں کاہل بنتے ہو حالانکہ اگر تم میدان جہاد میں درد و رنج میں گرفتار ہوئے ہو تو تمہارے دشمن بھی پریشانیوں میں مبتلا تھے لیکن اس میں فرق یہ ہے کہ تمہیں تو پھر بھی پروردگار عالم کی زیادہ سے زیادہ مدد و رحمت کی امید تھی لیکن وہ تو اس امید سے بھی محروم تھے (ان تکونوا تالمون فانهم یألمون کما تألمون و ترجون من الله ما لا یرجون) اور آخر میں زیادہ تاکید کے لیے فرماتا ہے:

یہ بات نہ بھولنا کہ تمہاری یہ تمام پریشانیاں، تکلیفیں، زحمتیں اور بعض اوقات کاہلی اور چشم پوشیاں خدا کی نظر سے مخفی نہیں (وکان الله علیما حکیما) لہٰذا ان سب کا نتیجہ تم دیکھو گے۔

۱۰۵۔ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىکَ اللّٰہُ ؕ وَ لَا تَکُنۡ لِّلۡخَآئِنِیۡنَ خَصِیۡمًا ۙ

۱۰۶۔ وَّ اسۡتَغۡفِرِ اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ۚ

ترجمہ

۱۰۵۔ ہم نے یہ کتاب تم پر حق کے ساتھ نازل کی تاکہ اس کے ساتھ جو خدا نے تجھے علم دیا ہے لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور خیانت کرنے والوں کے حامی نہ بنو۔

۱۰۶۔ اور خدا سے مغفرت طلب کرو کہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

شانِ نزول

زیر نظر آیات کی شانِ نزول کے بارے میں ایک طویل واقعہ نقل ہوا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

قبیلہ بنی ابیرق نسبتاً ایک مشہور قبیلہ تھا اس قبیلہ کے تین بھائی بشر، بشیر، مبشر نامی تھے۔ بشیر ایک مسلمان رفاعہ کے گھر میں داخل ہوا اور تلوار، زرہ اور کچھ خوراک چوری کر لیں۔ اس کے بھتیجے "قتادہ" نے جو مجاہدین بدر میں سے تھا یہ واقعہ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں بیان کیا لیکن ان تین بھائیوں نے اپنے ایک پڑوسی صاحب ایمان مسلمان لبید پر اس معاملے میں تہمت لگائی۔ لبید اس ناروا تہمت سے بہت زیادہ برہم ہوا اور تلوار نکال کر اس کے پاس آیا اور چیخ کر کہا: تم مجھ پر چوری کی تہمت لگاتے ہو، حالانکہ اس الزام کے زیادہ اہل تم ہو اور تم وہی منافق ہو جو پیغمبر خدا کی ہجو کہتے تھے اور پھر ہجو کے اشعار کو قریش سے منسوب کر دیتے تھے یا تو اس تہمت کو جو تم نے مجھ پر لگائی ہے ثابت کرو ورنہ میں اپنی تلوار تمھیں گھونپ دوں گا چور کے بھائیوں نے جب یہ صورت حال دیکھی تو لبید سے نرمی کا سلوک کیا لیکن جب انھیں یہ خبر ملی کہ واقعہ قتادہ کے ذریعے پیغمبر اکرمؐ کے گوش گزار ہو چکا ہے تو وہ اپنے قبیلے کے ایک خطیب کے پاس گئے کہ وہ چند افراد کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں جائے اور قبائلی عصبیت سے حقیقی چوروں کو بری الذمہ قرار دے اور کہے کہ قتادہ نے جھوٹا الزام لگایا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے (ظاہر پر عمل کرنے کے فریضہ) کے مطابق اس گروہ کی شہادت کو قبول کر لیا اور قتادہ کو سزا کا مستحق قرار دیا، قتادہ جو بے گناہ تھا اس سے بہت پریشان ہوا اور اپنے چچا کے پاس لوٹ کر گیا اور بہت زیادہ افسوس کے ساتھ واقعہ بیان کیا تو اس کے چچا نے اس کی دلجوئی کی اور کہا کہ پریشان نہ ہو خدا ہمارا نگہبان ہے اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور اس بے گناہ شخص کو بری الذمہ قرار دیا اور حقیقی خیانت کرنے والوں کی شدید سرزنش کی۔

اس آیت کی ایک اور شان نزول (بھی) نقل ہوئی ہے کہ ایک انصاری کی زرہ کسی جنگ میں چوری ہو گئی۔ شک بنی ابیرق قبیلہ کے ایک شخص پر تھا۔ چور کو جب خطرہ نظر آیا تو اس نے وہ زرہ ایک یہودی کے گھر میں پھینک دی اور اپنے قبیلہ والوں سے کہا کہ پیغمبر اکرمؐ کے سامنے اس کی صفائی دیں اور کہیں کہ زرہ تو یہودی کے گھر میں ہے اس لیے وہ بری الذمہ ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے جب یہ صورت دیکھی تو ظاہری طور پر اسے بری الذمہ قرار دیا اور یہودی کے خلاف فیصلہ دیا اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور حقیقت کو واضح کیا۔

تفسیر

خیانت کرنے والوں کی حمایت نہ کرو

خدا ان آیات میں پہلے تو پیغمبر اکرمؐ کو وصیت کرتا ہے کہ اس آسمانی کتاب کو بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان حق و انصاف کے اصول جاری ہوں: ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تم پر نازل کی ہے تاکہ اس کے ذریعے خدا نے تجھے جو علم دیا ہے لوگوں کے درمیان فیصلے کرو (انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما ارٰک اللہ) اس کے بعد کہتا ہے کبھی بھی خیانت کرنے والوں کی حمایت نہ کرو (ولا تکن للخائنین خصیما) اگرچہ بظاہر روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہے لیکن اس میں شک وشبہ نہیں کہ یہ ایک عمومی حکم ہے جو تمام قاضیوں اور فیصلہ کرنے والوں کے لیے ہے اس بنا پر اس قسم کے خطاب کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ممکن ہے کہ اس قسم کا معاملہ پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ پیش آیا ہے کیونکہ اس مذکورہ حکم کا

تعلق تمام افراد سے ہے۔

بعد والی آیت میں پیغمبر اکرمؐ کو بارگاہِ خداوندی سے طلب مغفرت کے لیے کہا گیا ہے (واستغفر اللہ) کیونکہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے (ان اللہ کان غفورًا رحیمًا)۔

یہ کہ یہاں استغفار کس لیے ہے اس میں کئی احتمال ہیں:

پہلا یہ کہ استغفار اس ترکِ اولیٰ کی بنا پر ہے جو فیصلہ میں جلدی کرنے کی وجہ سے آیات کی شانِ نزول کے بارے میں آیا ہے یعنی اگرچہ وہی اعتراف کی نوعیت اور طرفین کی گواہی تمہارے فیصلہ کرنے کے لیے کافی تھی لیکن بہتر یہ تھا کہ پھر بھی اس معاملے میں مزید تحقیق کی جاتی[2]

دوسرا یہ کہ پیغمبر اکرمؐ نے اسی شانِ نزول کے متعلق اسلام کے قضائی قوانین کے مطابق فیصلہ کیا اور چونکہ خیانت کرنے والوں کی سند اور ثبوت ظاہری طور پر زیادہ مستحکم تھے لہٰذا انہیں حق بجانب قرار دیا گیا پھر حق کے سامنے آجانے اور حق داروں کو حق مل جانے کے بعد حکم دیتا ہے کہ خدا سے مغفرت طلب کرو نہ کہ اس بنا پر کہ کوئی گناہ سرزد ہوا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ بعض لوگوں کی سازش کی وجہ سے ایک مسلمان کا حق سلب ہو رہا تھا (یعنی استغفار حکم واقعی ہے نہ کہ حکم ظاہری)۔

یہ احتمال بھی بیان ہوا ہے کہ یہاں استغفار کا حکم طرفینِ دعویٰ کو دیا گیا ہے جنہوں نے دعویٰ پیش کیا اور پھر اس سلسلے میں کئی ایک غلط گواہیاں دیں۔ پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث میں منقول ہوا ہے آپ نے فرمایا:

انما انا بشر و انکم تختصمون الی و لعل بعضکم یکون الحن بحجتہ من بعض فاقضی نحو ما اسمع فمن قضیت لہ من حق اخیہ شیئا فلا یاخذہ فانما اقطع لہ قطعۃ من النار۔

میں تمہاری طرح ایک بشر ہوں (اور ظاہری امور پر فیصلے کرنے پر مامور ہوں) شاید تم میں سے بعض وہی دلیل بیان کرتے وقت بعض دوسروں سے زیادہ قوی ہوں اور میں بھی اسی دلیل کی بنا پر فیصلہ کروں گا باوجود اس کے جان لو کہ میرا فیصلہ جو طرفین کے دلائل کے سامنے آنے پر صادر ہوتا ہے وہ واقعی حق کو نہیں بدل سکتا لہٰذا اگر میں کسی کے حق میں (ظاہر کے مطابق) فیصلہ کر دوں اور دوسرے کا حق اسے دے دوں تو میں جہنم کی آگ کا ایک ٹکڑا اسے دے رہا ہوں اسے چاہیے کہ وہ اس سے بچے اور نہ لے[1]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ظاہر کے مطابق اور دعویٰ کرنے والے طرفین کے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کریں۔ البتہ اس قسم کے فیصلوں سے عام طور پر حق دار کو حق مل جاتا ہے لیکن پھر بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات ظاہری دلیل اور گواہوں کی گواہی واقع کے مطابق نہ ہو تو یہاں خیال کرنا چاہیے کہ فیصلہ کرنے والے کا حکم واقع کو نہیں بدل سکتا اور اس سے حق، باطل اور باطل حق نہیں ہو سکتا۔

---

[1] المنار ج ۵ ص ۳۹۴ منقول از صحیح بخاری و صحیح مسلم

[2] پہلا احتمال اور شانِ نزول والی روایات اور اس روایت کا ظہور قرآ اور مذہب کے خلاف ہے کیونکہ آنحضرت بنصوص قرآن ترکِ اولیٰ سے بھی معصوم تھے (مترجم)

۱۰۷۔ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنْفُسَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ۝

۱۰۸۔ يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ۝

۱۰۹۔ هَا أَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَمَنْ يُجَادِلُ اللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَمْ مَنْ يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ۝

ترجمہ

۱۰۷۔ اور جنھوں نے اپنے آپ سے خیانت کی ہے ان کا دفاع نہ کرو، کیونکہ خدا خیانت کرنے والے گنہ گاروں کو دوست نہیں رکھتا۔

۱۰۸۔ وہ اپنے بُرے کاموں کو لوگوں سے چھپاتے ہیں لیکن خدا سے نہیں چھپاتے اور رات کی مجالس میں ایسی باتیں کرتے تھے جن سے خدا راضی نہ تھا خدا ان کے ساتھ تھا اور وہ جو عمل کرتے ہیں خدا اس پر محیط ہے۔

۱۰۹۔ جی ہاں تم تو وہی ہو جنھوں نے اس جہان کی زندگی میں ان کو بچایا لیکن کون ہے جو خدا کے سامنے قیامت کے دن ان کا دفاع کرے گا یا کون ہے جو ان کا وکیل اور حامی ہوگا۔

تفسیر

خیانت کرنے والوں کی حمایت نہ کرنے کے احکامات کے بعد ان آیات میں اس سلسلہ کو یوں جاری رکھا گیا ہے کہ کسی وقت بھی خیانت کرنے والوں کی اور ان کی جو اپنے آپ سے خیانت کرتے ہیں، حمایت نہ کرو۔ (ولا تجادل عن الذین یختانون انفسھم) کیونکہ خدا خیانت کرنے والے گنہ گاروں کو پسند نہیں کرتا (ان اللہ لا یحب من کان خوانا اثیما)۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ خدا اس آیت میں فرماتا ہے، وہ لوگ جو اپنے آپ سے خیانت کرتے ہیں، حالانکہ ہم آیت کی شانِ نزول کے مطابق جانتے ہیں کہ انھوں نے دوسروں سے خیانت کی تھی یہ اسی لطیف معنی کی طرف اشارہ ہے کہ جس کی قرآن نے بارہا یاد دہانی کرائی ہے کہ انسان سے جو بھی عمل سرزد ہو اس کے اچھے یا بُرے آثار معنوی ہوں یا مادی ہر ایک سے پہلے خود اس پر

ثر انداز ہوں گے جیسا کہ دوسرے مقام پر فرماتا ہے:

ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اسأتم فلها۔

اگر نیک کام کرتے ہو تو اپنے نفوس کے لیے کرتے ہو اور اگر برائی کرو تو بھی اپنے نفس کے لیے ہے۔ [1]

یا یہ ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ جس کی قرآن تائید کرتا ہے اور وہ یہ کہ تمام افراد ایک جسم کے مختلف اعضاء کی طرح ہیں اگر ایک کسی دوسرے کو کوئی تکلیف پہنچاتا ہے تو اس طرح خود اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ بعینہ اس شخص کی طرح جو اپنے ہاتھ سے اپنے منہ پر تھپڑ مارے۔ ایک اور نکتہ یہ ہے کہ آیت ان افراد کے بارے میں نہیں کہ جو مثلاً ایک ہی دفعہ خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں اور پھر اس پر پشیمان ہو گئے ہوں کیونکہ ایسے اشخاص کے بارے میں سختی نہیں بلکہ نرمی برتنی چاہیے۔ آیت تو ان افراد کے بارے میں ہے جن کی زندگی کا لائحہ عمل ہی خیانت ہے "یختانون" کے قرینہ سے جو کہ فعل مضارع ہے اور ہمیشگی پر دلالت کرتا ہے اور "خوان" کے قرینہ سے بھی جو کہ مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس کا معنی ہے "بہت خیانت کرنے والا"۔ "آثیما" کا معنی "گنہگار" ہے یہ "خوان" کی تاکید کے طور پر ذکر ہوا ہے۔ گذشتہ آیت میں بھی اسے خائن قرار دیا گیا ہے اور خائن اسم فاعل ہے اور وصفی معنی رکھتا ہے نیز تکرار عمل کی علامت ہے۔ پھر ایسے خیانت کاروں کی سرزنش کرتے ہوئے کہتا ہے انھیں شرم آتی ہے کہ ان کے اعمال کا باطن لوگوں کے سامنے ظاہر ہو لیکن وہ خدا سے تو شرم نہیں کرتے (یستخفون من الناس ولا یستخفون من اللہ)۔ وہ خدا جو ہر جگہ ان کے ساتھ ہے اور جس وقت رات کی تاریکی میں وہ خیانت کار سازشیں اور منصوبے بناتے تھے اور وہ باتیں کرتے ہیں کہ جن سے خدا راضی نہیں وہ (خدا) ان کے ساتھ تھا اور وہ ان کے تمام اعمال پر محیط ہے (وھو معھم اذ یبیتون ما لا یرضی من القول وکان اللہ بما یعملون محیطا) اس کے بعد روئے سخن چور کے قبیلے کے ان افراد کی طرف ہے جنھوں نے اس کا دفاع کیا تھا۔ خدا انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے تعجب ہے کہ تم اس جہان کی زندگی میں تو ان کا دفاع کرتے ہو، لیکن کون ہے جو قیامت کے دن ان کا دفاع کرے یا وکیل بن کر ان کے کام آئے اور ان کی مصیبتوں اور ابتلاؤں کو ختم کرے (ھا انتم ھؤلاء جادلتم عنھم فی الحیوۃ الدنیا فمن یجادل اللہ عنھم یوم القیامۃ ام من یکون علیھم وکیلا) اس وجہ سے تمہاری طرف سے ان کا دفاع معمولی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ دائمی زندگی میں خدا کے سامنے ان کا کوئی دفاع کرنے والا نہیں ہے۔

حقیقت میں اوپر والی تین آیات میں پہلے تو پیغمبر اسلامؐ اور سب قاضیوں کو حق کی وصیت کی گئی ہے کہ وہ مکمل طور پر نگرانی اور دھیان رکھیں کہ کچھ لوگ حیلہ سازی اور جھوٹے گواہوں کے ذریعے دوسروں کے حقوق پائمال نہ کریں پھر خیانت کرنیوالوں اور بعد میں ان کا دفاع کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اس جہان اور دوسرے جہان میں اپنے اعمال کے برے نتائج پر نظر رکھیں۔

---

[1] بنی اسرائیل ، ۷

اور یہ بلاغت قرآن کا ایک راز ہے کہ ہر واقعہ میں چاہے وہ ظاہراً کتنا ہی معمولی اور چھوٹا ہو وہ ایک ذرہ بھر یا تھوڑے سے اناج کے گرد گھومتا ہو، یا اس میں ایک یہودی اور دشمن اسلام کا ہاتھ ہو اس کے تمام پہلوؤں پر کھوج اور تحقیق کرتے ہوئے پوری توجہ دلاتا ہے اور ہر موقع پر خطرے سے آگاہ کرتا ہے۔ خدا کے عظیم پیغمبر سے لے کر جس کا دامن عصمت کی بنا پر ہر قسم کے گناہ سے پاک ہے خیانت پیشہ گنہگار افراد اور ان لوگوں تک جو رشتہ داری کے تعصبات کی وجہ سے اس قسم کے افراد کا دفاع کرتے ہیں ہر ایک پر اس کی مناسبت سے بحث کرتا ہے۔

۱۱۰۔ وَمَنْ يَعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○

۱۱۱۔ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○

۱۱۲۔ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ○

ترجمہ

۱۱۰۔ جو شخص کوئی برا کام کرے یا اپنے اوپر ظلم کرے پھر خدا سے مغفرت طلب کرے تو وہ خدا کو بخشنے والا اور مہربان پائے گا۔

۱۱۱۔ اور جو کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے اور خدا دانا و حکیم ہے۔

۱۱۲۔ جو شخص غلطی یا گناہ کا مرتکب ہو پھر بے گناہ پر الزام دھرے اس نے بہتان اور واضح گناہ کا بوجھ اپنے کندھوں پر لاد لیا ہے۔

تفسیر

ان تین آیات میں خیانت اور تہمت سے متعلق بحث کے بعد جو گذشتہ آیات میں ہو چکی ہے۔ تین عمومی احکامات بیان ہوئے ہیں۔

۱۔ پہلے تو اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ توبہ کی راہ بدکار لوگوں کے لیے ہر حال کھلی ہے اور جو شخص اپنے اوپر

یا کسی دوسرے پر ظلم کرے اور بعد میں حقیقتاً پشیمان ہو اور خدا سے مغفرت طلب کرے اور وہ اس کی تلافی کی کوشش بھی کرے تو وہ خدا کو بخشنے والا اور مہربان پائے گا (و من یعمل سوءا او یظلم نفسہ ثم یستغفر اللہ یجد اللہ غفورا رحیما)۔ غور کرنا چاہیے کہ آیت میں دو چیزیں بیان ہوئی ہیں ایک "سوء" اور دوسری کسی پر ظلم ۔ قرینہ مقابلہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور "سوء" کے اصل لغوی معنی (دوسرے کو نقصان پہنچانا) سے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کا گناہ جس سے انسان دوسرے کو نقصان پہنچائے یا اپنے آپ کو وہ حقیقی توبہ اور تلافی کی صورت میں قابلِ بخشش ہے ۔

ضمنی طور پر یجد اللہ غفورا رحیما (خدا کو بخشنے والا، مہربان پائے گا) سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی توبہ یہ اثر رکھتی ہے کہ انسان اپنے نفس کے اندر ہی اس کا نتیجہ پا لیتا ہے ایک طرف خدا کے غفور ہونے کے تصور سے گناہ کا پریشان کن اثر زائل ہو جاتا ہے اور دوسری طرف وہ محسوس کرتا ہے کہ معصیت کے سبب وہ رحمت والطاف الٰہی سے دور ہو گیا تھا اور اب اس کی توبہ کی وجہ سے دوریاں ختم ہو گئی ہیں اور وہ خدا کے نزدیک ہو گیا ہے ۔

۲۔ دوسری آیت اس حقیقت کی وضاحت ہے کہ جس کا اجمال گذشتہ آیات میں ہو چکا ہے اور وہ یہ ہے کہ " انسان جس گناہ کا مرتکب ہوتا ہے نتیجتاً اس سے اپنے آپ کو مزید نقصان میں مبتلا کر لیتا ہے (و من یکسب اثما فانما یکسبہ علی نفسہ) اور آیت کے آخر میں فرماتا ہے کہ خدا عالم ہے اور بندوں کے اعمال سے باخبر ہے اور وہ حکیم و دانا بھی ہے اور ہر شخص کو اس کے استحقاق کے مطابق سزا و جزا دیتا ہے (و کان اللہ علیما حکیما)۔

اس طرح گناہ اگرچہ ظاہر میں مختلف ہیں کبھی کسی گناہ کا نقصان دوسروں کو پہنچتا ہے اور کبھی اس کا نقصان اپنے آپ کو ہوتا ہے۔ لیکن اس کا حقیقی اور آخری نتیجہ بہرحال خود انسان کے اپنی طرف لوٹتا ہے اور گناہ کے برے اثرات سب سے پہلے خود انسان کی روح اور نفس میں ظاہر ہوتے ہیں [1]

۳۔ آخری آیت میں بے گناہ افراد پر تہمت لگانے کے گناہ کی شدت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے جو شخص خطا یا گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور اسے کسی بے گناہ کے سر تھوپتا ہے اس نے بہتان باندھا ہے اور واضح گناہ کا ارتکاب کیا ہے (و من یکسب خطیئۃ او اثما ثم یرم بہ بریئا فقد احتمل بھتانا و اثما مبینا) اس آیت میں وہ گناہ کہ جن کا انسان مرتکب ہوا ہو اور پھر انہیں دوسرے کے سر تھوپ دے ان کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں ۔ ایک خطیئۃ اور دوسرا اثم ان دونوں کے درمیان فرق کے سلسلہ میں مفسرین اور اہل لغت میں بہت اختلاف ہے جو معنی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ "خطیئۃ" "خطاء" سے ہے جو در اصل ان گناہوں اور لغزشوں کے معنی میں ہے جو انسان سے قصد اور ارادہ کے بغیر سرزد ہو جائیں اور بعض اوقات ان کا کفارہ اور تاوان ادا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن بتدریج خطیئۃ کے معنی میں

---

[1] شعلۂ اول نصیبِ دامن آتش زنہ است ۔ ایں سزا نے آں کہ بوسہ آستانِ ظلم را ۔ آگ کا پہلا شعلہ جلانے والے کے دامن کو جلاتا ہے ۔ آستانہ ظلم پر بوسہ دینے کی یہی سزا ہے۔

وسعت پیدا ہوگئی اور وہ ہر گناہ کے بارے میں استعمال ہونے لگا چاہے وہ عمداً ہو یا بھول کر۔ کیونکہ کسی قسم کا گناہ (چاہے وہ عمداً ہو یا بھول کر) انسان کی روح سلیم کے لیے مناسب نہیں ہے اور اگر اس سے سرزد ہو جائے تو حقیقت میں ایک قسم کی لغزش اور خطا ہے جو اس کے مقام و مرتبے کے منافی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خطیئہ کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں عمدی اور غیر عمدی گناہ دونوں شامل ہیں۔ لیکن اثم عموماً عمدی اور اختیاری گناہوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ دراصل اثم ایسی چیز کے معنی میں ہے جو انسان کو کسی کام سے باز رکھے اور چونکہ گناہ انسان کو بھلائی کے اور اچھے کاموں سے دور رکھتے ہیں لہٰذا انھیں "اثم" کہا جاتا ہے۔

ضمناً توجہ کرنی چاہیے کہ آیت میں تہمت کے بارے میں ایک لطیف تعبیر استعمال کی گئی ہے اور وہ یہ کہ گناہ کو تیر کی طرح قرار دیا گیا ہے اور دوسرے کی طرف اس کی نسبت دینے کو تیر ہدف کی طرف چھوڑنے کی طرح قرار دے کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جس طرح کسی کی طرف تیر پھینکنا ممکن ہے اسے ختم کر دے اسی طرح گناہ کے تیر کو بھی کسی ایسے شخص کی طرف چھوڑنا جو گناہ کا مرتکب نہیں ہوا ممکن ہے کہ اس کی عزت اور آبرو کو برباد کر دے جو دراصل اس کے قتل کی طرح ہے۔ واضح ہے اس عمل کا بوجھ ہمیشہ کے لیے ایسے شخص کے کندھے پر باقی رہے گا جس نے تہمت لگائی ہے اور "احتمل" (اپنے کندھے پر اٹھاتا ہے) یہ لفظ بھی اس ذمہ داری کی اہمیت اور اس کے ہمیشہ قائم رہنے کی طرف اشارہ ہے۔

جُرم تہمت

کسی بے گناہ پر تہمت باندھنا بدترین افعال میں سے ہے کہ جس کی اسلام نے شدت سے مذمت کی ہے۔ زیر نظر آیت اور متعدد اسلامی روایات جو اس ضمن میں ملتی ہیں اس کے لیے اسلام کا نظریہ واضح کرتی ہیں۔ امام صادقؑ ایک حکیم و دانا سے نقل کرتے ہیں:

البهتان علی البریٔ اثقل من جبال راسیات

بے گناہ پر بہتان باندھنا عظیم پہاڑوں سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ [۱]

بے گناہ افراد پر بہتان باندھنا روح ایمان کے منافی ہے جیسا کہ امام صادقؑ سے منقول ہے:

اذا اتهم المؤمن اخاه انماث الایمان فی قلبه کما ینماث الملح فی الماء

جو شخص اپنے مومن بھائی پر تہمت لگاتا ہے تو ایمان اس کے دل میں اس طرح گھل جاتا ہے جس طرح نمک پانی میں گھل جاتا ہے [۲]

حقیقت میں بہتان اور تہمت، جھوٹ کی بدترین اقسام میں سے ہے کیونکہ اس میں جھوٹ کے عظیم مفاسد اور غیبت کے نقصانات بھی شامل ہیں اور یہ ظلم و ستم کی بدترین قسم بھی ہے اس لیے پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے، آپؐ نے فرمایا:

---

[۱] سفینۃ البحار۔ جلد اوّل مادہ "بہت"

[۲] اصول کافی جلد ۲ ص ۲۶۹ باب التهمة و سوء الظن

من بهت مؤمنا او مؤمنة او قال فيهما ما ليس فيهما اقامه الله تعالى يوم القيمة على تل من نار حتى يخرج مما قاله

جو شخص کسی مومن مرد یا عورت پر بہتان باندھے یا ان کے بارے میں کوئی ایسی بات کہے جو ان میں نہ ہو تو خداوند عالم اسے قیامت کے دن آگ کے ایک ٹیلے پر کھڑا کر دے گا۔ یہاں تک کہ وہ اس بات سے بری الذمہ ہو جائے جو اس نے کہی ہے [1]

حقیقت میں اس گھٹیا اور مذموم کام کے رائج ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کا نظم و نسق اور اجتماعی انصاف برباد ہو جاتا ہے حق اور باطل آپس میں خلط ملط ہو جاتے ہیں بے گناہ افراد گرفتارِ بلا ہو جاتے ہیں گنہگار افراد چھپے رہتے ہیں اور باہمی اعتماد ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

۱۱۳۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ○

ترجمہ

۱۱۳۔ اگر خدا کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شاملِ حال نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ پختہ ارادہ کر چکا تھا کہ وہ تمہیں گمراہ کر دے لیکن وہ اپنے سوا کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے اور وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور خدا نے کتاب و حکمت تم پر نازل کی اور تمہیں اس چیز کی تعلیم دی جو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر خدا کا عظیم فضل تھا۔

تفسیر

یہ آیت بنی ابیرق کے حادثہ کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ قبل کی چند آیات کی شان نزول میں اس کی نشاندہی کی جا چکی ہے۔

آیت کہتی ہے، اگر خدا کا فضل اور رحمت تمہارے شامل حال نہ، تا تو (منافقین یا ان جیسے) بعض لوگ مصمم ارادہ کر چکے

---

[1] سفینۃ البحار جلد اول صفحہ ۱۱۱

بیٹھے کہ تمہیں راہِ حق و عدالت سے منحرف کر دیں لیکن لطفِ الٰہی تمہارے شاملِ حال رہا اور اس نے تمہاری حفاظت کی (ولو لا فضل اللہ علیک و رحمتہ لھمت طائفۃ منھم ان یضلوک)۔

وہ چاہتے تھے کہ ایک بے گناہ شخص پر تہمت لگائیں اور پھر پیغمبرؐ کو اس واقعے میں ملوث کریں تاکہ اس طرح ایک تو پیغمبر اکرمؐ کی اجتماعی اور معنوی حیثیت کو نقصان پہنچے اور دوسرا ایک بے گناہ مسلمان کے ذریعے اپنی بُری اغراض پوری کر سکیں لیکن وہ خدا جو اپنے پیغمبرؐ کا محافظ ہے اس نے ان کے منصوبوں کو نقش بر آب کر دیا۔

بعض نے اس آیت کی ایک اور شانِ نزول بھی ذکر کی ہے، وہ یہ ہے کہ،

قبیلہ بنی ثقیف کا ایک وفد پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: ہم دو شرطوں کے ساتھ آپ کی بیعت کے لیے تیار ہیں پہلی یہ کہ ہم اپنے بت اپنے ہاتھ سے نہیں توڑیں گے اور دوسری یہ کہ ہمیں اجازت دیں کہ ہم مزید ایک سال تک عزّٰی بُت کی پرستش کرتے رہیں۔

خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیا کہ ان تجاویز کے لیے کوئی میلان ظاہر نہ کریں۔

اسی ضمن میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں پیغمبر اکرمؐ سے کہا گیا کہ لطفِ خدا آپؐ کو ان وسوسوں سے محفوظ رکھے گا۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: یہ لوگ صرف اپنے آپ کو گمراہ کرتے ہیں اور آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے (وما یضلون الا انفسھم و ما یضرونک من شیء)۔

آخر میں گمراہی، خطا اور گناہ سے پیغمبرؐ کے محفوظ رہنے اور پیغمبرؐ کی معنویت کی علت بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: آپ پر خدا نے کتاب و حکمت نازل کی اور جو آپ نہیں جانتے تھے آپ کو اس کی تعلیم دی (و انزل اللہ علیک الکتاب والحکمۃ وعلمک مالم تکن تعلم)۔

بعد ازاں فرماتا ہے: آپ پر اللہ کا بہت ہی زیادہ فضل و کرم تھا (وکان فضل اللہ علیک عظیماً)۔

انبیاءؑ کا سرچشمۂ عصمت

مندرجہ بالا آیت ان آیات میں سے ہے جو نبی کے خطا، اشتباہ اور گناہ سے محفوظ ہونے کی نشاندہی کرتی ہیں ارشاد ہوتا ہے: اگر خدا کی امداد تمہارے شاملِ حال نہ ہوتی تو وہ تمہیں گمراہ کر دیتے لیکن امدادِ الٰہی کی وجہ سے وہ تمہیں گمراہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اور اس سلسلے میں تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

اس طرح سے دراصل خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو خطا اور گناہ سے محفوظ رکھا ہے تاکہ،

— پیغمبر امت کے لیے نمونۂ عمل بن سکے اور نیکیوں اور بھلائیوں کے لیے امت کے واسطے ایک معیار قرار پا سکے۔

— ایک عظیم رہبر کی حیثیت سے لغزشوں کے المناک انجام اور نتیجے سے محفوظ رہ سکے۔ یوں اُمت بھی اطاعتِ پیغمبر میں سرگردانی سے مامون رہے اور اطاعت و عدمِ اطاعت کے تضاد کا شکار نہ ہو جائے۔

—— لوگوں کو پیغمبر پر کامل اعتماد ہو سکے کیونکہ کامل اعتماد خدائی رہبری کی پہلی شرط ہے۔

آیت میں مسئلہ عصمت کی ایک بنیادی دلیل اجمالی طور پر بیان کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا نے پیغمبر کو علوم تعلیم فرمائے جن کی وجہ سے وہ گناہ اور خطا سے بالکل مامون و محفوظ ہو گئے ہیں کیونکہ علم و دانش (جب اپنے آخری مرحلے کو پہنچ جائے تو) موجب عصمت ہوتا ہے۔ مثلاً ایک ڈاکٹر ایسے پانی کو ہرگز نہیں پی سکتا جس میں ملیریا اور دیگر بیسیوں بیماریوں کے جراثیم موجود ہوں اور جنہیں وہ خود لیبارٹری میں دیکھ چکا ہو اور ان کے ہولناک اثرات سے بھی آگاہ ہو یعنی اس کا علم اسے ایسا عمل کرنے سے روکتا ہے جبکہ جہالت میں ممکن ہے وہ ایسا کام کر جاتا۔ اس بنا پر جو شخص وحی الٰہی اور پروردگار کی تعلیم کے ذریعے مختلف مسائل کے بارے میں مکمل آگاہی رکھتا ہو وہ لغزش و اشتباہ کا شکار ہوتا ہے نہ گمراہی و گناہ میں پڑتا ہے ...... یہاں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ پیغمبر گناہ نہ کرنے پر مجبور ہے بلکہ پیغمبر کو خدا کی طرف سے علم تو ہوتا ہے لیکن وہ اس سے مجبور نہیں ہو جاتا۔ یعنی پیغمبر کبھی اپنے علم پر عمل کرنے پر مجبور نہیں ہوتا بلکہ اپنے اختیار سے اس علم پر عمل کرتا ہے جیسے مذکورہ مثال میں ڈاکٹر اس آلودہ پانی کی کیفیت سے آگاہی کے باوجود اسے نہ پینے پر مجبور نہیں ہے بلکہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے اسے نہیں پیتا۔

اور اگر کہا جائے کہ پیغمبر کے لیے یہ فضل الٰہی کیوں ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا رہبری کی اہم اور بھاری ذمہ داری کی بنا پر ہے جو ان کے کندھے پر رکھی گئی ہے اور دوسروں کے دوش پر نہیں ہے کیونکہ خدا جتنی کسی پر مسئولیت اور ذمہ داری ڈالتا ہے اتنی ہی اسے توانائی اور قدرت عطا کرتا ہے (غور کیجیے گا)۔

۱۱۴۔ لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ○

ترجمہ

۱۱۴۔ ان کی بہت سی سرگوشیوں (اور خفیہ میٹنگوں) میں خیر و سودمندی نہیں ہے مگر یہ کہ کوئی شخص (اس طریقے سے) دوسروں کی مدد، کوئی نیک کام یا لوگوں کے درمیان اصلاح کی کوشش کرے اور جو شخص رضائے الٰہی کے لیے یہ سب کچھ کرے تو اسے ہم عظیم اجر دیں گے۔

تفسیر

سرگوشیاں

گذشتہ آیات میں بعض منافقین یا ان جیسے لوگوں کے راتوں کے مخفی اور شیطانی جلسوں اور میٹنگوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اب اس آیت میں "نجویٰ" کے زیر عنوان ذرا تفصیل سے بات کی گئی ہے۔

'نجویٰ' کا معنی صرف کان میں باتیں کرنا یا سرگوشی ہی نہیں بلکہ ہر قسم کی مخفی اور پوشیدہ میٹنگوں کو بھی 'نجویٰ' کہتے ہیں کیونکہ اصل میں 'نجویٰ'، 'نجوۃ' (بروزن دفعہ) کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے اونچی زمین۔ بلند زمینیں چونکہ اپنے اطراف سے جدا ہوتی ہیں اور خفیہ میٹنگیں اور سرگوشیاں بھی اطراف والوں سے جدا ہوتی ہیں لہٰذا انھیں 'نجویٰ' کہتے ہیں۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ سب الفاظ 'نجات' کے مادہ سے ہیں جس کا معنی ہے 'رہائی' اور کیونکہ ایک بلند جگہ سیلاب کے حملے سے نجات ہوتی ہے اور خفیہ میٹنگ اور سرگوشی بھی دوسروں کی اطلاع سے دور ہوتی ہے اس لیے اس کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

بہر حال آیت کہتی ہے: ان کی زیادہ تر خفیہ میٹنگیں جو شیطانی سازشوں اور منصوبوں کے تحت منعقد ہوتی ہیں ان میں کوئی بھلائی اور فائدہ نہیں ہے (لا خیر فی کثیر من نجواھم)۔

اس کے بعد اس لیے کہ کہیں یہ گمان نہ ہو کہ ہر طرح کی سرگوشی اور مخفی میٹنگ مذموم و ممنوع ہے ایک کلی قانون میں استثنائی صورت کے مواقع بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: مگر یہ کہ کوئی شخص اس کے ذریعے صدقہ کی وصیت کرتا ہو، دوسروں کی مدد کا اقدام کرتا ہو، نیک کام انجام دیتا ہو، یا لوگوں کے درمیان صلح کرواتا ہو (الا من امر بصدقۃ او معروف او اصلاح بین الناس)۔

ایسی سرگوشیاں اور میٹنگیں اگر ریاکاری اور تظاہر کے لیے نہ ہوں بلکہ ان کا مقصد رضائے پروردگار ہو تو خدا ان کیلیے اجر عظیم مقرر فرمائے گا (ومن یفعل ذٰلک ابتغاء مرضات اللّٰہ فسوف نؤتیہ اجرًا عظیمًا)

اصولی طور پر سرگوشیوں، کانا پھوسیوں اور خفیہ میٹنگوں کو قرآن نے ایک شیطانی عمل قرار دیا ہے،

"انما النجویٰ من الشیطان"

یعنی۔ 'نجویٰ' شیطان کی طرف سے ہے (مجادلہ — ۱۰)

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا عمل عموماً غلط کاموں کے لیے ہوتا ہے چونکہ نیک، مفید اور مثبت کاموں کی انجام دہی کیلیے عموماً کوئی خفیہ اور پوشیدہ چیز نہیں ہوتی ہاں البتہ بعض اوقات خلاف معمول حالات کی وجہ سے انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ نیک کاموں کو مثبت طور پر مخفیانہ بجا لائے یہ استثنائی صورت بارہا قرآن میں بیان کی گئی ہے مثلاً:

یاایھا الذین اٰمنوا اذا تناجیتم فلا تتناجوا

بالاثم والعدوان و معصیة الرسول و تناجوا
بالبر و التقوٰی

اے ایمان والو! جب تم سرگوشی یا اخفاء کرو تو گناہ، ظلم اور
پیغمبر کی نافرمانی کے لیے نہ ہو اور صرف نیک کاموں اور پرہیزگاری
کے لیے 'نجویٰ' کرو۔ (مجادلہ - ۹)

بنیادی طور پر اگر سرگوشی اور نجویٰ بعض لوگ بعض دوسرے لوگوں کی موجودگی میں کریں تو یہ دوسروں میں سوئے ظن پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے اور بعض اوقات دوستوں میں بدگمانی پیدا کر دیتی ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ضرورت کے بغیر یہ طریقہ اختیار نہ کیا جائے اور قرآن کے مذکورہ حکم کا فلسفہ بھی یہی ہے۔ البتہ کبھی آبروئے انسانی کی حفاظت کے لیے ایسا کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی کی چھپ کر مالی امداد کرنا، جسے زیرِ نظر آیت نے صدقہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔

اسی طرح کبھی امر بالمعروف اگر کھلے بندوں کیا جائے تو دوسرے کی شرمندگی کا باعث ہوتا ہے اور ممکن ہے اس طرح سے وہ نصیحت قبول نہ کرے اور اپنے طریقہ کار پر ہٹ دھرمی دکھائے۔ آیت میں اس کا ذکر 'معروف' کے حوالے سے کیا گیا ہے۔

اس کی ایک اور مثال لوگوں کے درمیان صلح و مصالحت کا موقع ہے۔ بعض اوقات مسائل کو علی الاعلان بیان کیا جائے تو اس سے مصالحت میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں طرفین سے محرمانہ اور رازدارانہ طریقے سے گفتگو کرنا چاہیے تاکہ مصالحت کا مقصد پایہ تکمیل کو پہنچ سکے۔

مذکورہ تین مواقع پر اور ایسے ہی دیگر مواقع پر ضرورت اس بات کی ہے کہ مثبت کام 'نجویٰ' کے زیرِ سایہ انجام دیے جائیں۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مذکورہ تینوں کام 'صدقہ' کے مفہوم میں آجاتے ہیں کیونکہ جو شخص امر بالمعروف کرتا ہے وہ علم کی زکوٰۃ ادا کرتا ہے اور جو صلح و مصالحت کرواتا ہے وہ لوگوں میں موجود اپنے اثر و رسوخ کی زکوٰۃ دیتا ہے۔ چنانچہ حضرت علیؑ سے منقول ہے:

ان اللّٰه فرض علیکم زکٰوة جاهکم کما فرض علیکم زکٰوة ما
ملکت ایدیکم۔

یعنی - خدا نے تم پر فرض اور واجب قرار دیا ہے کہ اپنے اثر و رسوخ اور معاشرتی
حیثیت کی زکوٰۃ ادا کرو۔ جیسا کہ اس نے واجب کیا ہے کہ مال کی زکوٰۃ ادا کرو۔[1]

نیز پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

الا ادلك علی صدقة یحبها اللّٰه و رسوله تصلح بین

---

[1] نورالثقلین ج ۱، صفحہ ۵۵۰ اور دیگر تفاسیر

الناس اذا تفاسدوا و تقرب بینھم اذا تباعدوا۔
یعنی — کیا تجھے ایسے صدقہ سے آگاہ کروں جسے خدا اور اس کا رسول پسند کرتے ہیں (اور وہ یہ ہے کہ) جب لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں تو ان میں صلح کروا دو اور جب وہ ایک دوسرے سے دور ہو جائیں تو انھیں نزدیک لاؤ۔[1]

۱۱۵۔ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝

ترجمہ

۱۱۵۔ جو شخص حق واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور راہِ مومنین کے علاوہ کسی راستے کی پیروی کرے تو ہم اسے اسی راہ پر لیے جاتے ہیں جس پر وہ جا رہا ہے اور اسے دوزخ میں داخل کریں گے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

شانِ نزول

گذشتہ آیات کی شانِ نزول میں ہم کہہ چکے ہیں کہ بشیر بن ابیرق نے ایک مسلمان کی چوری کرنے کے بعد اس کا الزام ایک بے گناہ شخص پر دھر دیا اور حیلہ سازی سے پیغمبر اکرمؐ کے سامنے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے دیا۔ لیکن مذکورہ آیات کے نزول سے وہ رسوا ہو گیا۔ اس رسوائی کے بعد بجائے اس کے کہ توبہ کرتا اور راہِ حق پر لوٹ آتا، اس نے کفر کا راستہ اختیار کر لیا اور واضح طور پر مسلمانوں سے الگ ہو گیا اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس سلسلے میں اسلام کا ایک عمومی حکم بیان کیا۔

تفسیر

جب انسان کسی غلطی کا مرتکب ہوتا ہے تو آگاہی کے بعد اس کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک ہے بازگشت اور توبہ کا راستہ، جس کے ذریعے گناہ کے اثرات دُھل جاتے ہیں اور اس کا تذکرہ گذشتہ چند آیات میں ہو چکا ہے۔ دوسرا ہے ہٹ دھرمی اور عناد کا راستہ، جس کے منحوس نتیجے کے بارے میں زیر بحث آیت میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے،

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۳ صفحہ ۱۹۵۵، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

ترجمہ

۱۱۶- خدا اپنے ساتھ کیے جانے والے شرک کو نہیں بخشتا (لیکن) اس سے کم تر کو جسے چاہے (اور مناسب سمجھے) بخش دیتا ہے اور جو شخص خدا کے لیے شریک کا قائل ہو، وہ دور کی گمراہی میں جا پڑا ہے۔

تفسیر

شرک ـــــ ناقابلِ معافی گناہ

منافقین اور مرتدین یعنی اسلام قبول کر لینے بعد کفر پر پلٹ جانے والوں سے مربوط مباحث کے بعد، یہاں دوبارہ گناہ شرک کی شدت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ ایسا گناہ ہے جو عفو و بخشش کے قابل نہیں ہے اور اس سے بڑھ کر کسی گناہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

کچھ فرق کے ساتھ یہی مضمون اسی سورہ کی آیت ۴۸ میں گذر چکا ہے۔

ایسی تکرار تربیتی مسائل میں لازمۂ بلاغت ہے کیونکہ بنیادی اور اہم مسائل کی فاصلے سے تکرار ہونا چاہیے تاکہ وہ نفوس انکا میں راسخ ہو جائیں۔

درحقیقت گناہ بھی مختلف بیماریوں کی طرح ہیں جب تک بیماری بدن کے اصلی مراکز پر حملہ آور ہو کر انھیں بے کار نہیں کر دیتی بدن کی دفاعی قوّت صحت و بہبود کے لیے کارآمد رہتی ہے لیکن اگر مثال کے طور پر بیماری بدن کے اصلی مرکز یعنی دماغ پر حملہ کر دے اور اسے مفلوج کر دے تو امید کے دروازے بند ہو جائیں گے اور موت یقین کی صورت میں آکھڑی ہوگی۔ شرک ایک ایسی ہی بیماری ہے جو روحِ انسانی کا حساس مرکز بے کار کر دیتی ہے اور انسانی جان پر تاریکی و ظلمت کا چھڑکاؤ کرتی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے نجات کی کوئی امید نہیں ہے۔ لیکن اگر حقیقت توحید اور یکتا پرستی جو ہر طرح کی فضیلت، جنبش اور تحریک کا سرچشمہ ہے زندہ ہو تو پھر دیگر گناہوں سے بخشش کی امید کی جا سکتی ہے (ان اللہ لایغفران یشرک بہ و یغفر ما دون ذٰلک لمن یشاء)۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ آیت اس سورہ میں کچھ فرق کے ساتھ دو مرتبہ آئی ہے تاکہ شرک و بت پرستی کے وہ آثار جو سال ہا سال سے لوگوں کے نفوس کی گہرائیوں میں گھر بنا چکے تھے ۔ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں اور توحید کے معنوی و مادی آثار ان کے شجرِ وجود پر آشکار ہو جائیں البتہ دو نوں آیات میں تھوڑا سا فرق ہے یہاں فرمایا گیا ہے، و من یشرک باللہ فقد ضل ضلالا بعیدًا ـــ یعنی ـــ جو شخص خدا کے لیے شریک کا قائل ہو وہ دور کی گمراہی میں گرفتار ہے ـــ لیکن گذشتہ آیت میں ارشاد ہوا ہے و من یشرک باللہ فقد افترىٰ اثمًا عظيمًا ـــ یعنی ـــ جو شخص کسی کو خدا کا شریک بنا دے اس نے بہت بڑا جھوٹ اور افترا باندھا ہے۔

درحقیقت وہاں جنبہ الٰہی اور خداشناسی کے لحاظ سے شرک کے عظیم نقصان کی طرف اشارہ ہوا ہے اور یہاں لوگوں کے لیے اس کے ناقابل تلافی نقصانات بیان ہوئے ہیں وہاں مسئلے کا علمی پہلو مدنظر رکھا گیا ہے اور یہاں اس کے عملی پہلو اور خارجی نتائج کا ذکر ہے واضح ہے کہ اصطلاح کے مطابق یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں[1]

۱۱۷۔ اِنۡ یَّدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَ اِنۡ یَّدۡعُوۡنَ اِلَّا شَیۡطٰنًا مَّرِیۡدًا ۙ﴿﴾

۱۱۸۔ لَّعَنَہُ اللّٰہُ ۘ وَ قَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنۡ عِبَادِکَ نَصِیۡبًا مَّفۡرُوۡضًا ۙ﴿﴾

۱۱۹۔ وَّ لَاُضِلَّنَّہُمۡ وَ لَاُمَنِّیَنَّہُمۡ وَ لَاٰمُرَنَّہُمۡ فَلَیُبَتِّکُنَّ اٰذَانَ الۡاَنۡعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّہُمۡ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلۡقَ اللّٰہِ ؕ وَ مَنۡ یَّتَّخِذِ الشَّیۡطٰنَ وَلِیًّا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ فَقَدۡ خَسِرَ خُسۡرَانًا مُّبِیۡنًا ﴿ؕ﴾

۱۲۰۔ یَعِدُہُمۡ وَ یُمَنِّیۡہِمۡ ؕ وَ مَا یَعِدُہُمُ الشَّیۡطٰنُ اِلَّا غُرُوۡرًا ﴿﴾

۱۲۱۔ اُولٰٓئِکَ مَاۡوٰىہُمۡ جَہَنَّمُ ۫ وَ لَا یَجِدُوۡنَ عَنۡہَا مَحِیۡصًا ﴿﴾

ترجمہ

۱۱۷۔ وہ خدا کو چھوڑ کر صرف بتوں کو پکارتے ہیں جن کا کوئی اثر نہیں اور (یا) وہ صرف سرکش اور تباہ کار شیطان کو پکارتے ہیں۔

۱۱۸۔ خدا نے اسے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور اس نے کہا ہے کہ میں تیرے بندوں سے ایک معین مقدار لے کر رہوں گا۔

۱۱۹۔ اور میں انھیں گمراہ کروں گا اور آرزوؤں اور تمناؤں کے حصول میں سرگرم رکھوں گا اور انھیں حکم دوں گا کہ وہ (بے ہودہ اور فضول کام انجام دیں اور) چوپایوں کے کان چیر دیں اور خدا کی (پاک) خلقت کو خراب کر دیں (فطرتِ توحید کو شرک آلود کر دیں) اور وہ لوگ جنھوں نے خدا کی بجائے شیطان کو اپنا ولی چنا ہے انھوں نے

---

[1] اس آیت کے سلسلے میں دیگر وضاحتیں تفسیر نمونہ جلد ۲ میں پیش کی جا چکی ہیں (دیکھیے اردو ترجمہ ص ۴۹۵)

واضح نقصان کیا ہے۔

۱۲۰۔ شیطان ان سے (جھوٹے) وعدے کرتا ہے اور انھیں آرزوؤں میں سرگرم رکھتا ہے اور مکر و فریب کے سوا انھیں کوئی وعدہ نہیں دیتا۔

۱۲۱۔ (شیطان کے) ان (پیروکاروں) کے رہنے کی جگہ جہنم ہے اور ان کے لیے کوئی راہِ فرار نہیں ہے۔

تفسیر

شیطانی سازشیں

پہلی آیت ان مشرکین کی حالت بیان کر رہی ہے جن کے منحوس انجام کا تذکرہ گذشتہ آیت میں کیا گیا ہے۔ اس میں درحقیقت ان کی سخت گمراہی کا سبب بیان کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: وہ اس قدر کوتاہ فکر ہیں کہ انھوں نے وسیع عالم ہستی کے خالق کو چھوڑ کر ایسے موجودات کے در پر رجوع کرتے ہیں کہ جن کا کچھ بھی مثبت اثر نہیں بلکہ بعض اوقات تو شیطان کی طرح تباہ کن اور گمراہ کن بھی ہوتے ہیں (ان یدعون من دونه الا اناثاً و ان یدعون الا شیطاناً مریداً)۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں مشرکین کے معبود دو چیزوں میں منحصر قرار دیے گئے ہیں اول ——— "اناث" اور دوم ——— "شیطان مرید"

"اناث" جمع ہے "انثیٰ" کی جو کہ "انث" (بروزن "ادب") کے مادہ سے ہے "انثیٰ" نرم اور قابلِ انعطاف موجود کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ لوہا جب آگ میں نرم ہو جائے تو عرب "انث الحدید" کہتے ہیں۔ عورت کو بھی "اناث" یا "مؤنث" اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ زیادہ نرم دل، لطیف اور انعطاف پذیر صنف ہے۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہاں قرآن کا اشارہ قبائل عرب کے مشہور بتوں کی طرف ہے ہر عرب قبیلے نے اپنا ایک بت بنا رکھا تھا جسے مونث نام دیا گیا تھا۔ مثلاً الات ——— جس کا معنی ہے "الہ" اور یہ "اللہ" کا مونث ہے "عزیٰ" بھی مونث ہے۔ "اعز" کا اسی طرح "منات" "اساف" اور "نائلہ" بھی مونث نام ہیں۔

بعض دوسرے بزرگ مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہاں اناث سے مراد مونث کا مشہور معنی نہیں ہے بلکہ یہ لفظ یہاں اصل لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی وہ ایسے معبودوں کی پرستش کرتے تھے جن کی حیثیت ایک کمزور مخلوق سے زیادہ نہ تھی اور جو آسانی سے انسان کے ہاتھوں ہر شکل میں ڈھل جاتے تھے ان کا پورا وجود دوسروں کے رحم و کرم پر جدھر چاہو اُدھر مڑ جانے والا اور حوادث کے سامنے جھک جانے والا تھا۔ زیادہ کھلے لفظوں میں وہ بے ارادہ اور بے اختیار معبود تھے جن سے کوئی نفع و نقصان نہ پہنچ سکتا تھا۔

باقی رہا لفظ "مرید" ——— تو اس کی تشریح کچھ یوں ہے: یہ لفظ لغت کے لحاظ سے "مرد" (بروزن "زند")

الناس اذا تفاسدوا و تقرب بینہم اذا تباعدوا ۔

یعنی ــــ کیا تجھے ایسے صدقہ سے آگاہ کروں جسے خدا اور اس کا رسول پسند کرتے ہیں (اور وہ یہ ہے کہ) جب لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں تو ان میں صلح کروا دو اور جب وہ ایک دوسرے سے دور ہو جائیں تو انہیں نزدیک لاؤ۔[1]

۱۱۵۔ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝

ترجمہ

۱۱۵۔ جو شخص حق واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور راہِ مومنین کے علاوہ کسی راستے کی پیروی کرے تو ہم اسے اسی راہ پر لیے جاتے ہیں جس پر وہ جا رہا ہے اور اسے دوزخ میں داخل کریں گے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

شانِ نزول

گذشتہ آیات کی شانِ نزول میں ہم کہہ چکے ہیں کہ بشیر بن ابیرق نے ایک مسلمان کی چوری کرنے کے بعد اس کا الزام ایک بے گناہ شخص پر دھر دیا اور حیلہ سازی سے پیغمبر اکرمؐ کے سامنے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے دیا۔ لیکن مذکورہ آیات کے نزول سے وہ رسوا ہو گیا۔ اس رسوائی کے بعد بجائے اس کے کہ توبہ کرتا اور راہِ حق پر لوٹ آتا، اس نے کفر کا راستہ اختیار کر لیا اور واضح طور پر مسلمانوں سے الگ ہو گیا اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس سلسلے میں اسلام کا ایک عمومی حکم بیان کیا۔

تفسیر

جب انسان کسی غلطی کا مرتکب ہوتا ہے تو آگاہی کے بعد اس کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک ہے بازگشت اور توبہ کا راستہ، جس کے ذریعے گناہ کے اثرات دُھل جاتے ہیں اور اس کا تذکرہ گذشتہ چند آیات میں ہو چکا ہے۔ دوسرا ہے ہٹ دھرمی اور عناد کا راستہ، جس کے منحوس نتیجے کے بارے میں زیر بحث آیت میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۳ صفحہ ۱۹۵۵، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

جو شخص حق آشکار ہونے کے بعد رسول کے سامنے مخالفت اور عناد کا مظاہرہ کرے اور راہ مومنین کو چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرے تو ہم اسے اسی راستے کی طرف کھینچے لیے جائیں گے جس پر وہ جا رہا ہے اور روز قیامت ہم اُسے جہنم میں ڈالیں گے اور کیسی بری جگہ اس کے انتظار میں ہے (ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدی و یتبع غیر سبیل المؤمنین نوله ما تولی ونصله جهنم وساءت مصیرا)۔

توجہ رہے کہ "یشاقق" "شقاق" کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے ایسی سرپچی کبھی مخالفت جس میں عداوت و دشمنی ملی ہوئی ہو۔

"من بعد ما تبین له الهدی" (یعنی — ہدایت اور راہ راست واضح ہو جانے کے بعد) —— یہ جملہ بھی اسی معنی کی تاکید کرتا ہے۔ درحقیقت اس سے بہتر انجام ایسے لوگوں کے بس میں ہی نہیں — ان کا انجام اس دنیا میں بھی منحوس اور افسوس ناک ہے اور اُس جہان میں بھی دردناک ہے۔ اس جہان میں اس طرح جیسے قرآن کہتا ہے کہ وہ دن بدن اپنی غلط راہ میں زیادہ راسخ ہوتے جاتے ہیں وہ بے راہ روی میں جتنا آگے بڑھتے ہیں جادۂ حق سے ان کا زاویہ انحراف اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے۔ اور یہ وہ انجام ہے جو انھوں نے اپنے لیے خود اختیار کیا ہے یہ ایسی تعمیر ہے جس کا سنگ بنیاد انھوں نے خود اپنے ہاتھوں سے رکھا ہے لہٰذا اس انجام کے سلسلے میں ان پر کوئی ظلم نہیں کیا گیا۔ یہ جو ارشاد الٰہی ہے کہ نوله ما تولی — یعنی — ہم اسے اسی راہ کی طرف کھینچیں گے جس پر وہ چل رہا ہے — یہ دراصل توفیق معنوی سلب ہونے، تشخیص حق نہ کرنے اور بے راہ روی میں پیش رفت کرنے کی طرف اشارہ ہے[1]

نوله ما تولی۔ کے بارے میں ایک اور تفسیر بھی ہے اور وہ یہ کہ "ہم ایسے لوگوں کو انھی جعلی معبودوں کی سرپرستی میں رہنے دیں گے جو انھوں نے اپنے لیے خود منتخب کر رکھے ہیں" نیز "نصله جهنم" قیامت میں انکے انجام کی طرف اشارہ ہے۔

اجماع کی حجیت

فقہ کی چار دلیلوں میں سے ایک اجماع ہے اس کا معنی ہے کہ کسی ایک مسئلے پر اسلامی علماء کا اتفاق رائے۔

اصول فقہ میں اجماع کی حجیت ثابت کرنے کے لیے مختلف دلیلیں بیان کی گئی ہیں۔ بعض کے نزدیک ان میں سے ایک زیر بحث آیت بھی ہے۔ کیونکہ آیت کہتی ہے کہ جو شخص مومنین کے طریق کے علاوہ کوئی راستہ انتخاب کرے تو وہ دنیا اور آخرت میں بدبخت انجام ہوگا۔ اس لیے جب مومنین کسی مسئلے میں ایک راہ انتخاب کرلیں تو سب کو چاہیے کہ اس کی پیروی کریں۔

لیکن حق یہ ہے کہ زیر نظر آیت کا اجماع کی حجیت سے کوئی تعلق نہیں (اگرچہ ہم اجماع کی حجیت کے قائل ہیں البتہ اس شرط کے ساتھ کہ زیر بحث مسئلے میں قول معصوم بھی موجود ہے یا معصوم ذاتی طور پر اصحاب اجماع میں موجود ہو، اگرچہ ناشناس طور پر ہی موجود ہو، لیکن ایسے اجماع کی حجیت کی دلیل دراصل سنت اور قولِ معصوم ہی کی حجیت ہے

---

[1] اس سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۱ (اردو ترجمہ ص ۱۴۰) میں "خدا کی طرف سے ہدایت و گمراہی" کے زیر عنوان تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔

نہ کہ درج بالا آیت حجیت اجماع پر دلیل ہے)۔

آیت کے حجیت اجماع پر دلیل نہ ہونے کے بارے میں عرض ہے کہ:

۱۔ جو سزائیں آیت میں معین ہوئی ہیں وہ ان لوگوں کے لیے ہیں جو جانتے بوجھتے پیغمبر کی مخالفت کریں اور راہ مومنین کے علاوہ کوئی راستہ منتخب کریں یعنی یہ دونوں امور جمع ہوں تو اس کا نتیجہ وہ ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے اور یہ وہ مخالفت ہے جو علم و آگاہی سے کی جائے اس صورتِ حال کا تو حجیت اجماع کے مسئلے سے کوئی ربط نہیں۔ اور یہ امر تنہا اجماع کو حجت قرار نہیں دیتا۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ سبیل المومنین سے مراد راہِ توحید، خدا پرستی اور اصل اسلام ہے نہ کہ فقہی فتاویٰ اور فروعی احکام جیسا کہ شانِ نزول کے علاوہ آیت کا ظاہر بھی اس حقیقت پر گواہ ہے اور حقیقت میں راہِ مومنین سے ہٹ کر کوئی راہ اپنانے کا مطلب مخالفتِ پیغمبر کے علاوہ اور کچھ نہیں دونوں باتوں کی بازگشت ایک ہی مفہوم کی طرف ہے یہی وجہ ہے کہ امام باقر علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں ہے:

> جس وقت حضرت امیرالمومنین علیؑ کوفہ میں تھے کچھ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے انھوں نے درخواست کی، آپ ہمارے لیے کسی پیش نماز کا انتخاب کریں (تاکہ ماہِ رمضان کی مستحب نمازیں جو تراویح کے نام سے مشہور ہیں اور حضرت عمر کے زمانے میں جماعت سے پڑھا کرتے تھے اس پیش نماز کے ساتھ پڑھ سکیں) امام علیہ السلام نے اس کام سے منع کیا اور ایسی جماعت سے روکا (کیونکہ نفلی نماز کے لیے جماعت صحیح نہیں ہے) اپنے امام و پیشوا کا قطعی حکم سننے کے باوجود یہ لوگ ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنے لگے انھوں نے وادو فریاد بلند کی، لوگو! آؤ اس ماہ رمضان میں آنسو بہاؤ۔
>
> دوستانِ علی میں سے کچھ لوگ آپ کے پاس آئے اور عرض کرنے لگے: کچھ لوگ آپ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتے۔
>
> آپ نے فرمایا: انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو جسے چاہیں منتخب کرلیں اور اس (غیر مشروع) جماعت کو بجا لائیں۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی[1] و من یشاقق الرسول ...... الخ

ہم نے جو کچھ آیت کی تفسیر کے بارے میں کہا ہے یہ حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے۔

۱۱۶۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا ○

[1] نور الثقلین جلد ۱ صفحہ ۵۵۱

ترجمہ

۱۱۶۔ خدا اپنے ساتھ کیے جانے والے شرک کو نہیں بخشتا (لیکن) اس سے کم تر کو جسے چاہے (اور مناسب سمجھے) بخش دیتا ہے اور جو شخص خدا کے لیے شریک کا قائل ہو، وہ دور کی گمراہی میں جا پڑا ہے۔

تفسیر

شرک ــــ ناقابلِ معافی گناہ

منافقین اور مرتدین یعنی اسلام قبول کر لینے بعد کفر پر پلٹ جانے والوں سے مربوط مباحث کے بعد، یہاں دوبارہ گناہ شرک کی شدت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ ایسا گناہ ہے جو عفو و بخشش کے قابل نہیں ہے اور اس سے بڑھ کر کسی گناہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

کچھ فرق کے ساتھ یہی مضمون اسی سورہ کی آیت ۴۸ میں گذر چکا ہے۔

ایسی تکرار تربیتی مسائل میں لازمۂ بلاغت ہے کیونکہ بنیادی اور اہم مسائل کی فاصلے سے تکرار ہونا چاہیے تاکہ وہ نفوس انسانی میں راسخ ہو جائیں۔

درحقیقت گناہ بھی مختلف بیماریوں کی طرح ہیں جب تک بیماری بدن کے اصلی مراکز پر حملہ آور ہو کر انھیں بے کار نہیں کر دیتی بدن کی دفاعی قوت صحت و بہبود کے لیے کار آمد رہتی ہے لیکن اگر مثال کے طور پر بیماری بدن کے اصلی مرکز یعنی دفاع پر حملہ کر دے اور اسے مفلوج کر دے تو امید کے دروازے بند ہو جائیں گے اور موت یقین کی صورت میں آکھڑی ہو گی۔ شرک ایک ایسی ہی بیماری ہے جو روحِ انسانی کا حساس مرکز بے کار کر دیتی ہے اور انسانی جان پر تاریکی و ظلمت کا چھڑکاؤ کرتی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے نجات کی کوئی امید نہیں ہے۔ لیکن اگر حقیقت توحید اور یکتا پرستی جو ہر طرح کی فضیلت، جنبش اور تحریک کا سرچشمہ ہے زندہ ہو تو پھر دیگر گناہوں سے بخشش کی امید کی جا سکتی ہے (ان اللہ لا یغفران یشرک بہ و یغفر ما دون ذٰلک لمن یشاء)۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ آیت اس سورہ میں کچھ فرق کے ساتھ دو مرتبہ آئی ہے تاکہ شرک و بت پرستی کے وہ آثار جو سال ہا سال سے لوگوں کے نفوس کی گہرائیوں میں گھر بنا چکے تھے۔ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں اور توحید کے معنوی و مادی آثار ان کے شجرِ وجود پر آشکار ہو جائیں البتہ دو آیات میں تھوڑا سا فرق ہے یہاں فرمایا گیا ہے، و من یشرک باللہ فقد ضل ضلالا بعیدا ــــ یعنی ــــ جو شخص خدا کے لیے شریک کا قائل ہو وہ دور کی گمراہی میں گرفتار ہے ــــ لیکن گذشتہ آیت میں ارشاد ہوا ہے، و من یشرک باللہ فقد افتریٰ اثما عظیما ــــ یعنی ــــ جو شخص کسی کو خدا کا شریک بنا دے اس نے بہت بڑا جھوٹ اور افترا باندھا ہے۔

درحقیقت وہاں جنبہ الٰہی اور خدا شناسی کے لحاظ سے شرک کے عظیم نقصان کی طرف اشارہ ہوا ہے اور یہاں لوگوں کے لیے اس کے ناقابل تلافی نقصانات بیان ہوئے ہیں وہاں مسئلے کا علمی پہلو مدنظر رکھا گیا ہے اور یہاں اس کے عملی پہلو اور خارجی نتائج کا ذکر ہے واضح ہے کہ اصطلاح کے مطابق یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں[1]

۱۱۷۔ اِنْ یَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَ اِنْ یَّدْعُوْنَ اِلَّا شَیْطٰنًا مَّرِیْدًا ۝

۱۱۸۔ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَ قَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا ۝

۱۱۹۔ وَّ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّیَنَّهُمْ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ یَّتَّخِذِ الشَّیْطٰنَ وَلِیًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِیْنًا ۝

۱۲۰۔ یَعِدُهُمْ وَ یُمَنِّیْهِمْ ؕ وَ مَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝

۱۲۱۔ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۫ وَ لَا یَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِیْصًا ۝

ترجمہ

۱۱۷۔ وہ خدا کو چھوڑ کر صرف بتوں کو پکارتے ہیں جن کا کوئی اثر نہیں اور (یا) وہ صرف سرکش اور تباہ کار شیطان کو پکارتے ہیں۔

۱۱۸۔ خدا نے اسے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور اس نے کہا ہے کہ میں تیرے بندوں سے ایک معین مقدار لے کر رہوں گا۔

۱۱۹۔ اور میں انھیں گمراہ کروں گا اور آرزوؤں اور تمناؤں کے حصول میں سرگرم رکھوں گا اور انھیں حکم دوں گا کہ وہ (بے ہودہ اور فضول کام انجام دیں اور) چوپایوں کے کان چیر دیں اور خدا کی (پاک) خلقت کو خراب کر دیں (فطرتِ توحید کو شرک آلود کر دیں) اور وہ لوگ جنھوں نے خدا کی بجائے شیطان کو اپنا ولی چنا ہے انھوں نے

---

[1] اس آیت کے سلسلے میں دیگر وضاحتیں تفسیر نمونہ جلد ۲ میں پیش کی جا چکی ہیں (دیکھیے اردو ترجمہ ص۴۴۵)

واضح نقصان کیا ہے۔

۱۲۰۔ شیطان ان سے (جھوٹے) وعدے کرتا ہے اور انھیں آرزوؤں میں سرگرم رکھتا ہے اور مکر و فریب کے سوا انھیں کوئی وعدہ نہیں دیتا۔

۱۲۱۔ (شیطان کے) ان (پیروکاروں) کے رہنے کی جگہ جہنم ہے اور ان کے لیے کوئی راہِ فرار نہیں ہے۔

تفسیر

شیطانی سازشیں

پہلی آیت ان مشرکین کی حالت بیان کر رہی ہے جن کے منحوس انجام کا تذکرہ گذشتہ آیت میں کیا گیا ہے۔ اس میں درحقیقت ان کی سخت گمراہی کا سبب بیان کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: وہ اس قدر کوتاہ فکر ہیں کہ انھوں نے وسیع عالم ہستی کے خالق کو چھوڑ کر ایسے موجودات کے در پر رجوع کرتے ہیں کہ جن کا کچھ بھی مثبت اثر نہیں بلکہ بعض اوقات تو شیطان کی طرح تباہ کن اور گمراہ کن بھی ہوتے ہیں (ان یدعون من دونہ الا اناثاً و ان یدعون الا شیطاناً مریداً)۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں مشرکین کے معبود دو چیزوں میں منحصر قرار دیے گئے ہیں اول ——— "اناث" اور دوم ——— "شیطان مرید"

"اناث" جمع ہے "انثیٰ" کی جو کہ "انث" (بروزن "ادب") کے مادہ سے ہے "انثیٰ" نرم اور قابلِ انعطاف موجود کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ لوہا جب آگ میں نرم ہو جائے تو عرب "انث الحدید" کہتے ہیں۔ عورت کو بھی "اناث" یا "مونث" اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ زیادہ نرم دل، لطیف اور انعطاف پذیر صنف ہے۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہاں قرآن کا اشارہ قبائل عرب کے مشہور بتوں کی طرف ہے ہر عرب قبیلے نے اپنا ایک بت منار کھا تھا جسے مونث نام دیا گیا تھا۔ مثلاً اللات ——— جس کا معنی ہے "الہہ" اور یہ "اللہ" کا مونث ہے "عزیٰ" بھی مونث ہے۔ "اعز" کا اسی طرح "منات" "اساف" اور "نائلہ" بھی مونث نام ہیں۔

بعض دوسرے بزرگ مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہاں اناث سے مراد مونث کا مشہور معنی نہیں ہے بلکہ یہ لفظ یہاں اصل لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی وہ ایسے معبودوں کی پرستش کرتے تھے جن کی حیثیت ایک کمزور مخلوق سے زیادہ نہ تھی اور جو آسانی سے انسان کے ہاتھوں ہر شکل میں ڈھل جاتے تھے ان کا پورا وجود دوسروں کے رحم و کرم پر جدھر چاہو اُدھر مڑ جانے والا اور حوادث کے سامنے جھک جانے والا تھا۔ زیادہ کھلے لفظوں میں وہ بے ارادہ اور بے اختیار معبود تھے جن سے کوئی نفع و نقصان نہ پہنچ سکتا تھا۔

باقی رہا لفظ "مرید" ——— تو اس کی تشریح کچھ یوں ہے: یہ لفظ لغت کے لحاظ سے "مرد" (بروزن "زرد")

کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے درختوں کی شاخیں اور پتے جھڑ جانا۔ اسی لیے جس نوجوان کے چہرے پر ابھی بال نہ اگے ہوں اسے " امرد " کہا جاتا ہے۔ لہٰذا " شیطان مرید " سے مراد وہ شیطان ہے جس کے شجرِ وجود کی تمام صفات فضیلت گر چکی ہوں اور بھلائی اور طاقت کی کوئی چیز اس میں باقی نہ رہی ہو یا پھر یہ لفظ مادہ " مرود " (بروزن " سرود ") سے ہے جس کا معنی ہے طغیان اور سرکشی ـــــــ یعنی ان کا وجود تباہ کار اور ویرانیاں لانے والا شیطان ہے۔

درحقیقت قرآن نے ان کے معبودوں کو دو گروہوں میں بیان کیا ہے ایک گروپ وہ ہے جو بے اثر اور بے خاصیت ہے اور دوسرا تباہ کار اور ویران گر ہے اور جو شخص ایسے معبودوں کے سامنے سر جھکائے وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہے۔

اس کے بعد کی آیات میں شیطان کی صفات، اس کے مقاصد و اہداف اور بنی آدم سے اس کی مخصوص دشمنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے نیز اس کے لائحہ عمل کے مختلف حصوں کی تشریح کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے، خدا نے اسے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے (لعنہ اللّٰہ) اس کی تمام تباہ کاریوں اور بدبختیوں کی بنیاد دراصل یہی ہے کہ وہ رحمتِ الٰہی سے دور ہو چکا ہے، اور یہ دوری اس کے غرور و تکبر کا نتیجہ ہے یہ بات واضح ہے کہ ایسا وجود جو رحمتِ خدا سے دور ہو کر ہر طرح کی خیر و خوبی سے محروم ہو چکا ہو، وہ دوسروں کی زندگی کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔ جس نے حیات بخشنے والے سے کچھ نہ پایا ہو وہ ہستی آفریں کیسے ہو سکتا ہے ایسا وجود نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہو سکتا بلکہ نقصان دہ بھی ہوگا۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ شیطان نے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ یہ کام سرانجام دے گا۔

۱۔ تیرے بندوں سے ایک معین حصہ لوں گا (وقال لاتخذن من عبادك نصيبا مفروضا)۔
وہ جانتا ہے کہ وہ خدا کے سب بندوں کو گمراہ نہیں کر سکتا اور صرف ہوس پرست، ضعیف ایمان والے اور کمزور ارادے کے مالک ہی اس کے سامنے جھکیں گے۔

۲۔ انھیں گمراہ کروں گا (ولاضلنهم)۔

۳۔ انھیں لمبی چوڑی امیدوں اور آرزوؤں کے سہارے مصروف رکھوں گا (ولامنينهم)۔[1]

۴۔ انھیں فضول اور بے ہودہ کاموں کی دعوت دوں گا ان میں سے یہ بھی ہے کہ انھیں حکم دوں گا کہ وہ چوپایوں کے کانوں میں سوراخ کریں یا انھیں کاٹ ڈالیں (ولامرنهم فليبتكن اذان الانعام)۔
یہ زمانہ جاہلیت کے ایک بدترین عمل کی طرف اشارہ ہے بت پرستوں میں یہ کام مروج تھا کہ وہ بعض چوپایوں کے کان چیر دیتے یا انھیں قطع کر دیتے پھر ان پر سواری کو ممنوع سمجھ لیتے اور ان سے کسی قسم کا کوئی فائدہ نہ اٹھاتے۔

۵۔ انھیں اس کام پر ابھاروں گا کہ خدا کی پاک خلقت کو بگاڑ دیں (ولامرنهم فليغيرن خلق الله)۔
یہ جملہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے انسان کی فطرت اولیٰ میں توحید، یگانہ پرستی اور ہر طرح کی پسندیدہ صفت

---

[1] اس لفظ کا مادہ " منی " (بروزن " منع ") ہے جو تقدیر اور حساب لگانے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے بعض اوقات خیالی اندازوں اور موہوم آرزوؤں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ نطفہ کو بھی " منی " اسی لیے کہا جاتا ہے کہ زندہ موجودات کی ابتدا کا حساب اسی سے لگایا جاتا ہے۔

رکھی ہے لیکن شیطانی وسوسے اور ہوا و ہوس اسے اس صحیح راستے سے منحرف کردیتے ہیں اور بے راہ روی کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ اس بات کی شاہد سورۂ روم کی آیہ ۳۰ ہے۔

فاقم وجهك للدين حنيفا فطرة الله التي فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذلك الدين القيم۔

اپنا چہرہ خالص توحیدی آئین کی طرف کرلو یہ وہی فطرت ہے کہ جس پر خدا نے شروع سے لوگوں کو خلق کیا ہے یہ آفرینش کبھی تبدیل نہیں ہوسکتی ——— یہی حقیقی اور مستقیم دین ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی منقول ہے کہ یہاں تغیر سے مراد فطرت توحید اور فرمان خدا میں تغیر ہے[1] ——— اور یہ ایسا ضرر ہے جو قابل تلافی نہیں ——— شیطان یہ نقصان انسان کی سعادت کی بنیاد کو پہنچاتا ہے کیونکہ وہ حقائق کو اوہام میں تبدیل کرکے رکھ دیتا ہے اور اس کے بعد سعادت شقاوت میں بدل جاتی ہے۔

آخر میں ایک حکم عمومی بیان کیا گیا ہے، جو شخص خدا کی بجائے شیطان کو اپنا سرپرست بناتا ہے وہ کھلے نقصان کا مرتکب ہوا ہے (ومن يتخذ الشيطان وليا من دون الله فقد خسر خسرانا مبينا)۔

اگلی آیت میں گزشتہ گفتگو کی دلیل کے طور پر چند نکات بیان کیے ہیں:

شیطان ہمیشہ ان سے جھوٹے وعدے کرتا رہتا ہے اور انھیں لمبی چوڑی آرزوؤں میں محو رکھتا ہے لیکن مکروفریب کے علاوہ کرتا ان کے لیے کچھ بھی نہیں ہے (يعدهم ويمنيهم وما يعدهم الشيطان الا غرورا[2])۔

محل بحث آیت میں سے آخری آیت میں شیطان کے پیروکاروں کے آخری انجام کا تذکرہ ہے۔ فرمایا گیا ہے، ان کا ٹھکانا جہنم میں ہے اور ان کے لیے بھاگ نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے (اولئك مأواهم جهنم ولا يجدون عنها محيصا[3])۔

۱۲۲۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا ○

---

[1] تفسیر تبیان ج ۳ ص ۳۳۴۔

[2] "غرور" دراصل کسی چیز کے واضح اور آشکار اثر کو کہتے ہیں لیکن یہ لفظ زیادہ تر ان امور کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کا ظاہر پرفریب اور باطن ناپسندیدہ ہو اور ہر ایسی چیز کو غرور کہتے ہیں جو انسان کو فریب دے اور حق سے منحرف کر دے چاہے وہ مال و ثروت ہو یا مقام و اقتدار۔

[3] "محیص" "حیص" کے مادہ سے ہے جس کا مطلب ہے عدول کرنا اور نگاہ پھیر لینا۔ لہٰذا محیص کا معنی ہوگا عدول کا ذریعہ اور فرار کا وسیلہ۔

ترجمہ

۱۲۲۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انھوں نے نیک کام سرانجام دیئے ہم انھیں عنقریب ان باغات بہشت میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ہمیشہ کے لیے ان میں رہیں گے اللہ تم سے سچا وعدہ کرتا ہے اور کون ہے جو قول اور اپنے وعدوں میں اللہ سے زیادہ سچا ہو۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ جو لوگ شیطان کو اپنا ولی بناتے ہیں وہ واضح طور پر خسارے اور نقصان میں ہیں شیطان ان سے جھوٹے وعدے کرتا ہے انھیں آرزوؤں میں محو رکھتا ہے اور اس کا وعدہ مکر و فریب کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے مقابلے میں اس آیت میں اہل ایمان کا انجام بیان کیا گیا ہے کہ، وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انھوں نے نیک اعمال انجام دیئے ہیں وہ بہت جلد فردوس بریں کے باغات میں جائیں گے، یہ وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں (والذین اٰمنوا وعملوا الصٰلحٰت سندخلھم جنٰت تجری من تحتھا الانھٰر) یہ نعمت دنیاوی نعمتوں کی طرح ناپائیدار نہیں ہے بلکہ ہمیشہ مومنین کو میسر رہے گی (خالدین فیھا ابدًا)۔

یہ وعدہ شیطان کے جھوٹے وعدوں کی طرح نہیں ہے بلکہ سچا ہے اور خدا کا وعدہ ہے (وعد اللہ حقًا) اور یہ واضح ہے کہ خدا سے بڑھ کر اپنے قول و قرار کا سچا کوئی نہیں ہو سکتا (ومن اصدق من اللہ قیلًا) کیونکہ وعدہ خلافی یا تو عجز و ناتوانی کی وجہ سے ہوتی ہے اور یا جہالت و احتیاج کی بنا پر جو کہ اللہ کی ساحت قدس سے بعید ہے۔

۱۲۳۔ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ○

۱۲۴۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ○

ترجمہ

۱۲۳۔ تمھاری اور اہل کتاب کی آرزوؤں سے (فضیلت و برتری) نہیں ہوتی، جو شخص برا عمل کرے گا اسے سزا دی جائے گی اور وہ خدا کے علاوہ کسی کو اپنا ولی و یاور نہیں پائے گا۔

۱۲۴۔ اور جو شخص اعمالِ صالح میں سے کچھ انجام دے، چاہے مرد ہو یا عورت، اگر وہ ایمان رکھتا ہے تو ایسے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے اور ان پر تھوڑا سا ظلم بھی نہیں ہوگا۔

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان اور دیگر تفاسیر میں ہے کہ مسلمان اور اہلِ کتاب ایک دوسرے پر فخر کرتے تھے اہل کتاب کہتے کہ ہمارا پیغمبر تمہارے پیغمبر سے پہلے آیا ہے اور ہماری کتاب تمہاری کتاب سے مقدم ہے اور مسلمان کہتے کہ ہمارا پیغمبر تمام پیغمبروں کا خاتم ہے اور اس کی کتاب آخری کتاب ہے اور دیگر آسمانی کتب سے زیادہ کامل و اکمل ہے لہٰذا ہم تم سے زیادہ افضل ہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ ہم برگزیدہ قوم ہیں اور جہنم کی آگ چند دنوں کے سوا ہم تک نہیں پہنچے گی (وقالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ)[1]

اور مسلمان کہتے کہ ہم بہترین اُمّت ہیں کیونکہ خدا نے ہمارے بارے میں فرمایا ہے:

(کنتم خیر امۃ اخرجت للناس)[2]

اسی ضمن میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور ان دعووں پر خطِ بطلان کھینچ دیا گیا اور یہ واضح کیا گیا کہ ہر انسان کی قدر و قیمت ان کے اعمال کے مطابق ہوگی۔

تفسیر

سچے اور جھوٹے امتیازات

ان دو آیات میں اسلام کی ایک بہت ہی اہم اساس کو بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ افراد کی وجودی قدر و قیمت اور جزاء و سزا، ان کے دعووں اور آرزوؤں سے مربوط نہیں ہے بلکہ صرف ایمان اور عمل سے وابستہ ہے اسلام کی یہ بنیاد ثابت اور سنت ہے اور غیر متبدل ہے یہ وہ قانون ہے جس کی نظر میں تمام امتیں یکساں ہیں لہٰذا پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے، فضیلت و برتری کا انحصار تمہاری اور اہلِ کتاب کی آرزوؤں پر نہیں ہے (لیس بامانیکم ولا امانی اھل الکتاب)۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے، جو شخص کوئی عمل بجا لائے گا وہ اس کے بدلے اپنی سزا پائے گا اور خدا کے علاوہ کسی کو اپنا

---

[1] بقرہ۔۸۰

[2] آلِ عمران۔۱۱۰

ولی و یاور نہ پائے گا (من یعمل سوءًا یجز بہ ولا یجد لہ من دون اللہ ولیا ولا نصیرًا) اور اسی طرح جو لوگ نیک عمل بجا لائیں گے اور صاحبِ ایمان ہوں گے وہ مرد ہوں یا عورتیں جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہو گا (ومن یعمل من الصالحات من ذکر او انثٰی و ھو مؤمن فاولٰئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون نقیرًا)۔[1]

اس طرح قرآن نے نہایت سادگی سے بقولے سب کے ہاتھ پر پاک پانی ڈالا ہے اور کسی مذہب سے دعوے کی حد تک خیالی، اجتماعی یا نسلی وابستگی کو بے فائدہ قرار دیا ہے اور نجات کی بنیاد اس مکتب کے اصولوں پر ایمان لانے اور اس کے پروگراموں پر عمل کرنے کو ٹھہرایا ہے۔

پہلی آیت کے ذیل میں بنیادی شیعہ سنی کتب میں ایک حدیث منقول ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد بعض مسلمان ایسی دہشت و پریشانی میں مبتلا ہو گئے کہ وہ ڈر کے مارے رونے لگے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انسان خطاکار ہے اور آخر اس سے گناہ سرزد ہونا تو ممکن ہی ہے اور اگر کسی قسم کی کوئی معافی اور بخشش نہیں اور تمام بُرے اعمال کی سزا ملے گی پھر یہ تو بڑا مشکل مرحلہ ہے۔ لہٰذا انھوں نے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس آیت نے ہمارے لیے تو کوئی صورت نہیں چھوڑی، اس پر پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

> اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے بات وہی ہے جو اس آیت میں نازل ہوئی ہے تاہم میں تمھیں ایسی بشارت دیتا ہوں جو تمھارے لیے قربِ خدا اور نیک اعمال بجا لانے کی تشویق کا سبب بنے گی اور وہ یہ کہ تمھیں جو مصیبتیں پہنچیں گی، تمھارے گناہوں کا کفارہ بنیں گی یہاں تک تمھارے پاؤں میں چبھنے والا ایک کانٹا بھی۔[2]

ایک سوال کا جواب

ارشادِ الٰہی ہے: ولا یجد لہ من دون اللہ ولیًا ولا نصیرًا (یعنی وہ اپنے گناہوں کے مقابلہ میں کسی کو اپنا سرپرست و یاور نہیں پائے گا) ممکن ہے بعض لوگ اس سے استدلال کرتے ہوئے کہیں کہ اس جملے سے مسئلہ شفاعت وغیرہ کی بالکل نفی ہو جاتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ـــــــ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ شفاعت کا معنی یہ نہیں ہے کہ شفاعت کرنے والے مثلاً انبیاء، آئمہ اور صلحا خدا کے مقابلے میں کوئی مستقل طاقت رکھتے ہیں بلکہ ان کی شفاعت بھی حکم خدا کے ماتحت ہے اور اس کی اجازت اور جس کی شفاعت کی جانا ہے اس کی اہلیت کے بغیر کبھی شفاعت نہیں کریں گے۔ لہٰذا ایسی شفاعت کی بازگشت بالآخر خدا کی طرف ہے اور خدا کی سرپرستی، نصرت اور مدد کا ایک شعبہ شمار ہوتی ہے۔

---

[1] نقیر کے مفہوم پر اسی سورہ کی آیت ۵۳ میں بحث کی جا چکی ہے۔

[2] نور الثقلین جلد اول۔ ص ۵۵۳

۱۲۵۔ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۗ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ○

۱۲۶۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ○

ترجمہ

۱۲۵۔ جو اپنے آپ کو خدا کے سپرد کردے اس سے بہتر کس کا دین ہے اور پھر جو نیکو کار بھی ہو اور ابراہیم کے خالص اور پاک دین کا پیرو ہو اور خدا نے ابراہیم کو اپنی دوستی کے لیے منتخب کرلیا ہے۔

۱۲۶۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب خدا کا ہے اور خدا ہر چیز پر محیط ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں ایمان و عمل کی تاثیر کے بارے میں گفتگو تھی۔ ان میں بتایا گیا تھا کہ کسی دین و آئین سے منسوب ہو جانا ہی کافی نہیں لیکن زیر نظر آیت میں اس بنا پر کہ کہیں گذشتہ بحث سے کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ دین اسلام کی تمام ادیان پر برتری کا اظہار یوں کیا گیا ہے، کون سا دین اس شخص کے دین سے بہتر ہے جو بارگاہِ الٰہی میں سراپا تسلیم ہو اور نیک عمل سے دستبردار نہ ہو اور ابراہیم کے پاک اور خالص دین کا پیروکار ہو (ومن احسن دینا ممن اسلم وجهه لله وهو محسن واتبع ملة ابراهيم حنيفا)۔

البتہ آیت یہاں استفہامیہ صورت میں ہے لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ سننے والے سے اس حقیقت کا اقرار لیا جائے۔

اس آیت میں تین چیزوں کو بہترین دین کے مقیاس کے طور پر شمار کیا گیا ہے،

پہلی، پورے طور پر خدا کے حضور سپردگی "اسلم وجهه لله"[1]۔

---

[1] "وجہ" لغت میں چہرے کو کہتے ہیں اور انسان کا چہرہ چونکہ اس کے قلب و روح کا آئینہ ہوتا ہے اور انسان کو خارجی دنیا سے مربوط کرنے والے حواس تقریباً سب چہرے میں واقع ہیں اس لیے یہ لفظ کبھی کبھی ذات کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۂ قصص آیت ۸۸ میں ہے

"کل شیء هالك الا وجهه"

ذات خدا کے علاوہ سب چیزیں ہلاک ہو جائیں گی۔

دوسرے: نیکوکاری (وھو محسن) یہاں نیکوکاری سے مراد دل، زبان اور عمل سے ہر طرح کی نیکی ہے۔ تفسیر نور الثقلین میں اس آیت کے ذیل میں پیغمبر اسلامؐ سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے جو اس سوال کے جواب میں ہے کہ احسان سے کیا مراد ہے حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فان یراک

(اس آیت میں) احسان سے مراد یہ ہے کہ جو کام بھی عبادتِ خدا کے لیے انجام دو وہ اس طرح ہو گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے اور وہ تم پر شاہد و ناظر ہے۔

تیسرے: ابراہیم کے پاک دین و آئین کی پیروی کرنا (واتبع ملۃ ابراھیم حنیفا)[1]

آیت کے آخر میں دینِ ابراہیم پر اعتماد کی یہ دلیل بیان کی گئی ہے کہ خدا نے ابراہیم کو اپنے خلیل کی حیثیت سے منتخب کر لیا ہے (واتخذ اللّٰہ ابراھیم خلیلا)۔

خلیل کسے کہتے ہیں؟

ہو سکتا ہے "خلیل" "خُلّت" (بروزن "محبت") کے مادہ سے ہو جس کا معنی ہے دوستی۔ یا پھر "خَلّت" (بروزن "ضربت") کے مادہ سے ہو جس کا مطلب ہے نیاز و احتیاج۔

مفسرین میں اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ زیرِ نظر آیت میں کون سا معنی آیت کے مفہوم کے زیادہ قریب ہے۔ بعض کے خیال میں دوسرا معنی حقیقت آیت کے قریب تر ہے کیونکہ ابراہیم اچھی طرح سے محسوس کرتے تھے کہ وہ بلا استثنا تمام چیزوں میں خدا کے محتاج ہیں لیکن اوپر والی آیت کہتی ہے کہ خدا نے خود ابراہیمؑ کو یہ مقام دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد دوستی ہے کیونکہ اگر یہ کہیں کہ خدا نے دوست کی حیثیت سے ابراہیمؑ کو منتخب فرمایا تو یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ دوسری صورت میں یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ خدا نے ابراہیمؑ کا انتخاب اپنے محتاج کی حیثیت سے کیا ہے جبکہ باقی تمام مخلوق بھی خدا تعالیٰ کی محتاج اور نیاز مند ہے لہٰذا یہ بات ابراہیمؑ سے مخصوص نہیں ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

یا ایھا الناس انتم الفقراء الی اللّٰہ

یعنی ــــ اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو۔ (فاطر ــــ ۱۵)

امام جعفر صادقؑ سے منقول ایک روایت میں ہے:

---

[1] "ملت" کا معنی "دین" ہے لیکن فرق یہ ہے کہ ملت کی اضافت خدا کی طرف نہیں ہوتی مثلاً "ملۃ اللّٰہ" نہیں کہتے بلکہ پیغمبر کی طرف اس کی اضافت ہوتی ہے جبکہ لفظ دین کی اضافت اللہ کی طرف بھی، پیغمبر کی طرف بھی اور دیگر افراد کی طرف بھی ہوتی ہے۔

حنیف ــــ اس شخص کو کہتے ہیں جو ادیانِ باطل چھوڑ کر حق کی طرف مائل ہو اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے۔ اس کی تشریح جلد دوم میں کی جا چکی ہے۔ ۲۲۹

خدا نے ابراہیم کو اگر اپنا خلیل (اور دوست) بنایا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ان کی دوستی کا محتاج تھا بلکہ یہ اس بنا پر تھا کہ ابراہیم خدا تعالیٰ کے مفید اور اس کی راہ میں کوشش کرنے والے بندے تھے۔[1]

یہ روایت بھی اس بات کی شاہد ہے کہ زیر بحث آیت میں خلیل کا مطلب دوست ہی ہے۔

رہا یہ سوال کہ خدا تعالیٰ نے ابراہیم کو یہ مقام کن خصوصیات کی بنا پر عطا فرمایا ہے تو اس سلسلے میں روایات میں کئی ایک وجوہات بیان کی گئی ہیں۔ جو سب ابراہیم کے انتخاب کی دلیل بن سکتی ہیں۔ ایک وجہ امام صادقؑ سے منقول ایک حدیث میں یوں بیان کی گئی ہے:

انما اتخذ الله ابراهيم خليلا لانه لم يرد احدًا ولم يسئل احدًا قط غير الله۔

یعنی ــــــ خدا تعالیٰ نے ابراہیم کو اپنا خلیل اس لیے بنایا کیونکہ انھوں نے کبھی کسی سوال اور تقاضا کرنے والے کو محروم نہیں کیا اور کبھی کسی سے سوال اور تقاضا نہیں کیا۔[2]

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کو یہ مقام زیادہ سجدہ کرنے، بھوکوں کو کھانا کھلانے اور رات کی تاریکی میں نماز پڑھنے یا پروردگار کی اطاعت کے لیے کوشاں رہنے کی وجہ سے حاصل ہوا۔

اگلی آیت میں پروردگار کی مالکیت مطلقہ اور تمام اشیاء پر اس کے احاطے کا تذکرہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خدا کی ملکیت ہے کیونکہ خدا تمام چیزوں پر محیط ہے (و لله ما فی السموات و ما فی الارض وکان الله بکل شیء محیطا) یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا نے ابراہیمؑ کو اپنا دوست اس وجہ سے نہیں بنایا کہ خدا کو کسی چیز کی ضرورت اور احتیاج تھی بلکہ خدا تو سب سے بے نیاز ہے۔ یہ انتخاب تو ابراہیمؑ کی خوبیوں اور بہترین صفات کی وجہ سے ہے۔

۱۲۷- وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِي يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ اَنْ تَنْكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ وَاَنْ تَقُومُوا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ

---

[1] یہ حدیث مجمع البیان میں زیر بحث آیت کے ذیل میں بیان کی گئی ہے۔

[2] تفسیر صافی اور تفسیر برہان ج ۱، ص ۴۱۷ ـ بحوالہ عیون اخبار الرضا۔

اللہ کَانَ بِہٖ عَلِیۡمًا ○

ترجمہ

۱۲۷۔ تجھ سے عورتوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ خدا اس بارے میں تمہیں جواب دیتا ہے اور جو کچھ قرآن میں یتیم عورتوں کے متعلق، جن کے حقوق تم ادا نہیں کرتے اور ان سے شادی کر لینا چاہتے ہو اور اسی طرح چھوٹے بچوں اور ناتوانوں کے متعلق تمہارے لیے بیان ہوا ہے (اس سلسلے میں خدا کی کچھ وصیتیں ہیں اور خدا یہ بھی سفارش کرتا ہے) کہ یتیموں کے ساتھ عادلانہ برتاؤ کرو اور جو نیکیاں تم انجام دیتے ہو خدا ان سے آگاہ ہے (اور وہ تمہیں ان کا مناسب بدلہ دے گا)۔

تفسیر

حقوق نسواں کے بارے میں مزید گفتگو

زیرِ نظر آیت میں کچھ لوگوں کے اعتراضات اور سوالات کا جواب دیا گیا ہے جو انہوں نے عورتوں (خصوصاً یتیم لڑکیوں) کے متعلق کیے تھے ارشاد ہوتا ہے: اے پیغمبر! تم سے عورتوں سے متعلق احکام پوچھتے ہیں۔ کہو کہ خدا اس سلسلے میں تمہیں جواب دیتا ہے (ویستفتونک فی النساء قل اللہ یفتیکم فیھن)۔

مزید ارشاد ہوتا ہے وہ یتیم لڑکیاں جن کے مال پر تم قبضہ کر لیتے تھے نہ ان سے شادی کرتے تھے اور نہ ان کا مال ان کے سپرد کرتے تھے تاکہ وہ کسی اور سے شادی کر لیں۔ قرآن مجید ان کے بارے میں کچھ اور سوالوں کا جواب دیتا ہے اور اس ظالمانہ روش کی برائی کو واضح کرتا ہے (وما یتلی علیکم فی الکتاب فی یتمی النساء اللاتی لا تؤتونھن ماکتب لھن وترغبون ان تنکحوھن)[1]۔

اس کے بعد چھوٹے بچوں کے بارے میں وصیت کی گئی ہے جو کہ زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق میراث سے محروم رہتے تھے فرمایا گیا ہے: خدا تمہیں وصیت کرتا ہے کہ تم کمزور بچوں کے حقوق کا لحاظ رکھو (والمستضعفین من الولدان)۔

---

[1] اس جملے کی مذکورہ تفسیر سے واضح ہوتا ہے کہ "ما یتلی" مبتدا ہے اور "یفتیکم فیھن" اس کی خبر ہے جو آیت کے سابق حصے کے قرینہ سے محذوف ہے اور لفظ "ترغبون" بھی یہاں مقابلہ نہ ہونے کے معنی میں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ "رغب" کا مادہ اگر "عن" کے ساتھ متعدی ہو تو عدم تمائل اور اعراض کے معنی دیتا ہے اور اگر "فی" کے ساتھ متعدی ہو تو مائل و راغب ہونے کے معنی دیتا ہے قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "عن" مقدر ہے۔

ایک مرتبہ پھر یتیموں کے حقوق کے بارے میں ایک مجموعی تاکید کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے، خدا تمہیں وصیت کرتا ہے کہ یتیموں سے عدل کرو (وان تقوموا للیتامی بالقسط)۔

آخر میں اس مسئلے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جیسا عمل خصوصاً یتیموں اور کمزوروں سے متعلق تم سے سرزد ہو وہ علم خدا کی نظر سے مخفی نہیں رہتا اور اس کی مناسب جزا ملے گی (وما تفعلوا من خیر فان اللہ کان بہ علیماً)۔

ضمناً اس طرف بھی توجہ رہے کہ "تستفتونک" دراصل "فتویٰ" اور "فتیا" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے مشکل مسائل کا جواب دینا۔ لغت میں اس کی بنیاد یہ ہو کہ "فتی" ہے جس کا معنی ہے "نوجوان"۔ لہٰذا ممکن ہے پہلے پہل یہ لفظ ان مسائل کے لیے استعمال ہوتا ہو کہ جن کے جوابات جاذب اور تازہ ہوتے ہوں اور بعد از اں ہر طرح کے مسائل کے جواب کے لیے استعمال ہونے لگا ہو۔

۱۲۸۔ وَاِنِ امۡرَاَةٌ خَافَتۡ مِنۡۢ بَعۡلِهَا نُشُوۡزًا اَوۡ اِعۡرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۤ اَنۡ يُّصۡلِحَا بَيۡنَهُمَا صُلۡحًا ؕ وَالصُّلۡحُ خَيۡرٌ ؕ وَاُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ۝

ترجمہ

۱۲۸۔ اور اگر کوئی عورت اپنے شوہر کے بارے میں اس بات سے خوفزدہ ہو کہ وہ سرکشی یا اعراض کا مرتکب ہوگا تو کوئی حرج نہیں کہ وہ آپس میں صلح کریں (اور عورت یا مرد صلح کی خاطر اپنے کچھ حقوق سے صرفِ نظر کریں) اور صلح بہتر ہے اگرچہ یہ لوگ (حبِ ذات کی فطرت کے مطابق ایسے مواقع پر) بخل سے کام لیتے ہیں اور اگر نیکی کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو (اور صلح کی وجہ سے درگذر کردو) تو خدا اس سے آگاہ ہے جو کچھ تم انجام دیتے ہو (اور وہ تمہیں مناسب جزا دے گا)۔

شانِ نزول

بہت سی اسلامی تفاسیر اور کتبِ احادیث میں اس آیت کی شانِ نزول یوں بیان ہوئی ہے:

رافع بن خدیج کی دو بیویاں تھیں، ایک سن رسیدہ تھی اور دوسری جوان۔ (بعض اختلافات کی بنیاد پر) اس نے اپنی سن رسیدہ بیوی کو طلاق دے دی۔ ابھی عدت کی مدت ختم نہ ہوئی

حتی کہ رافع نے اس سے کہا، اگر تم چاہو تو میں تم سے مصالحت کر لیتا ہوں البتہ اگر میں نے دوسری بیوی کو تجھ پر ترجیح دی تو تمہیں صبر کرنا ہوگا اور اگر ایسا نہ چاہو تو پھر مدت کی مدت ختم ہونے تک صبر کرو تاکہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔

اس عورت نے پہلی تجویز قبول کر لی، یوں ان کی آپس میں صلح ہو گئی۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں اس معاملے کے بارے میں حکم شریعت بیان کیا گیا ہے۔

تفسیر

صلح بہتر ہے

جیسا کہ اسی سورت کی چونتیسویں اور پینتیسویں آیات کی تفسیر میں ہم کہہ چکے ہیں[1] کہ "نشوز" اصل میں "نشز" کے مادہ سے ہے اور اس کا مطلب ہے "بلند زمین"۔ یہ لفظ جب عورت اور مرد کے بارے میں استعمال ہوتا ہے تو سرکشی اور طغیان کا مفہوم دیتا ہے۔

گزشتہ آیات میں عورت کے "نشوز" سے مربوط احکام بیان ہوئے تھے اور زیر نظر آیت میں مرد کے "نشوز" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، جب عورت یہ محسوس کرے کہ اس کا شوہر سرکشی اور اعراض کا ارتکاب کر رہا ہے تو کوئی حرج نہیں کہ حریم زوجیت کی حفاظت کے لیے اپنے کچھ حقوق سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صلح کرلے (وان امرأة خافت من بعلها نشوزًا او اعراضًا فلا جناح علیهما ان یصلحا بینهما صلحًا)۔

عورت نے چونکہ اپنے کچھ حقوق سے اپنی رضا اور رغبت سے اعراض کر لیا ہے اور جبر و اکراہ والی کوئی بات نہیں۔ لہٰذا اس کا کوئی گناہ نہیں۔ اس کے لیے "لا جناح" (کوئی حرج اور گناہ نہیں) کا استعمال بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

اس آیت کی شانِ نزول کی طرف توجہ کرنے سے ضمنی طور پر دو فقہی مسئلے بھی معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ دو بیویوں کے لیے ہفتہ بھر کے اوقات کی تقسیم جیسے احکام حقوق کے پہلو سے ہیں نہ کہ حکم کے حوالے سے۔ اسی لیے عورت یہ حق رکھتی ہے کہ اپنے ارادہ و اختیار سے اپنے اس حق سے جزوی یا کلی طور پر صرفِ نظر کرلے۔

۲۔ ضروری نہیں کہ صلح کا معاوضہ مال ہی ہو بلکہ صلح کا معاوضہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنا حق چھوڑ دیا جائے۔

بعد ازاں صلح پر تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے، بہر حال صلح بہتر ہے (والصلح خیر) یہ ایک چھوٹا سا پُر معنی اور پر مغز جملہ ہے۔ اس آیت میں جملہ اگرچہ خانگی اختلافات سے متعلق آیا ہے لیکن واضح ہے کہ یہ ایک کلی اور عمومی قانون ہے

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۲

جو ہر ایک کے لیے ہر مقام پر ہے۔ صلح و صفائی، دوستی اور محبت کو ہر مقام پر پیش نظر رکھنا چاہیے۔ نزاع و کشمکش اور ایک دوسرے سے دُوری انسان کی طبع سلیم اور پرسکون زندگی کے برخلاف ہے اس لیے استثنائی صورت میں جہاں ناگزیر ہو اس کے سوا نزاع اور دوری کا راستہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اسلام کے اس حکم کے برعکس بعض مادہ پرستوں کا خیال ہے کہ انسانی زندگی کی پہلی بنیاد دیگر جانوروں کی طرح بقا کی کشمکش اور تنازع ہے اور اسی طرح سے تکامل اور ارتقاء صورت پذیر ہوتا ہے۔ شاید یہی طرزِ فکر گذشتہ چند صدیوں کی بہت سی جنگوں اور خوں ریزیوں کا سرچشمہ ہے۔ حالانکہ انسان اپنی عقل و کوشش کے سبب دیگر جانوروں سے مختلف ہے اور اس کی ارتقاء اور تکمیل کا ذریعہ تنازع نہیں تعاون ہے[۱] اصولی طور پر تنازع بقاء کا نظریہ تو جانوروں کے تکامل کے لیے بھی کوئی قابلِ قبول بنیاد نہیں رکھتا۔

اس کے بعد بہت سے لڑائی جھگڑوں اور درگذر نہ کرنے کی بنیاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے، لوگ ذاتی طور پر اور حُبِ ذات کی فطرت کے باعث بخل کی موجوں میں پھنس کے رہ جاتے ہیں اور ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ اپنے حقوق سب کم و کاست وصول کرے اور یہی تمام لڑائی جھگڑوں کی بنیاد ہے (و احضرت الا نفس الشح)۔

لہذا اگر عورت اور مرد اس حقیقت کی طرف توجہ کریں کہ بہت سے اختلافات کا سرچشمہ بخل ہے اور بخل ایک مذموم صفت ہے پھر وہ اپنی اصلاح کی کوشش کریں اور درگذر کی راہ اختیار کریں تو نہ صرف یہ کہ خانگی اختلافات ختم ہو جائیں گے بلکہ بہت سے اجتماعی جھگڑے بھی جاتے رہیں گے۔ اس کے باوجود، اس بناء پر کہ مرد کہیں اس حکم سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں آیت کے آخر میں [illegible] ان کی طرف کرتے ہوئے انھیں نیکی اور پرہیزگاری کی وصیت کی گئی ہے اور انھیں کہا گیا ہے کہ وہ اپنے اعمال و کردار پر نگاہ رکھیں اور راہِ حق و عدالت سے منحرف نہ ہوں، کیونکہ خدا ان کے تمام اعمال سے آگاہ ہے

(و ان تحسنوا و تتقوا فان اللہ کان بما تعملون خبیرا)۔

۱۲۹۔ وَلَنْ تَسْتَطِيعُوٓا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۚ وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ○

۱۳۰۔ وَإِنْ يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا ○

---

[۱] اس سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد اوّل میں تنازع بقاء کے زیرعنوان تفصیلی گفتگو کی جاچکی ہے (دیکھیے ص ۵۹۲ اردو ترجمہ)

ترجمہ

۱۲۹- اور تم ہرگز یہ استطاعت نہیں رکھتے کہ (دلی محبت کے اعتبار سے) عورتوں کے درمیان عدالت کرسکو چاہے جتنی بھی کوشش کرو لیکن اپنا میلان بالکل ایک طرف نہ رکھو اور دوسری کو معلق نہ چھوڑ دو اور اگر اصلاح اور پرہیزگاری کی راہ اختیار کرو تو خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

۱۳۰- اور اگر (صلح صفائی کی کوئی صورت نہ ہو اور) ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو خداوند عالم ان میں سے ہر ایک کو اپنے فضل و کرم سے مطمئن کر دے گا اور خدا صاحب فضل و کرم اور حکیم ہے۔

تفسیر

ایک سے زیادہ شادیوں کے لیے عدالت شرط ہے۔

گذشتہ آیت کے آخر میں جس جملے میں احسان، تقویٰ اور پرہیزگاری کا حکم دیا گیا ہے، وہ شوہروں کے بارے ایک طرح کی دھمکی بھی ہے کہ انھیں اپنے بیویوں کے بارے میں راہ عدالت سے تھوڑا سا انحراف بھی نہیں کرنا چاہیے اس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ عدالت تو دلی لگاؤ کے سلسلے میں بھی ممکن نہیں ہے لہٰذا متعدد بیویاں ہونے کی صورت میں کیا کیا جائے۔

زیر بحث آیت اس سوال کے جواب میں کہتی ہے: محبت کے حوالے سے تو بیویوں کے درمیان عدالت ممکن نہیں ہے چاہے اس کے لیے کتنی بھی کوشش کیوں نہ جائے (ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم)۔

"ولو حرصتم" سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جو اس سلسلے میں بہت کوشش کرتے تھے، شاید اس کی وجہ اسی سورہ کی آیت ۳ تھی جس میں فرمایا گیا ہے:

فان خفتم الا تعدلوا فواحدة

یعنی ـــــ اگر تم اس بات سے ڈرو کہ تم عدل قائم نہیں کرسکو گے تو ایک ہی پر اکتفا کرو ـــــ

یہ واضح ہے کہ ایک آسمانی قانون خلاف فطرت نہیں ہو سکتا اور ممکن نہیں کہ وہ "تکلیف مالا یطاق" یعنی ـــــ ایسی ذمہ داری جس کی انسان میں طاقت نہ ہو، کا حامل ہو۔ دل کی محبت کے مختلف عوامل ہوتے ہیں جن میں سے بعض انسانی اختیار سے ماوراء ہیں لہٰذا ان کے بارے میں عدالت کا حکم نہیں دیا گیا ہے لیکن بیویوں سے برتاؤ اور ان کے حقوق کا لحاظ رکھنے کے بارے میں انسان پر عدالت کے لیے زور دیا گیا ہے جو کہ انسان کے بس میں ہے۔

اس بنا پر کہ مرد اس سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں اس جملے کے بعد فرمایا گیا ہے، جب کہ تم محبت کے حوالے سے بیویوں کے درمیان مساوات قائم نہیں کرسکتے تو پھر سارا رجحان اور قلبی لگاؤ تو ایک طرف نہ رکھو کہ جس سے دوسری بالکل معلق ہو کر رہ جائے اور

اس کے حقوق عملی طور پر ضائع ہو جائیں (فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقۃ)۔

آیت کے آخر میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو اس حکم کے نزول سے قبل اپنی بیویوں کے درمیان عدل میں کوتاہی کرتے تھے، ارشاد ہوتا ہے، اگر وہ اصلاح اور تقویٰ کی راہ اپنائیں اور گذشتہ رویے کی تلافی کریں تو خدا اپنی رحمت و بخشش ان کے شامل حال کر دے گا (وان تصلحوا وتتقوا فان اللہ کان غفورًا رحیمًا)۔

اسلامی روایات میں بیویوں کے درمیان عدالت ملحوظ رکھنے سے متعلق بہت سے مطالب مذکور ہیں جن سے اس قانون کی اہمیت اور عظمت ظاہر ہوتی ہے ایک حدیث میں ہے کہ حضرت علیؑ جو دن کسی ایک بیوی سے تعلق رکھتے تھے، اس دن وضو بھی دوسری کے گھر نہیں کرتے تھے[1]

پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں بھی ہے کہ آپ بیماری کے عالم میں بھی کسی ایک بیوی کے گھر قیام نہیں کرتے تھے

معاذ بن جبل کے بارے میں منقول ہے کہ اس کی دو بیویاں تھیں وہ دونوں طاعون کی بیماری کے باعث اکٹھی مر گئیں تو معاذ نے ایک کو دوسری سے پہلے دفن کرنے کے لیے بھی قرعہ نکالا تاکہ اس سے کوئی خلاف عدالت کام نہ ہو جائے[2]

ایک اہم سوال کا جواب

جیسا کہ اس سورہ کی آیت ۳ کے ذیل میں ہم نے یاد دہانی کروائی ہے کہ بعض ناسمجھ لوگ اس آیت کو زیر بحث آیت سے ملا کر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ایک سے زیادہ شادیاں عدالت سے مشروط ہیں اور عدالت ممکن نہیں ہے لہٰذا ایک سے زیادہ بیویاں کرنا اسلام میں ممنوع ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ روایاتِ اسلامی سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا شخص جس نے یہ اعتراض اٹھایا تھا امام جعفر صادقؑ کا ہم عصر تھا اور مادہ پرستوں میں سے تھا۔ اس کا نام ابن ابی العوجاء تھا۔ اس نے یہ سوال اسلام کے ایک مجاہد عالم ہشام بن حکم سے کیا۔ انھیں اس کا جواب معلوم نہ تھا لہٰذا وہ اپنے وطن جو ظاہراً کوفہ تھا سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تاکہ اس سوال کا جواب معلوم کر سکیں وہ امام صادقؑ کی خدمت میں پہنچے۔ حضرتؑ کو تعجب ہوا کہ وہ حج و عمرہ کے دنوں کے بغیر مدینہ کیوں چلے آئے ہیں۔ ہشام نے بیان کیا کہ اس قسم کا سوال پیش آیا ہے۔

امامؑ نے جواب میں فرمایا:

> سورۂ نساء کی تیسری آیت میں عدالت سے مراد نان نفقہ (اور حقوقِ زوجیت کا لحاظ رکھنا اور برتاؤ) ہے لیکن آیت ۱۲۹ میں عدالت جسے امر محال شمار کیا گیا ہے دلی لگاؤ اور میلان میں عدالت ہے (اس لیے تعدد ازواج شرائط اسلامی کے احترام کی صورت میں ممنوع ہے نہ محال)۔

---

[1] تفسیر تبیان، ج ۳، صفحہ ۲۵۰

[2] تفسیر تبیان ج ۳، صفحہ ۲۵۰

ہشام سفر سے لوٹ کر آئے اور یہ جواب ابن ابی العوجاء کو پیش کیا تو اس نے قسم کھا کر کہا:

یہ جواب خود تمھاری طرف سے نہیں ہے۔ [1]

واضح ہے کہ اگر ہم دو آیات میں "عدالت" کا الگ الگ مفہوم بیان کرتے ہیں تو یہ آیات میں موجود واضح قرینہ کی بناء پر ہے۔ محل بحث آیت میں صریحاً فرمایا گیا ہے کہ تمام قلبی لگاؤ ایک بیوی کی طرف نہ رکھو۔ لہٰذا دو بیویاں ہونا جائز شمار کیا گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس شرط کے ساتھ کہ عملی طور پر ان میں سے کسی پر ظلم نہ ہو اگرچہ دلی لگاؤ میں فرق ہو۔ نیز اسی سورت کی آیت ۳ میں صراحت کے ساتھ ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دی گئی ہے۔

پھر بعد کی آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اگر ازدواجی زندگی کو باقی رکھنا طرفین کے لیے مشکل ہو گیا ہے اور ایسی وجوہ پیدا ہو گئی ہیں کہ جن سے افقِ حیات ان کے لیے تاریک ہو گیا ہے اور کسی طرح مصالحت نہیں ہو سکتی تو وہ مجبور نہیں ہیں کہ ایسی ازدواجی زندگی کو باقی رکھیں اور آخر دم تک خانگی زندان کے ماحول میں تلخ کامی سے رہیں بلکہ وہ ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہیں۔ ایسے عالم میں انھیں چاہیے کہ جرأت سے اقدام کریں اور آنے والے حالات سے خوف زدہ نہ ہوں کیونکہ اگر وہ ان حالات میں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو خداوند بزرگ و برتر دونوں کو اپنے فضل و کرم سے مطمئن کر دے گا اور امید ہے کہ بہتر جیون ساتھی اور روشن تر زندگی ان کے انتظار میں ہو (وان یتفرقا یغن اللہ کلا من سعتہ) کیونکہ خدا کی حکمت آمیز رحمت بہت وسیع ہے (وکان اللہ واسعًا حکیمًا)۔

۱۳۱۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ۝

۱۳۲۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝

۱۳۳۔ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ۝

۱۳۴۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ

---

[1] تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۴۲۰

وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝

ترجمہ

۱۳۱۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اللہ کا ہے اور جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تمھیں ہم نے وصیت کی کہ خدا کی (نافرمانی) سے ڈرو اور پرہیز کرو اور اگر کافر ہوجاؤ تو (خدا کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ کا مال ہے اور خدا بے نیاز ہے اور لائقِ تعریف ہے۔

۱۳۲۔ اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے خدا کے لیے ہے اور خدا ان کی حفاظت اور نگہبانی کے لیے کافی ہے۔

۱۳۳۔ اے لوگو! اگر وہ چاہے تو تمھیں یہاں سے لے جائے اور (تمھاری جگہ) دوسرے لوگوں کو لے آئے اور خدا اس کام کی طاقت و قدرت رکھتا ہے۔

۱۳۴۔ جو لوگ دنیا کی جزا اور سزا چاہتے ہیں (اور معنوی اور اخروی نتائج کے طلبگار نہیں وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ) خدا کے پاس تو دنیا و آخرت دونوں کی جزا و ثواب ہے اور وہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو چکا ہے کہ اگر حالات مجبور کریں کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے جدا ہوجائیں اور اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہ ہو تو اس اقدام میں کوئی حرج نہیں اور آئندہ کے حالات سے نہیں ڈرنا چاہیے کیونکہ خدا انھیں اپنے فضل و کرم سے مطمئن اور بے نیاز کر دے گا۔

زیرِ نظر آیات میں سلسلہ کلام جاری ہے پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ہم انھیں بے نیاز اور مستغنی کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ کیونکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ کی ملکیت ہے (وللہ ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض)۔

جو ذات ایسی لامتناہی ملکیت اور بے پایاں قدرت رکھتی ہے وہ اپنے بندوں کو بے نیاز کرنے سے عاجز نہیں ہوسکتی۔

اس کے بعد اس موقع پر اور دیگر مواقع پر پرہیزگاری اختیار کرنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہود و نصاریٰ کو اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے صاحبِ کتاب ہیں اور اسی طرح تمھیں بھی ہم نے وصیت کی ہے کہ پرہیزگاری اختیار کرو (ولقد وصینا الذین اوتوا الکتاب من قبلکم و ایاکم ان اتقوا اللہ)۔

اس کے بعد روئے سخن مسلمانوں کی طرف کرتے ہوئے فرمایا: تقویٰ اختیار کرنے کا یہ حکم تمھارے فائدے میں ہے اور خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے اور اگر تم روگردانی کرو، نافرمانی کی راہ اپناؤ تو خدا کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا

کیونکہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کی ملکیت ہے اور وہ بے نیاز ہے اور لائق ستائش ہے (وان تکفروا فان للہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض وکان اللہ غنیًا حمیدًا) دراصل حقیقی معنی میں غنی اور بے نیاز تو خدا ہی ہے کیونکہ وہ غنی بالذات ہے اور کسی اور کی بے نیازی اسی کی مدد سے ہے۔ ورنہ ذاتی طور پر تو سب کے سب محتاج اور نیازمند ہیں اسی طرح وہی بالذات لائق ستائش ہے کیونکہ جن کمالات کی وجہ سے وہ تعریف و ستائش کے لائق ہے وہ اس کی ذات میں ہیں نہ کہ دوسروں کے کمالات کی طرح کہ جو عاریتاً انھیں دیئے جاتے ہیں اور کسی دوسرے کی طرف سے ہیں۔

بعد والی آیت میں یہ جملہ تیسری مرتبہ آیا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے خدا کی ملکیت ہے اور خدا ان کی حفاظت و نگہبانی اور انتظام و انصرام کرتا ہے (وللہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض وکفی باللہ وکیلًا)۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے مختصر سے فاصلے میں ایک مطلب کا تین مرتبہ تکرار کیوں کیا گیا ہے۔ کیا یہ تکرار صرف تاکید کے لیے ہے یا کچھ اور اشارے بھی اس میں مضمر ہیں۔ آیات میں غور و فکر کیا جائے اور دقت نظر سے کام لیا جائے تو ہر مرتبہ اس بات کے ذکر میں ایک نکتہ دکھائی دیتا ہے۔

پہلی مرتبہ دونوں میاں بیوی سے وعدہ کرتا ہے کہ ایک دوسرے سے الگ ہو جانے کے بعد خدا انھیں بے نیاز کر دے گا۔ اس موقع پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرنے پر قدرت رکھتا ہے اس نے اپنی زمین و آسمان کی وسعتوں کی ملکیت کا تذکرہ کیا ہے۔

دوسری مرتبہ تقویٰ و پرہیزگاری کی وصیت کے بعد یہ ذکر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ اس فرمان کی اطاعت کا خدا کو کوئی فائدہ نہیں ہے یا اس کی مخالفت اس کے لیے ضرر رساں نہیں ہے۔ درحقیقت یہ بات اس کے مشابہ ہے جو حضرت امیرالمومنین علیؑ نے نہج البلاغہ میں خطبہ ہمام کی ابتداء میں فرمایا ہے:

> ان اللہ سبحانہ وتعالٰی خلق الخلق حین خلقھم غنیا عن طاعتھم امنا من معصیتھم لانہ لاتضرہ معصیۃ من عصاہ ولا تنفعہ طاعۃ من اطاعہ
>
> یعنی ــــــ خدائے متعال نے انسانوں کو پیدا کیا جب کہ وہ ان کی اطاعت سے بے نیاز تھا اور ان کی نافرمانی سے امان میں تھا کیونکہ نہ تو گنہ گاروں کی نافرمانی اسے نقصان پہنچاتی ہے اور نہ اطاعت کرنے والوں کی اطاعت اسے فائدہ پہنچاتی ہے [1]

تیسری مرتبہ آیہ ۱۳۳ میں موجود بحث کے عنوان کے طور پر اس کا تذکرہ ہے اس کے بعد فرمایا گیا ہے، خدا کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں کہ تمھیں ختم کر دے اور تمھاری جگہ زیادہ آمادہ پختہ ارادے والا گروہ پیدا کر دے جو اس کی اطاعت میں زیادہ کوشاں ہو اور خدا ایسا کرنے پر قادر ہے (ان یشأ یذھبکم ایھا الناس ویأت بٰاخرین وکان اللہ علی ذٰلک قدیرًا)۔

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۳

تفسیر تبیان اور مجمع البیان میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو پیغمبر اکرمؐ نے اپنا ہاتھ سلمان کی پشت پر مارا اور فرمایا :

وہ گروہ عجم اور فارس کے یہ لوگ ہیں ۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان درحقیقت ان عظیم خدمات کی پیش گوئی ہے جو ایرانی مسلمانوں نے اسلام کے لیے کی ہیں ۔

آخری آیت میں ان لوگوں کے بارے میں بیچ میں گفتگو آگئی ہے جو خدا پر ایمان لانے کا دم بھرتے ہیں، میدان جہاد میں شرکت کرتے ہیں اور احکام اسلام کی پابندی کرتے ہیں مگر ان کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول نہیں ہوتا ، بلکہ مادی نتائج شلاً مال غنیمت کا حصول ہوتا ہے ارشاد فرمایا گیا ہے ، جو لوگ صرف دنیا کی جزا چاہتے ہیں وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ خدا کے پاس تو دنیا و آخرت دونوں کی جزا اور ثواب ہے (من کان یرید ثواب الدنیا فعند اللہ ثواب الدنیا و الاٰخرۃ) لہٰذا وہ دونوں کی جستجو کیوں نہیں کرتے اور خدا سب کی نیتوں سے آگاہ اور ہر محل و مقام پر اس کی نظر ہے اور منافق صفت لوگوں کے اعمال سے باخبر ہے (و کان اللہ سمیعًا بصیرًا) ۔

یہ آیت ایک مرتبہ پھر یہ حقیقت بیان کرتی ہے کہ اسلام کی نگاہ صرف معنوی اور اخروی پہلوؤں پر نہیں بلکہ وہ اپنے پیروکاروں کے لیے مادی اور روحانی دونوں طرح کی سعادتیں چاہتا ہے ۔

۱۳۵۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ ۚ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَ اِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ○

ترجمہ

۱۳۵۔ اے ایمان والو ، مکمل طور پر عدالت کے ساتھ قیام کرو ، خدا کے لیے گواہی دو اگرچہ یہ خود تمہارے لیے یا تمہارے والدین کے لیے یا تمہارے اقربا کے لیے نقصان دہ ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اگر وہ غنی یا فقیر ہوں تو خدا حق رکھتا ہے کہ ان کی حمایت کرے اس لیے ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو ، اس طرح تو حق سے منحرف ہو جاؤ گے ۔ اور اگر حق میں تحریف کرو گے یا اس کے اظہار سے اعراض کرو گے تو جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے ۔

تفسیر

عدالتِ اجتماعی

گذشتہ آیات میں خصوصیت سے یتیموں اور بیویوں سے عدالت کے بارے میں احکام تھے اب زیرِ نظر آیت میں بلا استثناء ایک بنیادی اور کُلّی قانون کے ذریعے سب اہل ایمان کو اجرائے عدالت کا حکم دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ عدالت قائم کریں اور عدالت سے کام لیں (یاایھا الذین اٰمنوا کونوا قوامین بالقسط)۔

توجہ رہے کہ " قوامین " " قوام " کی جمع ہے یہ مبالغے کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے " بہت قیام کرنے والا "۔ یعنی ہر حالت میں، ہر کام میں، ہر مقام پر اور ہر دور میں عدالت کے ساتھ قیام کرو تاکہ یہ عمل تمہارے اخلاق اور عادات کا حصّہ بن جائے اور اس سے انحراف تمہاری طبیعت، مزاج اور روح کے خلاف ہو جائے۔

" قیام " شاید یہاں اس بنا پر استعمال کیا گیا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ عام طور پر کام کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور کام کے پیچھے لگ جائے اس لیے کسی کام کے لیے قیام کا مطلب یہ ہے کہ اس کام کے لیے عزم راسخ اور مضبوط ارادے سے اقدام کیا جائے۔ اگرچہ وہ کام حکم قاضی کی شکل قیام وتحرک کا محتاج بھی نہ ہو۔ نیز ممکن ہے لفظ " قیام " کا استعمال اس لحاظ سے ہو کہ عام طور پر قائم اس چیز کو کہتے ہیں جو زمین پر عمودی شکل میں ہو اور کسی طرف بھی تھوڑا سا جھکاؤ بھی نہ رکھتی ہو یعنی یعنی عدالت کا اجراء اس طرح سے کرنا چاہیے کہ تھوڑا سا انحراف بھی نہ ہو۔

اس کے بعد تاکید کے لیے مسئلہ شہادت کے حوالے سے ارشاد ہوتا ہے، خاص طور پر شہادت اور گواہی کے معاملے میں تمام مفادات اور تعلّقات کو ایک طرف کر کے فقط خدا کے لیے گواہی دو اگرچہ وہ خود تمہاری ذات، تمہارے ماں باپ اور اعزا و اقربا کے نقصان میں ہو (شہداء للّٰہ ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین)۔

یہ بات تمام معاشروں میں موجود ہے اور خصوصاً زمانہ جاہلیت کا معاشرہ اس کا شکار تھا کہ عام طور پر گواہی دینے والے اپنی محبت ونفرت کے جذبات کے زیر اثر گواہی دیتے اور حق وعدالت کی ان کے ہاں کوئی اہمیت نہ ہوتی۔ ابن عباس سے منقول ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نو مسلم افراد مدینہ میں آجانے کے بعد بھی رشتہ داری کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے عزیزوں کے نقصان میں گواہی دینے سے احتراز کرتے تھے۔ مندرجہ بالا آیت اسی ضمن میں نازل ہوئی اور اس کے ذریعے ایسے لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے[1]

جیسا کہ آیت اشارہ کر رہی ہے یہ کام روح ایمان سے مطابقت نہیں رکھتا۔ حقیقی مومن وہی ہے جو حق اور عدالت کے سامنے کسی کا لحاظ نہ کرے یہاں تک کہ اپنے اور اپنے رشتہ داروں کے مفادات کی پرواہ نہ کرے۔

---

[1] المنار جلد ۵ صفحہ ۴۵۵

اس جملے سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عدالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے رشتہ دار ایک دوسرے کے نفع یا نقصان میں گواہی دے سکتے ہیں (ہاں البتہ اس میں اس تہمت کا اندیشہ نہ ہو کہ طرفداری یا تعصب سے کام لیا جارہا ہے)۔

اس کے بعد اصولِ عدالت سے انحراف کے کچھ اور عوامل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، نہ دولت مندوں کی دولت شہادتِ حق سے مانع ہو اور نہ فقیر کے فقر کو دیکھ کر پیدا ہونے والے جذبات، کیونکہ شہادتِ حق جس کے نقصان میں جاری ہو وہ دولت مند ہو یا فقیر، خدا اس کے حالات سے زیادہ آگاہ ہے۔ پروردگار کی حمایت کے مقابلے میں اہلِ ثروت و اہلِ اقتدار بھی گواہی دینے والے کو نقصان نہیں پہنچا سکتے اور نہ عدالت کے اجراء سے فقیر ہی ہچکارہ سکتا ہے (ان یکن غنیا او فقیرا فاللّٰہ اولی بھما)۔

دوبارہ تاکید کے طور پر حکم دیا گیا ہے، ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو، مبادا اجرائے عدالت میں رکاوٹ پیدا ہو جائے (فلا تتبعوا الھوی ان تعدلوا[1])۔

اس جملے سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ظلم و ستم کا سرچشمہ ہوا پرستی ہے اور اگر کوئی معاشرہ ہوا پرست نہ ہو تو ظلم و ستم وہاں قدم نہیں رکھ سکتا۔

دوبارہ قیامِ عدالت کی اہمیت کے پیش نظر فرماتا ہے، اگر تم حق دار تک اس کا حق پہنچنے میں حائل ہوئے یا حق میں تحریف کی یا حق آشکار ہو جانے کے بعد اس سے اعراض کیا تو خدا تمہارے اعمال سے آگاہ ہے (و ان تلووا[2] او تعرضوا فان اللّٰہ کان بما تعملون خبیرا) "تلووا" دراصل تحریف حق اور حق میں تغیر و تبدل کی طرف اشارہ ہے "تعرضوا" حق کے مطابق حکم کرنے سے اعراض اور منہ موڑنے کے معنی میں ہے۔ یہی بات امام باقرؑ سے منقول ایک حدیث میں بیان کی گئی ہے[3]

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ آیت میں "خبیر" کا لفظ آیا ہے "علیم" کا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "خبیر" عموماً اسے کہتے ہیں جو کسی چیز کی جزئیات اور ذرہ ذرہ سے واقف ہو۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ حق سے تمہارے ذرا سے انحراف سے بھی واقف ہے چاہے تم اسے کسی بہانے سے کرو اور چاہے اسے حق بجانب قرار دے لو اور وہ اس کی سزا بھی دے گا۔

زیرِ نظر آیت اجتماعی عدالت کے بارے میں اسلام کی گہری دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے اور اس کی ہر شکل و صورت کو مکمل طور پر واضح کرتی ہے اس سلسلے میں عدالتِ اجتماعی کے بارے میں ان چند جملوں میں موجود طرح طرح کی تاکیدیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اسلام اس اہم انسانی مسئلے میں کس قدر حساس ہے البتہ یہ امر انتہائی افسوس ناک ہے کہ مسلمانوں کا عمل اور اسلام

---

[1] لفظ — تعدلوا ممکن ہے "عدالت" کے مادہ سے ہو یا "عدول" کے مادہ سے ہو اگر "عدالت" کے مادہ سے ہو تو اس کا معنی یہ ہوگا فلا تتبعوا الھوی لان تعدلوا (ہوس پرستی کی راہ نہ اپناؤ تاکہ تم عدالت کا اجرا کر سکو) اور اگر "عدول" کے مادہ سے ہو تو اس کا معنی یوں ہوگا فلا تتبعوا الھوی فی ان تعدلوا (انحراف حق کی راہ میں ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو)۔

[2] "تلووا" مادہ "لی" (بروزن "طی") سے ہے اس کا معنی ہے "روکنا" یا "تاخیر"۔ یہاں دراصل پیچ و تاب دینے کی معنی میں آیا ہے۔

[3] تفسیر برہان جلد ۵ صفحہ ۳۵۶

کے اس بلند پایہ حکم کے درمیان زمین و آسمان کا فاصلہ ہے اور مسلمانوں کی پس ماندگی کا ایک عامل ان کا یہ طرزِ عمل بھی ہے۔

۱۳۶۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ○

ترجمہ

۱۳۶۔ اے ایمان لانے والو! (واقعی) ایمان لے آؤ خدا پر، اس کے پیغمبر پر، اس کی کتاب پر جو اس پر نازل ہوئی اور ان (آسمانی) کتب پر جو اس سے پہلے بھیجی گئی ہیں اور جو شخص خدا، اس کے ملائکہ، اس کی کتب، اس کے رسل اور روزِ آخرت کا انکار کرے وہ بہت دور کی گمراہی میں مبتلا ہے۔

شانِ نزول

ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ آیت اہلِ کتاب کے بعض سربرآوردہ لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ان میں عبداللہ بن سلام، اسد بن کعب اور اس کا بھائی اسید بن کعب اور بعض دوسرے لوگ شامل تھے وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ ابتداء میں خدمتِ پیغمبرؐ میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ پر، آپ کی کتاب پر، حضرت موسیٰ پر، تورات پر اور عزیر پر ایمان لائے ہیں لیکن ہم باقی آسمانی کتب اور اسی طرح دیگر انبیاء پر ایمان نہیں لائے۔

مندرجہ بالا آیت اسی سلسلے میں نازل ہوئی جس میں انہیں تعلیم دی گئی کہ انہیں سب پر ایمان لانا چاہیے (تفسیر مجمع البیان ملاحظہ)

تفسیر

شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا روئے سخن اہلِ کتاب کے بعض مومنین کی طرف ہے جو خصوص تعصبات کی وجہ سے اسلام قبول کر لینے کے بعد صرف اپنے سابق مذہب اور دینِ اسلام پر اظہارِ ایمان کرتے تھے اور باقی انبیاء اور آسمانی کتب کو قبول نہیں کرتے تھے لیکن قرآن انہیں نصیحت کرتا ہے کہ وہ تمام انبیاء اور آسمانی کتب کو باقاعدہ تسلیم کریں کیونکہ سب ایک ہی حقیقت کا تسلسل ہیں، سب کا ہدف ایک ہی ہے اور سب ایک ہی مبداء کی طرف سے مبعوث ہوئے ہیں (اگرچہ تعلیم کے درجوں کی مختلف کلاسوں کی طرح مراتب کا فرق موجود ہے اور ہر کوئی گذشتہ دین سے کامل تر دین کے ساتھ آیا ہے) اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ان میں سے بعض کو تو قبول کر لیا جائے اور بعض کو نہ کیا جائے کیا ایک ہی حقیقت کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے

اور کیا تعصبات حقائق پر پردہ ڈال سکتے ہیں ـــــ لہٰذا آیت کہتی ہے :

اے ایمان لانے والو! خدا پر، اس کے پیغمبر (رسولِ اسلام) پر اور جو کتاب اس پر نازل ہوئی ہے اس پر نیز گزشتہ آسمانی کتب پر ایمان لے آؤ (یا ایها الذین اٰمنوا اٰمنوا باللّٰه و رسوله والکتاب الذی نزل علیٰ رسوله والکتاب الذی انزل من قبل)۔

مذکورہ شانِ نزول سے قطع نظر آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ روئے سخن ان تمام مومنین کی طرف ہو جو ظاہراً اسلام قبول کر چکے ہیں لیکن ابھی تک ایمان ان کی روح کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ یہاں انھیں دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ صمیم قلب سے مومن بن جائیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ روئے سخن ان تمام مومنین کی طرف ہو جو اجمالی طور پر خدا اور پیغمبر پر ایمان لا چکے ہیں لیکن اسلام کی جزئیات اور عقائد کی تفصیلات سے آشنا نہیں ہیں۔ یہاں قرآن انھیں حکم دیتا ہے کہ حقیقی مومنین کو چاہیے کہ وہ تمام انبیاء، گزشتہ کتب اور خدا کے فرشتوں پر ایمان لے آئیں، کیونکہ ان پر ایمان نہ لانے کا مطلب حکمتِ خداوندی کا انکار ہے کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اللہ جو حکیم ہے اس نے گزشتہ انسانوں کو بغیر رہبر و رہنما کے چھوڑ دیا ہو کہ وہ میدانِ حیات میں سرگرداں رہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جن فرشتوں پر ایمان لانے کے لیے کہا گیا ہے ان سے مراد وحی لانے والے فرشتے ہیں کہ جن پر ایمان لانا انبیاء اور کتبِ آسمانی پر ایمان کے ساتھ لازم و ملزوم ہے یا پھر یہاں تمام فرشتے مراد ہیں کیونکہ جیسے ان میں سے بعض وحی و تشریع کے معاملے میں دخیل ہیں بعض عالمِ تکوین کی تدبیر پر بھی مامور ہیں اور ان پر ایمان لانا حکمتِ الٰہی پر ایمان لانے کا حصہ ہے۔

آیت کے آخر میں ان لوگوں کا انجام بیان کیا گیا ہے جو ان حقائق سے غافل ہیں ارشاد ہوتا ہے : جو شخص خدا، ملائکہ، کتبِ الٰہی، خدا کے فرستادہ انبیاء اور یومِ آخرت کا انکار کرے تو وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا ہے (ومن یکفر باللّٰه وملٰئکته وکتبه ورسله والیوم الاٰخر فقد ضل ضلٰلاً بعیداً) درحقیقت اس آیت میں پانچ اصولوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے اور وہ ہیں مبداء، معاد، آسمانی کتب، انبیاء اور ملائکہ۔

ضلال بعید (دور کی گمراہی) یہ ایک لطیف تعبیر ہے یعنی ایسے لوگ اس طرح سے دور پھینک دیئے گئے ہیں کہ حقیقی شاہراہ کی طرف ان کی واپسی آسانی سے ممکن نہیں ہے۔

۱۳۷۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ۝

۱۳۸۔ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۝

۱۳۹۔ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ

ترجمہ

۱۳۷۔ وہ لوگ جو ایمان لاکر کافر ہو گئے پھر ایمان لائے اور دوبارہ کافر ہو گئے پھر اپنے کفر میں بڑھ گئے خدا انھیں ہرگز نہیں بخشے گا اور نہ ہی انھیں راہ راست کی ہدایت کرے گا۔

۱۳۸۔ منافقین کو بشارت دو کہ دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

۱۳۹۔ جو لوگ اہل ایمان کی بجائے کفار کو اپنا دوست چن لیتے ہیں کیا وہ چاہتے ہیں کہ ان سے عزت حاصل کریں حالانکہ تمام عزتیں تو خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔

تفسیر

ہٹ دھرم منافقین کا انجام

گذشتہ آیت میں بتایا گیا ہے کہ کفار دور کی گمراہی میں ہیں اب اسی مناسبت سے زیر نظر آیت میں سلسلہ کلام آگے بڑھتا ہے پہلی آیت میں ایک ایسے گروہ کی طرف اشارہ ہے جو ہر روز اپنے آپ کو ایک نئی شکل وصورت میں پیش کرتا ہے یہ لوگ ایک دن مومنین کی صف میں ہوتے ہیں، دوسرے دن کفار کے ساتھ، اگلے روز پھر اہل ایمان کے ساتھ ہوتے ہیں پھر خطرناک اور متعصب کافروں کی صفوں میں موجود ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ وہ بت عیار کی طرح ہر لحظہ ایک نیا روپ اختیار کرتے ہیں ہر دفعہ ایک نئے رنگ میں ظاہر ہوتے ہیں اور آخر کار کفر اور بے ایمانی کی حالت میں جان دے دیتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیات میں سے پہلی آیت ایسے اشخاص کے انجام کے بارے میں کہتی ہے، وہ لوگ جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے، پھر ایمان لائے اور پھر کافر ہو گئے اور اپنے کفر میں بڑھ گئے خدا انھیں ہرگز نہیں بخشے گا اور راہ راست کی ہدایت نہیں کرے گا (ان الذین اٰمنوا ثم کفروا ثم اٰمنوا ثم کفروا ثم ازدادوا کفرا لم یکن الله لیغفر لھم ولا لیھدیھم سبیلا)۔

طرز وروش کا یہ تغیر، ہر روز رنگ وروپ کی یہ تبدیلی اور تلون مزاجی کا یہ عالم دراصل اسلامی اصولوں کی صحیح طور پہ تحقیق نہ کرنے کا نتیجہ ہے اور یا منافقین اور اہل کتاب میں سے متعصب کفار کی سازش ہے تاکہ حقیقی مومنین کو متزلزل کیا جا سکے کیونکہ ان کے زعم میں ان کی یہ آمدورفت حقیقی مومنین کے ایمان کو ڈانواں ڈول کر دے گی۔ جیسا کہ سورۂ آل عمران

آیۃ ۲، میں گذر چکا ہے۔

زیر بحث آیت میں ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہ ہونے کے بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے آیت کا موضوع سخن صرف وہ لوگ ہیں جو شدت کفر کی حالت میں بالا غراض دنیا سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں ایسے لوگ اپنے ایمان اور عمل کے پیش نظر بخشش کے لائق ہیں نہ ہدایت کے اہل مگر یہ کہ وہ اپنے معاملے میں تجدید نظر کریں۔

بعد ازاں اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے: ان منافقین کو بشارت دیجیے کہ دردناک عذاب ان کے لیے تیار ہے (بشر المنافقین بان لھم عذابا الیما)۔

"عذاب الیم" کے لیے "بشارت" یا تو ان کے لغو اور بے ہودہ افکار و نظریات کا استہزاء ہے یا پھر "بشر" چہرہ کے معنی سے ہے جو ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے اور ہر اس خبر کو بشارت کہتے ہیں جو انسان کے چہرے پر اثر انداز ہو اور اسے مسرور یا مغموم کر دے۔

آخری آیت میں ان منافقین کی یوں توصیف کی گئی ہے: وہ مومنین کی بجائے کافروں کو اپنا دوست بناتے ہیں (الذین یتخذون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین)۔ پھر بتایا گیا ہے کہ اس میں ان کا ہدف اور مقصد کیا ہے، کیا وہ اس دوستی کے ذریعہ واقعی کوئی عزت و آبرو حاصل کرنا چاہتے ہیں (ایبتغون عندھم العزۃ) جبکہ تمام عزتیں خدا کے لیے مخصوص ہیں (فان العزۃ للہ جمیعا) کیونکہ علم کا سرچشمہ ہمیشہ علم و قدرت ہوتا ہے اور جن کی قدرت کی کوئی حیثیت نہ ہو اور ان کا علم بھی ان کی قدرت جیسا ہو وہ کسی کو کیا صاحب عزت کر سکتے ہیں۔

یہ آیت تمام مسلمانوں کو تنبیہ کرتی ہے کہ وہ اپنی عزت و آبرو کے لیے چاہے وہ اقتصادی یا ثقافتی پہلو سے ہو یا سیاسی حوالے سے دشمنان اسلام کی دوستی تلاش نہ کریں بلکہ وہ ذات الٰہی پر بھروسہ کریں جو تمام عزتوں کا سرچشمہ ہے۔ دشمنان اسلام کی اپنی بھی کوئی عزت نہیں وہ دوسروں کو کیا دیں گے اور اگر ان کی بظاہر کچھ عزت ہو بھی تو وہ قابل اعتماد نہیں ہیں کیونکہ جب بھی ان کے مفاد کا تقاضا ہو وہ فوراً اپنے مخلص ترین اتحادیوں کو بھی چھوڑ کر اپنی راہ لیں گے اور ان کی یہ حالت ہو گی جیسے کبھی شناسائی ہی نہ تھی۔ دور حاضر کی تاریخ بھی ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

۱۴۰۔ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ۙ

ترجمہ

۱۴۰۔ اللہ نے قرآن میں تم پر (یہ حکم) نازل کیا ہے کہ جب تم سنو کہ کچھ لوگ آیاتِ الٰہی کا انکار اور استہزاء کر رہے ہیں تو ان کے ساتھ نہ بیٹھو جب تک وہ کوئی اور گفتگو نہ کرنے لگیں ورنہ اس صورت میں تم بھی ان جیسے ہو جاؤ گے۔ خدا منافقوں اور کافروں سب کو جہنم میں جمع کر دے گا۔

شانِ نزول

ابن عباس سے اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں منقول ہے کہ بعض منافقین یہودی علماء کی بیٹھکوں میں جا بیٹھتے تھے ان میٹنگوں میں آیاتِ قرآنی کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ اسی سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی جس میں اس کام کا بُرا انجام بتایا گیا۔

تفسیر

بُری مجلس میں نہ بیٹھو

سورہ انعام قرآن حکیم کی مکی سورتوں میں سے ہے اس کی آیت ۶۸ میں صراحت سے پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ:

اگر آپ دیکھیں کہ کچھ لوگ قرآنی آیات کا مذاق اڑاتے ہیں اور ناپسندیدہ باتیں کہتے ہیں تو ان سے اعراض کیجیے۔

یہ بات مسلّم ہے کہ یہ حکم نبی کریمؐ سے مخصوص نہیں بلکہ ایک عمومی حکم ہے البتہ اس میں خطاب پیغمبر سے کیا گیا ہے اس کا فلسفہ بھی بالکل واضح ہے کیونکہ یہ ایسے کاموں سے مقابلے کی ایک منفی صورت ہے زیرِ بحث آیت میں اس اسلامی حکم کی تاکید کی گئی ہے اور مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ: قرآن میں تمہیں پہلے حکم دیا گیا ہے کہ جب سنو کہ کچھ لوگ آیاتِ قرآنی سے کفر کرتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں تو اس وقت تک ان کے ساتھ نہ بیٹھو جب تک اس کام سے صرفِ نظر کر کے دوسرا کام شروع نہ کریں (وقد نزل علیکم فی الکتاب ان اذا سمعتم اٰیٰت اللہ یکفر بہا ویستہزء بہا فلا تقعدوا معہم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ)۔

اس کے بعد اس کام کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے: اگر تم ایسی مجالس میں شرکت کرو گے تو ان جیسے ہو جاؤ گے اور تمہارا انجام بھی ان جیسا ہوگا (انکم اذا مثلہم)۔

تاکید مزید کے لیے فرمایا گیا ہے: ایسی میٹنگوں میں شرکت روحِ نفاق کی علامت ہے اور خدا منافقین اور کفار سب کو جہنم میں جمع کر دے گا (ان اللہ جامع المنٰفقین والکافرین فی جہنم جمیعًا)۔

چند اہم نکات

۱۔ مجلس گناہ میں شرکت ارتکاب گناہ کی مانند ہے اگرچہ شریک ہونے والا خاموش ہی بیٹھا رہے کیونکہ ایسی خاموشی ایک طرح کی رضامندی اور عملی تائید ہے۔

۲۔ نہی عن المنکر اگر "مثبت" صورت میں ممکن نہ ہو تو کم از کم "منفی" صورت میں ہی انجام دینا چاہیے اس طرح سے کہ انسان گناہ کے ماحول اور گناہ کی مجلس سے ہی دور رہے۔

۳۔ جو لوگ سکوت اور ایسی مجالس میں شریک ہو کر عملی طور پر گناہ گاروں کی تشویق کا باعث بنتے ہیں ان کی سزا بھی ارتکابِ گناہ کرنے والوں کی طرح ہے۔

۴۔ کفار کے ساتھ اس صورت میں نشست و برخاست جبکہ وہ آیاتِ خداوندی کی توہین نہ کریں اور ان سے کوئی خطرہ بھی نہ ہو ممنوع نہیں ہے کیونکہ "حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ" کے جملہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کام مباح ہے۔

۵۔ ایسے گنہ گاروں سے اجتناب نہ کرنا نفاق کی علامت ہے کیونکہ حقیقی مسلمان کسی ایسی مجلس میں ہرگز شرکت نہیں کر سکتا جس میں آیاتِ خداوندی اور احکامِ الٰہی کی توہین ہو رہی ہو ایسا ہو نہیں سکتا کہ ایک حقیقی مسلمان ایسی مجلس میں ہو اور نہ اعتراض کرے اور نہ اظہارِ ناپسندیدگی کے لیے محفل کو چھوڑے۔

۱۴۱۔ الَّذِينَ يَتَرَبَّصُونَ بِكُمْ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِنَ اللَّهِ قَالُوا أَلَمْ نَكُنْ مَعَكُمْ وَإِنْ كَانَ لِلْكَافِرِينَ نَصِيبٌ قَالُوا أَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ۝

ترجمہ

۱۴۱۔ منافقین وہ ہیں جو ہمیشہ منتظر رہتے ہیں اور تمہارے نگران رہتے ہیں اگر تمہیں فتح و کامیابی نصیب ہو تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے (لہٰذا ہم بھی افتخار، اعزاز اور مالِ غنیمت میں تمہارے شریک ہیں) اور اگر کفار کامیاب ہو جائیں تو انھیں کہتے ہیں کیا ہم نے تمہیں جنگ اور مومنین کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنے کی ترغیب نہیں دی تھی (لہٰذا ہم تمہارے ساتھ اس کامیابی میں شریک ہیں) خدا تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا اور اس نے ہرگز مومنین پر کافروں کے غلبے کی راہ نہیں بنائی۔

تفسیر

منافقین کی صفات

زیرِ نظر آیت اور اس کے بعد کی کچھ آیات میں منافقین کی صفات اور ان کے افکارِ پریشاں کا تذکرہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: منافق وہ ہیں جو ہمیشہ یہ چاہتے ہیں کہ ہر پیش آنے والے واقعہ سے مفاد اٹھائیں اگر تمہیں کامیابی حاصل ہو جائے

تو فوراً اہل ایمان کی صفوں میں آکھڑے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے کیا ہماری امداد اس کامیابی میں تمہارے کام نہیں آئی لہٰذا ہم بھی ان تمام فوائد میں اور مادی و معنوی منافع میں تمہارے شریک اور حصہ دار ہیں (الذین یتربصون بکم فان کان لکم فتح من اللہ قالوا الم نکن معکم)۔

لیکن اگر کامیابی اسلام کے دشمنوں کو ہوئی تو فوراً اپنے آپ کو ان کے قریب کر لیتے ہیں اور اس پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ ہم ہی تھے جو تمہیں مسلمانوں سے جنگ کرنے اور ان کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کی ترغیب دیتے تھے اس لیے ہم بھی تمہاری ان کامیابیوں میں حصہ دار ہیں (وان کان للکفرین نصیب قالوا الم نستحوذ[1] علیکم ونمنعکم من المؤمنین)۔

اس طرح یہ لوگ اپنی موقع پرستی کے ذریعے چاہتے ہیں کہ مومنین کی کامیابی کی صورت میں افتخار و اعزاز پائیں یہاں تک کہ مالِ غنیمت میں بھی حصہ دار بنیں اور ان پر احسان بھی جتلائیں اور دوسری طرف کفار کی کامیابی پر بھی خوش ہوتے ہیں انھیں کفر میں پختہ تر کرتے ہیں، مسلمانوں کے خلاف ان کے حق میں جاسوسی کرتے ہیں اور ان کی کامیابی کی راہ ہموار کرتے ہیں گویا وہ "رفیق قافلہ" بھی ہیں اور "شریک راہزن" بھی۔ وہ اپنی زندگی اسی دوہرے کھیل میں گزار دیتے ہیں۔

قرآن ایک مختصر سے جملے میں ایسے لوگوں کا انجام بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: آخرکار ایک دن آہی جائے گا جب پردے اٹھ جائیں گے اور ان کے برے چہروں سے نقاب پلٹ دیئے جائیں گے ہاں "قیامت کے دن تمہارے درمیان خدا فیصلہ کرے گا" (فاللہ یحکم بینکم یوم القیمۃ) لہٰذا حقیقی مومنین کو چاہیے کہ ان سے مرعوب نہ ہوں۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: کبھی خدا مومنین پر کافروں کے تسلط کی راہ نہیں بناتا (ولن یجعل اللہ للکفرین علی المؤمنین سبیلا) کیا اس جملے سے مراد یہ ہے کہ منطق و استدلال کے لحاظ سے کفار کبھی مومنین پر غلبہ نہیں پائیں گے یا اس سے فوجی کامیابی یا سیاسی کوئی اور کامیابی مراد ہے اس سلسلے میں ہم بعض پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں۔

لفظ "سبیل" اصطلاح کے مطابق "نکرہ سیاق نفی میں" کے قبیل سے ہے جو کہ عمومیت کے معنی دیتا ہے لہٰذا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف منطق و استدلال سے بلکہ سیاسی، فوجی، ثقافتی، اقتصادی غرض کسی لحاظ سے بھی کفار اہل ایمان پر غالب نہیں آئیں گے آج اگر مختلف میدانوں میں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کفار مسلمانوں پر غالب ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر مسلمان حقیقی مومن نہیں ہیں۔ آج مسلمان ایمان کے تقاضے، اپنی ذمہ داریاں اپنا حقیقی طرز عمل اور اسلامی افکار سب کچھ فراموش کر چکے ہیں نہ ان میں اتحاد اور اخوت اسلامی کی کوئی خبر ہے نہ حقیقی معنی میں جہاد کرتے ہیں اور نہ وہ علم و آگہی کے حامل ہیں، حالانکہ

---

[1] "استحوذ" کا مادہ "حوذ" ہے یہ رانوں کے پچھلے حصے کو کہتے ہیں۔ ساربان جب اونٹ کو تیز چلانا چاہتا ہے تو اس کے پیچھے ہو کر اس کی رانوں اور پشت پر مارتا ہے لہٰذا "استحواذ" چلانے اور متحرک کرنے کے حوالے سے تسلط و غلبہ کا مفہوم دیتا ہے۔ مندرجہ بالا آیت بھی اسی معنی میں ہے۔

اسلام نے ان سب پر حصولِ علم لمحہ ولادت سے لے کر لحظہ موت تک لازم قرار دے رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ ایسی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

بعض فقہا نے حقوق اور حکم کے حوالے سے مختلف مسائل میں مومنین پر کفار کے عدم تسلط کے لیے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ آیت کی عمومیت کے پیشِ نظر یہ بات زیادہ بعید نظر نہیں آتی (غور کیجیے گا)۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ اس آیت میں مسلمانوں کی کامیابی کے لیے "فتح" کا لفظ استعمال ہوا ہے جبکہ کفار کی کامیابی کے لیے لفظ "نصیب" استعمال ہوا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر کفار کو کچھ کامیابیاں نصیب ہوں تو وہ محدود، وقتی اور ناپائیدار ہوں گی آخری فتح تو اہلِ ایمان ہی کو حاصل ہوگی۔

۱۴۲۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

۱۴۳۔ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۗ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝

ترجمہ

۱۴۲۔ منافقین اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ وہ انھیں دھوکا دیتا ہے (یعنی ان کا فریب باطل کر دیتا ہے) اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو وہ سستی اور کسالت کے ساتھ، لوگوں کے سامنے ریاکاری کرتے ہیں اور خدا کو یاد نہیں کرتے مگر تھوڑا سا۔

۱۴۳۔ وہ بے ہدف افراد ہیں نہ ان کی طرف مائل ہیں نہ اُن کی طرف (نہ اہلِ ایمان کی صف میں ہیں نہ کافروں کی قطار میں) اور جسے خدا گمراہ کر دے اس کے لیے تمھیں کوئی راہ نہ ملے گی۔

تفسیر

منافقین کی پانچ صفات

۱۔ وہ اپنے منحوس مقاصد کی تکمیل کے لیے دھوکا اور فریب دہی کی راہ اختیار کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ چاہتے ہیں کہ

خدا کو بھی دھوکا دے دیں۔ حالانکہ جب وہ ایسا کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں خود فریب میں مبتلا ہوتے ہیں کیونکہ وہ ناچیز اور حقیر سرمایے کے حصول کے لالچ میں اپنا وجود اور انسانیت کا عظیم سرمایہ اپنے ہاتھ سے دے بیٹھتے ہیں (ان المنافقین یخادعون اللہ وھو خادعھم)۔

مندرجہ بالا تفسیر "وھو خادعھم" کی واؤ سے معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہاں واؤ حالیہ ہے۔

بعض بزرگوں سے ایک قصہ منقول ہے، ایک بزرگ پیشہ وروں سے کہتے تھے:

"ڈرو، کہیں غریب مسافر تمھیں دھوکا نہ دے دیں۔"

کسی نے کہا: وہ تو انجان اور سادہ لوح ہوتے ہیں اور ہم انھیں دھوکا دے سکتے ہیں۔

بزرگ نے کہا: میرا مقصد بھی یہی ہے کہ اس طرح دھوکا دے کر تم ناچیز سرمایہ تو حاصل کر بیٹھتے ہو اور ایمان کا عظیم سرمایہ گنوا بیٹھتے ہو۔

۲۔ وہ خدا سے دور ہیں، اس سے راز و نیاز کی لذت سے محروم ہیں لہٰذا "جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سرتاپا کسالت، سستی اور بے حالی میں غرق ہوتے ہیں (واذا قاموا الی الصلوٰۃ قاموا کسالٰی)۔

۳۔ وہ چونکہ خدا اور اس کے عظیم وعدوں پر ایمان نہیں رکھتے لہٰذا اگر کوئی عبادت یا کوئی نیک کام انجام بھی دیتے ہیں تو وہ بھی ریاکاری کے لیے نہ کہ خدا کے لیے (یراءون الناس)۔

۴۔ وہ اگر کوئی ذکر بھی کرتے ہیں یا خدا کو یاد کرتے ہیں تو صمیم قلب سے نہیں اور نہ آگاہی و بیداری سے اور اگر ہو بھی تو بہت ہی کم (ولا یذکرون اللہ الا قلیلا)۔

۵۔ یہ لوگ سرگرداں اور بے ہدف ہیں ان کے پاس نہ زندگی کا کوئی پروگرام ہے نہ کوئی واضح راستہ۔ نہ وہ مومنین میں سے ہیں اور نہ کفار میں سے (مذبذبین بین ذٰلک لا الی ھؤلاء ولا الی ھؤلاء)۔

توجہ رہے کہ "مذبذب" اسم مفعول ہے اس کا مادہ "ذبذب" ہے یہ ایک مخصوص صدا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جب کوئی چیز آویزاں ہوں، ہوا کی موجیں اسے حرکت دیں تو جو آواز اس ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے اسے "ذبذب" کہتے ہیں، بعد ازاں یہ لفظ متحرک اشیاء، سرگرداں اور بے ہدف لوگوں کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔ منافقین کے بارے میں قرآن حکیم میں استعمال ہونے والی یہ لطیف ترین تعبیر ہے۔ ضمناً یہ تعبیر اس مطلب کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے اور وہ یہ کہ ایسا نہیں کہ منافقین کو پہچانا نہ جا سکے بلکہ ان کا یہ تذبذب ایک خاص آہنگ سے ہم رنگ ہوتا ہے جس کی طرف توجہ کرنے سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ اس تعبیر سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ منافقین ایک معلق اور آویزاں جسم کی طرح ہیں اور ذاتی طور پر ان کے بس میں کچھ نہیں یہ تو مختلف ہوائیں چلتی ہیں جو انھیں اِدھر اُدھر حرکت دیتی ہیں جدھر کو ہوا کا رُخ ہو ان کی حرکت بھی اُدھر کو ہوتی ہے۔

آیت کے آخر میں ان کا انجام اس طرح بیان کیا گیا ہے، وہ ایسے لوگ ہیں کہ جن کے اعمال کے باعث اللہ نے اپنا دستِ حمایت ان سے اٹھا لیا اور انھیں بے راہ رویوں میں گمراہ چھوڑ دیا ہے اور "جسے خدا گمراہ کر دے اس کے لیے تمھیں کبھی راہِ نجات نہیں ملے گی" (ومن یضلل اللہ فلن تجد لہ سبیلا)۔

خدا کے گمراہ کرنے سے متعلق اور یہ کہ اس سے اختیار و ارادے کی نفی نہیں ہوتی ــــــ تفسیر نمونہ جلد اول سورۂ بقرہ آیت ۲۶ کے ذیل میں بحث کی جا چکی ہے۔

۱۴۴۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ○

۱۴۵۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ○

۱۴۶۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ○

ترجمہ

۱۴۴۔ اے ایمان والو! مومنین کو چھوڑ کر کفار کو اپنا ولی اور سہارا نہ بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ (ایسا کر کے) اپنے خلاف بارگاہِ الٰہی میں ایک واضح دلیل قائم کرلو۔

۱۴۵۔ (کیونکہ) منافقین تو دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ہیں اور تمھیں ان کا ہرگز کوئی مددگار نہیں ملے گا (لہٰذا دشمنانِ خدا کی دوستی سے پرہیز کرو کیونکہ یہ نفاق کی علامت ہے)۔

۱۴۶۔ مگر وہ جو توبہ کرلیں اور اصلاح و تلافی کرلیں اور خدا (کے لطف کے دامن) سے وابستہ ہو جائیں اور اپنے آپ کو خدا کے لیے خالص کرلیں وہ مومنین کے ساتھ ہوں گے اور خدا اہلِ ایمان کو اجرِ عظیم عطا کرے گا۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں منافقوں اور کافروں کی کچھ صفات کی نشاندہی کی گئی تھی۔ ان آیات میں پہلے تو مومنین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ مومنین کی بجائے کافروں (اور منافقوں) کو اپنا سہارا اور ولی نہ سمجھیں (یا ایھا الذین امنوا لا تتخذوا الکافرین اولیاء من دون المؤمنین) کیونکہ یہ قانون شکنی اور خدا سے شرک کے مترادف ہے اور عدالتِ الٰہی کے قانون کے

مطابق اس کی بہت سخت سزا ہے اسی لیے فرماتا ہے: کیا تم چاہتے ہو کہ بارگاہِ الٰہی میں اپنے خلاف ایک دلیل قائم کرو (اتریدون ان تجعلوا للہ علیکم سلطانا مبینا)[1]۔

بعد والی آیت میں ان منافقین کی حالت واضح کی گئی ہے جن کی دوستی کا طوق غافل مسلمانوں نے اپنی گردن میں ڈال رکھا ہے یا پھر انہی کی حالت بیان کی گئی ہے جو اظہار اسلام کے باوجود نفاق کی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے اور تمھیں ان کا کوئی مددگار دکھائی نہ دے گا (ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار ولن تجد لھم نصیرا)[2]۔

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں نفاق کفر کی بدترین اقسام میں سے ہے اور منافق خدا سے سب سے زیادہ دور ہیں اسی لیے ان کا ٹھکانا جہنم کا بدترین اور پست ترین طبقہ ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے کیونکہ انسانی معاشرے کو منافقین سے جو خطرات لاحق ہوتے ہیں ان کا کسی اور خطرے سے موازنہ نہیں کیا جا سکے گا۔ اظہار ایمان کی وجہ سے جو مقام اور تحفظ انھیں حاصل ہوتا ہے وہ اسے بے دفاع افراد کے خلاف بزدلانہ طریقے سے استعمال کرتے ہیں اور پشت کی جانب سے خنجر گھونپتے ہیں یہ بات مسلم ہے کہ جو بزدل اور خطرناک دشمن دوستی کے روپ میں حملہ آور ہو وہ اس سے کہیں بدتر ہے جو کھلے بندوں دشمنی کا اعلان کرے اور اپنے آپ کو واضح طور پر پیش کرے۔ در اصل نفاق کا راستہ گھٹیا، پست، بزدل، بے وقعت اور ہر لحاظ سے آلودہ افراد ہی اختیار کرتے ہیں۔

یہ بات واضح کرنے کے لیے کہ ایسے افراد بھی جو اس قدر آلودۂ گناہ ہیں چاہیں تو خدا کی طرف لوٹ آئیں اور اپنی اصلاح کریں، مزید فرمایا: مگر یہ کہ ایسے لوگ توبہ کریں، اپنے اعمال کی اصلاح کریں (اور گذشتہ اعمال کی تلافی کریں)، لطف الٰہی سے متمسک ہوں اور اپنا دین و ایمان اللہ کے لیے خالص کریں (الا الذین تابوا واصلحوا واعتصموا باللہ واخلصوا دینھم للہ)۔ ایسے لوگ آخر کار نجات یافتہ ہو سکتے ہیں اور مومنین کے ساتھی بن سکتے ہیں (فاولٰئک مع المؤمنین) اور خدا تمام صاحبان ایمان کو اجر عظیم اور جزائے جزیل سے نوازے گا (وسوف یؤت اللہ المؤمنین اجرا عظیما)۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ آیت میں فرمایا گیا ہے کہ یہ مومنین کے ہمراہ ہوں گے یہاں اس طرف اشارہ ہے کہ ثابت قدم مومنین کا مقام ان سے برتر ہو گا وہ اصل ہیں اور یہ فرع۔ یہ تو سچے مومنین کے پرتو سے نور حاصل کریں گے۔

---

[1] "سلطان" کا مادہ "سلاطہ" (بروزن "مقالہ") ہے جس کا معنی ہے دوسرے کو مقہور و مغلوب کرنے کی قدرت۔ خود لفظ "سلطان" اسم مصدر کا معنی رکھتا ہے اور ہر قسم کے تسلط کے لیے استعمال ہوتا ہے اسی بنا پر "دلیل" کو بھی "سلطان" کہا جاتا ہے جو کہ ایک انسان کے دوسرے پر غلبہ کا باعث بنتی ہے بعض اوقات صاحبانِ قدرت کو بھی "سلطان" کہتے ہیں لیکن مندرجہ بالا آیت میں "سلطان" "دلیل و حجت" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

[2] "درک" (بروزن "مرگ") دریا کی گہرائی کے گہرے ترین مقام کو کہتے ہیں نیز رسیوں کو گرہ دے کر دریا میں ڈالا جائے تو آخری رسی جو گہرائی تک جا پہنچے اسے "درک" (بروزن "فلک") کہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب الفاظ کسی چیز کو پہچاننے اور اس تک پہنچ جانے کا مفہوم دیتے ہیں بعض اوقات تہ خانے کی سیڑھیوں کو بھی "درک" کہتے ہیں جب کہ چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں کو "درجہ" کہتے ہیں۔

دوسری بات جو قابل غور ہے یہ ہے کہ منافقین کا انجام بیان کرنے کے لیے انھیں دوزخ کا پست ترین طبقہ قرار دیا گیا ہے جبکہ مومنین کے بارے میں " اجرِ عظیم " کی بشارت دی گئی ہے جس کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے اور اس اجر کی عظمت لطفِ الٰہی سے وابستہ ہے۔

۱۴۷ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيمًا ○

ترجمہ

۱۴۷۔ خدا تمھیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر ادا کرو (اور نعمتوں کو مناسب طریقے سے استعمال کرو) اور ایمان لے آؤ، خدا شکر گذار (قدردان) اور آگاہ ہے (ان کے اعمال اور نیتوں کو جانتا ہے اور جو اچھا ہے اسے اچھی جزا دے گا)۔

تفسیر

خدا کی سزا انتقامی نہیں

گذشتہ آیات میں کافروں اور منافقوں کے لیے سخت سزاؤں کا ذکر تھا۔ اب اس آیت میں ایک اہم حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے اور وہ یہ کہ خدا کی طرف سے دردناک سزائیں اس بنا پر نہیں ہیں کہ وہ چاہتا ہے کہ گنہ گار بندوں سے انتقام لے یا اپنی قدرت کا مظاہرہ کرے یا ان کی نافرمانی اور عصیان سے اسے کوئی نقصان پہنچا ہے جس کی وہ تلافی کرنا چاہتا ہے کیونکہ یہ سب چیزیں تو کسی نقص اور کمی کا مظہر ہیں جبکہ خدا کی ذات ہر نقص اور کمی سے مبرا ہے بلکہ یہ سب سزائیں خود انسانوں کے بُرے افکار و اعمال کا ردِ عمل اور نتیجہ ہیں۔ اسی لیے فرماتا ہے، اگر تم شکر گذاری کرو اور ایمان لے آؤ تو خدا کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ تمھیں سزا دے (مایفعل اللہ بعذابکم ان شکرتم و اٰمنتم)۔

شکر کا مفہوم یہ ہے کہ ہر نعمت کو اس طریقے سے استعمال کیا جائے جس کے لیے وہ بنائی گئی ہے اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا جملے سے مراد یہ ہے کہ اگر تم ایمان لے آؤ اور عملِ صالح کرو، نعماتِ الٰہی کو مناسب طور پر استعمال کرو اور ان سے غلط فائدہ نہ اٹھاؤ تو بلاشبہ تھوڑی سی سزا بھی تمھارے دامن کو نہ چھوئے گی۔

تاکید مزید کے لیے کہتا ہے، خدا تمھارے اعمال اور نیتوں سے آگاہ ہے اور تمھارے نیک اعمال کے بدلے میں وہ بھی شاکر اور جزا دینے والا ہے (وکان اللہ شاکرًا علیمًا)۔

زیر نظر آیت میں "شکر" کو "ایمان" پر مقدم رکھا گیا ہے یہ اس بناء پر ہے کہ انسان جب تک اس کی نعمتوں کو پہچان نہ لے اور شکر گذاری کے مقام تک نہ پہنچ جائے اس وقت تک خود اسے نہیں پہچان سکتا۔ کیونکہ اس کی نعمتیں اس کی معرفت کا ذریعہ ہیں۔ اسلامی عقائد کی کتب میں بھی "وجوب معرفت الٰہی" کے لیے بعض لوگ "وجوب شکر منعم" کی دلیل پیش کرتے ہیں، اور وہ کہتے ہیں کہ شکر گذاری انسانی فطرت ہے اور نعمتیں بخشنے والے کا شکر ادا کرنا واجب ہے لہٰذا اس نعمتیں عطا کرنے والے کی معرفت بھی واجب ہے (غور کیجیے گا)۔

۱۴۸۔ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ○

۱۴۹۔ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ○

ترجمہ

۱۴۸۔ خدا پسند نہیں کرتا کہ کوئی شخص بری باتیں کہے مگر یہ کہ جو ظلم و ستم سے مجبور ہو اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۱۴۹۔ (لیکن) اگر نیکیوں کو آشکار کرو یا مخفی رکھو یا برائیوں سے صرف نظر کرو (تو تمھیں اس کی جزا دی جائے گی) خدا بخشنے والا اور قادر و توانا ہے (اور انتقام کی قدرت کے باوجود عفو و درگذر کرتا ہے)۔

تفسیر

اسلام کے چند اخلاقی احکام

ان دو آیتوں میں اسلام کے کچھ اخلاقی احکام بیان ہوئے ہیں پہلے فرمایا گیا ہے۔ خدا پسند نہیں کرتا کہ بدگوئی کی جائے یا بعض لوگوں کے عیب اور برے کام برملا بیان کیے جائیں (لا یحب اللہ الجهر بالسوء من القول) کیونکہ خدا خود ستار العیوب ہے وہ پسند نہیں کرتا کہ لوگوں کی پردہ دری کی جائے اور لوگوں کے عیب فاش کیے جائیں اور ان کی عزت و آبرو برباد کی جائے۔ علاوہ ازیں ہم جانتے ہیں کہ ہر انسان کے عام طور پر کچھ نہ کچھ کمزور اور مخفی پہلو ہوتے ہیں اگر یہ عیب ظاہر ہو جائیں تو پھر معاشرے میں بداعتمادی کی ایک ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے لہٰذا اجتماعی رشتوں کا استحکام اور

بشری تقاضوں کو ملحوظ نظر رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ کسی صحیح مقصد کے بغیر کسی کے مخفی اور کمزور پہلوؤں کا اظہار نہ ہو۔

ضمناً توجہ رہے کہ "سوء" سے مراد ہر طرح کی برائی اور قباحت ہے اور "جہر"، "من القول" سے مراد ہر قسم کا لفظی اظہار ہے چاہے وہ شکایت کی صورت میں ہو یا چغلی کی۔ یہی وجہ ہے کہ جن آیات سے غیبت کی حرمت کے بارے میں استدلال کیا گیا ہے ان میں زیر نظر آیت بھی شامل ہے لیکن آیت کا مفہوم غیبت میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس میں ہر طرح کی بدگوئی کی ممانعت کی گئی ہے۔

اس کے بعد بدگوئی کی استثنائی صورت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: مگر وہ شخص جو ظلم وستم کے ہاتھوں مجبور ہو (الا من ظلم) ایسے لوگ حق رکھتے ہیں کہ اپنے دفاع کے لیے ظالم کے ظلم کی شکایت کریں یا واضح طور پر ظلم وستم کی مذمت کریں اور ان پر تنقید کریں اور جب تک اپنا حق نہ لے لیں اور ظلم وستم کا ازالہ نہ کرلیں اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں۔

درحقیقت یہ استثناء اس لیے ہے کہ کہیں مندرجہ بالا حکم سے ظالم اور ستمگر غلط فائدہ نہ اٹھائیں یا یہ حکم ظلم وستم کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کا بہانہ نہ بن جائے۔

واضح ہے کہ ایسے مواقع پر صرف ظالم کے ظلم اور مظلوم کے دفاع سے مربوط باتوں پر ہی اکتفا کیا جانا چاہیے۔

آیت کے آخر میں قرآن اپنی روش کے مطابق کہ کہیں کوئی مظلوم بن کر اس استثناء سے سوء استفادہ نہ کرے اور بلاوجہ لوگوں کے عیب بیان کرتا پھرے، فرماتا ہے: خدا باتوں کو سنتا اور نیتوں سے واقف ہے (و کان اللہ سمیعًا علیمًا)۔

بعد والی آیت میں اس حکم کے نقطہ مقابل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، فرمایا: اگر لوگوں کی نیکیوں کو ظاہر کرو یا پوشیدہ رکھو تو اس میں کوئی حرج نہیں (جبکہ برائیاں استثنائی مواقع کے علاوہ مطلقاً چھپائی جانا چاہییں) نیز اگر برائیوں کے مقابلے میں لوگوں سے عفو وبخشش کی راہ اپناؤ تو بہتر ہے کیونکہ درحقیقت یہ الٰہی طرز عمل ہے کہ جو ہر قسم کے انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود اپنے اہل بندوں کے بارے میں عفو وبخشش سے کام لیتا ہے (ان تبدوا خیرا او تخفوہ او تعفوا عن سوء فان اللہ کان عفوا قدیرا)۔

دوسری آیت دراصل دو پہلوؤں سے پہلی آیت کا نقطہ مقابل قرار دی جاسکتی ہے پہلا یہ کہ برائیوں کے اظہار کے مقابلے میں نیکیوں کا اظہار اور دوسرا جن پر ظلم وستم ہوا ان کی طرف سے عفو وبخشش۔

ظالم سے درگذر اس کی تقویت کا سبب نہیں؟

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا ستمگر سے درگذر حقیقت میں اس کے ظلم کی تائید نہیں اور کیا یہ کام ایسے ظلم کے جاری رہنے کے لیے تشویق وترغیب کا باعث نہیں ہوگا اور کیا یہ عمل مظلوموں کے ذہنوں کو سُلا دینے والا نہیں ہے اور کیا منفی ردعمل پیدا نہیں کرے گا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ عفو ودرگذر کا اپنا محل ومقام ہے اور اظہار حق اور ظلم کے مقابلے کا موقع جدا ہے۔ اسی لیے احکام اسلامی میں ایک طرف ہے:

"لا تظلمون ولا تظلمون"

"نہ ظلم کرو اور نہ ظلم گوارا کرو" ——— (بقرہ ——— ۲۷۹)

اور یہ بھی کہ:

کونا للظالم خصما و للمظلوم عونا

یعنی ——— ظالم کے دشمن بنو، اور مظلوم کے ساتھی۔ [۱]

نیز یہ بھی کہ:

فقاتلوا التی تبغی حتی تفیٔ الی امر اللّٰہ

یعنی ——— ظالموں سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ حکم خدا کے سامنے سرنگوں ہو جائیں۔

(حجرات ——— ۹)

دوسری طرف عفو و درگذر اور بخشش کا حکم دیا گیا:

و ان تعفوا اقرب للتقوی

اور ——— اگر معاف کر دو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب تر ہے۔

(بقرہ ——— ۲۳۷)

یہ بھی فرمایا کہ:

و لیعفوا و لیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللّٰہ لکم

یعنی ——— معاف کر دو اور درگذر سے کام لو، کیا تم پسند نہیں کرتے کہ خدا تمہیں بخش دے۔

(نور ——— ۲۲)

ہو سکتا ہے کہ بعض کوتاہ نظر لوگوں کو ابتداء میں ان احکام میں تفاوت اور تضاد نظر آئے لیکن اسلامی مصادر اور کتب میں موجود احادیث کی طرف توجہ کی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عفو و درگذر کا اپنا مقام ہے اور ظلم کی سرکوبی کے لیے مقابلے کا ایک الگ موقع و محل ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ عفو و درگذر اس موقع کے لیے ہے جہاں قدرت اور دشمن پر کامیابی حاصل ہو اور دشمن آخری شکست سے دوچار ہو جائے یعنی جہاں دشمن کی طرف سے کوئی نیا خطرہ محسوس نہ ہوتا ہو۔ اس موقع پر عفو و درگذر ایک طرح سے اصلاحی اور تربیتی اقدام ہے اور یہ طرز عمل دشمن کو اپنے طرز عمل پر نظر ثانی پر آمادہ کرے گا۔ تاریخ اسلام میں ایسے بہت سے مواقع کا تذکرہ موجود ہے حضرت امیرالمومنینؑ کا یہ فرمان اس نقطۂ نظر پر شاہد ہے، آپؑ نے فرمایا:

"اذا قدرت علی عدوك فاجعل العفو عنه شكرا للقدرة عليه"

جب دشمن پر کامیابی حاصل کر لو تو عفو و بخشش کو اس کامیابی کی زکوٰۃ اور شکر کا ذریعہ قرار دو۔ [۲]

---

[۱] نہج البلاغہ، وصیت نامہ نمبر ۴۷

[۲] نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۱۰

دوسری طرف ایسے مواقع جہاں دشمن کا خطرہ ابھی باقی ہو اور احتمال ہو کہ درگذر کرنا اسے جرأت دے گا اور اس کی دوبارہ شرانگیزی کرے گا یا یہ کہ عفو و بخشش بیان ظلم کی تائید شمار ہوگی تو اسلام ایسی بخشش اور معافی کی کبھی اجازت نہیں دیتا اور ایسے مواقع پر پیروانِ اسلام نے کبھی عفو و بخشش کی راہ نہیں اپنائی۔

۱۵۰۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوۡلُوۡنَ نُؤۡمِنُ بِبَعۡضٍ وَّنَکۡفُرُ بِبَعۡضٍ ۙ وَّیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَّخِذُوۡا بَیۡنَ ذٰلِکَ سَبِیۡلًا ۙ﴿۱۵۰﴾

۱۵۱۔ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ حَقًّا ۚ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا مُّہِیۡنًا ﴿۱۵۱﴾

۱۵۲۔ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَلَمۡ یُفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡہُمۡ اُولٰٓئِکَ سَوۡفَ یُؤۡتِیۡہِمۡ اُجُوۡرَہُمۡ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۵۲﴾

ترجمہ

۱۵۰۔ جو لوگ خدا اور پیغمبروں کا انکار کرتے ہیں اور ان میں تبعیض اور فرق روا رکھنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان دو کے درمیان کوئی راہ منتخب کریں۔

۱۵۱۔ وہ پکے کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے ذلت آمیز سزا فراہم کر رکھی ہے۔

۱۵۲۔ (لیکن) وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں اور ان میں سے کسی کے درمیان فرق روا نہیں رکھتے انہیں عنقریب جزا دیں گے، خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

انبیاء میں فرق نہیں ہے

ان آیات میں کفار اور مومنین کی حالت بیان کی گئی ہے اور ان کے انجام کا تذکرہ ہے یہ آیات گذشتہ آیات کی تکمیل کرتی ہیں جن میں منافقین کا ذکر تھا۔

پہلے تو ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو انبیاء الٰہی میں فرق روا رکھتے ہیں۔ بعض کو حق پر سمجھتے ہیں اور بعض کو باطل پر۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ جو خدا اور اس کے پیغمبروں کے کافر اور منکر ہیں اور چاہتے ہیں کہ خدا اور اس کے پیغمبروں میں فرق روا رکھیں اور کہتے ہیں کہ ہم ان میں سے بعض پر تو ایمان رکھتے ہیں اگرچہ بعض کو قبول نہیں کرتے۔ اپنے گمان میں وہ چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کی کوئی راہ نکالیں یہی حقیقی کافر ہیں (ان الذین یکفرون باللہ و رسلہ و یریدون ان یفرقوا بین اللہ و رسلہ ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذلک سبیلا اولئک ھم الکافرون حقا)۔

یہ جملہ دراصل یہودیوں اور عیسائیوں کی حالت بیان کر رہا ہے یہودی حضرت عیسٰیؑ کو نہیں مانتے اور یہودی اور عیسائی دونوں حضرت پیغمبر اسلامؐ کو نہیں مانتے حالانکہ ان کی اپنی کتابوں کے مطابق ان پیغمبروں کی نبوّت ثابت شدہ ہے۔ حقائق کو قبول کرنے میں اس تبعیض کا سرچشمہ ہوا و ہوس اور جاہلانہ تعصبات ہیں اور بعض اوقات سے وجہ کا حسد اور تنگ نظری سدِ راہ ہوتی ہے یہ طرزِ عمل دراصل خدا پر اور انبیاء پر ایمان نہ لانے کی نشاندہی ہے کیونکہ ایمان یہ نہیں ہے کہ جو کچھ اپنی طبیعت اور میلان کے مطابق ہو اسے تسلیم کر لیا جائے اور جو مزاج اور ہوس کے خلاف ہو اسے رد کر دیا جائے یہ تو ایک طرح کی نفس پرستی ہے نہ کہ خدا پرستی۔ حقیقی ایمان تو یہ ہے کہ انسان حقیقت کو قبول کرے چاہے اس کے میلانِ طبع کے خلاف ہی کیوں نہ ہو لہٰذا قرآن ایسے افراد کو مندرجہ بالا آیت میں کافر قرار دیتا ہے اگرچہ وہ خدا پر اور بعض انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں (ان الذین یکفرون باللہ و رسلہ ....)

اس لیے جن چیزوں پر وہ اظہارِ ایمان کرتے ہیں اسے بھی بے وقعت قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس ایمان کا سرچشمہ جستجوئے حق نہیں ہے۔

آخر میں انھیں سرزنش کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے کفار کے لیے ذلت آمیز اور رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے (واعتدنا للکفرین عذابا مھینا)۔ اس میں عذاب کو "مُہِین" (ذلت آمیز) قرار دیا گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انھوں نے انبیاء میں تبعیض اور فرق روا رکھ کے دراصل ان میں سے بعض کی توہین کی ہے لہٰذا ان کی سزا ان کے عمل کی مناسبت سے ہونا چاہیے۔

گناہ اور سزا میں تناسب

سزا بعض اوقات "عذاب الیم" کی شکل میں ہوتی ہے مثلاً کوڑے لگانا اور بدنی تکلیف پہنچانا، بعض اوقات رُسوا کن ہوتی ہے۔ مثلاً کسی کے لباس پر کیچڑ ڈالنا وغیرہ کبھی شور و شیلی سے مملو عذابِ عظیم کی صورت میں، مثلاً کچھ لوگوں کی موجودگی میں سزا دینا اور بعض اوقات سزا کا اثر وجودِ انسانی پر گہرا ہوتا ہے اور ایک مُدت تک باقی رہتا ہے جسے عذابِ شدید کہتے ہیں۔ مثلاً طویل المدت قید با مشقت اور دیگر سزائیں۔

واضح ہے کہ عذاب کی ان میں سے کوئی بھی نوعیت گناہ کی نوعیت کی مناسبت سے ہے اسی لیے بہت سی آیاتِ قرآنی میں ظالموں کی سزا "عذابِ الیم" قرار دی گئی ہے کیونکہ بندگانِ خدا پر دردناک ظلم کرنے سے یہی سزا مناسبت رکھتی ہے

جن کا گناہ توہین آمیز ہے ان کی سزا بھی ذلت آمیز ہے۔ اس طرح جو لوگ بڑے اور شدید گناہ کرتے ہیں ان کی سزا بھی اسی قسم کی ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا مثالوں کا مقصد مطلب کو ذہن نشین کرانا ہے ورنہ اس جہان کی سزاؤں کا قیاس اُس جہان کی سزاؤں پر نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے بعد مومنین کی کیفیت اور انجام کا ذکر ہے، فرمایا: وہ لوگ جو خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لاتے ہیں اور ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور اس طرح حق کے سامنے اپنے جذبۂ تسلیم اور خلوص کا اظہار کرتے ہیں اور وہ ہر طرح کے نارو اتعصب کے مقابلے میں اپنے قیام کا ثبوت دیتے ہیں خدا بہت جلد انھیں جزا دے گا (والذین امنوا باللہ و رسلہ ولم یفرقوا بین احد منھم اولٰئک سوف یؤتیھم اجورھم)۔

البتہ پیغمبروں پر ایمان لانا اور عملاً انھیں تسلیم کر لینا اس بات کے منافی نہیں کہ ان میں سے بعض کو بعض سے افضل مانا جائے کیونکہ ان کی مأموریت اور ذمہ داریوں کے فرق کے لحاظ سے ان کے مراتب میں فرق یقینی ہے۔ مقصد یہاں یہ ہے کہ انبیاء پر ایمان لانے اور انھیں عملاً تسلیم کرنے میں ہم کوئی فرق نہ کریں۔

آیت کے آخر میں اس مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ اگر یہ مومنین پہلے ایسے تعصبات اور تفریق کے قائل رہے ہیں، یا دوسرے گناہوں کے مرتکب رہے ہیں تو اب اگر وہ اپنے ایمان کو خالص کرکے خدا کی طرف لوٹ آئیں تو خدا انھیں بخش دے گا اور خدا ہمیشہ سے بخشنے والا اور مہربان ہے (وکان اللہ غفورا رحیما)۔

یہ بات قابل غور ہے کہ زیر نظر آیات میں انبیاء میں تبعیض و تفریق کے قائل لوگوں کو حقیقی کفار قرار دیا گیا ہے لیکن جو سب پر ایمان لائے ہیں انھیں حقیقی مومن نہیں کہا گیا بلکہ صرف مومن کہا گیا ہے شاید فرق اس بنا پر ہو کہ حقیقی مومن وہ ہیں جو ایمان کے علاوہ عمل کے لحاظ سے بھی بالکل پاک اور صالح ہوں۔ اس بات کی شاہد وہ آیات ہیں جو سورۂ انفال کی ابتداء میں آئی ہیں، جن میں خدا پر ایمان لانے کے بعد مومنین کی صفات میں ایک مثبت اور زندہ سلسلہ اعمال بیان کیا گیا ہے۔ اس میں اخلاقی، اجتماعی اور ایمانی رشد کے علاوہ نماز، زکوٰۃ اور توکل بر خدا کی صفات بھی شامل ہیں اور اس کے بعد فرماتا ہے:

اولٰئک ھم المؤمنون حقا

یہ ہیں پکے اور حقیقی مومن۔ (انفال ــــــ ۴)

۱۵۳۔ يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ○

۱۵۴۔ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّورَ بِمِيثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا فِي السَّبْتِ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا ○

ترجمہ

۱۵۳۔ اہلِ کتاب تم سے تقاضا کرتے ہیں کہ (ایک ہی مرتبہ) آسمان سے ایک کتاب ان پر نازل کر دو (حالانکہ یہ تو ایک بہانہ ہی ہے) انھوں نے موسیٰ سے اس سے بھی بہت بڑا سوال کیا تھا اور کہا تھا کہ ہمیں ظاہر بظاہر خدا دکھا دے۔ اسی ظلم کی وجہ سے بجلی نے انھیں آلیا تھا۔ پھر انھوں نے ان واضح دلائل کے باوجود جو ان کے لیے آئے تھے (سامری کے) گؤسالہ کو (خدا کے طور پر) منتخب کر لیا پھر بھی ہم نے انھیں معاف کر دیا اور موسیٰ کو ہم نے واضح برتری عطا کی۔

۱۵۴۔ اور ہم نے کوہِ طور ان کے اوپر بلند کیا اور اسی حالت میں ان سے عہد و پیمان لیا اور ان سے کہا کہ (توبہ کے طور پر بیت المقدس کے) دروازے سے خضوع کے ساتھ آؤ (نیز) ہم نے ان سے کہا کہ ہفتہ کے روز تجاوز نہ کرو (اور کاروبار سے ہاتھ کھینچ لو) اور (ان تمام باتوں کے بارے میں) ہم نے ان سے محکم عہد و پیمان لیا۔

شانِ نزول

تفسیر تبیان، مجمع البیان اور روح المعانی میں ان آیات کی شانِ نزول میں لکھا ہے کہ کچھ یہودی پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے کہ اگر تم اللہ کے پیغمبر ہو تو اپنی آسمانی کتاب ایک ہی دفعہ ہمارے سامنے پیش کرو جیسا کہ موسیٰ تورات کو اٹھا لے کر آئے تھے۔

تفسیر

یہودیوں کی بہانہ سازی

آیات میں پہلے اہلِ کتاب (یہودیوں) کے تقاضے کا تذکرہ ہے۔ فرمایا: اہلِ کتاب تم سے تقاضا کرتے ہیں کہ (یکجا) ایک کتاب آسمان سے ان پر نازل کرو (یسئلک اھل الکتاب ان تنزل علیھم کتابًا من السمآء)۔

اس میں شک نہیں کہ ان کی اس فرمائش میں حسنِ نیّت شامل نہ تھی کیونکہ کُتب آسمانی کے نزول کا مقصد ارشاد، ہدایت اور تربیت ہے۔ بعض اوقات یہ ہدف آسمانی کتب کے یکجا نازل ہونے سے حاصل ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کی تدریجی تنزیل اس مقصد کے لیے زیادہ مددگار ہوتی ہے لہٰذا انھیں چاہیے کہ وہ پیغمبر سے دلیل کا مطالبہ کریں اور اعلیٰ وارفع تعلیمات کی فرمائش کریں نہ یہ کہ آسمانی کتب کے نزول کی کیفیت معیّن کریں لہٰذا اس کے بعد خدا نے ان کے عدم حسنِ نیّت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور اپنے پیغمبرؐ کی تسلّی کے لیے یہودیوں کی سابقہ ہٹ دھرمی، عناد اور بہانہ جوئی کا تذکرہ کیا ہے جو وہ اپنے عظیم پیغمبر حضرت موسیٰؑ بن عمران سے کرتے رہے تھے فرمایا: انھوں نے موسیٰ سے اس سے بڑی اور زیادہ عجیب چیزوں کی خواہش کی تھی اور کہا تھا کہ ہمیں ظاہر بظاہر خدا دکھا دے (فقد سألوا موسی اکبر من ذٰلک فقالوا ارنا اللّٰہ جھرۃ)۔

یہ عجیب و غریب اور غیر منطقی فرمائش تھی جس سے بُت پرستوں کا سا عقیدہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خدا کو جسم میں اور محدود دیکھنے کا تقاضا کر رہے تھے اور بلاشبہ اس کی وجہ ہٹ دھرمی اور عناد تھی ان کے اسی ظلم کے باعث صاعقۂ آسمانی نے انھیں آلیا (فاخذتھم الصّٰعقۃ بظلمھم)۔

اس کے بعد ان کے ایک اور بُرے عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے "گوسالہ پرستی"۔ فرمایا: انھوں نے ان معجزات اور واضح دلائل کو دیکھنے اور جاننے کے باوجود بچھڑے کو اپنا معبود قرار دے دیا (ثم اتخذوا العجل من بعد ما جاءتھم البیّنٰت)۔

ان تمام چیزوں کے باوجود اس لیے کہ وہ صحیح راستے کی طرف لوٹ آئیں اور ہٹ دھرمی اور عناد کی سواری سے اتر پڑیں ارشاد فرمایا: پھر بھی ہم نے انھیں بخش دیا اور موسیٰ کو برتری عطا کی اور واضح حکومت بخشی۔ نیز سامری اور بچھڑا پرستوں کی بساط الٹ دی (فعفونا عن ذٰلک واٰتینا موسی سلطانًا مبینًا)۔

وہ پھر بھی خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہوئے اور مرکبِ غرور سے نیچے نہ اُترے اسی لیے ہم نے کوہِ طور کو ان کے سروں پر متحرک کر دیا اور اسی حالت میں ان سے پیمان لیا اور ان سے کہا کہ اپنے گناہوں کی توبہ کے طور پر بیت المقدس کے دروازے سے خضوع و خشوع کے ساتھ داخل ہو جاؤ نیز انھیں تاکید کی کہ ہفتے کے روز کسب و کار سے دست کش ہو جاؤ اور تجاوز کی راہ نہ لو نیز اس دن دریائی مچھلیوں کا شکار نہ کرو کہ جو اس دن حرام ہے اور ان تمام چیزوں کے بارے میں ہم نے ان سے سخت عہد و پیمان لیا[1] لیکن انھوں نے ان میں سے کسی بھی تاکیدی عہد کو پورا نہیں کیا۔ (ورفعنا فوقھم الطور بمیثاقھم وقلنا لھم ادخلوا الباب سجدًا وقلنا لھم لا تعدوا فی السبت واخذنا منھم میثاقًا غلیظًا)۔

تو کیا یہ لوگ اس تاریک ماضی کے ہوتے ہوئے تم سے اپنے اس تقاضے میں سچے ہو سکتے ہیں؟ اگر یہ سچ کہتے ہیں تو پھر اپنی آسمانی

---

[1] کوہِ طور کے یہودیوں کے سروں پر مسلط ہونے کے بارے میں اور یہ کہ ایسا زلزلے کے زیر اثر تھا یا کسی اور عامل کی وجہ سے اور اسی طرح یہودیوں کے سابقہ بُرے اعمال کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اوّل میں بحث کی جا چکی ہے۔ (صفحہ ۲۴۰ اردو ترجمہ دیکھیے)

کتب میں آخری پیغمبر کی صریح نشانیوں کے بارے میں عمل کیوں نہیں کرتے اور انھوں نے تمھارے بارے میں ان کھلی نشانیوں سے چشم پوشی کیوں اختیار کر رکھی ہے۔

دو اہم نکات

۱۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ اعمال تو پہلے یہودیوں سے مربوط تھے پیغمبر اسلامؐ کے معاصر یہودیوں کا ان سے کیا واسطہ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے بڑوں کے اعمال پر معترض نہیں تھے بلکہ ان سے موافق نظریئے کا اظہار کرتے تھے اس لیے سب ایک ہی صف میں قرار پاتے ہیں۔

۲۔ مندرجہ بالا آیات میں جو یہ آیا ہے کہ یہودی مدعی تھے کہ تورات یکبارگی نازل ہوئی ہے تو یہ کوئی مسلم بات نہیں ہے شاید اس توہم کا سبب وہ دس فرامین ہیں، جنھیں دس وصیتیں کہا جاتا ہے جو کہ تختیوں کی صورت میں حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئے تھے۔ جبکہ تورات کے دیگر احکام کے یکجا نازل ہونے کے بارے میں کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے۔

۱۵۵۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

۱۵۶۔ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰي مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝

۱۵۷۔ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝

۱۵۸۔ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝

ترجمہ

۱۵۵۔ وہ اس بنا پر کہ انھوں نے اپنا عہد توڑ دیا، آیاتِ الٰہی کا انکار، انبیاء کو ناحق قتل کیا اور وہ (بطور تمسخر) کہتے تھے کہ

ہمارے دلوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے (اور ہم انبیاء کی باتوں کو سمجھ نہیں پاتے)، (لہٰذا وہ بارگاہِ الٰہی سے دھتکارے گئے) جی ہاں! خدا نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مُہر لگا دی ہے لہٰذا تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ باقی ایمان نہیں لائیں گے (اور یہ وہ ہیں جو راہِ حق پر چلتے ہیں اور ہٹ دھرمی نہیں کرتے)

۱۵۶۔ نیز ان کے کفر کے باعث اور اس عظیم تہمت کی وجہ سے جو انھوں نے مریم پر لگائی ہے۔

۱۵۷۔ اور ان کا یہ کہنا کہ ہم نے عیسٰی بن مریم پیغمبر خدا کو قتل کر دیا حالانکہ نہ انھوں نے اسے قتل کیا ہے اور نہ سولی پر لٹکایا ہے مگر یہ کہ معاملہ ان پر مشتبہ ہو گیا اور جنھوں نے اس کے قتل کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ اس کے متعلق شک میں ہیں اور اس کا علم نہیں رکھتے اور صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں اور انھوں نے یقیناً اسے قتل نہیں کیا۔

۱۵۸۔ بلکہ خدا اسے اپنی طرف لے گیا اور خدا توانا و حکیم ہے۔

تفسیر

یہودیوں کی کچھ اور کارستانیاں

ان آیات میں بنی اسرائیل کی کچھ اور کارستانیوں، قانون شکنیوں، عداوتوں اور انبیاء الٰہی سے دشمنیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

پہلی آیت میں ان میں سے ایک گروہ کی پیمان شکنی، کفر اور قتل انبیاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے انھیں پیمان شکنی کی وجہ سے اپنی رحمت سے دور کر دیا یا اپنی بعض پاکیزہ نعمتوں کو ان پر حرام قرار دے دیا (فبما نقضھم میثاقھم.....)[۱]

اس عہد شکنی کے بعد انھوں نے آیات الٰہی کا انکار کیا اور مخالفت کا راستہ اختیار کیا (وکفرھم بآیات اللہ) اور انھوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ایک اور بڑے جرم کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وہ یہ کہ راہِ حق کے ہادیوں یعنی انبیاء کو بلا جواز قتل کیا (وقتلھم الانبیاء بغیر حق)۔

وہ خلافِ حق اعمال میں اس قدر جسارت مند اور بے باک تھے کہ انبیاء کی گفتگو کا مذاق اڑاتے تھے اور انھیں صراحت سے

---

[۱] "فبما نقضھم" قواعد ادب کے اعتبار سے جار مجرور ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس کا کوئی عامل ہو ممکن ہے اس کا عامل "لعناھم" (ہم نے ان پر لعنت کی) محذوف و مقدر ہے یا "حرمنا علیھم....." (ہم نے ان پر حرام کر دیا) جو جو آیۃ ۱۶۰ میں ہے اس بنا پر جو کچھ درمیانی کلام میں آیا ہے وہ جملہ معترضہ کی حیثیت رکھتا ہے جو ایسے مواقع پر کلام کی خوبی اور زیبائی کا باعث ہوتا ہے۔

کہتے تھے: ہمارے دلوں پر تو پردہ ڈال دیا گیا ہے جو تمہاری دعوت کو سننے اور اسے قبول کرنے میں حائل ہے (وقولہم قلوبنا غلف) یہاں قرآن مجید مزید کہتا ہے: جی ہاں! ان کے دلوں پر واقعی مہر لگادی گئی ہے، اب کوئی حق بات ان میں جاگزیں نہیں ہوسکتی لیکن اس کا عامل ان کا اپنا کفر اور بے ایمانی ہے اس لیے تھوڑے سے افراد جو ایسی ہٹ دھرمیوں تک نہیں پڑتے وہی ایمان لائیں گے باقی نہیں (بل طبع اللہ علیہا بکفرھم فلا یؤمنون الا قلیلا)۔

ان کی قانون شکنیاں صرف یہیں تک محدود نہیں ہیں وہ کفر کی راہ میں اتنے تیز دوڑتے ہیں کہ انھوں نے مریم جیسی پاک دامن خاتون اور خدا کے ایک عظیم پیغمبر کی والدہ جو حکم خدا سے بغیر شوہر کے حاملہ ہوگئی تھی، پر بہت بڑی تہمت لگائی (وبکفرھم وقولھم علی مریم بھتانا عظیما)۔ یہاں تک وہ قتل انبیاء پر فخر کرتے تھے اور کہتے تھے ہم نے عیسٰی بن مریم اللہ کے رسول کو قتل کر دیا (وقولھم انا قتلنا المسیح عیسی بن مریم رسول اللہ) شاید یہ کہ کر رسول اللہ تمسخر اور استہزاء کے طور پر کہتے تھے۔ وہ قتل عیسٰی کے بارے میں اپنے دعوے میں جھوٹے تھے انھوں نے ہرگز مسیح کو قتل نہیں کیا اور نہ سولی پر لٹکایا۔ بلکہ ایک اور شخص کو جو اُن سے مشابہت رکھتا تھا اشتباہ میں سُولی پر لٹکا دیا (وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم)۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: مسیح کے بارے میں اختلاف کرنے والے خود شک میں تھے اور اپنی کہی ہوئی بات پر ایمان نہیں رکھتے تھے وہ صرف تخمینہ اور اندازے کی پیروی کرتے تھے (وان الذین اختلفوا فیہ لفی شک منہ مالھم بہ من علم الا اتباع الظن) اس بارے میں کہ انھوں نے کس بات میں اختلاف کیا مفسرین میں اختلاف ہے بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ انھوں نے اختلاف حضرت مسیح کی اصل حیثیت اور مقام کے بارے میں کیا تھا ایک گروہ جناب مسیح کو خدا کا بیٹا کہتا تھا اور بعض یہودیوں کی طرح انھیں پیغمبر ہی نہیں سمجھتے تھے اور یہ سب کے سب اشتباہ میں تھے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے قتل کی کیفیت کے بارے میں اختلاف ہو بعض کہتے ہیں کہ وہ قتل ہو گئے ہیں اور بعض کہتے کہ وہ قتل نہیں ہوئے اور ان میں سے کوئی بھی اپنی بات پر مطمئن نہیں تھا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت عیسٰی کے قتل کے مدعی انھیں نہ پہچاننے کی وجہ سے شک میں ہوں اور وہ یہ ہے کہ جسے انھوں نے قتل کیا تھا وہ مسیح ہی تھے یا ان کی جگہ کوئی اور شخص تھا۔

اس پر قرآن تاکیداً کہتا ہے انھوں نے قطعاً اسے قتل نہیں کیا بلکہ خدا اسے اپنی طرف اٹھائے گیا اور خدا قادر و حکیم ہے (وما قتلوہ یقینا بل رفعہ اللہ الیہ وکان اللہ عزیزا حکیما)۔

مسیحؑ قتل نہیں ہوئے

زیر نظر آیت میں قرآن کہتا ہے: مسیح قتل نہیں ہوئے اور نہ سولی پر چڑھے بلکہ معاملہ ان پر مشتبہ ہو گیا اور انھوں نے خیال کیا کہ انھیں سولی پر لٹکا دیا ہے حالانکہ یقیناً انھوں نے انھیں قتل نہیں کیا۔

موجودہ چاروں اناجیل (متی، لوقا، مرقس اور یوحنا) میں حضرت مسیح کو سولی پر لٹکائے جانے اور ان کے قتل کا ذکر ہے۔

یہ بات چاروں انجیلوں کے آخری حصوں میں تشریح و تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ آج کے عام مسیحیوں کا بھی یہی عقیدہ ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے تو قتل مسیحؑ اور انھیں مصلوب کیا جانا موجودہ مسیحیت کے اہم ترین بنیادی مسائل میں سے ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ موجودہ عیسائی حضرت مسیحؑ کو ایسا پیغمبر نہیں مانتے جو مخلوق کی ہدایت، تربیت اور ارشاد کے لیے آیا ہو بلکہ وہ انھیں خدا کا بیٹا اور تین خداؤں میں سے ایک کہتے ہیں جس کا اس دنیا میں آنے کا اصلی ہدف ہی فدا ہونا ہے اور اپنی قربانی کے عوض نوع بشر کے گناہوں کا سودا کرنا ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ وہ اس لیے آئے تاکہ ہمارے گناہوں کا فدیہ بن جائیں وہ سولی چڑھے اور قتل ہوئے تاکہ نوع بشر کے گناہوں کو دھو ڈالیں اور عاملین کو سزا سے نجات دلائیں۔ اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ راہِ نجات مسیحؑ سے رشتہ جوڑنے اور ان کے مصلوب ہونے کا عقیدہ رکھنے میں منحصر ہے یہی وجہ ہے کہ وہ مسیحیت کو " مذہب نجات " یا " مذہب فدا " کہتے ہیں اور مسیحؑ کو " ناجی " یا " فادی " کہتے ہیں یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی صلیب کا نشان بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں، اور صلیب ان کا شعار ہے اسی کی وجہ ان کا یہی عقیدہ ہے۔

یہ تھا حضرت مسیحؑ کی سرنوشت کے بارے میں عیسائیوں کے عقیدے کا خلاصہ۔ لیکن کوئی مسلمان بھی اس میں شک نہیں رکھتا کہ یہ عقیدہ باطل ہے اس کی وجوہات یہ ہیں۔

۱۔ حضرت مسیحؑ دیگر انبیاء کی طرح ایک پیغمبر تھے نہ وہ خدا تھے نہ خدا کے بیٹے۔ خدا یکتا و یگانہ ہے اس کا کوئی شبیہ و نظیر مثل و مانند اور بیوی بیٹا نہیں ہے۔

۲۔ گناہوں کا فدیہ بننا بالکل غیر منطقی بات ہے ہر شخص اپنے اعمال کا جوابدہ اور ذمہ دار ہے اور راہِ نجات خود انسان کا اپنا ایمان اور عمل صالح ہے۔

۳۔ گناہ گار کے فدیہ کا عقیدہ فساد، تباہی اور آلودگی کی ترغیب و تشویق کرتا ہے یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن خصوصیت سے مسیحؑ کے مصلوب نہ ہونے کا ذکر کرتا ہے حالانکہ ظاہراً ایک معمولی سی بات نظر آتی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ فدیے اور امت کے گناہ خریدنے کے بے ہودہ اور فضول عقیدے کی سختی سے سرکوبی کی جائے اور عیسائیوں کو اس خرافاتی عقیدے سے نکالا جائے تاکہ وہ نجات کے لیے اپنے اعمال کو درست کریں نہ کہ عقیدۂ صلیب کا سہارا لیں۔

۴۔ بہت سے قرائن ایسے موجود ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کو صلیب دیے جانے کے عقیدے کی کمزوری پر دلالت کرتے ہیں، مثلاً:

و۔ ہم جانتے ہیں کہ موجودہ چاروں انجیلیں جو حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہونے کا ذکر کرتی ہیں سب کی سب حضرت عیسیٰؑ کے بعد ان کے شاگردوں یا شاگردوں کے شاگردوں کے ذریعے لکھی گئی ہیں اور اس بات کا مسیحی مؤرخ بھی اعتراف کرتے ہیں۔

نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جناب مسیحؑ کے شاگرد دشمنوں کے حملے کے وقت بھاگ گئے تھے اور اناجیل بھی اس بات کی گواہ ہیں[1]۔ لہٰذا انھوں نے مسیحؑ کے مصلوب ہونے کے بارے میں عوام میں گردش کرتی ہوئی افواہ یا شہرت سنی اور وہیں سے

---

[1] " اس وقت تمام شاگرد انھیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے " (انجیل متی باب ۲۶ جملہ ۵۶)

یہ بات حاصل کی اور جیسا کہ بعد میں بیان کیا جائے گا کہ حالات ایسے پیش آئے کہ مسیح کی جگہ دوسرا شخص اشتباہ میں پکڑ لیا گیا۔

ب۔ دوسرا عامل جو یہ امکان ظاہر کرتا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کی بجائے اشتباہ میں دوسرا شخص پکڑا گیا ہو یہ ہے کہ شہر کے باہر جستیمانی باغ میں جو لوگ جناب عیسٰیؑ کو گرفتار کرنے کے لیے گئے وہ رومی لشکر کا ایک دستہ تھا یہ لوگ چھاؤنی میں اپنی فوجی ذمہ داریوں میں مشغول تھے یہ لوگ نہ یہودیوں کو پہچانتے تھے نہ وہاں کی زبان اور نہ آداب و رسوم جانتے تھے اور نہ ہی یہ لوگ حضرت عیسٰیؑ کو ان کے شاگردوں میں سے پہچان سکتے تھے۔

ج۔ اناجیل کے مطابق حملہ رات کے وقت حضرت عیسٰیؑ کی رہائش گاہ پر ہوا اس صورت میں تو اور بھی آسان ہے کہ تاریکی میں اصل انسان نکل جائے اور کوئی دوسرا اس کی بجائے گرفتار ہو جائے۔

د۔ تمام انجیلوں کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ گرفتار شدہ شخص نے رومی حاکم پیلاطس کے سامنے خاموشی اختیار کی اور اس کی گفتگو کے جواب میں اپنے دفاع کے لیے بہت کم ہی کچھ کہا۔ یہ بات بہت بعید ہے کہ حضرت عیسٰیؑ اپنے آپ کو خطرے میں دیکھیں اور اپنے بیانِ رسا، قوت گویائی اور شجاعت وشہامت کے باوجود اپنا دفاع نہ کریں۔

تو کیا اس سے یہ احتمال پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص ان کی جگہ پکڑا گیا ہو اور دہشت و اضطراب کا یا شکار ہوا ہو کہ اپنے دفاع میں کچھ کہہ بھی نہ سکا ہو۔ قوی احتمال یہ ہے کہ وہ اسخر یوطی نامی یہودی تھا جس نے حضرت مسیحؑ سے خیانت کی اور ان کے خلاف جاسوس کا کردار ادا کیا۔ کہتے ہیں کہ وہ جناب عیسٰیؑ سے بہت مشابہت رکھتا تھا خصوصاً جبکہ موجودہ اناجیل میں ہے کہ اسخر یوطی یہودی اس واقعے کے بعد دیکھا نہیں گیا اور اناجیل ہی کے مطابق اس نے خودکشی کر لی تھی[۱]

ہ۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کے شاگرد اناجیل کی شہادت کے مطابق خطرہ محسوس کرتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ دوسرے دوست احباب بھی اس دن چھپ گئے ہوں گے اور دور سے حالات پر نظر رکھے ہوں گے۔ لہٰذا گرفتار شدہ شخص رومی فوجیوں کے محاصرے میں تھا اور اس کے دوستوں میں سے کوئی اس کے گرد موجود نہیں تھا۔ اس لیے کون سے تعجب کی بات ہے کہ اشتباہ ہو گیا ہو۔

س۔ اناجیل میں ہے کہ جس شخص کو تختہ دار پر لٹکانے کا حکم دیا گیا اس نے تختہ دار پر خدا سے شکایت کی۔

تو نے مجھے کیوں تنہا چھوڑ دیا اور کیوں مجھے قتل ہونے کے لیے دشمن کے ہاتھ میں دے دیا[۲]

لہٰذا اگر حضرت مسیحؑ دنیا میں اس لیے آئے تھے کہ وہ سولی پر لٹکائے جائیں اور نوعِ انسانی کے گناہوں کا فدیہ ہو جائیں تو پھر ایسی ناروا باتیں انھیں نہیں کرنا چاہیے تھیں۔ یہ جملہ واضح طور پر نشاندہی کرتا ہے کہ وہ شخص نہایت کمزور، ڈرپوک اور عاجز و ناتواں تھا اسی لیے ایسی باتیں کر رہا تھا اور مسیحؑ ہوتے تو ایسی باتیں ہرگز نہ کرتے[۳]

---

[۱] انجیل متی باب ۲۷ جملہ ۲ [۲] ...... عیسٰیؑ نے بلند آواز سے پکار کر کہا ...... ایلی ! ایلی ! لما سبقتنی

یعنی ..... الٰہی ! الٰہی : تو نے کیوں مجھے چھوڑ دیا (متی باب ۲۷، جملہ ۴۶ - ۴۷)

[۳] مندرجہ بالا چند قرائن کے لیے کتاب "قربان صلیب" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

س۔ مسیحیوں کے نزدیک قابلِ قبول چار انجیلوں کے علاوہ موجودہ بعض اناجیل مثلاً انجیل برنابا میں واضح طور پر حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کی نفی کی گئی ہے[1]۔ یہاں تک کہ بعض محققین کا یہ نظریہ ہے کہ عیسیٰ نام کے دو شخص تھے ایک عیسیٰ کو سولی دی گئی تھی اور دوسرے کو نہیں دی گئی تھی اور دونوں میں پانچ سو سال کا فاصلہ تھا[2]۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے، یہ قرائن مجموعی طور پر حضرت مسیح کے قتل اور صلیب دیئے جانے کے بارے میں قرآن کے دعویٰ اشتباہ کو واضح کرتے ہیں۔

۱۵۹۔ وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ۝

ترجمہ

۱۵۹۔ کوئی اہلِ کتاب ایسا نہیں جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے گا اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا۔

تفسیر

مندرجہ بالا آیت کی تفسیر کے بارے میں دو احتمال ہیں۔ ان میں سے ہر ایک قابلِ ملاحظہ ہے:

۱۔ آیت کہتی ہے: کوئی اہلِ کتاب نہیں مگر یہ کہ وہ مسیح پر "اپنی موت" سے پہلے ایمان لے آئے گا (وان من اهل الکتاب الا لیؤمنن به قبل موته)۔

اور یہ وقت وہ ہوگا جب انسان موت کے دہانے پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا ربط اس جہان سے کمزور پڑ جاتا ہے اور بعد والے جہان سے قوی ہوجاتا ہے، پردے اس کی آنکھوں کے سامنے سے اٹھ جاتے ہیں، بہت سے حقائق اسے نظر آنے لگتے ہیں اور وہ ان کے بارے میں آگاہی حاصل کرلیتا ہے۔ اس موقع پر اس کی حقیقت میں آنکھیں مقامِ مسیح کو دیکھتی ہیں اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرلیتی ہیں۔ جو اس کے منکر تھے اب مومن ہوجاتے ہیں اور جو اسے خدا سمجھتے تھے اب اپنے اشتباہ کو جان لیتے ہیں۔

یہ ایمان فرعون اور دیگر ایسے لوگوں کا سا ایمان ہے جو عذاب میں گرفتار ہوجاتے ہیں اور اپنی بربادی کا سامان اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں۔ پھر اظہارِ ایمان کرتے ہیں ایسا ایمان انھیں کوئی فائدہ نہیں دیتا لہٰذا کس قدر اچھا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ

---

[1] تفسیر المنار ج ۶ صفحہ ۲۴

[2] المیزان ج ۲ صفحہ ۲۴۵

ایسے حساس لمحے پر ایمان لائیں جبکہ ایمان انھیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا ابھی ایمان لے آئیں اور مومن بن جائیں جب ایمان ان کے لیے فائدہ مند بھی ہے۔

اس تفسیر کے مطابق " قبل موتہ " کی ضمیر اہلِ کتاب کے بارے میں ہے۔

۲۔ دوسری تفسیر کے مطابق تمام اہلِ کتاب حضرت مسیحؑ پر " ان کی موت " سے پہلے ایمان لے آئیں گے۔ یہودی ان کی نبوت قبول کرلیں گے اور عیسائی ان کی الوہیت کے عقیدے سے دست کش ہو جائیں گے یہ اس وقت ہوگا جب اسلامی روایات کے مطابق حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے موقع پر حضرت عیسٰیؑ آسمان سے اتریں گے اور ان کے پیچھے نماز پڑھیں گے یہود و نصاریٰ بھی انھیں دیکھیں گے اور ان پر اور حضرت مہدی علیہ السلام پر ایمان لے آئیں گے۔

واضح رہے کہ حضرت مسیحؑ کا دین گذشتہ زمانے سے تعلق رکھتا ہے اور اب ان کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ دینِ اسلام کی پیروی کریں، جس کے جاری اور نافذ کرنے والے حضرت مہدی علیہ السلام ہوں گے۔

اس تفسیر کے مطابق " قبل موتہ " کی ضمیر کا تعلق حضرت مسیحؑ سے ہے نہ کہ اہلِ کتاب سے۔ بہت سی اسلامی کتب میں یہ حدیث پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

کیف انتم اذا نزل فیکم ابن مریم و امامکم منکم۔

اس وقت تمھارا کیا حال ہوگا جب فرزندِ مریم تم میں نازل ہوگا اور تمھارا امام و پیشوا خود تم میں سے ہوگا۔ [۱]

علی بن ابراہیم کی تفسیر میں شہر بن حوشب سے منقول ہے:

ایک دن حجاج نے کہا: قرآن میں ایک آیت ہے جس نے مجھے تھکا دیا ہے اور میں اس کے معنی میں ڈوبا رہتا ہوں۔

شہر نے کہا: کون سی آیت ہے، اے امیر!؟

حجاج نے کہا: و ان من اھل الکتاب .... کیونکہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کو قتل کرتا ہوں لیکن ایسے ایمان کی کوئی نشانی ان میں نہیں دیکھتا۔

شہر نے کہا، "تم آیت کی یہ تفسیر صحیح نہیں کرتے ہو"

حجاج بولا: کیسے؟ آیت کی صحیح تفسیر کیا ہے؟

شہر نے جواب دیا: مراد یہ ہے کہ حضرت عیسٰیؑ اس دنیا کے ختم ہونے سے پہلے اتریں گے اور کوئی یہودی یا غیر یہودی ایسا باقی نہیں رہے گا جو حضرت عیسٰیؑ کی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لے آئے، عیسٰیؑ، حضرت مہدیؑ کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔

---

[۱] تفسیر المیزان کے مطابق یہ حدیث مسند احمد، صحیح بخاری، صحیح مسلم اور سنن بیہقی میں موجود ہے۔

حجاج نے یہ بات سنی تو کہنے لگا، "وائے ہو تم پر، یہ تفسیر کہاں سے لائے ہو؟"
شہر نے کہا، محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب علیہم السلام سے میں نے یہ تفسیر سنی ہے۔
حجاج کہنے لگا: واللہ جئت بھا من عین صافیۃ (یعنی ــ بخدا صاف و شفاف سرچشمہ سے لایا ہے)[1]

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے، قیامت کے دن حضرت مسیحؑ ان پر گواہ ہوں گے (ویوم القیٰمۃ یکون علیہم شہیدا)۔ حضرت مسیحؑ کی ان کے خلاف گواہی سے مراد یہ ہے کہ وہ گواہی دیں گے کہ میں نے تبلیغ رسالت کی اور انھیں کبھی اپنی الوہیت کی دعوت نہیں دی بلکہ پروردگار کی ربوبیت کی دعوت دی۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۷ کے مطابق حضرت مسیحؑ قیامت کے دن اپنی گواہی اپنی اس زندگی کے دوران کے بارے میں دیں گے جب وہ اپنی اُمت میں موجود تھے لیکن اس کے بعد کی ذمہ داری قبول نہیں کریں گے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

وکنت علیھم شھیدا ما دمت فیھم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم وانت علی کل شیء شھید۔

یعنی ــ (حضرت عیسیٰ کہیں گے) جب تک میں ان کے درمیان تھا تو ان پر شاہد اور ناظر تھا لیکن جب تو نے ان میں سے مجھے اٹھا لیا تو تو ان پر نگران ہے اور تو ہر چیز پر شاہد و گواہ ہے۔

لیکن زیر بحث آیت میں ہے کہ حضرت مسیحؑ قیامت کے دن ان سب کے بارے میں گواہی دیں گے چاہے وہ ان کے زمانے میں تھے یا نہیں تھے۔

دونوں آیات پر غور و خوض کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت حضرت مسیحؑ کی طرف سے تبلیغ رسالت اور الوہیت کی نفی کے بارے میں گواہی سے متعلق ہے جبکہ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۷ ان کے عمل کے بارے میں گواہی سے مربوط ہے۔
اس کی وضاحت یہ ہے کہ زیر بحث آیت کہتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ان تمام لوگوں کے خلاف گواہی دیں گے جنھوں نے ان کی الوہیت کا عقیدہ رکھا، چاہے وہ آپ کے زمانے میں تھے یا اس کے بعد اور کہیں گے کہ میں نے انھیں ہرگز ایسی کسی چیز کی دعوت نہیں دی تھی۔ لیکن سورہ مائدہ کی آیت ۱۱۷ کہتی ہے کہ وہ کہیں گے کہ میں نے انھیں صحیح اور کافی و وافی تبلیغ رسالت

---

[1] تفسیر برہان جلد ۱ صفحہ ۴۲۶

کی ہے جب تک میں ان کے درمیان موجود تھا تو عملاً ان کے انحراف کو روکتا رہا لیکن میرے بعد یہ ہوا کہ وہ میری الوہیت کے قائل ہو گئے اور انھوں نے انحراف کا راستہ اختیار کیا ان دنوں میں ان کے درمیان نہ تھا کہ ان کے اعمال کا گواہ بنوں اور یہ کہ انھیں اس سے روکتا۔

۱۶۰۔ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۙ

۱۶۱۔ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا

۱۶۲۔ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰۤئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ۧ

ترجمہ

۱۶۰۔ اس ظلم کی وجہ سے جو یہودیوں نے کیا نیز راہ خدا سے بہت زیادہ روکنے کی بنا پر کچھ پاکیزہ چیزیں جو ان پر حلال تھیں ہم نے حرام قرار دے دیں۔

۱۶۱۔ اور (اسی طرح) ان کی سود خوری (بھی)، جبکہ انھیں اس سے منع کر دیا گیا تھا اور باطل طریقے سے لوگوں کا مال کھانے کی وجہ سے اور ان میں سے کافروں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

۱۶۲۔ لیکن ان میں وہ لوگ جو علم میں راسخ ہیں اور وہ جو ایمان لائے ہیں، ان تمام چیزوں پر جو تم پر نازل ہوئی ہیں اور ان پر جو تم سے پہلے نازل ہو چکی ہیں ایمان لا چکے ہیں اور وہ جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ جو خدا اور روز قیامت پر ایمان لائے ہیں ہم جلد ہی ان سب کو اجر عظیم دیں گے۔

تفسیر

یہودیوں میں سے صالح اور غیر صالح افراد کا انجام

گذشتہ آیات میں یہودیوں کی قانون شکنی کے چند نمونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا آیات میں ان کے کچھ اور ناشائستہ اعمال کا ذکر کرنے کے بعد ان سزاؤں کا تذکرہ ہے جو ان کے اعمال کی وجہ سے دنیا اور آخرت میں ان کے دامن گیر ہوئیں اور ہوں گی۔

پہلے ارشاد فرمایا: اس ظلم و ستم کی وجہ سے جو یہودیوں نے کیا اور لوگوں کو راہِ خدا سے باز رکھنے کی وجہ سے کچھ پاک و پاکیزہ چیزیں ہم نے ان پر حرام کر دیں اور انھیں ان سے استفادہ سے محروم کر دیا (فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبات احلت لھم وبصدھم عن سبیل اللہ کثیرا)۔

نیز اس بنا پر کہ وہ سود کھاتے تھے حالانکہ انھیں اس سے منع کیا گیا تھا اور اسی طرح لوگوں کا مال ناحق کھاتے تھے ان کے یہی کام ان کی اس محرومیت کا سبب بنے (واخذھم الربوا وقد نھوا عنہ واکلھم اموال الناس بالباطل)۔

اس دنیاوی سزا کے علاوہ ہم انھیں اخروی سزاؤں میں مبتلا کریں گے اور ان میں سے جو کافر ہیں ان کے لیے دردناک عذاب تیار ہے (واعتدنا للکافرین منھم عذابا الیما)۔

چند اہم نکات

۱۔ یہودیوں کے لیے طیبات کی حرمت: طیبات کی حرمت سے مراد وہی ہے جس کی طرف سورہ انعام آیۃ ۱۴۶ میں اشارہ ہوا ہے، جہاں فرمایا گیا ہے:

ہم نے یہودیوں کے ظلم و ستم کی وجہ سے ہر جانور جس کا سم پھٹا ہوا نہ ہو ان پر حرام قرار دے دیا۔ نیز گائے اور بھیڑ بکری کی چربی بھی کہ جس سے انھیں لگاؤ تھا ان پر حرام کر دی مگر اس کا وہ حصہ جو جانور کی پشت یا آنتوں کے اطراف میں ہو یا ہڈی کے ساتھ ملا ہوا ہو۔

لہٰذا مذکورہ حرمت تحریم تشریعی و قانونی تھی، تحریم تکوینی نہ تھی۔ یعنی یہ نعمتیں طبعی اور فطری طور پر تو ان کے پاس تھیں، لیکن شرعاً انھیں ان کے کھانے سے روک دیا گیا تھا۔

موجودہ تورات کے سفر لاویان کی گیارہویں فصل میں ان میں سے کچھ چیزوں کی حرمت کا ذکر موجود ہے لیکن یہ بات اس میں نہیں کہ یہ حرمت سزا کے طور پر تھی۔[1]

[1] تفسیر نمونہ جلد دوم کی طرف رجوع کیجیے (دیکھیے صفحہ ۲۰۱ اردو ترجمہ)

۲۔ کیا یہ حرمت عمومی تھی ؟ یہ حرمت ظالم لوگوں کے لیے ہی تھی یا سب کے لیے ـــــــ اس سلسلے میں مندرجہ بالا آیت اور سورہ انعام کی آیت ۱۴۶ کے ظاہری مفہوم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ تحریم عمومی تھی کیونکہ آیت میں "لھم" کہا گیا ہے جبکہ اخروی سزا کے لیے " للکافرین منھم " آیا ہے یعنی ان میں سے کافروں کے لیے ، لہٰذا ظالموں کے لیے تو یہ حرمت سزا کے طور پر تھی جبکہ نیک لوگ جو کم تعداد میں تھے ان کے لیے آزمائش اور انضباط کے پہلو سے تھی۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ تحریم فقط ستمگروں کے لیے تھی اور بعض روایات میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے تفسیر برہان میں سورۂ انعام کی آیت ۴۶ ۔ کے ذیل میں امام صادق علیہ السّلام سے منقول ہے ، آپؑ نے فرمایا :

بنی اسرائیل کے حکام اور رؤسا فقیر اور نادار لوگوں کو پرندوں کے گوشت اور جانوروں کی چربی کھانے سے روکتے تھے ۔ خدا نے ان کے اس ظلم و ستم کی وجہ سے ان چیزوں کو خود ان پر حرام قرار دے دیا[1]

۳۔ سود کی حرمت قبل از اسلام سے ہے : اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سود کی حرمت اسلام ہی سے مخصوص نہیں ہے ۔ بلکہ یہ گزشتہ قوموں میں بھی حرام تھا اگرچہ موجودہ تحریف شدہ تورات میں اس کی حرمت برادران دینی میں حرام شمار کی گئی ہے[2]

یہودیوں میں سے اہل ایمان

زیر نظر آیات میں سے آخری آیت میں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے جس کا قرآن نے بارہا اظہار کیا ہے اور وہ یہ کہ قرآن اگر یہودیوں کی مذمت کرتا ہے تو یہ نسلی اور گروہی جھگڑے کے حوالے سے نہیں ہے ۔ اسلام کسی قوم و قبیلے کی مذمت قوم اور قبیلے کی وجہ سے نہیں کرتا بلکہ اس مذمت کا ہدف صرف آلودۂ گناہ اور منحرف لوگ ہوتے ہیں اسی لیے اس آیت میں یہودیوں میں سے صاحب ایمان اور پاک دامن افراد کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے اور ان کی تعریف کی گئی ہے اور انھیں اجر عظیم کی بشارت دی گئی ہے قرآن کہتا ہے ، لیکن یہودیوں میں سے وہ لوگ جو علم و دانش میں راسخ ہیں ، خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ تم سے پہلے نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان لے آئے ہیں ہم بہت جلد انھیں اجر عظیم سے نوازیں گے (لکن الراسخون فی العلم منھم والمؤمنون یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک والمقیمین الصلوٰۃ والمؤتون الزکوٰۃ والمؤمنون باللہ والیوم الاٰخر اولٰئک سنؤتیھم اجرًا عظیمًا[3])۔

---

[1] تفسیر برہان ج ۱ ص ۵۵۹

[2] تورات ، سفر تثنیہ فصل ۲۳ جملہ ۱۹ ، ۲۰ - برادران دینی سے ظاہرًا اولاد حضرت اسماعیلؑ مراد ہے (مترجم)

[3] "الراسخون فی العلم" کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد دوم ص ۴۷ (اردو ترجمہ) میں تفصیلی وضاحت کی جا چکی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہودیوں کے بڑے لوگوں میں ایک جماعت اسلام کے ظہور اور اس کی حقانیت کو دیکھتے ہوئے دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئی اور دل وجان سے اس کی حمایت کی۔ یہ لوگ پیغمبر اسلامؐ اور باقی مسلمانوں کے لیے قابل احترام قرار پائے۔

۱۶۳۔ إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ ۚ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا ○

۱۶۴۔ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ○

۱۶۵۔ رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ○

۱۶۶۔ لَّٰكِنِ اللَّهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنزَلَ إِلَيْكَ ۖ أَنزَلَهُ بِعِلْمِهِ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ يَشْهَدُونَ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ○

ترجمہ

۱۶۳۔ ہم نے تم پر وحی کی جس طرح کہ نوح اور اس کے بعد والے انبیاء پر وحی کی تھی نیز ابراہیم، اسماعیل، اسحاق یعقوب (بنی اسرائیل میں سے) اسباط، عیسٰی، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان پر وحی کی اور (جیسے) داؤد کو ہم نے زبور دی۔

۱۶۴۔ اور وہ پیغمبر جن کی سرگذشت ہم تمھیں پہلے بیان کر چکے ہیں اور وہ پیغمبر کہ جن کا قصہ ہم نے بیان نہیں کیا اور خدا نے موسٰی سے کلام کیا۔

۱۶۵- وہ پیغمبر کہ جو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے تاکہ لوگوں کے پاس ان پیغمبروں کے بعد خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہے (اور سب پر اتمام حجت ہو جائے) اور خدا توانا و حکیم ہے۔

۱۶۶- لیکن خدا گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ تجھ پر نازل ہوا ہے وہ اس نے اپنے علم کی رُو سے نازل کیا ہے اور فرشتے (بھی) گواہی دیتے ہیں اگرچہ خدا کی گواہی کافی ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ یہودی انبیاء میں فرق کرتے تھے بعض کی تصدیق کرتے تھے اور بعض کی تردید کرتے تھے۔ زیر نظر آیات میں دوبارہ انھیں جواب دیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے تجھ پر وحی نازل کی جس طرح نوح اور اس کے بعد والے انبیاء پر وحی بھیجی تھی اور جیسے ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، وہ پیغمبر جو اولاد یعقوب میں سے تھے، عیسیٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ ہارونؑ اور سلیمانؑ پر وحی نازل کی تھی اور داؤدؑ کو زبور دی تھی (انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ واوحینا الی ابراھیم واسمٰعیل واسحٰق ویعقوب والاسباط وعیسٰی وایوب ویونس وھٰرون وسلیمٰن واٰتینا داوٗد زبورًا) لہٰذا ان بزرگ انبیاء میں کیوں تفریق کرتے ہو جبکہ سب کے سب ایک ہی راستے کے مسافر ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس آیت کے مخاطب عرب کے مشرکین اور بت پرست ہوں جو پیغمبر اسلامؐ پر نزول وحی پر تعجب کرتے تھے، آیت کہتی ہے کہ اس میں کون سی تعجب کی بات ہے، کیا پہلے پیغمبروں پر وحی نازل نہیں ہوئی۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: وہ انبیاء جن پر وحی نازل ہوئی وہ یہی نہیں تھے بلکہ دوسرے پیغمبر کہ جن کا ذکر تم سے پہلے کیا جا چکا ہے اور وہ پیغمبر کہ جن کا قصہ ابھی تک بیان نہیں ہوا۔ سب کی یہی ماموریت تھی اور ان پر بھی وحی نازل ہوتی رہی (ورسلا قد قصصناھم علیک من قبل ورسلا لم نقصصھم علیک) اور اس سے بالاتر یہ کہ خدا نے موسیٰ سے کلام کیا (وکلم اللہ موسٰی تکلیمًا)۔

لہٰذا رشتہ وحی تو ہمیشہ سے نوع بشر میں تھا اور کیسے ممکن ہے کہ ہم نوع انسانی کو بغیر راہبر و راہنما کے چھوڑ دیں، اور پھر ان کے لیے جابدہی اور ذمہ داری کے بھی قائل ہوں؟ لہٰذا ہم نے "ان پیغمبروں کو بشارت دینے والا اور ڈرانے والا قرار دیا تاکہ خدا کی رحمت اور ثواب کا لوگوں کو امیدوار بنائیں اور اس کی سزاؤں سے ڈرائیں تاکہ اس طرح ان پر اتمام حجت ہو جائے اور ان کے پاس کوئی بہانہ نہ رہے" (رسلا مبشرین ومنذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل)۔

خدا نے ان رہبروں کو بھیجنے کا پروگرام نہایت باریک بینی سے منظم اور جاری کیا ہے ایسا کیوں نہ ہو جبکہ "وہ تمام چیزوں پر توانائی رکھتا ہے اور حکیم (بھی) ہے" (وکان اللہ عزیزًا حکیمًا) اس کی حکمت سبب بنتی ہے

کہ یہ کام عملی صورت اختیار کرے اور اس کی قدرت راہ ہموار کرتی ہے کیونکہ ایک صحیح پروگرام اگر انجام پذیر نہ ہو تو اس کی وجہ یا عدم حکمت ہوگی یا عدم قدرت ـــــــ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی نقص خدا کی ذات پاک میں نہیں ہے۔

آیت کے آخر میں پیغمبر اکرم کی دلجوئی اور تسلی کے لیے کہتا ہے، اگر یہ لوگ تیری نبوت و رسالت کا انکار کرتے ہیں تو اس کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ خدا نے جو کچھ تجھ پر نازل کیا ہے وہ خود اس کا گواہ ہے (لکن الله یشهد بما انزل الیک) البتہ اس مقصد کے لیے تمہارا انتخاب بلاوجہ نہیں تھا بلکہ تمہاری اصلیت کو جانتے ہوئے اس نے یہ آیات تم پر نازل کی ہیں (انزله بعلمه)۔

ممکن ہے یہ جملہ ایک اور مفہوم کا بھی حامل ہو اور وہ یہ کہ جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اس کا سرچشمہ علم الٰہی کا دریائے بے کنار ہے اور اس کے مضامین شاہد ہیں کہ ان کا سرچشمہ علم الٰہی ہے اس لیے تمہارے دعوٰی کی صداقت کی گواہی خود متن آیات میں ثبت ہے اور کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے کیسے ممکن ہے کہ جس شخص نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا وہ علم الٰہی کے بغیر ایک ایسی کتاب لے کر آئے جو اعلیٰ ترین تعلیمات، فلسفوں، قوانین، اخلاقی احکام اور اجتماعی پروگرام پر مشتمل ہو۔

آخر میں مزید فرماتا ہے، نہ صرف خدا تمہاری حقانیت کی گواہی دیتا ہے بلکہ فرشتگانِ الٰہی بھی گواہی دیتے ہیں، اگرچہ خدا کی گواہی کافی ہے (والملٰئكة يشهدون وكفىٰ بالله شهيدًا)۔

چند اہم نکات

۱۔ اسلام تمام ادیان کی خوبیوں کا امتزاج ہے: بعض مفسرین "انا اوحینا الیک کما اوحینا... الخ" کے جملے سے یہ استفادہ کرتے ہیں کہ قرآن چاہتا ہے کہ پیغمبر سے یہ نکتہ کہے کہ تمہارے دین میں تمام خصوصیات اور امتیازات جمع ہیں جو گزشتہ ادیان میں تھے ـــــــ گویا

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

یعنی ـــــــ جو خوبیاں ان سب میں الگ الگ ہیں وہ تجھ اکیلے میں جمع ہیں

بعض روایات اہل بیتؑ میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے اور مفسرین نے بھی دراصل انہی روایات سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے [1]

۲۔ آسمانی کتب کی اقسام: مندرجہ بالا آیت میں ہے کہ زبور آسمانی کتب میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو دی تھی۔ یہ بات اس امر کے منافی نہیں جو مسلّم اور مشہور ہے کہ نئی شریعت کے حامل اور صاحب کتاب اولوالعزم پیغمبر پانچ سے زیادہ نہیں ہیں۔ کیونکہ جیسا کہ آیات قرآنی اور روایات اسلامی سے معلوم ہوتا ہے پیغمبران الٰہی پر نازل ہونے والی

---

[1] تفسیر صافی ص ۱۳۹، تفسیر برہان ج ۱ ص ۴۲۲ اور تفسیر نور الثقلین ج ۱ ص ۵۸۳ کی طرف رجوع فرمائیں۔

آسمانی کتب دو طرح کی ہیں۔

پہلی قسم۔ ان کتب کی ہے جن میں احکام تشریعی تھے اور جو نئی شریعت کا اعلان کرتی تھیں اور وہ پانچ سے زیادہ نہیں ہیں جو کہ پانچ اولوالعزم پیغمبروں پر نازل ہوئیں۔

دوسری قسم۔ ان کتب کی ہے جن میں کوئی نئے احکام نہیں ہوتے تھے بلکہ ان میں پند و نصائح، رہنمائی، وصیتیں اور دعائیں ہوتی تھیں۔ زبور بھی اسی طرح کی کتاب ہے۔ "مزامیر داؤد" یا "زبور داؤد" جو کہ عہد قدیم کی کتب میں شمار ہوتی ہے اس حقیقت پر شاہد ہے اگرچہ یہ کتاب بھی عہد قدیم و جدید کی دیگر کتب کی طرح تحریف و تغییر سے محفوظ نہیں رہی لیکن پھر بھی کہا جاسکتا ہے کہ کسی حد تک وہ اپنی شکل و صورت میں باقی ہے یہ کتاب ایک سو پچاس فصلوں پر مشتمل ہے جن میں ہر ایک کو مزمور کہتے ہیں اس کی تمام فصلیں پند و نصائح اور دعا و مناجات پر مشتمل ہیں۔

حضرت ابوذر سے ایک روایت میں منقول ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ انبیاء کی تعداد کتنی ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا:

ایک لاکھ چوبیس ہزار۔

میں نے عرض کیا: ان میں سے رسول کتنے تھے؟

آپؐ نے فرمایا: تین سو تیرہ، اور باقی صرف نبی تھے۔

ابوذر کہتے ہیں میں نے پوچھا: آسمانی کتابیں جو ان پر نازل ہوئیں وہ کتنی تھیں؟

آپؐ نے فرمایا: وہ ایک سو چار کتابیں ہیں، جن میں سے دس کتابیں آدم پر، پچاس کتابیں شیث پر، تیس کتابیں ادریس پر اور دس کتابیں ابراہیم پر (جو کل سو ہوئیں) اور تورات، انجیل، زبور اور قرآن مجید[1]

۳۔ اسباط سے کیا مراد ہے، اسباط جمع ہے سبط (بروزن سَبَد) کی جس کا مطلب ہے، بنی اسرائیل کے قبائل، لیکن یہاں مقصود وہ پیغمبر ہیں جو ان قبائل میں مبعوث ہوئے تھے[2]

۴۔ انبیاء پر نزول وحی کی کیفیت:۔ انبیاء پر نزول وحی کی کیفیت مختلف تھی کبھی نزول وحی کے فرشتے کے ذریعے وحی آتی، کبھی دل میں الہام کے ذریعے سے اور کبھی آواز سنائی دیتی۔ اس طرح کہ خدا تعالیٰ فضا میں یا اجسام میں صوتی لہریں پیدا کر دیتا اور اس طرح سے اپنے پیغمبر سے گفتگو کرتا، ان میں سے کہ جنھیں واضح طور پر یہ امتیاز حاصل ہوا ایک حضرت موسیٰ بن عمران تھے جو کبھی شجرہ وادیٔ ایمن سے صوتی لہریں سنتے اور کبھی کوہ طور سے انھیں آواز سنائی دیتی۔ اس لیے حضرت موسیٰؑ کو کلیم اللہ کا لقب دیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا آیات میں حضرت موسیٰؑ کا جداگانہ تذکرہ شاید ان کے اسی امتیاز کی وجہ سے ہو۔

---

[1] مجمع البیان ج ۱۰ صفحہ ۴۷۶
[2] "اسباط" کے بارے میں تفصیلی وضاحت، تفسیر نمونہ جلد اول میں کی جاچکی ہے (دیکھیے اردو ترجمہ ص ۴۴۴)

تفسیر

گذشتہ آیات میں غیر مومن افراد کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ اب اس آیت میں ایمان کی طرف دعوت دی گئی ہے اور اس کے نتیجے کا ذکر کیا گیا ہے اور مختلف تعبیرات جو انسان میں اشتیاق پیدا کریں ان میں سب کو جمع کیا تاکہ لوگوں کو اس بلند مقصد کی ترغیب دی گئی ہے۔

۱۶۷۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًاۢ بَعِیْدًا ۝

۱۶۸۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ

پہلے فرمایا گیا ہے: اے لوگو! وہی پیغمبر کہ جس کے تم منتظر تھے اور جس کے بارے میں گذشتہ آسمانی کتب میں نشاندہی کی جا چکی ہے وہ دینِ حق لے کر تمہاری طرف آچکا ہے (یآیھا الناس قد جاءکم الرسولؐ بالحق)۔[1]

اس کے بعد فرمایا: یہ پیغمبر اس ذات کی طرف سے آیا ہے جس نے تمہاری پرورش و تربیت اپنے ذمے لے رکھی ہے (من ربکم) پھر مزید فرمایا، اگر ایمان لے آؤ تو تمہارے فائدے میں ہے اس سے تم کسی دوسرے کی خدمت نہیں کرو گے بلکہ یہ خود تمہاری اپنی خدمت ہوگی (فامنوا خیرًا لکم) اور آخر میں فرمایا: یہ خیال نہ کرو کہ اگر تم نے راہِ کفر اختیار کی تو اس سے خدا کو کوئی نقصان ہوگا، ایسا نہیں ہے کیونکہ خدا ان تمام چیزوں کا مالک ہے جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں (وان تکفروا فان للہ ما فی السمٰوٰت و الارض) علاوہ ازیں چونکہ خدا عالم اور حکیم ہے اس نے جو احکام تمہیں دیئے ہیں، اور جو پروگرام ترتیب دیئے ہیں سب میں حکمت اور مصلحتیں پوشیدہ ہیں اور تمہارے فائدے میں ہیں (و کان اللہ علیمًا حکیمًا) لہٰذا اگر اس نے انبیاء اور پروگرام بھیجے ہیں تو یہ اس لیے نہیں کہ اسے ضرورت تھی بلکہ اس کے علم و حکمت کا تقاضا ہے۔ اس لیے ان تمام پہلوؤں کی طرف توجہ رکھتے ہوئے کیا یہ مناسب ہے کہ تم راہِ ایمان کو چھوڑ کر راہِ کفر پر گامزن ہو جاؤ۔

۱۷۱۔ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَکَلِمَتُہٗ ۚ اَلْقٰھَآ اِلٰی مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْہُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ ۚ۫ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَۃٌ ؕ اِنْتَھُوْا خَیْرًا لَّکُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰہُ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَہٗٓ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ وَلَدٌ ۘ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا ۝

ترجمہ

۱۷۱۔ اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں غلو (اور زیادہ روی) نہ کرو اور حق کے سوا خدا کے بارے میں کچھ نہ کہو۔ مسیح

---

[1] ظاہراً "الرسول" کی الف لام عہد کی اور اس پیغمبر کی طرف اشارہ ہے جس کے وہ انتظار میں تھے نہ صرف یہود و نصاریٰ بلکہ مشرکین بھی۔ کیونکہ وہ اہلِ کتاب سے اس ضمن میں کچھ مطالب سن چکے تھے اور وہ بھی منتظر تھے۔

[2] طرقِ اہلِ بیتؑ سے منقول بعض روایات میں حق کی تفسیر "ولایت حضرت علیؑ" سے کی گئی ہے اور جیسا کہ بارہا کہا جا چکا ہے ایسی تفسیر میں واضح مصداق کو بیان کیا جاتا ہے اور آیت اس معنی میں منحصر نہیں ہوتی۔

آسمانی کتب دو طرح کی ہیں۔

پہلی قسم۔ ان کتب کی ہے جن میں احکام تشریعی تھے اور جو نئی شریعت کا اعلان کرتی تھیں اور وہ پانچ سے زیادہ نہیں ہیں جو کہ پانچ اولوالعزم پیغمبروں پر نازل ہوئیں۔

دوسری قسم۔ ان کتب کی ہے جن میں کوئی نئے احکام نہیں ہوتے تھے بلکہ ان میں پند و نصائح، رہنمائی، وصیتیں اور دعائیں ہوتی تھیں۔ زبور بھی اسی طرح کی کتاب ہے۔ "مزامیر داؤد" یا "زبور داؤد" جو کہ عہد قدیم کی کتب میں شمار ہوتی ہے اس حقیقت پر شاہد ہے اگرچہ یہ کتاب بھی عہد قدیم و جدید کی دیگر کتب کی طرح تحریف و تغییر سے محفوظ نہیں رہی لیکن پھر بھی کہا جاسکتا ہے کہ کسی حد تک وہ اپنی شکل و صورت میں باقی ہے یہ کتاب ایک سو پچاس فصلوں پر مشتمل ہے جن میں ہر ایک کو مزمور کہتے ہیں اس کی تمام فصلیں پند و نصائح اور دعا و مناجات پر مشتمل ہیں۔

حضرت ابوذر سے ایک روایت میں منقول ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ انبیاء کی تعداد کتنی ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا:

ایک لاکھ چوبیس ہزار۔

میں نے عرض کیا: ان میں سے رسول کتنے تھے؟

آپؐ نے فرمایا: تین سو تیرہ، اور باقی صرف نبی تھے۔

ابوذر کہتے ہیں میں نے پوچھا: آسمانی کتابیں جو ان پر نازل ہوئیں وہ کتنی تھیں؟

آپؐ نے فرمایا: وہ ایک سو چار کتابیں ہیں، جن میں سے دس کتابیں آدم پر، پچاس کتابیں شیث پر، تیس کتابیں ادریس پر اور دس کتابیں ابراہیم پر (جو کل سو ہوئیں) اور تورات، انجیل، زبور اور قرآن مجید۔[1]

۳۔ اسباط سے کیا مراد ہے: اسباط جمع ہے سبط (بروزن سَبد) کی جس کا مطلب ہے، بنی اسرائیل کے قبائل، لیکن یہاں مقصود وہ پیغمبر ہیں جو ان قبائل میں مبعوث ہوئے تھے۔[2]

۴۔ انبیاء پر نزول وحی کی کیفیت:۔ انبیاء پر نزولِ وحی کی کیفیت مختلف تھی کبھی نزول وحی کے فرشتے کے ذریعے وحی آتی، کبھی دل میں الہام کے ذریعے سے اور کبھی آواز سنائی دیتی۔ اس طرح کہ خدا تعالیٰ فضا میں یا اجسام میں صوتی لہریں پیدا کر دیتا اور اس طرح سے اپنے پیغمبر سے گفتگو کرتا، ان میں سے کہ جنھیں واضح طور پر یہ امتیاز حاصل ہوا ایک حضرت موسیٰ بن عمران تھے جو کبھی شجرہ وادیٔ ایمن سے صوتی لہریں سنتے اور کبھی کوہ طور سے انھیں آواز سنائی دیتی۔ اس لیے حضرت موسیٰؑ کو کلیم اللہ کا لقب دیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا آیات میں حضرت موسیٰؑ کا جداگانہ تذکرہ شاید ان کے اسی امتیاز کی وجہ سے ہو۔

---

[1] مجمع البیان ج ۱۰ صفحہ ۴۷۶

[2] "اسباط" کے بارے میں تفصیلی وضاحت، تفسیر نمونہ جلد اول میں کی جاچکی ہے (دیکھیے اردو ترجمہ ص ۳۴۳)

۱۶۷۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ○

۱۶۸۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ○

۱۶۹۔ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ○

ترجمہ

۱۶۷۔ جو لوگ کافر ہوگئے ہیں اور انھوں نے (لوگوں کو) راہِ خدا سے روکا ہے وہ دُور دراز کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔

۱۶۸۔ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور (اپنے اوپر اور دوسروں پر) ظلم کیا خدا انھیں ہرگز نہیں بخشے گا اور انھیں کسی راستے کی ہدایت نہیں کرے گا۔

۱۶۹۔ مگر جہنم کے راستے کی کہ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ کام خدا کے لیے آسان ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں بے ایمان افراد اور اہلِ ایمان کے بارے میں متعدد مباحث گزر چکے ہیں۔ ان آیات میں ایک اور گروہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے بدترین قسم کا کفر انتخاب کر رکھا ہے۔ انھوں نے اپنی گمراہی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اوپر بھی ظلم وستم روا سمجھتے ہیں اور دوسروں پر بھی کیونکہ نہ وہ خود راہِ ہدایت پر چلتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی راہِ ہدایت پر نہ چلیں۔

لہٰذا پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے، جو لوگ کافر ہوگئے ہیں اور لوگوں کے راہِ خدا میں قدم اٹھانے میں حائل ہوتے ہیں وہ بہت دور کی گمراہی کا شکار ہیں (ان الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ قد ضلوا ضلٰلا بعیدا)۔ یہ لوگ جادۂ حق سے اس لیے دُور ترین ہیں، کیونکہ یہ ضلالت وگمراہی کے مبلغ ہیں اور بہت بعید نظر آتا ہے کہ ایسے لوگ اس راہ سے دست بردار ہوجائیں کہ جس کی طرف وہ خود دعوت دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کفر کے ساتھ ہٹ دھرمی اور عناد کو بھی ملا لیا ہے اور بے راہ روی کی طرف قدم اٹھایا ہے کہ جو راہِ حق سے بہت دُور ہے۔

اگلی آیت میں مزید کہتا ہے: جو لوگ کافر ہو گئے ہیں اور انھوں نے ظلم کیا ہے (انھوں نے حق پر بھی ظلم کیا ہے کہ جو چیز اس کے شایانِ شان تھی اسے انجام نہیں دیا اور اپنے اوپر بھی ظلم کیا ہے کہ خود کو سعادت سے محروم کر دیا ہے اور وہ گمراہی میں جا پڑے ہیں۔ نیز دوسروں پر بھی ظلم کیا ہے کہ انھیں راہِ حق سے روکا ہے) ایسے افراد کو پروردگار کی مغفرت میسر نہیں آئے گی اور خدا انھیں راہِ جہنم کے علاوہ کسی اور راستے کی راہنمائی نہیں کرے گا (ان الذین کفروا وظلموا لم یکن اللہ لیغفر لھم ولا لیھدیھم طریقًا الا طریق جھنم) اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہیں گے (خالدین فیھا ابدًا) انھیں جاننا چاہیے کہ خدائی تہدید اور دھمکی عمل پذیر ہو کے رہے گی کیونکہ خدا کے لیے یہ کام آسان ہے اور وہ اس پر قدرت رکھتا ہے (وکان ذلک علی اللہ یسیرًا)۔

جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ مندرجہ بالا آیات ایسے کفار اور ان کی سزا کے بارے میں خاص تاکید کرتی ہیں ایک طرف ان کی گمراہی کو ضلال بعید کہا گیا ہے اور دوسری طرف "لم یکن اللہ" سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں بخش دینا مقامِ خداوندی کے لائق نہیں ہے اور تیسری طرف خلود اور "ابدًا" سے اس پر مزید تاکید کی گئی ہے یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ وہ خود گمراہ ہونے کے علاوہ دوسروں کو گمراہ کرنے میں کوشاں رہتے تھے اور اس پر ان کی جوابدہی بہت عظیم ہو گئی تھی۔

۱۷۰۔ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَیْرًا لَّكُمْ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ○

ترجمہ

۱۷۰۔ اے لوگو! (جس پیغمبر (کے انتظار میں تم تھے وہ) پروردگار کی طرف سے حق کے (پروگرام کے ساتھ) تمھارے پاس آگیا ہے اس پر ایمان لے آؤ کہ اس میں تمھارا فائدہ ہے اور اگر کافر ہو جاؤ (تو خدا کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خدا کے لیے ہے اور اللہ دانا و حکیم ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں غیر مومن افراد کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ اب اس آیت میں ایمان کی طرف دعوت دی گئی ہے اور اس کے نتیجے کا ذکر کیا گیا ہے اور مختلف تعبیرات جو انسان میں اشتیاق پیدا کریں اس میں سب ہی تمام لوگوں کو اس بلند مقصد کی ترغیب دی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اے لوگو! وہی پیغمبر کہ جس کے تم منتظر تھے اور جس کے بارے میں گذشتہ آسمانی کتب میں نشاندہی کی جا چکی ہے وہ دینِ حق لے کر تمہاری طرف آچکا ہے (یاایها الناس قد جاءکم الرسول[1] بالحق[2])۔

اس کے بعد فرمایا: یہ پیغمبر اس ذات کی طرف سے آیا ہے جس نے تمہاری پرورش و تربیت اپنے ذمہ لے رکھی ہے (من ربکم) پھر مزید فرمایا، اگر ایمان لے آؤ تو تمہارے فائدے میں ہے اس سے تم کسی دوسرے کی خدمت نہیں کرو گے بلکہ یہ خود تمہاری اپنی خدمت ہوگی (فامنوا خیرًا لکم) اور آخر میں فرمایا: یہ خیال نہ کرو کہ اگر تم نے راہِ کفر اختیار کی تو اس سے خدا کو کوئی نقصان ہوگا، ایسا نہیں ہے کیونکہ خدا ان تمام چیزوں کا مالک ہے جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں (وان تکفروا فان لله ما فی السمٰوٰت و الارض) علاوہ ازیں چونکہ خدا عالم اور حکیم ہے اس لئے جو احکام تمہیں دیئے ہیں، اور جو پروگرام ترتیب دیئے ہیں سب میں حکمت اور مصلحتیں پوشیدہ ہیں اور تمہارے فائدے میں ہیں (وکان الله علیما حکیما) لہٰذا اگر اس نے انبیاء اور پروگرام بھیجے ہیں تو یہ اس لیے نہیں کہ اسے ضرورت تھی بلکہ اس کے علم و حکمت کا تقاضا ہے۔ اس لیے ان تمام پہلوؤں کی طرف توجہ رکھتے ہوئے کیا یہ مناسب ہے کہ تم راہِ ایمان کو چھوڑ کر راہِ کفر پر گامزن ہو جاؤ۔

۱۷۱۔ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ ۚ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۖ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ ۚ انتَهُوا خَيْرًا لَّكُمْ ۚ إِنَّمَا اللَّهُ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ سُبْحَانَهُ أَن يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ ۘ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ﴿١٧١﴾

ترجمہ

۱۷۱۔ اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں غلو (اور زیادہ روی) نہ کرو اور حق کے سوا خدا کے بارے میں کچھ نہ کہو۔ مسیح

---

[1] ظاہراً "الرسول" کی الف لام عہد کی اور اس پیغمبر کی طرف اشارہ ہے جس کے وہ انتظار میں تھے نہ صرف یہود و نصاریٰ بلکہ مشرکین بھی، کیونکہ وہ اہلِ کتاب سے اس ضمن میں کچھ مطالب سن چکے تھے اور وہ بھی منتظر تھے۔

[2] طرق اہلبیتؑ سے منقول بعض روایات میں حق کی تفسیر "ولایت حضرت علیؑ" سے کی گئی ہے اور جیسا کہ بارہا کہا جا چکا ہے ایسی تفسیر میں واضح مصداق کو بیان کیا جاتا ہے ورنہ آیت اس معنی میں منحصر نہیں ہوتی۔

عیسٰی بن مریم صرف خدا کے فرستادہ اور اس کا کلمہ (اور مخلوق) ہیں کہ جنھیں اس نے مریم کی طرف القا کیا اور وہ اس کی طرف سے (شائستہ) روح تھے۔ اس لیے خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لے آؤ اور نہ یہ کہو کہ (خدا) تین ہیں، اس بات سے رک جاؤ کہ یہ (بات) تمھارے فائدے میں نہیں ہے۔ خدا تنہا معبود یگانہ ہے۔ وہ منزہ ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو (بلکہ) جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اس کا ہے اور ان کی تدبیر و سرپرستی کے لیے خدا کافی ہے۔

تفسیر

خیالی تثلیث

اس آیت میں اور اس کے بعد والی آیت میں کفار اور اہلِ کتاب کے بارے میں جاری مباحث کے حوالے سے مسیحی معاشرے کے اہم ترین انحراف کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہے تثلیث یا تین خداؤں کا مسئلہ۔ مختصر سے استدلالی جملوں کے ساتھ انھیں اس عظیم انحراف کے انجامِ بد سے ڈرایا گیا ہے۔

پہلے انھیں خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہتا ہے، اپنے دین میں غلو کی راہ نہ چلو اور حق کے علاوہ خدا کے بارے میں کچھ نہ کہو (یا اھل الکتاب لا تغلوا فی دینکم و لا تقولوا علی اللہ الا الحق)۔

آسمانی ادیان سے انحراف میں ایک اہم ترین بات یہ ہے کہ لوگوں نے پیشواؤں اور راہنماؤں کے بارے میں غلو سے کام لیا۔ انسان چونکہ اپنے آپ سے لگاؤ رکھتا ہے لہٰذا وہ چاہتا ہے کہ اپنے رہبروں کو بھی ان کے اصل مقام سے بلند تر بنا کر پیش کرے تاکہ اس طرح اس کی اپنی عظمت میں اضافہ ہو، بعض اوقات لوگ اس ہولناک بھنور میں اس لیے پھنس جاتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ پیشواؤں کے بارے میں غلو ان سے عشق اور لگاؤ کی نشانی ہے غلو کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ وہ مذہب کی اصلی بنیاد یعنی خدا پرستی اور توحید کو خراب کر دیتا ہے اسی لیے غالیوں کے بارے میں اسلام کا رویہ نہایت شدید اور سخت ہے اور عقائد و فقہ کی کتب میں غالیوں کو کفار کی بدترین قسم قرار دیا گیا ہے۔

تثلیث اور الوہیتِ مسیح کا ابطال

اس سلسلے میں چند نکات پیشِ خدمت ہیں:۔

۱۔ عیسٰی مریم کے بیٹے ہیں: قرآنِ حکیم میں عیسٰی کا نام ان کی والدہ کے نام کے ساتھ سولہ مرتبہ آیا ہے (انما المسیح عیسی ابن مریم) یعنی عیسٰی صرف مریم کے بیٹے ہیں یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ مسیح بھی دیگر انسانوں کی طرح رحمِ مادر میں رہے اور ان پر بھی جنین کا دور گزرا وہ دیگر انسانوں کی طرح پیدا ہوئے، دودھ پیا اور آغوشِ مادر میں پرورش پائی

یعنی تمام بشری صفات ان میں موجود تھیں۔ لہذا کیسے ممکن ہے کہ ایسا شخص جو قوانین طبیعت اور عالم مادہ کا مقتول و محکوم ہو وہ خدائے ازلی و ابدی بن جائے۔

خصوصاً لفظ "انما"، جو زیر بحث آیت میں آیا ہے وہ اس وہم کا جواب ہے کہ اگر عیسٰی کا باپ نہیں تو اس کا یہ معنی نہیں کہ وہ خدا کا بیٹا ہے بلکہ وہ صرف مریم کا بیٹا ہے۔

۲۔ عیسٰیؑ خدا کے رسول ہیں: عیسٰیؑ خدا کے فرستادہ اور رسول ہیں (رسول اللہ) عیسٰیؑ کا یہ مقام اور حیثیت بھی ان کی الوہیت سے مناسبت نہیں رکھتا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کی مختلف باتیں جن میں سے کچھ اناجیل موجودہ میں بھی ہیں، سب کی سب انسانی ہدایت کے لیے ان کی نبوت و رسالت کی حکایت کرتی ہیں نہ کہ ان کی الوہیت اور خدائی کی۔

۳۔ عیسٰیؑ خدا کا کلمہ ہیں: عیسٰیؑ خدا کا کلمہ ہیں جو مریمؑ کی طرف القاء ہوا (و کلمته القاها الی مریم) قرآن کی چند آیات میں عیسٰیؑ کو کلمہ کہا گیا ہے یہ تعبیر مسیح کے مخلوق ہونے کی طرف اشارے کے لیے ہے جیسے ہمارے کلمات، ہماری مخلوق اور ایجاد ہیں، اسی طرح عالم آفرینش کے موجودات بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ نیز جیسے ہمارے کلمات ہمارے اندرونی اسرار کا مظہر ہوتے ہیں اور ہمارے جذبات و صفات کے ترجمان ہوتے ہیں اسی طرح مخلوقاتِ عالم بھی خدا کی صفاتِ جمال و جلال کو واضح کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آیاتِ قرآنی میں متعدد مقامات پر تمام مخلوقات کے لیے لفظ "کلمة" استعمال کیا گیا ہے (مثلاً کہف ۱۰۹، اور لقمان ۲۹) البتہ یہ کلمات آپس میں مختلف ہیں۔ بعض بہت اہم اور بلند ہیں اور بعض نسبتاً معمولی اور کم تر ہیں۔ حضرت عیسٰیؑ آفرینش کے لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ مقام رسالت کے علاوہ یہ امتیاز بھی رکھتے تھے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا کئے گئے۔

۴۔ عیسٰیؑ روح ہیں: حضرت عیسٰیؑ روح ہیں جنہیں خدا نے پیدا کیا ہے (وروح منه) یہ تعبیر قرآن حکیم میں حضرت آدمؑ کے بارے میں بھی آئی ہے۔ ایک معنیٰ کے لحاظ سے تمام نوع انسانی کے بارے میں ہے یہ اس روح کی عظمت کی طرف اشارہ ہے جسے خدا نے دیگر انسانوں میں عموماً اور حضرت مسیحؑ اور باقی انبیاء میں خصوصیت سے پیدا کیا۔

بعض لوگوں نے حضرت مسیحؑ کے بارے میں اس تعبیر سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے انھوں نے کہا ہے کہ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ عیسٰیؑ خدا کا جزو ہیں اور "منه" اس کے لیے دلیل ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایسے مواقع پر "من" تبعیض کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اصطلاح کے مطابق یہ "من" "نشویه" ہے۔ جو کسی چیز کی پیدائش کا سرچشمہ اور منشاء بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

یہ امر لائق توجہ ہے کہ تواریخ میں ہے کہ ہارون رشید کا ایک عیسائی طبیب تھا اس نے ایک روز علی بن حسین واقدی سے مناظرہ کیا، واقدی علمائے اسلام میں سے تھا۔

طبیب نے کہا: تمھاری آسمانی کتاب میں ایک آیت ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیحؑ خدا کا جزو ہیں پھر اس نے زیر بحث آیت کی تلاوت کی۔

واقدی نے فوراً قرآن کی یہ آیت تلاوت کی:

وسخرلکم ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض جمیعا منہ

یعنی ـــــ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے مسخر کیا گیا ہے اور یہ سب اس کی طرف سے ہے[1]

اور مزید کہا:

اگر "من" جزو بتانے کے لیے ہے تو پھر اس آیت کے مطابق آسمانوں و زمین کے تمام موجودات خدا کا جزو ہیں۔

یہ بات سن کر عیسائی طبیب فوراً مسلمان ہوگیا۔ ہارون رشید اس واقعے سے بہت خوش ہوا اور اس نے واقدی کو بہت انعام دیا[2]

علاوہ ازیں یہ امر تعجب خیز ہے کہ عیسائی حضرات والد کے بغیر حضرت عیسٰیؑ کی ولادت کو ان کی الوہیت کی دلیل قرار دیتے ہیں حالانکہ وہ بھول جاتے ہیں کہ حضرت آدمؑ ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے اس مخصوص خلقت کو کوئی بھی ان کی الوہیت کی دلیل نہیں سمجھتا۔

اس بیان کے بعد قرآن کہتا ہے: اب جبکہ ایسا ہے تو خدائے یگانہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لے آؤ اور یہ نہ کہو کہ تین خدا ہیں اور اگر اس بات سے اجتناب کرو تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے (فامنوا باللہ و رسلہ ولاتقولوا ثلاثۃ انتھوا خیرا لکم)۔

دوبارہ تاکید کی گئی ہے کہ خدا ہی معبود یکتا ہے (انما اللہ الٰہ واحد) یعنی تم اس بات کو مانتے ہو کہ تثلیث کے ہوتے ہوئے بھی خدا اکیلا اور یگانہ ہے۔ حالانکہ اگر اس کا بیٹا ہو تو وہ اس کا شبیہ ہوگا، تو پھر یکتائی کا کوئی معنی نہیں رہے گا۔ کیسے ممکن ہے کہ خدا کا کوئی بیٹا ہو جبکہ وہ بیوی اور بیٹے کی احتیاج کے نقص اور جسم اور عوارض جسم کے نقص سے مبرا و منزہ ہے (سبحانہ ان یکون لہ ولد)۔

علاوہ ازیں وہ ان تمام چیزوں کا مالک ہے جو آسمان و زمین میں ہیں سب اس کی مخلوق ہیں اور وہ ان کا خالق ہے اور مسیح بھی ان کی مخلوق میں سے ایک ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ ان کے لیے ایک استثنائی حالت کا قائل ہوا جائے۔ کیا ممکن ہے کہ مملوک و مخلوق اپنے خالق و مالک کا بیٹا بن جائے (لہ ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض) خدا صرف ان کا خالق ہی نہیں ہے بلکہ ان کا مدبر، محافظ، رزاق اور سرپرست بھی ہے (وکفٰی باللہ وکیلا)۔

اصولی طور پر وہ خدا جو ازلی و ابدی ہے اور ازل تا ابد تمام مخلوقات کی سرپرستی اپنے ذمہ لیے ہوئے ہے اسے بیٹے کی کیا

---

[1] جاثیہ ۱۳ (القرآن)

[2] تفسیر المنار جلد ۶ صفحہ ۸۴

ضرورت ہے، کیا وہ ہماری طرح ہے کہ اپنی موت کے بعد جانشینی کے لیے بیٹے کی خواہش رکھتا ہو۔

تثلیث ـــــ عیسائیت کی سب سے بڑی کجروی

عیسائیت جن انحرافات اور کجرویوں کا شکار ہے ان میں سے تثلیث سے بدتر کوئی نہیں۔ وہ تصریح سے کہتے ہیں کہ خدا تین ہیں اور یہ بھی کہ اس کے باوجود وہ ایک اور یکتا ہے یعنی وہ وحدت کو بھی حقیقی سمجھتے ہیں اور تثلیث کو بھی۔ اس بات نے عیسائیت کے محققین کے لیے ایک بہت بڑی مشکل پیدا کر دی ہے اگر خدا کی یکتائی کو مجازی اور تثلیث کو حقیقی سمجھتے تو بھی ایک بات تھی اور اگر توحید کو حقیقی مان لیتے اور تثلیث کو مجازی، پھر بھی معاملہ آسان تھا لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ دونوں کو حقیقی اور واقعی سمجھتے ہیں۔

اس آخری دور میں عیسائیوں کی طرف سے بے خبر لوگوں کو بعض تبلیغی تصانیف دی گئی ہیں، جن میں انھوں نے تثلیث مجازی کا ذکر کیا ہے یہ اصل میں ریاکاری ہے جو مسیحیت کے اصلی منابع و کتب اور ان کے علماء کے حقیقی عقائد سے مطابقت نہیں رکھتی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مسیحی ایک غیر معقول مطلب سے دوچار ہیں۔ کیونکہ ۱ = ۳ کو تو ایک ابجد پڑھنے والا بچہ بھی قبول نہیں کر سکتا۔ اسی لیے تو وہ عموماً کہتے رہتے ہیں کہ اس مسئلے کا تعلق میزانِ عقل سے نہیں بلکہ جذبۂ عبادت اور دل سے ہے۔

یہیں سے منطق و عقل سے مذہب کی لاتعلقی کا معاملہ شروع ہوتا ہے اور مسیحیت کو اس خطرناک وادی میں کھینچ لے جاتا ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ مذہب عقلی پہلو نہیں رکھتا بلکہ وہ صرف قلبی و تعبدی پہلو رکھتا ہے یہاں سے علم اور مذہب کی بیگانگی سامنے آتی ہے اور موجودہ مسیحیت کی منطق سے دونوں کا تضاد واضح ہوتا ہے۔ کیونکہ علم کہتا ہے کہ تین کا عدد ہرگز ایک کے عدد کے مساوی نہیں ہے لیکن موجودہ مسیحیت کہتی ہے کہ مساوی ہے۔

تثلیث کے بارے میں چند اہم نکات

۱۔ اناجیل میں عقیدۂ تثلیث نہیں ہے، موجودہ کسی انجیل میں بھی مسئلہ تثلیث کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے، اسی لیے عیسائی محققین کا نظریہ ہے کہ تثلیث کا سرچشمہ اناجیل میں مخفی اور غیر واضح ہے۔

ایک امریکی مصنف مسٹر ہاکس کہتا ہے،

لیکن مسئلہ تثلیث عہد عتیق اور عہد جدید میں مخفی اور غیر واضح ہے[1]

جیسا کہ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ مسئلہ تثلیث تقریباً تیسری صدی کے بعد عیسائیوں میں پیدا ہوا۔ یہ ایک بدعت ہے جو ایک طرف سے غلو کی بنا پر اور دوسری طرف سے عیسائیوں کے دیگر اقوام سے میل جول کی بنا پر حقیقی مسیحیت میں داخل ہو گئی۔

بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ عیسائیوں کی تثلیث اصولی طور پر ہندوؤں کی سہ گانہ پرستی جسے "تالوث ہندی"

---

[1] قاموس مقدس ص ۳۴۵ طبع بیروت

کہتے ہیں، سے لی گئی ہے۔[1]

۲۔ عقیدۂ تثلیث خلاف عقل ہے: تثلیث خصوصاً تثلیث در وحدت (یعنی ۔ ایک ہوتے ہوئے تین) ایک ایسا مطلب ہے جو بالکل نامعقول اور بداہت عقلی کے خلاف ہے اور ہم جانتے ہیں کہ دین کبھی عقل و علم سے جدا نہیں ہو سکتا۔ حقیقی علم حقیقی مذہب سے ہمیشہ ہم آہنگ ہوتا ہے اور یہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں یہ بات کہ مذہب کو تعبد ہونے کے ناتے قبول کر لیا جائے بہت ہی غلط ہے کیونکہ اگر کسی مذہب کے اصول قبول کرنے میں عقل کو ایک طرف رکھ دیا جائے اور تعبد ہونے کے حوالے سے ہی اسے قبول کر لیا جائے تو پھر اس مذہب اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا۔ اس موقع پر پھر کون سی دلیل ہے کہ کہا جائے کہ انسان کو خدا پرست ہونا چاہیے نہ کہ بت پرست اور یونہی یہ کیوں آخر مسیحی اپنے مذہب کی تبلیغ کریں، لیکن دوسرے مذاہب نہ کریں اور وہ کون سی خصوصیات ہیں جو وہ مسیحیت کے لیے سمجھتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ لوگ اس کی طرف آئیں یہ سب سوالات اس بات کی دلیل ہیں کہ مذہب کو منطق کے ذریعے پہچانا جائے اور یہ بات اس دعویٰ کے بالکل خلاف ہے کہ جس کے مطابق وہ مسئلہ تثلیث میں مذہب کو عقل سے جدا کرتے ہیں۔

بہر حال مذہب کی بنیادوں کو توڑنے کے لیے اس سے بدتر کوئی بات نہیں کہ ہم کہیں کہ مذہب عقلی و منطقی پہلو نہیں رکھتا بلکہ تعبد ہونے کے حوالے سے اختیار کیا جاتا ہے۔

۳۔ خدا ہر لحاظ سے یکتا ہے: توحید کی بحث میں بہت سی دلیلیں پیش کی گئی ہیں جو ذاتِ خدا کی یکتائی اور یگانگی کو ثابت کرتی ہیں اور ہر طرح کی دوگانگی، سہ گانگی یا تعدد کی نفی کرتی ہیں۔ خدا ایک ہی ہے جو لامتناہی وجود ہے، جو علم، قدرت اور توانائی کے لحاظ سے ازلی و ابدی اور غیر محدود ہے ہم جانتے ہیں کہ لامتناہی وجود میں تعدد اور دوگانگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اگر دو کو لامتناہی فرض کریں تو دونوں ہی محدود ہوں گے کیونکہ پہلا وجود دوسرے کی قدرت و توانائی اور ہستی کا فاقد ہے اور دوسرا وجود اسی طرح پہلے وجود اور اس کے امتیازات و خصوصیات کا فاقد ہے یعنی پہلے وجود کا اپنا وجود اور امتیازات ہیں اور دوسرے کا اپنا وجود اور امتیازات اس بنا پر پہلا وجود بھی محدود ہو گا اور دوسرا بھی۔ واضح تر الفاظ میں اگر دو وجود تمام جہات سے لامتناہی فرض کر لیے جائیں تو یقیناً پہلا "لامتناہی" وجود جب دوسرے "لامتناہی" وجود کی حد تک پہنچے گا تو وہ تمام ہو جائے گا اور دوسرا "لامتناہی" وجود جب پہلے "لامتناہی" وجود کی حد تک پہنچے گا تو وہ بھی تمام ہو جائے گا۔ لہٰذا دونوں محدود اور متناہی ہوں گے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ذاتِ خدا جو ایک لامتناہی وجود ہے اس میں ہرگز تعدد نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اگر ہم یہ اعتقاد رکھیں کہ ذاتِ خدا تین اقنوم یا تین ذاتوں سے مرکب ہے تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ تینوں محدود ہوں نہ کہ غیر محدود اور لامتناہی۔

علاوہ ازیں ہر مرکب اپنے اجزاء کا محتاج ہے اور اس کا وجود ان کے وجود کا معلول ہے ذاتِ خدا میں بھی ترکیب ماننے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ محتاج اور معلول ہو حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ بے نیاز ہے اور عالم ہستی کی پہلی علت ہے۔

---

[1] بیسویں صدی کے دائرۃ المعارف (فرید وجدی) کے مادہ ثالوث کی طرف رجوع کریں۔ ہندوؤں کے تین خدا برہما، فیشنو اور سیفا تھے۔

۴۔ خدا انسانی لباس میں کیونکر ممکن ہے : ان سب باتوں سے قطع نظر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ذاتِ خدا انسانی روپ میں ظاہر ہو اور اسے جسم، مکان، غذا اور لباس وغیرہ کی احتیاج پیدا ہو جائے۔ خدائے ازلی و ابدی کو ایک انسان کے جسم میں محدود کرنا اور اسے مادرِ رحم میں جنین کی حالت میں سمجھنا بدترین تہمتوں میں سے ہیں جو ذاتِ مقدسِ الٰہی سے وابستہ کی جائیں۔ اسی طرح خدا کی طرف بیٹے کی نسبت دینا ایک غیر منطقی اور بالکل نامعقول بات ہے کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خدا کے لیے مختلف عوارضِ جسمانی کا قائل ہوا جائے یہی وجہ ہے کہ جس شخص نے مسیحیت کے ماحول میں پرورش نہیں پائی اور بچپن سے اسے ان موہوم اور غلط تعلیمات کی عادت نہیں ہے وہ فطرت و عقل کے خلاف یہ باتیں سن کر کڑھنے لگتا ہے خود عیسائی "باپ خدا" اور "بیٹا خدا" جیسی باتیں سن کر اس لیے پریشان نہیں ہوتا کیونکہ وہ بچپن سے ان غلط مفاہیم سے مانوس ہو چکا ہوتا ہے۔

۵۔ پر فریب تشبیہیں : اس دور میں دیکھا جاتا ہے کہ بعض مسیحی مبلغین بے خبر لوگوں کو غافل رکھنے کیلئے پُر فریب مثالوں کا سہارا لیتے ہیں۔ مثلاً وحدت در تثلیث (یعنی تین ہوتے ہوئے ایک) کو کرۂ آفتاب، اس کا نور اور اس کی حرارت سے تشبیہ دیتے ہیں یعنی یہ تین چیزیں ہیں اس کے باوجود ایک حقیقت ہیں۔ اسی طرح وہ اسے ایسے وجود سے تشبیہ دیتے ہیں جس کا عکس تین آئینوں میں پڑ رہا ہو باوجودیکہ وہ ایک ہی وجود ہے پھر بھی تین وجود نظر آتے ہیں۔ اسی طرح وہ مثلث کی مثال دیتے ہیں جس کے تین زاویے ہوتے ہیں لیکن اگر ان زاویوں کو اندر کو بڑھائیں تو ایک ہی نقطے تک جا پہنچتے ہیں۔

تھوڑے سے غور و فکر سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان مثالوں کا زیر بحث مسئلے سے کوئی ربط نہیں۔ مسلم ہے کہ کرۂ آفتاب اور اس کا نور دو چیزیں ہیں نور قرمزی رنگ سے مافوق لہروں کو کہتے ہیں وہ سائنسی نقطۂ نظر سے حرارت سے مختلف ہے جو کہ امواجِ مادونِ قرمز ہیں اگر انھیں ایک کہا جائے تو یہ غلط فہمی اور مجاز سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔

اس سے زیادہ واضح جسم اور آئینوں کی مثال ہے کیونکہ جو عکس آئینوں میں پڑتا ہے وہ انعکاسِ نور کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں اور مسلم ہے کہ روشنی کا انعکاس خود جسم کے علاوہ چیز ہے اس لیے انھیں ایک چیز نہیں کہا جا سکتا اور جس نے بھی کسی سکول میں طبیعات (PHYSICS) کی پہلی کتاب پڑھی ہو وہ یہ بات جانتا ہے۔

مثلث والی مثال بھی ایسی ہے۔ مثلث کے زاویے یقیناً متعدد ہوتے ہیں اور مثلث کے اندرونی طرف بڑھتے جانے سے زاویے جب ایک نقطے میں بدل جاتے ہیں تو اس کا مثلث سے کوئی تعلق نہیں۔

باعثِ تعجب ہے کہ بعض مشرقی عیسائی توحید در تثلیث کے نظریئے کو صوفیا[۱] کی وحدتِ وجود کی منطق پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ کہے بغیر واضح ہے کہ اگر کوئی شخص وحدتِ وجود کے غلط اور انحرافی عقیدے کو قبول بھی کرے تو بھی اسے چاہیے کہ اس عالم کے تمام موجودات کو ذاتِ خدا کا جزو سمجھے بلکہ اس کا عین تصور کرے اس لیے اس میں سے تثلیث کا تو کوئی مطلب نہیں نکلتا بلکہ چھوٹے سے لے کر بڑے تک تمام موجودات اس کا جزو یا مظہر قرار پائیں گی۔ لہٰذا مسیحیت کی تثلیث کا وحدتِ وجود سے کوئی ربط نہیں اگرچہ اپنے مقام پر صوفیوں کے وحدت الوجود کا نظریہ بھی باطل ہو چکا ہے۔

---

[۱] صوفیوں کے نظریہ وحدت الوجود سے مراد وحدت موجود ہے وہ کہتے ہیں کہ ہستی بس ایک ہے جو مختلف چہروں میں ظاہر ہوتی ہے اور وہ ہستی ایک خدا ہے۔

۶۔ ایک اور اشتباہ:۔ بعض اوقات کچھ عیسائی کہتے ہیں کہ ہم جو عیسیٰؑ کو ابن اللہ کہتے ہیں تو یہ اسی طرح ہے، جیسے تم امام حسینؑ کو ثار اللہ و ابن ثارہ (خون خدا اور فرزند خون خدا) کہتے ہو یا بعض روایات میں حضرت علیؑ کو "ید اللہ" (اللہ کا ہاتھ کہا گیا ہے)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو یہ ایک بہت بڑا اشتباہ ہے کہ بعض نے "ثار" کا معنی خون کیا ہے کیونکہ لفظ "ثار" عربی میں کبھی بھی "خون" کے معنی میں نہیں آیا بلکہ اس کا معنی ہے "خون بہا" عربی میں خون کے لیے "دم" کا لفظ استعمال ہوتا ہے اس لیے "ثار اللہ" کا مطلب ہے "اے وہ شخص جس کا خون بہا اللہ سے تعلق رکھتا ہے اور وہی تیرا خونبہا لے گا" یعنی تو کسی ایک خاندان سے تعلق نہیں رکھتا کہ تیرا خون بہا اس خاندان کا سربراہ لے اور نہ ہی تو کسی ایک قبیلے سے تعلق رکھتا ہے کہ سربراہِ قبیلہ تیرا خون بہا لے، تو عالمِ انسانیت سے تعلق رکھتا ہے اور تیرا تعلق تو عالمِ ہستی اور خدا کی ذاتِ پاک سے ہے۔ لہٰذا تیرا خون بہا اسے لینا چاہیے، اسی طرح تو علی ابن ابی طالبؑ کا بیٹا ہے جو شہیدِ راہِ خدا تھے اور ان کا خون بہا بھی خدا ہی کو لینا چاہیے۔

دوسرا یہ کہ اگر کسی عبارت میں مردانِ خدا کے لیے "ید اللہ" یا اسی طرح کا کوئی لفظ آیا ہے تو تشبیہ، کنایہ اور مجاز کے طور پر ہے۔ کیا کوئی حقیقی عیسائی اس بات پر تیار ہے کہ مسیح کے لیے ابن اللہ کہنے کو ایک طرح کا مجاز اور کنایہ قرار دے مسلماً ایسا نہیں ہے کیونکہ مسیحیت کی اصلی کتب اور مصادر میں انھیں خدا کا حقیقی بیٹا قرار دیا گیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ صفت مسیح کے ساتھ مخصوص ہے کسی اور کے لیے ایسا نہیں ہے۔

یہ جو عیسائیوں کی بعض سطحی تبلیغاتی تحریروں میں نظر آتا ہے کہ وہ "ابن اللہ" کو کنایہ اور تشبیہ قرار دیتے ہیں یہ زیادہ تر عوام کو فریب دینے کے لیے ہے اس کی وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل عبارت کی طرف توجہ کریں۔ یہ عبارت قاموس کتاب مقدس کے مؤلف نے لفظ "خدا" کے ضمن میں تحریر کی ہے:

> اور "ابن اللہ" ہمارے نجات دہندہ اور فدیہ بننے والے کا ایک لقب ہے جو اس کے علاوہ کسی اور کے لیے نہیں بولا جا سکتا، مگر ایسے مقام پر کہ جہاں قرائن سے معلوم ہو کہ مقصد خدا کا حقیقی بیٹا ہے[۱]

۱۷۲۔ لَنْ یَّسْتَنْكِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَ مَنْ یَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ یَسْتَكْبِرْ فَسَیَحْشُرُهُمْ اِلَیْهِ جَمِیْعًا ۝

۱۷۳۔ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ

---

[۱] قاموس مقدس ص ۳۴۵، طبع بیکسٹرنت

يَزِيدُهُم مِّن فَضْلِهِ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ اسْتَنكَفُوا وَاسْتَكْبَرُوا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۙ وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ○

ترجمہ

۱۷۲۔ مسیح اس سے ہرگز پہلوتہی اور انکار نہیں کرتا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ اس کے مقرب فرشتے (اس کا انکار کرتے ہیں) اور جو اس کی عبودیت اور بندگی سے پہلوتہی کرے اور تکبر کرے، بہت جلد وہ ان سب کو اپنی طرف محشور کرے گا (اور انھیں قیامت میں اٹھائے گا)۔

۱۷۳۔ باقی رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال انجام دیے ان کی پوری جزا انھیں دے گا اور اپنے فضل و بخشش سے انھیں مزید دے گا۔ لیکن جنھوں نے پہلوتہی کی اور تکبر کیا انھیں دردناک سزا دے گا اور وہ خدا کے علاوہ اپنے لیے کوئی سرپرست اور یار و مددگار نہیں پائیں گے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے ان آیات کے سلسلے میں ایک شانِ نزول روایت کی ہے۔ روایت یہ ہے:

نجران کے کچھ عیسائی پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے عرض کیا:

آپ ہمارے پیشوا پر کیوں تنقید کرتے ہیں؟

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: میں نے ان پر کون سا عیب لگایا ہے؟

وہ کہنے لگے: آپ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور انھیں جواب دیا گیا۔

تفسیر

عیسیٰؑ خدا کے بندے ہیں

اگرچہ زیرِ نظر آیات کی مخصوص شانِ نزول ہے، اس کے باوجود وہ گذشتہ آیات سے مربوط ہیں جن میں الوہیت مسیحؑ کی نفی اور مسئلہ تثلیث کا ابطال کیا گیا ہے۔

پہلے تو ایک اور پہلو سے الوہیت مسیحؑ کی نفی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تم عیسیٰؑ کی الوہیت کا کیسے عقیدہ رکھتے ہو، جبکہ

نہ عیسیٰ پروردگار کی بندگی سے پہلو تہی کرتے ہیں نہ خدا کے مقرب فرشتے اس سے پہلو تہی کرتے ہیں (لن یستنکف المسیح ان یکون عبداً للّٰہ ولا الملئکۃ المقربون) مسلّم ہے کہ جو شخص خود عبادت کرنے والا ہو اس کے معبود ہونے کا کوئی معنی نہیں ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی اپنی ہی عبادت کرے یا یہ کہ عابد و معبود اور بندہ و خدا ایک ہی ہوں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے ایک حدیث مروی ہے آپؑ نے نجران عیسائیوں کو جو حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کے مدعی تھے مغلوب کرنے کے لیے ان کے ایک بزرگ جاثلیق سے فرمایا، عیسیٰؑ کی باقی باتیں تو اچھی ہیں ان میں صرف ایک عیب تھا اور وہ یہ کہ وہ زیادہ عبادت نہیں کرتے تھے۔

وہ عیسائی جھنجلا اٹھا اور امام سے کہنے لگا، آپ کتنی غلط بات کہہ رہے ہیں۔ اس بات پر تو اتفاق ہے کہ وہ سب سے زیادہ عبادت گذار تھے۔

امام نے فوراً فرمایا: وہ کس کی عبادت کرتے تھے؟ کیا خدا کے علاوہ کسی کی عبادت کرتے تھے؟ لہٰذا خود تیرے اعتراف کے مطابق وہ خدا کے بندے، مخلوق اور اس کی عبادت کرنے والے تھے، نہ کہ معبود اور خدا تھے۔

وہ عیسائی خاموش ہوگیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔[1]

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے، جو لوگ پروردگار کی عبادت اور بندگی سے پہلو تہی کریں اور اس کی وجہ تکبر ہو تو خدا ان سب کو قیامت کے دن حاضر کرے گا اور ہر ایک کو مناسب سزا دے گا (ومن یستنکف عن عبادتہ و یستکبر فسیحشرھم الیہ جمیعاً)

اس دن اہلِ ایمان اور نیک عمل کرنے والوں کو ان کی مکمل جزا دے گا اور اپنے فضل و رحمت سے اس پر اضافہ کرے گا اور جنھوں نے بندگی سے انکار کیا اور راہِ تکبر اختیار کی وہ دردناک عذاب میں گرفتار ہوں گے اور خدا کے سوا انھیں کوئی سرپرست، حامی اور مددگار نہیں ملے گا (فاما الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت فیوفیھم اجورھم و یزیدھم من فضلہ واما الذین استنکفوا واستکبروا فیعذبھم عذاباً الیماً ولا یجدون لھم من دون اللّٰہ ولیا ولا نصیراً)۔

دو اہم نکات

۱۔ استنکفوا اور استکبروا: استنکاف کا معنی ہے کسی چیز سے امتناع اور کسی سے پرے ہٹ جانا۔ اس لیے یہ لفظ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے لیکن "استکبروا" کہہ کر اسے محدود کر دیا گیا ہے کیونکہ خدا کی بندگی سے پہلو تہی اور امتناع کبھی جہل و نادانی کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی تکبر، خود بینی اور سرکشی کی بنا پر، اگرچہ یہ دونوں برے ہیں لیکن دوسرا کئی گنا بدتر ہے۔

۲۔ ملائکہ انکارِ عبادت نہیں کرتے: ملائکہ کے انکار عبادت نہ کرنے کا تذکرہ کیا تو اس لیے ہے کہ عیسائی تین معبودوں کے قائل تھے (باپ، بیٹا اور روح القدس، یا دوسرے لفظوں میں باپ خدا، بیٹا خدا اور دونوں کے درمیان واسطہ) اس سے پہلے کی آیت میں

---

[1] مناقب ابن شہر آشوب ج ۴ ص ۳۵۲

قرآن چاہتا ہے کہ دوسرے معبودوں یعنی مسیح اور روح القدس فرشتہ ہر دو کی نفی کی جائے تاکہ ذات پروردگار کی توحید ثابت ہو جائے یا پھر یہ اس بناء پر ہے کہ آیت میں عیسائیوں کے شرک کا جواب دیتے ہوئے عرب بت پرستوں کے شرک کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو فرشتوں کو خدا کی اولاد اور پروردگار کا جزو سمجھتے تھے یہ انھیں بھی ایک جواب ہے۔

ملائکہ کے بارے میں ان دونوں بیانات کی طرف توجہ کرنے سے اس بحث کی گنجائش نہیں رہتی کہ کیا زیر نظر آیت انبیاء پر ملائکہ کی افضلیت پر دلالت کرتی ہے یا نہیں، کیونکہ آیت تو تثلیث کے تیسرے اقنوم یا مشرکین عرب کے معبودوں کی نفی کے لیے ہے نہ کہ ملائکہ کی مسیح پر فضیلت بیان کرنے کے لیے ہے۔

۱۷۴۔ يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا ○

۱۷۵۔ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ○

ترجمہ

۱۷۴۔ اے لوگو! تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے لیے واضح دلیل آئی اور ہم نے واضح نور تمھاری طرف بھیجا۔

۱۷۵۔ رہے وہ لوگ جو خدا پر ایمان لے آئے اور اس (آسمانی کتاب) سے وابستہ ہوئے بہت جلد ان سب کو اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرے گا اور اپنی طرف سیدھے راستے کی ہدایت کرے گا۔

تفسیر

نورِ مبین

سابقہ آیات میں توحید اور تعلیمات انبیاء سے اہل کتاب کے انحراف کی بحث تھی۔ اب ان دو آیتوں میں آخری بات کہی گئی ہے اور راہ نجات کو مشخص و معین کر دیا گیا ہے پہلے تو اس عالم کے تمام لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: اے لوگو! تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے پاس ایک پیغمبر آیا ہے کہ جس کے پاس واضح دلائل و براہین موجود ہے اور اسی طرح اس کے ساتھ ایک نور آشکار بھیجا گیا ہے جس کا نام قرآن ہے جو تمھاری راہ سعادت کو روشن کرتا ہے (یا ایھا الناس قد جاء کم برھان من ربکم و انزلنا الیکم نوراً مبیناً)۔

بعض علماء کے نظریئے کے مطابق "برہان" "برہ" (بروزن "فرح") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے سفید ہونا

اور چونکہ واضح استدلال سننے والے کے لیے حق کے چہرے کو آشکار، نورانی اور سفید کر دیتا ہے لہٰذا اسے برہان کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ بعض مفسرین کہتے ہیں اور قرآن بھی گواہی دیتے ہیں کہ زیر نظر آیت میں برہان سے مراد پیغمبر اسلامؐ کی ذات بابرکات ہے اور نور سے مراد قرآن مجید ہے جبکہ دوسری آیات میں بھی اسے نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تفسیر نور الثقلین، علی بن ابراہیم اور مجمع البیان میں طرق اہلبیتؑ سے کئی ایک احادیث نقل کی گئی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ لفظ برہان پیغمبر اکرمؐ کے لیے ہے اور نور سے مراد حضرت علیؑ ہیں۔ یہ تفسیر اوپر بیان کی گئی تفسیر کے منافی نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے کہ نور کا بیان وسیع مفہوم ہو، جس میں قرآن بھی شامل ہو اور امیر المومنین علیؑ بھی جو کہ قرآن کے محافظ، مفسر اور مدافع ہیں۔

بعد والی آیت میں اس برہان اور نور کی پیروی کے نتیجے کا ذکر ہے، باقی رہے وہ جو خدا پر ایمان لائے اور انھوں نے اس آسمانی کتاب سے تمسک کیا، بہت جلد وہ انھیں اپنی وسیع رحمت میں داخل کرے گا اور اپنے فضل و رحمت سے ان کی جزا میں اضافہ کرے گا اور انھیں صراط مستقیم اور راہ راست کی طرف ہدایت کرے گا (فاما الذین امنوا باللہ واعتصموا بہ فسیدخلھم فی رحمۃ منہ و فضل و یھدیھم الیہ صراطا مستقیما)۔

۱۷۶۔ يَسْتَفْتُونَكَ ط قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ط اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ط فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ط وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ط يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ط وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ع

ترجمہ

۱۷۶۔ تجھ سے (بہن بھائیوں کی میراث کے بارے میں) سوال کرتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ خدا تمھارے لیے کلالہ (بہن بھائی) کا حکم بیان کرتا ہے۔ اگر ایک مرد مر جائے جس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ اس کے چھوڑے ہوئے مال سے آدھا (بطور میراث) لے گی اور (اگر بہن مر جائے اور اس کا وارث صرف ایک بھائی ہو تو) وہ اس بہن کا سارا مال میراث میں لے گا۔ اس صورت میں کہ (متوفی کی) کوئی اولاد نہ ہو اور اگر (متوفی کی) دو بہنیں باقی ہوں تو وہ مال کا دو تہائی لیں گی اور اگر بہن بھائی اکٹھے ہوں تو (تمام مال اس طرح سے تقسیم کریں گے کہ) ہر مذکر کے لیے مونث کے حصے سے دوگنا ہوگا۔ خدا تمھارے لیے (اپنے احکام) بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ

(حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

اور خدا تمام چیزوں کو جانتا ہے۔

شانِ نزول

بہت سے مفسرین جابر بن عبداللہ انصاری سے اس آیت کی شانِ نزول اس طرح نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں:

میں بہت سخت بیمار ہوگیا تھا تو پیغمبرؐ میری عیادت کے لیے تشریف لائے اور وہیں وضو کیا اور اپنے وضو کا پانی مجھ پر چھڑکا۔ میں چونکہ موت کی فکر میں تھا، پیغمبرؐ سے عرض کیا، میری وارث فقط میری بہنیں ہیں، ان کی میراث کس طرح ہوگی؟

اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جسے آیتِ فرائض کہتے ہیں۔

بعض کے نظریئے کے مطابق احکام اسلام کے بارے میں پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہونے والی یہ آخری آیت ہے[1]

تفسیر

زیرِ نظر آیت میں بھائی بہنوں کی میراث کی مقدار بیان کی گئی ہے۔ جیسا کہ اس سورہ کے اوائل میں آیت ۱۲ کی تفسیر میں ہم کہہ چکے ہیں کہ بہنوں اور بھائیوں کی میراث کے بارے میں قرآن حکیم میں دو آیتیں ہیں۔ ایک وہی آیت ۱۲۔ دوسری یہ آیت جو سورہ نساء کی آخری آیت ہے اگرچہ دونوں آیات میراث کی مقدار کے بارے میں مختلف ہیں لیکن جیسا کہ سورہ کی ابتداء میں بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ ان میں ہر ایک بہنوں اور بھائیوں کی الگ الگ قسم کے بارے میں ہے۔ آیت ۱۲، مادری بہن بھائیوں کے بارے میں ہے لیکن زیرِ بحث آیت پدری مادری یا صرف پدری بہن بھائیوں کے بارے میں ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ عام طور پر یہی تو کچھ لوگ متوفی سے بالواسطہ ربط رکھتے ہیں۔ ان کی میراث کی مقدار اسی واسطے سے ہوتی ہے یعنی مادری بہن بھائی ماں کے حصے کے حساب سے لیتے ہیں جو کہ ایک تہائی ہے اور پدری یا مادری پدری بہن بھائی باپ کی میراث والا حصہ لیتے ہیں جو کہ دو تہائی ہے۔ آیت ۱۲ چونکہ بہن بھائیوں کی میراث کے متعلق ایک تہائی حصے کے بارے میں ہے اس لیے بیان کے بارے میں ہے جو صرف ماں کی طرف سے متوفی کے ساتھ مربوط ہیں جبکہ زیرِ بحث آیت دو تہائی حصے کے بارے میں ہے لیکن یہ ان بہن بھائیوں سے متعلق ہے جو باپ سے یا ماں باپ دونوں سے مربوط ہیں۔ علاوہ ازیں ائمہ اہل بیتؑ سے مروی روایات جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں وہ بھی اس حقیقت کو ثابت کرتی ہیں بہر حال اب اگر ایک تہائی یا دو تہائی میراث بھائی یا بہن سے متعلق ہے تو باقی ماندہ مال قانونِ اسلام کے مطابق دیگر ورثہ میں تقسیم ہوگا اب جبکہ یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ ان دونوں آیات میں کوئی اختلاف نہیں ہم ان احکام کی تفسیر شروع کرتے ہیں جو اس آیت میں آئے ہیں۔

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا) صراط مستقیم کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اوّل میں سورۂ حمد کی تفسیر کے ضمن میں تفصیل سے گفتگو کی جا چکی ہے (اردو ترجمہ ص ۶۹)

[1] تفسیر صافی، مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

توجہ رہے کہ یہ آیت کلالہ (بہن بھائی) کے بارے میں سوال کے جواب کے طور پر نازل ہوئی ہے[1]۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے: تم سے اس بارے میں سوال کرتے ہیں تو کہہ دو کہ خدا کلالہ (بھائی بہن) کے بارے میں تمہارے لیے حکم بیان کرتا ہے (یستفتونک قل اللہ یفتیکم فی الکلالۃ) اس کے بعد چند احکام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بہن بھائی کی میراث کے چند احکام

۱۔ جب کوئی مرد دنیا سے چلا جائے اس کی کوئی اولاد نہ ہو فقط ایک بہن ہو تو اس کی آدھی میراث اس ایک بہن کو ملیگی (ان امرؤا ھلک لیس لہ ولد ولہ اخت فلھا نصف ماترک)۔

۲۔ اگر کوئی عورت مر جائے، اس کی اولاد نہ ہو اس کا بس ایک بھائی ہو (جو پدری ہو یا مادری پدری ہو) تو اس کی ساری میراث اس کے اس اکیلے بھائی کو ملے گی (وھو یرثھا ان لم یکن لھا ولد)۔

۳۔ اگر کوئی شخص دنیا سے چلا جائے اور دو بہنیں پیچھے چھوڑ جائے تو وہ اس کی دو تہائی میراث لیں گی (فان کانتا اثنتین فلھا الثلثان مما ترک)۔

۴۔ اگر مرنے والے شخص کی چند بہنیں اور چند بھائی ہوں (جو دو سے زیادہ ہوں) تو وہ اس کی تمام میراث آپس میں تقسیم کرینگے اس طرح سے کہ ہر بھائی کا حصہ ایک بہن سے دوگنا ہوگا (وان کانوا اخوۃ رجالا ونساء فللذکر مثل حظ الانثیین)۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے: خدا یہ حقائق تم سے بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ اور سعادت کی راہ پالو اور (یقیناً) جس راستے کی خدا نشاندہی کرتا ہے وہی صحیح اور حقیقی راستہ ہے، (کیونکہ) وہ ہر چیز سے دانا ہے (یبین اللہ لکم ان تضلوا[2] واللہ بکل شیء علیم)۔

یہ بات بتا دینی چاہیے کہ زیر نظر آیت میں بہن بھائیوں کی میراث اس صورت میں بیان کی گئی ہے جبکہ اولاد نہ ہو اور ماں باپ کے ہونے یا نہ ہونے کے متعلق اس میں کوئی بات نہیں آئی۔ لیکن اس سورہ کی ابتدائی آیات کے مطابق ماں باپ ہمیشہ اولاد کے یعنی میراث کے پہلے طبقے کے ہم پلہ قرار پاتے ہیں اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت اس مقام کے لیے ہے جب نہ اولاد ہو اور نہ ماں باپ۔

"سورۂ نساء" کی تفسیر اختتام کو پہنچی۔

---

[1] کلالہ کے لغوی معنی کیا ہیں اور یہ کہ بہن بھائیوں کو کلالہ کیوں کہتے ہیں..... اس کے بارے میں سورہ نساء آیت ۱۲ کے ذیل میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے (ص ۳۹۵ اردو ترجمہ جلد ۳)

[2] "ان تضلوا" یہاں "ان لا تضلوا" کے معنی میں ہے یعنی لفظ "لا" مقدر ہے، ایسی تعبیرات قرآن میں اور عربی زبان میں بہت ملتی ہیں۔

ادارہ امامیہ قرأت کالج

سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآن پاک (تفسیر نمونہ جلد ۲) کے اس نسخہ کو حرف بحرف بغور پڑھا میں تصدیق کرتا ہوں کہ متن میں کوئی اعرابی یا لفظی غلطی نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

حافظ محمد طفیل (شعلہ الفاضل)

مدرس / مینیجر

امامیہ قرآت کالج

اندرون موچی دروازہ۔ لاہور

اشاریے سے پہلے

زیرِ نظر اشاریہ تفسیر نمونہ کے قارئین اور محققین کی سہولت کے لیے خود مصباح القرآن ٹرسٹ نے مرتب کروایا ہے۔

یاد رہے کہ فارسی کی اصل اشاعتوں میں اشاریہ موجود نہیں ہے۔ اس طرح مصباح القرآن ٹرسٹ کو اس سلسلے میں پہل کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہو رہا ہے۔

ہماری کوشش ہوگی کہ آیندہ دیگر جلدوں کی اشاعتوں میں بھی اشاریہ شامل کرکے انہیں مفید تر بنایا جائے۔

اشاریوں کی عام رَوِش سے ہٹ کر زیرِ نظر اشاریہ میں تفسیر میں موجود قرآنی لغت کے زیادہ دقت طلب الفاظ کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ جن کتابوں سے مؤلفِ محترم نے استفادہ کیا ہے ان کی تفصیلی فہرست بھی پیش کر دی گئی ہے۔

عالمِ پیری میں یہ کٹھن اور بزرگانہ کام محترم سید شکیل حسنین موسوی نے انجام دیا ہے۔ خدا تعالیٰ اُن کی توفیقات میں اضافہ کرے اور انہیں خدمتِ اسلام اور قرآن کے لیے طولِ عمر سے نوازے۔

آپ کی آراء اور تنقید اس سلسلے کو بہتر اور مؤثر بنانے کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

انچارج
شعبۂ تصحیح و ترتیب
مصباح القرآن ٹرسٹ

۹ صفر المظفر ۱۴۰۸ھ

اشاریہ

تفسیر نمونہ ــــــــــ جلد ۲

ترتیب و تزئین ------ سیّد شکیل حسین موسوی

------ سیّد محمد حسین زیدی الباھروی

مضامین:

اصول وعقائد

توحید :

علمِ خدا :

عدل :

نبوّت :

امامت :

دُعا :

معاد :

جبر و اکراہ :

معجزہ :

موت :

احکام

نماز :

تیمم :

زکوٰۃ :

جہاد :

حج :

نکاح و ازدواج :

وراثت :

قتلِ اشتباہ کے احکام ؛

اخلاقیات

اخلاقِ حسنہ ؛

اخلاقِ رذیلہ

بخل ؛

حسد :

خیانت :

سرکشی :

نفاق :

اعمال بد :

بہتان :

شرک :

قتل :

اقوامِ سابقہ

بنی اسرائیل :

آلِ فرعون:

عیسائی:

کافر:

شخصیات

حضرت آدم علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام

ابن ابو العوجاء

ابنِ صوریا

ابو رافع

ابو قیس انصاری

ارفطہ

اسامہ بن زیدؓ

حارث بن یزید

حبابؓ بن منذر

حسنہ زوجہ عمرانؑ

حضرت حمزہؑ سید الشہداء

حیی بن اخطب

خالد

خالد بن ولید

زبیرؓ بن العوام (آنحضرتؐ کا پھوپھی زاد بھائی)

حضرت زکریا علیہ السلام

جناب زینبؑ بنت حضرت علیؑ

شاس بن قیس (یہودی سردار)

شہر بن حوشب

شیطان

عبداللہ بن سلام

عبداللہ بن عباسؓ

عثمان بن طلحہ

علی بن ابراہیم

عطا بن ابی رباح

حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ

علی بن حسین واقدی

گوستاولیبون (مورخ)

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

مقوقس

حضرت نوح علیہ السلام

نوفؒ بکالی

ہاکس (امریکی مصنف)

ہرقل

حضرت یحییٰ علیہ السلام

عُلماء و دانشور

کُتب سماوی

انجیل

تورات

زبور

قرآن

قرآن اور سائنس

کُتب تاریخ و تفسیر و سیر

لغاتِ قرآن

(ا)

بُری مجلس

بشر پرستی

تقیہ

توبہ

حسنات و سیئات

حقوق

حقوق اسلامی

سرگوشی

سزائیں

سُود

شخصیت پرستی کی مخالفت

شہادت و گواہی

شہدائے راہ خدا

صُلح کی پیشکش کا استقبال

طبقاتی تفاوت

ظُلم

علماء کی ذمہ داری

غزوات

قرعہ اندازی

قناطیر

کامرانیوں اور ناکامیوں کا سرچشمہ

کامیابی کا ایک راستہ

کفّارہ

کفر

گذشتہ تاریخ

گناہ کبیرہ و صغیرہ

متاعِ حیات

موت

ہجرت

یتامیٰ

مقامات

اُحد

اوطاس

بکہ

جتسیمانی باغ

حِجرِ اسماعیل

حدیبیہ

حمراء الاسد

روحا

کعبہ

مقربین بارگاہِ پروردگار